یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۰ شمارہ ۱

جنوری ۱۹۶۸ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

پروفیسر سیّد علی اکبر

مجلس مشاورت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۔ مسز راج سکینہ ۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں

معتمد

محمد اکبر الدین صدّیقی

مہتمم — محمد جمال الدین

منتظم — وقار خلیل

سالانہ	چھ روپے	غیر ممالک سے	دس روپے
ششماہی	تین روپے	فی پرچہ	پچاس پیسے

سید علی اکبر پرنٹر و پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر ایوان اردو خیرت آباد حیدرآباد سے شائع کیا۔

ترتیب

اپنی بات

اس شمارہ سے سب رس اپنے تیسویں سال میں قدم رکھ رہا ہے - یہ مدت ایک اردو ماہنامہ کے پڑھنے والوں کیلئے حیرانگی بھی ہوسکتی ہے اور تعجب خیز بھی۔ سب رس نے کتنے نشیب و فراز دیکھے کتنے انقلاب آئے اور گزر گئے۔ کتنے حادثوں سے وہ دوچار ہوا ہر وقت اس نے سبزہ کی طرح ان کے سامنے سر جھکا دیا لیکن ادب کی سرزمین میں اس نے اپنے قدم جمائے رکھے اس کا مسلک ہمیشہ صلح کل رہا اور مرنجان مرنج کی اس پالیسی نے اس کو اپنے قاریوں میں ہر دلعزیز بنائے رکھا۔ ادارہ ادبیات اردو کے ترجمان کی حیثیت میں جہاں اس نے اپنے ادارہ کی خدمت کی وہیں ادب کی قدروں کو بلند کرنے میں کوشاں رہا۔ دکھنی زبان اور ادب کی خدمت کو اس نے طرۂ امتیاز گردانا اور بعض حضرات کی ناراضگی کے باوجود بھی اس نے اپنی اس خدمت سے کوئی کوتاہی نہ برتی۔ سب رس کیلئے سب سے بڑا حادثہ تو ڈاکٹر زور کی رحلت تھی مرحوم نے اس کے لئے جو راہیں متعین کی تھیں وہ آج بھی اسی پر کاربند ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ اگر معزز قاریوں کی اعانت اور دلچسپیاں اور نامور ادیبوں اور شعرائے کرام کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو شاید اس کو وہ مقام حاصل نہ ہوتا جو آج ہے۔ دکھنی زبان اور ادب کے ساتھ ساتھ عصری ادب کی بھی جو خدمت اس نے انجام دی اس کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ آئندہ بھی توقع ہے کہ وہ اپنے اصولوں پر کاربند رہے گا۔ پیش کردہ شمارے میں نہایت گراں قدر مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کا اعلان ہم گذشتہ شمارے میں کر چکے تھے۔

ڈاکٹر محمد جمال شریف صاحب نے سخاوت مرزا صاحب کی اس تحقیق کو غلط ٹھہرایا ہے کہ نصاب الاحتساب کا کاتب گولکنڈہ کا شاعر غواصی ہے اور اس کا نام شیخ حسین بہاء الدین الملقب بہ غواصی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کے دلائل براہین قاطعہ ہیں اب محققین کو ابو محمد کے بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ غواصی کا نام ہے یا کنیت۔ حضرت امین الدین اعلیٰ کی درگاہ کے کتب خانہ میں بھی دوسری رباعی پہلی رباعی کے ساتھ ہی ملی ہے اور اس پر بھی ابو محمد نام لکھا ہے۔ دوسرا مضمون پروفیسر عصمت جاوید کا ہے۔ جنہوں نے ڈاکٹر خلیق انجم اور شیخ چاند مرحوم کی تحقیق کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور نہایت کارآمد باتیں بتائی ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان حسین نے حضرت اختر لکھنوی کی دو مثنویوں کا تعارف کرایا ہے اور ان کی مثنوی نگاری پر قدرت کے ثبوت پیش کئے ہیں۔ قدیم اردو تنقید طیب انصاری کا مضمون ہے اور اردو تنقید کی تاریخ کو بدلنے کی کوشش کی ہے اور نقادوں کیلئے یہ موضوع ایک لمحہ فکر فراہم کرتا ہے۔ انصاری صاحب نے نصرتی کو مغلیہ دربار سے ملک الشعراء کا خطاب دلوایا ہے۔ شاید وہ بھول رہے ہیں کہ نصرتی نے سکندر عادل شاہ کے عہد حکومت میں ۱۰۸۵ھ میں شہادت پائی۔ آخری مضمون حمیرہ جلیلی کا ہے جو حضرت جلیل کی پوتی ہیں اور مصطفیٰ کمال صاحب نے اپنے مضمون شائع شدہ مجلہ عثمانیہ میں حضرت جلیل پر جو حرف گیری کی ہے اس کا معقول انداز میں جواب دیا ہے۔ آخری حصہ شعرائے کرام کی تخلیق سے مزین ہے۔

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ کلام اقبال کے سب سے پہلے مرتب محمد عبدالرزاق راشد ایچ سی ایس وظیفہ یاب ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل نے ۱۵ ؍ دسمبر ۱۹۶۷ء کو انتقال کیا۔ ان کی موت آر۔ ٹی۔ سی بس سے حادثہ کا نتیجہ تھی جو مشیر باغ سے قریب پیش آیا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد ۱۶ ؍ دسمبر ۱۹۶۷ء کو تدفین عمل میں آئی۔ ہم پسماندگان کے غم میں شریک ہیں۔

ڈاکٹر محمد جمال شریف

ملک الشعراء غواصی کا نام

غواصی کا نام معلوم نہیں یہ ملا غواصی کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ تخلص غواصی تھا اور اس نے بعض وقت غواص یا غواصیا بھی تخلص لایا ہے۔ یہ گولکنڈہ کا باشندہ اور قطب شاہی دور کا بلند پایہ اور ممتاز شاعر تھا اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعراء۔ بقول ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور "غواصی گولکنڈہ میں پیدا ہوئے اور وجہی کے ہم عصر تھے ..... وجہی کے بعد حیدرآباد کے سب سے بڑے شاعر اور ملک الشعراء تھے"[1] اور پروفیسر عبدالقادر سروری نے سلطان عبداللہ کے عہد کے اور ایسا غواصی کو بلند پایہ مثنوی نگار بتلایا ہے[2]۔ نیز حکیم سید شمس اللہ قادری نے لکھا ہے کہ "ملا غواصی گولکنڈہ کے باشندے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر ہیں"[3]۔ بعض قرائن سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوا۔ اس کے انتقال کی صحیح تاریخ معلوم نہیں البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ تا ۱۰۸۳ھ) کی زندگی ہی میں فوت ہو چکا تھا۔

سخاوت مرزا صاحب نے اپنے ایک مضمون "ملک الشعراء غواصی اور اس کا کلام" میں غواصی کے بارے میں لکھا ہے کہ "غواصی کا نام تاریخ ولادت اور وفات نامعلوم ہے۔ رہا تخلص غواص یا غواصی مشہور تھا"[4]۔ اور نصیر الدین ہاشمی صاحب نے لکھا ہے کہ ہم غواصی کے نام سے واقف ہیں اور نہ اس کے پیدائش اور مرنے کے سنہ کی اطلاع ہے[5]۔ سخاوت مرزا صاحب نے اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۵۶ء میں اپنے ایک اور مضمون میں زیر سرخی "نصاب الاحتساب عربی کا کاتب غواصی گولکنڈوی" لکھا کہ "ہم کو یہاں نسخہ نصاب الاحتساب عربی مکتوبہ ملا غواصی گولکنڈہ سے بحث ہے"[6]۔ لیکن مرزا صاحب نے ملا غواصی پر لکھنے کی بجائے "نصاب الاحتساب" کے سنہ تالیف اور اس کے نسخوں سے متعلق جو مختلف کتب خانوں میں ہیں روشنی ڈالی ہے۔ مضمون کا نصف سے زیادہ حصہ اس پر حاوی ہے۔ آخر میں کتاب کے ایک نسخہ کے حوالے سے جو کتب خانہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ہے لکھا ہے کہ کاتب نے اپنا پورا نام لقب یا تخلص اس طرح لکھا ہے: "شیخ حسین بہاء الدین الملقب بہ غواصی ۱۰۹۰ھ اور یہ تحریر کیا ہے"۔

---

[1] اردو شہ پارے۔ صفحہ ۱۰۴ و اردو شاعری کا انتخاب صفحہ ۲۸ [2] اردو مثنوی کا ارتقاء صفحہ ۱۷ [3] اردوئے قدیم صفحہ ۵۶، ۵۷
[4] رسالہ اردو اکتوبر سنہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۰۲ [5] روح ترقی جمادی الاول ۱۳۶۹ھ صفحہ ۲۸ [6] اورینٹل میگزین کالج
نومبر ۱۹۵۶ء صفحہ ۷۵ [7] اورینٹل میگزین کالج صفحہ ۷۶۔

ہمارا ناقص خیال یہ ہے کہ کاتب نے جو اپنا لقب یہاں "غواصی" بیان کیا ہے وہ درحقیقت لقب نہیں بلکہ تخلص ہی ہے کیونکہ اس قسم کے القاب مروج نہیں بلکہ تخلص ہی ہوا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دراصل کاتب نے پہلے اپنا نام "شیخ حسین" لکھا اس کے بعد اپنا لقب "بہاؤالدین" اور آخر میں اپنا تخلص غواصی لکھا ہے جس نام سے وہ بہت زیادہ معروف تھا۔[علیہ]

مرزا صاحب نے زیرِ نظر نسخہ کے کاتب شیخ حسین بہاؤالدین الملقب بغواصی کو قطب شاہی سلطنت کے عظیم المرتبت اور بلند پایہ شاعر اور ملک الشعراء ملا غواصی قرار دینے کی کوشش کی ہے جو زیادہ دقیع نہیں ہے۔ اس لیے کہ لقب اور تخلص میں کافی اور بڑا فرق ہے جس کا اظہار مرزا صاحب نے بھی کیا ہے۔ لقب تو وہ ہے جو اپنے نام کے علاوہ کسی خاص صفت کی وجہ سے استعمال کیا جائے اور تخلص شاعر کا مختصر نام ہوتا ہے جسکو شاعر سہولت کی خاطر اپنے طویل ناموں کی بجائے اختیار کرتے ہیں یا پھر نام ہی کے کسی جزو کو تخلص کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے یہاں الملقب لغواصی سے تخلص مراد لیکر زیرِ بحث کاتب کو ملا غواصی خیال کرنا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ اگر بفرضِ محال مرزا صاحب کے اس خیال کو صحیح بھی مانا جائے تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ملا غواصی ملک الشعراء گولکنڈہ کیلئے وہ کونسی بات مانع تھی جس کی بنا پر اس نے زیرِ بحث نسخہ کی کتابت کے بعد ترقیمہ میں نام کیساتھ المتخلص لغواصی لکھنے کی بجائے الملقب لغواصی لکھا جبکہ وہ عام طور پر اپنے تخلص غواصی ہی سے زیادہ مشہور و معروف تھا۔ اس لئے مرزا صاحب کا خیال درست نہیں معلوم ہوتا۔ مرزا صاحب نے اولاً اپنے مضمون کا عنوان "نصاب الاحتساب عربی کا کاتب غواصی گولکنڈوی" ہی غلط تجویز کیا ہے۔ اس لئے کہ ترقیمہ میں غواصی گولکنڈوی کا اظہار نہیں ہے۔ اس طرح مرزا صاحب نے غواصی گولکنڈوی لکھ کر اپنے قارئین کے خیالات کو متاثر ہی نہیں بلکہ ہم خیال بنانے کی ناکام کوشش کی ہے اور عنوان کی سرخی غلط قائم کرکے صحت سے کام نہیں لیا ہے جبکہ زیرِ بحث نسخہ کا کاتب "شیخ حسین بہاؤالدین الملقب بغواصی" ہے۔ جب تک کہ لقب اور تخلص میں تمیز باقی ہے اور ان دونوں کو ایک ثابت نہ کیا جائے یا ملا غواصی کو اس نسخہ کا کاتب تسلیم نہ کیا جائے۔ مرزا صاحب کے خیال کی تردید ہوتی ہے اور قیاس ہوتا ہے کہ ان کے مفروضات کا تحقیق سے بہت کم لگاؤ ہے۔ نیز مرزا صاحب کا اپنی معلومات کی بنا پر زیرِ نظر کاتب کو صرف ملا غواصی ہی تصور کرنا تعجب خیز ہے شاید ان کے علم میں ملا غواصی کے علاوہ جو قطب شاہی دربار میں ملک الشعراء تھا اور کوئی اس تخلص کا شاعر یا اور کوئی شخص نہیں ہے۔ زیرِ بحث غواصی کے علاوہ مزید اور شاعر بھی اس تخلص کے گذرے ہیں جو فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ چنانچہ تذکرہ شاعران مولف محمد مہدی واصف میں غواصی تخلص کے ایک فارسی گو شاعر کا ذکر اس طرح ہے :—

عا اورنٹیل کالج میگزین نومبر ۱۹۵۶ء صفحہ ۷۶

غواصی از اہالی یزد بود غواص طبعش از دریای فکر دامن گوہر معانی با صدف الفاظ بر آوردی

در زمان شاہ طہماسپ صفوی بفراغ خاطر روزگار بسری برد اوسط مائتہ عاشر

از دریای پر آشوب جہان چون در یتیم سفر کرد من کلامہ :-

گر نہ ہر دم ز سر کوی تو ام رشک برد   عاشقیہا کنم آنجا فلک رشک برد[1]

یہی شعر مخطوطہ (۱۸۰۶) دیوان فارسی کتب خانہ آصفیہ میں غواصی خراسانی کے نام سے ملتا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ غواصی کا وطن خراسان ہے۔ نظامی بدایونی نے قاموس المشاہیر میں غواصی یزدی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اصلی نام عزیز الدین تھا شہر یزد کے رہنے والے تھے۔ پانچ سو (۵۰۰) اشعار روزانہ لکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی زندگی میں ایک لاکھ اشعار تصنیف کئے۔ اپنی ایک کتاب میں جو ۱۵۰۳ء مطابق ۹۰۸ھ میں لکھی گئی۔ لکھتے ہیں کہ انھوں نے نظم مسمی روضۃ الشہدا۔ تاریخ طبری۔ قصص الانبیاء۔ کلیلہ و دمنہ ذخیرہ خوارزم شاہی وغیرہ جیسی مشہور کتب فارسی کو نظم کیا ہے[2]۔ عزیز الدین غواصی یزدی سے واضح ہوتا ہے کہ شاید کاتب شیخ حسین بہاء الدین ملقب بغواصی اسی خاندان سے تعلق رکھتا ہو یا انکی اولاد سے ہو اور عزیز الدین کی مناسبت سے نام بہاء الدین اور غواصی یزدی کے خاندان میں ہونے سے شاید لقب غواصی ہو۔ نیز خزینۃ الاصفیاء میں سید علی غواص ترمذی کا ذکر ملتا ہے جو یہ ہے :-

"سید علی غواص ترمذی قدس سرہ مرید و خلیفہ شیخ نظام الدین تھانیسری از کمال اولیائے عصر و مشایخ عظام وقتی کہ شیخ نظام الدین از ہند بجانب بلخ روانہ شد۔ سید علی مرید گردید و مدتی بخدمت پیر روشن ضمیر ماندہ بکمال رسید... و چون غواص دریای معانی بود از پیشگاہ پیر روشن ضمیر مخاطب بخطاب غواص شد۔ وفات سید علی در سال یک ہزار و چہل در عہد سلطنت شاہ جہاں بادشاہ است[3]"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غواص لقب یا تخلص ہی نہیں بلکہ خطاب بھی تھا۔ اور ہو سکتا ہے۔ اسلئے مرزا صاحب کا لقب کو تخلص خیال کرنا قرین قیاس نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خطاب ہی ہو۔ بہر حال ان امور کی روشنی میں کوئی مناسب صورت ایسی نظر نہیں آتی جس کی بناء پر مرزا صاحب کے اس خیال کی تائید ہو سکے۔ اس لئے زیر بحث مخطوطہ کے کاتب شیخ حسین بہاء الدین الملقب بغواصی کی شخصیت ملا غواصی ملک الشعراء سلطنت قطب شاہیہ سے بالکل جدا قرار پاتی ہے۔ اس ضمن میں لقب اور تخلص کے فرق کے تعلق سے شبہ کے پیش نظر مرزا صاحب نے خود اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

---

[1] مخطوطہ ۲۲۲ صفحہ ۱۱۰ تذکرہ شاعران (محمد مہدی واصف) کتب خانہ آصفیہ   [2] قاموس المشاہیر جلد دوم صفحہ ۱۱۳

[3] خزینۃ الاصفیاء مطبوعہ صفحہ ۶۶۲ کتب خانہ آصفیہ۔

یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس میں کاتب نے اپنا لقب غواصی لکھا ہے دکہ تخلص) اور لقب اور تخلص میں بڑا فرق ہے۔ لقب تو وہ ہے جو اپنے نام کے علاوہ خاص صفت کیلئے استعمال کیا جائے مثلاً جلال الدنیا والدین اور تخلص شاعر کا مختصر نام جو شاعری کیلئے مختص ہے مثلاً ظہوری، عرفی، وجہی وغیرہ[1]۔

مرزا صاحب کے اس شبہ سے بھی مقالہ نگار کے خیال کو تقویت ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے شیخ حسین بہاء الدین الملقب بغواصی کاتب نصاب الاحتساب (عربی) قطب شاہی دربار کا ملک الشعراء ملا غواصی نہیں ہے۔ اسی ضمن میں مرزا صاحب نے شبہ کا اظہار بھی کیا ہے کہ غواصی نے جو شاید عربی جانتا نہ تھا کیوں نقل کی اور ایسی عمر میں جبکہ وہ ضعیف العمر تھا[2]۔ اس کے جواب میں مرزا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ عربی جاننے سے متعلق غواصی کی نسبت بظاہر کوئی سند نہیں ہے کہ وہ عربی کا بھی فاضل ہو۔ مگر اس کے کلیات دکنی میں بیسیوں عربی الفاظ، عربی ترکیبیں اور ترجمے موجود ہیں[3]۔ کلیات دکنی میں عربی الفاظ ترکیبیں اور ترجمے موجود ہونے سے یہ کسطرح بھی ثابت نہیں ہوتا کہ غواصی عربی کا بھی فاضل تھا۔ عام طور پر شدبد پڑھے لوگ غیر عربی داں بھی عربی الفاظ ترکیبیں اور ترجمے اپنی تحریروں اور تقاریر میں استعمال کرتے ہیں جو روز مرہ کا شاہدہ ہے کسی کے چند عربی الفاظ یا ترکیبیں استعمال کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ عربی کا فاضل اور فارغ التحصیل ہو۔ غرض مرزا صاحب کا یہ استدلال بھی بہت کمزور اور ناقابل قبول ہے۔

کاتب کے ضعیف العمر ہونے کے بارے میں مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ "ترجمہ میں آخری فقرہ میں یہ اشارہ ہے کہ اس نے آخری عمر میں نقل کی ہے۔ ہمارے قدیم بزرگ ضعیفی میں بھی کتابت سے دل بہلایا کرتے تھے اور بیکاری کو پسند نہ کرتے تھے[4]"۔ کاتب کے ضعیف العمر ہونے کے بارے میں سخاوت مرزا صاحب نے کس بنیاد پر یہ قیاس کیا غیر واضح ہے۔ البتہ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ ترجمہ میں آخری فقرہ میں یہ اشارہ ہے کہ اس نے آخری عمر میں نقل کی ہے۔ شاید مرزا صاحب نے یہ رائے "قد بلغ المقابلة بحسب الطاقة البشریة" کی بنا پر قایم کی ہے کیونکہ ترجمہ کے خاتمہ پر مرقوم یہی عبارت موجود ہے جس کو انھوں نے آخری فقرہ مراد لیا ہے اور اپنے مضمون میں درج کیا ہے اس عبارت سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کاتب نے اسکو آخری عمر میں نقل کیا ہے البتہ یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ اس کا مقابلہ حسب طاقت بشریہ کیا گیا ہے۔ اس سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ بعد کتابت اصل سے مقابلہ کیا گیا اور بوقت قرات و سماعت حتی المقدور امکانی کوشش کی گئی کہ اغلاط نہ رہنے پائیں۔ اس سے مرزا صاحب کا یہ مراد لینا کہ کاتب نے ضعیف العمری میں اس کی نقل کی صحیح نہیں ہے کیونکہ کاتب کی عمر کی کہیں بھی وضاحت نہیں ہے۔ جس طرح آج بھی بعد قرات و سماعت "نقل مطابق اصل ہے" لکھا جاتا ہے بالکل اسی طرح زیر بحث مخطوطہ کی تکمیل کے بعد بھی "قد بلغ المقابلة بحسب الطاقة البشریة" لکھا گیا۔ اس سے اس امر کی تصدیق مراد ہے کہ کتابت صحت کیساتھ اور حتی المقدور درست کی گئی ہے۔ ترقیمہ اس طرح لکھا ہے ۔۔۔

---

[1] اورنٹیل کالج میگزین نومبر ١٩٥٦ء صفحہ ٦٧ [2] اورنٹیل کالج میگزین نومبر ١٩٥٦ء صفحہ ٦٦

[3] ،، ،، ،، ،، ،، ،، [4] مخطوطہ (١٥٠٨) کتب خانہ جامعہ عثمانیہ عربی

"احمد اللہ وصلی علی رسولہ المجتبیٰ و نبیہ المصطفیٰ علی ان وفق لی بفراغ تنمیق ھذہ الرسالۃ وقت عصر یوم الاربعۃ الثالث من ربیع الثانی سنہ تسع وثمانین والف من الھجرۃ النبویہ وانا المحتاج الی اللہ المتین شیخ حسین بہاء الدین الملقب بغواصی"

قد بلغ المقابلۃ بحسب الطاقۃ البشریۃ ١/ہ

زیر بحث مخطوط نصاب الاحتساب خوشخط اور نسخ میں لکھا ہوا ہے۔ اس لئے کاتب کا خوش خط اور خوش نویس ہونا ضروری ہے چونکہ ملا غواصی کے بارے میں اس تعلق سے کوئی معلومات ہیں اور نہ بظاہر کوئی ثبوت ایسا ہے جس کی بناء پر یہ خیال کیا جاسکے کہ غواصی عربی کا فاضل ہی نہیں بلکہ اچھا خطاط بھی تھا۔ اس لئے اس زیر بحث مخطوط کا کاتب قرار دینا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ کتاب (۱۲۰) اوراق پر مشتمل ہے اور شروع سے آخر تک نسخ میں اور عربی نہج و رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے۔ البتہ درمیان میں کہیں خط بدلا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابت دو قسم کی ہے۔ صفحہ (۱) پر خط کچھ جلی ہے اور صفحہ (۲ تا ۵/ب) دیگر صفحہ (۱۱۲/ب) تا صفحہ (۱۲۳/ب) پر خط باریک اور کتابت میں فرق ہے جو ابتدائی تحریر سے بدلا ہوا ہے۔ نیز حاشیہ پر بھی بعض مقامات پر اس خط میں لکھا ہوا ہے۔ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید بوقت قرارت و سماعت بصورت اصلاح یہ تحریر کیا ہے۔ کتابت کے بعد قرارت و سماعت کرنے کی تصدیق ترقیمہ کے بعد کی عبارت سے ہوتی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جس سے سخاوت مرزا صاحب نے غلط رائے قائم کرکے کاتب کے ضعیف العمر ہونے کا قیاس قائم کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے تمام تذکرہ نگار اور مورخین جو غواصی کے قریب ترین زمانہ کے ہیں قطب شاہی دربار کے ملک الشعراء کا نام غواصی یا ملا غواصی ہی لکھا ہے۔ اگر اس کا نام شیخ حسین بہاء الدین ہوتا تو ضرور وہ اس کے نام کی وضاحت کرتے اور نام کی بجائے صرف تخلص لکھنے پر اکتفا نہ کرتے۔ مرزا نظام الدین احمد شیرازی نے حدیقۃ السلاطین میں جو عبداللہ قطب شاہ کی تاریخ لکھی ہے اس میں غواصی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ بادشاہ کے محل میں [illegible]ھ میں شاہزادہ پیدا ہوا تو غواصی نے تاریخ کہی اور اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا" ملا غواصی کہ در شعر دکنی از امثال خود ممتاز است این کلمہ را مادہ تاریخ ساخته است" "محفوظ باد" نیز [illegible]ھ میں جب سلطان محمد عادل شاہ نے ملک خوشنود کو سفیر بنا کر گولکنڈہ بھیجا تو اس کی واپسی پر عبداللہ قطب شاہ نے اس کے ہمراہ ملا غواصی کو بیجاپور روانہ کیا اور جب غواصی گولکنڈہ واپس ہوا تو محمد عادل شاہ نے میر زین العابدین کو اس کے ساتھ بھیجا نظام الدین احمد نے اس واقعہ کو اس طرح قلمبند کیا ہے۔

" وبعد از یک چندے ملا غواصی شاعر دکنی را رفیق او ساخته با تحفہ و یادگار روانہ بیجاپور ساختند"

وبعد از قتل خواص خان .... حضرت عادل شاہ میر زین العابدین پسر شاہ ابوالحسن حاجب

مقیمی را ہمراہ ملا غواصی شاعر نمودہ در زنجیر فیل بزرگ و شش سر اسپ عراقی و دو صندوق مقفل از

تحف و ہدایا ارسال داشتند[2]"

---

[1] مخطوط عربی (۱۵۰۰) کتب خانہ جامعہ عثمانیہ ۔ [2] حدیقۃ السلاطین حصہ اول صفحہ ۱۲۰، ۱۳۹

نیز کتب خانہ آصفیہ میں ایک مخطوطہ میں مرثیہ ہے جس کی سرخی "مرثیہ امام حسین کہ از مولانا غواصی است"[1] ہے۔ اور یہ غرہ رجب المرجب ۱۱۰۳ھ کا مکتوبہ ہے چونکہ یہ بہت قدیم اور ملا غواصی کے قریب ترین زمانہ کی تحریر ہے اور تاریخ حدیقۃ السلاطین عبداللہ قطب شاہ کے عہد کی تاریخ ہے اس لیے مولانا غواصی اور ملا غواصی سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ بقول مرزا صاحب غواصی کا نام شیخ حسین بہاء الدین نہیں تھا ورنہ ان کتابوں میں اس کے نام کا ذکر ضرور ہوتا۔ اگر غواصی کا یہ نام ہوتا تو ملک خوشنود کے ہمراہ بیجاپور کو روانگی کے وقت یا پھر بیجاپور سے گولکنڈہ کو واپسی کے وقت تاریخ میں اس کے تخلص کیساتھ ضرور اس کے نام کی بھی وضاحت ہوتی یا پھر بصورت لقب اس کی صراحت ہوتی۔ چونکہ ایسا نہیں ہے اس لئے شیخ حسین بہاوالدین کاتب نصاب الاحتساب کو ملا غواصی ملک الشعراء گولکنڈہ خیال کرنا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے اس کی ملا غواصی یا مولانا غواصی سے بالکل الگ شخصیت قرار پاتی ہے۔ اگر اس بات کو بقول مرزا صاحب صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ غواصی نے کیوں اپنے نام کیساتھ لفظ غواصی سے پہلے تخلص کی بجائے لقب کا اظہار مناسب اور ضروری سمجھا جبکہ وہ گولکنڈہ میں اور اس کے باہر بیجاپور میں بھی بہ حیثیت ممتاز اور بلند پایہ شاعر کے کافی مشہور تھا اور درباری شاعر اور ملک الشعراء ہونے کے وجہ سے بھی اپنے تخلص غواصی ہی سے زیادہ شہرت رکھتا تھا۔

مضمون کے خاتمہ میں سخاوت مرزا صاحب کا یہ لکھنا کہ "یہ ایک بڑا انکشاف ہے کہ اس کا نام شیخ حسین لقب بہاؤالدین اور تخلص غواصی تھا" انتہائی تعجب خیز ہے اس لئے کہ اسکی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہے جسکی بنا پر اس خیال کو تسلیم کیا جائے کیونکہ ترقیمہ میں یہ صاف لکھا ہے "شیخ حسین بہاؤالدین الملقب بغواصی"[2]۔ اس تحریر سے کہیں بھی مرزا صاحب کے خیال کی تائید نہیں ہوتی اور مرزا صاحب کا اس سے یہ تصور کرنا کہ کاتب نے اپنا نام شیخ حسین لکھا اس کے بعد اپنا لقب بہاؤالدین اور آخر میں اپنا تخلص غواصی لکھا ہے بے معنی اور مہمل بات ہے۔ اگر اس میں ذرا بھی اصلیت ہوتی اور اس کا کاتب زیر بحث شاعر ملا غواصی ہی ہوتا تو ضرور وہ لقب کی بجائے اپنے تخلص کو ظاہر کرتا جس سے کہ وہ عام طور پر مشہور تھا اس لیے کہ لقب کی بجائے تخلص لکھنے میں کوئی امر مانع نہیں تھا اور عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ شعراء اپنے نام سے زیادہ اپنے تخلص ہی سے زیادہ مشہور ہوتے ہیں حتیٰ کہ خود اپنی تحریروں میں ختم پر نام لکھنے کی بجائے صرف تخلص لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ لوگ مشہور شعراء کے ناموں سے تقریباً ناواقف ہوتے ہیں حتیٰ کہ غالبؔ۔ اقبالؔ۔ حالیؔ۔ جوشؔ (ملیح آبادی) امجدؔ (حیدرآبادی) جگرؔ (مرادآبادی) مجنوںؔ (گورکھپوری) وغیرہ جیسے مشہور و معروف شعراء کے ناموں سے بھی اکثر لوگ کم واقف ہوں گے۔ نام کی طرح لقب وغیرہ سے کوئی واقف نہیں ہوتا اور نہ خود شاعر کے نزدیک تخلص کے مقابل اس کے لقب کی کوئی اہمیت ہوتی ہے بلکہ وہ تخلص ہی کو اہمیت دیتے ہیں اور اپنی تحریروں میں دستخط کی جگہ تخلص لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ امجد حیدرآبادی جو دکن کے مشہور اور بلند پایہ شاعر تھے اور رباعیات کی حد تک شہنشاہ رباعیات اور سرمد ثانی کہلاتے تھے ایک اچھے خطاط اور خوشنویس بھی تھے۔ بعض رباعیاں خود انھیں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔

---

[1] مخطوطہ ادعیہ نمبر ۱۴۹ صفحہ ۳۲ کتب خانہ آصفیہ [2] نصاب الاحتساب صفحہ ۷۷

جس کے خاتمہ پر "امجد رقم" لکھا ہوا ہے۔ ان میں سے بعض اقتباسات شائع ہو چکی ہیں اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شعراء اپنے نام، لقب، کنیت، تخلص وغیرہ سے زیادہ اپنے تخلص ہی کو پسند کرتے ہیں۔ مرزا صاحب نے مضمون کے خاتمہ میں اپنے اس قیاس کے بارے میں شبکی وجہ یقینی بات کا اس طرح اظہار کیا ہے "ان حالات کے تحت جب تک کوئی اور شہادت معرض وجود میں نہ آئے یہ تصور بیجا نہ ہوگا کہ اس کا کاتب دکن کا وہی مشہور اور بلند پایہ شاعر ملک الشعراء غواصی گولکنڈوی ہے اور یہ ایک بڑا انکشاف ہے کہ اس کا اصلی نام شیخ حسین لقب بہاؤالدین اور تخلص غواصی تھا۔[1] قبل ازیں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ کاتب کا نام شیخ حسین بہاؤالدین ملقب بغواصی ہے نہ کہ نام شیخ حسین لقب بہاؤالدین اور تخلص غواصی جیسا کہ مرزا صاحب نے لکھا ہے۔ اس طرح اس کی غلط تاویل کرتے ہوئے سخاوت مرزا صاحب نے اس کو بڑا انکشاف تصور کیا ہے جسکی بنیاد محض ظنی قیاسات پر ہے جبکہ کاتب نے کہیں بھی نام۔ لقب۔ تخلص کی تمیز پیدا نہیں کی سوائے نام اور لقب کے کہ "شیخ حسین بہاؤالدین الملقب بغواصی" تو کاتب کے اس صاف اور صریح اظہار خیال کے بعد مرزا صاحب کا اس سے حسب منشا تاویل کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا جبکہ اس میں تخلص کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔ اور نام کی ترکیب بھی کچھ ایسی ہے کہ اس سے ایرانی پن کا اظہار ہوتا ہے۔ قبل ازیں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ زیر نظر کتاب نصاب الاحتساب خوشخط اور نسخ میں ہے خط اوسط درجہ کا اور بہت خاص ہے جس سے کاتب کے ایک اچھے خوشنویس ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ نیز اس ترکیب سے لکھا گیا ہے کہ اس کی طرز ایرانی عربی نہج سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے اور عربی زبان میں ہونے کے سبب سے اس خیال کو بھی زیادہ تقویت ہوتی ہے کہ کاتب عربی کا عالم اور مولداً شاید عرب تھا اور اس کے نام کی ترکیب سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ شاید اس نے ایران میں سکونت اختیار کر لی ہو۔ چونکہ ملک الشعراء غواصی گولکنڈوی تھا اور دکنی المولد اور اس کے بارے میں عربی کے عالم ہونے کی بھی کوئی شہادت نہیں ملتی نیز اس کے اچھے خطاط یا خوشنویس ہونے کا ذکر بھی کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا ہے۔ اس لیے سخاوت مرزا صاحب کا قیاس نصاب الاحتساب کے کاتب کے بارے میں کہ "شیخ حسین بہاؤالدین الملقب بغواصی" گولکنڈہ کا وہ مشہور و معروف اور بلند پایہ شاعر ہے جو دربار گولکنڈہ میں ملک الشعراء تھا صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ نصاب الاحتساب کا کاتب ملا غواصی نہیں بلکہ کوئی اور خطاط اور کاتب ہے جس کا نام شیخ حسین بہاؤالدین اور لقب غواصی تھا۔ جیسا کہ قبل ازیں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ نیز زیر بحث کتاب "نصاب الاحتساب" کے ترقیمہ میں سنہ ۱۰۸۹ھ لکھا ہوا ہے۔ اس سے سخاوت مرزا صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "غواصی عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵-۱۰۸۳ھ) کی وفات کے چھ سال بعد تک یعنی سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے اوائل عہد سنہ ۱۰۸۹ھ تک بقید حیات تھا۔[2] ترقیمہ میں سنہ ۱۰۸۹ھ کی موجودگی سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ زیر بحث کتاب کی تکمیل اسی سنہ میں ہوئی اور اس وقت کاتب بقید حیات تھا اگر کاتب کو ہم مرزا صاحب کے خیال کے مطابق ملا غواصی اور ۱۰۸۹ھ میں اسے بقید حیات تصور کریں تو پھر غواصی کی اس سنہ میں

۱؎ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۵۶ء صفحہ ۷۷　　　۲؎ اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۵۶ء صفحہ ۷۷

عمر کا تعین ضروری ہو جاتا ہے۔

عام طور پر یہ امر مسلمہ ہے کہ غواصی ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ – ۹۸۸ھ) کے زمانہ میں پیدا ہوا جس سے سب حضرات بشمول سخاوت مرزا صاحب متفق ہیں چنانچہ میر سعادت علی رضوی صاحب مرتب مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "غواصی کی تاریخ پیدائش نامعلوم۔ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ سلطان ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا ہوگا"[1] اور ڈاکٹر زور نے بھی اس طرح اظہار خیال کیا ہے، "یہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوا"[2]۔ نیز ڈاکٹر زور نے کلیات غواصی مرتبہ محمد بن عمر للچراز کے مقدمہ میں یہ تحریر کیا ہے کہ "ملا غواصی گولکنڈہ کے ملک الشعراء سمجھے جاتے ہیں وہ عہد محمد قلی (۹۸۸–۱۰۲۰ھ) میں اپنے عنفوان شباب میں تھے"[3] اور خود سخاوت مرزا صاحب نے اپنے ایک مضمون میں "ملک الشعراء غواصی اور اس کا کلام" میں لکھا ہے: "غواصی کا نام تاریخ ولادت اور تاریخ وفات معلوم نہیں ہے۔ رہا تخلص غواص یا غواصی مشہور تھا۔ جب وجہی نے اپنے "مثنوی قطب مشتری" تصنیف ۱۰۱۸ھ میں اس پر طنز کیا ہے[4] تو غواصی کی محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸–۱۰۲۰ھ) کے زمانہ میں کافی عمر تھی"[5]۔

ان بیانات سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ غواصی ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ تا ۹۸۸ھ) کے زمانے میں پیدا ہوا اور محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ – ۱۰۲۰) کے زمانہ میں اس کی کافی عمر تھی۔ کافی عمر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غواصی اس وقت گویا محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی ۹۸۸ھ کے وقت کافی عمر کا تھا کافی عمر سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید اس وقت غواصی شباب کے عالم سے گذر چکا تھا ورنہ اگر وہ جوان ہوتا تو سخاوت مرزا صاحب اسکی جوانی کی بجائے معمری کا کبھی ذکر نہ کرتے۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں اونکا "غواصی کی کافی عمر تھی" لکھنا اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وہ جوانی کی عمر سے کبھی کے تجاوز کر چکا تھا اور معمر تھا۔ اس لحاظ ابراہیم قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے شروع چار پانچ سال میں اوس کی پیدائش فرض کریں تو ۹۸۸ھ میں اس کی عمر کم از کم ۲۵ سال ہوگی اور اس طرح اوس کی پیدائش کا ۹۶۳ھ قرار پائے گا۔ اگر بقول مرزا صاحب غواصی ہی کو زیر بحث کتاب کا کاتب تصور کیا جائے تو سنہ ۱۰۸۹ھ میں اس کی عمر (۱۲۷) سال ہوگی اس عمر میں ملا غواصی ہی نہیں بلکہ کسی اور کہنہ مشق کاتب اور خطاط سے بھی (۱۳۰) اوراق یا (۲۵۶) صفحات کی کتابت مشکل ہے۔ اس لیے بھی زیر بحث کتاب کا کاتب ملا غواصی

---

[1] سیف الملوک و بدیع الجمال صفحہ (ا)، اور طوطی نامہ صفحہ (ا) [2] اردو شہ پارہ صفحہ ۱۰۴ [3] مقدمہ کلیات غواصی ص ک

[4] ـــــ ۵

اگر غوطے نک اس غواص کھائے　　　؎　　　تو یک گوہر اس دھات امولک نپائے

یو موتی نہیں وہ جو غواص پائیں　　　؎　　　یو موتی نہیں وہ جو کس ہاتھ آئیں

غواصاں کتے غوطے کھا کھا کر　　　؎　　　موئے ہیں سو اس سمد میں آکے کر

(قطب مشتری صفحہ ۱۷)

[5] اردو اکتوبر ۱۹۵۹ء صفحہ ۱۰۲۔

نہیں ہو سکتا یا اگر غواصی کی پیدائش ابراہیم قطب شاہ کے آخری زمانہ سے چند سال یعنی ۸-۱۰ سال قبل مراد لی جائے تو اس طرح بھی اس کی عمر ۱۰۸۰ھ میں سو سال سے متجاوز اور ۱۰۹ سال برآمد ہوگی۔ اس عمر میں بھی کسی خطاط سے (۲۵۶) صفحات کی کتاب کی نقل ممکن نہیں۔ اس لئے بھی زیر بحث کتاب کا کاتب ملا غواصی نہیں ہو سکتا۔ ان تمام امور سے مرزا صاحب کے خیال کی تردید ہوتی ہے۔ غواصی کی تاریخ پیدائش کی طرح اس کے انتقال کی صحیح تاریخ بھی معلوم نہیں البتہ اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی زندگی میں ہی وفات پا چکا تھا۔ میر سعادت علی رضوی صاحب مرتب "طوطی نامہ" و "سیف الملوک و بدیع الجمال" نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "غواصی نے جس طرح طوطی نامہ کے آخر میں تارک الدنیا ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس طرح عمل بھی کیا اس لئے اس کی آخری زندگی بالکل گمنام ہے یہاں تک کہ تاریخ وفات کا بھی علم نہیں قرین قیاس یہی ہے کہ اس کا سلطان عبداللہ ہی کے زمانے میں انتقال ہو گیا ہوگا[1]۔ چونکہ عبداللہ قطب شاہ کا انتقال ۱۰۸۳ھ میں ہوا اسلئے بقول رضوی صاحب غواصی ۱۰۸۳ھ سے قبل ہی فوت ہو چکا ہوگا۔ اس سے بھی مرزا صاحب کے خیال کی تردید ہوتی ہے کہ غواصی ۱۰۹۰ھ میں بقید حیات تھا۔ نیز نصیر الدین ہاشمی صاحب نے غواصی کے انتقال کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے کہ "وجہی کی طرح غواصی کا سنہ انتقال بھی معلوم نہیں ہوتا مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۰۶۰ھ کے پہلے اسکا انتقال ہو چکا تھا[2]"۔ اگر ہاشمی صاحب کا یہ قیاس صحیح ہے تو اس سے بھی سخاوت مرزا صاحب کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ کتاب "نصاب الاحتساب" مکتوبہ ۱۰۹۰ھ کا کاتب شیخ حسین بہاؤ الدین الملقب بغواصی کی بجائے ملک الشعراء ملا غواصی ہے۔ نیز چونکہ ملا غواصی کی وفات عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں مسلمہ ہے اور عبداللہ قطب شاہ نے ۱۰۸۳ھ تک برسر اقتدار رہکر انتقال کیا۔ اس لئے بھی زیر بحث کتاب مکتوبہ ۱۰۹۰ھ کا کاتب ملا غواصی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے شیخ حسین بہاؤ الدین الملقب بغواصی کی شخصیت ملک الشعراء ملا غواصی سے بالکل جدا قرار پاتی ہے۔ نیز اکبر الدین صدیقی صاحب لکچرار جامعہ عثمانیہ نے "ولی دکھنی اور غواصی دکھنی" اور "ملا غواصی" کے زیر عنوان غواصی کے انتقال کے بارے میں لکھا ہے کہ "غواصی۔ ولی کے انتقال سے کم و بیش پچاس سال پہلے انتقال کر چکا تھا[3]" اور ولی کی وفات سے کم از کم پچاس سال قبل غواصی نے رحلت کی[4]۔ اس سے بھی مرزا صاحب کے خیال کی تکذیب ہوتی ہے۔

راقم کو ریسرچ کے دوران میں غواصی کی ذیل کی دو رباعیاں ملی ہیں جن کا ذکر راقم نے اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالہ میں کیا ہے:—

---

[1] طوطی نامہ صفحہ ۶ سیف الملوک و بدیع الجمال صفحہ ۵

[2] تذکرہ کراچی فروری ۱۹۵۵ء صفحہ ۱۲

[3] دکن میں اردو صفحہ ۹۷

[4] نورس غزل نمبر اپریل سنہ ۱۹۵۸ء صفحہ ۵۵ -

رباعی غواصی

عاشق کوں امانت نگر اندیشں کہ دیک ✤ باطن بیں ہے جیوں شیر بناُس میش کہ دیک
جس ہات پکڑ عشق سنر اداز کیا ✤ سلطان کراس جان نہ درویش کہ دیک

رباعی ابو محمد

پتلی کوں ترے نانو جو برجیس رکھیا ✤ مہتاب نیرے پانو پہ آسیس رکھیا
تج ناز بھری آنک کے سنگار بدل ✤ سرمے کے نمن جیو کوں میا پیس رکھیا

یہ دونوں رباعیاں غواصی کے قلمی کلیات (کتبخانہ آصفیہ) میں صفحہ ۶۱ و ۶۲ پر موجود ہیں۔ دوسری رباعی زرباعی ابو محمد غواصی کے کلیات میں ہونے سے قیاس ہوتا ہے کہ شاید ابو محمد غواصی کی کنیت یا نام ہو۔ یہ ایک نیا انکشاف ہے جس پر ممکن ہے کہ آئندہ تحقیق کرنے والے مزید روشنی ڈالیں گے۔

عصمت جاوید

مرزا محمد رفیع سودا (از خلیق انجم) اور سودا (از شیخ چاند) کا تقابلی مقابلہ

سودا پر شیخ چاند کا تحقیقی مقالہ سودا کی شخصیت اور اس کے کلام کو سمجھنے اور پرکھنے کے سلسلے میں نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مقالہ مولوی عبدالحق کی نگرانی میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس کے متعلق خود مولوی صاحب فرماتے ہیں "تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے یہ اس پایے کا مقالہ ہے کہ اگر کسی یونیورسٹی میں بھی پیش کیا جاتا تو قابل قبول ہوتا۔ اگرچہ یہ میری نگرانی میں لکھا گیا ہے لیکن جس محنت اور کد و کاوش اور تلاش سے شیخ چاند صاحب نے اسے مرتب کیا ہے اس کا حق انہیں کو پہنچتا ہے۔ یہ مقالہ جانچ کے لئے مولانا حبیب الرحمن شروانی کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا جنھوں نے اسے سراہتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ "پی ایچ ڈی کی ڈگری پانے والوں میں بھی کمتر ایسا مقالہ لکھنے پر قادر ہو سکے ہونگے ......" اب ایک عرصے کے بعد سودا پر ایک نئی تالیف منظر عام پر آئی ہے۔ اس کے مؤلف خلیق انجم ہیں اور کتاب کا نام ہے "مرزا محمد رفیع سودا" جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ سودا پر شیخ چاند کا مقالہ سودا کو سمجھنے اور پرکھنے کے سلسلے میں نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ مقالہ اتنی محنت، کاوش اور تلاش و جستجو کے بعد لکھا گیا تھا کہ آج تک اسے علمی و ادبی حلقوں میں حرف آخر سمجھا جاتا رہا ہے لیکن ادب میں حرف آخر نامی کوئی شئے نہیں اور یہی اس کی زندگی کا ثبوت بھی ہے خلیق انجم نے اس سمت میں قدم اٹھا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا تنقیدی ادب زندہ ہے اور یہ کہ مزید تحقیقات کی گنجائش آج بھی باقی ہے اور رگِ تاک میں "بادۂ ناخوردہ" کا کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ باقی رہیگا۔ پیش لفظ میں آل احمد سرور رقمطراز ہیں "شیخ چاند کی کتاب قابل قدر ہے مگر اب خاصی پرانی ہوگئی ہے۔ اس لئے جدید تحقیق کے معیار سے سودا پر ایک نئی اور سیر حاصل کتاب کی اشد ضرورت تھی۔ خلیق انجم نے اس ضرورت کو بڑی خوبی سے پورا کیا ہے" اگرچہ آل احمد سرور نے یہ نہیں بتایا کہ شیخ چاند کی کتاب خاصی پرانی کس طرح ہوگئی ہے اور جدید تحقیق کا معیار کیا ہے لیکن خود خلیق انجم صاحب فرماتے ہیں "شیخ چاند کی کتاب سودا ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ اردو میں پہلا تحقیقی مقالہ ہے جو اتنے سائنٹیفک انداز میں لکھا گیا۔ اس مقالے کو شائع ہوئے تقریباً تیس برس ہو چکے ہیں۔ ان تیس برسوں میں اردو تحقیق میں غیر معمولی انقلاب رونما ہوا ہے۔ اسی زمانے میں ہمارے یہاں صحیح تحقیقی شعور پیدا ہوا۔ ہندوستان اور غیر ممالک کی لائبریریوں سے ایسے مخطوطے نکالے گئے جن سے قدیم ادب پر نئی روشنی پڑی۔ اردو شعراء کے قدیم تذکرے شائع ہوئے اور نئے نئے ماخذ کی نشان دہی کی گئی۔ سودا کی زندگی اور فن سے متعلق بھی بہت سا نیا مواد سامنے آیا۔

میں نے شیخ چاند کی سودا کی افادیت پہلے جیسی نہیں رہی۔ لیکن میں یہ بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ اگر شیخ مرحوم کی کتاب ۱۹۳۶ء میں شائع ہوتی (یا لکھی جاتی) تو یقیناً وہ میری کتاب سے بدرجہا بہتر ہوتی"۔ اس بیان کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگرچہ شیخ چاند کی سودا اچھے سائنٹفک انداز میں لکھی گئی ہے لیکن اردو دسند تحقیق میں "جو غیر معمولی انقلاب رونما ہوا اور ہمارے ہاں جو صحیح تحقیقی شعور پیدا ہوا" یہ کتاب اس سے محروم ہے۔ افسوس ہے کہ خلیق انجم نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ صحیح تحقیقی شعور سے ان کی کیا مراد ہے؟ اور کس طرح شیخ چاند کی سودا اس صحیح تنقیدی شعور سے محروم ہے۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گذشتہ تیس برسوں میں سودا پر جو "بہت سا نیا مواد" سامنے آیا ہے۔ خلیق انجم نے بڑی حد تک اس سے استفادہ کیا ہے۔ اگر شیخ چاند زندہ ہوتے تو یہ نیا مواد اپنی کتاب کے نئے ایڈیشن میں روایت کی کسوٹی پر کسنے کے بعد ضرور شامل کر لیتے۔

جیسا کہ خود خلیق انجم نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ شیخ چاند کی "سودا" سائنٹفک انداز میں لکھی گئی ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ادب میں سائنٹفک انداز بغیر صحیح تحقیقی و تنقیدی شعور کے وجود میں نہیں آ سکتا۔ شیخ چاند نے خود اس سائنٹفک انداز کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:- میں نے اس مقالے کے چار حصے کئے ہیں۔ پہلا حصہ تمہیدی ہے جس کے دو باب ہیں۔ پہلے باب میں سودا کے زمانے کے وہ تاریخی و معاشرتی حالات ہیں جن کا بین اثر اس کی حیات و شاعری پر ہوا۔ دوسرا باب شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا و ترقی پر ہے۔ یہ سودا کے دور تک کی مختصر ادبی تاریخ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب سودا نے شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت کیا ادبی و شعری رجحانات تھے اور اس کی ابتدائی شاعری پر اس کے کیا اثرات ہیں۔ دوسرا حصہ تحقیقی ہے۔ اس کے بھی دو باب ہیں۔ پہلے باب میں سودا کے سوانح حیات ہیں اور دوسرے باب میں اس کے کلام و تصانیف پر تحقیقی بحث ہے۔ تیسرا حصہ تنقیدی ہے۔ اس میں اکثر و بیشتر سودا کی اردو شاعری سے بحث کی گئی ہے اور ہر صنف نظم کو لیکر یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کی لفظی، لسانی اور عروضی کیفیت کیا ہے اور خیال و مضمون کے اعتبار سے اس کا کیا درجہ ہے۔ چوتھا حصہ اختتامی ہے۔ اس کے دو باب ہیں۔ پہلے میں یہ بتایا گیا ہے کہ زبان کے بنانے، سنوارنے اور پھیلانے میں سودا کی کیا کارگزاری ہے۔ اس حصے کے دوسرے باب میں یہ بتایا ہے کہ ہمارے ادب میں سودا کو کیا اہمیت حاصل ہے ...... وغیرہ۔

تیس سال کے دوران "صحیح تحقیقی شعور" پیدا ہونے کے بعد خلیق انجم نے اپنی تالیف کا خاکہ اس طرح مرتب کیا ہے (۱) سیاسی و سماجی حالات (۲) سوانح (۳) تنقید (سودا تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی نظر میں) (۴) سودا کی تصانیف (سودا کا الحاقی کلام سودا کا غیر مطبوعہ کلام (۵) سودا کے شاگرد (۶) اشعار سودا کا انگریزی ترجمہ۔

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ عہد سودا کے سیاسی اور سماجی حالات کو پیش کرنے میں خلیق انجم نے شیخ چاند کی مہیا کی ہوئی تفصیلات پر کیا اضافہ کیا ہے اور وہ اس میں کس حد تک حق بجانب ہیں۔ شیخ چاند نے اس عہد کے سیاسی و معاشرتی حالات پیش کئے ہیں جو ان کے الفاظ میں عالمگیر کی وفات ۱۱۱۸ھ سے شروع ہوتا ہے اور ۱۱۹۵ھ میں ختم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف خلیق انجم نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ حکومت مغلیہ کے زوال کا اصل سبب اسکے پیش نظر غیر متعلق اور غیر ضروری ہے۔ البتہ سیاسی انتشار کے باعث جو اقتصادی بدحالی

نمایاں تھی۔ اس کی تفصیل چونکہ موضوع کے پیشِ نظر مناسب تھی اس لئے انجم صاحب نے اسے بطورِ خاص کلامِ سودا کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ لیکن مناسب ہوتا اگر یہ تفصیل کلامِ سودا پر تبصرہ کرتے وقت پیش کی جاتی۔ تمہید میں کلامِ سودا سے حوالے قبل از وقت معلوم ہوتے ہیں۔ سائنٹیفک انداز کا تقاضا تو یہی تھا کہ تنقیدی حصے میں عہدِ سودا کے معاشرتی حالات کا عنوان قائم کر کے اس کے تحت سودا کے کلام سے مثالیں پیش کی جاتیں لیکن مصنفہ نے اسے مناسب نہیں سمجھا۔ شیخ چاند نے سیاسی حالات کی تفصیل پیش کرنے کے بعد اس دور کے تمدنی و معاشرتی حالات پر ان کے اثرات کا ذکر عمومی طور پر کیا ہے اور اس کے بعد ہی دوسرے باب میں شمالی ہند میں اس عہد کی اردو شاعری کی ابتدا و ترقی کا جائزہ لیا ہے لیکن انجم صاحب نے شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز کی تاریخ حصہ تنقید میں پیش کی ہے۔ شیخ چاند کی ترتیب زیادہ سائنٹیفک اس لئے معلوم ہوتی ہے کہ سیاسی حالات اور معاشرے پر اس کے اثرات کے بعد لازمی طور پر یہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے کہ اس وقت اردو شاعری کا کیا حال تھا۔ انجم صاحب کی ترتیب میں تاریخی تسلسل باقی نہیں رہتا البتہ سودا کے کلام کو سمجھنے میں یہ عنوان پس منظر کا کام ضرور دیتا ہے۔ بہرحال ترتیب کے اس فرق کی اپنی اپنی خوبیاں ہیں۔

سوانحی حصے میں خلیق انجم نے سودا کے حالاتِ زندگی سے متعلق بہت سی کارآمد باتیں بتائی ہیں اور اس مواد سے بھی استفادہ کیا ہے جس تک شیخ چاند کی رسائی نہیں تھی۔ مثلاً نقش علی کی "باغِ معانی" کے حوالوں سے انھوں نے سودا کے آبا و اجداد، ان کی تاریخ پیدائش اور اخلاق و کردار سے متعلق مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے (اور شیخ چاند نے بھی) مرزا کے آبا و اجداد کو کابل کا بتایا ہے جبکہ نقش علی (جو سودا کے ہم عصر بلکہ دوستوں میں سے تھے) یہ بتاتے ہیں کہ ان کے اجداد بخارا سے ہندوستان آئے اور دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی جس کی داخلی شہادت مرزا کے ان اشعار میں ملتی ہے جو انھوں نے میر علی ہاتف کی ہجو میں کہے تھے۔ اس کے علاوہ شیخ چاند نے شاہ کمال الدین کمال کے حوالے سے مرزا کو پسرِ دخترِ نعمت خاں عالی مرزا لکھا ہے لیکن انجم صاحب کو اس پر معقول اعتراض ہے کہ "اگر ایسا ہوتا تو اکثر تذکرہ نگار اس کا ذکر ضرور کرتے"۔ شیخ چاند نے مرزا کی تاریخ ولادت کا تعین ۱۱۰۶ھ میں کیا ہے لیکن خلیق انجم نے کافی بحث کے بعد یہ تاریخ ۱۱۱۸ھ میں متعین کی ہے۔ شیخ چاند نے مرزا کو سپاہی پیشہ قرار دیا ہے جس سے خلیق انجم کو اختلاف ہے۔ شیخ چاند نے قائم کے ایک بیان پر اپنا یہ مفروضہ قائم کیا تھا اور اس کی تصدیق سودا کے ایک قصیدے کے مندرجہ ذیل اشعار سے کرنی چاہی ہے ؎

کہی جاتی نہیں وہ مجھ سو جو اس ظالم نے　　جس طرح کی مری اوقات میں ڈالی ہلچل
لا بٹھایا مجھے گھر بار چھڑا لشکر میں　　پال بے چوب تلے اپنے بغیر از یک تل

اس پر خلیق انجم تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ اشعار ایک قصیدے کے ہیں۔ شیخ چاند کا خیال ہے کہ مرزا نے اوائل جوانی ہی میں پیشہ سپہ گری ترک کر کے مصاحبت اختیار کر لی تھی ۔۔۔ میرے خیال میں یہ اس وقت کہا گیا ہے جب مرزا عماد الملک کے ساتھ ترکِ وطن کر کے دہلی سے نکلے تھے"۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ قصیدہ جوانی میں نہیں بلکہ پختگی کے زمانے میں کہا گیا تھا پھر مندرجہ ذیل شعر کے متعلق خلیق انجم کیوں خاموش ہیں جس سے سودا کے جوانی میں سپاہی پیشہ ہونے کی داخلی شہادت ملتی ہے۔ یہ اشعار خلیق انجم

سوداؔ کے اس قصیدے کے اقتباس یہاں پیش کئے ہیں جو انھوں نے سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کی شان میں قیام لکھنؤ کے دوران لکھا۔

سپہ گری میں تو گزرا شباب کا عالم — نہیں وہ عمر کہ اب آؤں میں بہ کار سیاق
جو باندھوں اس پہ کمر اب تو اس طرح باندھوں — کہ جوں کمان کا قبضہ بندھے مقابل ناق
جو دست و پا میں نہ اسکے (مرے) رہی ذرا طاقت — لیا میں فن سخن کھول کر کمر سے یراق
سو اب میں تیغ زباں کو لڑوں ہوں سخت کیسا تو — ہوں فتح یاب مدد کی جو ہووے تیری وفاق

ان اشعار میں سوداؔ واضح طور پر جوانی میں اپنی سپہ گری کا ذکر کرتے ہیں اور اس طرح گردیزی کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ سوداؔ سپاہی پیشہ تھا۔ پھر خلیق انجم یہ کہنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں کہ مرزا کے ہم عصر تذکرہ نگاروں میں صرف گردیزی نے انھیں سپاہی پیشہ لکھا ہے جس کا کوئی اور ثبوت نہیں ملتا۔

مرزا کی ریختہ گوئی کی ابتدا کے سلسلے میں خلیق انجم رقمطراز ہیں "مرزا کا ایک قطعہ ہے جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ابتدا میں وہ فارسی میں شعر کہتے تھے لیکن بعد میں کسی فارسی داں نے ریختہ گوئی کا مشورہ دیا۔ قطعہ میں (اس) فارسی داں کا نام نہیں لیا گیا لیکن ... یہ فارسی داں خان آرزو ہی تھے" پھر لکھتے ہیں شیخ چاند اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس قطعے میں مرزا نے خسروؔ، فیضیؔ، آرزوؔ اور فقیرؔ جیسے فارسی شاعروں کے نام لئے ہیں۔ شیخ چاند کی دلیل یہ ہے کہ "خان آرزو کا مشورہ نہیں تھا اگر وہ مشورہ دیتے تو اس طرح فخریہ مسلم الثبوت اساتذہ میں اپنا شمار نہ کرتے"۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے خلیق انجم لکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ دلیل مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ قطعہ مرزا کا کہا ہوا ہے آرزو کا نہیں' دوسرے یہ قطعی ناممکن ہے کہ جو کچھ ہوا اور اس فارسی داں کے درمیان گفتگو ہوئی اسے مرزا نے ہو بہو نظم کر دیا ہو یہ نکہ شعری ضرورتوں کی وجہ سے یہ ممکن نہیں۔ چونکہ وہ فارسی داں خان آرزو ہیں اور آرزو کا نام قطعے میں بحیثیت استاد فن آ چکا تھا اسلئے مرزا کو آرزو کا نام پوشیدہ رکھنا پڑا ورنہ بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرزا عنوان ہی میں فارسی داں کا نام نہ بتاتے" ہمارے خیال میں شیخ چاند کی دلیل زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے۔ رہا یہ جواب کہ یہ قطعہ مرزا کا کہا ہوا ہے آرزو کا نہیں تو اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرزا نے اس قطعے میں اپنی ذاتی رائے نہیں بلکہ ایک فارسی داں کی رائے پیش کی ہے۔ اور اگر یہ فارسی داں آرزو ہی تھے تو مرزا آرزو ہی کی زبان سے اپنے آپ کو فخریہ مسلم الثبوت اساتذہ کی فہرست میں شامل نہ کرواتے۔ رہا یہ کہنا کہ آرزو کا نام قطعے کے ابتدائی شعر میں فارسی کا نام پوشیدہ رکھا ہے اور آرزو کا نام قطعے میں بحیثیت استاد فن "آچکا" نہیں تھا۔ بلکہ بعد میں لایا گیا ہے۔ اس کا قوی امکان ہے کہ سوداؔ نے صرف ایک فرضی فارسی داں کا ذکر کیا ہو اور شعری ضرورتوں کی بنا پر نہیں بلکہ اسلئے کہ انھیں فارسی گویوں کو صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ فارسی گوئی کا زمانہ گزر گیا۔ اب ہندوستانیوں کو اپنی مادری زبان ہی میں داد سخن دینی چاہیئے۔ اس بات کی وضاحت کیلئے انھوں نے ایک فارسی داں کو گھڑ لیا۔ پتہ نہیں انجم صاحب کو آزاد کی طرح اس بات پر اصرار کیوں ہے کہ یہ فارسی داں آرزو ہی تھے جبکہ کسی ہم عصر یا بعد کے تذکرہ نگار کے کسی بیان سے اس رائے کی تصدیق یا تائید نہیں ہوتی بعد

بقول شیخ چاند اردو میں طبع آزمائی کے مشورے کی اس زمانے میں کوئی ضرورت نہ تھی۔ خود اردو کی مقبولیت اور لوگوں کے بڑھتے ہوئے
عام رجحان [illegible] بھی اس سے نہ بچ سکے۔ سودا تو ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔
([illegible] کے ان کے والد [illegible]) اور پورا ہندوستانی تھا ماحول کے عام مذاق کے اثر سے اس نے فارسی کو کم التفاتی سے دیکھا اور
فارسی کو چھوڑ کے اردو میں طبع آزمائی کرنے کو ترجیح دی۔" خود خلیق انجم کو اس بات کا اعتراف ہے کہ "اردو کی مقبولیت میں فارسی دشمنی کو
دخل نہیں تھا۔ یہ وقت کی آواز اور تاریخی ضرورت تھی"۔ یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ سودا کے زمانے میں حزیں جیسا شاعر بھی
موجود تھا جو ہندوستانی شعرا و فارسی شعرا کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ کوئی عجب نہیں کہ اسی بنا پر سودا نے خانِ [illegible] کو یہ یاد دلایا ہو کہ

جو چاہے یہ کہ کہے ہند کا زباں داں شعر — تو بہتر اس کے لئے دیکھنے کا ہے آئیں
وگرنہ کہہ سکے وہ کیوں شعرِ فارسی ناحق — ہمیشہ فارسی داں کا ہو موردِ نظر یاں

سودا کے تلمذ کے متعلق انجم صاحب لکھتے ہیں: "شیخ چاند مرحوم نے سودا کے صرف ایک استاد شاہ حاتم کا ذکر کیا ہے حالانکہ
ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں کے بیانات سے چار استادوں کے نام ملتے ہیں"۔ انجم صاحب نے ان چار استادوں کے یہ نام بتائے
ہیں (۱) سلیمان قلی خاں وداد (۲) خان آرزو (۳) شاہ حاتم (۴) نظام الدین احمد صانع۔ تعجب ہے کہ انجم صاحب نے غلط بیانی سے
کیوں کام لیا اس لئے کہ یہ غلط بلکہ جھوٹ ہے کہ شیخ چاند نے سودا کے صرف ایک استاد شاہ حاتم کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے سودا کے
دو استادوں کے نام پیش کئے ہیں۔ صفحہ ۳۹ پر شیخ چاند کی یہ عبارت ملتی ہے "اس کی (سودا کی) طبیعت کو شعر و سخن سے فطری مناسبت
تھی صرف رہنمائی کے لئے استاد کی ضرورت تھی۔ اس زمانے میں مرزا محمد زماں عرف سلیمان قلی خاں وداد مشہور استاد تھے ......
سودا نے ابتداءً فارسی میں طبع آزمائی کی اور انھیں سے اصلاح لینی شروع کی۔ صفحہ ۴۱ پر یہ عبارت ملتی ہے "اردو میں طبع آزمائی کا
خیال پیدا ہوا تو استاد کی تلاش ہوئی۔ اس زمانے میں حاتم دلی کے مشہور استاد تھے۔ سودا بھی ان کی شہرت سن کر ان کا شاگرد ہوا۔" شیخ چاند
کے قول کے مطابق سودا نے ابتداءً فارسی میں وداد سے اور ریختہ میں شاہ حاتم سے اصلاح لی۔ چونکہ انجم صاحب شیخ چاند کی اس رائے
سے متفق ہیں کہ خان آرزو سودا کے استاد نہیں تھے اس لئے ان کی مذکورہ بالا فہرست میں چار کی بجائے تین اساتذہ رہ جاتے ہیں۔
رہا انجم صاحب کا یہ خیال کہ سودا نے ریختہ ہی میں یکے بعد دیگرے دونوں سے اصلاح لی جو قرین قیاس اس لئے نہیں معلوم ہوتا کہ
سلیمان قلی خاں وداد ریختہ کے اعلیٰ پایہ کے شاعر نہیں تھے بلکہ فارسی ہی ان کا میدان تھا۔ خلیق انجم کا ماخذ مصحفی کا یہ بیان
معلوم ہوتا ہے "در ابتدائے شوق شعر ہندی شاگرد سلیمان وداد بود و نیز بہ شاہ حاتم رجوع داشت۔" صفحہ ۴۰ پر شیخ چاند [illegible]
تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "وداد فارسی کا شاعر تھا اور موسوی خاں کا متوسل تھا۔ موسوی خاں کا زمانہ [illegible] ہے
یہ وہ زمانہ ہے جس میں اردو شاعری کو شمالی ہند میں فروغ نہیں ہوا تھا بلکہ ایک لحاظ سے وہاں اس کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔
اس کے علاوہ مصحفی کے سوا کسی تذکرہ نگار نے وداد کا ذکر بحیثیت اردو گو نہیں کیا ہے ایسی صورت میں وداد سے سودا کی اردو میں
شاگردی [illegible] خلیق انجم نے شیخ چاند کی اس رائے پر ذرا خیال تک نہیں کیا۔ [illegible] نہیں کیا؟

البتہ شیخ چاند نے سودا کی شاگردی کے سلسلے میں نظام الدین احمد صانع جیسے غیر معروف شخص کا نام نہیں لیا۔ اس سلسلے میں صانع کا ذکر صرف قدرت اللہ قاسم نے کیا ہے اور کسی دوسرے تذکرہ نگار کے بیان سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی۔ پھر نٹ نوٹ میں انجم صاحب نے صانع کے متعلق یہ لکھا ہے کہ شاہ حمزہ اور آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ نام سے سنِ ولادت نکلتا ہے۔ یعنی ۱۱۳۹ھ اگر یہ بیان صحیح ہے تو وہ سودا سے کم عمر ٹھہرتے ہیں۔ اس لئے سودا کا ان کی شاگردی اختیار کرنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ لیا کریم الدین کا یہ کہنا کہ نام سے سنِ ولادت نکلتا ہے جو ۱۱۰۸ ہے یعنی اگر نظام دین احمد پڑھا جائے تو ۱۱۰۸ ورنہ ۱۱۳۹ نکلتا ہے۔ تو عرض یہ ہے کہ نظام دین نام نہیں ہوا کرتا۔ نظام الدین ہی ہوتا ہے۔ انجم صاحب نے کریم الدین کے بیان کو صحیح سمجھ لیا ہے۔ گویا صرف صانع کو سودا کا استاد فرض کرنے کے لئے ان کے نام میں تحریف کرنی پڑتی ہے۔ اسلئے یہ کیوں نہ فرض کر لیا جائے کہ صانع کا نام نظام الدین ہی تھا اور اس طرح سودا کا انکی شاگردی اختیار کرنا مستبعد ہے۔ خصوصاً جب علی ابراہیم خاں بھی یہ کہتے ہیں کہ "صانع محبان سودا میں ہیں۔"

سودا کے خطاب ملک الشعرائی کے باب میں خلیق انجم محمد انوار حسین تحسین سہسوانی کی یہ روایت نقل کر کے جس میں بتایا گیا ہے کہ حزیں سودا کے ایک شعر پر اسے ملک الشعراء کے خطاب سے نوازتا ہے یہ عجیب بات لکھتے ہیں کہ "شیخ چاند نے اس روایت کو تسلیم کیا ہے حالانکہ شیخ حزیں جیسے بددماغ اور متعصب ایرانی سے اس انعام و اکرام (یا صرف اکرام؟) کی توقع نہیں کی جا سکتی" یہ بات قطعی غلط ہے کہ شیخ چاند نے اس روایت کو تسلیم کیا ہے۔ پتہ نہیں خلیق انجم شیخ چاند کے معاملے میں غلط بیانیوں سے کیوں کام لیتے ہیں۔ ایک غلط بیانی کی مثال تو اوپر گزر چکی۔ یہ دوسری مثال ہے مذکورہ بالا روایت کو نقل کر کے شیخ چاند نے یہ ضرور لکھا ہے کہ "اس روایت کی ہلکی سی تائید سودا کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے ؎

ممکن نہیں یہ روحِ مقدس سے حزیں کے   ایسی جو غزل ہووے تو سودا صلہ دے چھوڑ

لیکن وہ یہ بھی تو لکھتے ہیں "لیکن شیخ سے ایسی توقع رکھنا بیجا ہے کہ اس نے ایک ریختہ گو ہندوستانی شاعر کو محض ایک شعر کے نتیجے اتنی عزت بخشی ہو۔ اسکی کتاب (احوال حزیں) اپنے وقت کی "مدراند یاغی" کیا تعجب ہے کہ اس نے سودا کو در پوچ گویان ہند بدیہی کہا ہو جیسا کہ مشہور ہے" اس واضح بیان کی موجودگی میں یہ لکھنا کہ شیخ چاند نے اس روایت کو تسلیم کیا ہے اور پھر اسکی تردید اسی دلیل سے کرنا جس دلیل سے شیخ چاند کر چکے ہیں ادبی دیانت داری کی عجیب و غریب مثال ہے۔

سودا کے ملک الشعراء ہونے کے متعلق شیخ چاند کا یہ قیاس ہے کہ انھیں یہ خطاب کسی نہ کسی دربار ہی سے ملا ہوگا جسکی آمد یق کرنے سے وہ خود قاصر ہیں اسلئے خلیق انجم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انھیں یہ خطاب کسی دربار سے نہیں ملا تھا بلکہ "ممکن ہے کہ یہ خطاب میر کی ادبی سازش کا ایک حصہ ہو یا یہ صرف میر کا ایک ہتھیار تھا جو انعام اللہ خاں یقین کے خلاف استعمال کیا گیا ہے۔ یا یہ کہ میر نے سودا کو ملک الشعراء کہہ دیا (انھیں) بالواسطہ یقین سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے" انجم صاحب نے اس مفروضے کی بنیاد ایک دوسرے اس مفروضے پر رکھی ہے کہ تقریباً دس برس تک شمالی ہند سے لیکر جنوبی ہند تک جو مقبولیت و شہرت یقین کو ملی وہ میر اور سودا کو کافی بعد میں نصیب ہوئی" یا پھر نکات الشعراء کی تالیف کے وقت نوجوان شعراء میں یقین ملک الشعراء کے

متفق ہو سکتے تھے اور اس مفروضے کی بنیاد صرف دو رباعیوں پر قائم کی ہے جن میں سے ایک میں سودا اور یقین کو میر درد وغیرہ پر ترجیح دی گئی ہے اور دوسری میں یقین کو سودا پر۔ انجم صاحب نے یہ رباعیاں لچھمی نرائن شفیق کے حوالے سے پیش کی ہیں اور غالباً اسی بنیاد پر یقین کی شہرت کو شمالی ہند سے لیکر جنوبی ہند تک پہنچا دیا ہے جب انجم صاحب خود ہی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یقین مظہر گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور میر و سودا کا تعلق آزاد گروہ سے تھا تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ مظہر گروہ والوں میں سے کسی نے یہ رباعیاں میر و مرزا کو نیچا دکھانے کیلئے کہی ہوں۔ میر و مرزا سے متعلق بتانے جو یہ کہا ہے کہ "ع ایک ہاہا کہے ہے اک ہی ہی" تو اس قطعے کی بنیاد پر کیا یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ میر و سودا اپنے زمانے میں مقبول نہیں تھے؟ پھر ایک دو رباعیوں کی بنیاد پر یقین کو میر و سودا سے زیادہ مقبول ثابت کرنا کہاں تک مناسب ہے جبکہ میر و سودا کے عہد میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یقین کے متعلق یہ رائے رکھتے تھے کہ ان کے استاد مظہر جانجاناں انھیں غزلیں لکھ کر دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ افواہ غلط تھی جسکی تردید محمد حسین کلیم نے مندرجۂ ذیل شعر میں کی ہے ؎

یقین کے شعروں پہ ہیں بدگماں بعضے کاسکے تئیں غلط ہے ہم نے پوچھا ہے گا مرزا جانِ جاناں کو

اس میں شک نہیں کہ میر تقی میر یقین سے سخت ناراض تھے۔ نکات الشعراء میں لکھتے ہیں "ایں قدر بخود چیدہ است کہ رعونت فرعون پیش او پشت بر زمین گزارد...... والعہ سخن فہمی مطلق ندارد" لیکن ہم نہیں کہہ سکتے کہ مذکورہ بالا غلط خبر میر نے اڑائی ہو۔ اسلیئے کہ وہ بھی اس افواہ کی اس طرح تردید کرتے ہیں "مردمان گفتند کہ مرزا مظہر او را شعر گفتہ می دہد و وارث شعرہائے ریختہ خود گردانیدہ فاما قبول کردن ایں معنیش بندہ را خندہ می آید" یقین نے طویل عمر بھی نہیں پائی تھی اور پچیس سال کی عمر میں مار ڈالے گئے تھے پھر یہ استدلال کس قدر عجیب و غریب ہے کہ میر جیسا شاعر جو جرم خود سارے عالم پر چھایا ہوا تھا ایک نوجوان شاعر کی شہرت سے گھبرا کر سودا کو ملک الشعرائی کا اہل قرار دے اور مظہر گروہ والے تعارض نہ کریں۔ یہ تمام عجیب و غریب باتیں انجم صاحب کی ذہنی اپج سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں البتہ یہ ممکن ہے کہ سودا کو یہ خطاب کسی دربار سے نہ ملا ہو اس لئے کہ بقول انجم "تذکرہ گردیزی..... میں ملک الشعرائی کا کوئی ذکر نہیں۔ قدرت اللہ قاسم مردان علی خاں مبتلا ابراہیم علی خاں اور میر حسن وغیرہ نے بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو یہ خطاب اتنا بڑا اعزاز تھا کہ ہر تذکرہ نگار اور خاص طور پر میر حسن اور قاسم ضرور اس کا ذکر کرتے کیونکہ یہ دونوں سودا کے بہت مداح ہیں"۔

سودا کے فرخ آباد سے فیض آباد جانے کی تاریخ سے متعلق خلیق انجم نے شیخ چاند سے قدرے اختلاف کیا ہے۔ شیخ چاند کہتے ہیں "کہا جاتا ہے کہ نواب احمد خاں بنگش کے انتقال پر سودا فرخ آباد سے فیض آباد گیا۔ یہ صحیح نہیں بلکہ اس کی وفات ۱۱۸۵ھ سے کچھ قبل اس نے (سودا نے) فرخ آباد کو خیرباد کہی۔ نواب احمد خاں اپنی وفات سے دو سال قبل بصارت سے محروم ہو گیا تھا یہ سلطنت ان کے نہایت ابتری میں اگر رہے اور اسے حکومت کے کاروبار کو پوری طرح دیکھنے بھالنے کا موقع نصیب نہ ہوا۔ سودا کا سرپرست امیر مہربان خان رند دیوان بھی اپنے سرکاری فرائض کی بہ نسبت نواب کے علاج معالجے میں زیادہ مصروف تھا۔ نواب کی بیماری اور اس کے وہم پرستانہ معالجے نے فرخ آباد کے پناہ گزین شعرا کو نئی گردش کا پیغام سنا دیا تھا یہی وجہ ہے کہ سودا نے

اس کی وفات سے قبل نہ کہ بعد وفات فرخ آباد کو خیرباد کہی لیکن خلیق انجم مردان علی خاں مبتلا کے حوالے سے [illegible]
نواب احمد خاں بنگش کی وفات کے بعد سودا فیض آباد چلے گئے اگرچہ شیخ چاند نے اپنے دعوی کے جواز میں سودا کی [illegible]
چند شعر بھی پیش کیے ہیں جو اس نے مہرباں خاں رند کی مدح میں فیض آباد پہنچنے کے بعد لکھی تھی جن میں یہ شعر بھی ہے

خرمی تک زیر سایۂ نواب ❖ رہیو جوں آفتاب عالمتاب

ظاہر ہے کہ یہاں نواب سے مراد نواب احمد خاں بنگش ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے خلیق انجم لکھتے ہیں "ان اشعار
کی روشنی میں شیخ چاند نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سودا نواب کی زندگی ہی میں فرخ آباد چلے گئے تھے' شیخ چاند نے اس سلسلے میں جو دلائل پیش
کیے ہیں (اور خود سودا کے مذکورہ بالا شعر سے داخلی شہادت مہیا کی ہے) ان کی تردید مشکل ہے لیکن تعجب ہے کہ خلیق انجم کو انھیں
تسلیم کرنے میں تامل ہے وہ ان دلائل کو رد کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ فٹ نوٹ میں صرف اتنا کہہ دیتے ہیں "ہمارا خیال ہے کہ
نواب کی زندگی میں سودا نے فرخ آباد سے جانے کا ارادہ کیا ہوگا مگر بعد میں ملتوی کر دیا" سودا نے ایسا کیوں کیا ہوگا اس کی وجہ نہیں
بتائی گئی وہ تو مبتلا کے بتائے ہوئے سن اور اس کے اس دعوی کو کہ سودا نواب کی وفات کے بعد فیض آباد چلے گئے صحیح سمجھتے ہیں
اور بس۔ فرماتے ہیں "ہمارے خیال سے بظاہر کوئی ایسی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جس سے مبتلا کا بتایا ہوا سن غلط ثابت ہو" یہ بات بھی
نہیں کہ مبتلا نے سودا کے متعلق جو کچھ کہا ہے اسے خلیق انجم من وعن تسلیم کرتے ہوں۔ انھیں (اور شیخ چاند کو بھی) اس سے انکار ہے کہ
فرخ آباد میں سودا احمد خاں بنگش کی سرکار میں ملازم تھے لیکن فٹ نوٹ میں انجم صاحب مبتلا کے ایک بیان کا حوالہ دیتے ہیں جہاں
اس نے کہا ہے کہ سودا چندے ..... نزد نواب احمد خاں بنگش گزرانید" پھر ایسے غیر مستند تذکرہ نگار کے ایک بیان کو شیخ چاند کے دلائل
کے علی الرغم تسلیم کرنا کہاں تک جائز ہے۔

خلیق انجم نے سودا کی وفات سے متعلق میر بہادر علی واسق کے حوالے سے یہ معلومات فراہم کی ہے کہ ان کی موت زیادہ
آم کھانے سے واقع ہوئی۔ میر بہادر علی واسق لکھتے ہیں "چونکہ آم کھانا ان کی موت کا بہانہ بن گیا تھا۔ اس لئے ایک شخص نے ہندی مصرعہ
میں تاریخ وفات کہی ہے ع انبہ کھاتے کھاتے سودا کی جان نکلی۔ ایک عزیز نے اس مضمون کو فارسی میں کہا ہے ع آہ سودا انبہ
خورد و مرد" میر بہادر علی کی یہ عبارت (جس کا مختصر اقتباس ہم نے اوپر پیش کیا ہے) خلیق انجم نے بقول خود نثار احمد فاروقی کے ایک مقالے
"میر بہادر علی واسق" مطبوعہ نقوش اکتوبر ۱۹۵۵ء سے نقل کی ہے۔ اگرچہ ان مصرعوں سے تاریخ وفات ۱۱۹۵ھ نکلتی ہے (بشرطیکہ
فارسی مصرع میں الف ممدودہ کا صرف ایک عدد لیا جائے) لیکن انجم صاحب نے اس پر غور نہیں کیا کہ یہ دونوں مصرعے وزن سے
خارج ہیں۔ پہلا مصرع بحر مضارع اخرب میں اسی وقت ہو سکتا ہے جب پہلا رکن مفعول کے وزن پر ہو یعنی انبہ کو انبا پڑھا جائے
اور انبا کوئی لفظ نہیں بھی الف کے اضافے سے ایک عدد بڑھ جاتا ہے اور تاریخ ۱۱۹۶ھ نکلتی ہے۔ اسی طرح فارسی مصرع بحر رمل
مسدس مقصور یا محذوف میں اسی وقت ہو سکتا ہے جب آخری رکن فاعلات یا فاعلن ہو یعنی لفظ "مرد" میں ایک حرف صحیح یا
سبب خفیف جوڑا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس مصرع میں کسی لفظ کے اضافے سے صحیح تاریخ وفات نہیں نکل سکے گی جیسا کہ [illegible]

[illegible] وفات نے جو تاریخ وفات پیش کی ہے وہ درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس تاریخ سے [illegible]
اس [illegible] زیادہ اہم کی شخصیت میر [illegible] مصحفی عاشق نے سودا کی وفات سے متعلق جس [illegible]
سید خلیق انجم کو بیان کے اس حصے سے اتفاق نہیں کوئی تعجب نہیں اگر (زیادہ) اہم کا ذکر کرنے کا قصد بھی کسی سنائی بات پر
اس [illegible] اس بیان کی کسی اور طرف سے تائید نہیں ہوتی۔

... یہ تو تھا سوانحی حصہ۔ اب تنقیدی طرف آئیے تنقیدی حصے میں خلیق انجم نے سودا کے غیر مطبوعہ اور الحاقی کلام اور ان کے دیوان کے متداول و غیر متداول نسخوں کے اختلاف قرأت کی تفصیل قدرے بسط سے پیش کی ہے اس سے ان کی تالیف کی ضخامت شیخ چاند کی "سودا" کے مقابلے میں کافی بڑھ گئی ہے اور عیب کی بات ہو گئی ہے لیکن اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ تمام بحث سودا سے زیادہ کلیات سودا کی تدوین کے سلسلے میں ضروری ہے۔ سودا کی شخصیت اور ان کے کلام کو سمجھنے کے سلسلے میں یہ پیوست کردہ بحث غیر متعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ چاند نے اس بحث کو اٹھایا ضرور ہے لیکن اسے غیر متعلق سمجھ کر اس پر مفصل تبصرہ نہیں کیا۔ مثلاً مقدار کلام پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "چونکہ سودا کے الحاقی اور غیر مطبوعہ کلام کی بحث ابھی باقاعدہ طور پر طے نہیں ہوئی ہے ....

... انجمن ترقی اردو کلیات سودا کو خاص تحقیق سے مرتب کرا رہی ہے ..... یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ان کے کلام میں تمام اصناف سخن موجود ہیں" ایک اور جگہ قصاید کے باب میں لکھتے ہیں "قصائد کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی مستقل نظموں کے علاوہ اکثر اشعار [illegible] ایسے ملتے ہیں جو موجودہ کلیات میں موجود نہیں ہیں اور قلمی نسخوں میں درج ہیں۔ ان کی تفصیل طوالت کا باعث ہوگی۔ ہم نے [illegible] ایک مفصل مقالہ بنا لیا ہے جسے انجمن ترقی اردو کلیات سودا کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے" ایک اور جگہ لکھتے ہیں "ہم نے [illegible] کی تفصیلات بخوف طوالت یہاں درج نہیں کی ہیں" اس بحث کے چھیڑنے کا مدعا محض یہ تھا کہ اگر کوئی سودا کے کلام کو اس نظر سے دیکھنا چاہے تو اسے ضروری اشارے مل سکیں۔ خلیق انجم نے کلیات سودا کی تدوین کا کام اپنے ذمے لیا ہے۔ بہتر ہوتا اگر وہ ان تفصیلات سے زیر نظر کتاب کو گرانبار کرنے کی بجائے ان کا ذکر زیر تدوین کلیات کے سلسلے میں کرتے۔ سودا اور سوز کے دواوین میں اکثر غزلیں مشترک پائی جاتی ہیں۔ انجم صاحب نے ان کی تفصیل پیش کر کے یہ حکم لگایا ہے کہ یہ سوز کا کلام ہے لیکن اس کا مدلل [illegible] نہیں کیا [illegible] کے برعکس شیخ چاند زیادہ محتاط ہیں۔ لکھتے ہیں "سوز اور سودا کے کلیات کے متعدد نسخوں کا ہم نے مقابلہ کیا ہے جس میں غزلیں [illegible] دونوں کی نسبت یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ دراصل کس کی ہیں آیا سوز کی یا سودا کی یا خود مہربان خاں کی۔ مہربان خاں کے دیوان میں [illegible] کیا اس [illegible] وہ ہمارے پیش نظر نہیں ورنہ ممکن تھا کہ اس کے حل کی صورت نکل آتی" ایک اور جگہ لکھتے ہیں "ہم نے بہت سا کلام ایسا معلوم کیا ہے جو سوز اور سودا دونوں کے دیوانوں میں مشترک ہے۔ یہ چونکہ تعداد میں بہت زیادہ [illegible] کی تنقید سے بحث کرنا طوالت سے خالی نہیں۔ انجمن ترقی اردو کلیات سودا خاص تحقیق سے [illegible] ہوگئی۔ سودا کے کلام پر انجم صاحب کی کتاب کا [illegible]

متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں جو شیخ چاند کی "سودا" میں موجود نہ ہو۔ کچھ عنوانات نئے ضرور ہیں مثلاً غزل گوئی کا ضمن میں "داخلیت" "تصور حسن و عشق" "احساس تشنگی" "غم پرستی" "نشاط آمیزی" وغیرہ لیکن سودا کی غزل کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی اس بات کو جانتا ہے کہ ان کی غزل میں نہ تو داخلیت ہے (الا ماشاءاللہ) نہ احساس تشنگی اور نہ غم پرستی۔ رہا تصور حسن و عشق تو خود انجم صاحب نے بتایا ہے کہ انکا یہ تصور رسمی اور روایتی ہے" اس لحاظ سے سودا کی غزل کا جائزہ لینے کے سلسلے میں یہ عنوانات کس قدر موزوں ہیں اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ غزل کے متعلق وہ فرماتے ہیں "دوسرے اصناف سخن کی طرح غزل کی بنیاد بھی خارجی زندگی پر ہوتی ہے لیکن غزل پر خارجی زندگی براہ راست نہیں پیش کی جاتی بلکہ مادی تجربات کو پہلے شاعر کے آتشکدہ دل میں تپنا پڑتا ہے ..... بالفاظ دیگر اعلیٰ درجے کی غزل گوئی کیلئے "دروں بینی" پہلی شرط ہے" پھر فرماتے ہیں "سودا کا مزاج اور ذہن غزل کو راس نہیں آ سکتا تھا۔ ان کی شوخ تخیل اور طرارے بھرتی ہوئی ہمہ رنگ طبیعت اس دردمندی" سوز و گداز اور برشتگی و خستگی کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی جو غزل کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے ہاں جذبات کی وہ صداقت "معصومیت" خلوص "خود سپردگی اور دردمندی نہیں ہے جو لب و لہجہ میں نرمی اور گھلاوٹ اور انداز بیان میں سادگی و بے تکلفی پیدا کرکے شعر کو تیر و نشتر بنا دیتی ہے" اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ انجم صاحب بجا طور پر شدید داخلیت کو غزل کی جان سمجھتے ہیں اور خارجیت اور زور بیان کو اس کے حق میں مضر قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب شیخ چاند یہ کہتے ہیں کہ "سودا کا غزل میں کوئی خاص رنگ نہیں۔ وہ اس میدان میں طرح طرح طبع آزمائی کرتا ہے۔ غزل کی جان سادگی بیان ہے۔ سودا نے غزل میں اس کا بہت کم خیال رکھا ہے" تو فوراً خلیق انجم کہہ اٹھتے ہیں "مجھے شیخ چاند کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ غزل میں سودا کا اپنا مخصوص رنگ ہے جسکی بنیاد "خارجیت" زور بیان اور نشاط آمیز لب و لہجہ پر ہے" گویا خارجیت اور زور بیان غزل کی خصوصیات میں داخل ہیں وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "سودا غالباً پہلے شاعر ہیں جنہوں نے غزل کو داخلیت کی گھٹی ہوئی فضا سے باہر نکالا" ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے۔ رہی نشاط آمیز لب و لہجہ کی بات تو خلیق انجم نے ذیلی عنوان "نشاط آمیزی" کے تحت سودا کے جو اشعار پیش کئے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں نشاط آمیزی کا کیا تصور ہے۔ اگرچہ انجم صاحب نے ان اشعار میں (جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں) سودا کا غم عشق پیش کیا ہے لیکن "نشاط آمیزی" کے تحت ان اشعار کا پیش کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں اس غم عشق میں بھی نشاطیہ عنصر ملا ہے۔

جوں شمع تن ہوا شب ہجراں میں صرف اشک !! ÷ پر جس قدر میں چاہوں تھا اتنا نہ رو سکا !

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں ÷ یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

جو مذکور اس سے کرتا ہے مرا غم خوار رونے کا
تو کہتا ہے کہ چپ رہ ہے اسے آزار رونے کا

ظالم میں کہہ رہا کہ تو اس خوں سے درگزر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

تبصرہ طویل ہو رہا ہے۔ اس لئے اس کتاب میں جو دیگر اصناف سخن کا تجزیہ کیا گیا ہے اسکے متعلق ہم صرف اس قدر کہیں گے کہ اس سلسلے میں بھی انھوں نے طریقہ راسخ "قدما" کو اپنایا ہے اور پیش لفظ میں آل احمد سرور کا یہ دعویٰ "مدلل مداحی" جلوہ گر ہے

دوسرے حصے میں تنقید ہے جس میں سودا کی قادر الکلامی، ان کی ہمہ گیری اور ماحول کی عکاسی کو خاص طور سے اجاگر کیا ہے" مزید فرماتے ہیں۔ سودا کے قصائد کی عظمت کو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے لیکن ان قصاید کی سماجی اور تہذیبی اہمیت پر اور زور دینے کی ضرورت تھی" قصاید سودا کی سماجی اور تہذیبی اہمیت پر اس کتاب میں ایک لفظ کیا ایک حرف بھی نہیں ملتا۔ قصائد کے ضمن میں اگر کوئی خاص مگر عجیب بات ملتی ہے تو وہ یہ ہے" (سودا کے) اکثر قصیدوں میں گھوڑا، ہاتھی، تلوار، سپر، نیزہ پالکی اور نالکی وغیرہ کی تعریفیں کی گئی ہیں اگر یہ کہا جائے کہ اردو مرثیوں میں جو ان اشیاء کی تعریفیں ملتی ہیں، اس کی روایت سودا ہی نے قائم کی تھی تو غلط نہ ہوگا کیونکہ سودا سے قبل اردو مرثیوں میں یہ انداز نہیں تھا" ہمارا خیال ہے کہ یہ سہو کاتب ہے بجائے "مرثیوں" کے قصیدوں ہوگا' واللہ اعلم۔ خدا کرے کہ لفظ خونخواریت' جو صفحہ ۲۷ پر ملتا ہے وہ بھی کتابت کی غلطی ہو۔ ظاہر ہے کہ انجم صاحب کو اس کا علم ہوگا کہ "خونخوار" خالص فارسی مرکب ہے۔ بہر حال انجم صاحب کی یہ کوشش مجموعی طور پر یقیناً قابلِ قدر ہے اور "سودائیات" میں اچھا اضافہ ہے کیا اچھا ہوتا اگر وہ شیخ چاند کی "سودا" کو مشعل راہ بنا کر اس کام کو آگے بڑھاتے!

(بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر ۲۲ سے آگے) اس وجہ سے مشق سخن کیلئے منتخب کیا کہ یہ ان کے تنقیدی نقطہ نظر پر پوری اترتی تھی اور اسی میں مربوط خیالات اور نصیحت آمیز مضامین کا اظہار ممکن تھا۔ یہ صحیح ہے کہ تنقید کا یہ شعور واضح اور مربوط انداز میں کہیں نظر نہیں آتا بلکہ ان شاعروں نے آغاز کلام میں اپنے فن کے تعلق سے اظہار خیال کیا ہے لیکن یہ بات ہمارے ذہن میں رہنی چاہیئے کہ قدیم اردو تنقید کا یہ دور تذکروں کے آغاز سے بھی پہلے کا ہے۔ جہاں تک ان رجحانات کی افادیت اور اہمیت کا تعلق ہے یہ تذکرہ نگاروں کے تنقیدی شعور سے کہیں زیادہ واضح اور صحت مند ہیں بلکہ حالی نے جن رجحانات کو مقدمہ میں پیش کیا ہے وہ ان رجحانات سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ جو ہمیں قدیم اردو کے منظوم سرمایہ میں ملتے ہیں اسی وجہ سے میں آزاد، شبلی اور حالی کے دور کو اردو تنقید کا تجدیدی دور کہتا ہوں گو یہ تجدید ایجاد کی خوش فہمی کے ساتھ ہوئی ہے۔ دراصل اعلیٰ ذہن ہر دور میں اور ہر جگہ پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرے سے واقف رہنا ضروری نہیں۔ آزاد، شبلی اور حالی قدیم نقادوں کے نظریوں سے واقف تو نہ تھے لیکن ان کے شعور کی لوویں چونکہ ایک ہی سمت میں دوڑتی رہی ہیں اس وجہ سے انھوں نے تنقید کا وہی نظریہ پیش کیا۔ جن پر نصرتی، ابن نشاطی، غواصی، اور وجہی عمل پیرا تھے۔ تنقید کا درمیانی دور بحرانی تھا اس وجہ سے تنقید کا کوئی صحت مند رجحان باقی نہ رہ سکا۔ اس کے نتیجہ میں ادب بھی عفونت میں سنڈاس سے بدتر ہو گیا اور شعر اور قصائد کے اس ناپاک دفتر کو ہم عرصہ تک اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتے رہے۔ حالی کی عظمت اسی میں ہے کہ انھوں نے پوری جرات مندی سے گو توں، بھانڈوں اور طوائفوں کے اس شعری سرمایہ پر کاری ضرب لگائی اور ہمارے ادب کو معنوی اعتبار سے اس سرمایہ سے ملایا جو ہماری غفلت کی وجہ سے خرابیوں کی نذر ہو گیا تھا۔ حالی نے تنقید کے جس شعور کو اپنے طور پر پیش کیا ہے وہ ہمیں قدیم اردو تنقید کو سمجھنے اور واضح کرنے میں بے حد مفید ثابت ہوگا۔ حالی اور قدیم اردو تنقید کا تقابلی جائزہ بھی ایک دلچسپ موضوع ہے ہمارے نقادوں کو اس جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے جو فرق نظر آتا ہے وہ یہی کہ اردو کے ان قدیم شاعروں اور نقادوں کے یہاں تنقید کا شعور موجود تھا لیکن یہ مستقل فن کی صورت حالی کے "مقدمہ" میں اختیار کر لیتا ہے۔ قدیم مثنویاں تنقید کی جھلکیاں پیش کرتی ہیں "مقدمہ" اس شعور کی مردانگی کا نام ہے اسی وجہ سے حالی اپنے متقدمین پر تقدم حاصل کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سید سلیمان حسین

اثر لکھنوی بحیثیت مثنوی نگار

مرزا جعفر علی خاں اثر مرحوم جملہ اصناف سخن پر قادر تھے ذیل میں ان کی صرف دو نظموں پر مختصر گفتگو مقصود ہے جو مثنوی کی شکل میں ہیں (۱) مثنوی مایا (۲) نغمۂ جاوید۔

مایا انگریزی نظم "Laxmi the Goddess of wealth" کا منظوم ترجمہ ہے جو انگریزی میں سنسکرت ادب سے منتقل کیا گیا ہے۔ تعداد اشعار تخمیناً دو سو ہے۔ قصہ مختصر اور سبق آموز ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں مال و منال محض عارضی شے ہے جس کی خواہش انسان کو نہیں کرنا چاہیئے، اور وہ افراد جو دولت کو کسی طرح حاصل کر لیتے ہیں ان کا انجام بڑا عبرت ناک ہوتا ہے۔ اس تمثیل کو اثر مرحوم نے یوں پیش کیا ہے کہ ایک غریب گھر کی دوشیزہ محلوں کے خواب دیکھتی ہے، وہ ایک روز انھیں خیالوں میں گم تھی کہ ادھر سے دولت کی دیوی لکشمی جی کا گزر ہوا وہ مایا کی دلی خواہش معلوم کر کے اسے اپنے ساتھ ایک خاص مقام پر لے گئیں جہاں اسی طرح دوسرے بہت سے دولت کے پجاری جمع ہو کر دیوی کے حضور میں اپنی آرزوئیں پیش کرتے ہیں۔ جنھیں دیوی جی پورا کرتی ہیں چلتے وقت وہ مایا کو بھی ایک انگوٹھی دے جاتی ہیں وہ دن تو یونہی گزر جاتا ہے لیکن رات کی تنہائی میں مایا بہت پریشان ہوتی ہے آخر کسی طرح زمیں کی رگڑ سے اس کی انگوٹھی کا موکل نمودار ہو جاتا ہے جو مایا کو ایک بڑے اور پُر فضا جزیرے میں پہنچا دیتا ہے جہاں پہنچ کر وہ فرطِ مسرت سے جھوم اٹھتی ہے۔ لیکن یہاں بھی رات کی تنہائی میں بہت سراسیمہ و پریشان ہو کر اپنے امیر بننے کی خواہش پہ متاسف ہو کر دیوی جی سے پھر یہی تمنا کرتی ہے کہ اسے اس کے غریب و نادار والدین کے پاس پہنچا دیا جائے جہاں وہ انتہائی عسرت کے باوجود بہت مطمئن تھی۔

قصہ مختصر، سادہ اور غیر دلچسپ ہے لیکن اثر مرحوم نے اسے اپنی قادر الکلامی اور مشاقی سے ایک دلکش اور پُر تاثیر نظم کے قالب میں تبدیل کر دیا ہے ذیل میں نمونے کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ مایا کے دل میں ایوان زرنگار تک پہنچنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، دولت حسن سے مالا مال مایا اپنے حسن ہزار شیوہ پر یوں طعنہ زن ہوتی ہے ؎

دو آنکھوں میں نرگس شہلا بھی مات تھی — اس چشم نیم باز کی کچھ اور بات تھی
اب یہ تھا حال شیشے میں عکس اپنا دیکھ کر — جادو اسی پہ کرتی تھی جادو بھری نظر
اک ٹھنڈی سانس بھر کے وہ گرم سخن ہوئی — حسن ہزار شیوہ پہ یوں طعنہ زن ہوئی
عارض کی شمع کس لیے پروانہ جب نہیں — زنجیر زلف کس لیے دیوانہ جب نہیں

آنکھوں میں نشہ کس لیے تاثیر جب نہیں
کیوں خواب گوں ہیں خواب کی تعبیر جب نہیں

سینہ کہ ایک شور ہے جس میں چھپا ہوا
کس کو سنائے دل کے دھڑکنے کا ماجرا

یہ چہرہ جیسے بدلی سے نکلا ہوا قمر
یہ شاخ گل سا قد یہ لچکتی ہوئی کمر

رنگ ارغوان کا جسے تکتا ہے رشک سے
یہ بانہیں گوری گوری یہ شانے بھرے بھرے

یہ حسن جس پہ چھایا ہے عالم خمار کا
جو گلفروش ہے چمن و لالہ زار کا!!

کیا رائیگاں یہ ہوگا نہیں اے مرے خدا
یا اس کا قدرداں بھی کسی روز آئے گا

پہلوئے تاجدار ہو عزت کے واسطے
ایوان زرنگار حکومت کے واسطے

لکشمی جی کا آسمانی حسن ملاحظہ ہو ؎

وہ جلد جس میں نرمی تھی مخمل کے خواب کی
صندل کی تن میں سانس میں خوشبو گلاب کی

عارض کہ جیسے کھلنے سے پہلے کنول کا پھول
چہرا ہو جس کو چاند کی کرنوں نے بے اصول

بہتی ہوئی وہ زلفِ گرہ گیر الاماں
لہرائی ناگنوں کی وہ زنجیر الاماں

عالم تنہائی میں مایا کی کیفیات ؎

مایا بھٹکتی پھرتی تھی تنہا شکار یاس
غمگیں ناتواں سراسیمہ بد حواس

اپنے کو خاک پہ کھڑے قد سے گرا دیا
آہ و فغاں سے ارض و سما کو ہلا دیا

اندھیری رات میں مایا کی حالت زار ؎

مایا کے جوڑ جوڑ میں پیدا ہوئی ٹھٹھر
صورت نہ نکلی کوئی کہ سردی سے ہو مفر

چٹان ایک شق تھی اسی سے لپٹ گئی
راحت تو خیر یاد مصیبت کی ہٹ گئی

اک آہ دل کو چیرتی منہ سے نکل گئی
ڈھیلی گرفت ہو گئی گردن بھی ڈھل گئی

صبح کا منظر ——

لی ٹھنڈی سانس صبح نے بادِ صبا چلی
نکہت لٹاتی دلبر شیریں ادا چلی

آویزہ گل کے گوش میں شبنم کا دیکھ کر
طائر چہک کے گانے لگے شاخسار پر

گھاٹی جو مسکرائی تو چٹکی کلی کلی
پہلے تو کچھ سجائی پھر آغوش کھول دی

پھولوں کا تاج سر پہ دکھا کے بہار نے
آشیر باد چشمے کو دی آبشار نے

نظارہ موج نور تھا ضو دیتی تھی نظر
چھلکی ہو جیسے چاندنی چاندی کی نہر پہ

دولت کا ایک حریص جواں 'دیوی' کے حضور میں حاضر ہوتا ہے، اس کا حلیہ بھی ملاحظہ ہو ؎

آیا حضور ملکہ پھر اک جنگجو جواں
سینے کو تانے دیتا ہوا نیزے کو تکاں

تصویر اژدہے کی تھی اس کے خود پہ
شعلہ زباں دراز تھا کرتا جگر کو
ضو دے رہی تھی اس کی زرہ کی کڑی کڑی
چتون کڑی کڑی تھی تو بولی کھری کھری
منت نہ التجا نہ نمسکار اور نہ جے
دیوی سے یوں خطاب کہ بس لڑنے ہی کو ہے

بوڑھے حریص کا نقشہ ـــــ

بوڑھا حریص آگے بڑھا ضعف سے نڈھال
رعشہ بدن میں آنکھیں دھنسی لڑکھڑائی چال
کپڑوں کے بدلے چیتھڑے تن سے لگے ہوئے
صندوق بھاری باندھے تھا اس پر بھی پیٹھ سے
گھٹنوں سے ہاتھ ٹیک کے دیوی سے یہ کہا
سونے سے اسکو بھر دے بھکاری ہوں میں ترا

اختر ملکھنوی نے غزل کے علاوہ جدید نظمیں لکھنے کی مشق انگریزی و فرانسیسی زبانوں کی نظموں کے ترجموں سے بہم پہنچائی' لیکن ان کی اس نظم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ نہیں بلکہ ایک طبع زاد نظم معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے تمام قصہ نہایت ربط و تسلسل سلاست و صفائی کے ساتھ نظم کیا ہے اور اختصار کے باوجود مثنوی نگاری کے تمام ضروری لوازم کو بڑی مشاقی سے پورا کیا ہے نرم و شیریں زبان' اچھوتے اشعار اور لطیف تشبیہوں نے اس نفیس نظم کا پایہ اتنا بلند کر دیا ہے کہ اسے دورِ جدید کی مثنویوں میں اونچا مقام ملنا چاہیے۔

مثنوی نغمہ جاوید: — نغمۂ جاوید اختر مرحوم کی زندہ جاوید تخلیق ہے۔ یہ شری مد بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ ہے' لیکن یہ دوسرے ترجموں کی طرح محض لفظی نہیں' بلکہ دنیائے ادب میں پہلی بڑی کوشش ہے جس میں گیتا کے حکیمانہ مضامین' فلسفیانہ رموز اور ان کی تفسیریں ادبی حسن کے ساتھ پیش کی گئی ہیں اور ترجمہ اتنی کاوش سے کیا گیا ہے کہ اصل کی تمام رعنائیاں اور دلفریبیاں اس میں سموگئی ہیں۔

مثنوی کی شانِ نزول خود مصنف کی زبانی سنیے "۱۹۴۶ء کے موسم بہار میں دوران قیام سری نگر (کشمیر) لالا حویلی رام صاحب چیف سکریٹری ریاست جموں و کشمیر نے جن سے اکثر علمی و ادبی گفتگو ہوا کرتی تھی برسبیل تذکرہ کہا کہ اگر گیتا کے فلاں ادھیائے کا اردو میں ترجمہ کرو تو بہت اچھا ہو' میں نے اپنے عجز کا اظہار کیا' بات آئی گئی ہوئی' ایک دن گیتا پڑھ رہا تھا کہ لالا صاحب کی فرمائش کا دھیان آیا' اس وقت تک بھول چکا تھا کہ کس ادھیائے کے ترجمے کو کہا تھا' پہلے ادھیائے سے ابتدا کی' توفیق ہوئی اور شعر نکلنے لگے' اگر حافظہ غلطی نہیں کرتا تو پہلا ادھیائے۔ ایک ہی نشست میں ختم ہو گیا' اسی کے ساتھ یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ آگے بڑھ کر بعض مقامات ایسے آئے کہ گھنٹوں سر کھپانے پر بھی ایک مصرعہ موزوں نہ ہوتا تھا لیکن پھر سرچشمۂ فیض جاری ہو جاتا اور میں بقدرِ ظرف سیراب ہوتا' مجھے سات ہفتوں میں ترجمہ ختم ہو گیا۔"

نغمۂ جاوید میں تخمیناً دو ہزار اشعار ہیں لیکن اختر صاحب نے مجھے ۱۹۶۳ء میں فرمایا تھا کہ انھوں نے اس میں مزید اضافے کیے ہیں۔ مثنوی ۱۸ ابواب میں منقسم ہے ہر باب ایک خاص یوگ کے نام سے موسوم ہے جس میں اس یوگ کی تفسیر

شری کرشن جی کی زبانی پیش کی گئی ہے۔ مثلاً ودیا سر سمپت یوگ میں انسانی صفات یوں بیان کئے گئے ہیں ؎

بتاتا ہوں انساں کے اب وہ صفات — کہ ملتی ہے جن سے دوامی نجات
نڈر پن، وفا و صفا، و حیا — دلِ پاک اور مشغلہ علم کا
سخی۔ لذتِ نفس سے سادہ بھی — خدا ترس بھی راست گفتار بھی
جو ہے منکسر اور نیکو شعار — مگر اس کے با وصف ہے بردبار
کسی کو جو آزار دیتا نہیں — جو اوروں کا احسان لیتا نہیں
جو مدِ نظر رکھتا ہے اعتدال — غم و غصہ و ہو شدلی یا ملال
نہیں اس کو پروا کچھ ان چیزوں کی — جو اوروں کی ہیں وجہ آسودگی
نہیں خوردہ گیری کی عادت جسے — مروت جسے ہے مودت جسے
کریں خواہشیں مضطرب کیا مجال — خود ان کو ہو اس کے عوض انفعال
بلند اس کی ہمت ہے فرزانہ ہے — خیالات باطل سے بیگانہ ہے
عدو سے نہیں خواہش انتقام — نہیں خود ستائی یہ مبنی کلام
میسر ہوں اوصاف بالا اگر — تو زیبا ہے نازاں ہو جتنا بشر

سری کرشن جی نے عمل کی تعلیم دی ہے وہ بے عملی کو کفر سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپکا فرمانا ہے کہ عمل کو فرض جان کر پورا کرنا چاہیئے اور اس سے کسی قسم کے فائدہ کی امید نہ رکھنا چاہیئے گیان یوگ کے سلسلے میں عمل کی تعلیم یوں دی گئی ہے ؎

عمل کے ہو میدان میں گامزن — یہی تھا بزرگوں کا تیرے چلن
جو کہتا ہوں اب سن اسے دھیان سے — عمل ہوتے ہیں تین اقسام کے
روا نا روا۔ نفی ان دونوں کی — کٹھن راہ آساں نہیں آگہی
سکوں کام میں کام میں ہے سکوں — حقیقت بس اتنی ہے باقی فسوں
جو یوں کام کرنے پہ مائل ہوا — وہی اس طریقے میں کامل ہوا
سمجھ لے کہ سچ کا ہوا انکشاف — جب اضداد کا مٹ گیا اختلاف

جو شخص صحیح طریق عمل اختیار کرتا ہے اس کی نسبت فرماتے ہیں ؎

غرض آرزو کی وہ رکھتا نہیں — یہ خار اس کے دل میں کھٹکتا نہیں
غرض کوئی شامل نہیں کام میں — جو شعلے عمل اس کے آرام میں
قناعت سے دل اس کا بھرتا نہیں — کسی پہ بھروسہ وہ کرتا نہیں

عمل سے توقع ثمر کی نہیں   لہذا کبھی مضطرب بھی نہیں
عمل بہر تسکیں ہے کافی اُسے   نہیں کوئی فکر تلافی اُسے

نغمۂ جاوید اردو ادب میں نہایت ہی شستہ و رفتہ ترجمے کا اضافہ ہے جس کے مطالعہ سے حضرت اثر مرحوم کی بے پناہ قوت نظم کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس میں بھگوت گیتا کے حکیمانہ رموز اور سنسکرت شاعری کی روح فضا اور ادبی لطافتیں اس خوبی سے ترجمہ کی گئی ہیں کہ یہ شبہہ تک نہیں ہوتا کہ یہ کسی دوسری زبان کا ترجمہ ہے۔

اثر مرحوم کی مشاقی اور قادر الکلامی کا اندازہ ان مقامات پر ہوتا ہے جہاں انھوں نے گیتا کے بعض ایسے نکات جن کی تفسیر و تشریح کے لیے بڑی بڑی کتابوں کی ضرورت تھی چند اشعار میں بڑی خوبی سے پیش کر دیئے ہیں۔

مثنوی کی زبان سادہ سلیس اور بامحاورہ ہے۔ سنسکرت کے اسمار اور بعض ٹھیٹ ہندی الفاظ کے استعمال کے باوجود کہیں بھی روانی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے ان تمام محاسن نے مثنوی کا درجہ اتنا بلند کر دیا ہے کہ اس کا شمار اردو ادب کی بے نظیر مثنویوں میں کیا جائے گا۔

ان مثنویوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت اثر مرحوم کو بیانیہ شاعری پر اسی طرح قدرت حاصل ہے جس طرح صنف غزل پر۔ اثر کا شمار دورِ جدید کے چند ممتاز مثنوی نگاروں میں کیا جائے گا۔

ایک درخواست: — پچھلے برس کی طرح اس برس بھی میں ۱۹۶۷ء کی بہترین مطبوعہ شاعری مرتب کر رہا ہوں جو ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ دلی سے اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی شائع ہو گی۔ شاعر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ سنہ ۱۹۶۷ء میں شائع شدہ اپنی بہترین تخلیق مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں اور جس رسالے یا اخبار میں وہ تخلیق شائع ہوئی ہو اس کا حوالہ ضرور دیں۔

پتہ: پرکاش پنڈت، $\frac{1582}{3A}$ انوین شاہراہ، دلی ۳۲

طیب انصاری

قدیم اردو تنقید

ولی تا حالی اردو ادب کا حال برابر ادھا ہے۔ سیاسی انتشار کے پھیلتے ہی سماجی گندگیاں ابھر کر سامنے آگئیں اخلاقی قدریں بے نقاب ہوئیں معاشی صورتِ حال دگرگوں ہو گئی اور تہذیبی خرافات عریاں ہوئے یہ سب نتیجہ تھا ذہنی بے راہ روی اور گمراہی کا ہندوستان اس مدت میں ظلمت کدہ بن گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں جو ادب پیدا ہوا لسانی اعتبار سے ارتقاء پذیر سہی لیکن فکری لحاظ انحطاط گشتہ اور خطرناک تھا۔ پریشلی نے فن کی زندگی کے لئے افیون کی ضرورت محسوس کی تھی اردو غزل نے اپنے اظہار اور معنی کے ذریعہ حصول مسرت کے جو ساماں بہم پہنچائے اس میں افیون کا نشہ نہیں زہر کا اثر موجود تھا۔ غزل ہماری بے ربط اور بے ہنگام فکر کی شہکار ہے۔ اس کو ادب میں زندہ رکھنا چاہیئے تاکہ ہم اس کو دیکھ دیکھ کر عبرت حاصل کرتے رہیں! پہلے پہل آزاد، شبلی اور حالی نے اس بورژوائی صنف سخن کے خلاف بغاوت کی تو ہوشمندوں نے اس آواز کو اور بھی اونچا کیا لیکن جو لوگ دارفتۂ غزل تھے۔ اپنے ذہن اور مزاج کی وجہ سے چراغ پا ہو گئے۔ دراصل غزل کی مخالفت رائج الوقت تنقیدی شعور کے خلاف عظیم جہاد تھی حالی نے ادب میں تنقید کے جن نئے رجحانات سے روشناس کرایا ہے ان کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے آج بھی ہم نئے رجحان کا بانی انہیں کو ٹھہراتے ہیں۔ اس میں حالی کی کوششوں کا جہاں دخل ہے وہیں ایک دوسری وجہ بھی ہے میرا مطلب حالی اردو تنقید کے جدید رجحانات کے موجد نہیں بلکہ مجتہد ہیں۔ انھوں نے آزاد، ہالرائڈ اور سرسید کے زیر اثر اردو ادب میں نئے رجحانات اور اقدار کو پیش کیا ہے یہ سمجھ کر کہ پہلی بار ادب ان اصولوں اور قدروں سے روشناس ہو رہا ہے انھوں نے ایسا سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن ہم اپنی لاعلمی کی وجہ سے ایسا ضرور سمجھتے ہیں اس لاعلمی کی سب سے بڑی وجہ اردو کے اس قدیم سرمایہ کا نظروں سے اوجھل رہنا ہے جس میں وہ سارے رجحانات ملتے ہیں جو بعد کو حالی نے ان سے استفادہ کئے بغیر اردو ادب میں پیش کئے ہیں قدیم اردو تنقیدی سرمایہ کی روشنی میں اب حالی کی حیثیت ایک مجتہد کی ہے موجد کی نہیں ان باتوں کے اظہار کا مقصد حالی کے منصب میں کمی کرنا نہیں بلکہ ایک حقیقتِ حال کا اظہار ہے۔

تاریخ اردو تنقید میں حالی، شبلی اور آزاد کے دور کو ہم دوسرا دور کہتے رہے ہیں۔ قدیم سرمایہ کے سامنے آجانے کے بعد اب اس کو ہماری تنقید کا تیسرا دور رکھنا چاہیئے یعنی (۱) قدیم اردو تنقید کا دور (۲) تذکروں کی تنقید کا دور (۳) تجدیدی اصلاح کا دور اور (۴) جدید یا سائنٹفک تنقید کا دور۔

قدیم اردو تنقید کا مطالعہ ہمیں روم کے لاطینی ادب کے دور کی یاد دلاتا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے نظریات کے

زیر اثر لاطینی ادب میں دورِ بلاغت کا آغاز ہوا۔ افلاطون نے شعراء کی بے راہ روی اور بے تکے پن کی وجہ سے چاہا کہ اپنی تصوراتی ریاست سے شعراء کو باہر نکال دیا جائے لیکن ارسطو نے ان کی بازآبادکاری پر زور دیا اس ترمیم کے ساتھ کہ اسٹائل بہ موضوع کے لحاظ سے تبدیلی ہونی چاہیئے۔ ہوریس اپنے وقت کا بڑا خطیب تھا اس نے خطابت کے اجزاء سے بحث کی ہے جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس نے ارسطو کے خیالات میں اضافہ نہیں کیا البتہ اس کا ایک جملہ نقادوں کو چونکا دیتا ہے (to Poetry aims at to instruct or delight or both) یعنی شاعری مقصد سکھانا یا مسرت بخشنا یا پھر دونوں ہی ہے۔ اب شاعری صرف حصول مسرت اور اظہار خیال کا ذریعہ ہی نہ رہی۔ اس میں افادیت کا ہلکا سا تصور سکھانے کے انداز میں داخل ہو گیا اور شاعری یہ کام لانگی نس کے الفاظ میں عظیم جذبات اور عظیم تصورات کے ذریعہ انجام دیتی ہے بلکن وہ اظہار خیال میں ارسطو سے قریب نہیں ہے اس کا مزاج ہوریس کے ذہن سے قریب تر تھا اس لئے وہ بلاغت اور ندرت کی بات کرتا ہے اس کے نزدیک وہی ادب اعلیٰ اور ارفع ہے جس میں عظیم جذبات اور عظیم تصورات تو ہوں لیکن جہاں صنائع بدائع، فرہنگ اور تنظیم پر بھی اہمیت دی جاتی ہو ادب کے اس نقطہ نظر میں عظیم انقلاب (Devine comedy) طربیہ خداوندی نے برپا کر دیا۔ دانتے سے خداوندانِ سیاست نے سوال کیا

"تم جنت میں جانا چاہتے ہو یا جہنم میں؟"

"میں جہنم میں جانا پسند کروں گا"۔ اس نے جواب دیا "میں جہنم میں جاؤں گا جہاں شاعر ہوں گے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہاں میری محبوبہ بھی ہوگی" اس جواب سے چرچ کی دیواریں ہل گئیں۔ لاطینی کلاسیک کا خاتمہ بھی ہوا اور ایک نئے دور کا آغاز بھی جو تاریخ ادب میں نشاۃ ثانیہ کہلاتا ہے۔ دانتے کا شعور کہیں زیادہ پختہ تھا وہ جانتا تھا کہ لاطینی کلاسیک کا رجحان [illegible] نہیں البتہ وہ ورناکلر زبان اس زبان کو زیادہ اہمیت دیتا ہے جو عوامی ہوتے ہوئے بھی شاندار (وقیع) ہو۔ ارسطو نے موضوع پر بھی توجہ کرنے کی دعوت دی تھی لیکن دانتے نے اس پر زیادہ زور دینے پر اصرار کیا۔ دراصل دانتے سے لیکر کولرج اور ورڈزورتھ تک کا دور (سترھویں صدی عیسوی) موضوع اور اسٹائل کی باہمی کشمکش کا دور ہے۔ تقریباً سولھویں صدی عیسوی میں اردو ادب اسی کشمکش میں مبتلا رہا ہے۔ لانگی نس نے عظیم جذبات اور عظیم تصورات کی بات کہی تھی۔ یہی بات ابن نشاطی (پھول بن) نے اس سے ایک صدی قبل ہی کہی ہے اس کا کہنا ہے کہ اگر شعر میں "نصیحت" نہ ہو تو اس میں کم از کم "صنعت" تو ہو۔ اگر شعر میں نصیحت ہو نہ صنعت تو ایسا شعر ہیچ ہے۔ قدیم ادب میں ابن نشاطی ندرت اور جدت کے ساتھ ساتھ شوکت الفاظ پر بھی زور دیتا ہے۔ محاورے اور استعارے کا استعمال ایسا ہی ضروری ہے جیسے ہوریس اور لانگی نس کے یہاں۔ لیکن نصرتی اور وجہی ایسے شاعر ہیں جنھوں نے سادگی اور اصلیت پر زور دیا ہے۔ یہ ذہنی طور پر دانتے کولرج اور ورڈزورتھ سے قریب تر ہیں شاید اسی وجہ سے ورڈزورتھ کی رومانی شاعری نصرتی کی عشقیہ شاعری سے زیادہ ملتی جلتی ہے۔

اُردو کے اس قدیم دور میں تنقید کا شعور موجود تھا لیکن یہ فن نہیں تھا۔ یہ شعور عوام میں تھا اور خود شاعروں میں بہت زیادہ

دونوں شعور کی بنیاد پر ایک دوسرے کی شاعری کی فنی اور فکری صلاحیتوں کا اقرار و انکار کرتے ہیں۔ بلکہ قطب شاہی عہد میں قدیم اُردو کا ایک دبستان بھی بن گیا تھا جہاں فن و زبان کی خاص تعلیم و تربیت ہوا کرتی تھی۔

قطب الدین قادری جو فیروز بیدری کے نام سے اُردو ادب میں شہرت عام اور بقائے دوام کا مالک ہے اور ڈاکٹر مسعود حسین کے الفاظ میں استادِ دبستان گولکنڈہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ فیروز اور محمود بیدری دور ہی میں اساتذہ کا رتبہ حاصل کر چکے تھے یہی کچھ حال بیجاپور کا تھا۔ بیجاپور جغرافیائی اور تہذیبی اسباب و علل کی وجہ سے گولکنڈہ سے مختلف رہا ہے یعنی یہاں زبانِ اُردو گجراتی اثرات کی وجہ سے زیادہ بدلتی رہی ہے۔ گولکنڈہ میں قدیم اُردو اتنی تیزی سے نہیں بدلتی جتنی بیجاپور میں بلکہ یہاں اسلوب بھی بدل گیا۔ زبان میں گجراتی الفاظ کو شامل ہو گئے تھے اسلوب بھی "گجری" کہلایا۔ اس سلسلے میں ابراہیم عادل شاہ کا "نورس نامہ" بہترین ثبوت ہے۔ لسانی حیثیت سے بیجاپور گولکنڈہ سے الگ روش اختیار کرتا ہے جہاں تک ہیئت کا سوال ہے دونوں ہی جگہ مثنوی کا رواج عام رہا ہے۔ دوسری بات جو بیجاپوری ادب کو گولکنڈوی ادب سے ممتاز کرتی ہے وہ موضوع ہے موضوع کا تنوع بیجاپوری ادب کی برتری کو ثابت کرتا ہے۔ اُردو ادب کا باکمال شاعر جس کی مثال حالیؔ کے دور تک ملنی مشکل ہے وہ نصرتیؔ ہے۔ نصرتی کیا بلحاظ فن اور کیا بلحاظ موضوع اُردو شاعری میں اونچا مقام رکھتا ہے اور اس کی یہ امتیازی شان علی نامہ اور تاریخ اسکندری کی وجہ سے قائم ہے۔ علی نامہ اور تاریخ اسکندری کہنے کو تو قصیدے ہیں لیکن یہ اپنے دور کی مکمل اور جامع منظوم تاریخ بھی ہیں۔ ان تصانیف میں مصنف کی انسان دوستی کا پتہ چلتا ہے۔ جنگ اور تباہی سے نفرت کے جذبات ملتے ہیں۔ مذہبی اور جغرافیائی تعصب کے خلاف غم و غصہ کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ آج کے جدید تنقیدی نقطۂ نظر سے ان تصانیف کی پرکھ کی جا سکتی ہے۔ جس سے ان کی عظمت کے تعین میں مدد ملے گی۔

آرنلڈ نے ادب کو تنقید حیات کہا ہے۔ اس تنقید حیات کا یہ شاہکار کارنامے ہیں۔ ایلیٹ کے نزدیک کلاسیکی ادب فنی اور معاشرتی اعتبار سے مکمل دور میں پیدا ہوتا ہے۔ نصرتیؔ کے یہ معرکۃ الآرا کارنامے اس تکمیل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ کارنامے کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر وجود میں نہیں آئے ان کے پیچھے شاعر کا شعور بھی کارفرما ہے۔ بڑا شاعر وہی ہوتا ہے جو تنقید کا شعور بھی رکھتا ہے۔ نصرتیؔ کے اسی تنقیدی شعور نے قدیم اردو کو دو بڑی کلاسیکس سے سرفراز کیا ہے۔

کہنے کو تو گولکنڈہ لسانی اختلاط سے محفوظ رہا لیکن فن کے جواہر پارے یہاں بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نصرتیؔ کا سا باکمال شاعر پیدا نہ ہوا کہ جسے مغلیہ دربار سے ملک الشعرا کا خطاب ملتا لیکن وجہی ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے تاریخ ادب اردو میں اجرام مہر کی طرح چمکا ہے۔ قطب مشتری (حسن لیلےٰ) اور سب رس (نثری کارنامہ) اس کی فنی بزرگی کو منوانے کیلئے کافی ہیں۔ بلاشبہ علی نامہ اور تاریخ اسکندری کی طرح اس کا کوئی کارنامہ نہیں لیکن سب رس میں جن افکار و خیالات کا اظہار اس نے کیا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ وجہی ایک باشعور شاعر تھا اس کے یہاں ادب کا واضح تصور ملتا ہے اور اس تصور کو اس نے قطب مشتری میں بعنوان "در شرح شعر گوید" کے طور پر پیش کیا ہے۔ وجہیؔ نے "سب رس" کے ذریعہ بحیثیت نثر نگار اپنے تقدم کو منوا لیا ہے۔ اس نے "در شرح شعر" لکھ کر

اجتماعیت کاس ... نقد و نظر کے اولین نقوش بھی ملتے ہیں۔ جس طرح نثر اور تنقید کی تاریخ کا آغاز وجہی سے ہوتا ہے۔ وجہی ہمارا پہلا ادیب ہے [illegible] کہلائے گا۔ وجہی کلام میں ربط کا قائل ہے۔ لفظ اور معنی میں ربط ہو۔ سلاست اور فکر و بیان میں نزاکت کو ضروری سمجھتا ہے اس کے نزدیک خام اور ہیئت دونوں ہی اہم ہیں۔

دیکھ شعر کے فن میں مشکل اچھے
کہ لفظ ہور معنی یو سب مل اچھے

"لفظ ہور معنی کے بغیر ادب کا تصور بے معنی ہے وہ لاگی نس کی طرح ندرت فکر اور جدت خیال پر بھی زور دیتا ہے تقلید اور لگے ہوئے خیالات کو دہرانا معیوب سمجھتا ہے۔

نکو بول مضمون توں ہور کا !
کہ کالا ہے دو جگ میں موں چور کا

لیکن اساتذہ کی پیروی جرم نہیں کم از کم وہ الفاظ کے معاملہ میں اساتذہ کی تقلید ضروری سمجھتا ہے۔ شاعری کا فن یہ ہے کہ لفظ چنا ہوا ہو اور بہ اعتبار معنی بلند ہو کیونکہ معنی کا حسن بیان کے حسن سے بڑھ جاتا ہے اور پھر وہ معنی پر زور دینے کے بعد حسن بیان پر اصرار کرتا ہے۔ وجہی قدیم ادب میں دور بلاغت کا بانی ہے۔

غواصی وجدان شعری کو تخلیق شعر کا موجب قرار دیتا ہے۔ شاعری میں مضامین کے تنوع پر زور دیتا ہے اسی وجہ سے وہ ریاضت کو ضروری سمجھتا ہے۔ وجہی کی طرح غواصی بھی "نعمت" اور "صنعت" کی اہمیت کا اقرار کرتا ہے۔ دراصل اس کے نزدیک ادب نعمت اور صنعت کا حسین امتزاج ہے ادب کا یہی جامع تصور تقریباً ہر قدیم شاعر کے یہاں نظر آتا ہے۔

ابن نشاطی موضوع سے زیادہ فن پر زور دیتا ہے۔ کہتا ہے فن پر محنت کرنی چاہیئے۔ ایک ایک لفظ کو ایسا بٹھانا چاہیے جیسے نگینہ۔ شعر اس کے ہاں خیر بھی ہے اور حکمت بھی اور شاعری فہم (تخیل) اور سنگاری (فن) کا کام ہے ابن نشاطی شاعری میں انداز اور اسلوب کی تازگی تلاش کرتا ہے۔

ملک الشعرا نصرتی شاعری کو اکتسابی نہیں الہامی سمجھتا ہے۔ کسب سے یہ موتی ہاتھ نہیں لگتا یہاں تو مضامین غیب سے آتے ہیں لیکن یہ مضامین تکیہ کے نیچے سے نہیں ریاضت کی وجہ سے تخلیق پاتے ہیں بغیر محنت کے شاعری میں کمال پیدا نہیں ہوتا الفاظ کی تراش خراش پر نظر رکھنی چاہیئے۔ الفاظ کا برمحل استعمال ہونا چاہیئے اور شاعری کا کمال یہ ہے کہ اس میں حسن بیان بھی ہو اور حسن معنی بھی اسی وجہ سے شاعری اس کے ہاں نازک فن بن گئی۔ وہ شاعری میں باقاعدگی اور نظم و ترتیب کا اہتمام کرتا ہے علی نامہ میں نصرتی ارسطو سے قریب ہو جاتا ہے جب وہ کہتا ہے شاعری کا کام کامیابی سے نقل کرنا ہے۔ جذبات کی [illegible] کرنی چاہیئے کہ سننے والے کے اندر وہی جذبات پیدا ہوں فصاحت شعر کے جسد کی آرائش اور مضمون شعر کی جان ہے نصرتی نے تنقید کے جس معیار کو پیش کیا ہے۔ اس کو عملی صورت بھی دی ہے۔ مثنوی گلشن عشق، علی نامہ اور تاریخ اسکندری اس کی [illegible] اور حسن بیان کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ نصرتی ہی پہلا نقاد شاعر ہے جس نے شاید پہلی بار واضح طور پر کہا کہ شعر سے [illegible] چاہیے۔ علی نامہ اور تاریخ اسکندری نصرتی کے معیار فن پر پورے اترتے ہیں۔ نصرتی ہمارا نقاد شاعر ہے [illegible]

وہ یکا مذہبی انسان ہے لیکن مذہب کی بنیاد پر فساد کو برا سمجھتا ہے اسی وجہ سے وہ سیوا جی کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کرتا کیونکہ اس کی وجہ سے ملک کا امن وامان جاتا رہا اور سب سے پہلے اسی کی وجہ سے مذہب کی بنیاد پر لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ نصرتی محب وطن شاعر ہے اور جب اورنگ زیب کو دکن پر حملہ آور دیکھتا ہے تو بچین اٹھتا ہے وہ عادل شاہی دور حکومت کا پروردہ تو ہے لیکن اس پر شاہ پرستی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ تاریخ اسکندری میں اس نے غریب رعایا کی مصیبتوں اور جنگ کی تباہیوں کا درد انگیز نقشہ کھینچا ہے۔ نصرتی دراصل انسان دوست شاعر تھا اس کو اپنے وطن سے پیار تھا وہ اپنے لوگوں سے محبت کرتا تھا چونکہ عادل شاہی فرماں رواؤں نے ملک میں امن وامان قائم کر رکھا تھا اس وجہ سے ان کی قصیدہ خوانی میں پیچھے نہ رہا۔ نصرتی اپنے زمانے سے آگے تھا اس نے شاعری میں بھی اس نے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو پیش کیا۔ واقعی اگر ادب اپنے زمانہ کی تاریخ ہوتا ہے تو نصرتی نے جو شعری سرمایہ چھوڑا ہے وہ تاریخ بھی ہے اور تاریخ کا ورثہ بھی ہماری اس سے قدیم اردو ادب کا مرتبہ بے حد بلند ہوتا ہے۔

"یوسف و زلیخا" کا مصنف ہاشمی بھی ابن نشاطی کی طرح سلاست کو اعلیٰ شاعری کی خصوصیت بتاتا ہے۔ اس کے ہاں بھی وجدان شعری کے بغیر اعلیٰ شاعری کی تخلیق ممکن نہیں۔ وہ شدت احساس پر بھی زور دیتا ہے۔ ہاشمی دکنی اقتدار کا آخری شاعر ہے۔ زوال بیجاپور کے ساتھ ہی قدیم دور کا تقریباً خاتمہ ہو جاتا ہے اور ہاشمی کے دور سے لیکر ولی تک دکن میں سیاسی بحران کی وجہ سے کوئی قابل لحاظ اور معیاری ادب کی تخلیق نہ ہو سکی اس وجہ سے ہاشمی کے بعد بحرانی دور کے دیگر شاعروں کے یہاں تنقیدی رجحان نظر نہیں آتا۔ اس پورے دور کے تنقیدی رجحانات کا جائزہ لیا جائے تو چند حقائق واضح طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ دبستان لکھنو کے شاعر اور اساتذہ اس بات کے قائل تھے کہ " سند اردو از گفتگوئے ملک و امراء و حواشی و حضار شان جستن میہاست " لیکن دانتے کی طرح " دکھنی ادیب عوام کی ٹکسال سے کھرے سکے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے ہیں انھیں کی بول چال، ٹھیٹھ دیسی محاورے، ضرب الامثال، استعارے اور تشبیہات کو نگینوں کی طرح جڑتے اور عروس ادب کو سنوارتے ہیں وہ عوام کی بول چال کے الفاظ اور محاوروں کو بلا جھجک شعر میں باندھتے تھے۔ اور فصیح اور غیر فصیح کے جھگڑے میں پڑ کر زبان کو ادبی اور غیر ادبی کے خانوں میں نہیں بانٹتے تھے ان کے ہاں ادب کی زبان بھی وہی تھی جو عوام کی روزمرہ بول چال کی زبان ہے علاوہ وہ تشبیہوں اور استعاروں کو بھی کرتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ تنقیدی رجحان ہے جس نے قدیم ادب کو وقیع، جاندار، توانا، مفید اور لافانی بنا دیا۔ قدیم ادب افادیت پسند ہے اور یہ صنعت گری کا شاہکار بھی ہے۔ یہ متوازن نظر و نقد کا اعلیٰ عملی نمونہ ہے۔

ادب اور اخلاق کا رشتہ بڑا نازک رشتہ ہے۔ آج یہ رشتہ ادب میں نزاعی مسئلہ بن گیا ہے لیکن قدیم اردو تنقید کے اس سرمایہ پر جو "سب رس"، "قطب مشتری"، "سیف الملوک بدیع الجمال"، "پھول بن"، "علی نامہ" اور "یوسف و زلیخا" پر مشتمل ہے نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ قدیم نقادوں نے اپنے فن میں اخلاق کو بنیادی اور اہم جگہ دی ہے۔ چنانچہ ابن نشاطی شعر کو خیر و حکمت کہتا ہے۔ خواصی نصیحت کو اہمیت دیتا ہے کو شاعری کا جوہر سمجھتا ہے اور نصرتی کے ہاں شعر کا سوسائٹی کیلئے مفید ہونا لازمی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم اردو شاعری کی جو حیثیت چلی آتی تھی وہ محض فارسی کی نقل نہیں بلکہ ہیئت کے اعتبار سے اس کا اوج تا حال قابل ہے مثنوی کی ... [illegible]

(باقی صفحہ نمبر ۲۳ پر)

امام الفن اُستاد حضرت جلیلؔ

(مجلہ عثمانیہ ۱۹۶۷ء کے ایک مضمون کے جواب میں)

اُردو ادب میں تنقید کی عمر اگرچہ بہت کم ہے لیکن خدا رکھے تنقید نگاروں کی کمی نہیں۔ آج ادیب کم اور تنقید نگار زیادہ ہیں پہلے سنتے تھے کہ بگڑا ہوا شاعر ناقد بن جاتا ہے آج دیکھتے ہیں کہ غیر شاعر بھی تنقید نگار بنکر نہ صرف ہمعصروں پر بلکہ اساتذۂ سخن پر بھی بے جھجک اپنا قلم اٹھا رہے ہیں۔ مقصد اُن کا صرف یہ ہوتا ہے کہ اُن کا نام کسی بڑی شخصیت کیساتھ منسوب ہو جائے۔ قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا یہ بڑا آسان نسخہ ہے۔

مصطفےٰ کمال صاحب نے ایک ایسے ہی تنقید نگار کا رول ادا کیا ہے اور مجلہ عثمانیہ کے تازہ شمارہ میں جلیل حسن جلیلؔ مانکپوری کے عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے۔

امام الفن فصاحت جنگ جلیلؔ کی متعدد تصنیفات میں تین دواوین قابلِ ذکر ہیں (۱) تاج سخن (۲) جان سخن (۳) رُوحِ سخن یہ تین دیوان تین مختلف رنگ کے ہیں جن سے جلیلؔ کی شاعری کے تین ادوار کی ترجمانی ہوتی ہے چونکہ شاعر ماحول سے علیحدہ رہکر شاعری نہیں کرسکتا اسلئے اِن تینوں دواوین کو انہیں زمانوں کے پس منظر میں جانچا جانا چاہیئے جن میں اُن کی تخلیق ہوئی نہ کہ اُن تینوں کی ایک اکائی بناکر اُن پر رائے زنی کی جائے۔

تاج سخن پہلی مرتبہ ۱۳۲۰ھ میں حیدرآباد دکن میں شایع ہوا۔ یہ غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں بہادر آصفجاہ سادس کا دورِ حکومت تھا اور جلیلؔ کو داغؔ کی جگہ استادی کا شرف بخشا جاچکا تھا (واضح رہے کہ ۱۶ شوال المکرم ۱۳۲۲ھ کو غفران مکان نے ایک فرمان کے ذریعہ جناب جلیلؔ کو اپنی اُستادی کا عہدہ عطا کیا تھا اُن کے انتقال کے بعد آصفِ سابع نے بھی جلیلؔ کو منصبِ استادی سے سرفراز فرمایا۔

کمال صاحب نے اپنے مضمون میں جلیلؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے تاج سخن دیوان اول پر جو کچھ لکھا ہے اس میں سے حسب ذیل تین تنقیدوں کے بارے میں مجھے اظہار خیال کرنا ہے۔ کمال صاحب نے تاج سخن کی تین غزلوں پر اپنے مضمون کے مختلف مقامات پر یوں تنقید کی ہے۔

تنقید (۱) تاج سخن کی شاعری خالص لکھنوی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ حُسن وعشق پر نہایت عموی اور روایتی انداز میں خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ تنقید (۲) اس تاج سخن میں کہیں علوئے تخیل۔ بلند پروازی اور فکر کی گہرائی نہیں ملتی۔ تنقید (۳) [illegible] میں مبتذل خارجی اشعار اور معاملہ بندی کا دفتر ہے کہ جس میں زبان کی چاشنی کے باوجود ایک عریانیت اور سوقیانہ پن [illegible] ہے

تنقید (۱)۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ جلیلؔ کی شاعری کا پہلا دور ابتدائے شاعری سے شروع ہوکر تاج سخن کی اشاعت پر ختم ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جلیلؔ پر امیر مسلط تھے اسلئے اس دیوان کے نمایاں عناصر میں اگر لکھنؤ کے قدیم مروجہ

کے مضامین لیں تو اس میں حیرت کی بات ہی کیا ہے اور اس رنگِ سخن پر مبنی تنقید کی گنجائش ہی کہاں باقی رہتی ہے۔ جلیل کا تعلق لکھنؤ اسکول سے تھا اور وہ خالص لکھنوی شاعر تھے۔ آپ نے لکھنؤ کی شاعری کے آخری جلوے دیکھے اور نوابانِ رامپور کی محفل شعر و سخن میں امیر مینائی کی صحبت بھی حاصل کی اور اُن سے اپنے کمالِ فن کا خراجِ تحسین بھی حاصل کیا۔ جلیل یقیناً قدیم رنگ کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری کا ماحول اسی کا مقتضی تھا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس قدیم شاعری میں جلیل ایک کامیاب شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ کمال صاحب نے تو اپنے بیان کی تائید میں نہ تو کوئی دلیل پیش کی ہے اور نہ کوئی مستند حوالہ دیا ہے۔ لیکن میں اپنے بیان میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گی کہ دورِ حاضر کے ممتاز تنقید نگاروں کی نظر میں جلیل کی قدیم روایتی شاعری کیا درجہ رکھتی ہے۔

کلیم الدین احمد: — جلیل قدیم و جدید رنگ تغزل کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔ اپنے رنگ سے واسطہ رکھتے ہیں اور یہ رنگ قدیم رنگ تغزل کا یادگار ہے۔[۱]

مجنوں گورکھپوری: — جلیل غزل کے روایتی آہنگ کے اُستاد ہیں۔ نکھری ہوئی زبان اور نرم رچی ہوئی موسیقیت اُن کے کلام کی وہ ممتاز خصوصیت ہے جس نے ان کو مقبولِ عام بنا رکھا ہے۔[۲]

نیاز فتحپوری: — ہمکو جلیل کے ذکر میں جدید رجحانات کو نہ دیکھنا چاہیئے بلکہ انھیں کے آرٹ کو سامنے رکھکر فیصلہ کرنا چاہیئے اور اس لحاظ سے ہم کو اُن کا تغزل معیاری چیز نظر آتا ہے۔[۳]

قاضی عبدالغفار: — اپنے اسلوبِ کلام میں حضرت جلیل قدیم سلسلۂ تلمذ کے آخری اُستاد تھے جنکو حیدرآباد کی سرزمین نے اپنی گود میں سمیٹ لیا۔[۴]

مرزا فرحت اللہ بیگ: — شاعری کا جو رنگ قدیم تھا وہ (جلیل) اُس کے اُستاد تھے اور ایسے اُستاد تھے کہ موجودہ زمانے میں اُن کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔[۵]

علی اختر: — جلیل مرحوم اپنے زمانے کے یگانہ روزگار شاعر تھے اور فکر کی وہ کاوش خیالات کی وہ بلندی اور بیان کی وہ رعنائی جو عہدِ قدیم کا امتیاز تھی۔ اُن کے ساتھ ختم ہو گئی۔[۶]

ان اقتباسات سے یہ نکتہ بالکل واضح ہے کہ جلیل کے اپنے رنگ سخن میں اُن کے کمال کا اعتراف سبھی نے کیا ہے اب رہی "خالص لکھنوی رنگ" کی بات تو کمال صاحب کو یہ ثابت کرنا تھا کہ لکھنویت بجائے خود ایک ناپسندیدہ چیز ہے۔

تنقید نمبر ۴، [illegible] میں ہے "تاجِ سخن" کہیں علوئے تخیل۔ بلند پروازی اور فکر کی گہرائی نہیں ملتی۔ اس میں شک نہیں کہ جلیل نے اپنی شاعری کو نہ تو تنقید حیات کا ذریعہ بنایا اور نہ اپنی غزلوں میں نفسیاتی تجربے کئے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا

۱۔ نگار تغزل نمبر ۱۹۳۲ء ۲۔ نگار تغزل نمبر ۱۹۳۲ء ۳۔ نگار تغزل نمبر ۱۹۳۲ء

۴۔ روزنامہ پیام ۳ صفر المظفر ۱۹۴۶ء ۵۔ رہبر دکن ۲ صفر ۱۳۶۵ھ ۶۔ رہبر دکن ۲ صفر ۱۳۶۵ ہجری

درست نہیں کہ ان کے کلام میں تخیل کی بلندی، حقیقت پسندی، نازک خیالی کی مثالیں کم ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو جلیل کس طرح اپنی استادی کا لوہا منوا سکتے۔ درحقیقت تاج سخن کی اشاعت ہی جلیل کی شہرت کیلئے پر پرواز ہوئی اور ان کی استادی کا سکہ دکن سے لیکر لکھنو تک سارے ہندوستان پر بیٹھ گیا۔ ملاحظہ ہو کہ جس دیوان کے متعلق کمال صاحب کا ریمارک دیتا سلبی ہو اس کے بارے میں معاصرین جلیل کیا کہتے ہیں۔ تاج سخن کی اشاعت پر جو منظوم خراج تحسین انہیں ملا اُسکے چند نمونے پیش ہیں

ریاض خیرآبادی۔

جلیل استاد کے تم جانشیں ہو ٭ تمہیں کہتے ہیں ہم استادِ فن بھی
سمجھتا ہے تمہیں سرمایۂ ناز ٭ ریاضِ خوشنوا شیریں سخن بھی
تمہیں سب جانتے ہیں مانتے ہیں ٭ نہ اہل لکھنو۔ اہل دکن بھی[1]

عزیز لکھنوی۔

ناقورۂ ریاضِ سخن حضرت جلیل ٭ سرخیل اہل فضل۔ کمالات انتساب
فہرست اہل فن میں انھیں امتیاز ہے ٭ اُردو ہے انکی ذات سے ہر وقت بہرہ یاب
زندہ ہے اُن کے نام سے نام امیر بھی ٭ ہیں نکتہ سنج۔ نکتہ شناس اور نکتہ یاب[2]

محشر لکھنوی۔

باحسن طبع جلوۂ تازہ گرفتہ است ٭ مجموعۂ کلام سخن سنج بے عدیل
ہر مصرع اش بحسن مضامین نو فزید ٭ ہر شعر او بخوبی تخییل بے مثیل[3]

احسن مارہروی۔

کیا پوچھتے ہو کیوں ہوئی شہرت جلیل کی ٭ خود نام اُن کا ناموری کی دلیل ہے
وہ اپنے فن میں آج ہیں مشہور و مستند ٭ اُنکی ہر ایک طرز سخن بے عدیل ہے
دیوان ہے جلیل کا یا ہے یہ آئینہ ٭ روشن خیالیوں کا جو اپنی کفیل ہے[4]

یہ مشتے نمونہ از خروارے چند استاد تھے جو تاج سخن کی عظمت کا آئینہ ہیں۔ اس کے بعد کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ پھر بھی تاج سخن کے اشعار سے اِس بحث کو مربوط و مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ تاج سخن کی غزلوں میں ایسے اشعار کثرت سے ہیں۔ ان میں بلندیٔ خیال بھی ہے اور نزاکت تخیل بھی۔ یہ شعر تاج سخن ہی کا ہے جس سے اُردو غزل کی آبرو ہے۔

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں ٭ وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

وہ مشہور غزل بھی تاج سخن ہی کی ہے جس کا یہ مطلع ہے ؎

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے ٭ فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے ؛

اور اس غزل کا یہ شعر تو زبان زد خواص و عوام ہے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے ٭ جب تم چلو' زمین چلے' آسمان چلے

---

[1] [2] [3] [4] قطعات تاریخ تاج سخن ۱۳۲۲ ہجری

(۱) ادائے تخیل کے بے شمار اشعار تاج سخن میں قدم قدم پر ملتے ہیں جو ہر طبقہ اور ہر طبقے کے لوگوں کی زبان پر ہیں۔ ان میں آفاقیت بھی ہے تاثر بھی ہے جن سے یہ صاف ظاہر ہے کہ جلیل انسانی نفسیات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ ان شعروں میں نازک خیالی بجائے خود ایک قدر ہے۔ فکر رسا۔ ندرت تشبیہ جلیل کی نزاکت تخیل کے عناصر ہیں۔

نقاب کہتی ہے میں پردۂ قیامت ہوں
اگر یقین نہ ہو دیکھ لو اٹھا کے مجھے

اس ادا سے وہ چلے مستانہ چال
سایہ گھبرا یوں خاک پر لوٹا گیا

یہ رنگ گلاب کی کلی کا
نقشہ ہے کسی کی کمسنی کا

منہ پھیر کے یوں چلی جوانی
یاد آگیا روٹھنا کسی کا

سچ کہا زاہد یہ تو نے زہر قاتل ہے شراب
ہم بھی کہتے تھے یہی جب تک بہار آئی نہ تھی

یہ کون زیر زمیں اس کو گدگداتا ہے
کہ مسکراتی ہوئی ہر کلی نکلتی ہے

مدارِ زندگی ٹھہرا نفس کی آمد و شد پر
ہوا کے زور سے روشن چراغِ بزم ہستی ہے

اے تمنا تجھکو رو دوں شام وصل
آج تو دل سے نکالی جائیگی

تھی عشق و عاشقی کیلئے شرط زندگی
مرنے کے واسطے مجھے جینا ضرور تھا

تنقید (۲) تاج سخن میں مبتذل خارجی اشعار اور معاملہ بندی کا دو مرحلے گا جس میں زبان کی چاشنی کے باوجود ایک عریانیت اور سوقیانہ پن جھلکتا ہے۔

اس تنقید کے ثبوت میں حسب ذیل ۴ شعر کمال صاحب نے منتخب کیے ہیں۔

یہ جو سر نیچے کیے بیٹھے ہیں
جان کتنوں کی لئے بیٹھے ہیں

جان ہم سبزۂ خط پہ دیکر
زہر کے گھونٹ پیے بیٹھے ہیں

واعظو چھیڑو نہ رندوں کو بہت
یہ سمجھ لو کہ پیے بیٹھے ہیں

ہائے پوچھو نہ تصور کے مزے
گود میں تم کو لئے بیٹھے ہیں

ان اشعار کو ذرا غور سے پڑھتے ہی تنقید کے بے معنی اور بے جان ہونے کا ثبوت [illegible] شعر پر اگر اعتراض ہے دوسرا شعر رعایت لفظی کی ایک [illegible] ان تینوں اشعار میں جو مضامین استعمال کیے [illegible] بات [illegible] بیہودہ یا سوقیانہ نہیں۔ یہ تو "خود صیاد دام میں" والا مضمون ہے کہ متذکرہ بالا اشعار کے سمجھنے میں معترض کی سوجھ بوجھ عریاں ہو کر رہ گئی ہے کہ نہ صرف وہ شعر کا مفہوم اور غزل کا مزاج سمجھنے سے قاصر ہیں بلکہ مبتذل سوقیانہ اور عریانیت کی اصطلاحوں سے بھی کما حقہٗ واقف نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف تنقید نگاروں کے پاس جتنا اصطلاحیں تھے سوچے سمجھے مستعار لی ہیں ورنہ اپنے اعتراض کے جواب میں یہ اشعار پیش نہ کرتے

آخری شعر کسی حد تک اُن کے بیان کی تصدیق کرتا ہے لیکن اس قسم کے اشعار صرف جلیل کے یہاں ہی نہیں دہلی اور لکھنؤ کے بہت سے شاعروں کے پاس کم و بیش تھوڑی بہت تلاش کے بعد مل ہی جاتے ہیں۔ ذوقؔ۔ ظفرؔ۔ حسرتؔ موہانی۔ مصحفیؔ۔ جرأتؔ۔ جلالؔ۔ امیرؔ اور داغؔ کا دامن بھی اس سے آلودہ ہے لیکن ان کا تناسب پورے کلام میں بہت کم ہے۔ دو چار مثالیں دیکھ کر اس سے کسی شاعر کے رنگِ سخن یا معیارِ کلام کا تعین کر لینا ادبی تنقید کے منافی ہے اور غلط بھی ہے۔ پھر اس پر کمال صاحب نے مزید کمال یہ کیا ہے کہ جلیلؔ کے اس رنگِ سخن کا داغؔ سے موازنہ کرتے ہوئے یہ لکھ گئے ہیں:۔

داغؔ کی خوبی یہی تھی کہ کھل کھیلنے کے باوجود عریانیت کے مرتکب نہیں ہوئے۔"

مطالعہ کرنے والے یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ دبستان لکھنؤ اور دہلی میں جرأتؔ اور داغؔ کے نام اس تعلق سے زیادہ نمایاں ہیں۔ آبِ حیات کے حوالے سے یہ واقعہ اکثر تذکروں میں لکھا گیا ہے کہ جرأتؔ نے میرؔ سے اپنے کلام کی داد چاہی تو انھوں نے کہا: "تم شعر کہنا کیا جانو اپنے چوما چاٹی کیا کرو۔" بات یہ ہے کہ جرأت نے سب سے پہلے بگڑے ہوئے عام مذاق کی پیروی کی اور ایسا رنگ اختیار کیا جس کی تکمیل متاخرین میں نواب مرزا خاں داغؔ کے ہاتھوں ہوئی۔ ان دونوں میں باعتبار لفظ اور معنی بہت مماثلت اور مشابہت ہے۔

جناب داغؔ دہلوی کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ اپنی تصنیف تاریخ ادب اردو میں یوں رقم طراز ہیں۔

داغؔ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ اربابِ نشاط کے شاعر تھے اور اُن کے اشعار سوقیانہ اور مخربِ اخلاق ہوتے ہیں۔ اُن کے یہاں داخلیت اور متانت بہت کم ہے اور اشعار سوقیانہ اور بازاری ہیں جو اپنے حسن و انداز کو سرِ راہ لیکر بیٹھے ہیں جن کا بوس و کنار اور اختلاط مثل اشیائے بازاری کے خریدا اور بیچا جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے بعض اشعار مہذب کانوں کے سننے کے لائق نہیں ہوتے۔"

کمال صاحب نے جلیلؔ کے مقابل داغؔ کے کھل کھیلنے پر جو پردہ ڈالنا چاہا ہے۔ اس کی حقیقت متذکرہ بالا بیان سے واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ درحقیقت ناقد کا یہ اعتراض جلیل کے کلام پر نہیں۔ داغؔ کے کلام پر عائد ہوتا ہے اور جلیل کی پوزیشن نیازؔ فتحپوری کی درج ذیل تحریر سے اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ سالنامہ نگار ۱۹۴۲ء میں جلیلؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

"اس (لکھنوی) رنگ شاعری میں اضافہ زیادہ نہیں کیا لیکن مشق کر کے اُستادی کا درجہ حاصل کیا گو وہ داغؔ کی طرح بالکل کھل کھیلنے کی طرف کبھی مائل نہ ہوئے۔"

مظفر حنفی

کیا خبر کس کو بری لگ جائے تیری گفتگو
آج کیا یہ سوچ کر خاموش رہ سکتا ہے تو؟

ضبطِ غم کے نام پہ قسمیں بہت کھائیں مگر
آنسوؤں نے آخرش دل کی ڈبو دی آبرو

تشنہ لب امید لے کر تا سحر بیٹھے رہے
رقص میں مخصوص لوگوں تک رہے جام و سبو

فصلِ گل نے چھین لیا پھولوں کو جب اپنا لقب
طنز کرنے آ گئے کانٹے گلوں کے روبرو

ہم نقیبانِ سحر کی بات کیسے مان لیں
ظلمتیں لہرا رہی ہیں اپنا پرچم چار سو

وہ زمانہ ہے کہ آنکھوں میں شرارے چاہئیں
چشمِ گریاں اس طرح کب تک بہائے گی لہو

وقت اچھا ہے پیو بادہ کشو جی کھول کر
شیخ جی مسجد میں ہیں اس وقت مصروفِ وضو

صحنِ گلشن میں ذرا آزاد ہو کر سوچئے
یہ کوئی خوشبو ہے یا جلتی ہوئی کلیوں کی بو

دھجیاں اک دن بکھرنی ہیں جنوں کے ہاتھ سے
اور کچھ دن کیجئے چاکِ گریباں کو رفو

اہلِ مطلب نے ہمیں جی کھول کر دھوکے دیئے
ہم کو اک مدت سے تھی جنسِ وفا کی جستجو

دو نگاہیں بزم میں مل کر نہ دوبارہ ملیں
اک نہایت مضطرب ہے اک نہایت حیلہ جو

اس طرف اے کاش پھر جانا پڑے صیاد کو
وہ رہا میرا نشیمن زیرِ برقِ تند خو

کیا کہیں گے اس حماقت کو کہ ناکامی کے بعد
روکنے بیٹھے ہیں وہ خود رو درختوں کی نمو

لوٹ گلشن میں مچی ہے جل رہا ہے آشیاں
اور گاتی جا رہی ہے عندلیبِ خوش گلو

اے مظفرؔ! وہ تغزل ہے تو میں معذور ہوں
انتہائی حد پہ ملتا ہے جو غزلوں میں غلو

انوار ظہوری

کروٹیں لیتی ہے دل میں اک تمنا ان کہی
آج تک جانے زباں کس مصلحت سے چپ رہی

شوق جب نذرِ جنوں ہو گا تو دیکھا جائے گا
کی بحدِ آرزو پابندیٔ امرو نہی

میرے ذہن و دل پہ کیا گذری یہ اندازہ نہیں
صرف اپنی ذات سے یادوں کو دلچسپی رہی

عمر بھر جاری رہے شوق و طلب کا سلسلہ
دِل کو اب غم سے ارادت ہو تو پھر یوں ہی سہی

پرسشِ حالات کی فرصت کسے اس دور میں
کر لیا کرتا ہوں اپنے آپ کی میں دلدہی

سینکڑوں غزلیں کہیں نظمیں کہیں دوہے کہے
پھر بھی دِل کی بیشتر کیفیتیں ہیں اَن کہی

زندگی پر سایۂ اوہام لہراتا رہا!
ورطۂ حیرت میں صدیوں کی نظر ڈوبی رہی

آدمی ہے آج کس منزل کی جانب گامزن
سوچ میں غلطاں نظر سر در گریباں آگہی

عقل نے ہر منزلِ عرفاں پہ چاہا روک دوں
زیست نامعلوم راہوں کی طرف بڑھتی رہی

اجنبی صحرا میں آ نکلا ہمارا قافلہ
ہے یہی رہبر تو پھر منزل سے اچھی گمرہی

شوق کو رہبر بنا بیٹھی تلاشِ حسن میں
ہے جنوں کی دسترس میں زیست کی ناآگہی

ہر یزید وقت کو ملتا رہا ابنِ زیاد
ایک رُخ حالات کا تاریخ دہراتی رہی

کھیل ابنائے زمن کا جشنِ شمشیر و علم
وقت کے پہلو بہ پہلو خون کی ندی بہی

عقل والوں کو سکھائے میں نے آدابِ حیات
لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں تو دیوانہ سہی

ختم ہے تجھ پر ظہوری عصرِ حاضر کی غزل
تھی مقدر میں دیارِ فکر کی شاہنشہی

سعادت نظیر

(۱)

اب جو بھٹکتے پھرتے ہیں گم سم جگہ جگہ — ڈھونڈو گے ایک روز انھیں تم جگہ جگہ
راہِ وفا میں بڑھتے رہے ہم یقیں کے ساتھ — دیتا رہا فریب توہّم جگہ جگہ
ہم بوند بوند مے کو ترستے ہیں ساقیا — رکھے ہیں میکدے میں بھرے خُم جگہ جگہ
ہر ذرہ محوِ رقص ہے گلشن کا عندلیب — جادو اثر ہے تیرا ترنّم جگہ جگہ
گلزار کیا ہے دشت و دمن بھی ہوں لالہ زار — جب گل فشاں ہو اُن کا تبسّم جگہ جگہ

پہلے تو ایسا حال تمھارا نہ تھا نظیر
پھرتے ہو کھوئے کھوئے سے اب تم جگہ جگہ

(۲)

ہے آہِ دل برنگِ ترنّم جگہ جگہ — قاتل ہے وقفِ جوشِ ترحّم جگہ جگہ
لٹ لٹ کے پہنچے منزلِ جاناں پہ ہم تو کیا — اک آرزو تھی وہ بھی ہوئی گم جگہ جگہ
پھر کیوں نہ کوند جائیں رگِ دل پہ بجلیاں — جب ہو دل و نظر میں تصادم جگہ جگہ
ہے جوشِ اضطراب کہ رندوں میں ساقیا — برپا ہے تشنگی کا تلاطم جگہ جگہ
جذبِ دلِ حزیں کا تصرّف تو دیکھئے — ہر جنبشِ نظر سے ہے تکلّم جگہ جگہ
دنیائے دل ہے عشق کے داغوں سے لالہ زار — آراستہ ہے محفلِ انجم جگہ جگہ

جو نبضِ زندگی کو حرارت عطا کرے
فن ہے نظیر کام لو وہ تم جگہ جگہ

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

کس نے دی ہے درِ تنہائی پہ دستک یا رب
اُن کی یادوں کا کوئی شوخ سا جھونکا تو نہیں

یا وہ خود ہی دبے پاؤں چلے آئے ہوں
دل دھڑکتا ہے مرا ہاں کہیں ایسا تو نہیں

وا ہوا کس کیلئے شام ڈھلے کعبہ ہے
دیکھو دیکھو کہ کوئی راہ کا بھولا تو نہیں

تم چلی آئی ہو یا جھومتی آئی ہے بہار
کوئی بتلا دے مجھے یہ کوئی سپنا تو نہیں

میں نے خود اپنے تراشیدہ بتوں کو ڈھایا
کوئی الزام مرے کفر پہ آیا تو نہیں

یہ الگ بات ہے نظروں میں چھپی رہ تری
دل کہ شیشہ تھا مگر ہم نے بچایا تو نہیں

اب کیسے ڈھونڈنے جائیں کسے اپنا کہہ لیں
تم تو بس غیر ہوئے اور میں اپنا تو نہیں

حافظ رفیق درد

شکریہ، آپ کو مرا غم ہے
یہ عنایت بھی مجھ پہ کیا کم ہے

اب وفا ہے کہاں زمانے میں
آدمی، آدمی سے برہم ہے

زلفِ گیتی سنوارنے پر بھی
پھر وہی پیچ ہے، وہی خم ہے

یورشِ ظلم سے نہ ہل جائے
کیونکہ یہ دل بھی عرشِ اعظم ہے

میری کشتی کا غم مجھے ہوتا
اہلِ ساحل کی آنکھ کیوں نم ہے

تیری آنکھوں سے ڈھل رہی ہو شراب
آبِ کوثر ہے یا یہ زمزم ہے

دل جلوا داغِ دل کو بھڑکاؤ
شمعِ منزل کی روشنی کم ہے

دردؔ کا حالِ زار کیا کہیئے
اب تو وہ سوزشِ مجسم ہے

حسن بخت

مرہم لگا رہے ہیں وہ ہر چند گھاؤ پر
محسوس کر رہا ہوں میں خود کو الاؤ پر

کیا کام ملنے سے فائدہ بڑھ جائینگے یہ پھر
بہتر تو یہ رہے گا کہ اک اک جلاؤ پر

تم بجلیوں کے رقص پہ دیتے رہو گے داد
لیکن یہ بجلیاں تو ہیں اپنے ہی داؤ پہ

گرداب سے بچیں بھی تو ڈوبیں گے وہ ضرور
تکیہ کئے ہوئے ہیں جو کاغذ کی ناؤ پہ

پہنچے گی کیسے منزلِ تعزیر پر وفا
ہم سے ہے آج لغزشِ پیہم کھچاؤ پر

چشمِ غضب سے دیکھیے یا مسکرائیے
موقوف ہے یہ آپ کے اپنے سبھاؤ پر

سیلاب آ نہ جائے دیارِ طرب کی سمت
دریائے ضبطِ غم ہے ابھی چڑھاؤ پر

قطعات

(۱) چراغ لاکھوں ہی گم ہو گئے دھندلکوں میں
اُبھر سکی نہ کبھی جن کی لَو اندھیروں سے
سیاہ رات کے سایوں نے ڈس لیا دن کو
فضا کا جسم ہے زخمی نئے سویروں سے

(۲) امتیازِ بلندی و پستی
اِک نہ اِک دن ضرور دیں گے
توڑ کر فاصلوں کے پیمانے
لفظ نزدیک و دور بدلیں گے

(۳) شوقِ پرواز میں بے چین رہی تھی برسوں
اپنی تقدیر سے نالاں تھی کرن تارے کی
میں نے کل رات عجب رنگِ تغیر دیکھا
ظلمتِ شب سے ہراساں تھی کرن تارے کی

(۴) بہت چراغ جلائے ہیں دل کی بستی میں
مگر کہیں بھی محبت کی روشنی نہ ملی
بہ اختصار یہ حاصل ہے میری کوشش کا
میں زندگی سے ملا مجھ سے زندگی نہ ملی

(۵) متاعِ احساس بن کہاں ہیں شعور کے تابناک موتی
مری نظر میں ابھی تو بیداریٔ بشر پر غنودگی ہے
بھٹکنے والو! غلط تجسس کی مصلحت بھی بتا سکو گے
فردہ پھولوں میں تازہ نکہت تلاش کرنا تو ابھی ہے

نامؔ نظامی

تنہائیوں کا یہ بھی کرشمہ ہے دوستو
گلشن مری نگاہ میں صحرا ہے دوستو
مجھ پر برس رہے ہیں جو پتھر ہیں چار سُو
شاید کسی حسیں کا یہ کوچہ ہے دوستو
ہم بھی اُسی کے واسطے پھرتے ہیں کو بہ کو
جس مہ جبیں کا شہر میں چرچا ہے دوستو
جو چلدیا ہے دُور کئی زخم سونپ کر
آنکھوں میں اُس حسین کا نقشہ ہے دوستو
چلنا ذرا سنبھل کے یہ ہے راہ پر خطر
ہر ایک گام پر نیا دھوکا ہے دوستو
نامؔ کو ہر قدم پہ ہی رسوائیاں ملیں
کس کی نظر میں آج وہ اچھا ہے دوستو

کیف انصاری

اپنے اشکوں سے ہمیں ہر چند رسوائی ملی
یہ بھی کیا کم ہے اندھیری شب کو رعنائی ملی
اس طرح کب دوڑتے تھے راستوں میں بے خبر
شاخ سے ٹوٹے ہیں جب پتے تو بیتابی ملی
دُور تک بھی درد کا کوئی نشاں ملتا نہیں
اللہ اللہ کس قدر زخموں کو گہرائی ملی
میں تو سمجھا تھا کہ میں ہی ہو گیا ساکت یہاں
غور سے دیکھا تو سب کی آنکھ پتھرائی ملی
ہر گھڑی ہے گوشۂ زنداں میں زنجیروں کا شور
ہم کو تنہائی میں بھی ہنگامہ آرائی ملی
غم کی راتوں میں رہے ہیں مجھ سے محوِ گفتگو
شکر ہے، دیوار و در کو تابِ گویائی ملی
کیفؔ دن بھر سینکڑوں سائے تھے [illegible]
رات جب آئی تو سونے کو بھی تنہائی ملی

رونق دکنی سیمابی

بیگانۂ فردا

کہا فرشتوں نے اک دن کہ اے خدائے ودود
یہ جذبے تیرے ہیں یا بستگانِ نام و نمود

یہ مشتِ خاک بھی آمادۂ بغاوت ہے
اِسے ہے زعم کہ ہے [illegible]دا لبت و کشود

حقیقتوں پہ یہ غالب یہ قوتِ باطل
خِرد کی فتنہ طرازی سے بود ہے نابود

کہیں تو نکتۂ موہوم ذات ہے تیری
کہیں مخالفِ ذہنِ رسا ہے تیرا وجود

حریمِ قدس کے عجز و شکوہ سے ہٹ کر
جبینِ کفر ہے بیگانۂ ادائے سجود

تصورِ فہم کی جدت طرازیاں تو یہ
یہ کہتے ہیں تری قدرت کو کوشش بے سود

صلوٰۃ و صوم سے ہے جسم و روح کی ورزش
برنگِ بوئے پریشاں ہے بوئے عنبر و عود

غرورِ فن ہے محیطِ سوادِ سرمایہ
ہے امتیازِ من و تو کا اِن کے دم سے وجود

رگِ حیات جراثیمِ مرگ کی حائل
ہوائے فلسفہ چلنے لگی ہے زہر آلود

کمند پھینک رہے ہیں یہ چاند تاروں پر
ہے اِن کی جدتِ تخلیق ایٹموں کا ورود

یہی ہے حاصلِ تحصیلِ علم تو اک دن
بکھر ہی جائے گا شیرازۂ قیام و قعود

ہیں زیر و بم میں یہ سرگرم کے خود کو کھوئے ہوئے
فضول اِن کے لئے صوتِ سرمد و داؤد

اِدھر قوائے عمل میں لہو کا نام نہیں
اُدھر یہ شکوہ کہ ہر راہِ عزم ہے مسدود

وفا کا عکس ہی پڑتا نہیں کبھی اِس میں
دِل اِن کا ہے کہ ہے آئینۂ غبار آلود

ترے رسول کا یہ احترام کیا جائیں
ہو جن پہ کیفیتِ شاہد و شراب و سرود

یہ لوگ کون ہیں یارب یہ ماجرا کیا ہے
نہ ان میں شیوۂ اسلام ہے نہ طرزِ ہنود

بغیر حکم یہ مانا کہ کچھ نہیں ہوتا
ترے کرم پہ ہے قائم یہ کارگاہِ وجود

یہ خامشی تری اور ان کی گرمیاں توبہ
تو شمع کشتہ ہے اور یہ ہے سوزِ لا محدود

نہ دیکھی جائیگی اب ہم سے ان کی گستاخی
کہیں یہ ختم بھی ہو جائے دورِ نامسعود

کہا یہ قادرِ قیوم نے بطورِ جواب
سنا جو شکوۂ باشندگانِ چرخِ کبود

ہر ایک لفظ کی تہ میں چمک صداقت کی
ہر ایک بات تمہاری خلوص کی ہے نمود

بزعمِ علم مری ذات کے نہیں قائل
دِلوں سے جوہرِ ایماں بھی ان کے ہے مفقود

غرض یہ ہے کہ سلیم الخیال و دانا ہیں
بایں شکوہ یہ نا آشنائے فردا ہیں

اظہر نقوی

پرتو

میرا ماضی
کسی بچھڑے ہوئے ساتھی کی طرح
کھول کر بند دریچوں کو مری یادوں کے
جب دبے پاؤں مرے ذہن میں آجاتا ہے
ایک تصویر ابھر آتی ہے
دھندلی دھندلی سی۔
خیالوں کے کسی گوشے میں
جیسے برسات کی
آوارہ سیہ راتوں میں
کوند کر ایک ہی لمحے میں چلی جاتی ہے برق
اور پھر
وادیٔ تخییل نظر آتی ہے سنسان مجھے
مٹ گئے ذہن کے پردوں پہ لرز کر جیسے
کچھ سنہرے سے روپہلے سے سائے
اور پھر ایک جمود
میرے جذبات جکڑ لینے کو۔
ڈال دیتا ہے کمندیں اپنی
کج ہوئی فکر کے ہاتھوں کی گرفت
آخرش چھوٹ گیا دامنِ ماضی مجھ سے
میرا ماضی
کسی بچھڑے ہوئے ساتھی کی طرح
اب مرے ساتھ نہیں
اب میرے پاس نہیں۔

امین عالم راہیؔ

دِلّی

دِلّی میں کوئی دل کا نگہباں نہ ملے گا
اس شہر میں تسکین کا ساماں نہ ملے گا
ہر چند کہ بہتات ہے مخلوقِ خدا کی
انسان مگر تا حدِ امکاں نہ ملے گا
ہر گام پہ کر لیجئے حسینوں کے نظارے
فردوسِ نظر جلوۂ جاناں نہ ملے گا
ہاں فن کے تو کچھ لوگ خریدار ملینگے
لیکن کوئی فنکار کا خواہاں نہ ملے گا
میں شعر و مضامین کو لاؤں گا کہاں سے
جب شعر و مضامین کا عنواں نہ ملے گا
گریہ ہی رہے گا دلِ مایوس کا عالم
کچھ روز میں راہیؔ بھی غزلخواں نہ ملے گا

نقد و نظر

سب رس پر ایک نظر

ڈاکٹر سہیل بخاری - ناشر آزاد بکڈپو - اردو بازار لاہور - سائز کراؤن - خوبصورت گٹ اپ - صفحات ۱۱۲ - قیمت قسم اول غالباً کاغذ چکنا تین روپے اور کاغذ نیوز پرنٹ دو روپے

ڈاکٹر سہیل بخاری دکنی ادب کے تعلق سے مضامین پڑھنے والوں کیلئے نئے نہیں ہیں وہ عرصہ سے دکنی ادب کا گہرا مطالعہ کر رہے ہیں اور اپنے مطالعے کے نتائج مضامین کی شکل میں پیش کر رہے ہیں جو پاکستان کے اکثر موقر رسائل میں شایع ہوئے ہیں موصوف نے دکنی زبان اور ادب کے مطالعے کے بعد نہایت غور و خوض کرکے یہ فیصلہ کیا ہے کہ دکنی ایک مستقل زبان ہے جو اردو سے بالکل الگ ہے - یہ اردو کا پرانا روپ نہیں اور نہ ہی اس کا جز ہے - یہ لاطینی اور سنسکرت کی طرح مردہ زبان بھی نہیں بلکہ جیتی جاگتی اور زندہ ہے - اس کے نثر نگار اور شاعر آج بھی موجود ہیں اور مشاعرے کی محفلوں میں وہی چھائے رہتے ہیں - یہ میسور، مدراس، حیدرآباد اور مہاراشٹر کے ان علاقوں میں بولی جاتی ہے جو سطح مرتفع دکن اور اس کے اطراف و اکناف میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں - یہ آج بھی اردو سے متبائن ہے۔

ان تصورات کو پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر بخاری نے سب رس کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے نتائج کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے حصے میں فنی تجزیہ ہے دوسرے میں اس کی زبان - تیسرے میں اردو اور چوتھے میں ہریانی سے تقابل آخر میں فرہنگ بھی دیدی ہے - فنی تجزیہ میں کرداروں سے جو حرکات سرزد ہوتی ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے - یہ دکنی زبان کا پہلا دستیاب شدہ افسانہ ہے - نہ اس وقت ادیبوں کے پاس ان کی اپنی زبان کے نمونے تھے اور نہ ان کے کوئی گائیڈ - وہ کلم برداشتہ لکھتے تھے - انھیں تکنک سے اتنا سروکار نہ تھا جتنا قیام دلچسپی سے - اس لئے سب رس ہی نہیں دو سو سال بعد باغ و بہار اور دیگر منظوم قصوں میں بھی یہی کیفیات نظر آئینگی - انھیں آج کی عینک نقد سے دیکھنا موزوں نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ ایک بھی بلا ان خامیوں دیکھنے میں آتے ہیں - پرانے لوگ افسانہ حصول لذت اور خوش وقتی کیلئے لکھتے اور کہتے ان کا مقصد سماجی اصلاح نہیں تھا البتہ سماجی حالات غیر شعوری طور پر ان کی کہانیوں میں آجاتے ہیں اور چونکہ وہی قاعدہ کلیہ ہے - اس لئے ان واقعات کو سامنے رکھ کر بے تکان منفی اور سچی زبان لکھتا چلا جاتا ہے -

دوسرا حصہ زبان سے متعلق ہے کس زمانے میں لفظ اردو کا وجود بھی نہیں تھا یہ تو بعد کی پیداوار ہے - اسی زبان کو محمد الدین نے نویں صدی ہجری میں بھاکا گجری اور ہندی کہا دسویں صدی ہجری میں حضرت جانم نے بھی انھیں کی تائید کی ہے۔

امین الدین اعلیٰ نے گیارھویں صدی ہجری میں بھی اس کو اردو نہیں کہا البتہ عبدل نے ابراہیم نامہ میں "زبان دہلوی" کہا ہے بارھویں صدی کے ختم ہو جانے کے بعد بھی ولی، بحری، سراج وغیرہ اس کو ہندی کی بجائے دکنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کو اردو کہا جائے یا نہیں اردو ہندوستان اور پاکستان میں عام طور پر ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بنگال میں اس کا لب ولہجہ بنگالی ہوگا اس کو بنگالی اردو کہتے ہیں۔ اسی طرح بہاری، پنجابی، اودھی، مہاراشٹری، کرناٹکی اور مدراسی لفظ اردو کے ساتھ لگائے جاتے ہیں۔ ہم حیدرآباد کے لوگ آج بھی مدراسی اردو اور میسوری اردو کہتے ہیں۔ گویا کہ یہ اردو کی ایک ڈائلکٹ بن گئی ہے۔ علیحدہ زبان ایسی صورت میں کہہ سکتے جب یہ دوسرے علاقے میں سمجھی نہ جاتی جیسے بنگالی، مرہٹی، تلنگی، مارواڑی اور دیگر زبانوں کا حال ہے۔ جن کا ان کے اپنے علاقے سے ہٹ کر دوسرے علاقہ میں سمجھنا مشکل ہے۔ لیکن جب انھیں علاقوں کے لوگ کوئی کتاب لکھتے ہیں تو ساری اردو دنیا کیلئے ہوتی ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں وہ اپنی علاقائی زبان کا لفظ یا محاورہ استعمال کر جاتے ہیں۔ جس سے انھیں مفر نہیں۔

تیسرے حصے میں سب رس کا مقابلہ اردو سے کیا گیا ہے۔ لیکن معاصر کتاب سے نہیں بلکہ قدیم اور موجودہ دور کے الفاظ کی املا کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ اگر مقابلہ اردو کی معاصر کتاب سے (جو ابھی نہیں ملی) ہوتا تو بات زیادہ وقیع ہوتی۔ چوتھے حصے میں ہریانی سے مقابلہ کر کے یہ بتلایا گیا ہے کہ "اردو اور دکنی میں جتنا زیادہ اختلاف ہے ہریانی اور دکنی میں اتنی ہی مشابہت موجود ہے۔ لیکن زبان ہندوستان کو ہریانی کی بجائے اردو سمجھ بیٹھنا ہماری اپنی غلطی ہے۔ گویا فاضل مصنف دکنی کو ہریانی کی شاخ یا اس سے متاثرہ زبان بتاتے ہیں۔

آخر میں سب رس کے اہم الفاظ کی فرہنگ دی گئی ہے۔ جو دکنی ادب کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے اہمیت رکھتی ہے۔ فاضل مصنف نے اپنے دعوے کیلئے معقول استدلال پیش کئے ہیں توقع ہے کہ ماہرین لسانیات کیلئے یہ کتاب نہ صرف کارآمد ہوگی بلکہ فکر انگیز اور دکنی کو ایک نئی کسوٹی پر پرکھنے کا ذریعہ بھی بنے گی۔

المجید کا سائنس نمبر

المجید مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج الہ آباد کا رسالہ ہے جو محمد ریاض الدین احمد صاحب پرنسپل اور محمد مصطفیٰ خاں سید عابد علی اور سید محمد علی صاحبان اساتذہ کالج کی سرپرستی اور ادارت میں نکلتا ہے۔ یہ بڑی مسرت کا مقام ہے کہ ہمارے اساتذہ اور طلبا نے سائنسی مضامین لکھنے کی طرف توجہ کی ہے ورنہ ہندوستان میں جامعات سے بھی کوئی ایسا رسالہ نکلتا نظر نہیں آتا بابائے اردو مولوی عبدالحق نے سائنس دانوں کی ایک جماعت سے تعاون کر کے ایک رسالہ سائنس جاری کیا تھا جو تقسیم ہند تک چلتا رہا اس کے بعد اس کی طرف توجہ کرنے والا کوئی نہ رہا۔ پیش نظر شمارہ میں ایک حصہ اسلامیات پر ہے جس میں اسلام اور سائنس کے تعلق سے گراں قدر مضامین جمع کئے ہیں دوسرا حصہ فکر و نظر اور تیسرا سائنس اور سماج ہے۔ عہد جدید کے سائنسی رجحانات، نعیم احمد عثمانی صاحب تحریک کی پہلی منزل ریاض الدین احمد پرنسپل سائنس اور تمدن۔ ڈاکٹر مظفر الدین سماج پر سائنس کے اثرات، محمد مصطفیٰ خاں صاحب سائنس اور سماجی تبدیلیاں اظہر علی صاحب کے مضامین دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں ان مضمون نگار حضرات سے توقع ہے کہ وہ المجید کو اپنے رشحات سے نوازتے رہیں گے۔

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۰ شمارہ ۲

فروری سنہ ۱۹۶۸ء

ماہنامہ سب رس

(نگران)

پروفیسر سید علی اکبر (ایم۔ اے کینٹب)

(مجلس مشاورت)

میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رسول راج سکینہ، ڈاکٹر غلام عمر خاں

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم: محمد جمال الدین — منتظم: وقار خلیل

زر سالانہ چھ روپے — غیر ممالک سے دس روپے

ششماہی تین روپے — فی پرچہ پچاس پیسے

نمونے کے پرچہ کے لیے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد۔ حیدرآباد سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

گذشتہ مہینہ لسانی اعتبار سے ہنگامہ خیز رہا شمال میں سہ لسانی فارمولا قبول کر لیا گیا اور جنوب میں اس کی مخالفت ابھی جاری ہے اور دو لسانی پہ زور دیا جا رہا ہے۔ زبان کے مسئلے سے ایک طرف تصور جمہوریت کو دھکا پہنچا ہے تو دوسری طرف قومی یک جہتی کا تصور بھی متاثر ہوا۔ اور یہ سب کارگذاری قائدین قوم کی ہے جنھوں نے مخصوص نظریوں کے تحت فارمولے بنائے۔ صحیح فیصلہ تو مستقبل ہی کریگا

پیش نظر شمارہ امیر اور فقیر کے مضمون سے آغاز ہو رہا ہے جس میں ڈاکٹر مسعود علی بیگ صاحب نے امارت اور فقر کے بارے میں شعرا کا نظریہ پیش کیا ہے یہ ہماری شاعری کا ایک مستقل موضوع رہا ہے۔ اور تصوف میں تو اس کو اہم مقام حاصل ہے۔ دوسرا مضمون طیب انصاری کا امراؤ جان ادا پہ ہے۔ اس میں موصوف نے امراؤ جان ادا کے جذبات کی ترجمانی کی توضیح کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ماحول نے اس میں انسانیت کو فنا نہ ہونے دیا۔ اندر جیت دت صاحب نے تذکرۂ رفتگان کے تحت موازنۂ انیس و دبیر سے انتخاب پیش کیا ہے اور قدیر امتیاز صاحب نے حیدرآباد میں اردو نثر کے دس سال کا جائزہ لیا ہے۔ یہ بہت سخت اور ہچکچاہٹ پیدا کرنے والا موضوع ہے۔ اس میں بعض ادیبوں کے نام چھوٹ سکنے کا امکان ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ قدیر صاحب نے اگر ایسا کیا بھی ہو تو ارادتاً نہ ہوگا۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ایک شخص حیدرآباد میں طبع ہونے والی ہر کتاب کا نہ صرف علم ہی رکھے بلکہ اس کو پڑھ کر اس کے متعلق اپنے پاس کوئی رائے بھی رکھے۔ اگر کسی ادیب کے نام کی فروگذاشت ہو گئی ہو تو یقین ہے کہ وہ اس کو ناگوار محسوس نہ کریں گے۔

سلیمان خطیب ضلع گلبرگہ کے رہنے والے اور بارگاہ بندہ نواز گیسو دراز میں حاضری دینے والوں میں ہیں۔ اکتساب فن پہ انھوں نے بڑا ریاض کیا ہے۔ دکنی ادب کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ مشاہدہ اور زبان کے زندہ سوتوں سے بھی فیضیاب ہوتے رہے ہیں ساتھ ہی ساتھ ساری فنی خوبیوں کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان پر قیوم صادق صاحب نے جو مضمون پیش کیا ہے اس کی حیثیت ایک تعارف کی سی ہے اور توقع ہے کہ قارئین اس مضمون کے مطالعہ کے بعد خطیب کے اشعار اور نظموں کے مطالعہ کو بھی ضرور سمجھیں گے۔

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی نے تحریک رمزیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے رمزیت و اشاریت کے بعد اب جدیدیت بھی اصطلاح بن رہی ہے کیا مستقبل ان قدروں کو دوام عطا کریگا۔ اس سوال پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ آخری مضمون سید خواجہ حسینی صاحب کا ہے۔ ابن الوقت کو موصوف نے ایک نئے زاویہ نظر سے دیکھا ہے۔ نظموں کا حصہ بھی وقیع ہے اور غالباً دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

ڈاکٹر محمد علی بیگ

امیر اور فقیر

ابتدا ہی سے بنی نوع انسان امیر اور غریب دو طبقات میں منقسم ہے مشہور اشتراکی مفکرین کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس کا خیال تھا کہ ابتدائی دور میں جب انسان خانہ بدوشی کی زندگی گذارتا تھا تو مرد' عورت' بچے' بوڑھے سب ایک ساتھ نکلتے جنگل کے پھل پھلاری جمع کرتے جنگلی جانوروں کو شکار کرکے لے آتے' آپس میں مل بیٹھ کر کھاتے اور جانوروں کے چمڑوں سے تن ڈھانک لیتے تھے۔ یہ پریمیٹو کمیونزم کا دور تھا۔ اس کے بعد مختلف ادوار آئے اور ہر دور میں دو طبقات یعنی ایک حاکم اور دوسرا محکوم طبقہ معاشرے میں نمودار ہوا۔ پہلے آقا اور غلام پھر زمیندار' جاگیردار اور کسان) اور پھر سرمایہ دار اور مزدور پیدا ہوئے۔ ہر دور میں مقتدر طبقہ' دولت مند عیاش اور خوش و خرم رہا اور بے اقتدار محنت کش طبقہ نادار' مفلس اور مصیبتوں کا شکار رہا جس کے سبب دونوں طبقات میں کشمکش رہی اور اکثر قتل و خون اور جنگ و ہلاکت کا بازار گرم رہا۔ ممکن ہے کہ تاریخی واقعات اشتراکی مفکرین کی تائید میں پیش کئے جاسکیں لیکن ایک اور طبقہ یا گروہ بھی ہے جو آدم سے اس دم تک ہر زمانے میں اور دنیا کے ہر حصے میں رہا ہے جس پر نہ کارل مارکس کی نظر پڑی نہ فریڈرک اینگلس کی۔ یہ طبقہ یا گروہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کیلئے فقر اختیار کیا اور عسرت و تنگدستی اور درویشی و قناعت میں زندگی بسر کی۔ یہ طبقہ پیغمبروں' اماموں' اوتار' اولیاء اللہ' صوفیہ اور بہت سے حکماء و شعراء پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی سیکڑوں لوگ ہیں جو دنیا اور دولت دنیا کو ہیچ سمجھتے رہے۔ حرص و طمع کی بجائے کنج صبر اور گوشۂ قناعت اختیار کیا دولت و ثروت کی خاطر نہ قتل و خون کیا نہ ناانصافی و بے رحمی سے کام لیا اور نہ استحصال کیا۔ حرص و ہوا کے قاقم و سنجاب کو خرقۂ صبر پر نثار کیا' زمین سنگلاخ کو بستر کمخواب' دست نہی کو تکیۂ ابریشمی اور نان جویں کو خوان نعمت سمجھا۔

مشہور صوفی ابوالحسن علی ہجویری کہتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے فقر کا درجہ بلند کیا ہے اور فقرا ہی کو اپنے ساتھ مخصوص گردانا ہے کیونکہ فقرا خدا کی ذات کی طرف رجوع ہوئے اور انکا فقر ان کے لئے باعث فخر ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول خدا نے ارشاد فرمایا تھا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ میرے دوستوں کو میرے پاس لاؤ تو فرشتے پوچھینگے کہ تیرے دوست کون ہیں تو اللہ عزوجل فرمائیگا کہ وہ فقرا اور مساکین کی جماعت ہے' خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے تھے کہ اے اللہ مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مسکینی ہی کی حالت میں اٹھا اور مسکینوں کے گروہ میں میرا حشر فرما۔

فارسی اور اردو زبان کے اکثر شعراء خصوصاً صوفی شعراء نے فقیرانہ زندگی کو سراہا ہے اور اسکی عظمت و برتری بیان کی ہے۔

فقر ایک ایسا ... ہے ... دولت ... حرص ... کرتا ہے ... بلکہ بعض اوقات ظلم ... نا انصافی

اور انتہا یہ کہ قتل و غارتگری اور تباہی و بربادی کا باعث بنتی ہے یہی وجہ ہے کہ اولیاء اللہ اور حکمار نے اس سے دوری اختیار کرنے اور اسکے دام میں نہ پھنسنے کی نصیحت کی ہے اور حرص و ہوا اور طمع سے دل کو خالی رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ ولی دکنی کہتے ہیں ؎

طمع مال کی سر بسر عیب ہے خیالات گنج جہاں سر بسر مال

درد نے حرص کی روباہ بازیوں سے آگاہ کیا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید کی ہے ؎

حرص کرواتی ہے روبہ بازیاں سب ورنہ یاں اپنے اپنے بوریئے پہ جو گدا تھا شاہ تھا

سودا کا خیال ہے کہ حیات بے ثبات کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتا لیکن بالآخر یا دیدست رہتا ہے ؎

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک؟ آوارہ از ایں کوچہ بہ آں کو کب تک؟

حاصل یہی اس سے نا کہ دنیا ہووے بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک؟

انسان زندگی کے لئے ساز و سامان اکٹھا کرتا ہے اور موت اس کو ہر چیز سے جدا کردیتی ہے اسلئے نظیر اکبر آبادی کہتے ہیں ؎

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارہ

اگر دولت جمع بھی ہوجائے تو اس کے لٹ جانے یا چور لیجانے کا خوف لگا رہتا ہے یا پھر مزید دولت کی فکر میں نیند نہیں آتی۔ مرنے کے وقت دل دولت میں اٹکا رہتا ہے۔

اس لئے امجد حیدرآبادی کہتے ہیں ؎

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے

افلاس نے سخت موت آسان کردی دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

زندگی بھر دولت کی تمنا انسان کو بے چین اور پریشان رکھتی ہے اور انسان اسکے سبب زیادہ در گرہ صفت مار پیچ رہتا ہے۔ نظیر کہتے ہیں ؎

زر کی جو محبت تجھے تڑپائے گی بابا دکھ اس میں تری روح بہت پائیگی بابا

ہر کھانے کو ہر پینے کو ترسائے گی بابا دولت جو ترے یاں ہے نہ کام آئیگی بابا

پھر کیا تجھے اللہ سے ملوائیگی بابا؟

دولت کی تمنا اور حرص و طمع انسان کو لغویات میں مشغول کرتی اور در خاک چھنواتی ہے ؎

طالب کو اپنے رکھتی ہے دنیا ذلیل و خوار زر کی طمع میں چھانتے ہیں خاک نیاریے آتش

انسان بذات خود برا نہیں ہوتا مگر ہوس دنیا اسکو تباہ کرتی، کوچہ و بازار میں گھسیٹتی اور در در کی ٹھوکریں کھلاتی ہے۔

سبکو دنیا کی ہوس خوار لئے پھرتی ہے کون پھرتا ہے یہ مردار لئے پھرتی ہے ذوق

اگر انسان کی آرزوئیں اور خواہشات قلیل ہوں اور وہ قلیل ما یحتاج زندگی پر صبر و قناعت کرے تو نہ صرف اپنے کو

بنی نوعِ انسان کیلئے بھی باعثِ سکون بن جاتا ہے۔ خواہشات کا سلسلہ کبھی ختم ہونے نہیں پاتا۔ جب ایک خواہش پوری ہو جاتی ہو تو اس کی جگہ سو خواہشیں اور پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ لا متناہی رہتا ہے چونکہ تمام خواہشات کی تکمیل نہیں ہو سکتی اس لئے دل میں حسرت و یاس اور ناکامی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور انسانی زندگی فریادِ مسلسل بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیہ کے نزدیک دولت سے بے پروائی اور صبر و قناعت ایک بڑی دولت ہے وہ انسان کو بادشاہوں کی سی بے فکری عطا کرتی ہے۔ قانع انسان اپنے آپ کو اپنی دنیا کا بادشاہ سمجھتا ہے۔ بقول ولیؔ

پایا ہوں ولیؔ سلطنتِ ملکِ قناعت اب تخت و چتر حق میں مرے ارض و سما ہے

میرؔ کے نزدیک درویشِ قانع تاجدارِ حریص سے بدرجہا بہتر ہے ؎

بڑی دولت ہو درویشی جو ہو بہرہ قناعت سے کہ ہو ہے تنگ ہے حرص و ہوا سے تاجداروں پر

دولت کی طمع جس قدر انسان کو غم و درد عطا کرتی ہے اس قدر قناعت انسان کو سکون اور مسرت بخشتی ہے۔ قناعت سے انسان کو شانِ بے نیازی اور دنیا و آخرت میں سکون حاصل ہوتا ہے ؎

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ قناعت بھی بہارِ جاوداں ہے آتشؔ

اگر انسان قانع ہو غنی ہو وے دو عالم سے ہوا و حرص لیکن اسکی مٹی خوار کرتے ہیں ذوقؔ

دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بے تعلقی علو ہمتی، مردانگی اور نیکی کی دلیل ہے اسی لئے اولیاء صوفیہ اور شعراء نے اسکو سراہا ہے۔

پاک رہتے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلا گوہر ذوقؔ

دنیا ہے وہ صیاد کہ سب دام میں اس کے آجاتے ہیں لیکن کوئی دانا نہیں آتا

نگاہِ حقیقت بیں سے دیکھو تو دنیا ایک دھوکا ہے حقیقت شناس اور بلند فکر حکماء نے اسکو اسی لئے ہیچ سمجھا اور گذشتنی و گذاشتنی خیال کیا۔ غالبؔ کہتے ہیں ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء مرے آگے

عموماً ناواقفِ اسرار لوگ دولتِ دنیا پر نچھاور ہوتے اور خود اپنی تباہی کے درپے ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اقبالؔ نصیحت کرتے ہیں ؎

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

انسانی خودی دولتِ دنیا سے زیادہ قیمتی اور قابلِ قدر ہے۔ اسکی نگہبانی کرنا انسان کا فرض ہے دولتِ فانی اور خودی

لافانی ہے۔ لافانی کیلئے فانی کو چھوڑا جاسکتا ہے لیکن فانی کیلئے لافانی کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ دھن کا راج صرف فرش پر ہے۔ اس کا راج عرش اور فرش دونوں پر ہے ان گنت دولت مند صفحۂ ہستی پر نمودار ہوئے اور حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ نہ ان کا نام اور نہ ان کا نشان ملتا ہے۔ برعکس اس کے گلستان وجود میں ایسے ایسے پھول بھی کھلے جن کے نام کی خوشبو آج تک مہک رہی ہے اور جن کے لافانی نقوش آج بھی دنیا دیکھ رہی ہے۔ یہ اللہ کے فقرا کے نقوش ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قدرت انسان کا امتحان لیتی ہے کسی کو دولت دیکر دیکھتی ہے کہ وہ کیا کیا گل کھلاتا ہے اور کسی کو محروم رکھ کر آزماتی ہے کہ اس کا صبر کس درجے کا ہے۔ بالآخر دونوں مقامات متعین ہوتے ہیں۔ امیر اپنے جاہ و ثروت پر فخر و ناز کرتے ہیں اور فقیر اپنے صبر اور فقر پر۔ امیروں کے پیش نظر دولت دنیا ہوتی ہے اور فقرا اور درویشوں کے پیش نظر خدا اور حیات ابدالآباد ہوتی ہے۔ امیر اور غریب کا ایسا مکالمہ امجد حیدرآبادی نے بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ امیر کہتا ہے ؎

دنیا میں یہ بدنصیب جیتے کیوں ہیں　　مردود در حبیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو روٹی اور بدن پر کپڑا　　معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں

غریب کہتا ہے ؎

پیمانۂ زندگی کو بھرتے کیوں ہیں　　سر چڑھ کے زمین میں اترتے کیوں ہیں
رکھکر بھی تمام زندگی کے سامان　　معلوم نہیں امیر مرتے کیوں ہیں!

زندگی کا عیش موت کے بعد غم اور زندگی کا غم موت کے بعد عیش بن جاتا ہے۔ امام غزالی ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے روز فقیر سے اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ قسم ہے اپنی عزت و جلال کی کہ میں نے دنیا سے تجھے اس لئے محروم نہیں رکھا کہ تو میرے نزدیک ذلیل تھا بلکہ اس وجہ سے کہ تیرے لئے یہاں فضیلت اور کرامت پہلے ہی سے موجود کر رکھی تھی۔ حضرت یسوع مسیح ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گذرنا آسان ہے لیکن قیامت کے روز ایک دولت مند کا جنت کے دروازے سے گذرنا مشکل ہے۔ ایسی ہی بات قدیم دکنی شاعر وجہی نے پرندوں کی زبان میں بیان کی ہے ہما سے کہتا ہے:۔

لیکن آخر بادشاہی کے سبب　　جا پڑینگے دکھ میں محشر کے سب
گر نہ ہوتی چھاؤں تیری آہ آہ　　کیوں بلا میں جا کے پڑتے بادشاہ

ایک واقعہ وہ بیان کرتے ہیں کہ کسی شخص نے محمود غزنوی کو خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا ؎

از قضا محمود سلطاں کو کنے　　ایک دن دیکھا مگر سپنے منے
پس پوچھا محمود سوں راز نہاں　　کیا ہے اے سلطان تیرا حال یاں

تو محمود نے جواب دیا:۔

اسکو بولا مجکو تو دکھ دے نہیں　　نام سلطاں کر کے میرا لے نہیں

بولتے ہیں یوں بعض لوگ کیوں غلط مجھکو ناحق بولتے سلطاں غلط
بولنا سلطاں اُسے ہے سازوار سلطنت ہے جس کی دائم برقرار
میں تو اک بندہ پریشاں تر ہوں آج نام سلطاں سے مجھے ہے بہت لاج
بھاڑ پڑو یہ سلطنت جس کا حساب جو کہ اب دینے لگا ہے مجھ عذاب
کاش کے دنیا میں ہوتا میں گدا تا رہتا آرام سے میں مجھکو یاں سدا
خاکروبی سب سے بہتر تھی مجھے نا چھتر اور تخت یہ افسر۔ مجھے

وجدی زر پرستی اور حب جاہ کے ہیبت ناک انجام کی طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں ؎

ہے عبادت زر کی آخر کافری ہونہ تو زر کے بدل جوں سامری
جسکے دل میں عشق زر کرتا ہو دخل صورت اسکی ہووے محشر میں بدل

برخلاف اسکے جو لوگ صبر و فقر کی زندگی گذارتے ہیں ان کی دنیا میں بھی عزت ہوتی ہے اور آخرت میں بھی رفعت حاصل ہوتی ہے۔ خداکیلئے دنیاکو چھوڑنے والوں کا مرتبہ خداکے نزدیک بہت بلند ہے اور خداکے نزدیک جس کا اونچا درجہ ہوتا ہے دنیا میں اس کا بلند ہوتا ہے۔ خود اہل جہاں اسکے آگے جھکتے اور اس کے قدم چومتے ہیں۔ بقول امجد ؎

ہے سارے جہاں کا سر ترے قدموں پر ترے قدموں پہ جب سے ہے سر میرا

نہ صرف عام لوگ بلکہ خاص لوگ بھی اسکے آگے سر بزانو ہوجاتے ہیں۔ تاریخ انسانی گواہ ہے کہ نہ صرف امراء و روسا بلکہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ تاجداران عالی وقار نے انکی قدم بوسی سے استفادہ کیا۔ مصیبتوں سے نجات اور بخشائش کی دعا مانگنے کی خواہش کی یہی وجہ ہے کہ آتش کہتے ہیں ؎

اے ہمایش فقیری سلطنت کیا مال ہے بادشاہ آتے ہیں پابوس گدا کے واسطے

اور انشاء نصیحت کرتے ہیں کہ ؎

مل گدایانِ فلک رتبہ سے اے دل تو نہ کر خدمت بادشہ روئے زمین پر تکیہ

اقبال نے بندگی خداوندی کو بندگی زمانہ پر ترجیح دی ہے۔ کہتے ہیں:۔

یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ
اس فقر سے آدمی میں پیدا اللہ کی شان بے نیازی
مومن کی اسی میں ہے امیری اللہ سے مانگ یہ فقیری

وہ "من" اور "تن" کا موازنہ کرتے اور "شکم" کے مقابلے میں "دل" کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر [illegible] تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے "دل" یا "شکم"!

فانیؔ نے کس حسین انداز میں نصیحت کی ہے ؎

فانیؔ غمِ دوراں کا سبب تک نہ ملا کچھ فکرِ عدم عدم سے پہلے

جن لوگوں کی نظر دنیا کی حقیقت پر پڑجاتی ہے وہ دنیا سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں۔ نہ وہ اسکے پیچھے دوڑتے ہیں نہ اسکے لئے سرگرداں ہراساں اور پریشان رہتے ہیں۔ ان میں ایک شانِ بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے فقر کو شاہی سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس پر فخر و ناز کرتے ہیں۔ ؎

پایا ہے جو کوئی دولتِ فقر مشتاق نہیں سکندری کا — وفاؔ

بھیکی لگے اسکو شانِ دولت چاکھا جو مزہ قلندری کا — ولیؔ

بوریائے بے ریائے دشتِ فقر ہے مجھے تختِ سلیماں کی مثال — سراجؔ

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو — میرؔ

نہ تخت و تاج میں نے دولت و سپاہ میں ہے جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے — اقبالؔ

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ہو جسکی فقیری میں بوئے اسداللّٰہی — اقبالؔ

فقرا اور درویشوں کی خودداری اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ بادشاہوں اور شہنشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اس لئے کہتے ہیں کہ ؎

گلدستہ ہوکے رونقِ بزمِ شہاں ہوا کوڑا جو اس فقیر کے تکیے سے جھڑ گیا — آتشؔ

جو لوگ دولت و ثروت کے پیچھے دوڑتے اور اسکے لئے پریشان ہوتے ہیں اُن پر اکبر الہ آبادی نے نہایت پر لطف انداز میں چوٹ کی ہے کہتے ہیں ؎

نہایت خوش نما پتھر پڑے ہیں عقل پر انکی
جنھیں تسکین بے لعل و زمرد ہو نہیں سکتی

طیب انصاری

امراؤ جان ادا

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں جتنی تباہیاں آئی ہیں ان کے پیچھے زر، زن اور زمین کی ہولناکیاں کارفرما رہی ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوا کہ کہیں زبان و بیان کی محبت نے انسانی دنیا میں جمود کی کیفیت طاری کر دی اور لوگوں میں زندگی کا احساس ہی باقی نہیں رہا۔ شاید اردو تہذیب کا یہ منفرد پہلو ہے۔ جہاں اہل زبان نے زبان و بیان کے شوق میں ایک قوم اور تہذیب کو زوال آمادہ بنا دیا کیا آپ نے کبھی سنا بھی ہے کہ "چکلے" تہذیب و تمدن، علم و فن اور اخلاق و کردار کی تربیت گاہ بن گئے؟ رسوا نے اپنی تصنیف "امراؤ جان ادا" میں ایک ایسے ہی چکلے کا نقشہ پیش کیا جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں ادبی نوک جھونک ہوتی ہے، شعر و سخن کے کمال دکھائے جاتے ہیں، موسیقی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ صرف و نحو، منطق اور فنونِ لطیفہ بھی پڑھائے اور سکھائے جاتے ہیں۔ انسانی ذہن کا یہ زبردست المیہ ہے کہ اس سے خوب تر قدروں کا احساس چھن جائے اور وہ بدترین زندگی میں ایسا مست ہو جائے کہ اسے اپنی کم مائیگی اور بے بساطی کا بھی احساس باقی نہ رہے اور یہی المیہ اس وقت موت کہلاتا ہے جب کہ انسان تہی دامن اپنی برائیوں کو زندگی کا حاصل سمجھ بیٹھتا ہے۔ لکھنوی تہذیب کی اس موت کا خاکہ رسوا نے بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔ پڑھتے وقت ناظر کا ذہن اس بڑے چکلے کے اندر چھپی ہوئی گندگی کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا جو ایک خوبصورت، نازک تار حریر میں لپٹی لپٹائی زہر پھیلا رہی ہے۔ ایسے موقعوں پر رسوا کچھ کہتا سنتا نظر نہیں آتا وہ بھی دور کھڑا تماشہ بینی میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ وہ ادب میں غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل پیرا ہے ورنہ ہوتا تو یہ ہے کہ خود ناول نگار جگہ جگہ بولتا نظر آتا ہے ایسا ہی جیسے کبھی "بمبئی کا تماشہ" دکھانے والا پاؤں گھنگھروؤں کی آواز کے ساتھ ساتھ کہتا جاتا ہے۔

بمبئی کا تماشہ دیکھو!
جھانسی کی رانی دیکھو!!
چندریا کی لڑائی دیکھو!!!
بمبئی کا تماشہ دیکھو!

رسوا نے لکھنؤ کا تماشہ پیش تو کیا لیکن وہ خود بھی دور کھڑا سوچ رہا ہے کہ انسانی زندگی کس درجہ ذلالت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ زوال آمادہ تہذیب اس کے فکر و خیال کے گوشوں میں اضطراب و بے چینی پیدا کر دیتی ہے۔ یقیناً رسوا صرف ناول نگار نہیں ہے لیکن ناول نگاری میں جو عظیم ادب پارہ چھوڑا ہے اس کے ذوقِ فن کو ظاہر کرتا ہے۔ رسوا عظیم فنکار

نہیں ہے لیکن فن خود رسوا کی عظمت سے شرمایا ہوا نظر آتا ہے۔ رسوا نے جس چابکدستی اور کمال فن سے ایک تباہ شدہ اور غلاظتوں میں ڈوبی ہوئی معاشرت کو پیش کیا ہے اس میں اس کی ذہانت اور زور قلم کا یقیناً دخل ہے وہ ہمارے ادب کا رچرڈسن ہے۔ جس نے امراؤ جان ادا کے نام سے "پمیلا" لکھی اور اردو ناول نگاری کو نئے رجحانات اور نئے میلانات سے روشناس کرایا اور اس طرح یہ ناول فن ناول نگاری کی مستقل اور مضبوط بنیاد بن گیا۔

یہ بات نئی نہیں ہے کہ ادب تنقید حیات ہوتا ہے اس وجہ سے ادب کو صرف ادبی یا جمالیاتی نقطہ نظر سے جانچا نہیں جاسکتا۔ سماجی، معاشی اور معاشرتی و اخلاقی اقدار حیات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ نقطہ نظر کہ نقاد ادبیات کے گیسوؤں میں جوں ہے (ٹینی سن) یا چیخوف کا نقاد کو گھوڑے کی مکھی قرار دینا یا پھر فلابیر کا کہنا کہ "تنقید ادب کے جسم پر کوڑھ ہے" کوئی سنجیدہ بات نہیں، چیخوف نے بہت صحیح کہا ہے کہ "عام ترقی پسند خیالات کی طرح سماج کو آگے لے جانے والے ترقی پسند نظریات نئی بنیاد کے قیام کے لئے جدوجہد کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ جس سے سماجی ترقی کی تحریک کو مدد ملتی ہے اور سچ بھی یہی ہے کہ فکر صحیح اور عمل کی جولانی کے بغیر حیات کا ارتقا ممکن نہیں۔ گورکی اشتراکی نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے "اشتراکی حقیقت پسندی کا نقطۂ نگاہ میں وجود عمل سے عبارت ہے اور زندگی تخلیقی کوششوں کا نام ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی قیمتی انفرادی صلاحیتوں کا مسلسل نشوونما ہو تاکہ وہ فطرت کی طاقتوں پر اقتدار حاصل کر سکے۔ تندرستی کے ساتھ بہت دنوں تک زندہ رہ سکے اور اس دنیا کی نعمتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکے" امراؤ جان کے مطالعہ سے بہت جلد آپ اس حقیقت کو جان لیں گے کہ رسوا وجود انسانی کو عمل سے عبارت سمجھتا ہے۔ اس کے یہاں زندگی تخلیقی کوششوں کا نام ہے وہ فرد کی انفرادی صلاحیتوں کا مسلسل نشوونما چاہتا ہے۔ جس معاشرہ کو اس نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے وہ جمود کا شکار ہے، ارتقا کی صلاحیتیں مفلوج ہو چکی ہیں اور پورے کا پورا سماج اس اندھے کنوئیں کی طرح بن گیا ہے جس میں برسوں سے پانی ٹھہرا ہوا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ فریب نظر کے لئے سطح آب پر پھول کھلے ہیں لیکن اس کنول کی طرح جن کے پیر دلدل اور کیچڑ کے اندر دھنسے ہوئے ہیں ظاہر ہے ان پھولوں میں اور زندہ پھولوں میں بہت زیادہ فرق ہے، وہی فرق جو موت اور زندگی میں ہوتا ہے۔ بہتی ہوئی جھیلوں کے کنارے، دامن کوہ میں دور دور تک حد نظر تک لہکتے پھول، مہکتے پھول، جن کی خوشبو دلنواز اور جن کا نظارہ نظر نواز حیات انسانی میں فرحت اور انبساط کی لہروں کو دوڑا دیتے ہیں! رسوا اپنی محرومی قسمت سے آگاہ ہے اس کے یہاں جو پھول ہیں — امراؤ، خانم، بواحسینی، دلاور خاں، گوہر مرزا، راشد، جعفر علی اور حسن وغیرہ جاندار پھول نہیں ہیں، ان سے پھیلتی ہوئی لبساند بو سارے سماج کی ایک تہذیب کی بدبو ہے اور ایسے ہی بدبودار پھول ہیں امراؤ کے جوڑے میں بھی نظر آتے ہیں! رسوا یقیناً غیر جانبدار ہے، اس نے کہیں بھی کھلے بندوں اپنے کسی بھی نقطۂ نظر کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے کسی بھی کردار کو خواہ مخواہ اچھالنے کی کوشش نہیں کی، وہ کہیں بھی رنگ آمیزی کرتا

۱؎ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔

نظر نہیں آتا بلکہ ناول واقعات، کردار اور پلاٹ و مکالمے کے بل بوتے پر آگے بڑھتا ہے باوجود اس کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسوا کے شعور میں ایسی کوئی بات ضرور موجود تھی جو اس ناول کی تخلیق کیلئے تحریک بنی۔ ایک ذہین فنکار تفریح طبع کیلئے بھی کچھ لکھتا ہے تو اس کام میں یقیناً اسکے جذبات و کیفیات کی جھلک موجود ہوتی ہے وہ غیر جانبدار ہوتے ہوئے بھی بڑی حد تک جانبدار ہو جاتا ہے اور مرزا رسوا کی جانبداری یہی ہے کہ اس نے حیات کی نئی قدروں کی بازیافت کیلئے اس تہذیب کی گندگیوں اور کوتاہیوں کو بے نقاب کیا جہاں زہر آبِ حیات کہلاتا تھا، جہاں جمود اور تعیش پسندی کو آسودگی اور راحت کا نام دیا گیا، جہاں عورت کے تقدس کو ہوسناکیوں کا شکار بنا دیا گیا اور مختصراً جہاں موت زندگی کہلاتی تھی! رسوا یقیناً نقادِ حیات ہے اس نے "امراؤ جان ادا" لکھ کر لکھنوی تہذیب پر گہرا طنز کیا ہے لیکن رسوا کا کمال یہ ہے کہ وہ حقیقت کو حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک باکمال فنکار کی طرح پوری تصویر کو جوں توں پیش کر دیتے ہیں یہ تو پڑھنے والے کا نقطۂ نظر ہوتا ہے جو اس ناول کے پڑھنے کے بعد پوری تہذیب کو انسانی ترقی کا نشاۃ ثانیہ قرار دے۔ یا بدترین دور! رسوا کی یہی وہ غیر جانبداری ہے جو اپنے جمالیاتی اور تعمیری نقطۂ نظر رکھنے والے نقادوں میں یکساں مقبول بنا دیتی ہے۔

عورت ہمیشہ ہی سے ادب کا محبوب موضوع رہی ہے۔ ہند کی مورت گروں یا شاعر یا پھر مشرق و مغرب کے فنکار سبھوں نے عورت کو سرچشمۂ فن بنائے رکھا ہے اور بات ہے کہ بعض فنکاروں نے اپنی تخلیقات میں عریاں پیش کیا، ان کا رویہ تضحیک آمیز رہا۔ اور بعض نے اس کی شان میں شاہکار تخلیقات پیش کی ہیں۔ مرزا رسوا نے امراؤ کو ایک عورت اور صرف عورت سمجھ کر پیش کیا ہے اور اُن کے نزدیک عورت نہ تو نیکی کی اوتار ہے اور نہ ہی "مقدس دیوی" کہلاتی ہے بلکہ اس نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح عورت کے بیوپاری دلاور خاں کے روپ میں ہمارے سماج کے اندر عورتوں کا بیوپار کرتے پھرتے ہیں کس طرح معصوم عورت عیار اور مکار راشد کی طرح جال پھیلائے ہوئے مصنوعی اخلاق، مصنوعی عشق اور مصنوعی شعر و شاعری میں کمال رکھنے والے مردوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے اور کس طرح عمر رسیدہ، پیر نابالغ نواب جعفر خاں آج بھی سماج میں عورت سے دل بہلاتے ہیں۔ یہ عورت کی زندگی کا بڑا سانحہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے کو داتا بنا سمجھتی رہی ہے لیکن عجیب بات ہے وہ پھر بھی زمانہ میں سب سے زیادہ مظلوم کہلاتی ہے، زمانہ کے ظلم اسکے حصہ میں آئے ہیں وہ چاہتی ہے کہ ایک باعزت زندگی گذارے لیکن حالات اس طرح مجبور کر دیتے ہیں کہ بسا اوقات اپنی متاعِ عزیز بھی کھو بیٹھتی ہے اور پھر اسکی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی جو کل تک اس کو تقدس مآب سمجھتے رہے آج ان کی نظروں میں حقیر و کم مایہ بن جاتی ہے۔ امراؤ جان ادا ایسی ہی ستم رسیدہ عورت ہے جس کے دل میں ارمانوں بھری زندگی گذارنے کی چاہ ہے، جو اپنی ہمجولیوں میں بیٹھ کر خوشی کے گیت گانا چاہتی ہے جو دوسری عورتوں کی طرح رنگین سپنے دیکھا کرتی ہے وہ اپنے محبوب سے چاہے جانے کی آرزو رکھتی ہے وہ ایک ایسے گھر میں رہنا چاہتی ہے جہاں اس کے ماں باپ ہوں، چھوٹے چھوٹے بھائی ہوں۔ سنئے وہ اپنی تباہ حال زندگی میں کیسا خواب دیکھتی ہے۔—

"آج رات کو میں نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا جیسے ابا نوکری پر سے آئے ہیں مٹھائی کا دونا ہاتھ میں ہے چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے، اس کو مٹھائی کی ڈلیاں نکال کے دیں، مجھے پوچھ رہے ہیں جیسے میں دوسرے دالان میں ہوں اماں باورچی خانے میں ہیں اتنے میں ابا کو جو دیکھا تو دوڑ کے لپٹ گئی۔۔ خواب میں اتنا روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں!"

امراؤ یہاں صاف جھوٹ کہہ گئی وہ خواب میں نہیں روئی، زندگی بھر روتی رہتی ہے، اس کے شب و روز رونے آنسو بہانے میں گزرے ہیں اور یہ آنسو اس بات کا ثبوت ہیں کہ امراؤ باوجود طوائف کی زندگی گزارنے کے حیا اور شرافت کو کھو دینے کے باوجود حیا و شرافت کے احساس سے محروم نہیں تھی۔ درحقیقت یہی وہ احساس زیاں ہے جو بالآخر اسے کامیابی سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

امراؤ کے اندر جو امیرن ہے وہ کبھی مری نہیں ہمیشہ زندہ رہی اور ہر وقت امراؤ کے ذہن میں احساس کی صورت میں کلبلاتی اور جگاتی رہی ہے، اس نے بازاری عورتوں سے بالکل علیحدہ رکھا اس نے کبھی اسے سر راہ بیٹھنے نہیں دیا، گانے سے روک کے رکھا اور جب کبھی موقع ہاتھ آیا غیرت و حمیت کو جگانے کیلئے چونک پڑی۔ امراؤ مجرا میں شرکت کی غرض سے اپنے وطن جاتی ہے۔ وہاں وطن میں امیرن کس طرح امراؤ کو جھنجھوڑتی ہے خود امراؤ کی زبانی سنئے!

" دو دن کے بعد ایک مجرا آگیا -- اس کی تیاری کرنے لگی- جہاں کا مجرا آیا تھا- وہاں گئی- محلہ کا نام یاد نہیں- مکان کے پاس بہت بڑا پرانا املی کا درخت تھا- جس کے نیچے تکیہ تانا گیا تھا.... اسی مقام کو دیکھ کر وحشت سی ہوتی تھی- دل امڈا آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے- یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی ..... ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا- دل کو یقین ہو گیا تھا یہی میرا مکان ہے- جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں- ماں کے قدموں پر گروں وہ گلے لگا لیں گی مگر جرأت نہ ہوتی تھی.... پھر جی کہتا تھا ہائے کیا غضب ہے صرف ایک دیوار کی آڑ ہے ادھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لئے تڑپ رہی ہوں- ایک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں-

امراؤ کی یہی تڑپ ہے جو آپ ہم سب کو اسکے ساتھ تڑپنے پر مجبور کر دیتی ہے- واقعہ تو یہ ہے کہ رسوا نے عورت کے ساتھ بڑا انصاف کیا ہے اس نے عورت کے دل میں خود اسکے وجود کے احساس کو پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے- جب خانم امراؤ سے پوچھتی ہے:-

کیا تم ذات کی تریا ہو :

تو وہ رو پڑتی ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں- بہ مشکل تمام کہتی ہے-

ذات کی تریا تو نہیں ہوں تقدیر کا لکھا پورا کرتی ہوں!

عورت کی یوں تو کئی قسمیں ہیں لیکن اسے بآسانی تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اسی تقسیم کا احساس خود امراؤ کو بھی ہے کہتی ہے:-

بات یہ ہے کہ عورتیں تین قسم کی ہوتی ہیں (۱) نیک بختیں (۲) خرابیں (۳) بازاریاں- دوسرے قسم کی عورتیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں- ایک تو وہ جو چوری چھپے عیب کرتی ہیں- دوسری وہ جو کھلم کھلا بدکار ہو جاتی ہیں- نیک بختوں کے ساتھ صرف وہی عورتیں مل سکتی ہیں جو بدنام نہ ہو گئی ہوں- کیا تمہیں اتنی سمجھ نہیں ہے کہ وہ بیچاریاں جو تمام عمر چار دیواروں میں قید رہتی ہیں ہزار ہا قسم کی مصیبتیں اٹھاتی ہیں اچھے وقت کے تو سب ساتھی ہوتے ہیں مگر برے وقت میں بیچاریاں ہی ساتھ دیتی ہیں...... اکثر دیکھا گیا ہے کہ گھر کی

> عورتیں کیسی ہی خوبصورت، خوب سیرت اور خوش سلیقہ کیوں نہ ہوں، یہ دو تو مرد بازاریوں پہ جو
> ان سے صورت اور دوسری صفتوں میں بدرجہا بدتر ہیں فریفتہ ہو کر انھیں عارضی طور پر مدت العمر
> کے لئے ترک کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کو گمان کیا بلکہ یقین ہے کہ یہ کسی دکسی قسم کا جادو ٹونا
> ایسا کر دیتی ہیں جس سے مرد کی عقل میں فتور آ جاتا ہے۔ یہ بھی ان کی ایک قسم کی نیکی ہے اس لئے کہ
> وہ اس حال میں بھی اپنے مردوں کو الزام نہیں دیتیں بلکہ بدکار عورتوں ہی کو مجرم ٹھہراتی ہیں۔
> اس سے زیادہ ان کی محبت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے "

سچ تو یہ ہے کہ عورت سراپا محبت ہے' وہ محبت ہی کی آمیزش سے بنائی گئی اور محبت کرنے اور محبت کئے جانے کیلئے پیدا ہوئی' دنیا کے مذاہب میں اختلاف ہو تو ہو لیکن عورت کے مذہب میں اختلاف کی گنجائش نہیں یہ دنیا کی ساری عورتوں کا واحد مذہب ہے اور محبت ہمیشہ پاکیزہ ہوتی ہے۔ یہ کبھی ماں کی محبت کہلاتی ہے تو کبھی بہن کی محبت اور شوہر ہمیشہ اپنی بیوی سے محبت ہی کا آرزومند ہوتا ہے۔ محبت عورت کی تخلیق کی اصلی محرک ہے اور یہی اسکی شخصیت کا جزو اعظم بھی! جس عورت میں نفرت کی ذرا سی گنجائش ہو اپنے دشمن کیلئے بھی مجھے اس کے عورت ہونے میں شبہ ہے۔ امراؤ یہاں صرف عورت ہے تو آپ اسکو نیک بختوں میں شمار کر سکتے ہیں اور نہ ہی خرابین میں اور وہ بازاری بھی نہیں ہے۔ امراؤ صرف عورت ہے۔

ہمارے سماج کی مظلوم عورت! جانے علی عباس حسینی نے کیسے لکھ دیا' یہ ایک رنڈی کی کہانی اسی کی زبانی ہے۔ شاید ان کی نظر خانم بوا حسینی' خورشید اور بسم اللہ پر ہو لیکن تعجب ہے وہ امراؤ کے اندر چھپی ہوئی امیرن کو کیسے فراموش کر گئے۔ رسوا نے ان حقیقتوں کی عکاسی کرنے کیلئے ناول نہیں لکھے' یہ تو ایک وسیلہ ہیں جن کی مدد سے ہم چند طبقوں کو دیکھتے ہیں۔ خورشید الاسلام کے الفاظ میں ان طبقوں کی زندگی تو در کنار ان کرداروں کی زندگی بھی طوائفوں پر موقوف نہیں اور نہ بڑی حد تک ان کی معاون ہے۔ ان میں سے ہر ایک طوائف کی کہانی چند جملوں میں سنائی جا سکتی ہے اور یہ کہانی دوسری طوائف کی کہانی سے بالکل آزاد ہوگی۔ ان سب کی مجموعی داستان بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ سب طوائفیں تھیں۔ ناول نگار کی تمام صلاحیتیں بھی ان کی مصوری پر صرف نہیں ہوتیں اور نہ ناول کا سارا مواد بھی ان کی فضاؤں اور فضاؤں میں حل نہیں ہوتا۔ میلے' مشاعرے اور مجرے ہم یقیناً ایک طوائف کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ آنکھ ہمیں بہت دور لے جاتی ہے'۔ اس میں ہمیں مردوں کے کردار بھی ملتے ہیں ایسے مرد جو ذہنی طور پر ناکارہ ہو چکے ہیں جن کی ذہنی پستی کا یہ عالم کہ انھیں اپنی زندگی کا احساس بھی باقی نہیں رہا۔ گوہر مرزا اس گروہ کا نمائندہ اور اس دور کی معاشرت کے ہر دعوے کی زندہ نفی ہے' سوسائٹی جو مصنوعی اخلاق' مصنوعی پندار' مصنوعی عشق' مصنوعی شعر و شاعری میں کمال رکھتا ہے۔ یہ اپنے کمالات سے شرمندہ نہیں' نواب جعفر علی خاں اور نواب چھبن اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو آپ اپنے دام میں گرفتار ہے اور جانے ایسے کتنے مرد کردار کہانی میں ملیں گے۔ ایسا نہیں ہو کہ ان کرداروں میں سے کوئی مجرم ہی کا کردار بھی ہے۔ رسوا نے اپنے ناول میں کسی مجرم کے کردار کو جگہ نہیں دی لیکن باوجود اس کے امراؤ جان ادا کی کہانی ہے نہ طوائفوں کی روداد ہے' نہ اس میں چند انسانوں کی شکست و کامرانی کی تصویر ہے۔ بلکہ اس کا موضوع زوال ہے اور

یہ زوال ایک خاص معاشرت کا ہے جو اودھ کے چند شہروں میں محدود تھی۔ ایک ایسی تہذیب جہاں دولت کی کثرت ہے لیکن کوئی نصب العین یا مقصد نہیں اور وقت گزاری جن کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ان کی سماجی بدحالی مسلمہ سیاسی بصیرت کا اندازہ کیجئے کہ وہ غدر کے ہنگامے کو محض بدمعاشوں کی فتنہ پردازی سمجھتے ہیں اور مولوی کے جذبہ عشق کا یہ عالم ہے کہ ادنیٰ و بیبوا بسم اللہ کے حکم کی تعمیل میں درخت پر چڑھ جاتے ہیں۔

ٹی۔ایس۔ ایلیٹ نے غلط نہیں کہا کہ جب ایک تخلیقی ذہن دوسرے سے بہتر ہوتا ہے تو اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو بہتر ہوتا ہے وہ تنقیدی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے" بلاشبہ رسوا میں دیگر ناول نگاروں سے کہیں زیادہ تنقیدی شعور موجود تھا تب ہی تو اس نے کہا تھا کہ "ہمارے ناول نہ ٹریجڈی نہ کامیڈی ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوتے ہیں اور نہ ان میں سے کسی نے خودکشی کی ہے۔ نہ ہم ہوا نہ وصل ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ نہ سمجھنا چاہیے۔ ظاہر ہے ناول کا تنقیدی مطالعہ کرنے والا فنکار جب خود ناول لکھنے بیٹھے گا تو وہ زیادہ چوکنا، چوکس اور بیدار ہوگا قلم اٹھانے سے قبل غور و فکر کرے گا۔ یقیناً رسوا نے اپنے ناولوں میں واقعیت پسندی سے کام لیا ہے فطری مناظر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس نے اپنے کرداروں کا انتخاب اپنے ماحول سے کیا ہے خود رسوا نے اپنے نفسیات کے مطالعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کردار سازی میں جوہر دکھائے ہیں۔ فطرت انسانی کے اظہار میں رسوا نے کمال پیدا کیا اور اسکے پلاٹ محیر العقل نہیں ہیں۔

رسوا نے واقعاتی تسلسل کو اپنے ناول "امراؤ جان ادا" میں برقرار رکھا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے ناول میں مختلف عناصر کو جمع کر دیا گیا ہے۔ ذہنی اور فکری پہلوؤں کو اس نے پیش کیا ہے۔ مکالمے میں بھی اس نے اپنے فن کا اظہار کیا ہے مختصر الفاظ میں امراؤ جان ادا ہمارے اردو ادب کے تاج کا ہیرا ہے۔ اگر اس کہانی کے تعلق سے آپ کچھ سننا چاہتے ہیں تو سنئے کہ اس کہانی کی تخلیق کب ہوئی اور کیسے ماحول میں ہوئی! اسے

> اس وقت وہ باغ جس میں بہت سا روپیہ صرف کر کے جنگل اور پہاڑیوں کی گھاٹیوں کے نمونے بنائے گئے تھے۔ عجیب وحشت ناک سماں دکھا رہا تھا...... تاریکی روشنی پر چھائی جاتی تھی جس سے ہر چیز بھیانک... معلوم ہونے لگی تھی درخت جتنے اونچے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے، ہوا سن سن چل رہی تھی۔ سرو کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے...... فواروں کے حوض کے ہول سے چڑیاں اڑ رہی تھیں...... ہوا کے جھونکوں سے کنول بجھ گئے تھے...... مارے خوف کے باغ کی طرف دیکھی نہ جاتا تھا"

ایسے ہولناک منظر میں آگے بڑھنے والی حقیقی زندگی کو رسوا نے ناول کی صورت میں محفوظ کر لیا۔

تذکرۂ رفتگاں (قسط ۳)

اندر جیت دت اثر قسری

میر انیس کی خصوصیات شاعری

اس سلسلے کی قسط نمبر ۲ کی اشاعت پر موصول شدہ تعریفی، تنقیدی اور مشاورتی مکتوبات کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ہمارے برصغیر عظیم میں اپنے بزرگوں کی تصنیفات سے دلچسپی رکھنے والے اہل ادب، نقاد اور قارئین کی کوئی کمی نہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان رنگ برنگ مکتوبات پر ہی ایک قسط مکمل کر دوں۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے اصل موضوع سے ہٹ جانے کا خدشہ سد راہ بن گیا ہے۔

تبدیلی حالات اور گردش ایام کا اثر پارینہ جواہر پاروں پر پڑنا ایک لازمی و قدرتی امر تھا۔ جس کے زیر اثر بہت سے نسخے ناپید اور کئی تصانیف لائبریریوں کی الماریوں کی زینت بن کر رہ گئیں۔ نئی پود کی رسائی ان تک قریب قریب ناممکن ہو چکی ہے۔ اس لئے ان کے فیض سے بے بہرہ رہنے میں وہ کسی حد تک بے قصور ہیں۔ علاوہ ازیں پرانی ضخیم کتب کو دیکھتے ہی ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں کیوں کہ وہ نئی تحریروں، دلکش سرورق اور ہلکے پھلکے افسانوں کو پڑھنے کے عادی سے بن گئے ہیں۔ ان حالات میں ادب نواز ہستیوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان دیرینہ کتابوں میں سے مواد لے کر نئے انداز میں عہد حاضر کے جریدوں میں شائع کروائیں تاکہ نوجوان طبقہ ان سے دلچسپی لیتے ہوئے فیض یاب ہو سکے۔

قسط نمبر ۱ اور نمبر ۲ میں اردو ادب کی دو مختلف اصناف پر روشنی ڈالنے والے مضامین کے بعد اس قسط میں تیسرے پہلو شعر و شاعری پر کچھ لکھنا مقصود ہے۔ اس زمرے میں علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی زندۂ جاوید تصنیف "موازنۂ انیس و دبیر" کا سہارا لے رہا ہوں۔

مختصر سوانح حیات:- مولانا شبلی ایام غدر (۱۸۵۷ء) میں بمقام بنڈول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا جو وکالت کرتے تھے۔ مولوی شکر اللہ صاحب سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی میں مولوی فاروق چریاکوٹی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور رام پور میں مولوی ارشاد حسین صاحب سے فقہ کی کتابیں پڑھیں۔ کچھ عرصہ بعد لاہور آئے اور فیض الحسن صاحب سے رجوع فرمایا۔ پھر سہارنپور میں مولوی احمد علی سے علم حدیث پڑھا۔ ۱۹ سال کی عمر (۱۸۷۶ء) میں حج کیا۔ واپسی پر ذوق شعر رونما ہوا اور اعظم گڑھ کے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ وکالت پاس کر کے پہلے وکیل اور پھر عدالت دیوانی میں امین رہے ۱۸۸۲ء میں سر سید احمد سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ان کی علمی و ادبی قابلیت کے معترف ہو کر علی گڑھ کالج میں عربی و فارسی کا معلم مقرر کر دیا۔ یہیں سے قسطنطنیہ، ایشیائے کوچک، شام اور مصر کی سیاحت کیلئے نکلے۔ بوجہ علالت کچھ عرصہ کشمیر میں رہے جہاں اپنی مشہور تصنیف "الفاروق" مکمل کی۔ کچھ عرصہ حیدر آباد میں ناظم محکمۂ اشاعت علوم و فنون۔ بعد ازاں ندوۃ العلماء کی حالت نازک دیکھ کر لکھنؤ میں مدرس ہو گئے۔ ۱۸۹۲ء میں سلطان ترکی نے انھیں تمغۂ مجیدیہ سے سرفراز کیا

۱۸۹۴ء میں گورنمنٹ برطانیہ کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب پایا ۱۹۱۳ء میں اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد رکھی ۵۷ سال کی عمر پاکر پندرہ روزہ علالت کے بعد نومبر ۱۹۱۴ء میں انتقال فرمایا۔

طرزِ تحریر و تصانیف: مولانا اردو ادب کے ایہ ناز مصنف تھے۔ میلان طبع مختلف پہلو رکھتا تھا۔ علم الکلام، تاریخ، تنقید اور سیرت نگاری کے میدان میں انھوں نے اشہب قلم دوڑایا مگر زیادہ شہرت تاریخ اور تنقید نگاری کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ ان کی تصانیف کے متعلق ایک جرمن مستشرق کی رائے ہے کہ اہل مغرب کی محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندوستانی تصنیف تحقیق و تدقیق کا درجہ رکھتی ہے تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف میں سے ہے۔ ان کا طرز تحریر سلیس پر زور اور دلپذیر ہے۔ زبان میں سنجیدگی اور شانِ ادبیت موجود ہے۔ تشبیہ اور استعارے سے بھی کام لیا۔ آزاد کی شوخی کو نہ پاسکے۔ ان کی زبان مستند مانی جاتی ہے۔ ادبی زندگی کا آغاز مثنوی صبح امید سے ہوا۔ شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر نقادانِ سخن کو لغویات سے گریز اور عمدہ باتوں کو منتخب کرنے کی تمیز سکھاتے ہیں۔ ان کی تصانیف کافی ہیں لیکن المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، علم الکلام، سیرۃ النبی، سوانح مولانا روم، قابلِ ذکر ہیں۔ نظم میں کلیات شبلی۔ مجموعہ کلام اردو اور بوئے گل مشہور ہیں۔

میر انیس کی خصوصیات شاعری: بیان کرتے ہوئے "فصاحت" کی تعریف میں لکھتے ہیں:-

"علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں ان میں تنافر نہ ہو۔ الفاظ نامانوس نہ ہوں۔ قواعد صرفی کے خلاف نہ ہوں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ درحقیقت اس قسم کی آواز ہے اور چونکہ آوازیں بعض شیریں، دل آویز اور لطیف ہوتی ہیں۔ مثلاً طوطی اور بلبل کی آواز اور بعض مکروہ و ناگوار مثلاً کوے اور گدھے کی آواز اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض شیریں، سبک و حسین۔ بعض ثقیل، بھدے اور ناگوار۔ پہلی قسم کے الفاظ فصیح کہلاتے ہیں اور دوسرے غیر فصیح۔"

میر انیس کے کمالِ شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انھوں نے اردو شعراء میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے اور سینکڑوں مختلف واقعات بیان کئے تاہم ان کے تمام کلام میں غیر فصیح الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔

میر انیس کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ موقع پر فصیح الفاظ ڈھونڈتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں مرزا دبیر کے ہم مضمون الفاظ لئے جائیں تو یہاں غریب اور ثقیل الفاظ ملیں گے۔ اگر مرزا کے ہاں الفاظ فصیح ہوں گے تو میر کے ہاں فصیح ترین ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں جن سے فصاحت اور اختلاف مراتب کا اندازہ ہو سکے گا ؎

مرزا دبیر	کس نے دی انگوٹھی رکوع و سجود میں
میر انیس	سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں
مرزا دبیر	آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو

میرانیس :- آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

مرزا دبیر :- رویا میں بھی حسین کو رویا ہی کرتے ہیں

میرانیس :- حسرت یہ ہے کہ خواب میں بھی رو یا کیجئے

مرزا دبیر :- جیسے مکاں سے زلزلہ میں صاحب مکاں

میرانیس :- جیسے کوئی جو نچال میں گھر چھوڑ کے جاگے

ابتذال :- فصاحت کے بارے میں ایک بڑا دھوکہ یہ ہوتا ہے کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ' آسان اور کثیر الاستعمال ہو۔ اس لئے لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں سفید اور سیاہ کا فرق ہے دبیر جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں انیس کی تقلید کرتے ہیں' اکثر ان کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں مثلاً جہاں حضرت شہربانو نے حضرت عباسؓ کی لاش پر نوحہ کیا ہے' حضرت شہربانو کی زبان سے فرماتے ہیں ؏

ہے - ہے مرے دیور - مرے دیور - مرے دیور

ایک جگہ اور فرماتے ہیں - ؏

ناٹرا تو آن کی سالگرہ کا نکال لا

"ابتذال کی صاف بیّن مثال نظیر اکبرآبادی کا کلام ہے۔ اگر یہ مبتذل نہ ہوتا تو صفائی اور سادگی میں نظیر کا کلام انیس یا میرتقی میر سے نہ گھٹتا۔"

کلام کی فصاحت :- یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی۔ لیکن کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں بلکہ یہ ضرورت ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے ان کی ساخت میں نشست' سبکی اور گرانی کے ساتھ خاص تناسب اور توازن ہو۔ ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ انیس کا مصرع ہے ؎

فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور

صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں اور دونوں فصیح ہیں۔ انیس نے جا بجا انھیں استعمال کیا ہے لیکن اگر اس لفظ میں صحرا کی بجائے جنگل کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی غیر فصیح ہو جائے گا۔ میر صاحب کا ایک شعر ہے ؎

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں — جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

یہاں جنگل کی جگہ صحرا لاؤ تو مصرعہ پھیکا ہو جاتا ہے۔ شبنم اور اوس ہم معنی ہیں اور برابر درجہ کے فصیح بھی۔ لیکن میر صاحب اس شعر میں ؎ کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کی جگہ شبنم لے لے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی۔ لیکن یہاں پر شبنم فصیح تر ہے - ؏

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

مرزا کا مشہور مصرع ہے - مصرع   زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے ۔

اس میں جتنے الفاظ ہیں یعنی زیر- قدم - والدہ - فردوس اور بریں سب بجائے خود فصیح ہیں لیکن ان کو باہم ترکیب دینے سے جو مصرعہ پیدا ہوا وہ اس قدر بھدا اور گراں ہے کہ زبان اس کا تحمل نہیں کر پاتی- شاید کچھ لوگوں کا خیال ہو کہ مصرع کی ترکیب فارسی ہوگئی ہے اس لئے ثقل پیدا ہوگیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں- سینکڑوں شعروں میں ترکیبیں پائی جاتی ہیں لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا۔ مثلاً انیس فرماتے ہیں —

میں ہوں سردارِ شباب چمنِ خلدِ بریں
میں ہوں خالق کی قسم دلکش محمدؐ کا مکیں

انیس کا تمام کلام اس خوبی سے معمور ہے اور ان کا ہر شعر وصف کا مصداق ہے۔ نمونے کے طور پر دو شعر نقل کرتے ہیں۔

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں
قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

کلام کی اصلی ترتیب قائم رہنا : - ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے وہ بجائے خود قائم رہے - مثلاً- فاعل مفعول- خبر متعلقاتِ فعل جس ترکیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں، یہی شعر میں بھی قائم رہے ۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ شعر میں اس ترتیب کا بقید قائم رہنا قریب قریب ناممکن ہے صرف ایک آدھ شعر یا بہت سے بہت دو شعروں میں اتفاقیہ یہ بات پیدا ہو جاتی ہے لیکن چونکہ نظم کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے یہ تب ہی ممکن ہے۔ جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے ۔ اسی بنا پر شاعر کو کوشش کرنی چاہیئے کہ اصل ترتیب جہاں تک ہو سکے پوری قائم رہے- جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا شعر زیادہ صاف برجستہ رواں اور ڈھیلا ہوگا یہ صفت انیس سے زیادہ کسی اور کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

روزمرّہ اور محاورہ : - جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہل زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل متداول ہوتی ہیں انکو روزمرّہ کہتے ہیں- روزمرہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے لیکن فی الحقیقت وہ فصاحت ہی کا ایک جزو خاص ہے۔ اس لئے روزمرہ کا فصیح ہونا بھی لازمی امر بن جاتا ہے- انیس کے کلام میں نہایت کثرت سے روزمرّہ اور محاورہ کا استعمال پایا جاتا ہے اور اس پر ان کو ناز بھی تھا- چنانچہ فرماتے ہیں — مرغانِ خوش الحانِ چمن بولیں کیا خاک مرجاتے ہیں سن کے روزمرّہ میرا

حسنِ کلام : - کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کئے جائیں- لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کی مختلف اقسام ہیں- مہیب پر رعب- سخت، نرم، شیریں، لطیف- اسی طرح الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ کر مختلف طرح کے ہوتے ہیں بعض نرم شیریں اور لطیف- بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہے۔ بعض سے درد اور غمگینی پیدا ہوتی ہے۔ اسی بنا پر غزل میں سادہ شیریں سہل اور لطیف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں- قصیدہ میں زوردار الفاظ اور اسی طرح رزم بزم مدح ذم فخر ادّعا اور وعظ و پند ہر ایک کے لئے جدا جدا الفاظ ہیں- ہر قسم کے مضامین میں ایک ہی قسم کے الفاظ سے بھرپور کلام بجز ایک خاص رنگ کے بالکل بے اثر ہوتا ہے ۔ یہی ایک نکتہ ہے کہ سعدی سے رزم اور فردوسی سے بزم نہیں نبھ سکی۔

(باقی صفحہ نمبر ۲۶ پر)

تنقیدیات

حیدرآباد میں اُردو نثر کے دس سال

جدید نثر نگاروں کا تنقیدی جائزہ

فرانس کا مشہور نقاد تین کسی ادبی کارنامے کیلئے تین عناصر کی آمیزش یعنی نسل، ماحول اور وقت کے اشتراک و امتزاج کو ازحد ضروری سمجھتا ہے گویا ہمیں کسی فن پارے پر رائے دینے سے قبل ان عناصر کی روشنی میں فن پارے کا جائزہ لینا ضروری ہوگا۔ اس کے برعکس [illegible] کہتا ہے کہ ادب کو صرف ادب ہی کے معیار پر پرکھا جائے۔ اس کا یہ کہنا اس حد تک صحیح ضرور ہے کہ فن پارے میں سب کچھ تو ہو لیکن اس میں ادبیت مفقود ہو تو یہ ادب پارہ قطعی ادبی فن پارہ کہلانے کا مستحق نہیں مگر جہاں تک ادب کی قدروں کا تعلق ہے وہ ہر زمانے میں بدلتی رہی ہے اس سے انکار نہیں کہ ہر ادبی کارنامہ تاریخ کے ایک خاص موڑ پر وجود میں آتا ہے اور فن کار لاکھ چاہے مگر وہ فن کو ماحول اور حالات سے قطعی بچا نہیں سکتا۔ خود حیدرآباد کی جدید نثر کا جائزہ لیں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی۔ حیدرآباد کی جدید نثر کی تاریخ اور ادوار کا تعین اس طرح کیا جا سکتا ہے۔ (۱) پہلا دور (عہد عثمانی کی سرپرستی) (۲) دوسرا دور ۱۹۴۷ء کے بعد (۳) تیسرا دور قیام آندھرا کے بعد۔

عہد عثمانی کے نثر نگاروں کو جو تعاون اور سرپرستی حاصل ہوئی وہ بعد کے لکھنے والوں کو میسر نہ آسکی اس عہد کے نثر نگاروں کو جو شاہی ماحول ملا اسی کا نتیجہ ہے کہ اس دور کے نثر نگاروں نے شاہی ادب کو محفوظ کر لیا۔ ان نثر نگاروں نے سلاطین امراء اور درباری شاعروں کا سراغ لگایا قلی قطب شاہ، نصرتی، وجہی، غواصی، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور ایسے ہی کئی شعراء اور ادیبوں کو مولوی عبدالحق، پروفیسر وحید الدین سلیم، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری اور نصیر الدین ہاشمی نے روشناس کروایا۔

اس کے بعد دوسرے دور کے نثر نگاروں میں ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اکبر الدین صدیقی، سید مبارز الدین رفعت، زینت ساجدہ، ڈاکٹر سیدہ جعفر قابل ذکر ہیں اس عہد کے نثر نگاروں نے دکنی ادب کو محفوظ کرنے میں اپنے پیشروؤں کے کاموں میں قابل قدر اضافہ کیا۔ افسانہ نگاروں میں جیلانی بانو۔ واجدہ تبسم۔ آمنہ ابوالحسن ہیں جن کے افسانوں میں جاگیردارانہ نظام کی جھلکیاں اور بدلتے ہوئے حالات اور ترقی پسند رجحانات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

حیدرآباد میں جدید نثر کے تیسرے دور کا آغاز قیام آندھرا پردیش کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ قیام آندھرا پردیش کے بعد حیدرآباد کی تاریخ ایک نیا موڑ لیتی ہے جاگیردارانہ نظام زوال پذیر ہو گیا۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات نئے ادب پر پڑنے لگے۔ ادب میں نئے رجحانات کا چلن ہونے لگا۔ یہ رجحانات بڑی حد تک مغرب کی تقلید کی وجہ سے رواج پاتے رہے ادب کے دروازے

زندگی کے اظہار کے لئے کھول دئے گئے اور ادب برائے ادب کی بڑی شدومد سے مخالفت کی گئی۔ اس دور کے ادیبوں کے یہاں روایت پرستی، رجعت پسندی، اور کلاسکیت کے خلاف بغاوت ملتی ہے۔ اس نئی نسل کے لکھنے والوں نے ادب کے جمالیاتی یا تاثراتی اقدار سے بڑی حد تک گریز ہی نہیں کیا بلکہ بڑی حد تک سادہ بھی کیا ہے۔ اس کے برعکس ادب کے سماجی اقدار اور ترقی پسند رجحانات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ نثر نگار حالات اور ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے کیونکہ ادیب محض زندگی کی نقالی نہیں کرتا بلکہ فطرت میں جو کھانچے رہ جاتے ہیں ان کو ملانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

۱۹۶۲ء کے بعد حیدرآباد میں جو نثر نگار ابھرے ہیں ان کی ہمت افزائی کرنے میں یہاں کے اخبارات و رسائل کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ جہاں روزنامہ سیاست نے ابھرتے ہوئے اور جواں سال ادیبوں کی ہمت اور حوصلے بڑھائے ہیں۔ وہاں روزنامہ رہنمائے دکن کے بچوں کے صفحے سے بہت سے نوشق اچھے ادیب بنا کر ابھرے ہیں۔ روزنامہ ملاپ نے پچھلے چند سالوں سے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن کا سلسلہ شروع کیا ہے اس اخبار سے بہت سے نئے لکھنے والوں کو مواقع ملے ہیں یہاں کے ادبی رسائل میں سب رس، صبا، نوم اور خاتون دکن کا اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ ان جرائد نے جدید نثر نگاروں کو پرانے اور کہنہ مشق ادیبوں کے ساتھ جگہ دی ہے Warren کی یہ بات بڑی حد تک صداقت پر مبنی ہے کہ فن پارے کو جانچنے سے قبل ادیب کی شخصیت اور سوانح کو قطعی طور پر بھول جانا چاہئے اور فن کو صرف فن ہی کی بنیاد پر پرکھنا چاہیئے۔ ادھر چند سالوں سے اصنام پرستی کا ایسا رواج رہا ہے کہ ہر بڑے ادیب کی ناکارہ حرکت کو بھی سراہا جانے لگا ہے۔ فن کو شخصیت اور عمر کے لحاظ سے ترجیح دینا ایک بڑی بھول ہوگی۔ ایسا کرنا نئے لکھنے والوں کے حق میں برا ہوگا۔ بعض ایسے پرانے لکھنے والے موجود ہیں۔ جن کا قلم اب زنگ آلود ہو گیا ہے ان کو محض اسلئے گوارا کریں کہ یہ پرانے لکھنے والے ہیں بڑی ناانصافی ہوگی۔

نئے نثر نگاروں میں خاصی تعداد افسانہ نگاروں کی ہے۔ پچھلے چند سالوں سے بے شمار افسانے لکھے جا رہے ہیں اس کی بڑی وجہ مقبولیت ہے موجودہ دور میں عدیم الفرصتی کی وجہ سے بسا اوقات وقت نکالنا دشوار نظر آتا ہے۔ اس لئے اس زمانے میں افسانے اپنے ایجاز و اختصار اور جامعیت و بلاغت کی وجہ سے زیادہ پڑھے جا رہے ہیں۔

عفت موہانی کے یہاں فن کا بھرپور التزام ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کلائمکس اور اس کے اختتام پر کافی توجہ دی ہے عفت موہانی نے عصمت چغتائی کی طرح گھریلو موضوعات اور سماجی مسائل کو اپنے افسانوں میں سمویا ہے مگر انھوں نے عصمت کی طرح نفسیات کی گتھیوں میں الجھنے سے اپنے آپ کو بچایا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں پر عصمت کی چھاپ ہونے کے باوجود وہ عصمت کے افسانوں سے قدرے مختلف ہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کرداروں کی نفسیات کو فرائڈ کے نظریے سے دیکھنے سے گریز کیا ہے جیسا کہ اکثر عصمت کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے عریانیت سے بچے ہوئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں صحت مند معاشرے کی تشکیل نظر آتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں مریضانہ ذہنیت کو جگہ نہ دی وہ ادب میں پاکیزگی کی قائل ہیں۔ وہ برانگیختہ جذبات کو صرف لذت کوشی سمجھتی ہیں۔ عفت یہیں

فن کارانہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ اگر وہ گھریلو اور سماجی مسائل سے ہٹ کر دنیا کے اور مسائل میں بھی جھانکنے کی کوشش کریں تو موضوع میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔ رضیہ الجبار کے افسانوں پر جمالیاتی رنگ غالب ہے۔ ان کی تحریروں پر نیاز اور سجاد حیدر یلدرم کے اثرات نمایاں ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ادب میں جمالیاتی اسکول سے قریب نظر آتی ہیں۔ انھوں نے غم جاناں کیساتھ غم دوراں کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانے کی سرخیاں پلاٹ کے بھرپور تاثر کو پیش کرتی ہیں۔ رضیہ الجبار کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی اس کی منظر کشی اور فضا ہوتی ہے۔ رفعت صدیقی نے اپنے افسانوں میں زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے اپنے اندر زندگی کا شعور رکھتے ہیں۔ انھوں نے سماجی اور معاشی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ کریم رضا افسانوں میں کشمکش کو کافی اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے معاشی مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ اپنے افسانوں کے کرداروں کیساتھ بھرپور انصاف کیا ہے اور معاشی مشکلات کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔

نئے افسانہ نگاروں کا ایک مجموعہ "نیا کارواں" کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے جس کے لکھنے والوں میں رفعت صدیقی، رؤف خلش، شاہد عظیم اور وقار اعظمی قابل ذکر ہیں۔ یہ نئی نسل کے لکھنے والوں کا نقطۂ آغاز تھا نقطۂ آخر نہیں۔ ماہنامہ پیکر نے نئے لکھنے والوں کو تعارف کرانے میں خاص رول ادا کیا ہے مگر یہ رسالہ زیادہ دن جاری نہ رہ سکا۔ شاہد عظیم د عظیم صدیقی نے بڑے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانے احساساتی اور جذباتی ہیں۔ انھوں نے روٹی سے لیکر شادی تک کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ وقار اعظمی نے متوسط گھرانوں کے ساتھ ساتھ نچلے طبقات کی بھی افسانوں میں بھرپور نمائندگی کی ہے۔ حمید آرمودی بھی پچھلے چند سالوں سے رسائل میں چھپ رہے ہیں ان کی کہانیاں زیادہ تر سماجی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ احمد ہمیش نے گو کہ ابھی بہت کم لکھا ہے مگر ان کے ہاں فن کے بڑے اچھوتے نمونے ملتے ہیں۔ ان کی فکر بھٹکی ہوئی اور تحریر میں ذہنی جھنجلاہٹ نمایاں ہے۔ بہتر ہے کہ وہ اپنی فکر کا تعین کریں اور افسانوں کو خواب پریشاں نہ ہونے دیں۔ خدیجہ ہاشمی اور کشور سلطانہ دو ایسی خواتین افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں جذبات نگاری خاص اہمیت کی حامل ہے۔ خدیجہ ہاشمی نے زیادہ تر جذباتی افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں اضطرابی کیفیت ملتی ہے۔ کشور سلطانہ افسانوں میں کہانی کے موڑ کو خاص اہمیت دیتی ہیں اگر وہ سنجیدگی سے اس جانب توجہ کریں تو بہتر ہوگا۔

حیدرآباد میں مزاح پر بہت کم توجہ دی گئی ہے مرزا فرحت اللہ بیگ ناکارہ۔ آغا حیدر حسن، بھارت چند کھنہ، زینت ساجدہ کے بعد جو نئے مزاح نگار ابھرے ہیں۔ ان میں مجتبیٰ حسین، صفیہ اریب اور احمد جلیس خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

مجتبیٰ حسین کا فن پڑا پختہ ہے ان کی تحریر میں بے ساختہ ہنسی کا وہ عنصر موجود ہے جو شوکت تھانوی کا خاص وصف رہا ہے ان کے چھوٹے چھوٹے برجستہ چست جملے مزاح کی لطافت لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے اسکیچ بڑے جان دار ہیں قاری کو متاثر کرنے کا ایک خاص انداز ہے کبھی ان کا قاری ہنستے ہنستے ایک دم خاموش ہو جاتا ہے یہ ان کے مضامین میں ایک ایسا موڑ ہوتا ہے جہاں ہنسی کا لبادہ پھٹ جاتا ہے اور اندر سے زندگی کے تلخ حقائق جھانکنے لگتے ہیں۔ ان کے اسکیچ افسانے کی طرح اپنا کلائمکس اور اختتام رکھتے ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنا اور بات بات پر لطیفے چھوڑتے رہنا ان کے اسٹائل کی خاص خوبی ہے۔ صفیہ اریب

کے طنز و مزاح کا خاص موضوع عورت کی بے بسی اور شوہر کی لاپرواہی رہا ہے۔ ان کے یہاں مزاح کم اور طنز زیادہ ہوتا ہے۔
ان کے مضامین میں شوہر کی حماقتوں پر جہاں ہنسی آتی ہے، وہاں عورت کی مظلومیت کا احساس بھی بڑی شدت سے محسوس
ہوتا ہے۔ ان کے مزاح میں زخمی ہنسی اور گھٹے ہوئے قہقہے کی کیفیت ہوتی ہے۔ احمد جلیس نے مزاح کیساتھ مقالے، افسانے اور
ڈرامے بھی لکھے ہیں مگر اپنے مزاح کی وجہ سے حیدرآباد کے حلقوں میں مشہور ہیں۔ ان کا انداز تحریر بڑا ہی دلکش ہے۔ ان کے مزاح میں
طنز کا عنصر زیادہ ہوتا ہے وہ مزاح میں دانت دکھلا کر ہنسنے کے قائل نہیں انھوں نے فیشن پرستی اور اصنام پرستی کے خلاف جہاد کیا ہے۔

بدیع حسینی نے دکن میں ریختی کے ارتقاء پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے جو اب کتاب کی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔ عابدہ ابوالحسن
کا شمار جامعہ عثمانیہ کی ذہین طالبات میں رہا ہے۔ انھوں نے شاہ کمال کو گمنامی سے نکالا ہے ان کی تحریر دلکش اور انداز بیاں بڑا
اچھوتا ہے۔ خواجہ حسینی نے اردو نعت پر کام کیا ہے کبھی کبھار ادبی مضامین لکھ لیتے ہیں۔ مصطفیٰ کمال کا تعلق بھی جامعہ عثمانیہ سے ہے۔ ان کا
موضوع بھی تحقیق رہا ہے۔ ان کے علاوہ موسیٰ کاظم داؤد اشرف اور رفعت سلطانہ نے ادبی مضامین لکھے ہیں۔ داؤد اشرف کا انداز بیان
شگفتہ ہے وہ بات کہنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ رفعت سلطانہ کے مضامین طرز ادا کا خاص نمونہ ہوتے ہیں۔ ان کے انداز میں تیکھا پن ہے۔

طیب انصاری پچھلے چند سالوں سے تنقیدی و ادبی مضامین لکھ رہے ہیں۔ حیدرآباد میں تنقیدی مضامین لکھنے والوں کی خاص کمی رہی ہے۔ ان کی طرز ادا
پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی گہری چھاپ ہے بات سلجھانے میں انھوں نے وہی روش اختیار کی ہے ان کی تنقید میں وزن ہوتا ہے مگر جب کسی
ادیب یا فن پارے پر حکم لگاتے ہیں تو کبھی کلیم الدین احمد کی طرح چبھتے ہوئے جملے لکھنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید اپنے طرز نگارش کے تقتیل
ہیں بڑے عمدہ مضامین لکھے ہیں۔ رشید الدین نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے تراجم پر بھی خاص توجہ دی ہے ان کے مضامین ادبی، سماجی اور تہذیبی
ہوتے ہیں۔ ان کا شمار حیدرآباد کے زیادہ چھپنے والوں ہوتا ہے۔ طرز ادا میں ندرت ہے۔ نظام الدین مغربی نے تاریخ دنیا کو اپنا موضوع بنایا ہے۔
عرصہ دراز سے لکھنے کے باوجود اپنا مقام پیدا نہ کرسکے۔ اس میں ان کی تحریر کے قصور کے ساتھ ہی موضوع کا اثر بھی ہے۔

ان نثر نگاروں کا اپنے پیشروں کیساتھ تقابلی مقابلہ کرنا ایک تاریخی و ادبی غلطی ہوگی اور ان نثر نگاروں کو دوسری
زبانوں کے نثر نگاروں سے گڈمڈ کرنا بھی ایک زبردست بھول ہوگی جو ٹی ایس ایلیٹ نے الزبتھ عہد اور سترہویں صدی کے
انگریزی شاعر اور ڈرامہ نگاروں کا ناطہ فرانس کے اشاراتی شاعر سے جوڑ کر کی تھی۔ کیونکہ ایک خاص عہد کی ادبی روایتیں
دوسرے عہد میں فرسودہ تصور کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس عہد کا ادب اس خاص تاریخی و سماجی حالات کا نتیجہ ہوگا۔

تقابلی مطالعہ کے بجائے اگر ہم ماضی اور حال کے دھاگوں کو ملائیں تو حیدرآباد کے جدید نثر کے ارتقاء کا تعین کرنے میں
بڑی آسانی کے ساتھ نئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی۔

قیوم صادق

خطیبؔ کی شاعری — ایک جائزہ

دکن زندہ کردم بایں آرزو
کہ نام بماند دریں چار سو

یہ شعر سلیمان خطیبؔ کی دکنی شاعری پر صادق آتا ہے۔ خطیبؔ کی شاعری وہ سنگم ہے جو نئے اور پرانے دور کو ملاتی ہے یہ آج کی خالص اُردو میں بھی شاعری کرتے ہیں تو اس میں ایسی شگفتگی، ندرت و لطافت ملتی ہے کہ جی خوش ہو جاتا ہے۔ لیکن سب سے بڑا کام جو انھوں نے اپنے ذمے لیا ہے وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو قائم رکھنا ہے۔ چار سو سال پہلے جس کی دھوم تھی۔ آج بھی اُن کے نام عزت سے لئے جاتے ہیں۔ شاعری کی ہر صنف کو پیش کیا اور داد تحسین حاصل کی۔ قلی قطب شاہ کا کلیات، وجہیؔ کی قطب مشتری، نصرتیؔ کا گلشن عشق، علی نامہ، علی عادل شاہ شاہیؔ کا کلیات شاہی، مقیمی کی چندر بدن و مہیار، ابن نشاطی کی پھول بن وغیرہ اس کی زندہ جاوید اور شاندار مثالیں ہیں۔ آج بھی ہم محسوس کرتے ہیں کہ دکنی زبان دکن کے علاقوں میں جوں کی توں قائم ہے۔ اور عام و خاص آدمی دکنی زبان میں بات کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے۔ آج کا تعلیم یافتہ دکنی روزانہ گفتگو اس میں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ یہ اسی ماحول میں پیدا ہوا اور پرورش پاتا رہا ہے۔

خطیبؔ کا تعلق ضلع گلبرگہ شریف سے ہے۔ جہاں حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ آرام فرما ہیں۔ دکن کی یہ وہی سرزمین ہے جو سب سے پہلے اُردو ادب کی پیدائش اور ترقی کیلئے سازگار رہی اور اسی گلبرگہ سے اُردو کی تحریک ترقی پذیر ہوئی۔ خطیبؔ بھی عوام کی زبان میں اپنے خیالات شاعری کے ذریعہ لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔ ان کے خیالات میں بلندی، جذبات میں خلوص اور زبان میں بے انتہا صفائی اور سادگی ہے جو چیز بھی ان کے قلم سے نکلی ہے گہری فکر کی آنچ میں تپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ دنیا کو انھوں نے ہوشمندی کی نگاہ سے دیکھا بھی اور جذبہ کی گرمی کے ساتھ برتا بھی۔ ان کے بالغ اور رچے ہوئے ذوق نے تجربوں اور مشاہدوں اور عام انسانی احساسات کو اس حسن کاری اور تخیل کی رعنائی کے ساتھ شعر میں سمویا ہے کہ ان میں بلا کی وسعت اور با اعتبار اثر غضب کی گہرائی پیدا ہو گئی ہے

خطیبؔ سچے وطن پرست ہیں۔ ان کے دل میں ہمہ گیر محبت کی حقیقی تڑپ اور مزاج میں مستی و سرشاری کی والہانہ کیفیت ہے ان کے کلام میں درد و تاثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اسی لئے ان کا کلام جذبات نگاری کا بہت جاندار مرقع ہے۔ ان کے اشعار میں سادگی اور صفائی اتنی زیادہ ہے کہ بلا غور و فکر اشعار ذہن میں سما جاتے ہیں اور دل میں نشتر کی طرح اُتر جاتے ہیں۔ خطیبؔ اپنے کلام کو پڑھتے بھی خوب ہیں بالمقبول شخصے "خطیبؔ کا کلام پڑھنے کے بعد قاری پچاس فیصد متاثر ہوتا ہے اور کلام سننے پر ڈیڑھ سو فیصد متاثر ہوتا ہے۔"

نتیجہ یہ ہے کہ ہر خاص و عام محظوظ ہوتا ہے۔ طبیعت میں سوز و گداز اس طرح اپنا کام کر رہے ہیں جیسے رگوں میں لہو۔

روزمرہ کی زندگی کی اصلاح چھوٹی چھوٹی نظموں میں اس طرح کرتے ہیں کہ فلسفی اور واعظ کی لمبی لمبی تقریریں یا تحریریں ہیچ ہیں۔ سیاسی معاملات کو بھی دور اندیشی کی عینک سے دیکھتے اور اپنے اشعار سے لوگوں کو نتائج کی خبر دیتے ہیں اُن کی ظرافت اور بذلہ سنجی کسی نہ کسی تبلیغی مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے اور خوبی یہ ہے کہ ان کی نصیحت کبھی ناخوشگوار نہیں معلوم ہوتی۔ اپنے طرزِ بیان سے وہ تلخ باتوں کو بھی شربت کا گھونٹ بنا دیتے ہیں۔ وہ اپنے کلام سے دنیا کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مناظرِ قدرت کی تصویر کشی میں خطیب کو کمال حاصل ہے۔ عموماً پوری تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔

فطرت کے مظاہر میں خطیب کی نظر حسن و خوبی کے پوشیدہ سے پوشیدہ پہلو ڈھونڈ لیتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی طرح وہ کہیں فطرت کے پرستار ہیں اور کہیں حالی اور اکبر کی طرح اخلاق نگار لیکن اکبر کی طرح حسنِ بیان کا پہلو ان کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹتا خطیب ورڈز ورتھ کی طرح فطرت کے بڑے دلدادہ ہیں۔ روزمرہ زندگی کی مانوس اور سادی سیدھی چیزوں میں ان کی نظریں حسن کے ایسے دلکش پہلو دیکھ لیتی ہیں جو عام نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ حبِ وطن پر ان کی بعض نظمیں لاجواب اور بہترین ہیں۔ ان کے کلام میں آفاقی عناصر موجود ہیں جو وقت کی قید سے آزاد ہیں۔ ان کے روح پرور نغمے ہمارے دل کی پکار ہیں۔ یہ آج اور آئندہ کے لوگوں کی آپ بیتی ہے اور ان کا یہ کلاسیکل انداز انھیں ہمیشہ زندہ رکھیگا۔

خطیب ایک بڑی ہی رنگین، ایک بڑی ہی پُرکار اور پہلودار شخصیت رکھتے ہیں اور اس رنگین پرکاری اور پہلوداری کی جھلک ان کی ایک ایک بات میں نظر آتی ہے۔ ان کی زندگی کے ایک ایک پہلو میں ان سب کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ان کی ہر بات ایک مقام سے شروع ہوتی ہے، اور ایک مقام تک پہنچتی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ روتوں کو بھی ہنسا سکتے ہیں۔ مردہ دلوں میں بھی جولانی کی لہر دوڑا سکتے ہیں۔ غرض خطیب کی شاعری میں شوخی کا پہلو مختلف زاویوں سے رونما ہوتا ہے اور یہ سب کچھ ان کی رنگین پُرکار اور پہلودار شخصیت ہی کا نتیجہ ہے۔

خطیب کی شاعری کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ :—

۱۔ خطیب دراصل خالص اُردو، دکنی کے شاعر ہیں۔

۲۔ ان کی تعلیم و تربیت ایسے ڈھنگ سے ہوئی ہے کہ وہ ہر ماحول کو بخوبی سمجھ جاتے ہیں۔

۳۔ ان کا دکنی کلام قابلِ فہم ہے اور معنویت رکھتا ہے۔

۴۔ وہ اُردو، دکنی محاورہ اور روزمرہ کا استعمال بخوبی کرتے ہیں۔

۵۔ ہندی۔ انگریزی، کنڑا، تلگو، مرہٹی کا ترجمہ بھی لکھتے ہیں۔ جو آج کل روزمرہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

۶۔ سنجیدہ بات کو بھی مزاحیہ انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری پڑھنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

۷۔ ان کا پورا کلام دکن کا عام قاری مزے لے لے کر پڑھتا ہے۔

موجودہ دکنی شاعری میں خطیب اپنے تجربوں کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھنے والا شاعر ہے۔ اس نے دکنی شاعری کے اُفق کو وسیع کیا۔ وہ اپنے نادر اور جدید تجربوں کو جذباتی، تخیلی اور رجائی حیثیت دے کر سارے ماحول کو شاعرانہ بنا دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو ـــــ

غریباں کا درد لے کو محمد مصطفےٰ آئے ــ ہمے بے آسرا تھے جی، ہمارا آسرا آئے (نبی خانہ)

—(٭)—

ہمے بے سہارا ہیں بندہ نوازؒ ــ غریباں کا تمنا سہارا کتیں
تمے کیا مجتبیٰ کی معلوم نیں ــ ہمارے کو لوگاں تمارا کتیں
(نذر خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ)

—(٭)—

ہمالہ کی چاندی پگھلتی رہے ــ مرے گھر میں گنگا اُبلتی رہے
یہ گوتم کی گاندھی کی پیاری زمیں ــ ہمیشہ جواہر اُگلتی رہے
مری ماں تو مجھ سے بھی کچھ کام لے ــ ضرورت ہو میری تو آواز دے
اہنسا ہی کا بول بالا رہے ــ ترنگے کا جگ میں اجالا رہے (ہمالہ کی چاندی)

—(٭)—

دکنی کا اک دور انکوہ کن گزر گیا جی ــ کی بعد ان نمط کا شیریں سخن اچھیں گا
دکنی کوں جو نپڑے سوں ایوان میں بٹھایا ــ اپنچ واسطے تو گز بھر جگا نہ پایا
(ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ)

—(٭)—

موں اندھارے آکو دیکھ ڈر بن جاتی ہوں میں ــ طور بن جاتی ہوں میں جی نور بن جاتی ہوں میں (رکمنڈی)
کتنی نازک پھول سر کی جل پری کے روپ میں ــ کبھی چاندی چاندنی میں پکا سونا دھوپ میں (ندی)

—(٭)—

موٹ کا پانی پائل باجے ــ رادھا جیسے چھم چھم ناچے
مست اکر کر کرشن سرکا ــ مرلی بجانا ہمنا ساجے
مٹھا مٹھا موٹ کا پانی
موٹ چلاتوں ہلو ہلو (موٹ کا گیت)

دیکھو برکھا کے بادل ستانے لگے ــ ہور تمے یاد مجو تیج آنے لگے (دکھنی عورت کا انتظار)
اُٹھ کو صدر یہ بولیا عبادت کا یہ رتن ہے ــ انمول اس کے باتاں ہیرے کا ہر سخن ہے
عزت ہے کتی میری دُنیا کو تو بتا دے ــ مُجھکا ہوں کل سے باشا اک چائے تو پلا دے (شاعر کی عزت)

—(٭)—

بیٹی ہو چاند بی بی بیٹا ہو ٹیپو جیسا ــ ورنہ تو میرے مالک مائیں کو بانجھ کر دے (ہمارے بچے)
اک طرف موشادیاں ہیں سیٹھ کا ہے سیٹھ دل ــ اک طرف ہے ایک چودری باپ کی چھاتی پہ سل
(دو طرفہ)

—(٭)—

جس کی بچی جوان ہوتی ہے   کس مصیبت میں جان ہوتی ہے
بوڑھے ماں باپ کے کلیجہ پر   ایک بھاری چٹان ہوتی ہے   (جہیز جیسی)

(۵)

یاد ہوئے تو دل میں چھپانے کی بات   چپ ذرا سوچ کر مسکرانے کی بات   (یاد)

اور چین کی وہ کھینچی ہوئی دیوار کہاں ہے
اینٹم کا بنایا ہوا انبار کہاں ہے

کیا خوب پڑوسی ہے پڑوسی بھی ہمارا   (پڑوسی نامہ)

(۶)

بولی فادر مزے میں سوتے ہیں   ہم تو دنیا میں بور ہوتے ہیں
تو جو بیٹا بنا کو چھوڑی ہے   غیر لوگاں کا کیا گلہ اماں   (ایک قبرستان دو مناظر)

(۷)

اپنی محنت کا ٹکڑا کھانے کو   پھٹی کمبل میں ڈولنا اچھا   (محبوب صاحب اور محبوبہ بی)

(۸)

مندرجہ بالا اشعار کے فنی تجزیہ سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ ان میں مشاہدہ یا خیال احساسات، جذبات، تخیلات و واردات داخلی کی منزلوں سے گزر کر شاعرانہ تجربہ کی نئی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔ فن کاری کا خارجی تجزیہ ایک تازہ و شاداب تصویر، ایک نادر تعبیر، ایک جدید تنقید یا ایک بدیع مثال کی صورت میں تخلیق نو کا جامہ پہنتا ہے۔ ان اشعار میں حسن تجربہ حسن پیشکش اور حسن اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خطیب کی شاعری خطیبانہ انداز لئے ہوئے دلوں پر چھا جاتی ہے۔ یہ ماضی میں بھی پسند کی گئی حال میں سب کو پسند ہے۔ اور مستقبل میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیگی۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۸ سے آگے)

میر انیس نے رزم، بزم، فخر اور نوحہ سب کچھ لکھا ہے۔ لیکن جہاں جس قسم کا موقع آیا اسی قسم کے الفاظ ان کی قلم سے نکلے رزمیہ فخریہ لکھتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی   رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

جلال اور غیض کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں ؎

ع   نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

کیا جانے کس نے روک دیا ہے دلیر کو   سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

ان اشعار میں جو الفاظ آئے ہیں۔ جس طرح۔ ان کے مفہوم میں غیض و غضب ہے اسی طرح الفاظ کی صورت اور لہجے سے بھی ہیبت اور غیض و غضب ٹپکتا ہے۔

ڈاکٹر احتشام احمد ندوی

ادبی تنقید میں تحریک رمزیت

کالرج نے الفاظ کے حقائق کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ میں اشیاء اور الفاظ کے درمیان قدیم تصورات کی دیواروں کو منہدم کرنا چاہتا ہوں اور الفاظ کو اشیاء کی شکل میں نہیں بلکہ زندہ و متحرک شکل میں پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ امرسن نے اس تحریک کی بنیاد رکھی جس کو تحریک رمزیت (SYMBOLISM) کہا جاتا ہے۔ امرسن نے پہلی بار اعلان کیا کہ الفاظ اور اعمال مختلف اشیاء ہیں۔ شاعر فنکار ہے مگر اس کا فنکار ہونا اس کو عمل سے دور نہیں کر سکتا۔ اگر کسی شئے کا آپ اظہار کریں تو یہ فن نہیں ہے۔ فن تو آخر میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً انسان کسی شئے سے تاثر قبول کرے پھر اس کو ظاہر کرے اور اس تاثر کا کوئی نام رکھے تو یہ نام رکھنا فن ہو تا تاثر فن نہیں ہو سکتا۔

الفاظ کی عظمت اور اس کے عملی پہلو پر مشہور عرب ناقد عبد القاہر جرجانی نے اپنی کتاب اسرار البلاغۃ میں بڑے عالمانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جب ہم کسی عبارت یا کسی شعر کی تعریف کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ کیسے شاندار الفاظ ہیں کتنی عمدہ عبارت ہے کتنے پرکشش جملے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم الفاظ ترکیب اور جملوں کی تعریف کر رہے ہیں کہ ہم ان تخیلات و تاثرات کی عظمت کا اس طرح اظہار کرتے ہیں جو یہ الفاظ ہمارے قلب و ذہن پر مرتب کر رہے ہیں اور جو تصویریں یہ ہمارے اذہان میں محفوظ کر رہے ہیں ہم درحقیقت ان تصویروں اور خیالات کی تعریف کرتے ہیں۔ اس طرح یہ عظیم مشرقی ناقد نو سو سال قبل اپنے تنقیدی کارناموں میں تحریک رمزیت کی روح پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ الفاظ مصوری کرتے ہیں۔

ایک ناقد کہتا ہے کہ ذہن ایک قوتِ متحرکہ ہے مگر اس کو مافوق الفطرت قوت تجربہ سے تعبیر کرتا ہے اور اس کو اعلیٰ طاقت (TRANSCENDENTAL FORCE) قرار دیتا ہے جو حقائق کو اپنے انداز پر ڈھالتا ہے۔ امرسن کہتا ہے کہ شاعر پورے عالم کو شیشہ میں اتار لیتا ہے اور اس طرح ہمارے سامنے ہر شئے کی صحیح تصویر پیش کرتا ہے وہ اشیاء و امور کے تغیرات کو بھی دیکھتا ہے اس طرح اس کا کلام زندگی کی روانی کا ایک متحرک نقشہ بن جاتا ہے اس کا کلام فطرت کے ساتھ ارتقاء کی منزل طے کرتا ہے امرسن کہتا ہے کہ ہم خود رموز ہیں اور رموز ہی ہم نے وراثت پائی ہے۔ لیکن رمزیت کے اوپر غور و فکر کرنے سے ایک مسئلہ بڑا پیچیدہ بن کر سامنے آتا ہے اور وہ ہے شک۔ اور ابہام جو بھی یہ راہ اختیار کرتا ہے اس کو ابہام کی راہ سے گذرنا لازمی ہے۔ رمز و اشارہ کبھی یقین کی روشنی عطا نہیں کر سکتا۔ اس راہ میں حقیقت نہیں بلکہ عکس حقیقت ہی دیکھا جا سکتا ہے یہاں سایہ ہے جھاگ ہے اور بلبلہ ہے مگر اصل حقیقت انھیں اشیاء کے اندر مضمر ہے۔ رمزیت حقیقت نہیں ہے بلکہ حقیقت کی جانب حسین اشارہ ہے یہ اشارے ادب میں حسن، کیف، رعنائی اور رنگینی کا ذریعہ بنتے ہیں حسن خود بھی ایک مبہم شئے ہے اور رمزیت اس کیفیت کی

بھر پور غمازی کرتی ہے۔

جو ناقد طریقہ رمزیت کے علمبردار ہیں وہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ عدد، مقدار اور کمیت وغیرہ کو ادب میں کوئی اہمیت نہیں وہ زبان کی بے اختیت (NON-NOTATIONAL ASPECT OF LANGUAGE) کے قایل ہیں۔ یہ لوگ ان انفرادی ذاتی تجربات کا اظہار چاہتے ہیں جو نفس انسانی کو زندگی کی مختلف کیفیات میں حاصل ہوتا ہے۔ کسی زبان میں ان کیفیات کا اظہار آسان بھی نہیں۔ رمزیت پیدا ہونا ضروری ہوجاتا ہے۔ اصل میں رمزیت ایک مجرد تحریک یا طرز کا نام نہیں یہ ایک اصطلاح ہے۔ جو بہت سے پہلوؤں سے مرکب ہے حتیٰ کہ بعضوں نے تو یہاں تک شبہ کیا کہ رمزیت کا اپنا کوئی رنگ وجود بھی ہے یا نہیں؛ یہ اصطلاح بھی روحانیت کی طرح کچھ پیچیدہ سی ہوگئی ہے۔

ییٹس (YEATS) نے بڑی عمدہ بات اس سلسلہ میں لکھی ہے کہ ہر ادیب کا اسلوب ایک لامتناہی رمزیت کی ترجمانی کرتا ہے بلاشبہ ہر ادیب و شاعر کے پاس رمز، اشارہ اور غموض موجود ہے لیکن طرز سب کا اپنا منفرد ہوتا ہے جو ہمارے جذبات کو ہیجان میں لاتا ہے۔ اثر آفرینی کی یہ قوت ادیب کی عظمت کے لحاظ سے کم و زیادہ ہوتی ہے ملارمے (M ALLARME) لکھتا ہے کہ شعری زبان میں الفاظ انسان کے عہد طفولیت کے استعمال کئے جاتے ہیں جس میں زبان نصف زندہ ہوتی ہے اور نصف فراموش سی یا مُردہ۔

ییٹس تحریک رمزیت کے تین اصول پیش کرتا ہے :۔

۱۔ ہمارے اذہان تغیر پذیر ہیں اور ایک دوسرے سے تاثر قبول کرتے ہیں کبھی کوئی ذہن خود ایک قوت تخلیق کرتا ہے اور کبھی دوسری قوتوں کے ساتھ چلنے لگتا ہے۔ یہ چیزیں رمزیت پر اثرانداز ہوتی ہیں۔

۲۔ ہماری یادداشتیں بھی بدلتی رہتی ہیں اور اس کا اصل منبع ایک عظیم قوت ہے اور وہ قوت خود فطرت ہے۔

۳۔ اس عظیم ذہن اور قوت یادداشت کو قوت رمزیت کے ذریعہ ابھارا جاسکتا ہے۔

یہ قوت رمزیت تمام بشری قوتوں میں قوی تر ہے اسی کا جلوہ ہم شاعری، موسیقی، مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ میں دیکھتے ہیں۔

ایک دوسرا ناقد کہتا ہے کہ رمزیت دراصل عرفانِ نفس، شخصیت اور جذبات کی ایک کوشش ہے جس پر مناظر، اصوات اور تخیلی تجربے (IMAGINATIVE EXPERIENCE) اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس کی زبان میں اس کا جذبہ اس کے شعور کے سامنے واضح ہوکر آتا ہے اس لئے اس کی زبان اس کی کائنات بن جاتی ہے۔ اس کے تخیل کا صدور اس کے ذاتی علم سے ہوتا ہے۔ خالص مادی عالم رمزیت میں آکر ایک نئی شکل اختیار کرلیتا ہے اور جذبات کا ایک نیا پیرہن اسی کو مل جاتا ہے۔ اس کا نفس اور اس کی دنیا اس کے شعور کے سامنے نئے انداز میں پیش ہوتی ہے۔

بلاشبہ یورپ نے رمزیت کو ایک منظم شکل میں پیش کیا مگر یہ کوئی انوکھی شئے نہ تھی۔ تمام بڑے شعراء کے یہاں رمزیت کے

اعلیٰ نمونے موجود ہیں۔ میرؔ۔ غالبؔ اور مومنؔ کی شاعری رمزیت سے بھرپور ہے۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ فارسی تغزل کے اثر سے پوری اُردو غزل حسنِ رمزیت سے زعفران زار ہے اور ایسے اعلیٰ نمونے رمز و اشارہ کے موجود ہیں کہ بلا اس تحریک کے ہمارا شعری ادب ان متحرک الفاظ و خیالات سے مالا مال ہے جس کی دعوت بطور تحریک کے یورپ میں دی گئی اردو غزل دراصل رمز و اشارہ کی زبان ہے اور اسی قوت و صلاحیت نے اسکو عظمت بخش دی ہے۔ غزل کی ایک ایک اصطلاح ایک متحرک تصور ہے کہ ایک پورا عالم نگاہوں کے سامنے کر دیتی ہے۔ میخانہ' رند' گلشن' بلبل' چمن' صیاد اور کتنے الفاظ ہیں جو دراصل اپنے اندر ایک پوری داستان چھپائے ہیں۔ اسطرح اردو شاعری خصوصاً غزل رمزیت کی ایک اعلیٰ مثال ہے اور جاندار علمی نمونہ پیش کرتی ہے۔

بیجاپور کی اُردو مثنویاں

میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کیلئے "بیجاپور کی اُردو مثنویاں" پر ڈاکٹریٹ کیلئے مقالہ لکھ رہا ہوں اس سلسلہ میں جہاں تک میری رسائی ہوسکی ہے تمام بیجاپوری (عادل شاہی عہد) مثنویوں سے استفادہ کرچکا ہوں تاہم یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ ابھی کتنی مثنویاں ایسے گوشوں میں رہ گئی ہیں جن تک میری رسائی نہیں ہوسکی ہے میں ان تمام حضرات سے جنھیں دکنی ادب سے دلچسپی ہے درخواست کرتا ہوں کہ اگر ان کے پاس بیجاپور کی کوئی مثنوی ہو یا وہ کسی اور مثنوی سے واقف ہوں تو پتہ ذیل پر مجھے مطلع فرمائیں:۔

قیوم صادق احمد پوری

لکچرار شعبۂ اُردو گورنمنٹ مہارانی کالج

میسور ۱

اعلان

بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند۔ فارم ۴ رول ۸

ایڈیٹر کا نام = سید علی اکبر

قومیت = ہندوستانی

پتہ = ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد ملہ

پرنٹر کا نام = سید علی اکبر

قومیت = ہندوستانی۔

پتہ = ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد ملہ

پبلیشر کا نام = سید علی اکبر

قومیت = ہندوستانی

پتہ = ادارہ ادبیات اُردو۔

نام و پتہ مالک۔ ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد ملہ

میں سید علی اکبر تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

دستخط

سید علی اکبر

سید خواجہ حسینی

نذیر احمد اور ابن الوقت

نذیر احمد ادب برائے ادب کے معترف نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے حامی ہیں۔ اُن کی تصنیفات اُن کے اسی نظریہ کی مظہر ہیں۔ اس لیے ہمیں اُن کی تصنیفات میں ایک مقصدیت کارفرما نظر آتی ہے اُن کی اس مقصدیت کا مرکز سماجی اصلاح ہے اس سماج کی اصلاح جس میں وہ رہتے بستے تھے۔ اُن کا ناول ابن الوقت بھی اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ اس لئے ابن الوقت کا مطالعہ کرتے وقت اس سماجی پس منظر کا بھی جائزہ لینا ہوگا جس میں کہ ابن الوقت جنم لیتا ہے۔

ابن الوقت کا خالق اُس دور کا پروردہ ہے۔ جس میں قوم اپنے زوال کی انتہا کو پہونچ چکی تھی۔ متحدہ ہندوستان کے خواب دیکھنے والوں کے وارث شہنشاہِ دہلی کی حالت اُس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی سی تھی جس میں تیل ختم ہو چکا ہو جس چراغ کے ساتھ ہندوستان کے ایک شاندار دور کی یادیں اور ایک تہذیب کی داستانیں وابستہ تھیں وہ گل ہو رہا تھا۔ مرکز کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی علاقائی طاقتیں قومی انتشار میں اضافہ کر رہی تھیں ان سیاسی حالات میں ایک اور بڑی طاقت ابھر چکی تھی جو ہندوستان میں مغلوں کی وارث بنا چاہتی تھی۔ یہ انگریز تھے انگریز اپنے ساتھ ایک مذہب، تہذیب اور زندگی کے تعلق ایک نیا زاویۂ فکر ساتھ لائے تھے۔ یہ لوگ خود یورپ میں نئے دور کے پیامبر اور ایک زراعتی اور صنعتی انقلاب کے دور سے گذر چکے تھے جو سرمایہ دارانہ نظام سے واقف تھے اور سرمایہ کاری کا سلیقہ بھی رکھتے تھے۔

ہندوستان میں صرف قومی سیاست ہی کمزور نہ تھی بلکہ اس کا اثر زندگی کے مختلف اداروں پر بھی رہا۔ اس دور میں مذہب توہم پرستی کا دوسرا نام تھا جسے وہ لوگ روحانیت پرستی سے موسوم کرتے تھے۔ یہ مذہب بس ایک چھوئی موئی کا پتّا تھا ذرا ہاتھ لگایا اور کمھلایا۔ کسی نے انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش کی تو ذات باہر کر دیا۔ کوئی انگریزوں کے ساتھ ارتباط اور "مواکلت" روا رکھے تو اُسے کافر قرار دیا۔ اس توہم پرستی کی انتہا یہ ہے کہ دلی کالج کے ایک استاد بحالت مجبوری انگریز پرنسپل سے ہاتھ ملاتے تو اس ہاتھ کو الگ رکھتے اور جب تک کئی بار اُسے مٹی سے رگڑ رگڑ کر صاف نہ کرتے اس سے کوئی کام نہ لیتے۔

جب قوم اپنے زوال کی انتہا کو پہنچ چکی ہو تو ظاہر ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ پر اس کا اثر پڑے گا۔ اس دور میں عام طور پر تعلیمی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ سرسید، حالیؔ اور شبلی جیسے روشن دماغوں کے ساتھ ساتھ داستان امیر حمزہ پڑھ کر اپنے آپ کو مورخ عالم اور کچھ مزید داستانیں پڑھ کر اپنے کو جغرافیہ داں سمجھنے والوں کی بھی کمی نہ تھی قومی سیاست میں عدم استحکام کی وجہ سے لوگوں کی معاشی حالت بھی ابتر تھی۔ پرانے معاشی ادارے خورشید لب بام تھے اور ان کی جگہ نئے اداروں نے ابھی نہیں لی تھی لہٰذا

قتل و غارت کا جو بازار گرم تھا اس کی وجہ سے کئی افراد اور دسا جن کا کبھی طوطی بولتا تھا اب اُن کے گھر اُلو بول رہے تھے۔

خارجی حالات کا دھارا اتنا تیز و تند تھا کہ انسان کو اپنی داخلی قوتوں پر اعتماد نہ رہا۔ تخریبی سرگرمیوں نے وہ اودھم مچا رکھی تھی کہ کسی کو اپنی تعمیری صلاحیتوں کا احساس نہ رہا یہی وجہ ہے کہ وہ "بندگی" کو "بے چارگی" اور "قید حیات" کو "بند غم" سمجھتے رہے۔ ان حالات میں وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ انسان خودی کے زور سے دنیا پر چھا سکتا ہے مگر انہیں اس کا ضرور یقین تھا کہ خودی کو کھو کر ہی خدا کو پایا جا سکتا ہے۔ غیر یقینی حالات کا وہ طویل سلسلہ شروع ہو چکا تھا کہ اِک کر واقعات کے پیچھے کام کرنے والے اسباب کا پتہ لگانا کارے دارد والی بات تھی۔ اسی لیے وہ عالم اسباب پر غور کرنے کی بجائے آسانی کے ساتھ تقدیر پر یقین کر لینا چاہتے تھے اس افراتفری کے عالم میں لٹتی ہوئی زندگیوں کو دیکھ کر دوسرے عبرت پکڑتے اور لٹنے والے صبر کر لیتے۔ ان ناموافق حالات کو قسمت کا عطیہ سمجھ کر قبول کر لیتے کیونکہ حالات کا مقابلہ کرنے کی کسی میں نہ جرأت تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ تصوف ایک فلسفۂ حیات کا نہیں بلکہ ایک طرز زندگی کا نام ہے۔ یہ طرز زندگی ہمارے عوام کے لئے اخلاقی اصولوں کا منبع ہمارے ادیبوں کیلئے دنیائے خیال کی جولانگاہ اور ہماری تہذیب کی روح رہا ہے حالات کے اس طرح پلٹا کھانے کے بعد بھی عوام اسی طرز زندگی سے فیض یاب ہونا چاہتے تھے۔ اس چاہت میں خود تصوف کی صورت مسخ ہو کر رہ گئی۔ اس دور میں زندگی کی منفی قدروں نے جو جگہ پیدا کر لی تھی اس کا جواز بھی تصوف میں تلاش کیا گیا۔ جس سے اس سماج میں ایک غلط قسم کی روحانیت پرستی نے غلبہ پا لیا۔

ہندوستان کے افق سیاست پر جو نئی طاقت نمودار ہو چکی تھی اس نے زندگی کے ہر شعبے میں کامیابیاں حاصل کی تھیں ان کا سیاسی اقتدار مغرب سے مشرق تک پھیلا ہوا تھا۔ سائنس اور جدید علوم میں ان کے کارنامے قابل تحسین تھے۔ جنہیں معاشی خوشحالی حاصل تھی اور ہر طرف اُن کیلئے کامیابیوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے ایسی قوم زندگی کی مثبت قدروں کی ترجمان ہو گی اور پھر اُن کے علوم کی بنیاد عقلیت پسندی پر تھی۔ اس کے علاوہ اُن کا اپنا الگ مذہب تھا تہذیب تھی، تمدن تھا اور ایک نیا فلسفۂ حیات اور طرز زندگی تھی۔ جب ہندوستان کی زمام حکومت اِن لوگوں کے ہاتھ آئی تو سرزمین ہند پر ایک نئی کشمکش شروع ہوئی۔ یہ کشمکش اس پرانی توہم پرستی اور نئے عالم اسباب' اس بوسیدہ وجدان اور نئی عقلیت پسندی' اُس پرانی روش زندگی اور نئے طرز حیات' اُس پرانے انداز فکر اور نئے انداز فکر کے درمیان تھی۔ ہندوستانی اپنے مذہب اور تہذیب پر تنقید برداشت کرنے کے عادی نہیں۔ اندھے یقین پر عقیدہ رکھنے والے توہمات کی پرستش کرنے والے عقلیت پسندی کی جرح سے مجروح ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ کشمکش جسے مخاصمت کا رنگ بھی دیا جا رہا تھا اپنا رنگ دکھانے لگی۔ ہندوستانیوں کے لیے یہ پہلا شدید ذہنی دھچکا تھا جس کا ردعمل لازمی تھا۔ اس ردعمل کے طور پر بھی اپنے مذہب تہذیب اور زندگی کے متعلق اپنی مخصوص قدروں کی حفاظت پر کمربستہ ہو گئے جب اس ذہنی کشمکش نے طول کھینچا تو خود سماج ذہنی دو حصوں میں بٹ کر ایک نیا تضاد قائم ہو گیا۔ ایک طرف وہ ذہن تھا جو ہر پرانی چیز پر جان چھڑکتا تھا اور ہر نئی چیز سے بھڑکنے لگتا تھا۔ جو علت اور معلول پر نظر رکھنے کی بجائے اس بوسیدہ وجدان پر بھروسہ کرتا جسے زندگی کی منفی

قدروں سے انس ہو چلا تھا۔ اور زندگی کی مثبت قدروں پر سوچنے کو بدعت بلکہ خدا کی خدائی میں مداخلت تصور کرتا تھا۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ "ٹلتی نہیں آئی ہوئی" کچی عمارت کے قلعے میں قلعہ بند رہ کر لڑائی جاری رکھے رہا۔ دوسری طرف وہ ذہن تھا جو زندگی کی مثبت قدروں پر سوچنا چاہتا تھا۔ اُس بوسیدہ دیوار سے نجات حاصل کرنا اور عالم اسباب پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ اُسے بے جا "یقین" سے زیادہ صحت مند شبہ عزیز تھا۔ اُسے "جبر" سے زیادہ "اختیار" پر اعتماد تھا جو انسانی خودی کو کھونے سے زیادہ انسانی قدرت میں اضافہ کا متمنی تھا۔ غرض اس سماجی ذہن میں دو مخالف قوتیں کام کر رہی تھیں جن میں ایک پرانے ذہن اور پرانی روش زندگی کی پرستار اور دوسری نئے ذہن اور نئی زندگی کی علمبردار۔

یہ ہیں وہ سماجی حالات جو ابن الوقت کے مطالعہ کے وقت پس منظر کا کام دیتے ہیں اور یہ ہے وہ سماجی ذہن جو دو حصوں میں تقسیم ہو کر ایک نئے تضاد کو جنم دیتا ہے۔ نذیر احمد اس عمل اور ردعمل سے ایک ترکیب یا مفاہمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کشمکش کا جو ایک مشکل مسئلہ بن گئی تھی نیا حل پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس ذہنی گروہ بندی میں ابن الوقت نئے ذہن کا ترجمان ہے۔ ابن الوقت کی مخالف قوتیں اُس پرانے ذہن کی نمائندہ اور حجۃ الاسلام ان متضاد قوتوں کے درمیان ایک مفاہمت ہے۔ اس لیے میرے خیال میں ابن الوقت کے کردار پر غور کرتے وقت یہ سمجھنے سے کہ وہ سر سید یا نذیر احمد کا کردار ہے یا ایک ٹائپ ہے بہتر ہوگا اس کو اُس سماجی ذہن کا جو ابھی جنم لے رہا تھا نمائندہ سمجھ کر مطالعہ کریں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ نذیر احمد نے اپنے اس ناول میں اُس سماجی ذہن کی سچی نمائندگی کی ہے۔ مگر یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حجت ایک قابل قدر مفاہمت نہیں۔ غرض یہ ناول اُس سماجی ذہن کا بہترین عکس ہے انفرادی زندگی کا مرقع نہیں۔ اس میں ہمیں ذہنی کاوشیں ملتی ہیں دلوں کی دھڑکنیں نہیں بحث و مباحثے ملتے ہیں مناظرے ملتے ہیں ذہن کو مرعوب کرنے کی کوشش ملتی ہے دلوں پر چھا جانے والی کیفیت نہیں اس طرح یہ ناول اردو ادب میں ایک دور کے سماجی ذہن کا بہترین قبالہ اور ابن الوقت اس سماجی ذہن کے ایک حصے کا نمائندہ کردار ہے۔

نذیر احمد ابن الوقت کے خالق ہیں اور ان دونوں کے درمیان جو تعلق ہے وہ خالق اور مخلوق کا تعلق ہے۔ خالق اور مخلوق کا تعلق وہی ہوتا ہے جو بندے اور خدا کے درمیان ہوتا ہے جو اپنے مکمل وجود کے ساتھ خالق کی مرضی کا تابع ہوتا ہے مگر بعض اوقات معاملہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے اور خدا کو بھی بندے سے پوچھنا پڑتا ہے "بتا تیری رضا کیا ہے"۔ نذیر احمد اور ابن الوقت کا تعلق بھی کچھ اسی قسم کا ہے اور بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق کا بھی حریف بن گیا ہے۔

ابن الوقت کے متعلق ایک عام خیال یہ پایا جاتا ہے کہ اس کا مطمح نظر ہے "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"۔ ابن الوقت کی "زمانہ سازی" پر نظر رکھنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اُس کی ساری زندگی "زمانہ ستیزی" میں گزرتی ہے۔ اُس کے انگریزوں سے مناکحت اور مواکلت روا رکھنے، انگریزی علوم سیکھنے کی ترغیب دینے کو زمانہ سازی سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر خود اسلام کو بھی عقلیت پسندی کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش زندگی کی مثبت قدروں سے اُس کا لگاؤ پرانے اداروں کے خلاف اس کا ردعمل توہم پرستی کے خلاف اس کی تن تنہا مہم اپنے نئے رجحانات کی وجہ سے سارے سماج کی مخالفت مول لینے والے کردار کو کیا ہم

زمانہ ساز کہہ سکتے ہیں۔ کیا اس قسم کی مخالف ہواؤں سے ہمیشہ سینہ سپر رہنے والے کو ابن الوقت کہہ سکتے ہیں۔ ابن الوقت قسم کا آدمی تو زمانے کا ساتھ دیتا ہے زمانہ سے مقابلہ نہیں کرتا۔ موافقت کرتا ہے مخالفت نہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں تو ابن الوقت کو ابن الوقت کہنا بیجا ہے۔ وہ زمانہ ساز قسم کا نہیں بلکہ زمانہ ستیز قسم کا انسان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کردار کا نام تجویز کرتے وقت نذیر احمد کسی مغالطہ کا شکار رہے ہوں۔

ابن الوقت اس ذہن کی نمائندگی کے وقت ایک بہترین لیڈر کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے اس میں اچھے لیڈر کی بہت سی خصوصیات ملتی ہیں۔ اس کی جرأت، ہمت، مستقل مزاجی، زمانہ شناسی اور سب سے بڑھکر اپنی رائے کے صائب ہونے پر اس کا ناقابل شکست یقین جس سے خود اس کا خالق گھبرا جاتا ہے۔ اس یقین کی وجہ سے وہ سارے زمانے سے ٹکر لیتا ہے۔ اپنوں کے ٹوسٹ، غیروں کی چہ میگوئیاں انگریزوں سے دشمنی اور اپنی بے بسی بھی برداشت کر لیتا ہے۔ یہ سب وار خالی جاتے ہیں۔ اس کا ناقابل شکست یقین۔ اٹل ارادہ اور باوجود مخالفتوں کے اس کی مسلسل کوشش قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ ابن الوقت حقیقت میں ابن الوقت ہے اور یہاں تک کہ خود خالق نذیر احمد تذبذب میں پڑ جاتے ہیں اور انہیں ڈر لگنے لگتا ہے کہ کہیں یہ کمبخت ابن الوقت قاری سے ساز باز کر کے خود ان کے خلاف بغاوت کا علم بلند نہ کر دے۔ جب ان کا یہ شبہ یقین کی صورت اختیار کرنے لگتا ہے تو ابن الوقت کو منظر سے ہٹا کر خود قاری کے سامنے ایک ناصح کا روپ دھار کر آتے ہیں اور اپنا وہ عقلیت پسندی کے خلاف طویل لکچر شروع کر دیتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ :-

ابن الوقت نے کچھ یہ تھوڑی غلطی نہیں کی کہ مذہب کو محکوم عقل بنانا چاہا۔ پس اس کے مذہبی ریفارم کی ابتدا ہی غلط تھی۔

اور اس نصیحت پر لکچر ختم کرتے ہیں :-

پس جس شخص کی افتاد طبع اس طرح (ابن الوقت کی طرح) کی ہو اس کو شروع سے احتیاط کرنی ضرور ہے کہ ایسے خدشات کو دور کر کے خدائے تعالیٰ جل شانہ کی عظمت، اس کی قدرت، اس کے جلال، دنیا کے انتظام۔ اس کے انقلابات کون و فساد میں فکر کیا کرے امید ہے کہ اس کی طبیعت سنبھل جائے گی۔

اس لکچر کے تعلق سے یہ اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ انیسویں صدی کے اس مولوی نے عقلیت پسندی کے خلاف جس بچے تلے انداز سے تنقید کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ نذیر احمد نے اپنے پندار میں عقلیت پسندی کی پول کھولدی اس کے پرخچے اڑا دیئے یہ بحث دلچسپی سے خالی نہیں مگر بحث کا یہ ایک پہلو ہے ایک اور پہلو سے بھی اس پر غور کرنا پڑتا ہے اس کے خلاف بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے ایک مولوی سے ہم اتنی زیادہ توقع نہیں رکھ سکتے۔

کمال یہ ہے کہ ابن الوقت نذیر احمد کے لکچر کے باوجود اپنی ڈگر پر قائم رہتا ہے اور یہاں تک کہ اپنے خالق کا حریف بن جاتا ہے

اس کا خالق اب تو اُسے نیچا دکھانے کی ٹھان لیتا ہے۔ لوگ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں اس کے خلاف سازشیں شروع ہو جاتی ہیں خود انگریز اس سے جلنے لگتے ہیں۔ اس کو مکان خالی کرنا پڑتا ہے۔ اعلیٰ افسر بدگمان ہو جاتے ہیں وہ حاکموں سے بگاڑ مول لیتا ہے مالی مشکلات میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ یہ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے مگر اُس کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں ہوتی۔ اسکے ارادے شکست قبول نہیں کرتے وہ اپنی جہد مسلسل سے باز نہیں آتا۔ یہ بات خود نذیر احمد کے لیے پریشان کن بن جاتی ہے۔ شاید انہیں یہ شبہ بھی ہو گیا تھا کہ اُن کے کلچر کا اثر بھی کہیں زائل نہ ہو جائے۔

اس نئے موڑ پر پہنچکر نذیر احمد ابن الوقت کے لیے ایک نیا حریف پیدا کرتے ہیں وہ ہے حجت الاسلام پھر اس موڑ پر پہنچکر ناول مناظرے کا روپ دھارنے لگتا ہے جو خود اس ناول کی فنی کمزوری ہے مگر نذیر احمد اس کمزوری کو اس لیے برداشت کر لیتے ہیں کہ ابن الوقت کی بغاوت کا کم سے کم اس طرح تو ارتفاع کیا جاسکے۔

حجت کے برخلاف ابن الوقت زندگی کی مثبت قدروں کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ جبر کے ساتھ اختیار سے کام لینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ وہ ماضی کی مایوسیوں پر ماتم کرنے سے زیادہ آنے والے دور کے متعلق جبر سے بہتر امیدیں وابستہ رکھتا ہے۔ اس کے خیال میں سنہرا دور وہ نہیں جو گزر گیا بلکہ وہ ہے جو آنے والا ہے وہ اپنی زندگی کو تقدیر کے حوالے کرنے سے زیادہ "تدبیر" سے زمانے کو بدلنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ حال سے زیادہ مستقبل کا ترجمان معلوم ہوتا ہے جس کی زمانہ شناسی کا یہ عالم ہے کہ آنے والا دور اس کی نگاہوں میں اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے

> وہ زمانہ گیا شارپ صاحب میری ایک متنفس کی وضع کے پیچھے کیا پڑے ہیں ابھی تو بہت کچھ انہیں خلاف مزاج دیکھنا ہوگا اور سننا ہوگا..... غرض نظام ملک میں ہندوستانی بھی ویسے ہی دخیل ہونگے جیسے انگلستان میں وہاں کی رعایا۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو : —

> میں نہیں سمجھتا کہ صاحب کلکٹر یا کسی یورپین کو اگر چیکہ وہ وائسرائے ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارے لباس اور طرز تمدن میں دخل دینے کا استحقاق ہے۔ آج کرتو لباس ہے کل کو رعایا کے مذہب میں مداخلت شروع کر دینگے..... اور دیکھیے شارپ بھی اس معاملے میں بڑی زک اٹھائینگے۔

دیکھیے نئی نسل کی ذہنی ترجمانی کا کیا انداز ہے : —

> اجی وہ بھولے بھالے زمانے گئے کہ لوگ جلدی سے مذہبی ڈھکوسلوں کا یقین کر لیا کرتے تھے اب عقل کا دور دورہ ہے شاید آپ کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا کہ آج کل کے لڑکے اگلے وقتوں کے بڈھوں کو چٹکیوں میں اڑا لیتے ہیں۔

ابن الوقت انسان دوست بھی ہے اور عظمت انسانی کا قائل بھی۔

"انسان کی طاقت محدود نہیں کون کہہ سکتا ہے کہ انسان جس نے ریل چلائی تار دوڑایا
اور ہزارہا نئی نئی چیزیں دریافت کیں آئندہ کچھ نہیں کرسکے گا۔"

دیکھئے حجت کے خدا پر تبصرہ کرتے ہوئے انسان کی بے پناہ قوت کے پیش نظر وہ کس طرح پیشن گوئی کرتا ہے۔

"آپ کی تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے لاعلمی کا نام خدا رکھ چھوڑا ہے۔ دریافت سبب سے
عاجز ہوئے خدا ماننے لگے۔ لوگ دیکھتے ہیں آدمی پانی نہیں برساتا تو کہتے ہیں خدا برساتا ہے
تعجب نہیں کہ کسی نہ کسی دن ہم پانی برسانے پر قادر ہو جائیں۔"

ملاحظہ کیجئے وہ انسان کے دائرہ اختیار کو کتنا وسیع تصور کرتا ہے:۔

"اسی طرح اس نے اپنی تندرستی اور زندگی پر بھی اپنا اختیار معلوم کرنا شروع کیا ہے۔
بہت سے امراض کو اس نے بس میں کر لیا ہے۔ ان کو پیدا ہی نہ ہونے دیا اگر پیدا ہوا بھی
تو ان کو جس وقت چاہے معدوم کر دے اور اگر علم طب کیمیا اور طبیعات وغیرہ اسی
نسبت سے ترقی کرتے رہے جیسے کہ پچھلے سو برس میں تو وہ دن کچھ دور نہیں کہ
انسان اپنی تندرستی پر آپ حاکم ہو جائے گا اور کیا عجب کہ رفتہ رفتہ اپنی زندگی
پر بھی۔"

زندگی کے متعلق اتنا رجائی نظریہ زندگی کی مثبت قدروں پر اتنا پختہ یقین انسان کی قوت پر اتنا بھروسہ انسان کے دائرہ اختیار میں اتنی وسعت کا تصور وغیرہ اس بات کے شاہد ہیں کہ ابن الوقت نئے دور کا پیامبر ہے نئے ذہن کی ابتدا کا کرشمہ ہے امید کی ایک نئی کرن ہے۔ دوسرے لفظوں میں جدید ذہن کا ابتدائی نقش ہے۔

ابن الوقت کے کردار کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے حجت الاسلام کے کردار کا مطالعہ بھی مفید ہے کیونکہ حجت الاسلام نذیر احمد کا وفادار کردار ہے اور ان کے اسلام کا سچا علمبردار۔ حجت الاسلام کیا ہے۔ اسم با مسمیٰ ہے۔ اس دور کے سماجی ذہن کے تضاد THESIS اور ANTITHESIS کا SYNTHESIS ہے۔ اس کردار کے روپ میں نذیر احمد نے اس سماج کے درپیش مشکل مسئلے کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر حجت تو صرف ایک روشن خیال مولوی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا غصہ بات بات پر چڑ جانا ٹھوس دلائل کا مذاق اڑانا اور پھر اس کے بات کرنے کا لب و لہجہ بھی مولویانہ معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے ابن الوقت سے مخاطبت کا کیا انداز ہے:۔

"ارے احمق! اتنا تو سمجھ کہ میں نے ایک بات بھی نہیں کہی جس کا حوالہ قرآن سے نہ دیا ہو۔"

ان کا یہ طرز تخاطب صرف ابن الوقت کے ساتھ ہی نہیں بلکہ نئی نسل کے ساتھ دیکھئے کس عزت سے پیش آتا ہے:۔

ایک ایک نونڈا جس کو دین سے مس نہیں ناواقف بے خبر بے خود غلط - چلا اسلام
کا مجدد بننے اور لگا اصول میں لائے ذنی کرنے"
دیکھئے ابن الوقت کے ہیضہ پھیلنے کے متعلق ڈاکٹر کی رپورٹ کے تذکرے پر کس طرح تبصرہ کرتا ہے :-

حجت الاسلام یہ سن کر بے اختیار ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ "واقع میں ڈاکٹر صاحب نے
سبب خوب گھڑا۔ ہیضہ گاؤں سے تالاب میں آیا تالاب سے بھینس میں بھینس سے
دودھ میں دودھ سے چائے میں اور چائے سے صاحب لوگوں میں مگر انہیں ڈاکٹر صاحب
یہ بھی پوچھ لیا ہوتا کہ دکھیاری میں کہاں سے آیا"۔

وہ ان مفروضات پر ٹھیر کر سوچنے کی بجائے، ان اسباب کی کمزوری بیان کرنے کی بجائے صرف اس کا مذاق اڑاتا ہے کیونکہ
وہ عالم اسباب کو نہیں مانتا اور اس کی دکھتی رگ علم کلام ہے جس کے نام سے اسے چڑ ہے۔

اگر تم میری صلاح مانو تو علم کلام کی کتاب کو بھول کر بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجت اس پرانے ذہن کی طرفداری کرتا ہے اس کردار میں بھی ہم زندگی کی منفی قدروں سے
لگاؤ پاتے ہیں۔ اسی لیے وہ اختیار کا نہیں بلکہ "جبر" کا قائل ہے۔ اسے "تدبیر" سے زیادہ "تقدیر" پر بھروسہ ہے اور اس لحاظ
وہ روایت پسندوں سے قریب نظر آتا ہے۔ وہ کسی علت کا معلول معلوم کرنے کی بجائے واللہ اعلم بالصواب کہکر ٹال
دیتا ہے۔ ابن الوقت کی نئی ایجادات اور دریافت کے ذریعہ انسانی قدرت میں اضافے کے تذکرے پر دیکھئے کس طرح جل اٹھتا ہے

"نعوذ باللہ من ذالک" کیا تمہارے برے عقیدے ہیں تم تو حقیقت میں اس بات کے
منتظر ہو کہ انسان کچھ دنوں میں خدا ہونے والا ہے -

مسئلہ تقدیر پر اس کی حجت ملاحظہ ہو -

معتقد تقدیر حرمان سمجھ کر منجانب اللہ سمجھ کر دل کو تسلی دے لیتا ہے کہ اس میں کوئی
مصلحت مضمر ہوگی - غرض تقدیر کا ایسا عمدہ مسئلہ اور تم اس پر معترض ..."

خوشی یا مسرت کے حصول کا ذریعہ ملاحظہ ہو:-

اگر مذاق صحیح ہو تو دین سے بڑھکر کسی چیز میں خوشی ہو نہیں سکتی - دنیا کی فانی
چند روزہ بے ثبات خوشیوں کو خوشی سمجھنا غلطی ہے"۔

حجت زندگی سے زیادہ موت سے، حیات سے زیادہ بعد ممات سے لگاؤ رکھتا ہے وہ زندگی کو موت کی تیاری کا
وقفہ سمجھتا ہے :-

یہ زندگی دنیا تو چند روزہ ہے۔ بھلی طرح بھی گذر ہی جائے گی اور بری طرح بھی پہلا سی زندگی تو

وہ ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوگی گویا از سرِ نو پیدا ہوئے اور جس کی اصلاح دین کا مقصد ہے"

زندگی کی منفی قدروں سے زیادہ لگاؤ کی وجہ سے قوم کی انفرادی اور اجتماعی قوتوں کا اندازہ بھی غلط لگایا ہے ۔

نہ جرأت ہے نہ اتفاق نہ تہذیب ہے نہ شائستگی نہ سچائی کی تلاش ہے نہ معلومات

بہم پہونچانے کا شوق ہے نہ ہنر ہے نہ تجارت نہ دولت ہے نہ ایجاد ہے نہ صناعت ہے

غرض صلاحیت تو خانہ داری کی بھی نہیں اور حوصلے دیکھو ملک گیری کے ۔

اسلام کے بہترین اصول مساوات کی دیکھئے کیا تاویل کرتا ہے : ۔

حاکم اور محکوم میں مساوات کا ہونا ضعف حکومت نہیں تو اور کیا ہے ۔

غرض یہ ہیں حجت الاسلام جو اس پرانے ذہن سے زیادہ لگاؤ رکھتے ہیں اور نئے ذہن سے جنھیں کوئی ہمدردی نہیں ظاہر ہے اس قسم کا کردار نئے اور پرانے ذہن کے درمیان بہتر مفاہمت پیدا نہیں کرسکتا۔ اس طرح نذیر احمد کی یہ محنت بھی اکارت گئی کیونکہ نیا ذہن اس SYN THi S i S کو قبول نہ کرسکا۔ نذیر احمد نے اس معاملے میں بہت جلد بازی سے کام لیا ہے اُس سماجی ذہن میں جو تضاد پیدا ہو رہا تھا ابھی اُس کی ابتدا تھی اس تضاد کے منطقی نتیجے پر پہونچنے کے لیے عمل اور ردِّ عمل کا ایک طویل سلسلہ چاہیئے تھا اور اس سلسلہ کا اپنی انتہا پر پہنچنا بھی ضروری تھا جس کیلئے ایک طویل مدت درکار تھی اور زمانے کو اس SYNTHESiS کیلئے اقبال کا انتظار کرنا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس دور میں سیاسی بے چینی معاشی بدحالی تہذیبی پستی اور ہر طرف سے ناکامیابی کی وجہ سے قوم میں زندگی کے تعلق سے ایک مایوس کن رویہ پیدا ہو چلا تھا۔ ظاہر ہے مایوسیوں میں گھرا ہوا انسان اُمیدوں کے محل تو تعمیر نہیں کرسکتا اگر قوم زوال کے اُس نقطہ پر پہونچ چکی تھی جہاں سے اُسے نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ نئی کروٹ لینی تھی۔ ایک انقلاب کی ضرورت تھی اور انقلاب پہلے بغاوت ہوتا ہے اور بغاوت کیلئے اچھے باغی کی ضرورت ہوتی ہے یہ باغی ابن الوقت ہے دنیا باغیوں کے ساتھ ہمیشہ بُرا سلوک کرتی ہے اور جب بغاوت کامیاب ہو جاتی ہے تو انقلاب کہلاتی ہے اور انقلابی کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح آج ابن الوقت باغی نہیں بلکہ انقلابی ہے اور اس کی تنظیم لازمی۔ نذیر احمد اس انقلابی کو باغی ہی سمجھتے رہے اس لیے اس کی تنظیم نہ کرسکے۔ شاید اسی لئے انھوں نے ناول کو اپنے منطقی نتیجے پر پہونچنے سے پہلے ہی ختم کردیا۔

مظفر حنفی

غزل

کبھی پتھر نکل آیا کبھی ہیرا نکل آیا
ہمارے دامنِ کوتاہ میں کیا کیا نکل آیا

اب ایسے میں بھلا کیا عشق سے امید رکھیں ہم
حریمِ ناز سے جب حسن بے پردا نکل آیا

ہمارا تو وہی ہمدرد ہے جو چوٹ دیتا ہے
جسے بیگانہ سمجھے تھے وہی اپنا نکل آیا

یہ اک آنسو نکل آیا جو مایوسی کے عالم میں
شبِ تاریک میں جیسے کوئی تارا نکل آیا

وہاں ہر صاحبِ غیرت نے میری پیروی کی ہے
مجھے جب بزم سے آتے ہوئے دیکھا نکل آیا

ہمیشہ باغباں کی بات کی صیاد نے ہم سے
قفس میں تذکرہ جب بھی نشیمن کا نکل آیا

ذرا سوچو کہ ان افعال پر کیا تبصرے ہونگے
اگر ایسے میں کوئی دیکھنے والا نکل آیا

جہاں بھی اس طرف یا اُس طرف کی بات ٹھہری ہے
تمہارے واسطے اک بیچ کا رستا نکل آیا

خدا جانے تمہارے راز کا انجام کیا ہوگا
تمہارے رازداروں کا اگر چرچا نکل آیا

جہاں بھی خود نمائی نے ذرا سا سر اٹھایا ہے
وہاں ہر آدمی خود بیں و خود آرا نکل آیا

غزل میں لوگ حسن و عشق تک محدود رہتے ہیں
مظفرؔ طنز کے میدان میں تنہا نکل آیا

اقبالؔ نہاس

تنہائی کے صحرا کا یہ ماحول رہا ہے
ہر سمت گئے لمحوں کا اک غول رہا ہے

پتھر کی طرح لفظ سماعت پہ گرے ہیں
لاوے کی طرح خون مرا کھول رہا ہے

مِل جاتا اگر کچھ تو اُسے پھر نہ بڑھاتے
خالی ہے جو ہاتھوں میں یہ کشکول رہا ہے

ہم نے تو ہر اک بات جو تھی کھول کے رکھ دی
پر اُس پہ تکلف کا سدا خول رہا ہے

چہرے پہ ہے پھولوں کی سی نرمی کا تاثر
لیکن رگِ احساس میں خوں کھول رہا ہے

اوروں پہ جو گزری ہے وہی ہم پہ نہ گزرے
ہم بھی نہ بچھڑ جائیں کہیں ہول رہا ہے

ملتے ہیں بچھڑنے کے لئے لوگ یہاں پر
اقبالؔ بزرگوں کا یہی قول رہا ہے

ریاض حسین چودھری

کردار روسیاہ کو میزاں میں تولیئے
یہ روزِ احتساب ہے کچھ منہ سے بولیئے

منزل نہیں ملی تو شکایت فضول ہے
رہزن ملے تو ساتھ انہی کے بھی ہو لیئے

یہ پھیکی مسکراہٹیں مجھ کو نہیں قبول
میرے خلوصِ دل کی تو بولی نہ بولیئے

بخشی گئی ہیں رونقیں بزمِ خیال کو
الجھے ہوئے خیال کی گرہیں بھی کھولیئے

وہ بھی کرم کا ہاتھ بڑھائیں تو بات ہے
ڈستے ہیں دستِ تیرہ شبی کے سپولیئے

لکھیے عنایتِ غمِ دوراں کی داستاں
لفظوں کے موتیوں کو تغزل میں رولیئے

ہر شعر ہو ریاضؔ حقیقت کا آئینہ
رنگِ حقیقت آج فسانوں میں گھولیئے

محمد منظور احمد

مجھکو کسی کے پیار نے مارا ہے دوستو
وہ جس کا پیار جانِ بہارا ہے دوستو
تنہائیاں ہیں اُن کا نظارا ہے دوستو
جینے کا بس یہی تو سہارا ہے دوستو
جو شخص ہے وہ درد کا مارا ہے دوستو
یہ کیسا دلگداز نظارا ہے دوستو
کِس کو سنائیں ایک نئی صبح کے لئے
کِس کرب میں یہ وقت گزارا ہے دوستو
ہمت کے حوصلے کے سہارے کے واسطے
ہر ہر قدم پہ اُن کو پکارا ہے دوستو
دنیا حسین تھی، مگر اتنی حسیں نہ تھی
یہ کِس حسیں نظر کا اشارا ہے دوستو
ظالم سہی، بلا سہی، نامہرباں سہی
سب کچھ سہی، وہ میرا دلارا ہے دوستو
منظورؔ اپنے درد کا کس سے کریں بیاں
جو شخص ہے وہ درد کا مارا ہے دوستو

صابرؔ شاہ آبادی

کردار کو حالات میں ضم دیکھ رہا ہوں
اِس دَور کی بنیاد میں خم دیکھ رہا ہوں
اللہ رے اک نالۂ شبنم کا یہ عالم
دیکھے ہوئے خورشید میں نم دیکھ رہا ہوں
تم نے مری آنکھوں میں ہوس تو نہیں دیکھی
کھنچتا ہوا دامانِ کرم دیکھ رہا ہوں
کچھ کہہ کے تمکرّق ہوئیں آنکھوں کی بدولت
اک سلسلۂ لطف و کرم دیکھ رہا ہوں
یہ کوچۂ رنگیں تو نہیں ہے کہ جہاں پہ
چھپتے ہوئے پیرانِ حرم دیکھ رہا ہوں
اللہ رے احساس کی ڈوبی ہوئی نبضیں
انسان میں انساں کا عدم دیکھ رہا ہوں
احول کو پستی سے اٹھانے کے جتن میں
تہذیب کے ہاتھوں کو قلم دیکھ رہا ہوں
آنچل ترا حائل نہ سہی دید میں، پھر بھی
دورانِ کرم عذرِ کرم دیکھ رہا ہوں
صابرؔ مری توبہ کی قضا تو نہیں آئی
بے وجہ جو ساقی کا کرم دیکھ رہا ہوں

مسرت فتحپوری

کوئی انسانیت کے درد کا محرم نہیں ہوتا
شریک عشق ہوتا ہے شریک غم نہیں ہوتا
نوازش کی نوازش ہو کہاں میں اور کہاں ساقی
یہ جانا ہوں کہ احساس بیش و کم نہیں ہوتا
بیاں انداز سے حرماں بیاں انداز محرومی
بیاں انداز [illegible] ذرا بھی کم نہیں ہوتا
ہمارے عشق کا درجہ [illegible] حقیقت
نظر پیدا کرو [illegible] کم نہیں ہوتا
چمن کا کاشانہ کا شانہ [illegible] بنے ہیں
مقابل [illegible] منزل [illegible] ختم نہیں ہوتا
یہ ہم [illegible] جانا ہے لیکن نظر ان کی
بدلتا جا رہا ہے [illegible] عالم نہیں ہوتا
جو عالم دیکھیے تو دل کا یہ عالم ہے اے ہمدم
یہ دنیا [illegible] ناکامی [illegible] غم نہیں ہوتا
کسی کی جان جاتی ہے [illegible] دیکھنے والے
شبابِ [illegible] زیر و بم نہیں ہوتا
[illegible] ساز کے نغمے میں [illegible]
مجھے [illegible] کا عالم نہیں ہوتا
بیاں [illegible] مسرت [illegible]

کلونت سنگھ جانی

جس روز چمک کر دل کا مری ہر داغ کنول بن جائیگا
اس روز تمہاری رہنے کو دل تاج محل بن جائیگا
میں اپنے لہو کی سرخی سے یہ مانگ سجا دونگا جس دن
یہ حسن مکمل ہو کر اک رنگین غزل بن جائیگا
کمسن ہو ابھی ناداں ہو ابھی کیا جانو جوانی کے فتنے
اس عمر میں آکر ابرو بھی خنجر کا بدل بن جائیگا
وہ روٹھ گئے دل ٹوٹ گیا دنیا سے کنارا کر بیٹھے
معلوم نہ تھا ماتھے کی شکن تقدیر کا بل بن جائیگا
اقرار اگر تم کر نہ سکو انکار بھی جانی مت کرنا
یہ لفظ ہی ورنہ میرے لئے پیغام اجل بن جائیگا

رؤف خیر

[illegible]

نعیم تقوی

کھل جائے گا سب کچھ یہ خموشی کی صدا ہے
جھانکو مرے دل میں کبھی جو ہونٹوں کو سیا ہے
اتنا سا خلاصہ ہے مرے قصۂ غم کا !!
دل تھام کے بیٹھا ہے وہی جس نے سنا ہے
آلامِ مسلسل سے نہ گھبرائیں گے ہرگز
جب پیشِ نظر معرکۂ کرب و بلا ہے
ہر ذرہ ہے فردوسِ نظر ان کے لہو سے
دیکھو یہ رہِ آبلہ پایانِ وفا ہے
تاریخ کو دہراتے ہوئے زہر کا پیالہ
ہم ہی نے ہر اک دور میں ہنس ہنس کے پیا ہے
جو ساتھ ہے ہر وقت اسے ڈھونڈ رہے ہیں
جو سامنے رہتا ہے وہی ہم سے جدا ہے
ہے چاندنی جیسے کہ امیدوں کا کفن ہو
جب آپ نہیں ہیں تو مرے واسطے کیا ہے
یہ روشنی کیسی ہے کہ سایہ ہے گریزاں
اس دور میں ہر شخص پہ کیا وقت پڑا ہے
کیوں رنج و الم سے ہے سدا زیست عبارت
گو عرصۂ ہستی میں ہر اک لمحہ نیا ہے
ہے پیشِ نظر پیرہنِ عشق میں ملبوس
اے گردشِ دوراں تجھے پہچان لیا ہے
احساسِ حرارت ہے تری یاد کی لو سے
اے دوست مرا دل نہیں مفلس کا دیا ہے

اسحاق ملک

خوشی کی چاہ سے بڑھ کر سوالِ عظمتِ غم ہے
کرم رہنے دے اب تیرا ستم میں لطف کیا کم ہے
فروغِ جلوۂ رخ سے اجالا ہو گیا لیکن
اندھیرا ہی اندھیرا ہے جہاں تک زلف برہم ہے -
تمہارا ساتھ تھا جب تک ہماری تھی یہی دنیا
ہمارے دل کی دھڑکن کے سوا اب کون ہمدم ہے
نہ اتنا ہو سکا ان سے نشیمن خود جلا دیتے
چمن والے نہ سمجھے برق کا گرنا مسلّم ہے
تری مرضی کسی کو تو نے بن مانگے خوشی دیدی
مگر وہ دل جو تیرے عشق میں رنجورِ پیہم ہے
سلجھنا اس کا آبادی، الجھنا اس کا بربادی
کسی کی زلف کے خم تک مری تقدیر برہم ہے
خوشی کیا ہے ملکؔ اک لذتِ بے کیف کا عالم
کبھی غم سے محبت تھی خوشی کا آج ماتم ہے

میر یٰسین علی خاں

مناجات

ماخوذ از "جاوید نامہ" (اقبال)

عہدِ حاضر کیلئے زنجیرِ پا دامِ خرد
کاسہ ہائے آسماں مہر و مہ جامِ خرد

نخلِ فکرِ آدمی ہے نا امیدِ برگ و بر
ڈھونڈھتا ہے وہ خود اپنے واسطے تیر و تبر

علمِ حاضر اک تماشا خانۂ افکار ہے
یاں تھرکنے، ناچنے ذروں کا اک بازار ہے

بے تجلّی مردِ دانا کا جنونِ خام ہے
نقشبندِ رنگ حیرت خانۂ ایام ہے

آدمی افلاک پر معروفِ شب خوں ہے ابھی
در کشائے قصرِ عالی شانِ گردوں ہے ابھی

شوقِ تحقیقِ نوی سے پُر ہے غوغائے حیات
اک معمّہ بن گئی ہے تابشِ نورِ حیات

علم ہے محوِ تماشائے مقاماتِ بلند
روحِ آدم تک مگر پہنچی نہیں اس کی کمند

اے خدا روزی کُن آں روزے مرا
وا رہاں زیں روزِ بے سوزے مرا

باقر منظور

کیا نشاطِ دید کا موسم گذر گیا
ہم دیکھتے رہے اِدھر آیا اُدھر گیا

دل دردِ بن گیا تو بڑھی آبروئے دِل
احساسِ غم سے غم کا مقدر سنور گیا

لطفِ نظر سے بن گئی خلوت بھی انجمن
حسنِ تصورات بڑا کام کر گیا

اب اور مجھ سے شرحِ محبت نہ پوچھیے
اک حرفِ دلپذیر تھا دل میں اُتر گیا

ہر ہر قدم پہ رُک رہا تھا فریبِ عقل
جو کم نظر تھا راہِ طلب میں ٹھہر گیا

کیا سوز و سازِ عشق نے گہنا دیا اُسے
کیوں آفتابِ حسن کا چہرہ اُتر گیا

باقر کمالِ عشق کی تصویر دیکھ کر
جو ناشناسِ حسن تھا بے موت مر گیا

نقد ونظر

جن کتابوں پر تبصرہ شائع ہوجاتا ہے وہ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں
شریک کردی جاتی ہیں۔ ضرورت مند اصحاب مطالعہ فرماسکتے ہیں مصنفین اور
ناشرین سے درخواست ہے کہ تبصرہ کیلئے دو نسخے روانہ فرمائیں۔

حج وزیارت مولانا عبدالصمد نعمانی۔ مدرسہ حسینیہ لدڑ کیلاٹ (اڈیسہ) سائز ۱/۱۶ کراؤن صفحات ۱۲۸۔ خوبصورت دو رنگی سرورق قیمت ایک روپیہ۔

مؤلف نے بڑی عمدگی سے سلیس زبان میں حج بیت اللہ کے مسائل اور ادائی فریضے کے طریقوں کو قلمبند کیا ہے اور ساتھ ہی بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری دینے اور سلام عرض کرنے کے آداب اور اس تعلق سے مفید اور ضروری ہدایتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ ابتداء کے تعلق سے چالیس حدیثوں کا نہایت موزونیت سے انتخاب کیا ہے۔ اسی طرح آخر میں "عاشقین ومحبین کے حج و زیارت کے بعض حالات ومشاہدات" کے عنوان کے تحت چالیس واقعات مذکور ہیں۔ یہ سب کچھ ایسے دلکش پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں کہ ان کو پڑھکر غیر عازم حج بھی عازم ہوجاتا ہے اور وہ حضرات جنھوں نے پچھلے سالوں میں کبھی حج کیا تھا عالم تصور میں وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ کتاب میں بیان کئے گئے ان خاص مقامات پر جہاں انھوں نے ناواقفیت کی وجہ سے آنسو نہ بہائے تھے اب بہالیتے ہیں اور بعض کو تو اپنی گریہ وزاری کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ مختصر یہ کہ یہ کتاب "حج وزیارت" عازمین و قارئین دونوں کیلئے مفید ہے۔

کتاب کا نام "حج وزیارت" مختصر اور بہت موزوں ہے۔ مسائل کے بیان میں فقہ وحدیث کی معتبر اور مستند کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ لیکن بعض مقامات پر قاری غیر مطمئن نظر آتا ہے مثلاً (صفحہ ۳۰) عنوان "حج کرنے کے تین طریقے ہیں" کے تحت متمتع کے بیان میں کہ "میقات سے صرف عمرے کا احرام باندھیں اور مکہ معظمہ پہونچ کر عمرہ کرکے احرام ختم کردیا جائے اور پھر آٹھویں ذی الحجہ کو مسجد حرام سے حج کا احرام باندھا جائے"۔ "مسجد حرام سے احرام باندھنے" پر وہ غور کریگا اور سوچے گا کہ اگر وہ اپنی قیام گاہ مثلاً کسی رباط یا منزل وغیرہ میں جو حدود حرم میں داخل ہے احرام باندھے تو اس کا یہ احرام درست ہوگا یا نہیں۔ حج کرنے کے تین طریقوں میں صرف قِران کے مسائل ذرا تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ مفرد اور متمتع یہ تصفیہ کرنہیں پاتے کہ احرام کے کپڑے پہن کر انھیں بھی قارن کی طرح دو رکعت نماز پڑھنی چاہئے یا نہیں (صفحہ ۳۱) اور اس نماز کی نیت نفل کی ہوگی یا سنت کی۔ صحت بخش طریقے سے ادائی فریضے کیلئے حاجی کا نقصاناتِ حج اور کفارہ کے مسائل سے واقف ہونا ضروری ہے اور کتاب میں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ (صفحہ ۱۹) پر مندرجہ حدیث شریف کہ "حجر اسود جب جنت سے دنیا میں اتارا گیا تو وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا آدمیوں کی خطاؤں نے اس کو کالا کردیا" پڑھکر عام

عظمت و اہمیت کے تعلق سے تھا، کیونکہ اس کی کچھ تاریخ بھی معلوم کرنے کا اشتیاق ہوتا ہے۔ آئندہ اشاعت میں ہمارے خیال میں قاری اپنی تشفی کا سامان ڈھونڈے گی۔

کتاب کا سرورق عنوان کی مناسبت سے جاذب نظر ہے۔ کتابت بھی عمدہ ہے۔ ہزار احتیاط کے باوجود بعض آیتوں اور ادعیہ اور ان کا لے میں کاتب سے چوک ہوگئی ہے مثلاً وَاِنَّا اِلیٰ رَبِّنا لمنقلبون" (صفحہ ۱۵) میں "رَبِّنا" کے "ب" کو زیر کے بجائے زبر لگ گیا ہے۔ اعوذ برب البیت من الذین ..... "من الدین" کا دال بجائے زبر کے زیر سے لکھا گیا ہے (صفحہ ۲۶) یا حی یا قیوم لا الٰہ الا انت رحمتک استغیث" دراصل "برحمتک استغیث" ہے۔ یہ اور اس قسم کی اور فروگذاشتیں آئندہ کتابت کے وقت پیش نظر رہیں تو مناسب ہوگا۔

(پیر وفیسر الحاج سید حمید شطاری)

تلخیص تذکرہ سراپا سخن

مرتبہ ڈاکٹر سید سلیمان حسین۔ ناشر نایاب بک ڈپو۔ نادان محل روڈ لکھنو۔
$\frac{1}{16}$ کراؤن صفحات ۱۳۱ ۲ مجلد مع گرد پوش قیمت چار روپے۔

شاہ حسین حقیقت کے بیٹے سید محسن علی موسوی نے سات سو تینتیس شعرا کے ایسے اشعار جمع کئے جس میں اعضائے انسانی کی تعریف یا خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ہر شاعر کا نام بھی تخلص کے ساتھ لکھا ہے اور ان کی سکونت اور شاگردی وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس تذکرہ میں بہت سے نئے شعرا کے نام بھی ملتے ہیں۔ دکن کے شعرا میں ایمان، تجلی، سراج، سیاح، شاداں اور ولی کے نام ملتے ہیں۔ ایمان کا نام سید محمد خاں لکھا ہے اصل نام شیر محمد خاں ہے۔ سراج کے متعلق قبل زمانہ میاں ولی سید قمر علی لکھا ہے۔ سراج بعد زمانہ ولی اور سراج الدین نام ہے۔ ولی کا نام شاہ ولی اللہ لکھا ہے اور گجراتی بتایا ہے۔ میر نظام الدین ممنون کا نام فہرست میں میر نظام علی دیا ہے۔ حاشیہ میں ان غلطیوں کی تصحیح ضروری تھی۔ محسن نے تذکرہ کے بارے میں صراحت کر دی ہے کہ یہ تذکرہ شیخ امام بخش عشقی کی فرمائش پر دس سال کی جانکاہ محنت کے بعد ترتیب دیا ۱۲۶۹ھ میں اس کی تکمیل ہوئی اور مطبع نولکشور نے ۱۲۷۰ھ میں (۴۰۲) صفحوں پر شائع کیا۔

ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے اس کی تلخیص مرتب کر کے شائع [illegible] کام کی کوئی بات چھوٹنے نہیں پائی اس کے لئے انہیں کافی محنت برداشت کرنی پڑی۔ اگر وہ حاشیہ میں شعرا کے متعلق مزید معلو[illegible] دیتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ضخیم ہوتا لیکن افادیت زیادہ بڑھ جاتی۔ تاہم جن لوگوں نے مطبوعہ تذکرہ دیکھا ہے وہ ڈاکٹر سید سلیمان حسین کی محنت ان کے پاکیزہ ادبی شعور کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

شہر نگاراں

سبط حسن ناشر مرزا ظفر الحسن معتمد انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ کراچی۔
ملنے کا پتہ مکتبہ افکار۔ رابسن روڈ کراچی۔

شہر نگاراں قدیم حیدرآباد کی چند جھلکیوں پر مشتمل ہے۔ جس کو سبط حسن نے لکھا ہے پہلا باب "آن سا عزو آلہ جانی" کے عنوان سے ہے اس میں سبط حسن نے تاریخی ٹھوکریں کھائی ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ دنیا چل کے جنوب میں اسلام کا

سب سے بڑا مرکز اورنگ آباد ہی تھا مگر یا اب تک کی ساری تحقیق کو گلبرگہ، گولکنڈہ اور بیجاپور اہم مراکز تھے غلط ہو گئی اس سے پہلے فرماتے ہیں قاضی محمود بحری مصنف من لگن۔ شیخ داؤد ضعیفی اور وجہی اسی چمن کے پھول تھے۔

دوسرے باب کا عنوان پیام اور قاضی عبدالغفار صاحب ہے۔ تیسرے باب میں دکنی تہذیب کی جھلکیاں بتائی ہیں اور دکنی زبان سے سابقہ پڑنے پر جو لطف ملاہے اس کا ذکر کیا ہے اور بہت سی پرانی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ چوتھے باب کا عنوان "ہوشیار خبردار" ہے۔ یہ حصہ کتاب کا بدترین حصہ ہے اور کوئی حیدرآبادی اس کو پڑھ کر کتاب کے متعلق اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا اس میں دہن پاشا کے متعلق بھی باتیں ہیں اور اعلیٰ حضرت کے متعلق بھی۔ اعلیٰ حضرت کے متعلق کہا گیا ہے کہ "وہ حصولِ دولت کی بیماری میں مبتلا تھے" جس شخص کی داد و دہش سے شرقی ممالک تک فیض یاب ہو رہے ہوں اور شمالی ہند کے سینکڑوں افراد اسی کے ٹکڑوں پر پلے ہوں پچاسوں درسگاہیں، دارالعلوم اور ادارے اس کے دامانِ عاطفت میں پروان چڑھے ہوں اس کے متعلق ایسے الفاظ احسان ناشناسی کی دلیل ہیں حیدرآباد اور نظام کی دولت سے اگر خود مصنف کی مادرِ علمی بھی محروم ہوتی تو کبھی کی ختم ہو گئی ہوتی۔

اسی نظام کا واقعہ ہے کہ مہاراجہ کشن پرشاد کے دورِ وزارتِ عظمیٰ میں پانی کا ٹکس عاید کرنے کی تحریک پیش ہوئی۔ مثل دیکھ کر اعلیٰ حضرت نے مہاراجہ کو طلب کیا اور کہا کہ کیا میں رعایا سے پانی کی قیمت مانگوں۔ یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ مثل لے جاؤ بہر حال مصنف نے اگر یہ باب لکھا تھا تو ظفر الحسن کو حیدرآبادی ہونے کے ناطے اس کو حذف کر دینا چاہیے تھا

پانچواں باب "تمنا کا دوسرا قدم" ہے فاشزم کی تحریک کے پرچار کا ذکر ہے۔ چھٹے باب میں اردو کانگریس اور ایلورہ کے عنوان سے ترقی پسند مصنفین کی شاخ کے قیام کی داستان اور پھر ایلورہ کے متعلق اظہارِ خیال ہے آخری باب آخری سلام پر ختم ہوتا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ مندرجات کے عنوان سے ہے جس میں ان تمام شخصیتوں اور اداروں وغیرہ کا ذکر ہے۔ تاریخی لحاظ سے یہی حصہ زیادہ اہم معلوم ہوتا ہے۔ اگر ظفر الحسن ناشر کی بجائے خود مصنف ہوتے تو کتاب کی اہمیت اور دلکشی بہت زیادہ بڑھ جاتی۔ ہمیں اب بھی توقع ہے کہ ظفر اس طرف توجہ کریں گے۔

سید کوئی قوم نہیں

کتاب پر مصنف مولف کا نام نہیں البتہ ناشر بوا نامیاں خاں پنجابی کمپالہ (یوگنڈا) افریقہ ہیں۔ اور اس کو تبلیغی مرکز ریلوے روڈ لاہور نے شایع کیا ہے۔ ہندوستان میں مکتبہ تجلی دیوبند سے ایک روپیہ ۲۵ پیسے میں مل سکتی ہے۔ اس میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سید کسی قوم یا فرقہ کا نام نہیں اسکے ثبوت میں تاریخی حقائق اور واقعات پیش کئے گئے ہیں اور یہ بتلایا گیا ہے کہ قیامت میں اعمال صالحہ کو دیکھا جائے گا نسب کی کوئی اہمیت نہ ہوگی۔ قرآن اور حدیث سے حوالے پیش کئے گئے ہیں۔

نقشِ اول

سید قسیم الحق گیاوی۔ ناشر تاج پریس باری روڈ گیا۔ بہار۔ قیمت ۵۰/۱۔

یہ قسیم الحق گیاوی کے کلام کا مختصر سا ۷۲ صفحات کا مجموعہ ہے اسمیں ۱۷ صفحات تقریظیں ہیں۔ حمد

نعت، مذہبی اور قومی سبھی قسم کی نظمیں شامل ہیں۔ کلام میں بعض اشعار سے شاعر کی ذہانت و جودت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مشق و مزاولت اچھا شاعر بنا دے گی۔

حسن نظر چرخ چینوٹی۔ ناشر بزم جمال اُردو ۱۱۴۲۴ - بی ٹی روڈ شکتی نگر دہلی۔
$\frac{1}{16}$ کراؤن صفحات ۹۶ قیمت مجلد ۳/- غیر مجلد ۲/-

یہ چرخ چینوٹی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ ۲۶ صفحات تک تعارفی مضامین ہیں اور صفحہ ۲۷ سے کلام شروع ہوتا ہے ۴۰ صفحات تک قطعے ہیں اور اس کے بعد غزلیں۔ کلام شاہد ہے کہ چرخ فن سے واقف ہیں۔ اچھوتی تشبیہوں اور استعاروں پر قادر ہیں زبان شستہ اور رواں ہے۔ شعر گوئی کا ذوق نہایت لطیف اور پاکیزہ ہے۔ توقع ہے کہ کلام مقبولیت حاصل کرے گا۔

انتخاب کلام وجد انجمن ترقی اردو علی گڈھ عرصہ دراز سے شعرا کے کلام کا انتخاب شائع کر رہی ہے۔ ان انتخابات نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ بعض شعرا کے انتخاب کلام کے دو دو اور تین تین ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں سکندر علی وجد کے کلام کا یہ انتخاب ترمیم و اضافہ کے بعد چوتھی مرتبہ شایع ہو رہا ہے۔ سرور صاحب نے تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ لوگ جو کسی مجبوری کی بنا پر کسی شاعر کا سارا کلام نہیں پڑھ سکتے اس شاعر کے رنگ سے متعارف ہو جائیں اور انھیں اسکے تفصیلی مطالعہ کی خواہش پیدا ہو۔ وجد اور مخدوم حیدرآباد کے ان شعرا میں ہیں جن کی شہرت طالب علمی کے دور ہی میں ہو گئی اور اس میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا گیا اور مقبولیت بڑھتی ہی گئی۔ اس کا سبب ان کا پڑھنے کا انداز ہی نہ تھا بلکہ کلام کی ندرت، بانکپن، تیکھا انداز، رچاؤ اور زندگی بخش اور حیات آفریں حرارت تھی۔ وجد کا پہلا مجموعہ کلام "لہو ترنگ" شائع ہوا اور دوسرا "آفتاب تازہ" نقش ثانی نقش اول سے بہتر تھا۔ اس لئے کہ وقت کے ساتھ ساتھ کلام میں پختگی اور خیالات میں جدت، رفعت اور ندرت آتی گئی۔ ان دونوں مجموعوں سے یہ انتخاب تیار کیا گیا ہے۔ اس میں سولہ نظمیں ہیں اور انیس ۱۹ غزلیں تقریباً سب ہی مشہور نظمیں شامل ہیں مثلاً اجنتا، نکتہ چین، مزدور [illegible] پیام، تاج محل، رقاصہ، ایلورہ اور طویل نظم کاروان زندگی اسی طرح انیس غزلیں بھی منتخب کیف آگین اور وجد آور ہیں۔ توقع [illegible] گا کہ بہت جلد پانچویں ایڈیشن کی نوبت آجائے۔

منارۂ نور خاور نوری۔ ناشر ادارہ تبلیغات حسینی۔ دیوڑھی عنایت [illegible] منڈی میر عالم حیدرآباد۔
$\frac{1}{16}$ کراؤن۔ خوبصورت رنگین سرورق۔ کتابت معمولی طباعت اور کاغذ نفیس صفحات ۱۰۲ قیمت ۲ روپے

میر حیدر علی صاحب صفا کے دو صفحے کے پیش لفظ اور سید مہدی حسین صاحب کے تمہیدے کے دو صفحے کے عنوان سے ان قصائد کا آغاز ہوتا ہے جو اہل بیت کرام کی شان میں کہے گئے ہیں۔ مراثی، نوحے اور سلام تو اکثر لکھے جاتے رہے ہیں۔ منقبت حضرت علی پر فارسی اور اردو میں قصیدے بھی ملتے ہیں جن میں شاعروں نے قدیم انداز شاعری کو برتا ہے لیکن پیش نظر کتاب شاعر کی جدت طرازی کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ اس میں اکیس قصائد ہیں جن میں اکثر و بیشتر دو دو مطلعوں کے ہیں۔ بہ اعتبار ساخت ان سب میں تشبیب، مدعا اور دعا کی پابندی تو نہیں لیکن اس سے انھیں بے نیاز بھی نہیں کہا جا سکتا۔ ممدوحین سے شاعر کا اظہار عقیدت

غالب یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ؎

کونین تری مدح میں سرگرم عمل ہیں لیکن ترے خاور کا نیا طرز ادا ہے

زبان و بیان کے لحاظ سے بھی قصاید بلند پایہ ہیں اور کہیں آورد کا شائبہ نظر نہیں آتا تسلسل اور روانی ان قصائد کی ایک خصوصیت ہے اور قاری سے یقیناً اپنی داد آپ طلب کریں گے ۔

وجدان کفر | منوہر لال شارب ۔ ادبی ٹرسٹ بکڈپو ۔ کمان اجنگ عابد روڈ حیدرآباد ۔ سائز ۱/۸ x ۲۰ ۳۰ ۔ صفحات ۲۰۰ کاغذ کتابت اور طباعت نفیس قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے ۔

شارب حیدرآباد کے جواں مرگ شعراء میں ہیں ۔ غموں میں زندگی گذاری مصیبتیں جھیلتے رہے ۔ اس آگ میں تپ کر کندن بنے اور شعر کے جواہر ریزے ان کے اپنے تجربات ہیں اس سانچے میں ڈھلے ہوئے ترشے ترشائے نگینے جو انگوٹھیوں کے لئے جمال آرا اور حسن افزا بن جاتے ہیں ۔ شارب کی غزلوں میں جتنا درد اور سوز ہے آواز میں بھی یہی کیفیت تھی وہ جب بھی شاعروں میں غزل پڑھنے مائیک پر آتے مجمع میں خواہ کتنا ہی شور و ہنگامہ ہو سناٹا و صامت ہو جاتا اور ان کی درد بھری لے میں ڈوب جاتا ۔ وہ رند لاابالی بھی تھے اور بکار خویش ہوشیار بھی انھوں نے اپنے فن سے خوب کام لیا خدائی راہ پر چل کر اپنے لئے جگہ پیدا کرنا مشکل ہے لیکن شارب اس میں کامیاب رہے ۔ مقدمہ نگار ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے صحیح لکھا ہے کہ شارب بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے ۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے ڈوب کر کہا ہے اور سوز دروں کی آنچ میں تپا کر پیش کیا ہے ۔ ان کی شاعری کا مزاج جمالیاتی اور جلالی ہے وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھیں فنا فی الشعر کہا جاتا ہے ۔ انھوں نے جو کچھ کہا کیف و مستی میں کہا اور جو کچھ کہا ۱۹۶۲ء میں غزلوں کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں ان میں اس کی حیثیت بہت بلند ہے ۔ (محمد البرالدین صدیقی)

روشنی کے بھنور | تامل ناڈ پبلیکیشنز ۵ ایرالسا بیگم اسٹریٹ ماونٹ روڈ مدراس ۲ قیمت (۷۰) پیسے ۔

افسانوں کا یہ مجموعہ مجلس مصنفین مدراس کا شائع کردہ ہے " کانچ کے محل کی کیا خبر" کے زیر عنوان مجلس کے سکریٹری راز امتیاز نے پیش لفظ لکھا ہے ۔ اس مجموعے میں تین افسانہ نگاروں [illegible] فیاض ، فضل جاوید اور علیم صبا نویدی کے تین تین افسانے شامل ہیں ۔ حسن فیاض کا تعارف جناب کاوش [illegible] کرایا ہے حسن فیاض کی افسانہ نویسی کی عمر دو سال ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں افسانہ لکھنے کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں ۔ تینوں افسانوں میں روزمرہ کے کردار پیش کئے گئے ہیں افسانوں میں کہیں کہیں فنی نقائص ہیں جو مشق و مزاولت سے دور ہو جائیں گے ۔ دوسرے افسانہ نگار فضل جاوید کا تعارف ملک کے ممتاز عالم جناب محمد یوسف کوکن عمری نے کرایا ہے تینوں افسانے شگفتہ اور دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں ۔ سماج کے بعض دلچسپ پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے ۔ ان افسانوں میں املاکی غلطیاں بھی ہیں اور زبان کی بھی نظر ثانی میں اکثر غلطیاں دور ہو جا سکتی تھیں ۔ تیسرا افسانہ نگار علیم صبا نویدی کو مدراس کے مشہور شاعر جناب [illegible] نے متعارف کیا ہے علیم صبا نویدی تامل ناڈ کے ابھرتے ہوئے فنکار ہیں ۔ اسلوب اور انداز بیان کے لحاظ سے انفرادیت موجود ہے ۔ ان کے افسانوں میں کچھ کیا ہے بھی ہو اور رجحانی بھی ۔ اگر یہ نو عمر فنکار مشق اور مطالعہ جاری رکھیں تو ان سے بہتر امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں ۔ ہمیں امید ہے کہ ادبی حلقوں میں یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور مدراس کے ان ابھرتے ہوئے فنکاروں کی ہمت افزائی کی جائیگی ۔ (فرزانہ انصاری)

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۰ شمارہ ۳

مارچ ۱۹۶۸ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

پروفیسر سید علی اکبر ایم۔اے۔کینٹب

مجلس مشاورت

میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ، ڈاکٹر غلام عمر خاں

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

منتظم	مہتمم
وقار خلیل	محمد جمال الدین

زرسالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے

ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

نمونے کے پرچہ کے لئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں
چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

پیش نظر شمارہ بجامت کہتر بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔ ابتدا جناب ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب کے مضمون سے ہوئی ہے "قرآن اور میں" عنوان ہے اس میں انانیت کا جو تصور کار فرما ہے وہ برہمی کا موجب ہو سکتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے قرآن کو نہ صرف سینہ سے لگایا ہی ہے بلکہ تا بحد استعداد اس کے سینے میں بھی جھانکنے ہی کی نہیں بلکہ بہ غور دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں ایک اچھا خاصا قرآنی کتب خانہ جمع کیا اور برسوں مطالعہ کرتے رہے پیر ہو گئے تو یہ کتب بارہ سال ہوئے ادارہ کی نذر کر دیا جو آج ادارہ میں ایوان قرآن کی شکل میں منظم موجود ہے۔

دوسرا مضمون عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو جناب ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کا ہے جو آج کا معرکۃ الآرا مبحث ہے ہنگامہ خیز ہی نہیں بلکہ فتنہ انگیز بھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے نہایت عالمانہ انداز میں حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے اور آندھرا پردیش میں انگریزی کے دلیش سے نکالنے کے بعد ہندی کو براجمان کرنے پر جو افتاد پڑے گی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد ریاست کی علاقائی زبان تلنگی کے ساتھ ساتھ اردو جو عوام کے پیچھے پڑی ہے۔ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ اردو کا رسم خط اردو والے اسی وقت چھوڑیں گے جب اردو ان کے ذہن سے محو کر دی جائے گر بقول غالب ؎ "آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک"۔

بہرحال ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون فکر انگیز اور قابل غور ہے۔ تیسرا مضمون بھی نہایت اہم ہے۔ اس سے دکنی غزل کی تاریخ اور ڈیڑھ سو سال پیچھے چلی گئی ہے۔ فیروزی کی رباعی منظر عام پر آگئی ہے۔ اب ڈاکٹر محمد جمال شریف صاحب نے تغزل کی تمام خوبیوں سے بھرپور فیروزی (فیروز شاہ بہمنی ۸۲۵ھ) کی غزل پیش کی ہے۔

جناب شکیل احمد صاحب صدیقی (لکھنؤ یونیورسٹی) نے امیر حسن دہلوی کے متعدد قلمی نسخوں اور دیوان کے دیباچہ پر تحقیقی نظر ڈالی ہے اور نئی باتیں پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی نے حیات جاوید (سرسید کی سوانح حیات) پر تنقیدی نظر ڈال کر مولانا حالی کو بلند پایہ سوانح نگار ثابت کیا ہے۔ ڈاکٹر وشنو سروپ نے ایک نیا موضوع اردو والوں کو دیا ہے اور نشاط صاحب نے یگانہ کے فن سے بحث کی ہے۔

۲۵، ۲۶ اور ۲۷ فبروری کو ادارہ ادبیات اردو نے یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقریبات منائیں۔ ۲۵ جنوری کو پانچ بجے گنبد محمد قلی قطب شاہ پر سید قمر حسن صاحب سابق رکن ہائی کورٹ کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ دوسرے دن ساڑھے چار بجے ایوان اردو میں ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مس نجمہ صدیقہ نے میر محمد مومن کی شاعری پر، ڈاکٹر مغنی تبسم نے وجہی کے اسلوب نثر پر۔ جناب عبدالوہاب ظہوری نے قطب شاہی اطبا پر مقالے سنائے۔ یہ مقالے آئندہ کی اشاعت میں شامل رہیں گے رات میں نو بجے مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت جناب عبدالوحید خاں صاحب ناظم آثار قدیمہ نے کی اور معتمدی کے فرائض محترمہ بانو طاہرہ سعید نے انجام دیئے۔ ۲۷ فبروری کو تلگو اجلاس منعقد ہوا۔ اس طرح یہ تقریب خوش اسلوبی سے انجام کو پہنچی۔

ڈاکٹر ہاشم امیر علی

قرآن اور میں

سرخی عنوان ہی سے آپ کی پیشانی پر بل آ گئے! بقول شاعر؎

ارے - آپ کی تو آنکھوں میں چمک رہے ہیں آنسو　٭　بس اب آپ سن چکے اور میں سنا چکا فسانہ

برادر محترم! اس قدر جلد غصہ میں نہ آئیے بیشک میں نے لفظ قرآن کے ساتھ "شریف" یا کریم یا حکیم نہیں لکھا ہے۔ اور پھر ان لفظوں میں اس قدر انانیت بھری ہے کہ بادی النظر میں گستاخی کا ضرور گمان ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو یاد رکھیے کہ میں بھی مسلمان ہوں اور مسلمانوں میں بھی ایسا مسلمان جو قرآن کا شیدائی ہے اور الکتاب کو دنیا کی دوسری کتابوں سے نسبت دینے کو بھی بے ادبی سمجھتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ "ایں کتابے نیست چیزے دیگر ست" قرآن لاریب کلام اللہ ہے اور اسی حیثیت سے قابل احترام ہے لیکن آپ نے یہ بھی سوچا کہ میں کیا اور کون ہوں؟

بندہ پرور! میں وہ ہستی ہوں۔ جس کی خلقت سے قبل پروردگار عالم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں اپنے ایک خلیفہ کی تخلیق کرنے والا ہوں جس میں قوت ارادہ بھی ہو اور خیر و شر میں امتیاز کرنے کا ملکہ بھی رہے۔ سنا ہے کہ اس ارادۂ ایزدی کے اظہار پر فرشتوں میں کھلبلی مچ گئی۔ انھوں نے عرض کیا پروردگار! ایسی ہستی تو تیری کائنات کے نظم میں خلل ڈالے گی۔ باعث فتنہ و فساد ہوگی۔ کیا ہم سب تیرے ہر حکم کی تکمیل کیلئے کافی نہیں ہیں؟

آپ کو معلوم ہے کہ پروردگار عالم نے فرشتوں کو کیا کہہ کر خاموش کیا؟

فرمایا "تم نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں"

یہ کہہ کر خالق مطلق نے "کن" فرمایا اور میں وجود میں آ گیا۔ ملائکہ نے مجھے سجدہ کیا یعنی میری اطاعت کا اقرار کیا قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا مجھے خود یاد نہیں لیکن مجھے یاد دلایا گیا ہے کہ پھر رب العلمین نے خود مجھ سے سوال کیا "کیا تو مجھے اپنا رب [illegible]" اور میں نے اپنی تتلاتی زبان میں کہا "بلیٰ" ہاں مانتا ہوں۔

اس عہد طفلی میں مجھ سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں ان سے درگذر کیجئے میں فرشتہ تھوڑا ہی تھا کہ غلطی کر ہی نہ سکتا، نہیں بھائی جب سے مجھے اپنے عمل پر اختیار حاصل ہوا۔ بس اسی وقت سے میں نے غلطیاں بھی کرنا شروع کر دیں۔ جنت سے نکالا جانا [illegible] اس دنیا میں آکر بھی کیا کیا حماقتیں نہیں کیں۔ کیا کیا غضب نہیں ڈھائے کیا کیا ستائیں نہیں [illegible] مگر کیا کروں میرے [illegible] میری سرشت اور تقدیر ہی میں تلاش حق لکھ دی ہے اور اس تلاش میں شب و روز خود کو [illegible] پاتا ہوں۔ [illegible] صحیح راستہ پر

چل نکلتا ہوں کبھی غلط راستہ پر چلکر نا چار و نا کامیاب الٹے پاؤں لوٹ آتا ہوں اور بھائی اس شیطان کا تو ذکر ہی کیوں کروں جو پروردگارِ عالم کی اجازت سے مجھے ہر لحظہ سبز باغ بتا کر بہکاتا رہتا ہے۔ بس افسوس اور پچھتاوا اس کا ہے کہ میں ان خاص بندوں کے حوصلے سے بہت دور ہوں جن پر شیطان کا بس ہی نہیں چلتا اور جو اپنے خالق کی بات رکھنے کے لئے جان بھی نذر کر دیتے ہیں۔

اب آپ مجھ سے تھوڑا بہت واقف ہو گئے ہوں گے تو کہئے اگر میں نے اس مضمون کا عنوان "قرآن اور میں" رکھا تو کیا بے ادبی کی۔ مانا کہ اللہ کی طرح کلام اللہ بھی قدیم ہے لیکن کلام اللہ صرف قرآن ہی تک محدود تھوڑا ہی ہے؛ قرآن کو تو دنیا میں نازل ہوئے اسی مہینے (رمضان المبارک ۱۳۸۶ھ) میں چودہ سو سال پورے ہوئے ہیں اور وہ بھی قمری سال! نزولِ قرآن سے اب تک اس کرۂ زمین نے آفتاب کے گرد چودہ سو مرتبہ بھی گردش نہیں کی ہے اور میں جس وقت میں نے اس پر قدم رکھا جب سے آج تک کائنات کا یہ ذرہ یا نکتہ چودہ سو یا چودہ ہزار مرتبہ کیا چودہ لاکھ سے کہیں زیادہ گردشوں کی تکمیل کر چکا ہے۔

قرآن کے اعجاز سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن بھائی کیا میں قرآن سے زیادہ نمایاں معجزہ نہیں ہوں۔ مجھ میں قوتِ تخیل ہے قوتِ گویائی ہے۔ نیک و بد خیر و شر کی قوت ہے۔ مجھے میرے خالق نے دو آنکھیں دی ہیں کہ دیکھوں۔ زبان دی ہے کہ اپنے دیکھنے سننے کا اظہار کروں اپنی خوبیاں اور اپنے کمالات کہاں تک گناؤں آپ سنتے سنتے تھک جائیں گے اور میری بلندیوں اور میری پستیوں کی گنتی ختم نہ ہوگی۔ میری طویل عمر کی مناسبت سے آج صبح کی بات ہے کہ یہ کرۂ زمین بھی میری قوتِ عمل کیلئے تنگ ہو گیا ہے۔ میں نے چاند تاروں پر بھی کمندیں ڈالنا شروع کر دی ہیں۔ بس اب آپ دیکھتے ہی رہیئے کہ اور کیا کیا نئے معجزات میری ہستی کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ اور آخر کیوں نہ ہوں؛ کیا میرے خالق ہی نے مجھے اشرف المخلوقات نہیں بنایا ہے کہ مجھے خلیفۃ اللہ فی الارض کا لقب نہیں عطا ہوا۔ تو پھر میں اس ارض کو جنت نشان بنانے کی کوشش نہ کروں تو کیا کروں۔ کیا اس امانت میں خیانت ہی کرتا چلا جاؤں۔ میں نے کیا بے ادبی کی اگر سبحان اللہ کے ساتھ اقبال کی زبان میں ایک بار کہدیا کہ ؎

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں   کارِ جہاں دراز ہے۔ اب مرا انتظار کر

بھائی جان! یہ قرآن تو میرے لئے نازل ہوا ہے۔ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ مجھے بار بار راہِ راست بتلاتا رہے۔ مجھے قدرتِ پروردگار کے کرشموں کی طرف متوجہ کرتا رہے۔ اقوامِ ماضی کے نیک و بد کردار سے آگاہ کرے اور ہر وقت یہ یاد دلاتا رہے کہ اگر میں اپنے خالق کا منشا پورا کرنے میں بالکلیہ قاصر رہوں تو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جاؤں گا اور میری جگہ کوئی دوسری ہستی پیدا کی جائے گی کہ خالق کا منشا پورا ہو اور اس کی کائنات حسین سے حسین تر بنتی جائے۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں قول میں اب تک پورا نہیں اترا۔ اپنے فرائضِ تعمیر پوری طرح بجا لانا تو کجا میں نے تخریب میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر کے بھیس میں میں نے کیا کیا نہیں برباد کیا! پھر بھی ندامت کے باوجود یہ سوچے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اگر میں نے تعمیر سے زیادہ تخریب کی ہوتی تو کیا یہ دنیا ایسی ہوتی جیسی کہ اب ہے۔ اسی خیال کی رو میں مست ہو کر ایک بار کہہ اٹھا تھا ؎ کہ تو شب آفریدی چراغ آفریدم

مگر اس چراغ کی ٹمٹماہٹ کتنی دور جا سکتی ہے کیا یہ صحیح نہیں کہ اس کی حقیر روشنی ہی سے میری کم مائیگی ظاہر ہوتی ہے؟ اچھا صاف صاف سن ہی لیجئے لیکن بھائی اس راز کو عام ہونے نہ دیجئے ورنہ فرشتوں تک بھی خبر پہنچ جائے گی اور ان کے پاس میری رہی سہی عزت بھی جاتی رہے گی۔

میں آرام اور سہل پسند بہت ہوں۔ سستی اور آرام جوئی ہی نے مجھے منزل مقصود تک پہنچنے نہیں دیا۔ آپ نے قرآن میں پڑھا ہوگا کیا میں نے انسان کو دو آنکھیں نہیں عطا کیں؛ زبان نہیں بخشی؛ تو پھر یہ ان کو استعمال کیوں نہیں کرتا؛ نشیب و فراز میں جو فرق ہے اس کو کیوں نہیں محسوس کرتا۔ بلندی کی طرف کیوں نہیں مائل ہوتا۔ نشیب اور سہل راستہ کیوں ٹٹولتا رہتا ہے۔ کیا یہ نہیں سمجھتا کہ کمزوروں کی مدد کرنا ہمسایوں کے کام آنا اپنی مدد کرنا اپنے کام آنا ہے۔ پھر اپنے ہم جنسوں کے کندھوں کا بوجھ ہلکا کرنے میں کیوں نہیں سرگرداں رہتا مگر اپنی سستی کو کیا کروں۔ جب ضمیر کی لے دے بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو انگڑائی لے کر کہہ اٹھتا ہوں ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ۔۔۔۔۔۔ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

قطع کلام معاف کیجئے۔ صرف ایسے سوالات کر کے قرآن میری متواتر تنبیہ نہیں کرتا۔ بلکہ میرے سامنے نمونے بھی پیش کرتا ہے کہ دیکھو جو انسان سستی اور کاہلی اور بے روح سجدوں کی بجائے پروردگار عالم کی حقیقی خدمت، عبودیت یا عبادت کرتے ہیں ان کو خالق کائنات کس طرح سے نوازتا ہے۔ کیا کیا رحمتیں خدمت گذار اغیار کے کاشانوں پر برساتا ہے۔ ڈھونڈنے والوں کو کیسی کیسی نئی دنیائیں دیتا ہے۔ لیکن بھائی کیا کروں میری نیم خوابی ایسی ہے کہ قرآن کی یہ سب نصیحتیں ایک کان سے داخل ہوتی ہیں اور دوسرے کان سے باہر نکل جاتی ہیں صرف یہ یاد رہ جاتا ہے کہ مجھ سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اور اگر میرا بس چلے تو اس نیم خوابی ہی کی حالت میں سیدھا جنت پہنچ جاؤں۔

قرآن نے کہا دن رات اپنے معبود کا دھیان رکھو۔ اگر آپ ذرا سوچنے کی تکلیف گوارا فرمائیں تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہر لحظہ اپنے خالق کو حاضر و ناظر سمجھا جائے لیکن میری سستی اس حکم کی تعمیل کی کیسے اجازت دیتی ہیں الفاظ بکرۃً و اصیلاً کے معنی لئے صبح و شام اور سمعنا و اطعنا کہہ کر صرف صبح اور شام کے وقت اللہ کا نام لے لیتا ہوں۔ بس "فرض" ادا کر کے باقی وقت نفس پرستی میں منہمک ہو جاتا ہوں یہ دبی زبان سے آپ نے کیا فرمایا؟ میں نے صرف دو وقت جو کہا وہ غلط ہے۔ اچھا بھائی پانچ وقت سہی لیکن کیا یہ پانچ وقت اللہ کا نام لینے سے بقیہ پورے اوقات کی خدا فراموشی کی تلافی ہو سکتی ہے؟ یوں پوچھئے تو میری "عبادت" کبھی کبھی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی نگہداشت اور ان کے حقوق و فرائض کو نظر انداز کر کے سینکڑوں نوافل کی ادائی سے خود کو جنت کا مستحق سمجھتا ہوں۔

قرآن کی تعلیم سے استفادہ کرنے کی بابت یہ تو میرا عوامی روپ تھا۔ خواص کے روپ میں قرآن سے جو سلوک میں نے کیا ہے اس کی داستان اس سے کہیں زیادہ اندوہناک ہے۔ اس کے ایک رُخ کو دیکھئے تو آپ مجھے فرشتہ سمجھنے لگیں گے لیکن دوسرے رُخ کو دیکھئے تو معاذ اللہ میں شیطان نظر آؤں گا۔ بے شک میں نے قرآن کی بظاہر بہت خدمت کی جس قدر اس کے رنگ روپ کو سنوارا اور کسی کتاب کو نہیں سنوارا۔ اس کی ہزاروں تفسیریں بھی لکھیں لاکھوں بار سونے چاندی اور موتیوں سے اس کی جلدوں اور اس کے ورقوں کو سجایا۔ قرآن ہی کی کتابت میں خطاطی کے ہنر کو انتہا تک پہنچا دیا۔ آج سے صدیوں قبل قرآن ہی کی بدولت عربی زبان ہی کی

بدولت اس کے عروج تک پہنچایا۔ قرآن ہی کی آیات کو طرح طرح سے لکھ کر در و دیوار کو گلزار بنا دیا اور فنِ تعمیر کو حسنِ نزاکت اور تقدس بخشا۔ یہی کتبے ہیں جو میری موجودہ انتہائی پستی کے دور میں بھی میرے لئے باعثِ فیضان ہیں۔

ہاں بھائی! میں نے یہ سب کچھ کیا اور اس سے بہت زیادہ قرآن کی خدمت کی لیکن دل تھام کر سنئے میں نے قرآن کی خدمت میں اس عقل و فہم و دراک یا فراست مومن سے بہت کم کام لیا جسے پروردگار عالم نے میرے لئے طرۂ امتیاز بنایا تھا مگر اپنی صفات کو روبہ عمل لاتا بھی تو کیسے؟ قرآن کی اصلی تعلیم پر پوری طرح عمل کرنے کیلئے محمدؐ کا دل اور حسینؓ کا جگر چاہیئے۔ ان دو روپوں میں بیشک میں نے فرشتوں کو بھی دم بخود کر دیا مگر اس بلند مقام پر کب تک رہتا؟ میری کمزوریاں مجھ پر غالب آگئیں اور ما بعد دورِ ملوکیت میں دفعتہ رفتہ میں وہ انسان نہیں رہا جس کو قرآن نے جلا دی تھی۔ پھر بھی دو تین صدیوں تک قرآن کی تعلیم کا پرتو مجھ پر پڑتا رہا اور میں نے ایسے متعدد افراد کے روپ میں اپنی تلاشِ حق کے نمونے دکھائے جن کے نام اب تک مشرق و مغرب میں خاص و عام ہیں لیکن چنگیز و ہلاکو کے بھیس میں میں نے خود کی بنائی ہوئی تہذیب کو ایسا برباد کر دیا کہ اس کی بدحالی کے نتائج سے مجھے آج تک نجات نہیں ملی۔ مجھے خود پر بھروسہ باقی نہیں رہا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کی بلند تعلیم سے استفادہ کی اہلیت ہی کھو بیٹھا۔ اس سے چشم پوشی کرنے لاحق ایں کہ اگر قرآن کے نور کی کہیں سے جھلک بھی آنے لگی یا کسی کو تلاشِ حق میں رسائی ہونے لگی تو فوراً میں نے اس پر تفسیر بالرائے کا الزام لگا کر اس کی تردید کرنی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد جو علماء مجھ میں پیدا ہونے لگے انھوں نے اپنی خداداد ذہانت کو قرآن فہمی کے لئے استعمال کرنے سے احتراز کیا اور عوام کے سوالات کے جواب میں اور وسوسوں کو دور کرنے کی خاطر ضعیف و قوی روایات کو بطور تفسیر یک جا نقل کر دینے ہی میں اپنی سلامتی سمجھی۔

مسلمانوں کے آپسی جھگڑے۔ سنی، شیعہ، قادیانی کے درمیان دنگہ فساد کی بنیاد ہی یہ ہوگئی کہ ہر فرقہ کے علماء کی سمجھ میں جو معنی آئے متعلقہ فرقے کے عوام اصلی معنی سمجھنے لگے اور جو معنی دوسرے فرقے کے علماء نے بتائے وہ سب تفسیر بالرائے قرار پائے مناظرہ کا بازار روز بروز گرم ہوتا گیا اور میں اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر کو برباد ہوتے دیکھتا رہا۔

میرے ہمدم! حسن وہ جس کا ہر کوئی اعتراف کرے اور حق وہ جس کا دشمن بھی قائل ہو جائے لیکن دشمن تو کجا قرآن میں دوست سے دوست بھی پوری طرح ہم خیال نہیں۔ اگر آپ اس کو بہتان سمجھتے ہیں تو قرآن کا کوئی ترجمہ پیش کیجئے جس کو چند مسلمانوں نے مل کر مرتب کیا ہو خواہ وہ چند اصحاب سنی ہوں یا شیعہ یا قادیانی۔ انجیل و توراۃ کے ترجمے دو دو تین تین سو آدمیوں کی متفقہ رائے سے مرتب ہوئے لیکن آج قرآن کا ایک بھی ترجمہ کسی زبان میں نہیں پایا جاتا جسے چند تو کجا صرف دو مسلمانوں نے مل کر مرتب کیا ہو۔ کیا یہ صورتِ حال اس کا ثبوت نہیں دیتی ہے کہ قرآن کے اصلی مفہوم کو میں خود کھو بیٹھا ہوں اور حافظ کے قول کے مطابق کہ؎ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔ کو صحیح ثابت کر رہا ہوں کیا از سرِ نو اس پیام کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے جس نے تیئس سال کی قلیل مدت میں عرب کی وحشی اور بت پرست قوم کو مہذب اور نعرہ توحید کا علمبردار بنا دیا تھا۔

استغفراللہ! میں نے بھی روانی بیان میں کیا کیا کہہ دیا۔ یہ تو باتیں ایسی ہیں کہ دل ہی دل میں دکھ کر ہزار بار مرجانا چاہیئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے انکشافات میں عموماً میں بہت احتیاط برتتا ہوں حق پر جان دینے کی نہ مجھ میں قوت باقی ہے نہ ارادہ۔ پشتہا پشت سے سلامت روی اور حکمت عملی پیش نظر رہی ہے۔ شاذ و نادر ہی زیادہ زبان تک آتی ہے۔ جیسے اقبال کے الفاظ میں ہم نے ایک بار کہہ دیا تھا ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی   یہ اُمت روایات میں کھو گئی

بھائی! اب قوتِ گویائی جواب دینے لگی، مگر بات پوری نہیں ہوئی۔ میں نے اپنی ایک کمزوری کا اب تک ذکر نہیں کیا لیکن خود ان زدیک آجائیے یہ اندرونی راز ایسا ہے کہ میرے ہم جنس اس کے سننے کی تاب ہی نہیں لاسکتے۔ ان تک اس اعتراف کی ہوا بھی پہنچ جائے، تو نہ جانے کیا کر دیں۔ میں خود نہیں میں شدت سے مبتلا ہوں سب سے بنیادی کمزوری یہی ہے جو میری قرآن فہمی میں حایل ہے اور اب بھی قدم آگے بڑھانے نہیں دیتی مگر اس موضوع پر بھے اور کہنے کی طاقت نہیں رہی۔ میرا دل ٹوٹا جا رہا ہے۔ چلتا نا باقی ہے۔ اسے کاش میں قرآن کے اصل مفہوم کو اس کے حقیقی پیام کو سمجھنے کی دل نشین کرنے کی صحیح کوشش کرتا اور خود پسندی، آسائش طلبی اور خود نہیں کی بجائے تلاشِ حق کا مشکل راستہ اختیار کرتا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسا ہوتا تو نہ مجھ پر مصیبتیں آتیں نہ مجھے حزن و غم کا سامنا ہوتا۔ دعا کیجیے کہ خدا اب بھی مجھے یہ نعمت عطا کرے کہ تلاشِ حق میں جاں فروشی کیلئے آمادہ ہو جاؤں۔

بقیہ مضمون صفحہ ۳۲ سے آگے

حالی کے علم، محنت، تجربہ، ادبی قابلیت، بصیرت اور فکر و فن نے ایک ایسا کارنامہ حیات جاوید کی شکل میں پیش کیا ہے جو متقدمین و متاخرین سب کے لئے باعث فخر ہے سامان بصیرت ہے فن سوانح عمری کی پیشانی کا نور ہے۔ دلوں کی زندگی ہے تاریخ کی خلعت ہے۔ تنقید کا سرمایہ ہے اور ادب کی لازوال دولت ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں

ہندوستان کا لسانی مسئلہ اور اُردو

ہندوستان میں زبان کا مسئلہ سیاسی قائدین کے ہاتھوں میں ایک تماشا سا بن گیا ہے۔ آزادی کے بیس سال میں اس کے کیا کیا فارمولے نہ بنے اور یہ کس کس نشیب و فراز سے دوچار نہ ہوا۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ آج انگریزی کو پاسبان خود صنم خانے سے مل گئے ہیں۔ انگریزی کی خاطر ہندوستانیوں نے جانیں دیں، اس کی خاطر اسٹیشن جلائے گئے۔ بسیں الٹی گئیں غرض کہ ہر وہ حرکت بیجا کی گئی جو جمہوریت کے چہرے پر سیاہ داغ ہے۔

اس فتنہ و انقلاب کی ابتدا ہوئی اس تصور سے کہ ہندی اور ہندوستانی قومیت لازم و ملزوم ہیں، اُردو ایک پاکستانی اور انگریزی ایک بیرونی زبان ہے۔ تاملناڈ اور بنگالی کو بھارتی بنانے کیلئے ان کا "ہندیانا" ضروری ہے۔ یہ تصورات غلط مفروضات پر قائم تھے اس لئے ان مفروضات کو ختم ہونے کیلئے دو دہوں کی ضرورت تھی۔

روشنی آئی لیکن دیر میں آئی اور جزوی آئی۔ سہ لسانی اور دو لسانی فارمولوں کی تکرار کے بعد بہرحال سرکاری طور پر طے یہی پایا کہ لسانی فارمولے ہی میں نجات ہے۔ یہ سہ لسانی فارمولا لسانی اقلیتوں کے لئے چہار لسانی بن جاتا ہے۔ بیس سال کے غور و فکر میں بہرحال دو صداقتوں کا علم ہوا۔ پہلی یہ کہ مادری زبان تعلیم کا بہترین ذریعہ ہے اور دوسری یہ کہ ملک کی وحدت اور سالمیت کے پیش نظر رابطہ کی زبان کا استحکام ضروری ہے۔ ان دونوں صداقتوں کے انکشاف کے بعد بھی الجھاؤ باقی رہ گئے ہیں۔ پہلی یعنی مادری زبان کی صداقت کے ساتھ پیچ یہ رہی کہ ان لوگوں کا حشر کیا ہوگا جن کی مادری زبان ریاست کی علاقائی زبان نہیں، دوسری کے ساتھ یہ سوال قائم رہا کہ رابطہ کی زبان ہندی ہو یا انگریزی یا دونوں۔

پہلے رابطہ کی زبان کے مسئلہ کو لیجئے۔ آزادی کی پہلی لہر میں ہندی والے دستور ساز اسمبلی سے یہ منظور کرا لے گئے کہ ۱۹۶۵ء تک انگریزی کا چلن رہنے کے بعد ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی، دیوناگری رسم خط میں بنائی جائے گی۔ ہمارے دستور کی اکثر دفعات میں ابہام بالقصد رکھا گیا ہے۔ گورنر اور ریاستی کابینہ کے باہمی ربط کے غیر واضح ہونے کا خمیازہ تو ہم آج کل بھگت ہی رہے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں ہمارے دستور سازوں نے سرکاری زبان کے متعلق دفعات میں جو ابہام رکھا ہے اس کی مثال متاخرین شعرائے فارسی کے یہاں بھی مشکل سے ملے گی۔ زبان کا تمام مسئلہ اسی کا بھگتوان ہے۔ چنانچہ جوں جوں ماہ و سال گزرتے گئے اور ۱۹۶۵ء قریب آتا گیا، خود پنڈت نہرو کی زندگی میں سطح مرتفع دکن سے زبان کے بارے میں گڑگڑاہٹ اٹھنے لگی۔ بالآخر اس نے ۱۹۶۵ء کے تاملناڈ کے زلزلے کی شکل اختیار کر لی۔ چونکہ ہماری جمہوریت میں روشنیٔ فکر کے لئے ہمیشہ ایک صدمۂ شدید کی ضرورت پڑتی ہے اسلئے اچانک محسوس

کیا گیا کہ ۱۹۶۵ء بہت قریب آگیا ہے۔

ہندی ہنوز کمسن کنہیا ہے اور انگریزی کے بغیر کام چلانا ممکن نہیں۔ چنانچہ پنڈت نہرو کے ایک تاریخی اعلان سے ہندوستان میں انگریزی کے چلن کی مدت اور بڑھ گئی جس کی مصدقہ شکل اب لینگویجز ایکٹ کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ بل ایکٹ بنے عمل اور ردِ عمل کی تکرار شروع ہوگئی اور بل کی بعض دفعات میں ایسی ترمیم کردی گئی کہ ہندی والوں کا کام صرف ہندی پڑھنے سے چل جائے۔ جبکہ دیگر زبانیں بولنے والے لازمی طور پر انگریزی یا ہندی سیکھیں، اس کے خلاف بنگال میں طوفان اور سطح مرتفع دکن میں پھر لرزش زیریں شروع ہوگئی ہے۔ چنانچہ سیاسی ذہن اب اس انداز میں سوچ رہا ہے کہ سیول سروس کے امتحانات میں انگریزی اور ہندی کے پرچے تو کرنا پڑیں لیکن ان پرچوں کے نمبر نہ جوڑے جائیں تاکہ نتائج امتحان پر اثر نہ پڑے۔

دوسرا مسئلہ مادری یا ریاستی (علاقائی) زبان کا ہے۔ اُردو کا مسئلہ اسی سے متعلق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو کی ایک کل ہند حیثیت ہے۔ مختلف ریاستوں میں اس کے بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ (یو پی) سے لیکر ۲۳ لاکھ (میسور) تک جاتی ہے دیگر ریاستوں میں بھی دو لاکھ تا دس لاکھ کی تعداد میں اردو بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ کشمیر میں اس کو مادری زبان کے طور پر بولنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے لیکن یہ وہاں کی تہذیبی اور سرکاری زبان تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن اُردو کا بنیادی مسئلہ اب اس قدر کل ہند حیثیت کا نہیں رہا۔ جتنا کہ ریاستی یا علاقائی حیثیت کا بن گیا ہے مثلاً یوپی اور بہار میں اس کا مقابلہ ہندی سے ہے، ہندی اُردو ایک ہی لسانی حقیقت کی دو شکلیں ہیں اس لئے یہ ایک دوسرے میں جذب بھی ہوسکتی ہیں اور انجذاب کے اس عمل میں ایک دوسرے کو متاثر بھی کرسکتی ہیں۔ یہاں اُردو رسم خط کا ایک اہم رول ہے وہ حضرات جو اُردو کے لئے دیوناگری رسم خط تجویز کرتے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندی کے علاقے میں اُردو کا وجود اسی سے عبارت ہے ورنہ اُردو کے اسالیب میں وہ وسعت ہے کہ ایک طرف اس کے ڈانڈے ہندی سے ملے ہوئے ہیں اور دوسری طرف فارسی سے' اُردو رسم خط کے پیچھے ایک تہذیب اور ایک تاریخ ہے۔ اسے مفاہمتوں اور سمجھوتوں کی خاطر قربان نہیں کیا جاسکتا تاآں کہ وہ سمجھوتہ ایک کل ہند سطح پر نہ ہو جس میں ہندوستان کی ہر زبان کو کچھ کھو کر کچھ پانا پڑے۔ ہر زبان کا ایک اجتماعی وجود اور اس کی ایک "انا" ہوتی ہے جو تاریخ کے عمل میں رفتہ رفتہ تحلیل ہوتی ہے۔ اتاترک نے ترکی میں اس پر جو ضرب کاری لگائی تھی اس کا ردِ عمل اب ترکی میں پایا جاتا ہے۔ جس کے زیر اثر ترک اور ترکی دونوں آج اپنے وجود پہ پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ اُردو کے سلسلے میں دیوناگری رسم خط تجویز کرنے والوں میں یہ کہوں گا کہ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ جرات استدلال پیش کیوں نہیں کرتے کہ اردو والوں کو صاف صاف اب ہندی اختیار کرلینی چاہیئے اس لئے کہ اُردو کا اب ہندوستان میں کوئی مستقبل نہیں۔ میرے خیال میں اس تجویز میں پھر بھی ایک استدلال سا تو ملتا ہے کہ اقلیتوں نے بارہا اپنی زبانیں بدلی ہیں۔ جزوی اور محتاط جرات کے مقابلے میں بے محابا جرات کم از کم ایک نسل کو لسانی دو رنگی سے بچالے گی!

اُردو کا موقف جہاں تک جنوبی ہند کی ریاستوں کا تعلق ہے۔ قدرے مختلف ہے۔ دکن کی جن ریاستوں میں

اُردو بولنے والے خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں، مہاراشٹرا آندھرا پردیش اور میسور میں۔ ان میں سے اوّل الذکر کی علاقائی زبان کا تعلق زبانوں کے ہند آریائی گروہ سے ہے۔ اسلئے اُردو اور مرہٹی کے مابین کافی مشترک لسانی عناصر پائے جاتے ہیں۔ دراصل دکن میں قدیم اُردو کا تشکیلی گہوارہ مرہٹی ہی کا علاقہ رہا ہے۔ آندھرا پردیش اور میسور میں اردو کا سابقہ دراویڈی خاندان کی دو زبانوں تلگو اور کنڑی سے ہے۔ اردو اور ان زبانوں کے مابین صرف سنسکرت سے ماخوذ الفاظ کا اشتراک ہے ورنہ قواعد کے اعتبار سے اردو ان زبانوں سے بالکل مختلف ہے۔ دکن کی زبانوں سے اردو کے اختلاط کی ایک حد فاصل ہے اور ان میں انجذاب ناممکن ہے۔ سابق سلطنتِ آصفیہ کی شہری اور قصباتی آبادی کو چھوڑ کر دکن کا تمام اردو داں طبقہ دو لسانی ہے۔ یعنی مرہٹی کے علاقے میں وہ مرہٹی بولتا ہے اور تلگو کے علاقے میں تلگو قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کے زمانے سے یہ دو زنگی قائم ہے چوں کہ اُردو حکمرانوں کی زبان تھی اسلئے اُس وقت اس دو زنگی کا جھکاؤ اُردو کی جانب رہتا تھا اب صورتِ حال مختلف ہوتی جا رہی ہے۔ آج جب کہ تلگو اور کنڑی بولنے والوں کی نئی نسل اُردو سے قطعاً اعماض کر رہی ہے۔ اُردو بولنے والے ان زبانوں کے سیکھنے پر مجبور ہیں چنانچہ حیدرآباد جیسے اُردو شہروں میں اُردو بولنے والے بچے اب تلگو پڑھ رہے ہیں۔ یہ بچے پڑھ کر جب بڑے ہوں گے تو انھیں کام چلاؤ تلگو آتی ہوگی اور اسی نسبت سے اُردو سے ان کا سابقہ کم ہوتا جائے گا۔

شمالی ہند کے مقابلے میں دکن میں یہ لسانی دو زنگی ابھی عرصے تک قائم رہے گی جب کہ شمالی ہند میں گھریلو زبان کے محاورے میں کوئی بڑی تبدیلی ہوئے بغیر اُردو والوں کی نئی نسل ہندی میں ڈھل جا چکی ہے۔ دکن میں تلگو کو مادری زبان کی قدرت کے ساتھ استعمال کرنے میں ابھی عرصہ لگے گا۔ چنانچہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اردو والے چاہیں تو اپنی تنظیم کر سکتے ہیں۔ کسی بھی تنظیم کے لئے ضروری ہے کہ اس زبان کے بولنے والوں کے یہاں لسانی "انا" کا شعور ہو۔ اس کی قدر کا احساس ہو اور وہ اپنے لئے اردو کو ناگزیر سمجھتے ہوں۔ اس کے بغیر کسی بھی اقلیت کی زبان کا زندہ رہنا دشوار ہے۔ تاریخِ لسانیات شاہد ہے کہ تیسری نسل تک اقلیتوں کی زبانیں بدل جاتی ہیں۔ تاآں کہ وہ ایک "اسرائیلی انا" کے عزم پر فائز نہ ہوں۔ اجتماعی انا کی اس شرط کو پورا کرنے کے بعد تنظیم کا ہونا ضروری ہے۔ تنظیم ہمارا کمزور ترین پہلو رہا ہے۔ عمل کی ناکامی ہمارا مرض دیرینہ ہے۔ خود ہمارے شہر حیدرآباد میں بے شمار ڈیڑھ اینٹ کے ادارے ہیں۔ اس انتشار کی وجہ سے ہم ایک بھی ادارہ جیسا کہ چاہیئے نہیں چلا سکتے۔ اقلیتوں کی زبان کے تحفظ وارتقا کے کئی محاذ ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنی اپنی استعداد کے مطابق محاذ کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ سیاسی پلیٹ فارم کی جدوجہد سے قطع نظر اُردو کے تعلیمی نظام کی تنظیم وقت کا اہم مسئلہ ہے بالخصوص ان بڑی تبدیلیوں کے پیش نظر جو آندھرا پردیش کے تعلیمی نظام میں ۱۹۶۹ء سے آنے والی ہیں جب تلگو کو یونیورسٹی کی سطح پر ذریعہ تعلیم بنانے کا آغاز کر دیا جائے گا۔ اس وقت اردو کی صورتِ حال کیا ہوگی۔ اُردو کالجوں کا قیام کہاں کہاں عمل میں آ سکے گا۔ اردو کی متوازی کلاسیں کہاں کہاں قائم کی جا سکیں گی۔ جن قصبوں اور دیہاتوں میں اُردو بولنے والے بچے بہ مجبوری تلگو میڈیم سے پڑھیں گے کیا وہاں اُردو کو بحیثیت ایک لازمی مضمون کے پڑھایا جا سکے گا۔ یونیورسٹی اور کالجوں میں اُردو مادری زبان والے اساتذہ کا کیا حشر ہوگا اب تک تو انگریزی کے سہارے گذر گئی جو مہ گئی ہے اسکے لئے کیا سہارا ہوگا یہ ہے وہ زبردست لسانی مسئلہ جو آندھرا پردیش کی اُردو بولنے والوں کے سروں پر آن کھڑا ہے۔ جسکا سیاسی علمی اور تعلیمی سطح پر حل ڈھونڈھنا ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر محمد جمال شریف

ابتدائی اُردو (دکنی) کی
ایک نایاب بیاض

یہ ایک قدیم اور نایاب بیاض ہے جسے میرے ایک مخلص دوست مولوی احمد خاں صاحب درویش نے دی ہے۔ بیاض ۵ء۳ × ۶ سائز کی (۵۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۲ تا ۱۵ سطریں ہیں۔ یہ اپنی قدامت اور ندرت کے اعتبار سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں مختلف شعراء کا اُردو اور فارسی کلام ہے جس کی تفصیل ذیل میں پیش ہے :—

۱- فیروزی	ایک غزل (دکنی)	۹- شمسی-	نامکمل غزل (دکنی)
۲- شاہ برہان جانم	ایک غزل (〃)	۱۰- میر محمد علی -	۸ دوہرے (〃)
۳- شوقی	۴ غزلیں (〃)	۱۱- شریف محمد	۸ غزلیں (〃)
۴- میران	۱۰ غزلیں (〃)		۳ سرودِ عشق (〃)
۵- فراقی	ایک غزل (〃)		دوہرے (〃)
۶- نیازی	ایک غزل (〃)		۱۸ غزلیں (فارسی)
۷- نادر	ایک غزل (〃)	۱۲- شاہ راجو	گفتار سید راجو (〃)
۸- ناصر	ایک نظم (〃)	۱۳- شاہ نعمت اللہ ولی	نعتِ نبی صلعم (〃)

۱۴- خواجہ کاکی — مناجات خواجہ کاکی (فارسی)

بیاض سے اولاً فیروزی کی نادر غزل پیش کی جاتی ہے۔

فیروز شاہ بہمنی (۸۰۰ - ۸۲۵ھ) متخلص بہ فیروزی کی ایک اُردو رباعی کو جو راقم کے پی۔ ایچ ڈی کے مقالہ کی زینت ہے ماہنامہ سب رس نومبر ۱۹۷۶ء کے ذریعہ سے اس خیال کے ساتھ روشناس کرایا گیا تھا کہ شاید تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ دریافت نشان راہ کا کام دے اور آئندہ تحقیق میں فیروزی کا مزید کلام منظر عام پر آئے۔ حسن اتفاق کہ راقم کو زیر نظر بیاض میں فیروزی کی ایک غزل جس میں ۵ شعر ہیں بعنوان "فیروزی راست" دستیاب ہوئی جسے ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ فیروزی کی جس رباعی کا سابق میں تعارف کرایا گیا تھا اس کا عنوان بھی "فیروزی راست" ہی تھا۔ اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ رباعی اور غزل دونوں فیروزی ہی کی تخلیقات ہیں۔ فیروزی کی رباعی اگرچہ کہ اسکو اُردو کا ایک بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر قرار دینے کیلئے

کمائی تھی لیکن اس غزل کی دستیابی سے بھی نہ صرف اس خیال کی تائید ہوتی ہے بلکہ اس کے ایک اچھے پُرگو نازک خیال اور بلند پایہ شاعر اور استادِ سخن ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ چونکہ یہ بالکل ابتدائی دور اور اردو غزل گوئی کی تاریخ میں سب سے پہلی غزل ہے اور اس سے پہلے کے کسی اور شاعر کی غزل کا نمونہ دستیاب نہیں ہوا اسلئے فیروزؔی اردو کا پہلا غزل گو شاعر قرار پاتا ہے۔

غزل کی زبان قدیم ہے جو شوخی اور نازک خیالی کا بہترین نمونہ اور لٹکتی۔ مہکتی۔ چہکتی۔ ٹھمکتی۔ کالی۔ لالی۔ خالی۔ لٹکی جٹکی۔ آگی۔ جاگی۔ لاگی جیسے الفاظ و محاوروں سے پُر اور قد۔ سرو۔ چال۔ کال۔ گل۔ نین۔ کاجل۔ بال کی نادر تشبیہات سے مالامال ہے اور قافیہ ڈولتا۔ بھولتا۔ گھولتا۔ چلبولتا۔ چھولتا۔ کھولتا ہے۔ یہ ابتدائی دور کی اردو غزل کا اولین اور اعلیٰ نمونہ ہے جو اپنے زمانے کی تہذیب و تمدن کی جاندار چلتی پھرتی تصویریں نظروں کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ فیروز شاہ بہمنی جو کئی زبانیں جانتا اور فارسی کا ایک شیریں کلام اور جادو بیان صاحبِ دیوان شاعر تھا اردو غزل میں فارسی تشبیہات و استعارات اور فارسی غزل کے علامتِ اظہار اور عناصر کو برتنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ مقامی تہذیب کے عناصر کو ہی اپنی غزل میں جگہ دی اور مقامی تشبیہات و استعارات اور دکنی الفاظ و محاورات کو اس خوبی سے برتا ہے کہ اس سے اس کی قادر الکلامی اور حسنِ کمائی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ فیروزؔی کی اس تخلیق میں فارسی عنصر اور ایرانی طرز معاشرت کی بجائے دیسی تہذیب و تمدن اور دکنی عنصر غالب ہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ فیروزؔی نے غزل کی زبان کو سادہ اور رواں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں دکنی رنگ محض زبان کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ زبان کے علاوہ خیال اور طرز معاشرت میں بھی عیاں ہے۔ فیروزی نے جو فارسی کا پُرگو قادرالکلام اور صاحبِ دیوان شاعر تھا اردو میں فارسی کی محض نقالی نہیں کی ہے بلکہ فارسی غزل کی ہیئت کو سامنے رکھکر اپنی زبان میں کامیاب کوشش کی ہے۔ اس میں مضامین کا تنوع اور جذبات و احساسات کی رنگا رنگی بھی ہے اور مقامی ماحول و دیسی معاشرت کی عکاسی بھی۔ جس سے عورتوں کی مخصوص تہذیب اور دکنی رہن سہن۔ چال چلن کی واضح جاندار اور چلتی پھرتی تصویریں نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ نیز محبوب کی یاد میں انتظارِ یار کی جو گھڑیاں کاٹنی پڑتی ہیں اس کا واضح خاکہ بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس میں مقامی تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھ ساتھ رفعتِ خیال بھی ہے اور شگفتگیِ بیان بھی۔ شیریں زبانی بھی ہے اور جادو بیانی بھی۔ اشعار کے مضامین سے جوشِ محبت بھی ٹپکتا ہے اور عشق کی کارفرمائی بھی۔ اس میں داخلیت اور خارجیت کا خوبصورت امتزاج بھی ہے اور جذبات و احساسات کا مرقع بھی۔ حسن کے خارجی مظاہر کی عکس کشی کے ساتھ مقامی رنگ ایسا دیا گیا ہے کہ اس پر دکنی چھاپ علانیہ نمایاں ہے۔ غرض غزل کا جو متوازن مزاج بعد کے غزل گو شعرا میں ملتا ہے وہی مزاج اس غزل کا بھی ہے جو اس کی رگ رگ میں رچا بسا ہوا ہے۔ جو لوگ اقلیم دکن کے ساتھ ساتھ اقلیم سخن کے بھی بادشاہ ہوئے ہیں ان کی فہرست میں فیروز شاہ بہمنی نہ صرف فارسی کے بلند پایہ صاحب دیوان بلکہ دکنی کے شاعر کی حیثیت سے سرفہرست اور ممتاز نظر آتا ہے۔ جسے قدرت نے سلطنتِ بہمنی کی حکمرانی اور فرماں روائی کے ساتھ ساتھ سلطنتِ سخن کی بادشاہت بھی عطا فرمائی۔

ذیل میں فیروزی کی اس غزل کو پیش کیا جاتا ہے ؎

"فیروزی است"

لٹکتی سنہ پری سوں سوھتی سوعادا سروُسا ڈولتا
توں ایسی سرک پر ھوتی فرشتہ دیک بج بھولتا

مہکتی بال بیش کالی جھکتی گال گل لالی
ٹھمکتی نین تو خالی نینوں مین کا جلا گھولتا

چھل اتی چال سون ٹکی چلنت میں ہنس کو ہٹکی
کر مکر پر لٹ یون لٹکی جو دھن پہ ناگ چلبولتا

توں ہر دم یاد ہے آکھی نہ بسریں دین دین جاگی
سو ڈوری ذکر کی لاکی دولارا من منی جھولتا

سو جہ انک دل بدل سر سے سو شعلی آگ کے برسے
بعوت فیروزی اب ترسے سو کاھی میک نہیں کھولتا

۱ خوبصورتی سے سج کر	۲ ہاتھی	۳ ناز نخرہ	۴ مانند - جیسے -
۵ فرشتہ - نیک	۶ دیکھ	۷ تجھ	۸ - سر -
۹ آنکھ	۱۰ آنکھوں میں	۱۱ کاجل	۱۲ شوخ - چلبلا -
۱۳ بہت - نہایت	۱۴ - سے	۱۵ رفتار	۱۶ کر - کھ - چہرہ -
۱۷ زلف	۱۸ جون - مانند - جیسے -	۱۹ دولت - روپیہ پیسہ - خزانہ	۲۰ سانپ
۲۱ چل بولتا (چلبلانا)	۲۲ تو	۲۳ آتی ہے	۲۴ گزرے
۲۵ رات دن	۲۶ محبوب - پیارا -	۲۷ دل	۲۸ مین
۲۹ آنگ - جسم - بدن -	۳۰ تہ بہ تہ	۳۱ بہت	۳۲ کیوں - کس لئے -
۳۳ میگھ - بادل	۳۴ چھپتا		

نوٹ

غزل کی کتابت بن و عن کی گئی ہے -

محمد شکیل احمد صدیقی

دیوان امیر حسن دہلوی کے قلمی نسخے
اور مطبوعہ دیوان کے دیباچہ پر تحقیقی نظر

سرزمین ہند میں پیدا ہونے والے فارسی گو شعرا میں امیر حسن دہلوی کا نام صف اول میں ہے یہ امیر خسرو دہلوی کے ہمعصر دوست اور پیر بھائی تھے شاہزادہ محمد سلطان المعروف بہ خان شہید گورنر ملتان اور علاءالدین خلجی کے درباروں میں دونوں شعرا ساتھ ساتھ رہے۔ ہندوستان کے یہی دونوں شعرا ایسے ہیں جنکی عظمت کے سامنے ایرانیوں نے بھی سر جھکایا ہے۔ امیر خسرو کو جو مقبولیت حاصل ہے۔ وہ محتاج بیاں نہیں۔ امیر حسن کی بھی شہرت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں ہی سعدی ہند مشہور ہو گئے تھے۔

حسن کے دیوان کے قلمی نسخے ہندوستان کے علاوہ یورپ کی بڑی بڑی لائبریریوں مثلاً بوڈلین لائبریری آکسفورڈ، برٹش میوزیم لائبریری لندن، انڈیا آفس لائبریری لندن، رائل لائبریری برلن، میونچ لائبریری جرمنی، اور سینٹ پیٹربرگ لائبریری امریکہ وغیرہ میں موجود ہیں۔ جن میں سے انڈیا آفس لائبریری لندن اور بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں بالترتیب ۱۵ اور ۸ نسخے ہیں۔ ہندوستان کی لائبریریوں میں بھی کئی کئی نسخے محفوظ ہیں مثلاً سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد میں ۵ نسخے ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری بنگال میں ۳ نسخے، آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں ۲ نسخے خدابخش لائبریری بانکی پور میں ۲ نسخے۔ ان نسخوں میں کچھ نسخے تو ایسے ہیں جن میں کوئی تاریخ کتابت درج نہیں لیکن وہ نسخے جن میں تاریخ کتابت دی ہوئی ہے قدیم ترین نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں ہے اسکی کتابت شاعر کی وفات کے ۹۰ سال بعد ۸۲۹ھ میں ہوئی بیرونی ممالک کے نسخوں میں دوسرا قدیم نسخہ بھی اسی لائبریری کی زینت ہے جو ۸۳۲ھ میں زیور کتابت سے آراستہ ہوا یہ نسخہ پہلے نسخہ سے کہیں بہتر ہے ہندوستان میں جو نسخے ہیں اُن میں قدیم ترین نسخہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی لائبریری میں ہے اور امیر خسرو دہلوی کے دیوان کے حاشیہ پر ہے اس کی کتابت ۸۰۵ھ میں ہوئی تھی۔ دوسرا قدیم نسخہ آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں ہے۔ جسکی کتابت ۸۶۰ھ میں ہوئی امیر کے دیوان کے زیادہ تر نسخے مغلوں کے عہد کی یادگار ہیں اسلئے بعض بعض نسخے بڑے مطلا اور مذہب ہیں اور بہت ہی پاکیزہ نستعلیق خط میں لکھے ہوئے ہیں جن میں سے ایک نسخہ تو سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کے شوکیس کی زینت بنا ہوا ہے۔ یہ ۹۹۸ھ کا ہے۔ ایک اور نسخہ جو دیوان شاہی کے ساتھ شامل ہے۔ ۱۰۱۷ھ کا ہے۔ یہ بھی اسی میوزیم کے شوکیس میں ہے۔

دیوان کے تمام نسخوں میں دو نسخے ایسے ہیں جن کے شروع میں ایک مقدمہ بھی شامل ہے جو خود شاعر کا ہے۔ ان میں سے ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے جس کا سنہ کتابت ۹۴۳ھ ہے اور دوسرا نسخہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں ہے [illegible]

لکھا گیا۔ ان دواوین کا مقدمہ بہت ہی اہم ہے اور اس سے شاعر کے بارے میں بہت ہی قیمتی معلومات فراہم ہوتی ہیں مثلاً ۱۳ سال کی عمر سے شاعری شروع کی مروجہ دیوان سے قبل ۳۰ سال کی عمر میں غیاث الدین بلبن کے عہد میں سب سے پہلا دیوان[۱] مرتب کیا۔ مروجہ دیوان کی ترتیب کے وقت شاعری سے بیزاری کا اظہار اور تصوف کی طرف رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

قلمی نسخوں کے علاوہ حسن کا ایک مطبوعہ دیوان بھی ہے یہ دیوان مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی سرپرستی میں مسعود علی محوی صاحب کی مساعی جمیلہ سے تقریباً ۴۰ سال قبل ۱۳۵۲ھ میں مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ اُسے محوی صاحب نے ۵ نسخوں سے ترتیب دیا جن میں سے ایک نسخہ خود مہاراجہ صاحب موصوف کا ذاتی تھا بقیہ چار نسخوں میں دو آصفیہ لائبریری اور دو سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد کے نسخے ہیں۔ مہاراجہ صاحب کا یہ ذاتی نسخہ نہ معلوم اب کہاں پہونچا؛ باوجود جستجو مجھے اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اس مطبوعہ دیوان سے قبل ۱۴۱ صفحہ کا ایک بسیط مقدمہ محوی صاحب نے سپرد قلم فرمایا ہے جو محوی صاحب کی کاوش اور اُن کی علمیت کی روشن دلیل ہے۔ امیر حسن کے بارے میں اس قدر معلومات فاضل مرتب نے اس مقدمہ میں اکٹھا کر دی ہیں جو اس سے پہلے اور کہیں نہیں ملتیں۔ محوی صاحب کی محنت شاقہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مقدمہ میں بعض تحقیقی غلطیاں ہو گئی ہیں جن کا ذکر کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا لیکن اس سے قبل یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ہمارا مقصد عیب جوئی یا تنقیص ہرگز نہیں جیسا کہ عام طور پر رواج سا ہو گیا ہے کہ اشہب قلم کی باگ تنقید کے میدان سے تنقیص کے ریگستان کی طرف موڑ دی جاتی ہے تحقیق ایسا عمیق سمندر ہے جس کی کوئی تھاہ نہیں اس کی گہرائیوں سے برابر قیمتی موتی نکلتے ہی رہتے ہیں پھر یہ کہ محوی صاحب نے جب یہ مقدمہ سپرد قلم کیا اُس وقت یہ سہولتیں نہ تھیں کہ بیرونی ممالک کی لائبریریوں میں جو مواد ہے وہ لیکر فلم یا فوٹو اسٹیٹ کاپی کی شکل میں آجائے اور بغیر سفر کی صعوبتوں کو برداشت کئے گھر بیٹھے ہم اُس سے فائدہ اٹھا سکیں نیز یہ کہ حیدرآباد کے علاوہ ہندوستان کی دیگر لائبریریوں سے بھی وہ مستفید نہ ہوئے تھے ان حالات میں انھوں نے جو کچھ لکھ دیا وہ بہت ہے علاوہ ازیں غلطی اور سہو بڑوں بڑوں سے ہو جاتا ہے یہ فطرت انسانی کا جزو لا ینفک ہے۔ انسانی تحریر کوئی صحیفۂ آسمانی تو نہیں کہ اُس کا حرف حرف صحیح ہو اور اُس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہ ہو یا اُس سے اختلاف نہ کیا جا سکے خامیوں کے باوجود امیر حسن کی حیات و شاعری کے سلسلہ میں محوی صاحب کا یہ مقدمہ نقش اولیں کی حیثیت رکھتا ہے اور نقش اولین کی اہمیت کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

امیر حسن کا سالِ ولادت بجائے ۶۵۱ھ کے ۶۵۲ھ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے محوی صاحب نے انڈیا آفس لائبریری والے دیوان کے مقدمہ کا حوالہ دیتے ہوئے ۶۵۱ھ درج کیا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مقدمہ کے اختتام پر جو تاریخ دی ہوئی ہے اُس سے ۶۵۲ھ ہی نکلتا ہے مقدمہ میں اس دیوان کی ترتیب کے وقت شاعر نے اپنی عمر ۶۳ سال کی لکھی ہے مقدمہ کے آخر میں تاریخ ۲ ذیقعدہ ۷۱۵ھ درج ہے۔ لیکن بانکی پور لائبریری والے دیوان میں جو مقدمہ ہے اُس کے خاتمہ پر غرہ ربیع الاول ۷۱۴ھ درج ہے ۶۳ سال کی

---

[۱] افسوس کہ یہ دیوان ناپید ہے۔

عمر میں دیوان مرتب ہونا اس میں بھی مرقوم ہے۔ میں نے انڈیا آفس کے دیوان کے مائیکرو فلم منگوا کر اور پٹنہ جاکر دونوں مقدموں کا مقابلہ کیا۔ دونوں مقدموں کی عبارت تقریباً ایک ہی ہے البتہ بانکی پور والے مقدمہ میں ایک پیراگراف شروع میں زائد ہے جو قصیدہ مخمس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ہے جس سے اس دیوان کی ابتدا ہوئی ہے۔ دونوں دواوین کی تاریخ ترتیب میں ۲۱ ماہ کا فرق ہے اس فرق کا سبب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حسن نے ۷۱۴ھ میں دیوان مرتب کرلیا تھا ۲۱ ماہ بعد جب اس سے دوسرا نسخہ نقل کیا گیا تو کاتب نے تاریخ نقل کو تاریخ ترتیب قرار دے دیا کیونکہ جب ہمارے پاس اس کا ثبوت موجود ہے کہ دیوان ۷۱۴ھ میں مرتب ہوگیا تھا تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ قدیم شہادت پر بعد کی تحریر کو ترجیح دیں علاوہ ازیں تاریخی اعتبار سے بھی انڈیا آفس والے نسخہ کی تاریخ صحیح نہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ علاءالدین خلجی کا ۶ شوال ۷۱۵ھ کو انتقال ہوا جیسا کہ امیر خسرو کے ان اشعار سے ظاہر ہے ؎

زشوال آمده ہفتم پیاپے   سنہ ہفصد شانزده بر سرِ دے
کزیں دیرِ سپنج آں شاہِ آفاق   بروں از ہفت گنبد بر کشش طاق[1]

۲۰ ذیقعدہ ۷۱۵ھ کو دیوان کی ترتیب اس کے انتقال کے ۶ ہفتہ کے بعد قرار پاتی ہے اس طرح شاعر کا یہ بیان غلط ہوا جاتا ہے کہ اس نے علاءالدین خلجی کے عہد میں یہ دیوان مرتب کیا جیسا کہ بانکی پور لائبریری کے مخطوطہ سے ظاہر ہے اگر بانکی پور کے مخطوطہ کو نظر انداز کرکے صرف انڈیا آفس والے مخطوطہ کو سامنے رکھیں تو اس میں بھی "ہم عہد بادشاہ" کا لفظ دیا ہوا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت کوئی نہ کوئی بادشاہ تخت دہلی پر متمکن تھا لیکن مندرجہ بالا تاریخ پر دہلی کا تخت بادشاہ سے خالی تھا کیونکہ علاءالدین خلجی کے بعد مبارک شاہ ۲۴ محرم ۷۱۶ھ کو قطب الدین کے لقب سے تخت نشین ہوا۔[2] ان دونوں بادشاہوں کے درمیان ڈھائی ماہ کا وقفہ اس لئے ہے کہ علاءالدین خلجی کے انتقال کے بعد اس کے غلام ملک کافور پر حکمرانی کا بھوت سوار ہوا اور اس نے سلطان علاءالدین خلجی کے بیٹوں کو اندھا کرا کر قید کرنا شروع کردیا چنانچہ سلطان کے تین بیٹوں خضر خاں، شادی خاں اور فرید خاں کے ساتھ یہی ظالمانہ سلوک رہا چوتھا بیٹا مبارک شاہ باقی رہا لیکن قبل اس کے کہ وہ ملک کافور کے مظالم کا نشانہ بنے خود ملک کافور کو ہی اس کے ظلم کی سزا مل گئی یعنی اس کے خاص مقربین نے سازش کرکے اُسے ہزار ستون کے محل میں قتل کردیا۔

امیر حسن کی ولادت ۶۵۱ھ میں ہونے کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں امیر حسن کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ:— "او را بامیر خسرو تقدم گونہ ہست"

واضح رہے کہ یہی سنہ امیر خسرو کی ولادت کا بھی ہے چونکہ دونوں میں کسی کی تاریخ پیدائش یا مہینہ کا پتہ نہیں چلتا اس لئے یہ بعید از قیاس نہیں کہ امیر حسن امیر خسرو سے چند ماہ بڑے ہوں اور اسی لئے محدث صاحب "تقدم گونہ" کے الفاظ لاتے ہیں۔

محوی صاحب نے اپنے مقدمہ میں مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ امیر حسن نے غیاث الدین بلبن کا

---

[1] مقدمہ مثنوی دول رانی خضر خاں ص۵۵   [2] مثنوی نہ سپہر ص۵۱

شان میں تصیدے لکھے اور تردید کی وجہ یہ پیش کی ہے کہ حسن کے کسی بھی کلیات میں غیاث الدین بلبن کی مدح میں ایک شعر بھی نہیں ملتا محوی صاحب کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ الغ خاں کے خطاب نے مولانا موصوف کو غلطی میں ڈال دیا ہے کیونکہ علاء الدین خلجی نے جب سریر سلطنت پر قدم رکھا تو اپنے چھوٹے بھائی الماس بیگ کو جس کا جلال الدین خلجی کے قتل میں بڑا حصہ تھا "الغ خاں" کا خطاب دیا یہی خطاب بلبن کو بھی اپنی وزارت کے زمانہ میں سلطان ناصر الدین محمود سے ملا تھا لیکن لطف یہ ہے کہ اس دعوے کی تائید میں محوی صاحب نے جو اشعار پیش کیے وہ اُن کے بیان کی تائید کے بجائے تردید کر رہے ہیں مثلاً ؎

مدار ملک کشور گیر عالم معز الحق الغ خان معظم
گرامی گوہر الماس ترکیب و النصر من اللہ نقش تمام

— (۲) —

خلق در سایۂ اقبال الغ خانی باد سایۂ دولت شہ بر سرش ارزانی باد
شہ ز تاریخ اولی ثانی اسکندر شد شاہ اقبال تو تا حشر ہمہ ثانی باد

— (۳) —

بزور بازواں عالم کشادی ازیں اقبال بر خوردار بادی
مقرر مہر تو ہر چہ از بازوت خاست الغ خاں معظم باز دست راست
خضر خاں و سیا یک شمع گلشن دو چشم ملک ملک از مہر دو روشن

محوی صاحب کا علم تاریخ اتنا بے بضاعت نہیں کہ وہ الماس کا لفظ ہوتے ہوئے الغ خاں سے الماس بیگ کے بجائے غیاث الدین بلبن سمجھیں یا انھیں اس کا علم نہ ہو کہ اسکندر ثانی کا خطاب اپنے لئے علاء الدین خلجی نے مقرر کیا تھا یا سلطان ناصر الدین محمود نے جس کا رجحان اسکندری کے بجائے درویشی کی طرف تھا اسی طرح اقتباس نمبر ۳ میں خضر خاں اور مبارک خاں کے صریحی نام اشعار میں ہوتے ہوئے الغ خاں کے لفظ سے اُن کا دھوکہ کھانا کسی طرح باور نہیں کیا جا سکتا۔ محوی صاحب پر غلط فہمی کا الزام عاید کرنے کی کوشش میں فاضل مقدمہ نگار نے اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں کی کہ بلبن کی وزارت کے زمانہ میں جب کہ وہ الغ خاں کے خطاب سے موسوم تھا امیر حسن بالکل بچے تھے اور بلبن جب سلطان بنا اس وقت ان کی عمر ۱۳ سال کی تھی پس الغ خاں کے لفظ سے محوی صاحب کو یہ گمان کس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ قصیدے بلبن کی شان میں ہیں۔ محوی صاحب کی نظر سے بلبن کی شان میں جو قصیدے گذرے ہوں گے وہ حسن کے دیوان اول میں ہوں گے جو انھوں نے غیاث الدین بلبن کے عہد میں مرتب کیا تھا اور جس کے بارے میں وہ مروجہ دیوان کے دیباچہ میں خود فرماتے ہیں۔

"پیش ازیں در عہد غیاثی آنچہ در مدت سی سال جمع شدہ بود دیوانے ساختہ تمام شدہ است"

لیکن یہ دیوان اب ناپید ہونے کے سبب حقیقت درون پردہ ہو گئی ہے۔ محوی صاحب نے خاص طور پر انڈیا آفس والے

۱؎ مخطوطہ دیوان حسن انڈیا آفس لائبریری محفوظ و آکسفورڈ لائبریری مخطوطہ

دیوان میں بلبن کی شان میں کوئی قصیدہ نہ ہونے کا جو ذکر کیا تو اس بارے میں عرض یہ ہے کہ یہ دیوان بھی تو وہی ہے جو علاء الدین خلجی کے زمانہ میں بعمر ۷۰ سال ترتیب دیا گیا۔ امیر حسن نے علاؤ الدین خلجی کی شان میں قصائد اس وقت لکھے جب کہ ان کی زندگی پر درویشانہ رنگ چڑھنا شروع ہو گیا تھا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس زمانہ میں قصائد نہ لکھے ہوں گے جب کہ شباب کا عالم تھا دل میں شاعری کی امنگیں تھیں ہم چشموں سے بازی لیجانے کا جذبہ تھا اور ممدوحین (غیاث الدین بلبن اور شاہزادہ محمد سلطان) بھی ایسے تھے جو ہر اعتبار سے قابلِ قدر شناس اور شعراء نواز تھے اور حسن کے مقابلہ میں علاء الدین خلجی کی اس طبقہ کے ساتھ مراعات عشر عشیر بھی نہ تھیں اور جس کی قدرنا شناسی کا امیر خسرو نے متعدد جگہ ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں وہ زمانہ کچھ ایسا تھا کہ دربار کی وابستگی کے بعد مداحی ہر شاعر کیلئے تقریباً ناگزیر ہو جاتی تھی خواہ اس کی طبیعت مداحی سے متنفر ہی کیوں نہ ہو لہذا محدث صاحب کے بیان کے مطابق امیر حسن کا بلبن کی شان میں قصائد لکھنا بالکل قرین قیاس ہے۔ محوی صاحب کا یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ مولانا عبدالحق ان لوگوں میں نہیں جن کی نسبت یہ گمان کیا جائے کہ انھوں نے بغیر کسی بنیاد کے یوں ہی ایک لغو بات لکھدی ہو گی[۱] ان کے بیان کی تردید کرنا تعجب خیز ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن انڈیا آفس یا بانکی پور کے مخطوطہ کا مقدمہ دیکھے بغیر اس قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

امیر خسرو اور امیر حسن کے درمیان محبت کی جو غلط داستان مشہور ہے اس کا بانی محوی صاحب نے ابوالقاسم فرشتہ کو قرار دیا ہے[۲] لیکن میرے نزدیک اس کا بانی فرشتہ نہیں کیونکہ فرشتہ سے قبل دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ مولفہ ۸۹۲ھ میں شاہزادہ سلطان حسین مرزا نے مجالس العشاق مولفہ ۹۰۹ھ میں اور تقی کاشی نے خلاصۃ الاشعار (۱۰۱۵-۱۰۱۶) میں بھی اس افسانہ کو لکھا ہے۔ یہ دوسری بات کہ کسی نے مختصر لکھا اور کسی نے حکایت لذیذ ہونے کی بناء پر دراز تر۔ اس قسم کا واقعہ اگر ایک تذکرہ نگار لکھدیتا ہے تو بعد کے آنیوالے تذکرہ نگار اس پر کچھ اضافہ ہی کرتے چلے جاتے ہیں یہی چیز اس داستان میں بھی نظر آتی ہے[۳]۔ بہر حال جب تک مزید تحقیق نہ ہو ہم ان دونوں باکمال شعراء کی داستان محبت کا بانی بجائے فرشتہ کے دولت شاہ سمرقندی کو قرار دینگے جس نے اپنا تذکرہ تاریخ فرشتہ سے تقریباً اکیو تیس سال قبل لکھا تھا چونکہ محوی صاحب نے اس داستان کو غلط ثابت کرنے کیلئے مدلل بحث کی ہے اسلئے اس بارے میں یہاں مزید ثبوت پیش کرنا غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔

ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں امیر خسرو اور امیر حسن کے دوستانہ مراسم کا سبب خود کو قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:۔

"و از محبت من میان ایشاں ہر دو استاد قرابت شد و در خانہائے یکدگر آمد و شد کردن گرفتند[۴]"

محوی صاحب نے بھی داستان عشق کی تردید کے سلسلہ میں برنی کے مندرجہ بالا بیان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان دونوں میں

---

[۱] دیباچہ دیوان حسن مرتبہ محوی صفحہ ۲۱ [۲] دیباچہ کلیات حسن صفحہ ۲۸ [۳] تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۱۰۸، مجالس العشاق صفحہ ۵۸-۵۶ اور خلاصۃ الاشعار انڈیا آفس مخطوطہ صفحات ۵۱۴ و ۵۱۵ [۴] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۳۶۰

باہم تعارف کا سبب ضیاء الدین برنی تھے لیکن مجھے اس بات کے تسلیم کرنے میں اسلئے کلام ہے کہ یہ دونوں شاعر ۶۷۸ھ لغایۃ ۶۸۳ھ ۵ سال تک ملتان میں خان شہید کے دربار میں ایک ساتھ رہے ہیں اُس وقت ضیاء الدین برنی پیدا بھی نہ ہوئے تھے کیونکہ انھوں نے اپنی تاریخ کے خاتمہ یعنی ۷۵۸ھ میں اپنی عمر ۷۴ سال کی بتائی ہے[1] اس حساب سے اُن کی ولادت کا سال ۶۸۴ھ قرار پاتا ہے شاہزادہ محمد سلطان کی شہادت اور ملتان کی بزم منتشر ہونے کے بعد ۶۸۶ھ میں جس وقت معزالدین کیقباد اور بغرا خاں کی تاریخی ملاقات اودھ میں دریائے سرجو کے کنارے ہوئی ہے اُس وقت امیر خسرو اودھ میں امیر علی سرجاندار کے ندیم تھے انھوں نے امیر حسن کو جو خط لکھا ہے وہ اعجاز خسروی میں موجود ہے[2]۔ اس خط میں کیقباد اور بغرا خاں کی ملاقات کا حال درج ہے اور یہ غرہ رجب ۶۸۶ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس سے امیر خسرو اور امیر حسن کے دوستانہ مراسم کا پتہ چلتا ہے کیونکہ بڑے طویل القاب و آداب کے ساتھ ساتھ انھیں "دوستدار یگانہ خسرو" لکھا ہے۔ اس خط کے تحریر کرنے کے وقت بھی ضیاء الدین برنی کی عمر صرف ۲ سال کی تھی لہٰذا یہ بات قابل قبول نہیں کہ ان دونوں میں تعارف کا سبب ضیاء الدین برنی تھے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ برنی کی وجہ سے ان دونوں کے دوستانہ مراسم اور زیادہ استوار ہو گئے ہوں۔ گمان یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں کی ملاقات شمس دبیر کی وجہ سے ہوئی جن سے حسن کی قرابت داری تھی اور ۶۷۸ھ میں جس وقت ملک طغرل کی سرکوبی کیلئے بلبن نے لکھنوتی پر چڑھائی کی ہے۔ امیر حسن اور شمس دبیر دونوں لشکر کے ساتھ تھے جس کا پتہ فوائد الفواد کی مندرجہ ذیل عبارت سے چلتا ہے —

"بعد ازاں در حسن طبع و اخلاق او شمس دبیر سخن افتاد بندہ عرضداشت کرد کہ بندہ را با و نسبت قرابتے ہست خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ وقتے مصاحب یکدیگر بودہ اید بندہ گفت دراں کہ سلطان غیاث الدین بہ لکھنوتی رفت دراں لشکر بندہ و او ہم در اثنائے راہ چہ در کشتی و چہ در خشکی یکے میشدیم خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ ہم قوم بود بندہ گفت آرے[3]"

اس مہم میں امیر خسرو بھی بغرا خاں کے ساتھ گئے تھے[4]۔ بلکہ جب اس مہم کے بعد بلبن لکھنوتی اور بنگالے کی حکومت بغرا خاں کو سپرد کرکے لوٹنے لگا اور امیر خسرو بھی شاہی فوج کے ساتھ عازم دہلی ہوئے تو شمس دبیر نے اس بات کی بڑی کوشش کی کہ وہ اُس کے ساتھ لکھنوتی میں رک جائیں لیکن امیر نے معذرت چاہی[5]۔ بہرحال اس مہم میں امیر خسرو اور امیر حسن دونوں تھے اور دونوں کو شمس دبیر سے تقرب حاصل تھا ۶۸۶ھ میں امیر خسرو کی شمس دبیر سے پھر ملاقات ہوئی جس کا حال انھوں نے اس طویل خط میں لکھا ہے جو حسن کو اودھ سے روانہ کیا تھا اور جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے اس خط سے امیر خسرو کے شمس دبیر کے ساتھ گہرے مراسم کے علاوہ حسن کے ساتھ بھی شمس دبیر کے خصوصی مراسم کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ امیر خسرو کی اس ملاقات میں شمس دبیر کو اگرچہ منتشر شدہ احباب میں سے ہر ایک کی یاد آتی ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ امیر حسن کی۔ امیر خسرو

۱؎ تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۵۷۳ ۲؎ اعجاز خسروی حصہ پنجم صفحہ ۷۱ تا ۷۵ ۳؎ فوائد الفواد صفحہ ۱۲۸

۴؎ امیر خسرو از ڈاکٹر وحید مرزا صفحہ ۶۲ ۵؎ امیر خسرو از ڈاکٹر وحید مرزا صفحہ ۶۳۔

کو بھی اس موقعہ پر حسن کی کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے چنانچہ اسی خط میں لکھتے ہیں :-

" تمامت روز دریں تجری بودم کہ یارب اگر در مجلس عشق آں نجم علا بچشم آمدے نوراً علی نور بودے[1] "

بہرحال امیر حسن اور امیر خسرو کے اپنے بیانات کی روشنی میں ان دونوں کی ملاقات کا سراغ ۶۶۷ھ میں لگتا ہے۔ جس کا سہرا بجائے برنی کے شمس دبیر کے سر ہے۔

دیباچہ کے ضمیمہ میں محوی صاحب نے امیر حسن کی سلطان علاءالدین کے دربار میں رسائی ملک اعزالدین کی وساطت سے لکھی ہے جسکی نشاندہی خود حسن کی ایک مثنوی کرتی ہے۔ یہ مثنوی ملک اعزالدین کے تلطف کے ذکر میں لکھی گئی ہے لیکن اس نام کی جس شخصیت کو محوی صاحب نے شاعر کی دربار میں رسائی کا ذریعہ ٹھرایا دراصل وہ شخصیت اس کی ذمہ دار معلوم نہیں ہوتی اور یہاں پر بھی محوی صاحب کو غلط فہمی ہوئی۔

علاءالدین خلجی کے عہد میں ملک اعزالدین نام کی دو نمایاں شخصیتیں گذری ہیں اور دونوں ممتاز عہدوں پر فائز تھیں اول ملک نصرت خاں کے بھائی جو کہ الماس بیگ الغ خاں کے امیر حاجب تھے۔ ان کو قلعہ جالور کے قریب ۶۹۷ھ میں باغیوں کی ایک جماعت نے قتل کر دیا تھا[2]۔ محوی صاحب نے انھیں کو حسن کے دربار علائی میں باریاب ہونے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس نام کی دوسری شخصیت اول الذکر سے بھی زیادہ اہم ہے۔ یہ دوسرے ملک اعزالدین عمدۃ الملک کے بیٹے اور ملک حمیدالدین کے بھائی تھے دونوں بھائی اپنی اصابت رائے ہنرمندی، مردم شناسی اور بزرگ زادگی نیز گوناگوں فضائل میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے علاءالدین نے ایک کو اپنا مصاحب خاص بنایا تھا اور دوسرے کو دیوان انشا سپرد کیا تھا[3]۔ اور الماس بیگ الغ خاں کے انتقال کے بعد ملک اعزالدین کو اسکی جگہ پر وزارت کے عہدہ پر متعین کیا[4]۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ رزم و بزم دونوں مقامات پر یہ ایسے سخنگو اور سخندان تھے کہ برنی کے الفاظ میں جن کا ثانی چشم روزگار نے نہیں دیکھا[5]۔ شاید اسی خوبی کی بنا پر سلطان نے ان کو اپنے خاص ندیموں میں شامل کیا تھا انھوں نے جنگ کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے سلطان کے بھتیجے اکت خاں نے جب تل پٹ کے مقام پر سلطان کے خلاف بغاوت کی تھی تو ملک اعزالدین اور ملک نصیرالدین نے اس کا تعاقب کیا اور افغان پور میں اسے گرفتار کر کے اس کے سر کو تن سے جدا کر دیا[6]۔ ان ملک اعزالدین کے نام کے ساتھ برنی نے کہیں کہیں یغان خاں کا لفظ بھی لکھا ہے[7]۔ فتوح السلاطین میں بھی اس نام کے ساتھ یغانخاں درج ہے ؎

خنیدم یکے روز شاہ کریم   بیاراست بزمے چو باغ نعیم
حریفاں طلب کرد بس یک بیک   چو عزالیغانخاں وچوں قیریک

اسی لفظ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ امیر حسن سلطان کے دربار میں ان ہی کی وساطت سے پہونچے نہ کہ اول الذکر کی کیونکہ امیر حسن نے

---

[1] اعجاز خسروی رسالہ پنجم صفحہ ۵۳
[2] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۵۲ تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۰۳
[3] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۴۷
[4] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۹۹
[5] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۳۵۸
[6] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۷۶
[7] فتوح السلاطین صفحہ ۳۰۵

جو مثنوی اِن کے ملطف کے ذکر میں لکھی ہے اُس کے آٹھویں شعر میں یغاں خاں کا لفظ آیا ہے ؎

چراغ دودۂ اعظم یغان خاں ملک خواں چوکش بزمش فلک خواں

مطبوعہ دیوان میں بجائے یغا خاں کے نغانخاں درج ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مخطوطہ میں یہ لفظ صاف پڑھنے میں نہیں آیا اس لئے کاتب نے نغانخاں لکھ دیا اور غالباً اسی لئے اس شعر کے سامنے علامت استفہامیہ بنی ہے بوڈلین لائبریری آکسفورڈ کے مخطوطہ میں یغانخاں کا لفظ صاف درج ہے۔ امیر حسن جن کے لشکر شاہی سے تعلق کا سراغ غیاث الدین بلبن کے زمانے میں بھی ملتا ہے اور علاء الدین خلجی کے زمانہ میں تو لشکر کی ملازمت کا فوائد الفواد کی متعدد مجلسوں سے پتہ چلتا ہے۔ ان کا موخر الذکر ملک اعزالدین کی وساطت سے دربار میں داخلہ حاصل کرنا بالکل قرین قیاس ہے کیونکہ اس دور میں وزیر اور ندیم تک لشکر شاہی کے ساتھ میدان جنگ میں جایا کرتا تھا اور اکثر فوج کی کمان ان کے سپرد ہوتی تھی۔ امیر حسن نے اپنے اشعار میں ملک اعزالدین کی خوبیوں پر جس طرح روشنی ڈالی ہے وہ اس تصویر کے عین مطابق ہے جو برنی نے پیش کی ہے وہ لکھتے ہیں :-

یکے کز بزم گردونش اسنر قصر سر جملہ ملوک و سرور عصر
ستودہ سیرت و فرخندہ آئین کریم الخلق الحق عزالدین
محمد اسم و رسمش جملہ محمود وجودش خاص بہر جود موجود
چراغ دودۂ اعظم یغانخان ملک خواں چوکش بزمش فلک خواں
بدانش ہم نشین عقل والا بہمت از مقام فہم بالا
کرم در عہد او نامے گرفتہ جہاں از عدلش آرامے گرفتہ
بزرگا! کریما! عالی نژادا! سرت در سروری پاینده بادا
چہ گویم مدحت چوں تو کریمے صفائے غازی نعلے عظیمے
از آں چنداں ملوک تو لی زمانے ہمی یکسا نات تو ماندست برجائے

یہ مثنوی "مثنوی عشق نامہ" کا ایک جزو ہے جو امیر حسن نے سنہ ۷۰۰ھ میں لکھی تھی "۶۰۲" اشعار کی یہ پوری مثنوی شاعر نے ایک رات میں نظم کر ڈالی ؎

نمودم اندریں چنداں تفکر سواد یکشبہ بوداں ہمہ در
لبالب صفحہ ای در شد نمودہ دو شنبہ غرۂ ذوالحجہ بودہ
چو در نظم آمد این ابیات دلکش شمردم حاصل آمد شش صد و شش

شاعر نے اس کی تصنیف کا صرف سنہ ہی نہیں بلکہ تاریخ اور دن تک درج کر دیا ہے جو ہماری اس بات کو اور زیادہ پایۂ ثبوت کو پہنچا دیتا ہے کہ ان کی رسائی دربار علائی میں ملک اعزالدین کی وساطت سے ہوئی جن کا اوپر ذکر کیا گیا نہ کہ ان کے وسیلے سے جن کا ذکر مرزا صاحب نے اپنے دیباچہ میں کیا ہے کیونکہ ان کی وفات اس مثنوی کے نظم کرنے سے ۲ سال قبل ہی ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

حیاتِ جاوید کا ایک تحقیقی مطالعہ

حالی کی حیاتِ جاوید اردو ادب کا ایک لافانی کارنامہ ہے انھوں نے یہ عظیم کام عزت و شہرت کی خاطر نہیں بلکہ ایک فرض سمجھ کر کیا چنانچہ لکھتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے کہ فرض ادا ہو گیا اور یہ کہنے کی گنجائش نہ رہی کہ جس شخص نے قوم کی ایسی خدمات کیں قوم میں کسی کو اس کی لائف لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ اگرچہ حالی اس سے قبل دو سوانح عمریاں سپردِ قلم کر چکے تھے مگر ان کا رنگ حیاتِ جاوید سے قطعاً مختلف ہے۔ اس کتاب میں ان کی فنی عظمت، اسلوب کی خوبی، تحقیق و استدلال کی قوت اور فکر کی جولانی پوری طرح نمایاں ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے لگاتار محنت کی ہے اور بڑی جانفشانی سے یہ سوانح عمری مرتب کی ۱۹۰۱ء میں ایک ہزار صفحے کی یہ ضخیم کتاب زیورِ طباعت سے مزین ہو کر سامنے آئی۔ حالی نے سات برس عمرِ عزیز کے اس کتاب پر صرف کئے اور واقعات، حالات، کتب و رسائل کے اقتباسات اس طرح تلاش کر کے جمع کئے جیسے شہد کی مکھی پھولوں سے رس کو تلاش کر کے لاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب کتاب طبع ہوئی تو اردو ادب کا ایک عظیم و لامثیل کارنامہ قرار پائی۔ حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب میں حالی کا قلم ایک نقاد کا قلم ہے۔ مگر حیاتِ جاوید میں وہ ایک مورخ، ناقد (اور ادیب) کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ حالی نے سرسید کے مشن کی توضیح اور ان کے کارناموں کی تفسیر کا حق ادا کر دیا ہے چنانچہ آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ اس میں صرف سرسید کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ذہنی تاریخ آ گئی ہے۔ حالی نے تمام مواد سمیٹنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی ہے ان کا یہ خیال کہ سرسید کے تمام کارناموں کا محرک مذہبی اصلاح کا جذبہ تھا بالکل صحیح ہے اور انھوں نے سرسید کی مذہبی خدمات پر بجا طور پر زور دیا ہے۔ سوانح عمری میں سب سے ضروری چیز وہ ہمدردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ حالی کے یہاں یہ چیز موجود ہے اور اسی وجہ سے ان کی کتاب کو "مدلل مداحی" یا کتاب المناقب" اور ایک رخی تصویر کہا گیا حالانکہ سوانح عمری میں یہ سنگ راہ کا کام دیتی ہے۔"

ہر لحاظ سے حالی نے ایک مکمل اور اعلیٰ درجہ کا کام انجام دیا ہے۔ اور ان کا نقطۂ نظر بھی اس سلسلہ میں متعین تھا۔ چنانچہ ایک صاحب کو لکھتے ہیں کہ "عربی میں ایک مثل ہے کہ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کام کتنی دیر میں ہوا ہے بلکہ سب یہ دیکھتے ہیں کہ کام کیسا ہوا۔ لوگ اس بات کا لالچ دیتے ہیں کہ جس قدر جلد لائف تیار ہو گی اسی قدر کثرت سے فروخت ہو گی مگر اس بات کی مجھے مطلق پروا نہیں، لائف عمدہ لکھی جائے اگرچہ اس کی ایک جلد بھی فروخت نہ ہو' حالی کا یہ نقطۂ نظر ایک مصنف کا طرزِ فکر ہے[۱]

---

[۱] یادگارِ حالی از صالحہ عابد حسین انجمن ترقی اردو ہند طبع دوم ص ۷۰۔۲

مولوی عبدالحق اس کو "مہا تصنیف" قرار دیتے ہیں۔ سیرت نگاری میں "حیات جاوید" سنگ منزل کی حیثیت رکھتی ہے لوگوں نے اسی دئے سے اپنے دئے روشن کئے ہیں' چنانچہ صالحہ عابد حسین رقمطراز ہیں کہ "سیرت نگاری میں حالی نے ایک نئی راہ اختیار کی جو اب تک اردو میں کسی نے نہ کی تھی اور وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ بعد میں اردو سیرت نگاری اسی ڈگر پر چل پڑی"[1]۔ ڈاکٹر عابد حسین کا بھی یہ خیال ہے کہ "یہ تینوں کتابیں خصوصاً حیات جاوید محض واقعات کی پوٹ اور تعریفوں کا پشتارہ نہیں بلکہ جدید طرز کی سوانح عمریوں کا نمونہ ہیں"[2]۔

در اصل حالی نے مسلمانوں کی ایک صد سالہ اقتصادی و تہذیبی' تمدنی' سیاسی اور تعلیمی و معاشرتی تاریخ قلمبند کی ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق حیات جاوید کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "حیات جاوید حالی کے سب سے بڑی تصنیف اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں صرف سرسید احمد خاں کی سیرت' ان کے حالات اور کارناموں ہی کا بیان نہیں بلکہ ایک اعتبار سے مسلمانوں کی ایک صدی کے تمدن کی تاریخ ہے"[3]۔

کتاب لکھنے کیلئے وہ خود علیگڈھ آئے اور کچھ عرصہ کیلئے وہاں قیام کیا۔ تہذیب الاخلاق کے فائل کا مطالعہ کیا علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ دیکھا سرسید کی تصانیف' دوستوں کے خطوط' انگریزی اخبارات کے بیانات اور تمام دوسری مفید مطلب تحریروں کا غور سے مطالعہ کیا اس طرح ایک تسلسل کے ساتھ حالات و واقعات کو ترتیب دیا۔

کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں سرسید کے خاندان اور بچپن کے حالات ہیں پھر ملازمت' غدر' تصانیف' سفر انگلستان' سیاسی زندگی میں حصہ لینا اور وفات وغیرہ کا بیان ہے اس کو ہم سید کی زندگی کے تمام واقعات کی داستان کہہ سکتے ہیں یہ واقعاتی حصہ ہے جس میں نہایت تفصیل سے سرسید کے حالات زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ سرسید کے خیالات' خدمات' اثرات' اصلاحات' تصنیفات ان کے پیام کی تفسیر' ان کے اخلاق و خصائل کی توضیح اور ان کی معنوی شخصیت کی بھرپور نمائندگی کی گئی ہے۔ ان کی ایک ایک تصنیف کی گرہ کشائی کی گئی ہے ادب اردو' صحافت' تاریخ' سیاست' قومیت' تحقیق' اسلوب تحریر' اصلاحی سرگرمیاں' مخالفین کے جوابات اور موافقین کا ذکر وغیرہ نہایت قابلیت اور سوجھ بوجھ سے کیا گیا ہے۔

حالی کے انداز بیان میں حد درجہ بے تکلفی ہے حتیٰ کہ علمی مسائل کے بیان میں بھی۔ حالی کو قلم پر پوری قدرت حاصل ہے وہ بڑے فنکارانہ انداز سے تمام متعلقہ پہلو کو پیش کر دیتے ہیں حتیٰ کہ لطائف و ظرائف تک بھی وہ نظر انداز نہیں کرتے ان کو یہ سلیقہ خوب معلوم ہے کہ واقعات کو کس طرح منتخب کر کے موضوعات کے تحت مناسبت کے ساتھ درج کیا جائے۔

---

[1] یادگار حالی صفحہ ۲۴۱ [2] یادگار حالی صفحہ ۲۴۲

[3] فن سوانح عمری کا ارتقا از الطاف فاطمہ طبع اول لاہور ۱۹۶۱ء صفحہ ۹۷۔

اسی کتاب میں بے شمار اقتباسات موجود ہیں مگر مصنف کو اس کا پورا احساس ہے کہ اقتباسات کہاں تک دلکشی اور تاثر پیدا کرسکتے ہیں اور کہاں سے اکتاہٹ اور بے کیفی شروع ہوتی ہے اس بناء پر وہ نہایت اطمینان سے موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے اقتباسات نقل کرتے ہیں البتہ بشری کمزوری کے مطابق کہیں کہیں اصول نبھا نہیں سکے ہیں اور اقتباس بے کیفی کا باعث بن جاتا ہے۔

اس کتاب میں سب سے بڑی خوبی "جامعیت" ہے یعنی سرسید کی زندگی کے جملہ پہلوؤں اور تمام کارناموں کی تفصیل وتشریح دلائل اور مثالوں سے پیش کی گئی ہے اور کسی بھی مسئلہ کو بحث کرتے وقت اس کے اوپر جملہ شبہات و اعتراضات کا مصنف نے جواب بھی فراہم کردیا ہے (اگرچہ یہ کیفیت ہر موقع پر سوانح نگار کیلئے مناسب نہیں) سرسید کی شخصیت، خیالات اور خدمات، کارنامے، اثرات اور نتائج تمام مباحث پر سیر حاصل بحثیں اس میں موجود ہیں جو مصنف کی جگر کاوی اور جانفشانی کی تصویرکشی کرتی ہیں۔ مصنف نے خونِ جگر کی بارش کی ہے اور فکر و نظر کے جلوؤں سے کتاب کو بقعۂ نور ——— اور تحریر کی دلکشی سے اس کو چمن سدا بہار بنا دیا ہے اور دلائل کی روشنی سے سرسید کی عقلیت پسندی کو گویا ایک نئے رنگ و آہنگ میں پیدا کیا ہے۔

حیات جاوید کا اسلوب

حالی کا اسلوب نہایت دل نشین اور سادہ ہے وہ رنگینی کے متوالے اور الفاظ سے کھیلنے والے نہیں ہیں بقول آل احمد سرور سرسید نے اردو کو مقدس سنجیدگی عطا کی۔ حق یہ ہے کہ یہ سنجیدگی سرسید تک محدود رہتی اگر حالی نہ ہوتے۔ حالی نے اس کے ذریعہ لوگوں کو کام کرنا سکھایا حالی نے اپنے اسلوب کے ذریعہ سرسید کے طرز ادا کو عام کیا جس میں جذبات اور الفاظ پر علم سنجیدگی، فصاحت، صفائی اور سادگی کو ترجیح حاصل ہے۔ وہ حقائق کو سامنے لاتے ہیں اور بڑے بڑے علمی مسائل کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں ان کے اسلوب کی اس خوبی کی ترجمانی صرف حیات جاوید کرتی ہے۔ کیونکہ دوسری کتابوں میں ایسے مذہبی، تاریخی اور تہذیبی مسائل کم تر زیر بحث آتے ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین رقمطراز ہیں کہ ان کا اسلوب بیان اتنا منجھا ہوا ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو پانی کر دیتے ہیں اور لطف یہ کہ علمی متانت اور وقار کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا یہ کیفیت حیات جاوید کے اسلوب میں نمایاں ہے۔

ذخیرہ الفاظ

حیات جاوید کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ حالی کے پاس الفاظ کا غیر معمولی ذخیرہ ہے وہ بڑی خوبی اور عمدگی سے الفاظ مختلف زبانوں سے لیکر استعمال کرتے ہیں مثلاً ہندی اور انگریزی سے۔ ہندی الفاظ کا استعمال تو یقیناً قابل تحسین ہے۔ بقول صالحہ عابد حسین وہ بہت سے متروک الفاظ بھی اس طرح استعمال کر جاتے ہیں کہ انکو نئی زندگی مل جاتی ہے۔ حالی نے زندگی کے الفاظ بھی خوب استعمال کئے ہیں یہ کیفیت ان کی تمثیلوں میں زیادہ نمایاں ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

انگریزی الفاظ

اب جہاں تک انگریزی الفاظ کا تعلق ہے وہ اردو مذاق پر ایک بار ہے۔ حالی نے سرسید کی کوشش پر انگریزی الفاظ کے ذریعہ اردو کو وسعت دینے کا خیال کیا۔ کچھ الفاظ تو بیشک اردو میں

کھپ گئے ہیں مگر بے شمار الفاظ جو حالیؔ نے انگریزی کے استعمال کئے ہیں وہ "حیاتِ جاوید" پڑھتے وقت طبیعت کو کھٹکتے ہیں مثلاً یہ چند الفاظ و فقرے: بجائے مقالات کے بایوگرافی بجائے سوانح کے۔ سویلائیزیشن بجائے تہذیب کے۔ ججمنٹ (فیصلہ) کرکیولوجی (علم آثار قدیمہ) آپشنل (اختیاری) وغیرہ وغیرہ۔ دوسرا غضب یہ ہے کہ خود انگریزی سے واقف بھی نہیں مگر الفاظ استعمال کرتے گئے۔

"حیاتِ جاوید" میں خصوصاً اور اپنی عام نثر میں عموماً حالیؔ تمثیلیں بڑے نرالے انداز سے استعمال کرتے ہیں ان کی تشبیہیں ان مخصوص ادبی دائرے سے باہر ہوتی ہیں جن کی رنگینی سے ذہن پٹے ہوئے تھے وہ حقائق زندگی سے تمثیلیں پیش کرتے ہیں۔ شیخ چاند نے بجا طور پر اس جانب توجہ دلائی ہے کہ ان کی تمثیلیں اس قدر دلچسپ اور برمحل ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا خیال کو بے تامل قبول کرتا ہے اور تخیل کے نازک اور لطیف استعمال سے حظ اٹھاتا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تشبیہوں کا مواد مشاہداتِ زندگی سے اخذ کیا ہے اور زندگی میں بھی اس میدان سے جس کا تعلق عمل سے ہے چنانچہ وہ اپنے مسدس کے بارے میں لکھتے ہیں "گویا اہل دلی اور اہل لکھنؤ کی دعوت میں ایسا دسترخوان چنا گیا ہے جس میں ابالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ نہیں ہے" لکھنؤ اور دلی کے دبستانوں کی خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر یہ تمثیل نہایت بلیغ ہو جاتی ہے حالیؔ بعد میں وضاحت کرتے ہیں کہ ان کا مقصد واہ وا اور مزا ایسا نہیں بلکہ مسدس کے ذریعہ عزیزوں اور دوستوں کو عزت دلانی ہے۔ یہ تو میں نے ان کے اسلوب کی عام خصوصیت بیان کی ہے اب اس آئینہ میں حیاتِ جاوید کا جائزہ لیجئے تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ اس میں یہ کیفیت جابجا موجود ہے اور نہایت بلاغت کے ساتھ۔ چنانچہ حیاتِ جاوید کے مقدمہ ہی میں بڑے عمدہ انداز سے سرسید اور اپنے گذشتہ دو اصحاب سوانح کے بارے میں لکھتے ہیں "ہم نے دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی لیکن اول تو ایسی بامیر گرانی چاندی سونے کے ملمع سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اس کے سوا وہ انھیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جو موج خیز اور پر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ جاتے ہیں ..... اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے تقلید کی جڑ کاٹی ہے بڑے بڑے علماء و مفسرین کو ستایا ہے قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں" حق یہ ہے کہ یہ اندازِ بیان نہایت ٹھیٹ اُردو کا ہے ایک ایک تمثیل اپنے اندر حقیقت کا خزانہ سمیٹے ہے اور اثر و دلکشی کا سامان اپنے اندر چھپائے ہے۔ دیکھنے میں تو یہ معمولی بات ہے مگر اس طرز کی تمثیلوں کو پیش کرنا آسان نہیں، گل و بلبل، شمع و پروانہ اور دریا و پہاڑ کی تشبیہیں عام ہیں سب ہی پیش کرتے ہیں مگر روش عام سے ہٹ کر اور تمثیلوں کو زندگی کے اندر سے تلاش کرنا بڑے مشاہدہ اور فن کا ثبوت ہے۔

اعتدال و توازن

حالیؔ کی طبیعت میں غضب کا توازن نظر آتا ہے اور یہی اعتدال ان کے اسلوب کا سب سے امتیازی وصف ہے جس کے بارے میں شیخ چاند لکھتے ہیں کہ وہ الفاظ کو اپنے خیالات کا تابع

کر لیتے ہیں اور ان کی اس طرح کتر بیونت اور کانٹ چھانٹ کرتے ہیں کہ خیال کے جسم پر ٹھیک اترتے ہیں[۱] حالی کے اسلوبِ نثر میں شاعرانہ صناعی نہیں ہے بلکہ وہ ادبی و علمی خیالات کو صحت، وضاحت اور روانی سے پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے یہاں رنگینی نہیں ہے مگر روانی پوری طرح موجود ہے ایسی روانی جو فصاحت کی حامل ہے نہ کہ لفاظی اور زورِ بیان کی تخلیق کردہ۔ بلاشبہ وہ فصیح نثر لکھتے ہیں چنانچہ مہدی افادی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ سرسید کے بعد اگر کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو وہ بڑھے حالی ہیں[۲] الفاظ اور معانی کے درمیان اعتدال و توازن ان کے اسلوب کا جوہر ہے۔ "حیاتِ جاوید" میں انھوں نے خیالات، جذبات اور زبان سب میں توازن کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کے اسلوب کے صحت و توازن سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ ان کے یہاں ادبیت نہیں ہے حالی کے یہاں ادبیت بڑے اچھے انداز سے ملتی ہے یعنی ادبی چاشنی میں بھی وہ توازن کو برقرار رکھتے ہیں کیفیت کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے سرسید کی دلنشین تحریریں جیسی کہ اردو زبان میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں شائع ہو رہی تھیں اگرچہ سرسید نے اپنی زندگی نام بھلائی کے کاموں میں مدت سے وقف کر رکھی تھی مگر ابھی تک ان کا حال پہلی رات کے چاند کا سا تھا کہ کسی نے دیکھا اور کسی نے نہ دیکھا لیکن مدرسۃ العلوم اور تہذیب الاخلاق نے ان کی کوششوں کو چودھویں رات کے چاند کی طرح سب پر روشن کر دیا[۳]

بہرحال تشبیہوں، استعاروں اور تمثیلوں میں بھی انھوں نے توازن کا ثبوت پیش کیا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں بھی اعتدال ہے اور جذباتی مسائل پر بھی وہ ٹھنڈے دل سے "حیاتِ جاوید" میں غور کرتے ہیں۔

البتہ ان کے اسلوب میں کہیں کہیں ایک ناہمواری کا احساس بھی ہوتا ہے یہ کیفیت ان کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے جہاں کہیں ان کو ادبی چاشنی کا خیال آجاتا ہے وہاں عبارت نہایت ادبی مسرت کی حامل بن جاتی ہے۔ اسی طرح کہیں کہیں عبارت سپاٹ اور پھیکی نظر آتی ہے تو بقول انھیں کے ابالی کھچڑی اور بے نمک مرچ کا سالن بن جاتی ہے۔

حیاتِ جاوید کا اسلوب ایک موثر اور جاندار اسلوب ہے چنانچہ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں کہ "یہ حقیقت ہے کہ حالی کا طرز ہی زندہ و پائندہ طرز تھا جسے اردو کے ادیب اپنا سکتے تھے اور ایسے ہی طرز کو حیاتِ جاوید نصیب ہوتی ہے"[۴] پروفیسر آل احمد سرور کا بھی یہی خیال ہے کہ سرسید کے ساتھیوں میں صرف حالی کا اسلوب زندہ رہنے والا ہے یہ صریحاً زیادتی ہے شبلی کا اسلوب زندہ ہے اور زندہ رہے گا اس بنا پر سرور صاحب کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ حالی کا اسلوب زندگی کا ساتھ دینے والا ہے۔

"حیاتِ جاوید" کے اسلوب میں قوتِ استدلال پوری طرح موجود ہے مصنف نے اپنی باتوں میں وزن پیدا کیا ہے۔

۱؎ یادگار حالی صفحہ ۲۲۰　　۲؎ یادگار حالی صفحہ ۲۲۹

۳؎ حیاتِ جاوید ج ۱ ص ۵ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۹ء　　۴؎ یادگار حالی ص ۲۲۹

اسی طرح ایک والہانہ عشق سرسید کے مشن سے اور مسلمانوں کے تنزل سے ایک سوز دروں کی کیفیت ان کے اسلوب میں رنگ آمیزی کرتی ہے۔ "حیاتِ جاوید" کی خصوصیات میں ان دونوں عناصر کی توضیح کی گئی ہے

سادگی، وضاحت، اور تمثیل و محاورہ کے ذریعہ لطفِ کلام پیدا کرنا حیاتِ جاوید کے اسلوب کی بنیادی خصوصیات ہیں

اُردو اور سوانح نگاری میں حیاتِ جاوید کی عظمت

بحیثیت سوانح نگار کے حالی اس سے قبل اپنا سکہ بٹھا چکے تھے، یہ کتاب درحقیقت ان کے فن کا عروج ہے اس میں ان کی فنی عظمت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ حالی نے یہ سوانح عمری نہایت محبت و شفقت اور محنت سے مرتب کی ہے۔ اسلوب کے علاوہ اس میں مندرجہ ذیل خوبیاں ایسی ہیں جو دوسری کتابوں میں ابھر کر سامنے نہیں آتیں۔

ہمدردی

حالی نے صاحبِ سوانح سے ہمدردی کا ثبوت دیا ہے وہ ہر جگہ سرسید کے ساتھ ان کی مدافعت میں کربستہ نظر آتے ہیں ان کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے سرسید کی اعلیٰ اور ادنیٰ ہر خوبی کو ابھارا اور نکھارا ہے اور سرسید کے کردار کو آب و رنگ بخشا ہے وہ ہر طرح سرسید کی ہمدردی کرتے ہیں وہ سرسید کی بعض ان لغزشوں کا ذکر کرتے ہیں جو آخر میں ان سے سرزد ہوئیں پھر ان کا جواب بھی خود ہی پیش کر دیتے ہیں، حالانکہ ایک سوانح نگار کی حیثیت سے ان کو اتنی ہمدردی کی ضرورت نہ تھی مگر سرسید سے ان کے مقاصد سے اور ان کی جدوجہد سے حالی کو عشق تھا اور پوری سوانح عمری اسی خلوص و محبت کی غماض ہے۔ دورِ جدید میں ہمدردی ایک اہم وصف تسلیم کیا جاتا ہے مگر اس کے ذریعہ حقائق کو چھپانا اور اصل تصویر پر پردہ ڈالنا ایک عیب ہے۔ صاحبِ سوانح کی نجی زندگی بے پردہ آنی چاہئے تھی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ حالی کا قلم یہاں پہونچ کر محتاط ہو گیا ہے۔

جزئیات کا احاطہ

اس عظیم سوانح عمری کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ مصنف نے اس میں سرسید کی زندگی کے تمام واقعات جن میں ذرا بھی جان تھی تلاش کرکے سپردِ قلم کر دیئے ہیں کسی ایسی شخصیت میں جہاں خود بڑے بڑے کارنامے موجود ہوں وہاں جزئیات پر توجہ کرنا اور ان سے کلیات کا استنباط کرنا یقیناً بڑی کاوش اور تندہی کا طالب تھا۔ یہ حالی کی عظمت ہے کہ انھوں نے خاندان سے لے کر ملازمت اور پھر کالج اور وفات کے جملہ حالات مختلف ذرائع سے تلاش کرکے مع تفصیلات اس طرح درج کئے کہ وہ واقعات کی کھتونی نہیں معلوم ہوتے بلکہ ایک منطقیانہ انداز سے پیش کئے گئے ہیں۔ واقعات میں اکثر حوالے تک دیدیا ہے اور خطوط و ذاتی علم سب اس راہ میں استعمال کیا ہے۔ اگرچہ بہت سی جزئیات فضول ہیں جو فرطِ تعلق کے باعث داخل ہو گئی ہیں۔

قوتِ استدلال

حالی نے اپنی پوری تصنیف میں قوتِ استدلال سے کام لیا ہے، سرسید کی خوبیوں کو دلیلوں سے ثابت کیا ہے اور ان کی خامیوں کو دلیلوں سے رد کرکے ان کی پوزیشن صاف کی ہے۔ شاید اسی بنا پر علامہ شبلی نے اس کو مدلل مداحی کہا تھا (اگرچہ یہ جرم ایسا نہ تھا جس پر اتنی سخت سزا دی جائے) بہرحال

اس سوانح عمری میں مصنف کی قوت استدلال نہایت واضح ہے۔

سوز دروں کتاب میں اوّل سے آخر تک جو تاثر قاری پر مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مصنف قوم کا لگاؤ رکھتا ہے وہ مسلمانوں کی ترقی کیلئے سر سید کی طرح کوشاں ہے۔ اور مسلمانوں کے تنزل سے اس کا دل پاش پاش ہوا جاتا ہے۔ ہندوستانیوں کیلئے عموماً اور تہذیب و تعلیم سے پچھڑے ہوئے مسلمانوں کیلئے خصوصاً ایک سوز دروں ایک تڑپ، ایک چبھن اور کسک حالی اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں جس ہستی نے اتنا بڑا کام کر لیا اور انھوں نے اس کو ایک نمونہ عمل بنا کر سب کے سامنے پیش کیا کہ جاؤ تم بھی ایسے عمل کرو۔ یہ سوز دروں دراصل ان کی زبان اور ان کے اسلوب کیا تاثیر پیدا کرتا ہے اسلئے کہ ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد۔

تاریخی مواد سر سید کی سوانح عمری میں حالی کا قلم حیات سعدی اور یادگار غالب کی طرح ناقد اور سوانح نگار کا قلم نہیں رہ جاتا ہے بلکہ وہ ہندوستان کی تاریخ غدر، وائسرائے کونسل، لجسلیٹو کونسل، اتو بیتو ایکا سیاسی مسئلہ اور دوسرے مسائل سے گفتگو کرتا ہے حالی کی زبان میں شبلی کی ایسی رنگینی و شوکت نہیں مگر وہ اپنی خاص طرز کی دلکشی سے واقعات کو ادب میں ڈھال دیتے ہیں اور حیات کو حیات جاوید میں داخل کرکے اس کو ادب کا قالب عطا کر دیتے ہیں جس سے دنیا اردو کا محقق بے نیازی کا دعویٰ نہیں کر سکتا کم از کم ایک چوتھائی کتاب تاریخی مواد سے پُر ہے۔

انگریزی سے ناواقفیت کے باعث ان کو کافی زحمت اٹھانی پڑی ہوگی اسلئے بے شمار مقامات پر وہ انگریز افسروں، لکھنے والوں اور سر سید سے تعلق رکھنے والوں کا ذکر کرتے ہیں کہیں انہیں سر سید کی عظمت کو انگریزوں کے بیانات سے ثابت کرنا ہوتا ہے ہیں۔ اسی طرح اسکا بڑا افسوس کرتے ہیں کہ سر سید کی ایک سوانح عمری ایک انگریز نے لکھی اس طرح سبقت اسکو حاصل ہوگئی۔

تنقیدی مواد حالی نے اپنی دو سوانح عمریوں میں غیر معمولی تنقیدی مواد بھر دیا جس کو بعض ناقد سوانح نگاری کیلئے نامناسب تصور کرتے ہیں حیات جاوید میں بھی انھوں نے تنقیدی مواد پیش کیا ہے۔ سر سید کی ادبی خوبیوں کو اور اردو ادب پر ان کے احسانات کو بڑی تفصیل اور فراخ حوصلگی سے بیان کیا ہے۔ ان کی کتابوں کی خوبیوں کو مدلل پیش کیا ہے مثال کے طور پر خطبات احمدیہ کو لے لیجئے جس پر بڑے سائز کے ۔د صفحے انھوں نے صرف کیے ہیں اور اس کی ایک ایک عظمت کی گرہ کشائی کی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے حیات شبلی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں علامہ سید سلیمان ندوی نے علامہ شبلی کی تصانیف پر کماحقہ بحث نہیں کی مگر یہ اعتراض حیات جاوید پر وارد نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ حالی نے ہر موضوع پر اس میں تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔

تہذیب الاخلاق کے اثرات پر جو کچھ لکھا ہے اور جن زاویوں سے نظر ڈالی ہے وہ خود میرے دعویٰ کا ثبوت ہے آخر میں انھوں نے سر سید کو نادر آف اردو قرار دیا ہے۔ آل احمد سرور نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جدید اردو کے بانی سر سید تھے۔

حالانکہ غالب نہایت سلیس و جدید اردو کی ابتدا کر چکے تھے مگر انھوں نے مسائل حیات سے تعرض نہ کیا تھا سرسید کو پہلی بار زندگی کے مسائل کو اردو میں پیش کرنے کی اولیت ضرور حاصل ہے۔

مذہبی موضوعات

حالی نے کتاب کا ایک بہت ضخیم حصہ مذہبی بحثوں کیلئے وقف کر دیا ہے اس کی وجہ بھی جاننا ظاہر ہے اسلئے کہ سرسید کا کارنامہ اپنے تمام پہلوؤں کے باوجود دراصل مذہبی ہے اور بقول حالی۔

"وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی"

حالی نے سرسید کے مذہبی کاموں کی قیمت کا تعین کیا اور ان کو ہندوستان میں نہیں بلکہ عالم اسلامی میں جدید علم کلام کا بانی ٹھیرایا اور اس حد تک ان کا بیان صحیح بھی ہے کہ مذہب کو عقل کی راہ سے سمجھنے کی کامیاب کوشش سرسید نے کی ہے۔ خصوصًا خطبات احمدیہ میں بابت اجتہادی غلطیاں تو پھر انسان ہونے کے ناتے قابل نظر انداز ہیں پھر بھی ان کی نیت صحیح تھی اگرچہ آراء کی صحت میں شبہ ہے۔

حالی نے وضاحت سے بتایا کہ سرسید مسلمانوں کی دنیا ٹھیک کر کے اس طرح ان کے دین کو معزز کرنا چاہتے ہیں۔ آل احمد سرور نے نہایت صحیح لکھا ہے کہ سرسید کا بنیادی اصول مسلمانوں کی اصلاح میں یہ مقولہ تھا جو انھوں نے عظیم آباد کے ایک اجتماع میں بتایا تھا کہ دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی مگر دنیا چھوڑنے سے دین جاتا ہے۔"

حالی نے سرسید کی مذہبی خدمات کو کتابوں کی تفصیل حوالوں اور پھر ان کے اثرات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ شاید خود سرسید بھی اتنی وضاحت سے یہ کام نہ کر سکتے۔

حالی کی سوانح نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ سرسید کی ہر جد و جہد کو مصور کر دیتے ہیں وہ کماحقہ نفسیاتی تصویر پیش نہ کر سکے مگر حق یہ ہے کہ انھوں نے صداقت بیان کا اعلیٰ نمونہ پیش کر دیا ہے۔

حالی نے سرسید کی اردو خدمات کو اور اس انقلاب کو جو ان کی وجہ سے اردو میں آیا بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے یہی نہیں بلکہ تہذیب الاخلاق کے بارے میں انھوں نے صاف لکھا کہ اس نے اردو میں انقلاب پیدا کر دیا اور ادب کا رخ مڑ گیا۔ وہ ایک انگریز کا قول نقل کرتے ہیں کہ تہذیب الاخلاق نے ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں[2]

اس طرح سرسید کی خدمات کو حالی نے حیات جاوید میں مصور کیا ہے۔ اور حقائق و اعداد سے ان کی عظمت کو نمایاں کیا ہے اس کتاب نے ہندوستان کے تاریخی تمدن کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس میں ایک دور کی تاریخ تفصیل و تشریح سے ٹکسالی زبان میں پیش کی گئی ہے اور فکر و فن کے جادو جگائے گئے ہیں۔

---

[1] حیات جاوید ج ۲ ص ۹۵ [2] حیات جاوید ج ۲ ص ۵۹

اس کتاب میں بعض خامیاں بھی ہیں مگر یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ اسکی خوبیاں اس کے نقائص کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔
اس روشنی میں ہم اس کتاب کی چند فنی خامیوں کی طرف اشارہ کرنا مناسب تصور کرتے ہیں

تنقید کی زیادتی

سوانح عمریاں اتنے تنقیدی مواد کی متحمل نہیں ہوتیں کہ جن کے نیچے وہ دب جائیں۔ حیاتِ جاوید کے اس تنقیدی حصہ کی طوالت نے اس کے سوانح نگارانہ فن پر زبردست اثر ڈالا ہے۔ ورنہ یہ اعلیٰ بیوگرافی سے بہت قریب ہے[1]۔

ذاتی زندگی کے بیان میں احتیاط

سوانح نگار کا فرض یہ ہے کہ جلوت و خلوت دونوں پہلوؤں کو پیش کرے تاکہ صاحب سوانح کی مکمل تصویر ہو سکے۔ حیاتِ جاوید میں خلوت کی زندگی میں وہ ہمیں بار بار یہ اذن نہیں دیتے اور ایک چوکس اور فرض شناس دربان کی طرح پس پردہ کم سے کم جھانکنے کا موقع دیتے ہیں[2]۔

ہیرو کی کمزوریوں سے اغماض

علامہ شبلی نے حیات جاوید پر یہ اعتراض کیا کہ اس میں حالیؔ نے بعض چھوٹی چھوٹی کمزوریوں کا ذکر کر دیا مگر بعض بڑی بڑی باتیں نظر انداز کر گئے اس سے انکا مقصد یہ تھا کہ قاری یہ سمجھے کہ ہاں ہیرو کی کمزوریوں پر تنقید بھی کی گئی ہے اور اس طرح بنیادی کمزوریوں پر پردہ پڑ جائے۔ علامہ شبلی نے اس جرم کو زیادہ شدید کر دکھایا ہے سرسید کی کمزوریوں سے۔ انھوں نے دیدہ و دانستہ گریز کیا ہے اور جہاں کہیں ان کی کوئی کمزوری یا قابل گرفت بات بیان کی ہے فوراً اس کے جواز کیلئے کوئی دلیل بھی لے آئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اعلیٰ سوانح نگاری کے منافی ہے[3]۔

"حیاتِ جاوید" پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اس میں سرسید کی شخصیت کی ہو بہو تصویر نہیں ہے۔ یہ اعتراض زیادہ جاندار اس لئے نہیں کہ اولاً تو سرسید کی زندگی سے حالی ایک نمونہ عمل پیش کرنا چاہتے ہیں اس لئے ان کے نزدیک تصویر کشی جو جدید سوانح عمریوں کی جان ہے، براہ راست مقصد نہ تھی پھر بھی جتنی عمدہ تصویر جا بجا انھوں نے پیش کی ہے وہ ان کو اعلیٰ فنکار ثابت کرنے کیلئے کافی ہے۔

حالیؔ نے خود سرسید کی کمزوریوں سے اغماض برتنے کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ ابھی اردو میں تنقیدی انداز سے سوانح عمری لکھنے کا دور شروع نہیں ہوا۔ بالکل یہی بات نفسیاتی انداز اور تصویر کشی کے بارے میں کہی جاسکتی ہے کہ حیات جاوید کی تصنیف کے وقت یہ فن اردو میں اتنا ترقی یافتہ نہ تھا اسی بنا پر اگر ذہنی ارتقاء، پرائیوٹ زندگی، تنقیدی انداز نظر کی کمی اور غیر معمولی مدحیہ انداز سے کتاب مزین ہے تو اس کا سبب منجملہ اور اسباب کے اردو زبان کا ارتقائی دور ہے۔

بہرحال علامہ شبلی کا اعتراض بالکل بے بنیاد نہ تھا مگر اس میں کچھ مبالغہ تھا جو عربی کی ایک مثل سے مطابقت رکھتا ہے کہ

۱؎ فن سوانح نگاری کا ارتقاء ص ۱۰۶ ۲؎ فن سوانح نگاری کا ارتقاء ص ۱۰۵ ۳؎ فن سوانح نگاری کا ارتقاء ص ۱۰۱

"المعاصرت سبب المنافرت" معاصرت منافرت کا سبب بن جاتی ہے۔ چنانچہ "افادات مہدی" میں مہدی حسن لکھتے ہیں کہ کیا اسی معیار تنقید پر جس پر آپ حیاتِ جاوید کو کس رہے ہیں اپنی سوانح عمریوں کو جانچنا پسند کریں گے! اس میں شبہ نہیں کہ حالی بشر تھے اور بشری کمزوریوں سے ان کی کتاب خالی نہیں۔ آدمی جب کسی کو چاہتا ہے تو اس کی خامیاں بھی خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں اور خوبیوں میں وہ مبالغہ کرنے لگتا ہے بالکل یہی کیفیت کی غمازی حالی نے حیاتِ جاوید میں کی ہے مگر حق یہ ہے کہ ان چند باتوں کے علاوہ جامعیت اور شخصیت نگاری کا انھوں نے حق بھی ادا کر دیا ہے جس کی تفصیل آپ کی نگاہوں سے گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔

بہر حال "حیاتِ جاوید" ایک ایسا علمی کارنامہ ہے جو زندہ رہے گا مگر عجیب بات ہے کہ اس کتاب کو جتنی شہرت دینی عظمت حاصل ہے اس کے مطابق اس کو مقبولیت حاصل نہیں۔ اس میں کچھ تو اس کی ضخامت کو دخل ہے اور کچھ سرسید کے بارے میں مختلف طبقات کے طرز فکر کو۔ اس سے کتاب کی عظمت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ "ہماری زبان میں یہ اعلیٰ و مکمل نمونہ سوانح عمری کا ہے۔ اس میں حالی نے اپنا کلیجہ کا غذ پر نکال کر رکھ دیا ہے۔ اس میں انسانی زندگی کی عظمتیں پوشیدہ ہیں۔ اس میں حالی کی عظمت کا جلوہ ہے اس میں ایک قوم کی خوابیدہ تمنائیں ہیں اور اس کے مستقبل کی نشان دہی ہے۔

حیات جاوید سے سرسید کی مساعی مصور ہو کر سامنے آتی ہیں چونکہ مسلمانوں کا دین ان کی دنیا سے بالکل جڑا ہوا تھا اس بناء پر سرسید نے مذہب کے راستہ سے اصلاح شروع کی۔ سرسید نے مسلمانوں کے مذہب کو جدید تعلیم سے بچانے کیلئے یہ راہِ عمل اختیار کی جو مضر اثرات جدید تعلیم سے ان پر مرتب ہوتے تھے اس کیلئے انھوں نے تفسیر اور دوسری کتب تصنیف کیں۔

سرسید نے پہلی بار مسلمانوں کیلئے "قوم" کا لفظ استعمال کیا[۱] اور ان کو متحد و منظم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مسلمانوں کیلئے الگ نمائندگی طلب کی اسلئے کہ ان کو خدشہ تھا کہ اکثریت اقلیت کو نگل نہ جائے۔ چونکہ غیر مسلم تعلیم یافتہ، مالدار اور اکثریت میں تھے مسلمان پس ماندہ، جاہل اور غربت و افلاس کا شکار تھے اسلئے سرسید نے انگریزوں کی مدد سے ان کو ابھارنا چاہا۔ سرسید نے واضح طور پر مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت سے باز رکھا اس لئے کہ ۱۸۵۷ء میں وہ پٹ چکے تھے۔ انگریزوں نے ان کو بالکل دبا دیا تھا۔ ایسی صورت میں کانگریس کی شرکت سم قاتل تھی۔ سرسید کی یہ تمام باتیں ہم فرقہ پرستی پر محمول نہیں کرسکتے اس لئے کہ انھوں نے ملک و قوم کے پس ماندہ طبقہ کو روشنی دکھائی اگر جسم کا کوئی عضو مفلوج ہو جائے تو پورا جسم اس سے متاثر ہوگا اسی بناء پر خود غیر مسلم زعماء جواہر لال وغیرہ نے تسلیم کیا ہے کہ سرسید کا کارنامہ اس دور کے لحاظ سے مناسب تھا ورنہ قوم کا ایک اہم حصہ جاہل و پس ماندہ رہ جاتا۔

سرسید خوب سمجھتے تھے کہ جدید اعلیٰ تعلیم ہی سے قوم کو عظمت و عزت حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ ہر اس تجویز کے مخالف تھے

۱۔ حیاتِ جاوید ص ۵۹ — ۵۹

جو اعلیٰ تعلیم سے مسلمانوں کو روکے چنانچہ انھوں نے ٹیکنیکل تعلیم تک کی مخالفت اسی اصول کی بنا پر کی ہے اسی بنا پر انھوں نے ہندوستانی زبانوں میں تعلیم کی بھی مخالفت کی۔

اُردو اور ہندی کی آویزش بھی سرسید کے زمانہ میں شروع ہوئی سرسید نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا کہ ہندو مسلمان ساتھ نہیں رہ سکتے۔ غیر مسلموں کے ہندی پر اصرار کے باعث انھوں نے یہ نظریہ قائم کیا تھا۔

سرسید نے اردو ادب کی خدمت مختلف انداز سے کی۔ انھوں نے تصانیف کے علاوہ رسالے نکالے، سائنٹیفک سوسائٹی نے ۰۰ کتابوں کے انگریزی سے اردو میں ترجمے شائع کئے۔ یہ ایک بڑا کام تھا۔ علاوہ ازیں ایک رسالہ بھی اسی نام سے شائع ہوتا تھا۔ پھر لندن سے لوٹ کر انھوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا جو پہلی بار ۶ برس نکلتا رہا دوسری بار کچھ عرصہ نکلا پھر تیسری بار دو برس نکلا۔ ۲۴ برس کے عرصہ میں تین بار اس طرح نکلا جیسے بادل میں چاند چھپ چھپ کر نکلے۔ اس کے ذریعہ اُردو میں واقعی انقلاب ہوا۔ انگریزوں کی خوشامد کا پہلو پوری کتاب میں نمایاں ہے۔ خود سرسید کی تمام تصانیف سے اور عمل سے حالی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید انگریزوں کے وفادار تھے اور مسلمانوں کو ان کا مذہب وفاداری سکھاتا ہے۔ حالی نے بار بار یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ سرسید نے مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے خیالات بدلے اور وہ ان کو انگریزوں سے قریب لائے کسی ناقد نے بڑی عمدہ بات لکھی ہے کہ سرسید کی سعی کامیاب ہوئی انگریزوں نے مسلمانوں پر توجہ کی ان کیلئے تعلیم و نوکری کی سہولتیں فراہم کیں اسلئے نہیں کہ سرسید نے چاہا تھا اور سعی کی تھی بلکہ اس لئے کہ ان کی پالیسی بدل چکی تھی۔ ابتدا میں صاحبِ حکومت ہونے کے باعث مسلمانوں کو خوب دبایا بعد میں ان کو ابھارنے کی کوشش کی تاکہ ہندو مسلمان باہم لڑ سکیں اور طاقت کا توازن قائم رہے اور ہوا بھی یہی۔

سرسید کی انگریز دوستی یقیناً بربنائے مصلحت تھی اس وقت کے حالات کے لحاظ سے یہی طریقہ تھا آگے بڑھنے کا صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ حالی رقمطراز ہیں کہ اب ہم کو ہمیشہ غلام بن کر رہنا ہے اسلئے سرسید نے ہم کو یہ طریقہ بتایا کہ کس طرح غلامی میں زندگی گزاری جائے جبکہ اسلاف کا دور غلامی کا نہیں آزادی کا تھا اس لئے حالی کی نظر میں اسلاف کی زندگی نمونۂ عمل نہ رہ گئی تھی۲

میں نے آخر میں کتاب کے موضوعات کے بارے میں تعرض اس لئے مناسب سمجھا کہ معلوم ہو سکے کہ جن موضوعات پہ حالی نے قلم اٹھایا اور جن اہم تاریخی سیاسی اور ادبی مسائل پر انھوں نے قلم کے جوہر دکھائے ہیں وہ آسان معاملہ نہ تھا وہ صرف حالی ہی کا حصہ تھا کہ انھوں نے بے شمار اخلاقی، تہذیبی، ادبی، معاشرتی، سیاسی، معاشی اور مذہبی مسائل کو بہت سلجھے ہوئے انداز میں سمیٹا ہے۔ اتنے بڑے کام میں کامیابی بڑی مشکل ہے مگر (باقی صفحہ نمبر ۱۰۱ پر)

۱۔ حیات جاوید ج ۲ ص ۵۱-۵۲

۲۔ مقدمہ حیات جاوید ا تا ۵

ڈاکٹر وشنو سروپ

ہندی کے چند مسلمان شعراء
(۱۶۵۰ تا ۱۸۵۰ء)

عہد وسطیٰ یعنی مسلم دور میں جیسے جیسے سیاسی اعتبار سے امن قائم ہوتا گیا ویسے ویسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قلبی تعلقات مضبوط ہوتے گئے۔ ان تعلقات کو اور زیادہ قریب کرنے کا کام۔ کرشن بھگتی کے تصورات اور عناصر نے کیا۔ ایک طرف تو سری کرشن جی کے حسن و جمال سے جذباتی اور حسن پرست قسم کے مسلمان شعراء متاثر ہوئے اور دوسری طرف برج بھاشا کی طویل عرصے سے شاعری میں مٹھاس اور رسیلے پن نے مسلمان شعراء کے جذبات کو اپنی طرف کھینچا۔ کرشن بھگتی کی شاعری جو ابتک حقیقت کو پیش کرتی تھی۔ اب بتدریج مجازی عشق میں تبدیل ہونے لگی اور ہندی کے مسلم شعراء نے بھی اس کی تقلید کی۔

عہد متوسط میں اہم مقام عالم کا ہے۔ یہ برہمن تھے لیکن شیخ نام کی رنگریزن کی شاعرانہ ذہانت پر فریفتہ ہوکر اس سے شادی کرنے کیلئے اسلام قبول کرلیا تھا۔ ان کی شاعری کا عہد سمبت ۱۷۴۰ تا ۱۷۶۰ مانا گیا ہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "عالم کیلی" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ان کے اور بھی اشعار ملتے ہیں جو اس مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ عالم کو محبت کا درد رکھنے والا شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن ان کا درد صوفی شعراء کے درد کی طرح صوفیانہ نہیں ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ صوفیوں نے کائنات کو جس طرح ایک خاص نقطۂ نظر سے محبوب کو خالق کی جدائی میں ترستا ہوا دیکھا ہے عالم کی وہ کیفیت نہیں ہے بلکہ اس نے محبت کے درد کا ایسا روپ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو زیادہ اثر آفریں ہو۔ کیوں کہ فراق میں اس کا تاثر بہت زیادہ بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اسی لئے عالم کی شاعری میں فراق کے مضامین بہت زیادہ ملتے ہیں۔ اس نے فراق سے پیدا ہونے والی حالت کا بہت دلگداز اور اثر انگیز نقشہ پیش کیا ہے ؎

عالم پریم ویوگ میں 'اٹھت اٹیپٹی جھار   من لاگے جیرا جرے' لاج ہوت بری جھار

وہ کہتا ہے کہ اے عالم عشق میں جدائی کی آگ کی لپیٹ اٹھتی ہے اور دل لگ جاتا ہے۔ جگر جل جاتا ہے۔ یہ شرم جیا کو بھی جلا کر خاک کر دیتی ہے۔

کرشن کی محبت میں دیوانی فراق زدہ گوپیوں کی بے کسی مایوسی اور لاچاری کی حالت کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے۔ کہتا ہے ؎ جا تھل کیتے بہار انیکن' تا تھل کاں کری بیٹھی چھینوں کرے

جا رسنا سوں کری بہو بات' تا رسنا سوں چرتر گنیوں کرے

عالم جون سے کنجن میں کری کیلی تہاں اب بیس دھنیوں کرے

نینن میں جو سدا رہتے تن کو اب تان کہانی سنیوں کرے

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جہاں ہم نے کرشن کے ساتھ عیش و آرام کا لطف اٹھایا ہے۔ اب وہاں بیٹھے ہوئے کنکریاں چننے کی نوبت آگئی ہے۔ جس زبان سے ہم نے کرشن کے ساتھ بیٹھ کر بہت سی باتیں کی ہیں اب اسی زبان سے کرشن کے اوصاف کا بیان کرنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ اے عالم ہم نے جن کنجوں میں کرشن کے ساتھ اچھا وقت گذارا ہے۔ اب وہیں بیٹھ کر سر دھن رہے ہیں جو ہمیشہ نظر کے سامنے رہتا تھا اب اس کی صرف کہانی ہی سننی پڑ رہی ہے۔

محبت میں فراق کی کیفیتوں کو ابھارنے کیلئے عالم نے بہت ہی نرالا انداز اختیار کیا ہے اور یہ انداز اثر آفریں اور دلگداز ہے اس کا سبب یہ ہے کہ عالم خود بھی محبت کا مارا تھا اور اسی لئے اس کا دل محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نظریہ سے عالم کو گھن آنند اور رس خاں کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے

عالم کی بیوی شیخ شریک زندگی ہی نہیں بلکہ شاعری میں بھی اس کی ہم سر و ہم مرتبہ تھی۔ ان دونوں میں محبت کی ابتدا شاعری ہی کے ذریعہ ہوئی تھی۔ اس کا دلچسپ قصہ یوں ہے کہ ایک بار عالم نے اپنی پگڑی رنگنے کیلئے شیخ رنگریزن کے پاس بھیجی اس کے کنارے پر کاغذ کا ایک ٹکڑا بندھا تھا جس پر یہ آدھا دوہا لکھا تھا۔ ع

"کنک چھڑی سی کامنی کاہے کو کٹ چھین"

یعنی عورت جو سونے کی نازک چھڑی سی ہے۔ اس کی کمر باریک کیوں ہے ؟

شیخ نے دوہے کو اس طرح پورا کیا۔ ع

"کٹ کو کنچن کاٹ بدھی کچن مدھیہ دھری دین"

یعنی خالق نے کمر کا سونا کاٹ کر سینہ پر رکھ دیا ہے۔

شیخ کے اس تکملہ پر عالم ریجھ گئے۔ شیخ کی فہم و ذکا اور سوجھ بوجھ بہت زیادہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار شہزادہ معظم مذاق میں شیخ سے پوچھ بیٹھا۔ کیا عالم کی بیوی تم ہی ہو۔ شیخ نے فوراً اپنی ذہانت کا ثبوت اس طرح دیا کہ ہاں جہاں پناہ۔ جہان کی ماں میں ہی ہوں۔ جہان عالم اور شیخ کے لڑکے کا نام تھا۔ عالم کے نام سے جو اشعار ملتے ہیں ان میں شیخ کی شعری ذہانت کا اتحاد بھی ملتا ہے۔ چنانچہ ذیل کے بند کا آخری مصرع شیخ کا کہا ہوا ہے ـــــ

پریم رنگ پگے جگمگے جگے جامنی کے جیون کی جوتی جگے جو اُگت میں !!

دن کے ماتے متوارے ایسے گھومت ہیں جھومت ہیں جھکی جھکی جھانپی اگھرت ہیں

عالم سو نول نکائی ان نینن کی پانکھری پدم پے بھنور تھرکت ہیں

چاہت ہیں اڑی بے کو دیکھت مینک مکھ جانت ہیں رینی تاتے تاہی میں رہت ہیں

مطلب یہ ہے۔ محبوب کی آنکھیں رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے محبت کے نشے سے سرشار ہیں اور زندگی کی خوشی اور جوش بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

عشق میں مدہوش ہو کر وہ اس طرح گھومتی پھرتی ہیں، جھومتی ہیں، جھکتی اور پھر اچھل جاتی ہیں۔ ایسے عالم (ان آنکھوں کی خوبصورتی اور رونق ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کنول کی پنکھڑی پر بھونرہ تھرکتا ہے۔ یہ بھونرے (یعنی آنکھیں) اڑنا تو چاہتی ہیں۔ لیکن جب وہ چاند سے چہرہ کو دیکھتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ چاند غروب نہیں ہوا ہے اور ابھی رات باقی ہے اس لئے اڑنے سے باز رہتے ہیں۔

شیخ کی گہری جنسی جذبات نگاری کی ایک مثال ملاحظہ ہو ؎

پیاری پر ینک پے نشنا سوئے سووت ہی کن چکی ورکی نیک اپر کو سرکی
عطر گلاب او سگندھ مہکا یہ دیکھو اٹھی آپٹ کہاں تے مدھو کر کی
بیٹھیو کچھو بیچ بیچ اڑی نہ سکت کے ہوں رہی اپرکیہ سیخ دوتی دوپہر کی
مان ہو سمر سُمری بیر سنکر کو مار نیا ترتی پور سرتی چھانس دنجانی سر کی

مطلب یہ ہے کہ محبوبہ پلنگ پر بے فکر سو رہی تھی اور اس کی انگیا ذرا اوپر کو سرک گئی اور اس کے سینے سے جب عطر اور گلاب کی مہکار اٹھنے لگی تو بھونروں کی ایک قطار وہاں پہنچ گئی۔ ایک ادنیٰ کیفیت بھونرا اس کی دونوں چھاتیوں کے درمیان بیٹھ گیا ہے اور اڑ نہیں سکتا۔ شیخ کہتی ہے کہ بھونرے کی زرد شکل دوپہر کی روشنی جیسی معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کام دیو نے شیو کے ساتھ اپنی پرانی لڑائی کو یاد کر کے جس میں کام دیو نے تیر چلایا اور اس کی پھانس شیو کے دل میں چبھی رہ گئی۔

ہندوؤں کے مذہبی عقائد اور ہندوستانی ادبی روایات سے مسلمان شعراء نے ——— کتنا قریبی تعلق قائم کیا تھا۔ اس کی واضح مثال شیخ کی شاعری میں ملتی ہے۔

ہندی کی مسلم شاعرات میں سب سے زیادہ مشہور اور عزت کے ساتھ لیا جانے والا نام تاج کا ہے۔ ان کی شاعری میں عشق حقیقی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ کرشن کے موہ لینے والے حسن پر فریفتہ ہو کر وہ تمام چیزوں سے علیحدہ ہو کر کرشن کی محبت میں غرق ہو گئیں تھیں۔ ان کے عشق کا جوش اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ مسلمان ہونے کے باوجود ہندو ہو کر رہنے کا عہد کر لیا تھا ؎

نند کے کمار قربان تاڑی صورت پے   ہوں تو ترکانی ہندوانی ہوئے رہوں گی میں

کہا جاتا ہے کہ ایک بار سری کرشن جی کے دیدار کیلئے یہ مندر میں گئیں لیکن پجاریوں نے داخل ہونے نہیں دیا۔ یہ باہر ہی پڑی رہیں۔ آدھی رات کو بالک کرشن پجاریوں کے تھال میں کھانا لے کر تاج کے پاس آئے اور کہا اے عورت تو دن بھر کی بھوکی ہے۔ کھانا کھا کے تھال پجاری کو دے دینا۔ آج سے مندر میں آنے سے تجھے کوئی نہ روکے گا۔ اس نے کرشن کے

حسن کا بہت ہی دلکش اور محویت کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

چھیل جو چھبیلا سب رنگ میں رنگیلا بڑا چت کا اڑیلا کہوں دیوتوں سے نیارا ہے
مال گلے سوہے، ناک موتی سیت سوہے، کان کنڈل من موہے لال کمٹ سر دھارا ہے
دشٹ جن مارے، سب سنت جو اُبارے تاج چت میں نیہار و پریتی کرن بارا ہے

مطلب یہ ہے کہ وہ چھیل چھبیلا ہے اور ہر رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ وہ بڑا ضدی اور تمام دیوتاؤں سے بالکل الگ ہے مالا اس کے گلے میں خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ اس کی ناک میں سفید موتی سہاتا ہے۔ کان کی بالی دل کو موہ لیتی ہے اور اس کے سر پر سرخ تاج ہے۔ برے لوگوں کو مارنے اور نیکوں کو ترقی دینے والا ہے۔ اے تاج وہ جو اٹل محبت کرنے والا ہے۔ اس کو اپنے دل میں دیکھنے کی کوشش کرو۔

زبان کی رو سے تاج کی شاعری پر بطور خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے اس کا زمانہ سمبت $\frac{1700}{1652}$ء کے قریب کا ہے اس زمانہ کے کسی بھی دوسرے شاعر نے برج بھاشا کو چھوڑ کر کھڑی بولی میں شعر کہنے کی ہمت نہ کی۔ تاج کو ایسی خالص اور رس سے بھری ہوئی کھڑی بولی میں شعر کہنے کی اولیت حاصل ہے دویدی دور میں کافی کوشش کے بعد شعراء کو اس زبان پر عبور حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔

محققین کی توجہ اس طرف ضرور منعطف ہونی چاہیے کہ تاج کو خالص کھڑی بولی کی پہلی شاعرہ مانا جا سکتا ہے یا نہیں خسرو نے عہد قدیم میں جو شعر کہے ہیں وہ خالص کھڑی بولی نہیں ہے۔ تاج نے اپنے آپ کو پوری طور پر ہندوانی روایات میں رنگ لیا تھا۔ گنیش کی مدح میں شعر گوئی اس کا بین ثبوت ہے۔ پیش کردہ دوہے میں بھی کھڑی بولی کا روپ دکھائی دیتا ہے ؎

گنپتی گن سرتاج ہو تمہیں نماؤں شیش
گیان دیو پورن ہمیں جانیں گے سُت ایش

مطلب۔ اے گنیش! تم گنوں کے سرتاج ہو میں تمہیں سلام کرتی ہوں
ہمیں عقل و فہم عطا کرو تب ہی ہم آپ کو شیو کا خلف سمجھیں گے۔

ریتی کال کے دوسرے مسلم شعراء میں رسلین کا ذکر کئے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں کہلایا جا سکتا۔ ان کا اصلی نام غلام نبی تھا۔ ان کے کلام کے مجموعے کا نام "انگ درپن" ہے جو سمبت ۱۷۹۴ میں لکھا گیا تھا۔ آنکھوں کے تعلق سے کہے گئے دوہے کو اکثر لوگ غلط فہمی میں بہاری لال کا کہتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ دوہا ہے ؎

امیئے ہلاہل مدبھرے سویت شیام رتنار
جیئت مرت جھکی جھکی پرت جیہی چتوت اک بار

سفیدی سیاہی اور سرخی رکھنے والی آنکھیں آب حیات، زہر اور شراب سے بھری ہوئی ہیں یہ جس کو

ایک بار دیکھ لیتی ہیں وہ جیتا ہے مرتا ہے اور ڈولتا ہے (صنعت لف ونشر مرتب کی ایک خوبصورت مثال)

ان محبت کی لے میں ڈوبے ہوئے شعرا کے علاوہ احمد، نذیر علی خاں، کندن شاہ، کریم، حاجی بنی وغیرہ اور دوسرے کئی مسلم شعرائنے بھی ہندی شاعری سے محبت کی دھارا میں اپنے تاثرات سے روانی کو تیز کر دیا۔ اسی عہد کے حفیظ اللہ خاں پرتیم نے اپنی شائستہ ظرافت آمیز شاعری سے ہندی شاعری میں ایک نئی راہ پیدا کی۔

ان کی ایک تصنیف۔ کھٹمل بائیسی میں کھٹملوں کو ظرافت کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ کھٹملوں کے ڈر سے بیچارے برہما کنول اور شیو کھاٹ پر نہیں سو پاتے اسی لئے انھیں ترتیب وار کنول، سمندر اور پہاڑ کا سہارا لینا پڑا ہے۔

دِدھی ہری ہر، اور ان تے نہ کو اوستے او

کھاٹ پر سووں کھٹمل کوں ڈری کے

کرشن بھکتی سے متعلق اور شرنگار رس کی شاعری میں سخن فہم مسلمان شعرائنے جو بے لاگ اور پر خلوص شعر کہے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ثقافتی اتحاد میں خواہ سیاسی اعتبار سے وہ کامیاب ہو یا نہ ہو علمی اعتبار سے ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ علمی دنیا میں قومی اور مذہبی اختلافات کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ سیاسی میدان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف ختم نہیں ہو سکا۔ عوامی زندگی میں بھی یہ اختلاف کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں نظر آتا ہے لیکن علمی دنیا میں ان دونوں قوموں نے ان اختلافات کو بالکل بھلا دیا۔ کئی مسلمان شعرا کی شاعری کے متعلق اگر یہ نہ بتایا جائے کہ یہ مسلمان شاعر کا کلام ہے تو قاری ہندو شاعروں کے کلام سے انھیں الگ نہ کر سکے گا۔ دونوں میں ہندوستانی کلچر کی ہم آہنگی نظر آتی ہے۔

نشاط قیصر

یگانہ۔حیات اور شاعری

میکسم گورکی نے اپنی تصنیف "روزنامچے کے پریشان اوراق" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک روز وہ کسی پارک کے قریب سے گذر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک شخص ایک بنچ پر بیٹھا کبھی ہیٹ کو اوڑھ لیتا اور کبھی اُسے اتار کر سورج کے سامنے رکھ دیتا۔ گورکی نے قریب پہونچ کر دیکھا تو وہ چیخوف تھا۔ گورکی نے پوچھا۔

"کیوں چیخوف یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟

چیخوف نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ یہ دھوپ قابو میں نہیں آتی ہے میں ہیٹ میں شعاعیں جمع کر کے جلدی سے اوڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن وہ نکل بھاگتی ہیں۔

"گورکی اُسے چھوڑ کر اپنی راہ لگ گیا۔

تو یگانہ نے دھوپ جمع کرنے کی کوشش تو نہیں کی بلکہ بحر ادب کی تہہ میں ڈوب کر انمول موتی ضرور نکالے"

مرزا واجد حسین یاس، یگانہ چنگیزی ۱۸۸۳ء میں بمقام عظیم آباد محلہ مغلپورہ میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں مدرسے میں داخل ہوئے۔ جناب بیتاب کے شاگرد تھے۔ بچپن ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔ جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو یکسوئی سے شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور جناب شاد کی شاگردی اختیار کی ۱۹۰۳ء میں انٹرنس پاس کر لینے کے بعد بہ سلسلۂ ملازمت کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا۔ لیکن جلد ہی وطن واپس آگئے۔ پھر دہلی، اجمیر، الہ آباد، بنارس وغیرہ کی سیاحت کے بعد ۱۹۰۶ء میں مستقل طور پر لکھنؤ آگئے اور یہیں مرزا عظیم شفیع صاحب کی چھوٹی صاحبزادی سے شادی کرلی۔

مڑ کے دیکھا نہ آشیانہ کی طرف   خون ہو ہو کے رہ گئی ہے یاد
کشش لکھنؤ ارے توبہ   پھر وہی ہم وہی امین آباد

اور حیدرآباد بہ سلسلۂ ملازمت جانے لگے تو یہ غم جدائی لکھنؤ یہ کہا ہے

اے لکھنؤ اے دیار دور افتادہ   اے جانِ من اے بہارِ دور افتادہ
اب دور سے اس خاک کو سجدہ کیجے   میں کون ہوں ایک مرادِ دور افتادہ

یگانہ کو اپنی زندگی میں خواہ وہ کسی صورت میں ہو۔ بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا سبب اصول سے صحیح طور پر ناسازگاری طبیعت اور اہل لکھنؤ کی بے سلوکی تھی۔ یگانہ اپنی ایک خود نوشت سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جب ان بزرگوں کے مشاعروں میں برابر شریک ہونے لگا۔ اور کلام نے دلوں پر اثر کیا اور ان لوگوں کو ہر مشاعرہ میں

اپنی شکست محسوس ہونے لگی تو آتشِ حسد بھڑک اٹھی۔ دلوں میں خیال پیدا ہوا کہ یہ بات اچھی نہیں کہ ایک عظیم آبادی ہمارے شہر میں ایسی ایسی غزلیں پڑھ جائے اور اپنا رنگ جما جائے۔ خود اپنے قلم میں اتنا زور نہ تھا کہ اپنے کلام کے ذریعہ یاس کے رنگِ تغزل کا نمونہ پیش کر سکیں ناچار یہ سوجھی کہ لاؤ اس شخص کو باتوں باتوں میں اڑا دیں۔ خواہ مخواہ سرِ مشاعرہ مضحکہ کریں کہ یہ شخص مرعوب یا کبیدہ خاطر ہو کر بھاگ نکلے۔ چنانچہ ۔ برج نارائن چکبست نے ایک مشاعرہ خواجہ آتش علیہ الرحمۃ کی زمین (گریباں پھاڑ چلیے اب نکل صحرا کے دامن میں) میں کیا۔ میں بھی اس مشاعرہ میں موجود تھا۔ میری غزل پر ان حضرات نے اور ان کے ہوا خواہوں نے وہ دہ فرمائشی قہقہے لگائے کہ میں ہمیشہ ان کا ممنونِ احسان رہوں گا۔ اس کے بعد حکیم منے خاں آغا صاحب (جو معیار پارٹی کے ایک رکن ہیں) کے مکان پر بنے صاحب طاہر کی طرف سے غالب کی زمین میں (منظر کھلا دفتر کھلا) ایک مشاعرہ ہوا اس مشاعرے میں بھی وہی سلوک ہوا جیسے آگے کیا گیا ہے۔ مجھے بھی مجبوراً کہنا پڑا کہ مجھے نہ کسی کی داد سے غرض ہے نہ بیداد کا شکوہ کلامِ دل پذیر کسی کی داد بیداد کی پرواہ نہیں رکھتا ہے۔"

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب یگانہ لکھنؤ میں بالکل نو وارد تھے یعنی شروع ہی میں اہلِ لکھنؤ نے ان کے دل میں اپنے لئے نفرت کے بیج بو دیئے۔ اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہے کہ ان واقعات سے ایک حساس شاعر پر کیا گذر سکتی ہے اور وہ بھی یگانہ جیسا خود دار انسان (اواخر ۱۹۴۲ء) میں جبکہ مرزا کی حیدرآباد کی ملازمت ختم ہونے والی تھی پرنس معظم جاہ نے یگانہ سے خود فرمایا کہ آپ وظیفہ سے پہلے چھ ماہ کی یا تنخواہ رخصت لے کر میرے پاس کیوں نہیں آجاتے۔ پرنس کی بات سن کر یگانہ بہت گھبرائے کہ میں اور دربار داری۔ یہ کبھی ممکن نہیں۔ یگانہ پرنس کی تجویز پر خاموش رہے اور جب ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ تب بھی پرنس کی مصاحبت نہیں قبول کی حالانکہ کم سے کم دو تہائی ورما ہوار ملتے ایسے سلوک کے بعد مزاج میں تلخی اور انتقامانہ رجحان۔ چڑچڑا پن کا آجانا فطری بات ہے اور اسی چڑچڑاہٹ و انتقامانہ رجحان نے جب فروغ پایا تو غالب کے چچا بھی بنے اور اقبال کا مذاق بھی اڑایا۔ جگر کی شاعری کو جاپانی مال بھی قرار دیا اور مرزا مراد بیگ کے نام سے آیاتِ وجدانی میں تعریفی عبارتیں بھی لکھیں۔ اس کے علاوہ مرزا کے کلام پر طرح طرح سے غلط اعتراضات کی بوچھاڑ کی۔۔۔

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں کہ "۱۹۱۳ء میں جب "نشترِ یاس" چند اساتذہ کی تعریفوں کے ساتھ شائع ہو کر منظرِ عام پر آئی جس میں یاس کو مسلم الثبوت سخنور قرار دیا گیا تھا۔ تو لکھنؤ کے تنگ ظرف شاعروں کے حلقہ میں آگ لگ گئی۔ عزیز و صفی جیسے شاعروں نے یاس کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا اور یاس کی مخالفت بڑی شد و مد کے ساتھ ہونے لگی یہ مخالفت ادبی چشمک کی حد سے گذر کر گندی اور رکیک گالیوں تک پہونچ گئی۔"

تو صاف ظاہر ہے کہ اہلِ لکھنؤ کی تنگ ظرفی و بدسلوکی ہی۔ یگانہ کے لکھنوی اساتذہ سے تنازعہ کا سبب بنی بقولِ جوش ملسیانی یہ شہر اہلِ لکھنؤ کے لئے ایک بدنما داغ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے ؎

مرادِ یاس پر کرتے ہیں شکر کے سجدے — دعائے خیر تو کیا اہلِ لکھنؤ کرتے

تقریباً ۱۹۱۵ء سے غالب کی تنقید شروع کی بظاہر تو اس کی وجہ غالب پرستوں کی اصلاح تھی جو غالب کی غلط تقلید کر رہے تھے۔ لیکن اس کی اصل وجہ اہلِ لکھنؤ کی مخالفت کرنی تھی۔ یہاں ایک بات یہ قابلِ غور ہے کہ غالب پر اعتراضات کا سلسلہ لکھنؤ کی شعرا پر اعتراضات کے بعد شروع ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہلِ لکھنؤ کی تنگ ظرفیوں اور نازیبا حرکتوں نے ان کے دل پر بڑا اثر کیا اور اہلِ لکھنؤ کی ہر بات نے مخالفت پر اکسایا اور لکھنؤ کے بعض شعرا جو مخالفین میں سے تھے غالب کی اُس وقت پیروی و تقلید کر رہے تھے۔ جس سے یگانہ غالب دشمنی پر اتر آئے اور ہندوستان کے ادبی حلقوں میں یگانہ کی جانب سے بیزاری کی ایک تیز لہر دوڑ گئی یگانہ کی غالب دشمنی بھی بڑھتی گئی تو یگانہ کو غالب سے یا غالب کے کلام سے شروع سے ہی نفرت نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو یگانہ کم از کم غالب کی زمین میں غزل تو نہ کہتے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ غالباً ۱۹۲۵ء میں غالب شکن کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔ غالب شکن کے وجود کا سبب یہ ہے کہ ایک بار کانپور میں آل انڈیا شاعر کانفرنس ہوئی جس میں مقالے پڑھے گئے۔ ایک مقالہ نگار نے اِس وقت کے شاعروں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جناب یگانہ کے مجموعہ "ترانہ" کا حوالہ دیا۔ جس میں مرزا نے غالب کی ہجو میں سخت الفاظ استعمال کئے تھے۔ مقالہ نگار نے ترانہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ایسا بلند خیال شاعر ایسے الفاظ بھی استعمال کر سکتا ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب بھی اس کانفرنس میں شریک تھے آپ نے لکھنؤ آکر جناب یگانہ کو حیدرآباد خط لکھا کہ آپ کے کمال کے قدرداں آپ کی شاعری کے بارے میں اس سے بہتر رائے سننے کے خواہشمند ہیں۔ ان کے اِس خط کے جواب میں یگانہ نے ایک طویل مکتوب لکھا جس میں اپنے رویہ کو حق بجانب ٹھہرایا اور اپنے اسی مکتوب کو یگانہ نے بعد میں کتابی شکل میں غالب شکن کے نام سے شائع کر دیا۔ اس کے بعد "غالب شکن" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا جس کا نام غالب شکن دو آتشہ رکھا۔

یگانہ کے غالب پر پے در پے حملوں سے ادبی حلقوں میں بیزاری پیدا ہو گئی۔ لیکن پھر فضا میں سکون پیدا ہو گیا اور ایسا سکون کہ ؎

دونوں دیوانے ہیں علیؑ کے طالب — جان ایک ہے گو جدا جدا ہیں قالب
مذہب میں شاعری میں قومیت میں — غالب ہیں یگانہ اور یگانہ غالب

اہلِ مذہب کے نزدیک یگانہ نہ جانے کیا کیا تھے لیکن یگانہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے اس کے علاوہ ان کے گھر میں مذہب کا بہت دور دورہ تھا اور وہ اس میں کبھی دخل انداز نہ ہوئے اس کے علاوہ وہ سیاہ رنگ کی ٹوپی جس کو اس زمانے میں مذہبی لوگ پہنا کرتے تھے۔ یگانہ بھی استعمال کرتے تھے۔ اس سے ان کے مذہبی احساس کا پتہ چلتا ہے۔

یگانہ ایک فطری شاعر تھے۔ زبان پر زبردست قدرت رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں سادگی ہے وہ الفاظ کے داؤ پیچ میں نہ الجھتے ہیں نہ الجھاتے ہیں۔ جو ان کے لکھنوی ہم عصر شعراء کا خاصہ تھا۔ حضرت عزیز لکھنوی کے چند اشعار

ملاحظہ ہوں اور دیکھیے کہ ان میں کس حد تک ناما نوسیت اور غالبیت نمایاں ہے ؎

جفائے ناز بتقریب رسمِ الفت ہے — الٰہی خیر ابھی امتحاں نہیں ہوتا
ہے بہم ترجیح سودائے مژہ پرداز و قدح — ہر رگِ دل دے رہا ہے نوکِ نشتر کا جواب
سلسلہ جوہرِ شمشیر کا تھا مانع دیر — ہر نظر تھی مری پابند سلاسل قاتل
مژگاں کو شغل ماتمِ ناکامیٔ نگاہ ہو! — آنکھیں جھپک رہی ہیں تری جلوہ زار میں

مرزا کے کلام میں ایک قسم کی توانائی ہے۔ جو ان کو اپنے ہم عصر شعراء سے ممتاز کر دیتی ہے۔ مرزا کا تجربہ و مشاہدہ ذاتی تجربہ و مشاہدہ تھا۔ ان کا غم حقیقی غم ہے۔ مصنوعی نہیں۔ ان کی شاعری زندگی کے اندھیرے اجالے پر مبنی ہے۔ اسلئے انکا کلام ہم کو براہِ راست متاثر کرتا ہے۔ جس نے انھیں زندگی سے قریب کر دیا ہے۔ یگانہ نے زندگی کی تہوں میں اپنی جڑیں مضبوط کری ہیں۔ آسکر وائلڈ نے کیا ہی مزے کی بات کہی ہے کہ "خندہ و نشاط کے پیچھے ہوسکتا ہے کہ ایک درشت سخت گیر اور رحم نا آشنا مزاج ہو لیکن غم کے پیچھے ہمیشہ غم رہتا ہے" اور یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ روح کو خوبصورت اور روح کی خوبصورتی کو جلا بخشنے والا غم ہی ہوتا ہے تو کیا آپ کو یگانہ کے غم میں ان کی روح کی زیبائی و خوبصورتی محسوس نہیں ہوتی ہے؛ یگانہ کا غم ایک صحت مند غم ہے ان کے یہاں بڑی شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ یگانہ کے یہاں زندگی کی موجیں لہریں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی نظر میں زندگی کا ماحصل رونا نہیں اور حوادثِ زمانہ سے مغلوب ہونا نہیں ہے بلکہ زندگی سے لڑنا ہے۔ وہ ناامیدی کی تلقین نہیں کرتے بلکہ ان کے یہاں ایک جہدِ مسلسل ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک دھیمی دھیمی آنچ کی کیفیت پائی جاتی ہے جس سے دل گداختہ کی کسک کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کسکِ زندگی کے تلخ تجربات بھی ہیں اور حسن و عشق کے والہانہ پن اور گوناگوں تجربات کا نتیجہ بھی۔ یگانہ اور ان کے پڑھنے والوں کے درمیان ایک ذہنی رابطہ قائم ہو جاتا ہے جو ان کے ہم عصر و دورِ حاضر کے شعراء میں کم ہی نظر آتا ہے۔ سوائے فراق کے کیونکہ فراق بھی بہت حد تک یگانہ سے متاثر کہے جاسکتے ہیں۔ عزیز و صفی پر غالبیت کا دباؤ تھا۔ اصغر تصوف کے ڈورے میں بندھے تھے۔ فانی کی شاعری یاسیت کی پابند تھی حسرت کو سیاست نے بے سُر کر دیا۔ جگر زمانے کی سطحی جذباتیت کی آواز بن کر رہ گئے جگر کو بھی یگانہ کا ہمعصر کہا جاسکتا ہے۔ حالانکہ وہ یگانہ سے عمر میں چھوٹے تھے مگر یگانہ کی شاعری جگر کے بعد مقبول ہوئی اسلئے ہم جگر کو بھی یگانہ کا ہمعصر مان سکتے ہیں۔ حالانکہ یگانہ کی زندگی بڑی تنہائی میں گزری مگر نہ تو ان کے یہاں فانی کی یاسیت و قنوطیت کا شائبہ ہے۔ اور نہ وہ انسانوں کو اصغر کی طرح بادلوں میں پناہ لینے کو کہتے ہیں۔ ان کے یہاں غم نام کی کوئی چیز نہیں وہ غم کو بڑی آسان چیز سمجھتے ہیں ؎

مزے کے ساتھ ہوں اندوہِ غم تو کیا کہنا — یقیں نہ ہو تو کرے کوئی امتحاں اپنا

سید عابد علی عابد نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یاس کا لہجہ اور اسلوب اردو غزل میں بالکل نئی آواز کی

حیثیت رکھتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے یگانہ کی غزلوں کو جدید غزلوں سے تعبیر کیا لیکن پھر بھی یہ بات قابلِ غور ہے کہ ۱۹۳۵ء کے پہلے ان کی شاعری مقبول نہ ہوئی۔ اس کی بظاہر کئی وجہیں نظر آتی ہیں اوّل تو یہ کہ بہت لوگ تو ان کی غالب شکنی کی وجہ سے ان کی طرف دھیان ہی نہ دیتے تھے۔ ان میں ناقدانِ فن بھی شامل تھے۔ دوم یہ کہ ان کی غزلیں زمانہ کے مذاق کے مطابق نہ تھیں۔ ان کی اپنے عصر میں نامقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ یگانہ کا جو زمانہ تعین کیا جاتا ہے وہ زمانہ وہ تھا جبکہ داغ اور امیر کے مضامین کو الٹ پھیر کر برتا جا رہا تھا اور غزل بالکل روایتی اور بے جان ہو کر رہ گئی تھی۔ جب اس چیز کو لکھنؤ کے کچھ شعراء نے محسوس کیا تو انھوں نے غالب اور درد کو اپنا قبلہ و کعبہ تسلیم کر لیا اور غالب کے مصرعوں پر غزلیں کہہ کر اس کے مزاج و فلسفہ کو اپنانے کی کوشش کی اور درد کے مخصوص تصوف زدہ انداز کو داخل کرنا چاہا۔ جس سے ان کی غزل بالکل پر تصنع ہو کر رہ گئی۔ جس کو اس وقت کا ذہن خاطر خواہ قبول نہ کر سکا۔ اب کچھ شاعروں نے اس تصنع کی مخالفت کی۔ ان میں جگر سب سے نمایاں تھے۔ اتفاق سے ان کی سطحی رومانیت۔ موسیقیت اور عشقیہ خیالات ان کی مترنم آواز جگر کے قارئین و سامعین کو بڑی بھائی۔ اور جگر اپنے دور پر چھا گئے۔ لیکن یگانہ کی شاعری ان سبھوں سے جدا تھی۔ ان کیلئے سبھوں سے الگ تھی۔ اس لئے وہ اتنے مقبول نہ ہو سکے۔ بظاہر تو وہ غالب شکن تھے مگر وہ غالب سے ذہنی طور پر قریب کہے جا سکتے ہیں۔ اور جب ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۰ء کے بعد اس موسیقیت رومانیت اور غنائیت کا بھی زور کم ہو گیا اور اس کے مقابل سنجیدہ اور تہہ دار اور جاندار شاعری قبول اور پسند کی جانے لگی تو یگانہ کو بھی لوگ قبول کرنے لگے۔ اس کے علاوہ یگانہ نے غالب شکن لکھ کر اپنے خلاف دشمنوں کو کافی مواد فراہم کر دیا تھا اُن دشمنوں میں ناقدانِ فن بھی شامل تھے۔ یگانہ کے بارے میں نقادوں کا خیال یک طرفہ تھا۔ یوسف حسین خاں نے اپنی کتاب "اردو غزل" میں تو حسرت، فانی، جگر اور اصغر کا تو کھلے دل سے تذکرہ کیا ہے مگر یگانہ کے سلسلے میں ایک جملہ بھی نظر نہیں آتا اور نہ ڈاکٹر ابواللیث نے اپنی کتاب "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" میں نہ رشید احمد صدیقی نے "اردو غزل" میں لیکن ادھر تو اب یگانہ پر لوگوں نے دھیان دینا شروع کر دیا ہے اور ان پر اب بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ حالانکہ ابھی ان کو صحیح مقام نہ مل سکا ہے۔ جو یہ مستحق ہے۔ جگر کو اپنے دور میں بڑی شہرت حاصل ہوئی مگر نقاد صرف کلام کو پرکھتا ہے نہ کہ وہ شاعر کے ہنگامی محفلوں اور ذاتی پروپیگنڈے کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے

اب میں یہاں یگانہ کی شاعری کے کچھ نمونے پیش کروں گا جن سے ان کی شاعری کی بہت حد تک نمائندگی ہو سکے گی۔

تلملانے کا مزہ کچھ نہ تڑپنے کا مزہ　　ہیچ ہے دل میں اگر دردِ خداداد نہیں

کارگاہِ ہستی کی نیستی بھی ہستی ہے　　ایک طرف اجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

کیا ان بھی کسی کی نہ گذری زمانے میں　　یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا — چال سے تو کافر پہ سادگی برستی ہے
کیا کوئی پوچھنے والا بھی اب اپنا نہ رہا — دردِ دل رونے لگے یاسؔ جو بیگانوں سے
پیالہ خالی اٹھا کر لگا لیا منھ سے — کہ یاسؔ کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا
زمانہ اس کے سوا اور کیا وفا کرتا — چمن اجڑ گیا کانٹے گلے کا ہار بنے
اتنا تو زندگی کا کوئی حق ادا کرے — دیوانہ وار حال پہ اپنے ہنسا کرے
کھا گیا کتنے جاں نثاروں کو — پردہ پردہ میں شعلۂ بیباک
دور سے دیکھنے کے یاسؔ گنہگار ہیں بس — آشنا تک نہ ہوئے لب کبھی پیمانے سے
مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا — مجھے سر مار کے تیشہ سے مر جانا نہیں آتا
بادِ مراد چل چکی لنگر اٹھاؤ یاسؔ — پھر آگے بڑھ کے خوبیٔ تقدیر دیکھنا
چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا — دلیل راہِ محبت ہے فیصلہ دل کا
سلسلہ چھڑ گیا جب یاسؔ کے افسانے کا — شمع گل ہو گئی دل بجھ گیا پروانے کا
تڑپ کر آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے آخر — تلاشِ یار میں جب کوئی کارواں نکلا
خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا — خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
تمہارے دم سے سلامت ہیں ولولے دل کے — سزا کے بعد سزا کو ابھارنے والے
خضرِ منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں — میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے
سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں — سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

ایک مثلث کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

ناخدائے کم ہمت ہاتھ پاؤں مار آیا — تہہ کی کیا خبر لاتا حوصلہ بھی ہار آیا
پار اتارنا کیسا بادِ سر اتار آیا

کشتیٔ حیات اپنی ہو رہی تھی دھار پر — سنگدل تماشائی ہنستے تھے کنارے پر
دل وہی شکستہ دل پھر ہمارے کام آیا

رباعی ملاحظہ ہو ؎ (۱) دنیا سے الگ جا کے کہیں سر پھوڑو
یا جیتے جی ہی مردوں سے ناتا جوڑو
کیوں ٹھوکریں کھانے کو پڑے ہو بیکار
بڑھنا ہے بڑھو نہیں تو رستہ چھوڑو

زیبؔ غوری

جاگ اے غمِ دل نالۂ ہجراں کی گھڑی ہے
اک سازِ شکستہ کی طرح رات پڑی ہے

اے رہروِ غم بادِ تمنا بھی ہٹا دے
جانا بھی بہت دور ہے منزل بھی کڑی ہے

کل تک جو بہت دور تھی مجھ سے وہی دنیا
اک اشک کی صورت مرے دامن میں پڑی ہے

اپنے سے گذر پاؤں تو اُس تک ہو رسائی
میں ہوں کہ کوئی راہ میں دیوار کھڑی ہے

یہ شمع امید آہ کوئی دم کی ہے مہماں
ظلمت کی نظر تکتی ہوئی لو پہ گڑی ہے

اے گریہ کوئی باغ امید اور لگا دے
کچھ خاک ابھی تک مرے دامن میں پڑی ہے

پھر سے تری ہر یاد سلگ اٹھی ہے دل میں
جانسوز شرارے ہیں کہ ساون کی جھڑی ہے

یہ زیست بھی صد حسرت و اُمید کے باوصف
اک شب ہے جو کب سے یونہی بے نور پڑی ہے

کچھ ذکر نہ کر صبح تمنا کے سوا دوست
یہ رات مرے غم سے ترے غم سے بڑی ہے

کچھ کشمکشِ زیست کا بھی لطف اٹھا لے
مرنے کو تو اے زیبؔ بڑی عمر پڑی ہے

ساحلؔ مانکپوری

الفت کی رہگزار ہے تنہا نہ جائیو
ہر ہر قدم پہ خار ہے تنہا نہ جائیو

اہلِ چمن ہیں مست نسیمِ بہار سے
گلشن جنوں شعار ہے تنہا نہ جائیو

اے دوست ہوشیار کہ کوئے رقیب کا
ہر ذرّہ فتنہ کار ہے تنہا نہ جائیو

نکلا تو ڈھونڈنے کو ہے تو حسنِ زندگی
یہ سخت رہگزار ہے تنہا نہ جائیو

ساحلؔ ہیں راہزن بھی گزرگاہِ زیست میں
یہ راہ پُرغبار ہے تنہا نہ جائیو

غلام مرتضیٰ راہی (جی۔ایم۔راہی)

قدرت کے کارناموں کو دہرا رہا ہوں میں
تا حدِ ممکنات نظر آ رہا ہوں میں

دل کو ہر اعتبار سے سمجھا رہا ہوں میں
اپنے کیے کی آپ سزا پا رہا ہوں میں

اپنی حقیقتوں کی طرف دیکھ دیکھ کر
آئینۂ خیال میں شرما رہا ہوں میں

جزِ خواب کچھ نہیں ہوں مگر کچھ تو ہوں ضرور
خوابیدہ کائنات کو چونکا رہا ہوں میں

اوروں کی طرح مجھ کو بھی ہے زندگی عزیز
دل کو ترے خیال سے بہلا رہا ہوں میں

خود اپنی وسعتوں سے ابھی بے نیاز ہوں
کوتاہیٔ نظر کی قسم کھا رہا ہوں میں

صدیوں کی راہ سے مجھے آنا پڑا یہاں
صدیوں کی راہ پھر سے جدھر جا رہا ہوں میں

کم ہو رہا ہے جسم کا سرمایۂ نفس
راہی قدم قدم پہ لٹا جا رہا ہوں میں

شاہد ماہلی

ساغر تھا، چاندنی تھی، جوانی تھی، رات تھی
تجھ بن بجھی بجھی سی مگر کائنات تھی

تیرِ نگاہ، درد کے خنجر، نوائے غم
ان حادثوں کی راہ میں تنہا حیات تھی

غم خانۂ حیات درخشاں کیے ہوئے
تاروں کی انجمن شبِ ہجراں کے ساتھ تھی

شکوہ ہم اُن سے تنگیٔ داماں کا کیا کریں
خود ہی کچھ جو لیتے تو کیا خوب بات تھی

دربارِ کردگار سے شاہد کو کیا ملا
اک تلخ زندگی تھی سو وہ بے ثبات تھی

شجاع خاور

دوا کو درد کہتا ہوں، خزاں فصلِ بہاراں کو
کوئی سمجھا بھی اب تک میرے دل کے سوزِ پنہاں کو
نشانِ بے بسی بھی ہے یہ تو ہیں جنوں بھی ہے
کیا جائے جو خود ہی چاک اپنے جیب و داماں کو
مری قسمت کہ آہِ سرد اسی دم لب پہ آتی ہے
ذرا حرکت ہوا کرتی ہے جس دم نبضِ امکاں کو
نگاہِ کیف دستی! کوئی ساغر کوئی پیمانہ
نشاط و تازگی دیدے جو احساسِ پریشاں کو
بہ ایں صورت جہاں میں عین ممکن ہے کہ کچھ ہو جائے
شکیبائی نہیں ملتی مری فکرِ پریشاں کو
متاعِ ہوش تو ہر جلوہ اُن کا لوٹ لیتا ہے
مگر وہ جلوہ جو لوٹے متاعِ درد و حرماں کو
چمن میں آکے خونِ گل کریں کیا اس لیئے خاور
خراجِ خوں دیا تھا ہم نے ہر خارِ بیاباں کو

صلاح الدین نیّر

کس کے ہونٹ مہکے ہیں کس نے زلف لہرادی
اس قدر نہ تھی پہلے شہرِ دل میں آبادی
درد و غم کی راہوں سے کتنے قافلے گذرے
پھر بھی کتنی ویراں ہے شاہراہِ آزادی
کون سننے والا ہے کس سے حالِ دل کہیئے
زندگی کا ہر لمحہ بن گیا ہے فریادی
رہروانِ الفت کی ایک ہی روش ہوگی
فرشِ گل کی سرحد کا خونِ دل کی ہو وادی
آپ کے لیئے بھی ہم مسکرا نہیں سکتے
زخم سہتے سہتے ہم اتنے ہوگئے عادی
بھیگی بھیگی پلکیں ہیں محوِ گفتگو کب سے
ہنستے ہنستے ہونٹوں نے چھین لی ہے آزادی
اس کے درد کو سمجھیں آؤ نیّرِ تاباں!
آج بھی اکیلی ہے حسرتوں کی شہزادی

شبیب رضوی

مرے ندیم مری داستاں ادھوری ہے — کہ تیری مستیٔ گفتار لاشعوری ہے
غمِ حیات سے ملنا تو کوئی بات نہیں — حیاتِ غم کا تعارف بہت ضروری ہے
تجھے خیال ہی اتنا قریب کیوں آیا — مجھے یہ فکر ابھی اور کتنی دوری ہے
جو بات تجھ سے کہوں وہ بلا ضرورت ہے — جو بات کہہ نہ سکوں وہ بہت ضروری ہے
جسے گزار چکا وہ تو خیر یاد نہیں — جسے گزاروں گا وہ دور بھی عبوری ہے
سبک خرام ہے اشکوں میں شوق کا عالم
یہ تیرا ضبط ہے یا میری ناصبوری ہے

نقد و نظر

محمد اکبرالدین صدیقی

کلیات آفریں لاہوری

فقیر اللہ آفریں لاہوری۔ انتشارات پنجابی ادبی اکادمی سائز ۶×۹
صفحات ۶۲۳ قیمت پندرہ روپے۔ پنجابی ادبی اکیڈمی۔ ۱۔ کچہری روڈ لاہور۔

شاہ آفریں اپنے عہد کے مشہور شعرا میں ہیں اور استاد سخن سمجھے جاتے ہیں معاصرین میں خان آرزو اور عبدالحکیم حاکم سیالکوٹی کے علاوہ مرزا عبدالقادر بیدل کا دور آخر ہے اور غلام علی آزاد بلگرامی کا بھی عنوان شباب ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:۔

"فقیر وقتے کہ از ہند بجانب سندھ رفت بیست و نہم محرم سنہ ثلث و اربعین و مائۃ والف در لاہور با شاہ آفریں ملاقات کرد و نکہت ملقش دماغ را بشگفتگی آورد و در آں ایام قصیدہ ہیر رانجھا نظم می کرد" سندھ سے واپسی میں بھی آزاد نے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ پنجابی ادبی اکیڈیمی نے آفریں کا دیوان شایع کر کے بلند پایہ کلام کو محفوظ کر لیا ہے۔ اگر تذکروں کے اشعار کو بھی جو دیوان میں شامل نہیں ہیں جگہ مل جاتی تو بہتر ہوتا۔ مثلاً نتائج الافکار کی غزل کلیات میں نہیں ہے ؎

از تپ غم تا کشیدم آتش افشاں نالہ　　　　بر لب اکرم شب تاب است ہر تبخالہ

کتب خانہ آصفیہ میں آفریں کے دیوان کا ایک مخطوطہ ہے یہ جس غزل سے شروع ہوتا ہے اس کا مطلع ہے ؎

دل قبلہ و نیاز نماز دوام ما　　　　گرداندن رخ است ز دنیا سلام ما

اس کے صرف ۵۰ ورق ہیں۔ دیوان ۹۸ صفحات پر ہے اور ہر صفحہ میں ۵ کالم ہیں اس کی سائز ۸×۵ ہے۔ یہ آفریں کی زندگی میں لکھا گیا ہے اور آفریں کی رحلت اس سے انیس سال بعد واقع ہوئی اس کا ترقیمہ ہے "دیوان آفریں لاہوری بخط عبدالوہاب بتاریخ بست و نہم شہر ذیحجہ سنہ ہجری ۱۱۳۵ یکہزار و یک صد و سی و پنج در عہد بادشاہ محمد شاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہ سنہ جلوس پنج روز پنجشنبہ۔

اس نسخہ کی نقل حاصل کر کے مطابقت کی جاتی تو اس سے انیس سال قبل کی کہی ہوئی غزلوں کی نشان دہی ہو جاتی تاہم پنجابی ادبی اکیڈیمی کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اس نے ایک ایسے شاعر کے کلام کو منظر عام پر لایا جو اپنے دور میں بلند پایہ استاد رہ چکا تھا۔ ابتدا غزلوں کی فہرست ردیف کے ساتھ ساتھ بلحاظ ابتدائی حروف تہجی دے کر بہت زیادہ سہولت فراہم کر دی گئی ہے۔ اس کی کتابت ٹائپ میں ہے اور نہایت عمدہ کاغذ پر ہے۔ ضخیم کتابیں مجلد ہوں تو ان کی نفاست بڑھتی اور زندگی دراز ہوتی ہے۔

سالنامہ پیام تعلیم

جناب محمد حسین حسان صاحب ایڈیٹر پیام تعلیم نے اس سال پیام تعلیم کا جو سالنامہ شایع کیا ہے وہ کئی حیثیتوں سے پچھلے سالناموں پر سبقت لے گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی سائز ۲۰×۲۶ کی بجائے ۸/۱ کراؤن کر دی گئی۔ دوسرے اس کا

سرورق ہے جو بیحد دلکش ہے اندرونی خوبیوں میں لکھنے والوں کی ایک ایسی صف ہے جنھوں نے بچوں کیلئے لکھتے لکھتے عمر گذاری ہے جناب سید ابو تمیم صاحب فرید آبادی۔ جناب عبدالسلام قدوائی جناب مقبول احمد سیوہاروی۔ جناب سہیل عظیم آبادی محترمہ صالحہ مجیب جناب غلام ربانی جناب حرمت الاکرام۔ جناب شفیع الدین نیر صاحب اور بہت سے حضرات اسی کہکشاں کے درخشاں ستارے ہیں۔ اسی طرح نوجوانوں کی بھی ایک ایسی صف ہے جو آہستہ آہستہ ادبی دنیا میں اپنا مقام پیدا کر رہی ہے سائنسی موضوع پر لکھنے والوں کی ہمارے ادب میں بہت کمی ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کیلئے سائنسی ادب کا تصور صرف پیام تعلیم ہی کے پاس باقی رہا ہے اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں اس لئے زیادہ مضامین سائنسی موضوع پر ہوں تاکہ بچے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ ایسے شاندار سالنامے کی اشاعت پر ہم پیام تعلیم کے ارباب کار کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں اور متوقع ہیں کہ سے "نقش ثانی بہتر کشد ز اول" پر کاربند رہیں گے۔

گل صحرا طالب بے پوری ۱۸۔ ہیٹنگز روڈ الہ آباد پلہ کراؤن صفحات ۱۰۰ مجلد مع گرد پوش قیمت دو روپے۔

گل صحرا طالب بے پوری کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ طالب صاحب بے پوری ہیں لیکن قادر الکلام ہیں۔ اور جب کچھ اپنے بارے میں پڑھیے تو پتہ چلے گا کہ انھوں نے اپنی تربیت آپ کرنے میں بڑی خوش سلیقگی اور شائستگی سے کام لیا ہے غزلوں میں تغزل کی پوری شان ہے اور نظموں میں درد اثر کی فراوانی کلام کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور اقبال سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں ڈوب کر کہتے ہیں۔ کلام میں نغمگی بھی ہے اور کیف بھی چند شعر ملاحظہ ہوں۔

خود میری آنکھ نم نہیں جب اپنے حال پر — پھر میرے بخت خفتہ پہ آنسو بہائے کون
ترا جلوہ جس کی نظر میں سمائے — کسی کی طرف پھر وہ کیا آنکھ اٹھائے
نہ جانے یہ افتاد کیا رنگ لائے — مجھے دیکھ کر آج وہ مسکرائے۔
کچھ یوں مٹا رہی ہے مجھے گردش فلک — دنیا کو جیسے میری ضرورت نہیں رہی
دامن تار تار ہے اور ہم — کچھ نہ پوچھو بہار کا عالم
گفتنی ہو تو کوئی بتلائے — دل بے اختیار کا عالم
کیسا اندھیر ہے ساقی یہ تری محفل میں — کسی آئین کا پابند نہیں ہے کوئی
ہزار بت شکن آئے مگر نہ توڑ سکے — غرور سب سے بڑا سومنات ہے شاید
اللہ رے جنوں میں بھی یہ پاس وضع عشق — سرزد نہ ہو سکی کوئی دیوانہ پن کی بات
ہم جہاں ہیں وہاں کا حال یہ ہے — آدمی لاکھ اور انساں چند

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا — جلد — شمارہ

۱۹۳۸ء — ۳۰ — ۴

اپریل ۱۹۶۸ء

ماھنامہ
سب رس

نگران
پروفیسر سید علی اکبر
ایم اے (کینٹب)

مجلس مشاورت
میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ
ڈاکٹر غلام عمر خاں

معتمد
محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم — منتظم
محمد جلال الدین — وقار خلیل

زرسالانہ چھ روپے — غیرممالک سے دس روپیہ — ششماہی تین روپے
فی پرچہ پچاس پیسے — نمونے کے پرچہ کیلئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ
آنا ضروری ہے

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

پیش کردہ شمارہ میں پہلا مضمون حضرت ترک علی شاہ قلندر ترکی پران کے ایک عزیز شاگرد سید مراد علی صاحب طالع کا ہے۔ ترکی حیدرآباد میں بڑی شہرت کے حامل تھے اردو اور فارسی شاعری پر انھیں عبور حاصل تھا لیکن ان کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے۔ تمکین کاظمی مرحوم نے ایک آدھ مضمون لکھا یا ضمناً تذکرہ کیا ہے۔ ہم ممنون ہیں کہ جناب ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی اور راقم الحروف کی درخواست پر طالع صاحب نے یہ مضمون قلمبند کر کے عنایت کیا۔

ڈاکٹر چراغ علی صاحب نے دکنی مرثیہ کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ راقم الحروف نے حضرت جانم کا وہ مرثیہ پیش کر دیا ہے جس سے حضرت میراں جی شمس العشاق کے سنین ولادت و وفات کا تعین ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں عرصہ دراز سے جو بحث چلی آرہی ہے وہ اختتام کو پہنچی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ایک حسین اور شاندار کتاب نہرو نامہ پر تبصرہ کیا ہے۔ طیب انصاری صاحب نے ادب کو عناصر خمسکی دین پر اظہار خیال کیا ہے۔ حصہ نظم بھی گراں قدر ہے اور یقیناً قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

۲۴ مارچ ۱۹۷۶ء کو ایوان اردو میں دہلی کے مشہور شاعر جناب گلزار دہلوی کا جو حضرت زار دہلوی کے صاحبزادے اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی کے فیض یافتہ ہیں خیر مقدم کیا گیا۔ ایوان اردو کا میوزیم اور کتب خانہ دیکھنے کے بعد ایک مختصر سی محفل شعر منعقد ہوئی۔ مہمان شاعر نے اپنا کلام سنا کر حاضرین کو محظوظ کیا چار قطعے یہاں پیش کیے جاتے ہیں

مضموں ہیں گہر فکر جواں ہے میری
کوثر میں دھلی طرز بیاں ہے میری
دلی جسے کہتے ہیں وطن ہے میرا
اردو جسے کہتے ہیں زباں ہے میری

مٹتی ہوئی دلی کا نشاں ہیں ہم لوگ
ڈھونڈو گے کوئی دن میں کہاں ہیں ہم لوگ
جلتی ہوئی شمعوں کے سحر کے آنسو
بجھتی ہوئی لکڑی کا دھواں ہیں ہم لوگ

ساحر کی زباں زور کی بولی میری
سائل نے سکھایا ہے ادب کا اسلوب
کیفی سے تلمذ کا شرف رکھتا ہوں
اردو کے سوا کچھ نہیں مجھ کو مطلوب

میر و مرزا ذوق و مومن نے جسے بخشی جلا
وہ زباں نواب مرزا داغ کی رکھتا ہوں میں
آٹھ صدیوں تک جسے پالا عوام الناس نے
فخر ہے مجھ کو زبان خسروی رکھتا ہوں میں

آخر میں ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات کے نتائج شریک ہیں۔ آئندہ امتحانات جون کے پہلے ہفتے میں منعقد ہونگے۔

سید مراد علی طالع

امیر الشعراء حضرت ترکی قلندرؒ نورمحلی

نام ونسب اور وطن غلام محمد نام' غلامی شاہ اور ترک علیشاہ مرشد کے دیئے ہوئے لقب' امیر الشعراء خطاب اور ترکی تخلص تھا۔

آپ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے فردوسی طوسی تک پہنچتا ہے۔ آپ کے دادا آبا و اجداد کی سکونت شہر ہرات میں تھی ۱۷۳۹ء میں بادشاہ ایران نادر شاہ' ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو وہ بھی شاہی فوج کیساتھ ہرات سے چل کر لاہور میں آکر ٹھیر گئے پھر ان کے صاحبزادے حضرت باج خان" (والد حضرت ترکی) سردار رنجیت سنگھ حاکم پنجاب (۱۷۹۹ء تا ۱۸۳۹ء) کے عہد میں لاہور سے منتقل ہو کر شہر نورمحل تشریف لائے اور ہمیشہ کے لیئے یہیں بس گئے۔ حضرت باج خاں' سات زبانوں کے جید عالم اور ہفت قلم کے ماہر خطاط تھے۔ نورمحل ہی میں استاذی حضرت مولانا ترکی قلندر رحمتہ اللہ علیہ کی ولادت ہوئی۔

پیدائش حضرت ترکی کی والدۂ محترمہ سردار نور محمد ہراتی کی صاحبزادی تھیں جن کی زبان فارسی تھی۔ البتہ بعد میں وہ نورمحل کی سکونت کی وجہ سے کچھ کچھ پنجابی زبان سے واقف ہوگئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ترکی کی مادری زبان فارسی تھی۔ جن دنوں میں محترمہ حاملہ تھیں اس وقت کا یہ عجیب وغریب واقعہ ہے کہ ایک روز حسبِ عادت سحر کو نماز فجر کے لیئے اٹھیں اور وضو کر کے نماز سے فراغت پا کر مصروف دعا تھیں کہ کسی نے گھر کی متصلہ مسجد سے یہ شعر گنگنایا

طفل می گرید چو راہِ خانہ را گم میکند　　　چوں نگریم منکہ صاحب خانہ را گم کردہ ام

اس شعر کے سنتے ہی محترمہ پر آتنی رقت طاری ہوئی اور اس قدر روئیں کہ پورا دامن آنسوؤں سے بھیگ گیا اسی حالت میں وہ سجدہ میں گر کر یہ دعا مانگیں: ۔ اے خالق ہژدہ ہزار عالم ایں جنین کہ در شکم من است اگر طفل است .... شاعرے باشد کہ نام او باآفاق مشہور گردد و عمرش دراز باشد و اگر دختر است تو مالکی چنانچہ اس واقعہ کے چند ہی روز بعد ۱۲۴۲ھ میں حضرت ترکی پیدا ہوئے۔

والدہ محترمہ کی وفات اور شاعری کا آغاز ایک مرتبہ آپ کے والد بزرگوار حضرت باج خاں رحمتہ اللہ علیہ سخت بیمار ہوگئے۔ بیماری نے اس قدر زور پکڑا کہ زندگی کی امید قطعاً باقی نہیں رہی اور طبیبوں نے بھی متفقہ طور پر مایوسی ظاہر کر دی جب اس کا علم آپکی والدہ محترمہ کو ہوا تو اس نیک بخت بی بی نے فوراً وضو کر کے پہلے نفل نماز ادا کی اس کے بعد قرآن پاک اپنے سر پہ رکھکر سات دفعہ شوہر کے اطراف چکر لگائے اور

پھر رو بہ قبلہ ہوکر حضورِ قلب کے ساتھ جناب باری میں یہ دعا مانگی۔

"یا حیّ یا قیوم۔ اگر عمر شوہر من باقی نماندہ من ہمہ عمر خود را با شوہر خود سپردم"

خدا جانے وہ کیسی گھڑی تھی اور ان الفاظ میں کیا اثر تھا کہ اسی دن سے وہ نیک بخت بی بی بسترِ مرگ پر فراش ہوکر سات دن کی مختصر علالت کے بعد دنیا سے رخصت ہوگئیں اور حضرت باج خاںؒ صحت یاب ہوگئے اور ۱۰۰ سال سے زیادہ کی عمر پاکر فوت ہوئے۔ اس وقت حضرت ترکی کی عمر بمشکل پندرہ سولہ برس کی تھی۔

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ آپ کے والد بزرگوار سات زبانوں کے زبردست عالم اور فن خطاطی میں ہفت قلم استاد مشہور تھے اس کے علاوہ پیچیدہ مسائل اور دقیق اشعار کے معنی و مفہوم اور معمے حل کرنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ دور دراز مقامات سے اکثر لوگ آکر آپ سے فیض حاصل کرتے تھے لیکن شاعری انھیں پسند نہ تھی اس لئے وہ اپنے صاحبزادے حضرت ترکی کو بھی اس خیال سے باز رکھنے کی ہر دم کوشش کرتے تھے لیکن قدرت نے تو ازل سے آپ کو شاعر بنا کر پیدا کیا تھا جیسا منہ سے نکلتی وہ مقفی مسجع اور میزانِ شاعری میں تلی ہوتی تھی یہی وجہ تھی کہ سنِ شعور کو پہنچتے ہی قوم محل کے عوام نے آپکو صائب ثانی کا خطاب دیا اور آئندہ اسی نام سے آپ پکارے جانے لگے۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ لاہور کے ایک شاعر جو خود کو شاہ آفرین استاد کی اولاد سے ظاہر کرتے تھے آپ کے والد بزرگوار سے ملاقات کیلئے مکان پر آئے اور کہا کہ ایک مہینہ قبل میں نے یہ مصرعہ کہا تھا کہ "شمیم نظر نجم زلف مشکفام تو بود" لیکن آج تک مصرعہ ثانی حسب دلخواہ نہ ہو سکا۔ یہ سن کر آپ نے جواب دیا کہ :۔ مجھے تو شاعری سے کوئی دلبستگی نہیں البتہ یہ سترہ سالہ لڑکا اس جنون میں مبتلا ہے۔ شاید وہ مصرعہ ثانی کہہ دے۔ اتنا کہہ کر والد بزرگوار نے آپ کو آواز دی۔ آواز کے ساتھ ہی آپ فوراً حاضر خدمت ہوگئے۔ والد بزرگوار نے ارشاد فرمایا کہ :۔ "اگر حسبِ منشائے ایں مہمان مصرعہ ثانی پیوند کنی از امروز ترا اجازت شعر گفتن خواہم داد" والد بزرگوار کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہی خوش ہوکر آپ فوراً مہمان کی طرف مخاطب ہوکر کہنے لگے کہ فرمائیے وہ مصرعہ کیا ہے۔ مہمان نے مصرعۂ بالا کا اعادہ کیا تو آپ نے اسی مصرعہ کو مطلع بنا کر فی البدیہہ یہ ارشاد فرمایا کہ :۔

شمیم نظر نجم زلف مشکفام تو بود — اسیر طائر نظارہ ام بدام تو بود

سنتے ہی مہمان اور دوسرے حاضرین اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ والد بزرگوار نے بھی اس مصرعہ کو پسند کیا۔ ہر طرف سے صدائے تحسین و آفرین بلند ہوئی۔ معزز مہمان شاعر نے خوش ہوکر نہایت خلوص کیساتھ تمام حاضرین کے روبرو اپنا طبعزاد مصرعہ آپکو بخشدیا اسی دن سے والد بزرگوار نے آپ کو شعر گوئی کی اجازت دیدی اور اس واقعہ کے چار روز بعد ہی آپ کو حضرت گل محمد خاں ناطق مکرانی کی خدمت میں لیجا کر شاگردی میں دیدیا۔

شرف ارادت وبیعت آپ حضرت غوث علیشاہ قادری قلندر پانی پتی متوفی سنہ ۱۲۹۵ھ کے مرید تھے۔ حضرت پیر و مرشد قبلہ نے آپکو ابتدا میں غلامی شاہ کے نام سے مخاطب فرمایا تھا۔ اسی لئے جو اشعار آپ حضرت پیر و مرشد قبلہ کے سامنے فرماتے تھے حسن ادب سے ان میں غلامی تخلص استعمال ہوتا تھا ایک عرصے تک پیر و مرشد کی خدمت میں رہکر آپ نے روحانی فیض حاصل کیا روزانہ نماز تہجد کے وضو کیلئے پانی گرم کرکے دینے کی

خدمت آپ کے تفویض تھی۔ ایک دفعہ موسم سرما کا واقعہ ہے کہ :۔ حضرت پیر و مرشد نماز تہجد کے لئے اٹھے۔ مرید صادق نے پانی گرم کرکے دیا تو وضو کرکے نماز ادا کی اور اس کے بعد مصلی پر ہی بیٹھے ہوئے آپکو روبرو طلب کرکے بہت ہی شفقت کے ساتھ فرمایا کہ :۔ آج کا پانی خوب گرم تھا۔ مانگ کیا مانگتا ہے ؟ آپ نے ادباً عرض کیا کہ دو چیزیں مانگتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ میں حرام سے دور رہوں۔ اور دوسری یہ کہ میری کڑوی بات بھی شیریں پیدا ہوجائے۔ ان ہی دو کی مجھے آرزو اور جستجو ہے۔ پیر و مرشد نے ارشاد فرمایا کہ :۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے دونوں چیزیں عطا کیں۔ مرید کی درخواست اور پیر و مرشد کی بخشش کو حضرت ترکی نے اس طرح نظم کیا ہے۔

اولیں از حرام باشم دور　　　نکند نفسِ سرکشم مجبور
دیگر اے پیشوائے اہل یقین　　　سخنِ تلخ من شود شیریں
گفت بخشید حق ترا ہر دو　　　ایزدت کرد ایں عطا ہر دو

فن شاعری میں تلمذ　علم عروض و قافیہ اور اصلاح سخن میں آپکو فارسی زبان کے حسب ذیل چار اساتذۂ سخن سے شرف تلمذ حاصل تھا جو اپنے وقت کے امام فن تھے۔

۱۔ استاد اول حضرت گل محمد خاں ناطق مکرانی　　　۲۔ استاد دوم حضرت شہاب الدین واثق ہراتی

۳۔ استاد سوم حضرت رکن الدین مکمل آفور محلی :۔ موصوف اپنے وقت کے زبردست مفتی اور مظفر خاں بادشاہ ملتان کے عہد حکومت میں صدر الصدور کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے۔

۴۔ استاد چہارم حضرت امام بخش صہبائی دہلوی۔

ان حضرات کے علاوہ زبان ریختہ میں آپکو حضرت میر علی اوسط رشک لکھنوی سے شرف شاگردی حاصل تھا۔ غرض کہ تقریباً دس سال تک اساتذۂ کرام سے آپ نے فیض حاصل کیا اور اصلاح شعر و اسباق کتب درسی اور علم عروض و قافیہ میں کافی دستگاہ حاصل کرکے درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔

سیر و سیاحت　جب آپ کی عمر ۲۰ سال کی ہوئی تو سیر و سیاحت کا شوق پیدا ہوا اور اس شوق کی تکمیل میں آپ نے پورے بائیس سال صرف کردیئے مختلف بلاد اسلامیہ اور ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر کا آپ نے پیدل دورہ کیا بائیس سال کے طویل عرصے میں بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں، عالموں اور بزرگوں سے ملکر فیض حاصل کرنے اور دنیا کے عجائب و غرائب دیکھنے کا آپ کو اتفاق ہوا۔ چنانچہ آپ کے ایک عزیز شاگرد سید نواب جان تمنا بنارسی نے جو استاد کی محبت میں اپنے وطن بنارس کو خیرباد کہکر شہر حیدرآباد میں آکر مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے تھے آپ کے حالات زندگی پر مشتمل اردو زبان میں ایک کتاب موسومہ بہ مخزن ترکی ۱۳۱۲ھ میں لکھ کر شائع کی تھی جس میں ابتدائے سن بلوغ سے اشاعت کتاب تک حضرت ترکی کے مختصر سالانہ حالات زندگی اور سیر و سیاحت کا تفصیلی ذکر ہے۔ افسوس کہ فی الوقت یہ کتاب نایاب ہے۔

قوم اجنہ سے ملاقات

بائیس سالہ سفر کے دوران میں یوں تو آپ نے سینکڑوں عجائبات عالم دیکھے لیکن ان سب سے اولیٰ و افضل حضرت محمد اسماعیل حبشی جن کی ملاقات کا واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت ہی عجیب و غریب ہے۔ حسنِ اتفاق سے ایک مرتبہ شہر منگرول متصل سومنات میں آپکا گزر ہوا اور شہر کی جامع مسجد میں فروکش ہوگئے۔ اس مسجد کے ایک حجرہ میں مولوی اسمٰعیل جن بھی رہتے تھے وہ بڑے ہی جید عالم اور زبردست بزرگ تھے۔ مولوی اسماعیل جن کبھی بھیڑ کی صورت میں تو کبھی اژدھے کے روپ میں اور کبھی شیر کی شکل بن کر سامنے آتے تھے مگر یہ قلندر مشرب اللہ کا شیر بلا جھجک ان سے ہمکلام ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو حضرت ترکی مولوی اسماعیل جن کیساتھ محتاط طریقہ پر رہے لیکن بعد کو مولوی اسمٰعیل جن ان پر کچھ ایسے مہربان ہوگئے کہ حضرت ترکی اُن کے والہ و شیدا بن گئے اور بہت کچھ فیض ان سے حاصل کیا۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں:-

مولوی اسماعیل عالم متبحر بودند اگر راست راست احوال آنحضرت بقلم آرم مردم حمل برکذب خواہند کرد مگر اینقدر تاہم خواہم نوشت کہ مولوی اسماعیل از قوم اجنہ اندو در حجرۂ جامع مسجد منگرول کہ شہریست متصل سومنات برکنارۂ محیط اعظم با فقیر ملاقات شدہ وایں عاجز بسیار فیض باطنی از صحبت آنجناب برداشتہ و آنحضرت شیخ سعدی شیرازی را نیز دیدہ شیخ ہم دراں حجرہ چند روز قیام میداشت۔ دریں شعر مصرعہ اولیٰ از فکر ایں فقیر و مصرعہ ثانی از طبع والائے مولانا اسماعیل است۔

"دل زہم آغوشیٔ خوباں نگیرد تازگی؛ گل شود افسردہ در گردن حمائل چوں شود"

حضرت اسماعیل گاہ بہ شکل گوسپند و گاہ بہ شکل اسد و گاہ بصورت اژدھا متشکل می شدند داصل صورت آنجناب مانند اہل حبش بود و اہلیۂ حضرت را نیز دیدہ ام کہ ہرا قرزند می گفتند

(سخنوران چشم دیدہ)

خطاب امیر الشعراء

جب آپ چالیس برس کے ہوئے تو اس درجے پر پہنچ چکے تھے کہ شعرائے عجم و ہند آپکے اشعار سے سند لینے لگے۔ ملک اور بیرون ملک میں آپکا طوطی بول رہا تھا۔ دہلی اور لکھنو، میرٹھ اور بنارس، پنجاب، کابل، ایران اور اصفہان سے قصائد اور غزلیں اصلاح کیلیے آپ کے پاس آنے لگیں۔ غرضکہ سکونت دہلی کے زمانہ میں آپ دنیائے شاعری میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے اور اسی بنا پر لارڈ میو وائسرائے ہند (۱۸۶۹ء تا ۱۸۷۲ء) نے ایک دربار کے موقع پر آپکو طلب کر کے امیر الشعراء کے خطاب کا اعزاز بخشا۔ چنانچہ فخریہ طور پر فرماتے ہیں۔

منم منم کہ امیر سخن خطاب من است — منم منم کہ علم را بر آسماں دارم
منم کہ فیض گرفتم ز ناطق کراں — منم نسب کہ ز طوسی دریں جہاں دارم

آں گو رنر کہ میو نامش بود چوں حد آں بزم نظم سن بشنود
کرد با من خطاب میر سخن داند این قصہ را زمین و زمن (سراپا حیرت)

ہمعصر صاحبان فن قیام دہلی کے زمانے میں متعدد محفلوں اور مشاعروں میں آپ کو شریک ہونے کے مواقع ملے۔ اکثر موقعوں پر جیسا کہ صاحبان کمال کا قاعدہ رہا ہے ندرتِ کلام اور فن دانی کے اعتبار سے بعض شعراء سے نوک جھونک بھی چلتی رہی۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:۔

دہلی میں فنِ شعر میں برسوں مری ترکی یاران سخنور سے رہی جنگ برابر

لہٰذا توضیحاً صرف دو چار مخصوص شعرائے کرام کے نام درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ مظفر علی خاں اسیرؔ ۲۔ اسد اللہ خاں غالبؔ ۳۔ حکیم مومن خاں مومنؔ ۴۔ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہؔ

اور حسبِ ذیل معاصرین کو حضرت ترکیؔ سے خاص تعلق خاطر ہی نہیں بلکہ گہری عقیدت تھی۔

(۱)۔ ضامن علی جلالؔ لکھنوی (۲) شوقؔ نیموی (۳) امیر اللہ تسلیمؔ (۴) انورؔ دہلوی (۵) غنیؔ رامپوری (۶) شمشادؔ لکھنوی (۷) کمال لکھنوی خلفِ جلال لکھنوی

تصانیف فارسی اور اردو زبان میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ فارسی کتابوں کی نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) دیوان گلشن معنی۔ اس دیوان کو آپ نے (۳۰) سال کی عمر میں بزمانۂ سیر و سیاحت ترتیب دیا تھا۔

۲۔ فرخ نامہ معروف بہ رامائن پارسی:۔ یہ کتاب جو چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے مہاراجہ ہیرا سنگھ والی ریاست نابھہ (ملک پنجاب) کی فرمائش پر لکھی گئی اور اس کے صلہ میں والیٔ اسٹیٹ نے آپ کے نام معقول وظیفہ اور منصب منظور کیا تھا جو زندگی بھر ملتا رہا۔ یہ کتاب بھی بزمانۂ سیر و سیاحت لکھی گئی تھی۔

۳۔ ساقی نامہ ۴۔ مثنوی گلزار محبت ۵۔ رسالۂ بدر حسین نظم

۶۔ مثنوی صوت سرمد:۔ یہ کتاب شہر حیدرآباد کے کسی مطبع سے ۱۳۲۳ھ میں شائع ہوئی تھی۔

۷۔ سرور الناظرین۔ نثر۔

۸۔ گلبانگ ترکی نثر:۔ یہ کتاب مختلف ابواب پر مشتمل ہے میرے پاس اس کا ایک ناقص الاول و آخر نسخہ ہے جس کے ابتدائی (۸) صفحات اور آخر کے چند اوراق تلف ہو گئے ہیں اس لئے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کب اور کہاں چھپی ہے البتہ کتابت و طباعت کے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شمس الاسلام پریس حیدرآباد میں مثنوی سرخاب عشق کے قریبی زمانے میں چھپی ہوگی۔ نمونہ درج ذیل ہے۔

شخصے ... بود کہ دیر وقت در مسجد وقت پور رفتہ بود ہر پنج کس باہم تنازع میکردند۔ یکے ترا سنی میگفت دیگرے شیعہ ... وہابی تو چیا ... مہدوی ... قادیانی۔ آخر بندۂ خدا مذہب تو چیست؟

گفتم مذہب من اینست کہ جہد اشرک نمی کنم۔ (گلبانگ اوّل)

شخصے از من پرسید کہ کدام وقت بر ابلیس لعین خوشترین و صعب ترین میگزرد۔ گفتم خوشترین آنوقت کہ زاہد دیرینہ از اخوالیش بمناہی مشغول شود و صعب ترین آنزماں کہ خداوند تعالیٰ بندۂ خود را رویائے صادقہ بنماید۔ (گلبانگ سوم)

۹- دیوان سرمایہ پیری :- یہ دیوان عبدالحی مالک مطبع عثمان پریس کے اہتمام سے ۱۳۳۱ھ میں بلدۂ حیدرآباد سے شائع ہوا۔ کتاب رائل سائز کے (۱۰۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت طباعت دیدہ زیب، کاغذ سفید اور چکنا۔ آخر کے (۲۰) صفحات قصائد و قطعات اور رباعیات کے ہیں۔ اس دیوان کی ابتدا حسب ذیل غزل سے ہوئی ہے۔ نمونتاً صرف دو شعر مطلع اور مقطع درج ذیل ہیں۔

زداغ سینہ پر خوں بہارے کردہ ام پیدا پے سیر تو اے گل لالہ زارے کردہ ام پیدا

بہ سلطان امام الدین نباشد حاجتم ترکیؔ چو محبوب علی خاں شہریارے کردہ ام پیدا

غزل کے آخری شعر میں دو سلاطین کے نام لئے گئے ہیں پہلے مصرعہ میں شاہ کشمیر اور دوسرے مصرعہ میں شہریار دکن آصفجاہ سادس کی طرف اشارہ ہے۔

۱۰- مثنوی طول امل۔

۱۱- مثنوی شکر آب :- یہ مثنوی جو (۵۰) ابیات پر مشتمل ہے۔ حیدرآباد میں ۱۳۲۱ھ میں لکھی گئی تھی۔

۱۲- مثنوی ناز و نیاز :- یہ مثنوی (۸۵) ابیات پر مشتمل ہے اور حیدرآباد میں لکھی گئی تھی۔

مذکورہ بالا تینوں مثنویاں دیوان سرمایۂ پیری میں شامل ہیں۔

۱۳- تذکرہ سخنوران چشم دیدہ :- فارسی نثر کی یہ کتاب مطبع شمس الاسلام حیدرآباد سے ۱۳۲۶ھ میں سید رحیم الدین کے اہتمام سے رائل سائز کے (۲۴۴) صفحات پر شائع ہوئی تھی۔ کتابت طباعت نہایت نفیس، کاغذ عمدہ اور چکنا ہے۔ حضرت ترکیؔ نے اس میں اپنے شاگردوں اور دیکھے بھالے (۲۳۰) شاعروں کا تذکرہ لکھا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہر شاعر کے کلام کے ایک ایک دو دو شعر بھی نمونتاً دیدیئے ہیں۔ آغاز تذکرہ میں حمد و نعت اور مدحت سلطان دکن اعلیحضرت میر عثمان علی خاں آصفجاہ سابع کے بعد اصل مضمون شروع کیا گیا ہے۔

۱۴- مثنوی ترانۂ حق :- یہ مثنوی جو (۱۲۰) ابیات پر مشتمل ہے اور حیدرآباد ہی میں لکھی گئی تھی، تذکرہ سخنوران کی اشاعت کے موقع پر اسکو بھی کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کر دیا گیا ہے۔

۱۵- ارشاد قلندر :- فارسی نثر کی یہ کتاب تعبیرات خواب سے متعلق ہے اور فی الوقت نایاب ہے۔

۱۶- مثنوی سرخاب عشق :- یہ مثنوی اصل میں داستان حسن و عشق سہنی (حسینۂ گجرات) اور مہوت مرزا۔ ملقب بہ

یہی وائی زامیرزادہ بلخ) کا فارسی ترجمہ ہے جس کو قیس ادیب محمد فضل شاہ نے پنجابی زبان میں نظم کیا تھا اس میں جملہ (۱۲۲۵) ابیات ہیں۔ یہ مثنوی حیدرآباد ہی میں لکھی گئی اور مطبع شمس الاسلام سے باہتمام سید رحیم الدین ۱۳۳۳ھ میں شائع ہوئی۔ کتاب رائل سائز کے (۵۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ دبیز اور چکنا۔ مثنوی کا آغاز حمد و نعت، مناجات اور منقبت پیر و مرشد سے کیا گیا ہے۔ حضرت استاذی ترکی مرحوم سے اس مثنوی کے ابتدائی چند صفحات کے درس لینے کا راقم الحروف فقیر طالع کو شرف حاصل رہا ہے۔

وقت کے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھ کر بقول ع "گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے" زبان اردو کی خدمت کی طرف آپ متوجہ ہوگئے اور اس سلسلے میں آپ نے جو کتابیں لکھی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ مثنوی گلزار شہادت　　۲۔ مثنوی جلال اختر　　(۳) مثنوی سعد و جمیلہ　　۴۔ دیوان شباب

۵۔ تبسم کدہ　　۶۔ تمسخر کدہ　　۷۔ دیوان سرمایۂ حیات

مذکورہ بالا اردو اور فارسی تمام تصانیف میں صرف دو کتابیں گلزار محبت اور گلزار شہادت ایسی ہیں جو طبع نہ ہوسکیں۔ باقی کتب آپکی زندگی میں ہی شائع ہو کر منظر عام پر آچکی تھیں لیکن فی الوقت ان میں سے اکثر نایاب ہیں۔

دیوان سرمایۂ حیات استاذی حضرت ترکی نور محلی کا اردو دیوان ہے جو مطبع شمس الاسلام حیدرآباد میں سید رحیم الدین مالک و مہتمم مطبع کے اہتمام سے ۱۳۳۳ھ میں رائل سائز کے (۳۰۰) صفحات پر چھپا اس کے آخری (۸) صفحات تضمین اور قطعات خمسہ اور نعت پر مشتمل ہیں۔ نمونتاً چند اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں تاکہ قارئین کو آپ کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوسکے۔

زندگی میں گر نہیں ہے قدر تو مرنے کے بعد　　بیش قیمت لعل سے میرا سخن ہوجائے گا۔

ائے مسیحی نہیں گر شاہِ عرب ختم رُسل　　کیوں نہ پیدا ہوا پھر کوئی پیمبر اب تک

قسمت میں جو لکھا ہے وہ ہوجائے آج ہی　　یارب یہ مجھکو مدۂ فردا نہیں قبول

اک روز رو لے بیٹھ کے رونا ہے جسقدر　　ہر روز کی بکا دلِ شیدا نہیں قبول

ہے مرے مدت سے سر پہ بار دنیائے دنی　　اب میں خود مزدور رہوں مزدور کی حاجت نہیں

مل گیا گلگشت کو باغ دکن ہے اب مجھے　　گلشن کشمیر اور لاہور کی حاجت نہیں

میں یہ پڑھتا ہوں وہ جب کرتے ہیں خوں　　ثُمَّ اَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُوْنَ

عہد کرکے کس لئے پھرتے ہو آپ　　ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ

کاش لیجائیں مجھے مقتل کو اس انداز سے　　طوق ہو زیب گلو اور دست و پا زنجیر میں

ہوں میں ترکی اب دکن میں ویسے ہی جیسے کہ تھے　　اصفہاں میں میرزا صائب غنی کشمیر میں

قسمت میں اگر ملکِ سلیماں بھی ہو ترکی　　لیکن بخدا حبِ وطن اور ہی کچھ ہے

ورود بشہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد:- آپکو اپنا وطن نور محل چھوڑے ہوئے (۲۵) سال سے زیادہ ہوگئے تھے اور

اس عرصے میں آپ کے والد بزرگوار کا انتقال بھی ہوچکا تھا۔ واقعۂ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی اب وہ نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔

بقول شیفتہ — دِلّی اب ہے تن بےجاں تن بےجاں کیا خاک — جان سے جاچکے جو لوگ تھے جانِ دہلی

مغلیہ عظمت و جبروت کا چراغ گل ہوچکا تھا۔ یہاں کی محفلیں اور صحبتیں دن بدن بے کیف اور سرد پڑتی جارہی تھیں عوام میں بغض و حسد کا مادہ ترقی کر رہا تھا جیسا کہ وہ فرماتے ہیں ؎

بکار و بار من ایزد چرا دہ زنگ نوشت — چرا بقسمتِ من جائے تکیہ سنگ نوشت

بقول حاسدِ بدخو اگر نسیم فائق — چرا امیر سخن والیٔ فرنگ نوشت

دید یعقوب نے زدردِ پسر — زانکہ من از غم پدر بنیم

روئے شاں گر ندیدہ ام دم مرگ — خاکِ شاں کاش یک نظر بینم

کے بود یارب کہ قبر باج خاں را بنگرم — گنبد آں مرقد گردوں نشاں را بنگرم !!

کاشکی روید بر تنِ من ہمچو مرغاں بال و پر — تا پرم چوں عندلیب آں گلستاں را بنگرم (رسالہ بیری)

غرضکہ ان تمام اسباب اور وجوہات کی بنا پر دہلی سے دل برداشتہ ہوکر آپ نے ہجرت اور دوبارہ سیر و سیاحت کا ارادہ کرلیا تھا لیکن ضعیفی اور مالی مشکلات نے رکاوٹیں پیدا کردیں اور آپکا ارادہ پورا نہ ہوسکا چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

قصد رفتن اگر پیادہ کنم — تاب دریا نہ اینقدر بینم

ورکنم رائے رفتن از رہ بحر — دیدہ را تر بفکر زر بینم

مغلیہ دورِ حکومت کے خاتمے کے بعد آصفجاہی سلاطین کی بے مثال علم پروری اور امرائے سلطنت کی ادب نوازی کی وجہ سے اس وقت پورے ہندوستان میں صرف شہر حیدرآباد ہی صاحبان علم و فن کے لیے مرکزی حیثیت کا مقام رکھتا تھا۔ اس لئے آپ بھی نواب جعفر حسین خاں مخاطب بہ صف انگن جنگ نواب تاڑبن کے اصرار پر ۱۸۸۶ء ۱۳۰۴ھ میں فرخندہ بنیاد بلدہ حیدرآباد تشریف لائے اور نواب موصوف کے مکان میں ہی مقیم ہوئے۔ نواب موصوف نے آپ کی بڑی قدر و منزلت کی شہر کے علماء اور شائقین شعرا اور عمائدین کو جمع کرکے آپکا تعارف کروایا اور سب سے پہلے خود نواب صاحب نے ایکہزار روپیہ نذرانہ پیش کرکے آپ سے شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ رفتہ رفتہ پورے شہر میں آپکی دھوم مچگئی اور صاحبان ذوق جوق در جوق آکر آپ سے فیض حاصل کرنے لگے۔

الطاف شاہانہ شہر حیدرآباد میں زمانۂ قدیم سے کوہ شریف مولا علی پر ہر سال ماہ رجب میں شاندار عرس ہوا کرتا ہے۔ عرس شریف میں شرکت کے لئے ازراہِ عقیدت اعلیحضرت میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس بنفس نفیس پابندی سے تشریف لیجایا کرتے تھے۔ حسن اتفاق سے ایکمرتبہ عرس میں حضرت ترکی سے ملاقات ہوگئی۔ آپ نے شہریارِ دکن کی مدح میں برجستہ چند دعائیہ اشعار فی البدیہہ سنائے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

زباں شناسے تو کیفیت دردل عالم کرد   چنانکہ درس الحمد مقتدی آمین

بادشاہ کو یہ شعر اتنا پسند آیا کہ اسی دن سے مدح گریاں میں آپکا شمار ہوا اور ماہانہ دو سو روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو زندگی بھر آپکو ملتا رہا۔ اس کے علاوہ سلطان امام الدین شاہ کشمیر کے دربار سے بھی آپکو بزمرہ دعاگریاں معقول مشاہرہ ملتا تھا۔ نیز ریاست نابھہ اور اسٹیٹ مہاراجہ کشن پرشاد وزیر اعظم حیدر آباد سے بھی تنخواہیں مقرر تھیں مگر جتنا آتا تھا اتنا خرچ کر دیتے تھے۔

حلیہ اور لباس

آپ نہایت سرخ و سفید اور تنومند تھے۔ چہرہ کتابی اور بلند پیشانی، ناک ستوان اور رخسار پرگوشت آنکھیں نرگسی اور چال مستانہ، سر بڑا اور ابرو کمانی، کان بڑے اور لو لٹکی ہوئی، منہ میں بتیسی پوری قائم اور زیر زنخدان، غبغب، آواز گرجدار اور چہرہ شاندار جسم گٹھیلا و سڈول اور سینہ چوڑا، مونچھیں باریک اور داڑھی خشخاشی سر میں زلفیں حنائی اور قد تقریباً ۶ فٹ متناسب الاعضا بحیثیت مجموعی آپ نہایت وجیہہ اور شکیل تھے۔ ہر چلتے کی نظر آپ پر پڑتی تھی۔

کانوں میں جھمکے اور ہاتھوں میں سبز چوڑیاں، سر پر ترکی ٹوپی اور آنکھ پر چشمہ، جسم پر بنیان اور باریک ململ کا سفید کرتہ۔ کرتہ کے اوپر صدری جس کے بٹن ہر وقت کھلے ہوئے اور اس میں جیبی گھڑی، پاؤں میں پنجابی وضع کا جوتہ اور شلوار، بائیں ہاتھ میں انگشتری پہنتے تھے۔ لباس گو معمولی اور سیدھا سادا ہوتا تھا لیکن صاف ستھرا اتنا کہ ہاتھ لگانے سے میل لگ جائے۔ پچانوے سال کی عمر پائی لیکن عصائے موسیٰ اور خر عیسیٰ کی حاجت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔

اخلاق و عادات

آپ نہایت متواضع اور منکسر المزاج، فقیر دوست اور قلندر صفات، خندہ اور خوش اوقات، سلیم الطبع اور مہمان نواز خدا ترس اور تہجد گزار، رحمدل اور سخی تھے۔ بچوں میں بچے اور بوڑھوں میں بوڑھے معلوم ہوتے اور ان سے اسی طرح کی گفتگو فرماتے تھے۔ ہر وقت ہشاش بشاش رہتے اور اپنے شاگردوں سے بالکل مساویانہ طور پر ملتے تھے۔ ظرافت اور مذاق کا پہلو بھی کافی نمایاں تھا۔ حقہ بہت شوق سے استعمال فرماتے تھے۔ حاضر دماغی اور قادر الکلامی کا یہ حال تھا کہ بیٹھے بیٹھے آنِ واحد میں غزل کی غزل پوری کہہ دیتے تھے۔ اصلاح سخن کے بارے میں کبھی کسی شاگرد سے غزل چھوڑ جانے کو آپ نے نہیں فرمایا بلکہ اسی وقت اصلاح دیدیا کرتے تھے۔ حتی الامکان کبھی کسی سائل کے سوال کو آپ نے رد نہیں کیا۔ اتفاق سے کبھی کوئی شاگرد بہت دنوں تک نظر نہ آئے تو دوسرے شاگرد سے اسکی کیفیت منگواتے یا خود اس کے گھر پہنچکر مزاج پرسی فرماتے تھے۔ دعوت کے نام پر انکار ہوتا تھا ہاں اگر کوئی شخص بلا علم و اطلاع اپنے ساتھ گھر لیجا کر کچھ کھانا کھلاوے تو شوق سے تناول فرماتے تھے۔ جیسا کہ وہ فرماتے ہیں۔ شعر

احباب لئے جاتے ہیں ترکی مجھے ورنہ   اس شوخ کے گھر میں مری دعوت تو نہیں ہے۔

عید المومنین یوم الجمعہ کے سچے عاشق تھے۔ ایک دن پہلے سے یعنی جمعرات سے گھر چھوڑ کر مسجد میں اعتکاف

بیٹھ جاتے تو جمعہ کی نماز پڑھ کر ہی گھر واپس ہوتے تھے۔ نماز جمعہ ہمیشہ گھر سے قریب مسجد بیرون لال دروازہ واقع اندرون احاطۂ درگاہ حضرت شاہ مخفی الحسینی چشتی رحمۃ اللہ علیہ میں ادا فرماتے تھے۔ بعض خوش اعتقاد شاگرد بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے اس مسجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ قاعدہ تھا کہ نماز پڑھ کر لوٹتے وقت آپ اپنے شاگردوں کو ساتھ لیکر مکان آتے اور سب کو ایک برتن پر بٹھا کر دوپہر کا کھانا کھلا کر رخصت کرتے تھے۔ راقم الحروف طالع پر جو اس وقت گیارہ سال کا تھا اور اپنے والد بزرگوار حضرت عالی کے ساتھ نماز جمعہ کو جایا آیا کرتا تھا خاص نظر شفقت رکھتے تھے اور بعد فراغ طعام واپسی کے وقت ہر جمعہ کو ایک روپیہ بطور میوہ خوری و خرچ سواری راقم الحروف کو عنایت ہوتا تھا۔ یہ واقعہ ۱۳۳۵ء کا ہے اور اسی زمانے میں حضرت ترکی مجھے مثنوی سرخاب عشق کا درس دیا کرتے تھے۔

واقعہ (۱) حضرت کو شروع ہی سے سویرے اٹھنے کی عادت تھی۔ ایکدن کا واقعہ ہے کہ ٹھنڈی ٹھنڈی پُروا ہوا چل رہی تھی ستارے الوداعی نظریں دنیا پر ڈال رہے تھے۔ قریب کے کسی درخت کی شاخ سے ایک خوش الحان پرندے نے اپنے سریلے اور پُرکیف نغمات مدھ بھرے لہجے میں سنانے شروع کئے۔ اِن پرکیف نغمات پر آہستہ آہستہ ایک خاص قسم کی کیفیت حضرت پر طاری ہوئی اور فوراً اپنی جگہ سے اچھل کر "مست قلندر" مست قلندر" کہتے ہوئے عالم بیخودی میں رقص کرنے لگے۔ بہت دیر تک یہی کیفیت رہی جب کسی قدر جوش کم ہوا تو یہ شعر گنگنانے لگے۔ شعر۔

شب گرودت شب رت داتا ‌ ‌ ‌ گردن کے چرنوں پہ جیت لاگا

راقم الحروف کو یہ شعر حفظ کرا دیا گیا تھا اور ترنم کیساتھ اکثر پڑھوا کر سنتے اور لطف اٹھاتے تھے۔

واقعہ (۲) :- صبح کے نو بجے ہیں۔ میں اور میرے والد حضرت عالی مکان میں بیٹھے ناشتہ کر رہے ہیں ایسے میں اچانک حضرت" آ دھمکے اور باہر سے آواز پر آواز لگائے جا رہے ہیں۔ "بڑے جناب ہیں؟ کیا چھوٹے جناب بھی ہیں؟" پہلی آواز پر تو ہم نے غور نہیں کیا لیکن دوسری آواز کیساتھ ہی جواب دیا گیا کہ: ہاں۔ حضرت ہیں۔ ابھی حاضر ہوا" اُدھر سے جواب الجواب ارشاد ہوا کہ :- "جلدی آؤ۔ ورنہ میں ست باندہ لونگا" حضرت کا یہ جملہ اِدھر ختم ہوا اور اُدھر ہم دونوں باپ بیٹے کھانا چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ حضرت" دونوں ہاتھ سر کی طرف بلند کئے ہوئے ایک پاؤں پر کھڑے ہیں۔ فوراً ہاتھ جوڑ کر راقم الحروف نے عرض کیا کہ :- اللہ کے واسطے معاف کیجئے۔ قصور ہو گیا۔ ست کو توڑیئے ورنہ زمین و آسمان دہل جائیں گے" اس کے بعد ہی حضرت نے ست کو توڑ دیا۔ والد کو اپنے ساتھ لیکر وہ تو آگے بڑھ گئے اور میں گھر میں آگیا۔

واقعہ (۳) :- میں گیارہ سال کا تھا اور بلدۂ حیدرآباد کی قدیم ترین درسگاہ دارالعلوم میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا میرے دوست ڈاکٹر رضی الدین صدیقی جو غالباً اس وقت اسلام آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں وہ نہ صرف میرے ہم عمر اور ہم محلہ بلکہ اسوقت ہم مکتب اور ہم جماعت بھی تھے۔ حسن اتفاق سے میں نے یہ مصرعہ موزوں کیا

یعنی "چار باتیں جس سے کیں تو نے وہ تیرا ہو گیا"۔ جب چار آٹھ دن تک میں اور میرے دوست جنھیں شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس پر مصرعۂ ثانی نہ لگا سکے تو مجبوراً میں نے حضرت استاذی کے ملاحظہ میں مصرعہ مذکور پیش کر دیا حضرت نے فوراً ارشاد فرمایا کہ شعر ؎

چار باتیں جس سے کیں تو نے وہ تیرا ہو گیا　　　سحر ہے جادو ہے او کافر تری تقریر میں

میں فوراً اٹھکر آداب تسلیمات بجالایا۔ حضرت نے اس وقت یہ ارشاد فرمایا کہ:- چھوٹے جناب۔ جب تم آگے چلکر شاعری کرو تو اپنا تخلص طالع رکھنا۔ گو میں شاعر نہیں ہوں لیکن اس وقت سے آج تک تبرکاً و تیمناً اپنے نام کیسا تھ طالع ضرور لکھتا ہوں اور جب میں غور کرتا ہوں تو حضرت قلندر کا یہ ارشاد ایک راز ہی راز معلوم ہوتا ہے اور ویسے تو بحساب ظاہر ابجد کے لحاظ سے لفظ طالع کے اور اسم علی کے اعداد بالکل مساوی ہیں۔

تلامذۂ حضرت ترکیؒ آپ کے شاگردوں کی تعداد یوں تو سینکڑوں تک پہنچ چکی تھی لیکن بقول "مشتے نمونہ از خروارے" یہاں صرف چند قابل ذکر تلامذہ کے نام لکھے جاتے ہیں جن میں سے اکثر صاحب دیوان ہوئے ہیں

۱۔ محمد اسمٰعیل ازل حیدرآبادی (۲) افضل بیگ افضل دہلوی صاحب دیوان اردو و فارسی (۳) غوث محی الدین اقدس حیدرآبادی سجادہ نشین درگاہ میر مومن چپ (۴) مشہور رباعی گو شاعر استاذی مولانا سید امجد حسین امجد حیدرآبادی صاحب دیوان (۵) نواب خواجہ حسین اثر منصبدار حیدرآبادی نبیرۂ نواب سلطان نواز جنگ۔ اثر صاحب حضرت ترکی کے چھوٹے داماد اور جانشین اول تھے (۶) راجہ نیم چند احقر جاگیردار حیدرآبادی (۷) خواجہ جہانگیر علیخاں انف منصبدار حیدرآبادی مصنف فسانۂ عشق (۸) محمد اکبر علیخاں اکبر حیدرآبادی جمعدار صدر وزیری صاحب دیوان (۹) معین الدین احمد بشر حیدرآبادی صاحب دیوان اردو و فارسی (۱۰) بجرنگ پرشاد بزمی حیدرآبادی (۱۱) سید نواب جان تمنا بنارسی (۱۲) حافظ جمیل الدین جمیل منصبدار حیدرآبادی صاحب دیوان اردو و فارسی (۱۳) نواب جعفر حسین خاں جعفر حیدرآبادی مخاطب بہ صف افگن جنگ نواب تاڑبن۔ نواب موصوف بلدہ حیدرآباد میں حضرت ترکی کے سب سے اولین شاگرد تھے (۱۴) حیدر حسینی شاہ حسینی حیدرآبادی سجادہ نشین (۱۵) مرزا مہدی رفعت ایرانی محلوتی (۱۶) نواب میر رحمٰن علی سیف مخاطب سیف الملک حیدرآبادی (۱۷) سید قادر محی الدین سلیم حیدرآبادی صاحب دیوان فارسی (۱۸) مرشد زادہ نواب میر شجاعت علیخاں شجاعت تحصیلدار حیدرآبادی داماد کلاں حضرت ترکی (۱۹) میر اعظم علی شائق مفتی بلدہ حیدرآباد صاحب دیوان فارسی و اردو نعت گوئی میں کافی شہرت پائی (۲۰) محمد خاں طلعت حیدرآبادی صاحب دیوان (۲۱) سید خواجہ محی الدین علیؔ صاحب دیوان فارسی (۲۲) بسم اللہ بیگم عصمت دختر کلاں حضرت ترکی محل مرشد زادہ نواب میر شجاعت علیخاں شجاعت حیدرآبادی (۲۳) خیر النساء بیگم عفت دختر خورد حضرت ترکی محل نواب خواجہ حسین اثر منصبدار حیدرآبادی (۲۴) حکیم سید وزیر علی عالی حیدرآبادی معروف بہ بڑے جناب والد راقم الحروف (۲۵) شیخ عبدالقادر قیصر حیدرآباد (۲۶) فتح محمد قیصر مخاطب بہ فتح شاہ دولہ مصنف ناول کید النساء فرزند اکبر ترکی (۲۷) سید اسحاق محمود ایرانی (۲۸) مولوی سلیمان عیدی دہلوی (۲۹) نواب میر محمد علی خاں ناظم حیدرآبادی ہمشیرزادۂ نواب صولت جنگ (۳۰) حافظ غلام محی الدین نکہت حیدرآبادی صاحب دیوان فارسی

مختصر یہ ہے کہ حضرت ترکیؒ جب حیدرآباد تشریف لائے تو ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو کر رہ گئے اور سوائے دربار دہلی منعقدہ ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء کے حیدرآباد سے باہر نہیں گئے تقیتیس ۳۳ سالہ قیام کے عرصے میں سینکڑوں نے آپ کے قدم چومے اور سینکڑوں ہی شاگرد بنے۔ آخرکار (۹۵) سال کی عمر میں ۲۵ رجادی الثانی ۱۳۳۶ھ ۱۹۲۰ء یوم پنجشنبہ کو آسمان شاعری کا یہ چمکتا ہوا آفتاب غروب ہو گیا۔ وطن مالوف سے دور فارسی کا کوہ نور گولکنڈہ کے کھنڈروں میں ہمیشہ کے لئے گم ہو گیا۔ فارسی کا گرجتا ہوا شیر شہر حیدرآباد کے ایک محدود قبرستان کی چار دیواری میں ابدی نیند سو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا مزار بیرون لال دروازہ بلدہ حیدرآباد اندرون احاطہ درگاہ شریف حضرت شاہ محمد مخفی الحسینی چشتیؒ واقع ہے اور اس پر سنگ مرمر کا حسب ذیل کتبہ خط نستعلیق میں بطور سنگ بالین نصب ہے۔

۷۸۶
۹۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا اللہ و یا رحمٰن و یا رحیم

بوقت وفات حضرت والد صاحب قبلہ جناب شیخ غلام محمد ترک علیشاہ صاحب ترکی "ملک الشعراء" بندہ نواب نظام الملک حسب الدولہ صوبہ کشمیر صوبہ ملک دو آبہ جالندھر پنجاب نے یہ شعر فی البدیہہ فرمایا ہے ؎

گذر بر قبر ترکی اگر کنی اے دوست

دمے نشین سر اخلاص و فاتحہ برخواں

تاریخ وفات دہم شہر جمادی الثانی ۱۳۳۶ھ روز پنجشنبہ

عمر ۹۵ سال

گذرانیدہ دختر کلاں بسم اللہ بیگم عصمت

آخر میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ اس مضمون کو محترم احباب جناب مولوی ضیاء الدین احمد دیسائی صاحب مہتمم محکمہ آثار قدیمہ حکومت ہند مستقر ناگپور اور مولوی محمد اکبر الدین صدیقی صاحب استاد شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی فرمائش پر لکھا گیا ہے۔ حضرت ترکی رحمۃ اللہ علیہ کے ہی حسب ذیل اشعار پر ختم کیا جاتا ہے۔

ز انتہائے مردہ پنداست و من یقین دارم

کہ در زمانہ بنا شم بزندگی مشہور

کنند یاد مرا اہل زمان سخن سنجاں

ندوم ز منزل دنیا چو سوئے خانہ گور

(سرمایہ پیری)

ڈاکٹر محمد چراغ علی

دکنی مرثیے کی چند اہم خصوصیات

اردو مرثیے کی ابتدا دکن میں ہوئی اب یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہو چکی ہے۔ عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں مرثیے نے بڑی ترقی کی۔ دکنی مرثیہ گو شعرا نے مرثیوں میں واقعات کربلا شہادت امام حسینؑ اور مصیبت اہل بیت کے تعلق سے اپنی گہری عقیدت اور والہانہ جذبات کا نچوڑ پیش کر کے اس صنف سخن کو مالا مال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تین سو برس گزر جانے کے باوجود دکنی مرثیہ اردو ادب میں ایک مخصوص مقام رکھتا ہے۔ اور اس کا مطالعہ جہاں عقیدتمندوں کے لئے باعث طمانیت ہے وہیں یہ ادب کے جویاؤں کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہے دکنی شعرا کے کارناموں میں ہمیں خصوصی اور عمومی دونوں قسم کے مرثیوں کے وافر نمونے ملتے ہیں۔ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے دکنی مراثی کا مطالعہ نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ زبان قدیم ہونے کی وجہ سے ان مرثیوں کا پڑھنا اور سمجھنا آسان نہیں پھر بھی ان میں جو سوز و اثر اور درد و گداز پایا جاتا ہے وہ دکنی زبان کی قدامت کے دبیز پردوں سے بھی جھانکتا رہتا ہے۔ دکنی مرثیہ اپنی چند خصوصیات کی وجہ سے اردو ادب میں ایک انفرادی حیثیت کا مالک ہے۔ دکنی مرثیہ گو شعرا نے مرثیے کو اثر آفریں بنانے کے لئے باوجود زبان کی تنگ دامانی کے اپنی جدت سے اس میں وہ تمام تجربات کئے ہیں جو آگے چل کر شمالی ہند کی ترقی یافتہ مرثیہ گوئی کو اس کی معراج کمال تک پہنچانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے دکنی مرثیہ گو شعرا، عوام کی نفسیات پر اثر انداز ہونے والے ان تمام جذبات سے واقف ہو چکے تھے۔ جو مرثیے کی کامیابی کی ضمانت دے سکتے ہیں اور جن کو ادبیت کا جامہ پہنا کر لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا نے بعد میں ـــ بام عروج پر پہنچا دیا۔ یا یوں کہیے کہ ترقی یافتہ مرثیہ گوئی کے سارے نقوش اُن ہی خطوط پر قائم ہیں جو دکنی شعرا نے آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑے تھے اگر ہم دکنی مرثیے کا ایک سرسری جائزہ لیں تو اسکے چند اہم پہلوؤں پر نظر پڑتی ہے مثلاً دکنی مرثیے کا عقیدتی پہلو، دکنی مرثیے کا جذباتی پہلو، دکنی مرثیے کا بیانیہ پہلو، دکنی مرثیے کا روایاتی پہلو، دکنی مرثیے کا معاشرتی پہلو، دکنی مرثیے کا تہذیبی پہلو، دکنی مرثیے کا رثائی پہلو اور دکنی مرثیے کا ایمائی پہلو دکنی مرثیہ نگاروں نے اس فن کو کہاں تک ابھارا اس امر کا اس مختصر مضمون میں ایک سرسری جائزہ بھی لینا مشکل ہے یہاں صرف اشارۃً یہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ دکنی مرثیہ گو شعرا نے مرثیہ گوئی کے حق کو ادا کرنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی؟ اور وہ اصل مقصد سے کس قدر قریب تر نظر آتے ہیں۔

چونکہ دکنی مرثیہ نگاروں نے مرثیے کے لئے غزل کی ہیئت کو مخصوص کر لیا ہے۔ اس لئے دکنی مرثیے میں مضامین

کی ریزگی پائی جاتی ہے اس وجہ سے دکنی مرثیہ نگار کبھی واقعات و تفصیلات کو بیان نہیں کرتا، ان کی طرف صرف اشارے کرکے گزر جاتا ہے چونکہ بعد کو دبستانِ لکھنؤ کے مراثی میں واقعاتِ شہادت کو تمام جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے دکنی مراثی میں روایات و واقعات کی طرف جو اشارے ملتے ہیں اُن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دکنی مرثیہ نگار ان تمام تاریخی روایات و واقعات کا علم رکھتے تھے جن کو دبستانِ لکھنؤ کے شعرا اپنے مرثیہ میں بیان کرنا ضروری سمجھا۔ دکنی مرثیہ گو شعرا نے تفصیلات پر اس لیے توجہ نہیں دی کہ غزل کی ریزہ کاری انھیں تفصیل میں جانے سے مانع تھی۔ غزل اور دکنی مرثیے میں دو بنیادی خصوصیات مشترک ہیں، ایک تو ہیئت کا اشتراک اور دوسرے داخلیت کی یگانگت۔ دکنی مرثیہ نگاروں نے اس ہیئت کا انتخاب بھی موضوع اور مزاجِ موضوع کے اعتبار سے کیا تھا۔ چونکہ ان کے نزدیک مرثیے کا مقصد جذباتِ غم والم کا اظہار کرنا تھا اس لیے انھوں نے ایسی ہیئت اختیار کی جو موسیقانہ بھی تھی اور ریزہ کار بھی۔ انھیں مرثیے میں خارجی زندگی کے تجربات اور واقعات کو قلمبند کرنا نہیں تھا اس لیے انھیں ایسی ہیئت کی ضرورت نہیں تھی جس میں ربطِ بیان کی گنجائش ہو۔ انھیں تو اپنے مختلف متنوع کیفیات و احساسات کو موسیقیت کے سہارے منظوم کرنا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل غزل کی ہیئت ہی کر سکتی تھی۔

غزل اور دکنی مرثیے میں بنیادی خصوصیات کے اس اشتراک کے باوجود دکنی شعرا نے مرثیے کے لیے جو بحور استعمال کی ہیں وہ غزل کی مقبول و مروج بحور سے مختلف ہیں۔ دکنی مرثیہ گو شعرا نے اپنے کارناموں میں ہزج مثمن سالم، رجز مثمن سالم اور مضارع مثمن اخرب سالم کو بہت زیادہ استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ عشق و عاشقی کے مزاج میں جہاں درد و غم ہے وہیں مسرت و اہتزاز بھی ہے اور مستی و سرشاری بھی۔ اس کے برخلاف مرثیے میں درد و غم کی وہ آگ ہے جو شاعر کے دل و دماغ کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے، اور وہ چیخنے، چلانے، سینہ کوبی کرنے اور سر پٹکنے لگتا ہے۔ مزاجِ موضوع کے اسی اختلاف کی وجہ سے جہاں غزل اور دکنی مرثیے کی مقبول بحروں میں اختلاف ہے وہیں قافیہ و ردیف کے صوتی آہنگ اور لہجے میں بھی اختلاف نظر آتا ہے۔ لانبے مصوتوں اور انفی آوازوں کا استعمال دکنی مراثی کے قافیہ و ردیف میں زیادہ ہوا ہے، اور ان اصوات کا بکثرت استعمال یہ ثابت کرتا ہے کہ ان اصوات کو دکنی مرثیے کے نوحیہ اور بینیہ مزاج سے خصوصی مناسبت ہے۔ دکنی مرثیہ نگاروں نے مراثی کے قافیہ و ردیف کے انتخاب میں مرثیے کے موضوع، فضا اور آہنگ کا بڑا لحاظ رکھا ہے اور اپنے شعورِ فن کا بڑی حد تک ثبوت دیا ہے۔ غزل کی ہیئت میں خواہ اس کا موضوع عشق و عاشقی ہو یا نالہ و شیون، قافیہ و ردیف شاعر کی نفسی کیفیات سے بڑا گہرا ربط رکھتے ہیں۔ اس کا ایک سرسری اندازہ غزل اور قصیدہ میں قافیہ و ردیف کے آہنگ کے تقابلی مطالعے سے ہو سکتا ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کی غزل کی بے کیفی کے جہاں اور مختلف اسباب ہیں وہیں ایک سبب یہ بھی ہے کہ دبستانِ لکھنؤ کی غزل میں قافیہ و ردیف کے انتخاب میں غزل کے مزاج و آہنگ کی رعایت نہیں رکھی گئی۔

دکنی مرثیہ گو شعرا نے بعض مرثیوں کی ردیف ہی ہائے، وائے، واحسینؑ، یاحسیناؑ، ہیہات اور واویلا رکھی ہے۔ دکنی مراثی میں حسنِ تعلیل کا بکثرت استعمال ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دکنی مرثیہ گو شعرا جب زمین و آسمان کی ہر شے کو غمِ حسینؑ میں سوگوار دکھانا چاہتے ہیں تو انھیں اس سوگواری کی تاویل کرنی پڑتی ہے اس مقصد سے ہر مرثیہ نگار نے کم و بیش ہر مرثیے میں اس صنعت کو بکثرت استعمال کیا ہے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

یو فلک پر شفق نیں جانو — لہو میں کسوت آپس رنگیا ہے چاند
آسماں کے اپر یو نیں تارے — غم سوں رو رو انجو سٹیا ہے چاند

مرتضیٰ کا یہ پورا مرثیہ چاند کی مختلف خصوصیات کی حسنِ تعلیل ہے۔

اردو شاعری کی اور اصناف کی طرح مرثیے کا موضوع بھی متعین ہے اور موضوع کے تعین کی وجہ سے اس کا لفظی سرمایہ بھی مخصوص و محدود ہو جاتا ہے، لیکن دکنی مرثیے اور دبستانِ لکھنؤ کے مرثیے میں یہ فرق ہے کہ دکنی مرثیہ بنیادی طور پر مرثیہ ہی ہوتا ہے اور لکھنوی مرثیہ، مرثیہ ہوتے ہوئے اور بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ اس میں رزمیہ عناصر بھی ہوتے ہیں اور بزمیہ عناصر بھی، واقعات نگاری بھی ہوتی ہے اور منظر نگاری بھی، کردار نگاری بھی ہوتی ہے اور نفسیات نگاری بھی، سراپا نگاری بھی ہوتی ہے اور گھوڑے اور تلوار کی تعریف بھی اس لئے لکھنوی مرثیہ جہاں جہاں اپنے بنیادی موضوع اور مزاجِ موضوع سے ہٹ کر متنوع موضوعات کی طرف آتا ہے وہاں اس کی زبان بھی ان موضوعات کے تقاضے کے مطابق پھیل کر غیر محدود ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے دکنی مرثیہ، صرف مرثیہ ہے اس لئے جس طرح اس کا موضوع متعین ہے اُسی طرح اس کی زبان بھی متعین ہے۔ دکنی مرثیے کی زبان کا مطالعہ نہ صرف دکنی مرثیے کے مزاج ہی کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ اس حقیقت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ دکنی شعرا نے زبان کی ابتدائی حالت میں بھی ایک مخصوص اور متعین موضوع کو بیان کرنے کے لئے زبان کی تنگ دامانی کی وجہ سے تصرف کرکے مترادفات و محاورات کا کس قدر وسیع سرمایہ فراہم کر لیا تھا اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ شعرائے دکن مرثیے میں اس لفظی سرمایہ کو برتتے ہوئے وہ مخصوص لہجہ اور آہنگ بھی پیدا کرتے تھے۔ جو مرثیے کی رثائی مزاج کی ترجمانی میں مدد دیتا ہے۔ دکنی مرثیہ نگاروں نے جو لفظی سرمایہ استعمال کیا ہے وہ مرثیے کے غم آگین مزاج سے بڑی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ یہاں چند مترادفات اور محاورات درج کئے جاتے ہیں، جن کو دکنی مرثیہ گو شعرا نے استعمال کیا ہے مثلاً:۔

مترادفات:۔ (سورج) سُور۔ آفتاب۔ بھان، خورشید وغیرہ

محاورات:۔ غدر کرنا بمعنی ستم کرنا۔ سیکا کرنا بمعنی سک جانا۔ سرتے آنا بمعنی نئے سرے سے آنا، دلا دکت میں ڈبنا بمعنی غمگین ہونا، سر نہانا بمعنی سر سے پاؤں تک نہانا وغیرہ۔

دکنی مرثیہ نگاروں نے حضرت امام حسینؑ کی ولادت سے شہادت تک کے واقعات کی طرف جو اشارے کئے ہیں

[illegible] کیا جائے تو واقعات کا خاکہ ذہن نشین ہو جاتا ہے دکنی شعرا نے واقعات نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی ہے اس لئے دکنی مراثی کے انبار صرف سانحہ شہادت پر آہ و زاری سے پٹے پڑے ہیں

مرثیہ کا بنیادی مقصد رونا، رُلانا رہا ہے۔ لکھنؤ میں مرثیہ فن اور موضوع کے اعتبار سے عروج کمال کو پہنچا نوعیت مضمون کے اعتبار سے اس کے ابواب متعین کئے گئے۔ واقعات کے بیان میں ترتیب و تفصیل سے کام لیا گیا لیکن اس کے باوجود لکھنؤ میں بھی مرثیہ کا بنیادی مقصد شہادتِ امام پر نالہ و زاری کرنا ہی رہا۔ دکنی مرثیہ نگار اس بنیادی مقصد سے اس قدر وفادار رہے کہ انہوں نے واقعات کی طرف بہت کم توجہ کی۔ ان کے نزدیک واقعاتِ کربلا کا بیان کرنا مورخ کا کام تھا۔ مرثیہ نگار کا کام ان واقعات پر ماتم کرنا تھا۔ جذبۂ حبِ اہلِ بیت کو اکسانا اور دشمنانِ حسین سے جذبۂ نفرت کو ہوا دینا تھا۔

رثائی اور بکائی مضامین بیان کرنے کے لئے تمہید اور مضامین کی ترتیب کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی لئے دکنی مرثیہ مطلع سے مقطع تک ماتم ہی ماتم ہوتا ہے۔ اس کمل رثائیت اور اشاریت کے باوجود دکنی مراثی میں نوعیت کے اعتبار سے چند مضامین ہر مرثیے میں مشترک ملتے ہیں۔ اور ان کے بیان میں تھوڑی بہت ترتیب بھی نظر آتی ہے۔

دکنی مرثیہ مظلوم شہیدوں کا ماتم ہوتا ہے۔ دوسرے مضامین ضمناً آتے ہیں۔ بعض مراثی کی ردیف ہی کلماتِ تاسف ہوتے ہیں جیسے ہائے، ہا لہفا ہائے) (وائے، وائے وائے) (واحسینؑ یا حسیناؑ) اور ہیہات اور واویلا) وغیرہ اس خصوص میں چند مثالیں

(۱) آیا ہے محرم کو ماہ چند ہائے ہا لہفا ہائے　　لایا عشور کی یو خبر ہائے، ہائے ہائے

(۲) دو جگ اماماں دکھ تے سب جیو کرتے زاری وائے وائے
تن روں کی لکڑیاں جال کر کرتے ہیں خواری وائے وائے　　(محمد قلی قطب شاہ)

(۳) دو جگ غل پڑیا ہے واحسینؑ یا حسیناؑ　　تیرے یو غم کڑیا ہے واحسینؑ یا حسیناؑ　　(داعی)

(۴) ہیہات شہ کا درد ہے، اس غم سوں عالم گرد ہے　　تب تے چندر مکھ زرد ہے ہیہات شہ کا درد ہے　　(نصرتی)

دکنی مراثی میں ماتم گساری اور نوحہ گری شاعر کی طرف سے نہیں ہوتی بلکہ وہ کائنات کے مختلف افراد و عناصر کو بھی شہادت حسین پر ماتم کناں دکھاتا ہے۔ جہاں تک رحومین کے ماتم کا تعلق ہے اس کا بیان اسی طرح کیا جاتا ہے جس طرح زندہ اشخاص ماتم کرتے ہیں۔ ملائک، حور، جن اور پری کے نوحہ و ماتم کا انداز بھی انسانوں کے جیسا ہی ہوتا ہے البتہ دیگر عناصر کائنات کے ماتم کے دو انداز و اسلوب ملتے ہیں ایک تو یہ کہ بغیر کسی حسنِ تعلیل کے شاعر جرنیات، جمادات، نباتات اور حیوانات کو ماتم کناں بتاتا ہے دوسرا اسلوب یہ ہے کہ شاعر کسی شئے کی ماتم گساری کی شاعرانہ تاویل کرتا ہے یہی اسلوب دکنی مراثی میں بہت عام اور مقبول ہے بلکہ بعض پورے مرثیے اسی اسلوب میں کہے گئے ہیں۔

ماتم گساری، عزاداری اور اشکباری کا بنیادی محرک حب اہل بیتؑ اور خصوصاً حب حسینؑ ہے۔ لیکن اس کا ایک محرک یہ تصور بھی ہے کہ حسینؑ کے غم میں سوگواری اور اشکباری دنیا میں سرخروئی اور آخرت میں بخشش کا سرمایہ ہے یہ عقیدہ سنی اور

دونوں فرقوں کے مرثیہ نگاروں کے ہاں ملتا ہے جہاں شعرا مرثیے میں ماتم کی وضاحت کرتے ہیں وہیں مرثیے کے ہی مقصد پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ مقصد مرثیہ سے متعلق مختلف اسالیب میں جو شعر کہے گئے ہیں اُن سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں

(۱) شہادت امام پر اپنے درد و غم کا اظہار کرنا

(۲) دوسروں کے جذبۂ غم کو اکسانا اور انہیں رُلانا

(۳) مجالس عزا کو گرمانا اور سینہ کوبی کے مقصد کی تکمیل کرنا

یہ تینوں امور ایک ہی مقصد کے مختلف پہلو ہیں جسے ہم اظہار درد و غم کہہ سکتے ہیں۔ دکنی مراثی سے چند شعر مثال میں کے پیش کئے جاتے ہیں:۔

(۱) قتل سید خدا ہے واویلا　　جگ پو روز جزا ہے واویلا　　(مومن)

(۲) محرم جگ میں پھر آیا ہے یاراں آہ واویلا　　ہزاراں دکھ ہزاراں غم ہزاراں آہ واویلا　　(غواصی)

(۳) اُو دل کرتا میاں سب اس غماں تھے لہو روئیں　　وا اماماں یا اماماں یا دکر کو دل کھو دیں　　(محمد قلی قطب شاہ)

(۴) آہے فلک کیا کیا آہ آہے فلک کیا کیا اللہ　　فاطمہؑ کوں غم دیا آہ آہے فلک کیا کیا اللہ　　(ملک خوشنود)

دکنی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ فارسی شاعری کا اتباع کرتے ہوئے بھی ہندوستانی تہذیب کی حامل ہے۔ دکنی مرثیے میں مقامی تہذیب کے عناصر بکثرت ملتے ہیں دکنی تہذیب میں اظہار غم کے لئے کیا کیا علائم مروج تھے دکنی مرثیے میں ہمیں ملتے ہیں۔ مثلاً

(۱) ہتیار ۔ تروار

(۲) زیور ۔ گھسری

(۳) پارچہ و ملبوسات ۔ کسوت، رومال

(۴) جواہرات ۔ نیلم، لالاں

(۵) سامان آرائش ۔ عطر، چوڑیاں

(۶) محرم کے متعلقات ۔ الاوہ، شربت کے گوڑیاں، شتے

(۷) رسومات و روایات، اُگر انچیل کرکے دودھ پلانا

(۸) اظہار غم کے علامات ، خاک سر پر سٹنا

(۹) جغرافی حالات ، صحرا، کالوا

(۱۰) باجے ۔ طبل، قرنا

(۱۱) روزمرہ زندگی کے عناصر، گوڈی، لگن وغیرہ

مجھے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں اس دور کے بکثرت مراثی دستیاب ہوئے ہیں، ان مرثیوں کا مطالعہ دکنی مرثیوں کے بارے میں محض قیاس کی بنا پر رائے زنی کرنے والوں کی اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیگا کہ گولکنڈہ اور دکن میں مرثیہ نگاری کا آغاز ضرور ہوا ہے۔ لیکن اس کا مقصد محض رونا رولانا اور مجالس عزا کو گرمانا تھا ادبی اور ادبی اعتبار سے دکنی مرثیے کا کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دکنی مرثیہ ادبی اعتبار سے بھی اتنا ہی بلند ہے جتنا کہ مقصدی اعتبار سے بعض ارباب نقد اس کو ادب سے [illegible] خیال کرتے ہیں [illegible] گئے ہیں۔

(۱) خواص کے زبان کے اچھر ہے لطیف تو　　　اے عارفاں ہو یا و تمہیں یوا چھر کرو (غواصی)

وردی کس و تعجیل کے ساتھ مرثیے میں فکر و فن کے اہتمام کی وضاحت کرتا ہے:-

(۲) طبیعت کی دریا سوں غواص دل　　　لے آیا ہے ڈب کر سلام علیک (وردی)

(۳) پرو دیا ہوں تاگے میں اخلاص کے　　　یوں غلطاں گوہر سلام علیک (ایضاً)

مرثیے میں دعا کا پہلو ملاحظہ فرمائیے:-

(۱) تمہارے وجہی کوں یا اماماں　　　نیں تمن بن اس کوں سایا (وجہی)

(۲) اماماں کی دعا تے تلطف کیں دے شفا یارب　　　شہیداں دوستی تے سب شہاں سیانے سرایا ہے (محمد قلی قطب شاہ)

اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ لکھنؤی شعرا نے موضوع سے ہٹ کر مرثیے کو ایسا ادبی جامہ پہنایا ہے کہ اس روپ میں مرثیے کی ادبیت زیادہ اور رثائیت کم ہوگئی، برخلاف اس کے دکنی مرثیہ گو شعرا نے ادبیت کی طرف ضمنی طور پر توجہ کی اس کی بڑی وجہ اُن کی مقصدی پہلو سے وفاداری ہے نہ کہ ادبی پہلو سے اغماض یا کسی اور وجہ سے رو گردانی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ دکنی مرثیے میں بھرپور رثائیت موجود ہے اور لکھنؤی مرثیے کی رثائیت ادبی رنگ کے چمک اُٹھنے سے ماند پڑ گئی ہے اس خیال کی تائید میں میں کئی مثالیں پیش کرکے اور تقابلی جائزہ لے کر ثابت کر سکتا ہوں کہ متذکرہ صدر دعا مفروضہ نہیں ہے بلکہ واقعہ، لیکن اس مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے کسی اور موقع پر اس موضوع پر لکھا جائے گا۔

(بقیہ صفحہ ۲۸ سے آگے)

خلقت (۱)یقین انساں تھا توحید میں سلطان تھا　　　صاحب ولایت شان تھا جے کچھ حکم الٰہی کا
(۲)بالکیں کاکوں گن دھرے سنگت لو ہاتج دھرے　　　کنچن ہو کر بھیس پھرے جے کچھ حکم الٰہی کا

دوہرہ

جے طالب مشتاق تجہ دھرنے سکے ملا یک بات کر
(۳)ارشاد کر تلقین جس دیتا کرتار بیتا بات کر
بھاگ بڑے جس توں ملیا اس نظر کیا کرتار
جس پر (۴)ان توں دھرے اس بخشیں بخشنہار

توکل سے شہباز تھا قانع قناعت راز تھا　　　معشوق سوں تجہ ناز تھا جے کچھ حکم الٰہی کا
اس نفس تھے بیزار تھا شب روز تجہ دیدار تھا　　　صدق میں اقرار تھا جے کچھ حکم الٰہی کا
ایمان میں نا ہی خطا، نقر علی کا تجہ عطا　　　کرتار اپنا کر لیتا ہے جے کچھ حکم الٰہی کا
توں حق کا مرشید ہے اور دین کا خورشید ہے　　　راہ سلوک مستعید ہے جے کچھ حکم الٰہی کا

اختلاف نسخ | (۱) ... (۲) پرکیں (۳) ارشاد تلقین (۴) میا

فرہنگ | (۲) لیکن تجہ میں ایسی ...

محمد اکبرالدین صدیقی

مرثیہ حضرت برہان الدین جانم

اردو نامہ کے تسبویں شمارے جنوری ۱۹۶۸ء میں حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ وفات پر جناب سخاوت مرزا صاحب نے ایک مضمون لکھا ہے۔ اور جہاں انھوں نے بہت سے حوالے دیئے ہیں راقم الحروف کی کتاب کلمۃ الحقائق کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور کہتے ہیں" گرافسوس تو یہ ہے کہ اس مرثیے میں شاعر کا تخلص موجود نہیں جس کی بنا پر اس کو شاہ برہان کا تسلیم کیا جائے" کلمۃ الحقائق میں میں نے یہ لکھا ہے کہ یہ مرثیہ حضرت شمس العشاق کے صاحبزادے حضرت برہان الدین جانم کا ہے۔ اور میرے اس قول کی بنیاد مرثیہ کا یہ شعر تھا ؎

دنیاں کا منجہ پدرا ہے، اور دین منجہ لنگرا ہے   اس دکھ کا منجہ عذرا ہے، جے کچھ حکم الٰہی کا

اس شعر میں حضرت جانم نے واضح طور پر بتلایا ہے کہ وہ دنیاوی طور پر میرے باپ تھے دینی اعتبار سے مرشد تھے اسی لئے مجھے اس رنج و غم کا عذر ہے لیکن مشیت ایزدی کو جو منظور ہے وہی ہوتا ہے۔

جناب سخاوت مرزا صاحب نے مولوی عبدالحق صاحب ہی کی طرح نہ اس شعر کو صحیح پڑھا اور نہ سمجھا میں نے کلمۃ الحقائق کی ترتیب کے موقع پر سال وفات اسی مرثیہ کی روشنی میں ۹۰۲ھ قرار دیا تھا لیکن اب جبکہ مجھے دوسرا نسخہ بھی امین دوگھاوی بیجاپور کے کتب خانے سے دستیاب ہوا مجھے اپنی رائے میں تبدیلی کرنی پڑی اور اب اس نتیجہ پر پہنچا کہ میراں جی شمس العشاق کا وصال ۲۵ شوال ۹۰۲ھ مطابق ۲۳ جون ۱۴۹۷ء کو ہوا۔ اس سلسلے میں اب تک جتنی بھی بحثیں ہوئی ہیں۔ وہ سب کوئی ٹھوس مواد نہ ملنے کی بنا پر تھیں لیکن اب جب کہ ایک حقیقت سامنے آگئی ہے تو مزید بحث کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

یہ بات مختلف تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ حضرت میراں جی شمس العشاق آنحضرت صلعم کے حکم کی بنا پر مدینہ طیبہ سے شاہ پور آئے (شاہ پور کی آبادی دیکھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ پور پہلے ایک آباد علاقہ تھا۔ اور بیجاپور بعد کو آباد ہوا اور یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ مطابق ۱۴۹۰ء میں عادل شاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی اسوقت شاہ پور کا علاقہ آباد تھا اور یہاں کشور خاں کا باغ بھی تھا جو بہمنی سلطنت کا ایک صوبہ دار تھا۔ محمود گاواں کی وزارت کے آخری دور میں کشور خاں کے بعد محمود گاواں کا ترک پسر خواندہ عادل سردار بناکر بھیجا گیا۔ شاہ پور کی بنیاو ڈالنے یا آباد کرنے کا جو ذکر ملتا ہے یہ ممکن ہے کہ شاہ پور ہی سے متصل کوئی دوسرا علاقہ ہو۔ جناب سخاوت مرزا صاحب نے مجمع الانساب کے

حوالے سے یہ تبلایا ہے کہ آپ کا خاندان قدیم زمانے میں مغل کہلاتا تھا آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی حاجی شریف دولت دوام الدین اور خطاب دولت خاں تھا۔ دولت خاں (دوام الدین) کے چار صاحبزادے تھے۔ (۱) تیغ جنگ خاں (۲) مراتب خاں (۳) میراں خاں (۴) اور ہیبت خاں۔

میراں خاں فرزند سوم دولت خاں ہی کو مولف مذکور نے میراں جی شمس العشاق لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بیجاپور کا نہایت ذی عزت امرا کا خاندان تھا۔

یہ صحیح ہے کہ دولت خاں کے چار بیٹے تھے اور یہ ذی عزت امرا کا خاندان تھا۔ گجی محل سے قریب ہی ہیبت خاں کا جو مقبرہ ہے اور اسکے دیکھنے سے جو وحشت بلکہ دہشت ہوتی ہے۔ اُس سے اُن کی عزت و عظمت کا اندازہ ہوگیا جاسکتا ہے لیکن مجمع الانساب سید شاہ محی الدین قادری کی تالیف ہے بیجاپور میں حالات یہ تبلاتے ہیں کہ قادریوں [illegible] کوئی چیز ایسی نہ ملی جو قادریوں کی شان میں گستاخی کا موجب بن سکتی لیکن ایسا بہت سا مواد موجود ہے جس میں چشتیوں کو کمتر ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے شاہ صادق قادری نے امین الدین اعلیٰ کی ہجو میں ایک بہت طویل مثنوی تلمبند کی ہے یہ ثبوت کے لئے کافی ہے یہی حال مجمع الانساب کا بھی ہے کہ شمس العشاق کے خاندان کو چغتائی اور پٹھان ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں دوسرے جو شجرے ملے ہیں ان میں زیادہ یکسانیت ہے ان میں کہیں خاں کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ مجھے شبہ ہے کہ نسل نامہ بھی انھیں بزرگوں میں سے کسی نے لکھ کر انھیں کے نام سے موسوم کر دیا ہو اور اس کی وجہ سے محققین غلطیوں میں الجھ گئے۔

... حضرت میراں جی شمس العشاق جب بیجاپور پہنچے تو حضرت کمال الدین بیابانی مجرد کے ہاتھ پر بیعت کی آپ نے اپنے مرشد کے حکم کی بناء پر متاہل زندگی گزاری آپ کے دو صاحبزادوں برہان الدین جانم اور خواجہ عطاء اللہ کا ذکر ملتا ہے۔ خواجہ عطاء اللہ نے جو غیر شادی شدہ تھے نوجوانی کے عالم میں انتقال کیا۔ اور اس ٹیلے پر جہاں حضرت امین الدین اعلیٰ کا مزار ہے قریب ہی ایک چوکنڈی میں دفن ہیں کہا جاتا ہے کہ اس خاندان میں جو بھی نوجوان غیر شادی شدہ انتقال کرتا ہے تو اس کو اسی احاطہ میں دفن کیا جاتا ہے یہاں حضرت میراں جی شمس العشاق اور حضرت برہان الدین جانم کے تعلق سے تذکرہ غوثیہ سے چند اشعار پیش کرتا ہوں جن میں اُن کی مدح و توصیف کی گئی ہے یہ کتاب علی پیر حسینی کے کسی مرید نے لکھی ہے۔ یہ اوائل بارھویں صدی کی تصنیف ہے

وصف حضرت شاہ میراں جی شنو | دمبدم با صدق گویم نو بنو
بادشاہ چشت و مقبول رسولؐ | ہر چہ خواہی می شود از وے حصول
تا بہ شش سال آں شہنشہ در حرم | خفتہ زیک پہلوئے خود بہر کرم
بر سر بالیں بیامد مرتضیٰ | گفت خیز اے نور چشم جان ما

یا علی المرتضیٰ آن شاہ من   تا زما خوش گفت یک سخن
خواجہ کونین و مقبول کریم   چون درآنجا آمد از لطف عمیم
گفت خیز اے شمس عشاق امم   ہر چہ تو خواہی بگو آن می دہم
در دکن یکی ہست نامش شاہ پور   در علو حال نیاید بے ز طور
ہاں برو دکن بہر خود را آن مکاں   تا ز صحبت حالے یابد امان

وصف حضرت شاہ برہان

رکن شرع مصطفیٰ برہانِ دیں   شاہ برہاں اسم ذات بہترین
جانشین شاہ میراں آں ولی   در ریاضت بود یکتا منجلی
شاہ انس و جاں و مولائے کرم   متقی مرتاض وہم ثابت قدم
صاحب مشکل کشا روشن ضمیر   ہادی ہر بندگاں را دستگیر
فاخر فقر رسول کردگار   شرح وصف ذات پاکش بے شمار

اسی طرح حضرت امین الدین اعلیٰ کے مرید محمد حسینی معظم نے اپنی ایک مثنوی شجرۃ الاتقیا میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز، حضرت جمال الدین مغربی اور حضرت کمال الدین مجرد بیابانی کے ذکر کے بعد حضرت میراں جی شمس العشاق کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں:

میرانجی اتھا نام ان کا اول   لقب شمس عشاق کا کر فضل
سچے پیر پر حق دسے شہ کمال   اوسی روز حق کا سو کرے وصال
اوسی روز بولے یو سی عرفا سب   اوسی روز لیے فقد عرفا سب
اوسی روز سب راز روشن کئے   اوسی روز اپنا خلافت دیئے
کہے یہاں آ تا تم ہدایت کرو   اتا بے دھر لگ تم خلافت کرو

. . . .

میرانجی کو حق وانچہ روشن کیا   اوسی ٹینک کوں حق خدا گلشن کیا
وہی ٹینک پھر جب ہوا ہے نشر   اوسی ٹھار آ کر بسا ہے شہر
دیکھی خلق حق یہ یو مشتاق ہے   یو بر حق سبے شمس عشاق ہے
مریداں سنے جمع عالم ہوا   جو کوئی آ ملا سو محرم ہوا

. . . .

ہوا شاہ کے گھر یو روشن چراغ   کیا چشت کے خانوادہ کو باغ

دیکھے نام برہان تب شاہ کا | عجب لاد سا مکہ اد یہ ماہ کا
وہی چاند کوئی دن کو کامل ہوا | او کامل ہوا اور فاضل ہوا
عمر جب ہوا یا نزدہ سال کا | ہوا شوق غالب چھپے حال کا
ہوئے دست بعیت پدر سوں کتے | ہوا قطب روشن پدر سوں کتے
جمع کر مریداں میں رخصت کئے | کرو کو سفر تب حکم شہ دیئے

. . . . | . . . .

سفر میں کتے نعمتاں پائے ہیں | برس تین بعد از وہ پھر آئے ہیں

. . . . | . . . .

کے جانشین شاہ برہان کو | خلافت دیئے قطل سبحان کو
اول حق کی سب آشنائی دیئے | سو بعد از کتے شاہ رحلت کیئے

یعنی اس طرح حضرت برہان الدین جانم پندرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر سیاحت کے لیئے نکلے اور تین سال بعد واپس ہوئے اپنے والد سے خلافت حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت میراں جی شمس العشاق نے رحلت فرمائی اس لحاظ سے حضرت جانم کی عمر اسوقت اٹھارہ تا بیس سال ہوگی۔ نہ کہ پندرہ تا بیس سال جیسا کہ سخاوت مرزا صاحب نے ظاہر کیا ہے۔ حضرت جانم نے اپنے والد کی عمر اور تاریخ وفات کا اسطرح ذکر کیا ہے سے

تاریخ سال نوسو دو اس پر اگلے بھی دو | دو دن مدت وفا شو ' بے کچ حکم الہیٰ کا
اربع تسوں یہ سال ہے ماہے کوں شوال ہے | رحلت کے اس حال ہے ' بے کچ حکم الہیٰ کا
تاریخ بست و پنج بود بسیار گریاں رنج شود | در حال واصل گنج خود بے کچ حکم الہیٰ کا
شب پنجشنبہ روشن کیا ہجرت سنو رپور کیا | جیو ڑا قبض کر ان لیا بے کچ حکم الہیٰ کا

کلمۃ الحقائق (برہان الدین جانم کا رسالہ نثر) کی اشاعت کے موقع پر میں نے پہلے مصرع میں "نوسو دو اس پر" دو داوین کے ساتھ اور دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں "اربع سوں" پڑھا تھا۔ لیکن اسکی اشاعت کے بعد جب دوسرے نسخہ تک رسائی ہوئی تو مقابلہ کرنے پر شبہ اس طرح رفع ہوا کہ پہلے مصرعے میں "نوسو دو" اور دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں "اربع تسون" (تسعون) تھا اس طرح معلوم ہوا کہ آپ نے ۹۴ سال کی عمر پائی ۲۵ شوال سنہ ۹۰۲ھ چہارشنبہ کا دن گزرنے کے بعد شب پنجشنبہ میں وصال فرمایا۔ اس طرح آپکی ولادت کا سنہ ۸۰۸ھ قرار پاتا ہے۔ اور چونکہ حضرت جانم کی عمر اسوقت اٹھارہ تا بیس سال ہو تو آپ کی پیدائش کا سنہ ۸۸۲ھ تا ۸۸۴ھ ہوگا۔ جبکہ بیجاپور میں عادل شاہی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی البتہ عادل خاں بحیثیت صوبہ دار پہنچ چکا تھا۔ حضرت جانم نے سنہ ۹۰۴ھ میں اپنی طویل نظم ارشاد نامہ لکھی اور کلمۃ الحقائق کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

یہ رسالہ ارشاد نامہ کے بعد لکھا گیا۔ اسلئے کہ اس میں ارشاد نامے کے اشعار موجود ہیں اسکا کوئی اندازہ نہیں کہ کتنے دن بعد مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) کے خیال کے برعکس جسکو انہوں نے سخاوت مرزا صاحب کے مخطوطہ مطبوعہ اُردو سے معلق میں ظاہر کیا ہے۔ آپ نے ۹۹۰ھ کے بہت بعد رحلت فرمائی۔ کتب خانہ گیچی محل بیجاپور کی ایک بیاض میں کئی بزرگوں کی وفات اور اہم واقعات کی تاریخیں درج ہیں۔ اس میں حضرت جانم کی تاریخ وفات "عزیز جان چشتیاں جانم" بتلائی ہے۔ جس سے ۱۰۰۶ھ متخرج ہوتے ہیں۔ اگر اسکو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو برہان الدین جانم کی وفات ۱۵ جمادی الثانی ۱۰۰۶ھ کو واقع ہوئی اور یہی سنہ حضرت امین الدین اعلیٰ کی پیدائش کا بھی ہوگا۔ چونکہ آپ اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے گویا اسوقت حضرت جانم کی عمر ۱۲۰ یا ۱۲۲ سال ہوگی۔ اس عمر میں توالد و تناسل کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہم کسی نتیجہ پہ نہیں پہنچ سکتے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ میں نے ایک مثنوی میں حضرت امین الدین اعلیٰ کے بارے میں یہ پڑھا ہے کہ آپ بارہ سال تک ماں کے پیٹ میں رہے اور اسکے بعد ولادت ہوئی۔ دوسری بات یہ کہ آپ کی والدہ نے وصیت فرمائی تھی کہ مجھے حضرت جانم کے گنبد میں دفن نہ کیا جائے۔ اسی لیے آج بھی انکا مزار حضرت میراں جی شمس العشاق اور برہان الدین جانم کے گنبد کے چبوترے سے بائیں کی طرف کچھ فاصلہ پر زیادہ نشیب میں ایک چھوٹی سی چار دیواری میں ہے۔ جسکا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے اور وہاں زیارت کی کسی مرد آدمی کو اجازت نہیں دی جاتی۔

اب یہاں ہم حضرت جانم کا وہ مرثیہ پیش کرتے ہیں جو انہوں نے اٹھارہ یا بیس سال کی عمر میں اپنے والد کی وفات کے موقع پر لکھا۔ یہ دکنی ادب میں پہلا دستیاب شدہ مرثیہ ہے جو کسی شخصیت پر لکھا گیا ہے۔

مرثیہ بر وصال حضرت میراں جی شمس العشاقؒ

من تصنیف حضرت برہان الدین جانمؒ

شاہ میرانجی جگ رتن سو ہر[1] رتن منجہ دل کندنا — یتا چھ نا اپنی ادن ہے کچھ حکم الٰہی کا
منجہ دیپتی کا آفتاب تھا اور نین کا مہتاب تھا — ان چھپ گیا جوں خواب تھا ہے کچھ حکم الٰہی کا
کرسوں صفت میں شاہ کی دین تس ملیا آہی بھی — نئے چھوڑ منجہ اس راہ تھی ہے کچھ حکم الٰہی کا
توں جگ میں منجہ سر تلج تھا ہر دو جہاں منجہ راج تھا — تج بن نہ منجہ کچھ کاج تھا ہے کچھ حکم الٰہی کا
سوہی میراں منجہ پیر ہے۔ اس روز کا دستگیر ہے — تج بن میں بے پیر ہے ہے کچھ حکم الٰہی کا

اختلاف نسخ | ۱۔ آہ تھی۔

فرہنگ | ۱۔ تربیت دینے والا ۲۔ دن ۳۔ ہوتے تک ۔ وہی ۵۔ سہارا

دوہرہ

بن تیل دیوا کیوں بلے بن لو کہہ نکس جوں پھرے
یوں جیو با ول تج بنا جل جل پھی تڑ پیا کرے
ساجن ساجن کہوے کراو نیند نہ آوے چھک
پلک لگے جس نیند کی جن کوں کیا ہے دوکہ

ہیرا تجکو کیا کیوں رکھوں نس دن رہے کرتیا جوکوں — شہ بن دکھڑا کیوں کنت ہوں بے کچھ حکم الٰہی کا
تجہ سوز برہے داغ پر جوں موم گلتا اگ پر — یوں دوکہ لکھیا منجہ بھاگ پر بے کچھ حکم الٰہی کا
تج بن منج کوں پیاس ہے جیوں کی کہر بالا تاس ہے — او ٹیا رگت تن ماس ہے بے کچھ حکم الٰہی کا
تیوں تو منجھے تھا بستی سوں شہیراں جی جیستی — بے کچھ حکم الٰہی کا
جیونا جرم اس سات تھے کیتک جیو جیوں کاٹ تھے — حکم کیا لئی دھات سے بے کچھ حکم الٰہی کا

دوہرہ

تج بن دہاری دکہہ کی اوسر پڑی منجہ آئے کر
تج بن ہیٹھنکا کون تو جھے کس جا پکاروں دعائے کر
میں تج بنا یوں دکھی جوں بن سستی چکور
یوں منجہ تلتل جیئی تج بن کمینا اور

جس وقت ان طالب کیتا تن کوں معزرت کچ نہ تھا — تسلیم کر جیو را دیتا بے کچھ حکم الٰہی کا
مناجات سبھی وقت سحر رو دھاں ملایک دیتے خبر — بلاؤ سکلے کر خبر بے کچھ حکم الٰہی کا
کئے رب کا فرمان ہے آج قبض کرنا جان ہے — یاو رسنو جن کان ہے بے کچھ حکم الٰہی کا
کئے وقت ہمارا آج ہے ہم تیں رہنا تم شاد ہے — دنیا تو یو برباد ہے بے کچھ حکم الٰہی کا
منج بانج نا کچ غم کرو توکل تکیا اس پر دھرو — بولیا چالیا تم نل کرو بے کچھ حکم الٰہی کا

دوہرہ

دھن میت نا مات آوسی سبھی ملیں اگے چھوڑ کر
مندھر سپنن نا سپن پڑسی اندھاری گور کر
کوئی نا رہیں اتجے جگ دنی سب جگ مرنہار
کوئی آگلو کوئی پیچھیں پنت لگے سبھی چلنہار

دا کر جیوں [illegible] گیا [illegible] سانس [illegible] کہیں [illegible] اتاس ہے [illegible] پیلا موم (ابتدائی نکلا) جوں بجہاں تو کیتی [illegible] گئی [illegible] دھاری [illegible] پنہسا پیکا [illegible] کیسے [illegible] کمیں [illegible] مناجات [illegible] جیہاں [illegible] قبھی [illegible] بخبر [illegible] تھے [illegible] معاف [illegible] چپک گئے [illegible] نا یسے [illegible] دونی۔ [illegible] سیتھیں۔

[illegible] چلے [illegible] درخت [illegible] اخیس [illegible] کرتا ہوں (و) [illegible] گلہ کردن [illegible] کیسے کہوں [illegible] فراق [illegible] قسمت میں یہ دکھ لکھا تھا [illegible] خون [illegible] سہارا [illegible] ایسی زندگی [illegible] گذارنا جو ہے [illegible] شکایت کرتے ہے [illegible] رنج وغم کی دھار یا تم [illegible] وہ [illegible] درس کون سمجھائے [illegible] پیلا کر پکاروں [illegible] جاند [illegible] لمحہ بہ لمحہ [illegible] اضطراب [illegible] جائے پناہ [illegible] روح جان [illegible] سب [illegible] کہے [illegible] بغیر [illegible] دولت [illegible] دوست [illegible] آئے گا [illegible] اس دنیا میں [illegible] واسطہ

بے کوئی ہور دیا سب کوئی پیالا یہ پیا　　جس جیو دیا اس موت دیا جے کچھ حکم الٰہی کا
بے غوث قطب اوبڑے جی[۲۰] کے جکت[۲۱] رتن جڑے　　سو[۲۲] ہے اندھارے گور پڑے جے کچھ حکم الٰہی کا
بے تحت شاہ سلطان ہے نا کوئی رہے اس جان ہے　　کل من علیہا فان ہے جے کچھ حکم الٰہی کا
منجہ ہون دیو مشغول سوں نا کوئی اٹھو تم غول سوں　　خشنود رب کے قول سوں جے کچھ حکم الٰہی کا
نا منجہ پیچھیں کوئی روونا ارواح میری غم ہوئے نا　　فرمان اس کا سر لینا جے کچھ حکم الٰہی کا

دوہرہ

ہنا لئیں تم دکہ لئی نا غم کرو اس بات کا
الموت تجھے خارج نہیں سنسار سہنا رات کا
جے کوئی جیویں سب مریں دایم جیوے نہ کوئے
قیامت لگ جے جیویں تو آخر مرنا ہوئے

سرور میرا ڈھل گیا کرتار[۲۳] سجایا ان کیا　　جو ان کیا میں سر لیا جے کچھ حکم الٰہی کا
تاریخ حضرت سال نوسودو اس پر اگلے بھی دو　　دین[۲۴] مدت وفات یو سنو جے کچھ حکم الٰہی کا
اربع[۲۵] تسوں یو سال ہے ماہے کہوں شوال ہے　　رحلت کئے اس حال ہے جے کچھ حکم الٰہی کا
تاریخ بیت و پنج بود بسیار گریاں رنج شد　　درحال واصل گنج خود جے کچھ حکم الٰہی کا
شب پنجشنبہ روشن کیا ہجرت منور[۲۶] کیا　　جیوڑا[۲۷] قبض کر ان لیا جے کچھ حکم الٰہی کا

دوہرہ

مکہ آئینہ جھل[۲۸] ہے روشن منور کیا
آنکھیں کھول سکلوں دی خبر کلمہ عرض کر جیو دیا
شہ[۲۹] باج جگ اجھار ہے اور دیسے تاریک جہاں
سو سنسار میں تھے یوں چھپا جو چاند لگیا گریاں ۳۹

اب لینے نا ہیں سکت کیتا[۳۰] کر دل رد رد صفت　　قایم قیامت اس وقت سے جے کچھ حکم الٰہی کا

نسخہ	۲۰ بیکت ۲۱ کہیں ۲۲ نوسودو اس پر اگلے بھی دو ۲۳ دو دن مدت وفا شو ۲۴ اربع سو یو ۲۵ کوں ۲۶ پور ۲۷ جال ۲۸ پانچ
	جگ اجاپ ہے سنو سار میں تھے یوں چھپا ؟ جوں چاند لگیا گراہن اور دیسے تاریک جہاں
حاشیہ	۲۵ جھی کہ تخت ملہ میرے بڑا بیں ۲۶ وہی ۲۷ خدا نے جیسا مناسب سمجھا اس نے کیا ۲۸ زوج ۲۹ گرہ ۳۰ کتنی کہاں تک۔

تربت آئی چل کر لیتی امانت جھیل کر — ایسے ربی کے کھیل کر بے کچھ حکم الہیٰ کا
باتی دیوا کیوں بلے جیوڑا سو میرالیوں جلے — قضا اللہ کچھ نا چلے بے کچھ حکم الہیٰ کا
دنیا کا منجہ پدر[29] ہے اور دین کا منجہ انگر ہے — اس دکھ[30] میں منجہ عذر ہے[29] بے کچھ حکم الہیٰ کا
دنیاں[31] منجہ نا قبل کیا اور دین منجہ حاصل کیا — یا حق منجے[32] واصل کیا بے کچھ حکم الہیٰ کا

دوہرہ

جگ جیتا ون من تو میراں قلب دو دکھ ایساتوں دیسے
سو ہیچ جیونا[33] ئی سانچ کر سنگت تیری جی سے
تج بن سکہ نا پاؤں تل منجہ دو کہ گھنیرا ہوئے
اکھ[34] تیرے یوں لکھے میٹ نہ سکے کوئے

تج بن گھڑیا[35] جوں خواب ہے نیناں بھی پر آب ہے — یوں دو کہہ لکھیا منجہ بھاگ ہے بے کچھ حکم الہیٰ کا
سینا دکھا ہے دکھ کھٹا[36] منجہ دو دل لائی تج بنا — بے کچھ[37] حکم الہیٰ کا
تج بن رہنا مشکل ہے مشکل سکے کر حیل[38] ہے — شب روز مشغول دل ہے بے کچھ حکم الہیٰ کا
تج بن بڑی منجہ بھول ہے حال پریشاں کل ہے — توں حق کا مقبول ہے بے کچھ حکم الہیٰ کا
روضہ منور پور ہے مقام تجہ سو پور ہے — دین دنیا میں ظہور ہے بے کچھ حکم الہیٰ کا

دوہرہ

جس[36] کا پیا ل بچھڑے رہے دکھڑا اگ ان کوں بھوت ہے
جیونا سو اس کوں جھوٹ ہے ہر ہر گھڑی سوت ہے
توں جوں ار کر چندن[37] کا اور دیسے بھریا باس
جو پھر بنواس تل کریں[37] پھرے باس

من گریہ کر دم ہر زماں حال پریشاں شد ازاں — مرشید مطلق رہنمائی بے کچھ حکم الہیٰ کا
شریعت میں رہ راس تھا طریقت بھی اس پاس تھا — حقیقت میں خاص[38] خاص تھا بے کچھ حکم الہیٰ کا

باقی صفحہ (۳۰) پر

اختلاف نسخ: (۲۸) جال (۲۹) ... ہے (۳۰) دو کہہ کاں (۳۱) دنیاں سچے منجہ
تجے منجہ (۳۳) یچ (۳۳) جینا (۳۴) گھڑی (۳۵) جنم (۳۶) بھیا کیوں کننا (۳۶) نسخہ الف میں اس کو دوہرہ کی بجائے شعر لکھ کر آخری ٹکڑا ... کی جگہ
ردیف لکھا ہے۔ بلحاظ ترتیب یہ غلط ہے۔ (۳۷) بھو تھم مورے باس (۳۸) خاص الخاص۔

فرہنگ: (۲۸) میری روح (۲۹) اس طرح جل رہی ہے جیسے چراغ کی بتی جلتی ہے۔ (۳۰) دنیا میں ہی (۳۲) الفاظ (۳۳) کہنا (۳۷) چندن کا درخت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

نہرو نامہ

آزادی کے بعد کے ان بیس[2] برسوں میں ہماری تاریخ کے کئی باب لکھے گئے ہیں۔ ملک آزاد ہوا۔ ایک جمہوری نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ سوشلسٹ سماج کا تصور سامنے آیا سماجی مساوات اور عدل کا خواب دیکھا گیا۔ غیر مذہبی ریاست قائم ہوئی۔ غیر جانب داری اور امن کا پرچم بلند کیا گیا۔ تعمیر کے منصوبے بنائے گئے۔ اور آگے بڑھنے کے نشانے طے کیے گئے۔ ان سب باتوں کے پیچھے کس کا ذہن تھا؛ کس کی آواز تھی جو قدم قدم پر حوصلہ بڑھاتی تھی؛ وہ کون تھا جس کا دل پھول سے بھی نرم اور جس کا احساس شیشے سے بھی نازک تھا؛ وہ کس کی شخصیت تھی جس کے بانکپن کے سامنے زمین راستہ چھوڑ دیتی تھی اور جس کے اعتماد کے سامنے چٹانیں پگھل جاتی تھیں۔ ایک جواہر لال نہرو کے جانے سے کیا کیا نہیں چلا گیا! گاندھی کے بعد وہ ملک کے محبوب ترین رہنما تھے۔ اردو شاعری نے چونکہ ہر قدم پر تحریک آزادی کا ساتھ دیا ہے۔ اس میں قومی رہنماؤں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

گاندھی جی کے بارے میں معلوم ہے کہ جتنی موثر، حسین اور جاودان نظمیں ان کے بارے میں اردو میں لکھی گئی ہیں۔ ان کی نظیر ہندوستان کی کوئی دوسری زبان شاید ہی پیش کر سکے۔ یہی بات ان نظموں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے جو نہرو کے بارے میں لکھی جا رہی ہیں۔ ساغر نظامی ہمارے ان شاعروں میں سے ہیں جنھیں جواہر لال نہرو سے ذہنی عشق تھا۔ وہ انھیں صرف ایک قومی رہنما کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک سچے ہمدرد اور بے مثل انسان کی حیثیت سے بھی جانتے تھے۔ نہرو نامہ کے ایک ایک لفظ سے ان کی عقیدت اور محبت پھوٹی پڑتی ہے۔ اُردو میں نہرو پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں جوشِ جذبات، شدتِ احساس اور زورِ بیان کے اعتبار سے یہ نظم نہایت اہم ہے۔ اُردو میں نہرو پر اس سے زیادہ کسی ایک شخص نے نہیں لکھا۔ نہرو کی رعایت سے کتاب کی آرائش میں گلاب کے رنگ کا تمام خیال رکھا گیا ہے۔ کتاب طباعت کا ایک نیا معیار پیش کرتی ہے۔ اُردو میں بہت کم کتابیں اس اہتمام سے شائع کی جاتی ہیں اشاعت میں جس سلیقے اور خوش مذاقی سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اگرچہ نظم کا بنیادی موضوع نہرو کی ذات ہے، لیکن اسے حیات اور موت کی کشمکش کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔

---

[1] نہرو نامہ (ساغر نظامی) ادبی مرکز، ۲۵۹ پہنڈارہ روڈ نئی دہلی ۱۱۔ قیمت ۱۳ روپے صفحات ۶۳ + ۲۰۰

بادِ صرصر کے گرم جھونکوں میں　　　اک نئی فصلِ گل خراماں ہے
نکہتِ گل کی نرم چاپ نہیں　　　ہے دھمک یہ خزاں کے قدموں کی
نہیں افسردگی، تبسم ہے　　　آہ کے بھیس میں ترنم ہے
صبح دم پھول کے بکھرتے ہی　　　سینکڑوں غنچے مسکراتے ہیں
حکمت مرگ و زیست کیا کہیے
موت اسرار، زندگی اسرار

آخری شعر کا مرکزی خیال پوری نظم پہ ایک قوس کی طرح محیط ہے۔ ساغر نظامی نے مرثیوں یا تاثراتی نظموں کے عام پیرایہ سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی ہے ایک عام شاعر اس موضوع پہ قلم اٹھاتا تو شاید یا سوانح حیات نظم کر دیتا یا پھر تعریفوں کے پل باندھ کر رکھ دیتا۔ ساغر نے زندگی اور موت کے بنیادی مسائل کو سامنے رکھا ہے۔ اور نہرو کو محض ایک رہنما، یا ادیب یا مورخ کی حیثیت سے نہیں بلکہ اعلیٰ انسانی قدروں کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے، یہ وہ قدریں ہیں جن سے زندگی کا سہاگ قائم ہے اور جنھیں ہر دور میں اونچے انسانوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے اور جن کی بدولت یہ دنیا رہنے کے قابل اور یہ زندگی محبت کرنے کے لائق ہے۔ ساغر نظامی نے حسن، خیر، حق پہ الگ الگ عنوان قائم کر کے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ نظم مختلف پاروں میں بکھری ہوئی ہے۔ لیکن خیال کی مرکزیت نے سب میں ایک طرح کا معنوی ربط پیدا کر دیا ہے۔ نظم کے مطالعے سے ایک ایسے ذہن کا تصور سامنے آتا ہے۔ جو نہرو کی شخصیت سے بے حد متاثر رہا ہو گویا دل خون ہو گیا ہو اور آنسو مصرعوں میں ڈھل رہے ہوں۔ ایسے موقعوں پر جذبے کا وفور، الفاظ کی روانی، ترکیبوں، تشبیہوں اور تلمیحوں کی نادرہ کاری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ؎

نازشِ روزگار اور تنہا　　　مسکراتی بہار اور تنہا
لاکھ طوفان دل میں اور خاموش　　　مستقل بے قرار اور تنہا
کبھی مسرور اور کبھی مغموم　　　کبھی بے اختیار اور تنہا
کون ہوتا ہے رازدارِ جنوں　　　دامنِ تار تار اور تنہا
ترکِ دنیا ہے اور کس کا نام　　　وارثِ اختیار اور تنہا
اور کس شے کو تیاگ کہتے ہیں　　　صاحبِ اقتدار اور تنہا

(ب)

وہ مورخ، ادیب، دانشور　　　اہل دل، اہل ذوق، اہل نظر
تازہ نقشِ حیات کا نقاش　　　وہ نئے ذہن و فکر کا معمار

کشش حسن اس کی شہر بہ شہر — اس کی محبوبیت دیار دیار
اس کی تیز و حسین و شوخ نظر — اک کرن آفتاب کی سی تھی
دل نہ تھا اس کے گرم سینے میں — ایک پتی گلاب کی سی تھی

ویر کے ساز دل کا سوز لیے — کرشن کی شوخ بانسری کا فسوں
رام اور لکشمن کا تیاگ لیے — اور بھرت کی بلندیٔ کردار
روح سیتا کا نور دل میں لیے — آندھیوں میں لیے وفا کا چراغ
بدھ کے احساس کے کنول کی مہک — اور محمدؐ کے پھول کی خوشبو
آریائی روایتوں کا جمال — عرب اطوار زندگی کا جلال
رزم گاہِ حیات میں آئی — آنسوؤں میں دل اشوک لیے
دل خسرو کا سوز و ساز لیے — روح محبوب کا گداز لیے
روح اکبر کا اضطراب لیے — اک نئے عشق کی شراب لیے
غیر فانی جمال اجنتا کا — تاج کا حسنِ لازوال لیے

وطن کی شان میں یہ چند شعر بھی ملاحظہ ہوں:—

زندہ باد اے مرے عظیم وطن
رہیں شاداب تیرے کوہ و دمن
یونہی نغمہ کناں رہیں پیہم
یہ تری نربدا و گنگ و جمن
خوشبو پھیلے تری بہار بہار
پھول مہکیں ترے چمن بہ چمن
زندہ باد اے مرے عظیم وطن

ساغر نے جذبات کو فکر کی آنچ دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسانیت کی اعلیٰ قدریں ضائع نہیں ہوتیں۔ عظیم شخصیتوں کے چلے جانے کے بعد بھی ان کے خیالات زندہ رہتے ہیں۔ وہ خوشبو کی طرح فضا میں پھیل جاتے ہیں اور پیار بن کر دل میں اتر جاتے ہیں۔ زندگی اور موت کی دھوپ چھاؤں میں یہی خیالات کبھی نعرۂ حق بن کر ظاہر ہوتے ہیں کبھی نغمۂ محبت بن کر پھول کی طرح کھلتے ہیں اور کبھی فلسفۂ عمل بن کر دلوں کو گرماتے ہیں ؎

آج بھی اُس کا دل دھڑکتا ہے۔

اپنی دھرتی کے ذرے ذرے میں گونج ہے نغمۂ عقیدت کی
کھیتوں میں بھرنوں میں ہواؤں میں
نہرو مرجھا گیا ہے مثلِ گلاب لیکن اک روز خاکِ گلشن سے
پھر وہ مثلِ گلاب پھوٹے گا

زندگی کیا ہے اور موت ہے کیا کیا ہیں اسرارِ صبح و شام نہ پوچھ
ہیں رموزِ حیات بے پایاں بزمِ تخلیق کا نظام نہ پوچھ
شمع سے شمع جلتی آتی ہے
پھول سے پھول کھلتے آئے ہیں

ایک بند اور سنئے:—

ایک سورج ہزار ہا کرنیں ایک جلوہ ہزار ہا پرتو
جامِ سقراط سے کبھی چھلکا کبھی روحِ صلیب سے ٹپکا
خونِ انساں کی آبرو بن کر اک نئی چشمِ جستجو بن کر
کرشن کی بانسری میں لہرایا نغمۂ زندگی کی لے بن کر
اور کبھی ارضِ کربلا پہ بہا آلِ احمد کا یہ لہو بن کر
کبھی باپو کے نطق میں ابھرا امن عالم کا مدعا بن کر

ساغرؔ نے صرف ایک پہلو ہی کو مدنظر نہیں رکھا دوسرے رُخ سے بھی فن کارانہ انداز سے پردہ اٹھایا ہے۔

اک طرف بھیڑ ہے اندھیروں کی اک طرف نور کا تلاطم ہے
چشمہ جاری ہے زندگی کا مگر تشنہ کامی سی تشنہ کامی ہے

یہ نظم نہرو کی یاد میں کسی ایک شاعر کا نہیں، بلکہ اردو کا نذرانۂ عقیدت ہے۔ یہ نوحہ یا مرثیہ نہیں بلکہ نہرو کی پرکشش شخصیت ان کے جمال و جلال، ان کی خوئے دل نوازی، خلوص و ایثار، امن عالم کے لیے ان کی جستجو، ان کی سیاسی غیر جانب داری، صنعتی اور سیکولر ہندوستان کا ان کا خواب، سوشلسٹ سماج کی ان کی تمنا، ان کی ذہنی عظمت، عوام سے ان کی محبت، ہندوستان کا درد، یہ سب کچھ اس شعری دستاویز میں جمالیاتی احساس اور ملائمت لطافت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ساغر نظامی اس نظم کے لیے اُردو دنیا کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

طیب انصاری

ادب کو عناصر خمسہ کی دین

اردو ادب کی خوش بختی سمجھیے کہ ایک ہی عصر میں پانچ بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں ورنہ بڑی شخصیتیں خال خال ہی پیدا ہوا کرتی ہیں۔ اُردو ادب کا موجودہ ڈھانچہ آزادؔ، نذیر احمد، شبلیؔ، حالیؔ اور سرسید کی فکر رسا کا حاصل ہے۔ اور ان کی تحریک اصلاح کا حاصل بھی۔ جدید ادب کے ان معماروں نے آنے والی نسل کے لیے حیات و انقلاب کی بنیاد کو فراہم کردیا تھا۔ اور ان ہی بنیادوں پر ہم آج نشیمن پر نشیمن تعمیر کرتے جا رہے ہیں۔ قصہ جدید و قدیم کا آغاز ادب میں ان ہی عناصر خمسہ کا نتیجہ ہے، انھیں بحثوں کی وجہ سے ہم آج بھی جدید ترین ہوتے جا رہے ہیں اور درحقیقت ادب میں فکر کرنا خود کی تلاش، اجتماعی بہتری کا شعور اور ایسی ہی بہت ساری خوبیاں ہمیں ان ہی شخصیتوں سے ورثہ میں ملی ہیں۔ گو یہ شخصیتیں ایک ہی دور سے متعلق ہیں۔ لیکن فکر و خیال کے اعتبار سے چند کا تعلق ماضی سے ہے۔ اور چند کا حال سے اور ایک آدھ شخصیت ایسی بھی ہے جو مستقبل پر نظر رکھتی ہے۔ اسی فکر کے اختلاف و اختلاط نے سوچنے اور سمجھنے کی راہوں کو کھول دیا۔ اور اسی کے نتیجے میں ہمارا ادب فرد و سماج کے مسائل سے بھرپور نظر آتا ہے۔

آزادؔ کی کئی ایک تحریریں ہیں مثلاً بچوں کی اردو ریڈرس، اردو کی قواعد، قصص ہند، نصیحت کا پھول، دربار اکبری، سخندانِ فارس، نیرنگ خیال اور آبحیات، لیکن آزادؔ کو "آبحیات" کی وجہ سے شہرتِ دوام حاصل ہوئی۔ آزادؔ ہمارے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے پہلی بار بچوں اور عورتوں کیلئے لکھنا شروع کیا۔ چنانچہ "نصیحت کا کرن پھول" اور لڑکیوں اور بچوں کے لیے قصص ہند لکھا

نذیر احمد نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی اور عورتوں کے لیے ادب تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ اردو ادب میں صاحب طرز جدید اور پہلے ناول نگار کی حیثیت سے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں "ابن الوقت" کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ناول زبان و بیان ہی کے اعتبار سے اہمیت نہیں رکھتا بلکہ فیلڈنگ کے الفاظ میں یہ اپنے معاشرے کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ نذیر احمد نے "ابن الوقت" میں اپنے سماج اور اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے۔

شبلیؔ نعمانی کی "علم الکلام"، "الکلام"، موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ، شعر العجم، سیرت النبی، المامون اور الفاروق ایسی کتابیں ہیں جو ادب اور زندگی کی قدروں کو بدل دیتی ہیں۔ شبلیؔ کی تحریریں تاریخ تو ہیں لیکن یہ تاریخ ساز بھی ہیں۔ شبلیؔ ذہین انسان تھے وہ انسان کی زندگی کے تقاضوں کو محسوس کرتے تھے۔ قوموں کی زندگی پر ان کی نظر گہری تھی۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنے فکر و خیال کے اظہار میں بیباکی اور سنجیدگی کو اختیار کیا ہے۔

۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق کی اجرائی عمل میں آئی ۱۸۷۵ء میں سرسید نے جس کالج کا سنگ بنیاد رکھا تھا

سن ۱۹۲۰ء تک پہنچتے پہنچتے یہ چھوٹا سا کالج یونیورسٹی میں بدل گیا۔ لیکن ہم ادب کی تاریخ میں علیگڑھ یونیورسٹی کو تحریک کی حیثیت سے جانتے اور سمجھتے ہیں۔ آثار الصنادید، کلمتہ الحق، مسلہ تصور شیخ، سفرنامۂ لندن، تاریخ بجنور، رسالۂ فوائد الافکار، خطبات احمدیہ، قرآن کی تفسیر اور اسباب بغاوت ہند۔ ان کے اہم نثری کارنامے ہیں۔

سچائی، سادگی اور خلوص کے پیکر حالی اردو ادب پر ہُما کی طرح سایہ فگن ہیں۔ ان کی ذات بابرکات نے اردو ادب کے سرمایہ کو فکر و خیال سے مالامال کیا ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری اردو تنقید کی پہلی کتاب ہے۔ اس تصنیف کی وجہ سے ہم اور ہمارا ادب زندگی سے قریب تر ہو گیا۔ مقدمۂ شعر و شاعری کے علاوہ حیات جاوید، حیات سعدیؒ اور یادگار غالب تینوں سوانحی کارنامے ہیں۔

آزاد نے تذکروں اور تنقیدوں کو سامنے رکھکر "آبحیات" کی ترتیب کی ہے۔ عبارت میں رنگین اور چکتے ہوئے لفظوں کا استعمال کیا ہے۔ آبحیات انشاء پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے اس کی تنقیدی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ ادب کی تاریخ کی حیثیت سے بھی آبحیات مکمل کتاب نہیں ہے۔ آبحیات میں حقیقت کم اور من گھڑت واقعات کی بہتات ہے۔ اردو زبان کی ابتداء کے بارے میں جو نظریے آزاد نے پیش کئے ہیں وہ زیادہ تر قیاس پر مبنی ہیں۔ آزاد بنیادی طور پر انشاء پرداز ہیں۔ نقاد نہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے کسی بھی شاعر کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا ہے۔ ان کا تخیل بے لگام رہا ہے۔ ساتھ ہی وہ جانبداری بھی برتتے رہے ہیں۔ آبحیات کی اہمیت باوجود ان کوتاہیوں کے اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ آبحیات اردو شاعروں کا پہلا تفصیلی اور جامع تذکرہ ہے۔ آبحیات ہی کے طفیل میں ہم میر اور سودا سے بھی واقف ہو سکے ہیں آبحیات نے اردو کے قدیم شاعروں سے عام دلچسپی پیدا کر کے لوگوں میں ادبی تحقیق کا شوق اور اردو شعر و ادب کی تاریخ لکھنے کا خیال پیدا کر دیا۔ اردو زبان نے فارسی انشاء پردازی سے جو فائدہ اٹھایا ان کا اعتراف کرتے ہوئے ان نقصانات کی طرف آبحیات ہی نے ہمیں سب سے پہلے توجہ دلائی جو فارسی کی رنگین اور تخیلی انشاء پردازی کی تقلید سے اردو کو پہنچے۔ اردو نثر کی طرح اردو شاعری کی اصلاح میں بھی آبحیات کا بہت کچھ حصہ ہے۔ اردو شاعری خاص کر غزل کے نقائص کی طرف سب سے پہلے آزاد ہی نے توجہ دلائی۔ درحقیقت آبحیات نے مقدمہ کے لئے فضا کو ہموار کیا تھا سب سے پہلے آزاد ہی نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ شاعری کو محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں بنانا چاہئے۔ آبحیات ایک طرف اردو شاعری کے ارتقاء کی تاریخ پیش کرتی ہے تو دوسری طرف ہماری سوسائٹی کا ایک مکمل نقشہ دکھاتی ہے۔ جس کی نظیر کوئی دوسری تصنیف پیش نہیں کر سکتی۔ آزاد نے یہ کتاب لکھکر ہماری معاشرتی اور ادبی تاریخ کے نہایت اہم پہلوؤں کو ابدی گمنامی سے بچا لیا ہے۔

آبحیات کے بعد گل رعنا، اور شعر الہند" دو مزید تذکروں کا اضافہ ہوا لیکن یہ آبحیات کے فراہم کردہ معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کرتے اور نہ ہی زبان و بیان کے اعتبار سے غیر معمولی کارنامے ہیں۔ یہ درحقیقت آبحیات کا

تقلید میں لکھے گئے تذکرے ہیں۔

اُردو کے عناصرِ خمسہ میں حالی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حالی کا دور درحقیقت تاریخ اُردو ادب میں انقلابی حیثیت رکھتا ہے۔ آئینِ نو اور طرزِ کہن کی کشمکش میں حالی نے ہراول کی طرح نئے رجحانات اور نئے افکار کی رہبری اور رہنمائی کی۔ حالی کی حیثیت اس سپہ سالار کی سی تھی جنھیں ذہین سیاستدانوں اور فوجی ماہرین کی تائید حاصل رہتی ہے۔ حالی کی تحریروں کے پیچھے آزاد، ہالرائیڈ، شبلی، نذیر احمد اور سرسید کا ذہن کارفرما رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حالی نے اپنے ہمعصروں سے فکر و خیال کو مستعار لیا ہے بلکہ ہر ذہین انسان کی طرح انھوں نے اپنے ماحول سے اثر قبول کیا ہے۔ لیکن اسمیں شبہ نہیں ہے کہ حالی کے ذہن پر سرسید نے تسلط حاصل کر لیا تھا۔ اس وجہ سے حالی کی اپنی ذاتی رائے نہ ہونے کے برابر تھی بقول مولوی عبدالحق، حالی ہمارے ان بزرگوں میں سے ایک ہیں جو ملت کی زبوں حالی پہ کڑھتے رہے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں حالی کی حیثیت ایک دردمند دل کی سی ہے۔ حالی نے سرسید کی تقلید کسی بے چارگی کی وجہ سے قبول نہیں کی بلکہ وہ اپنے تئیں یہ سمجھتے تھے کہ ملت اسلامیہ کی نجات سرسید کے خیالات کو عملی صورت دینے میں ممکن ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اور بعض اوقات سرسید کی شخصیت سے اختلاف پیدا ہونے کے باوجود بھی علیگڈھ تحریک سے انحراف نہیں کیا۔ اس سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حالی کو اپنی ملت سے کتنی والہانہ محبت تھی۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھنے کے بعد ہم حالی کی نظم و نثر کو پڑھیں تو ہمیں ان کی نظم اور نثر میں سرسید کے خیالات کی گونج نظر آئے گی۔ حالی نے آزاد اور ہالرائڈ کی مدد سے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ ہمارا ادب صرف حصولِ مسرت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ میتھو آرنلڈ کے خیال سے متفق نظر آتے ہیں کہ ادب تنقیدِ حیات بھی ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ غزل کا دروازہ زندگی کے مسائل کیلئے کھول دینا چاہیئے تو اس کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ وہ غزل کے مزاج کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ حالی قتیلِ غزل نہیں ہیں بلکہ معمارِ غزل ہیں۔ جنھوں نے اُردو غزل کو نیا آب و رنگ دیا اور نیا آہنگ بھی۔ اسی طرح انھوں نے اردو شاعری میں مقصدیت واقعیت اور حقیقت پہ زور دیا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مقدمۂ شعر و شاعری صحیفۂ آسمانی تو نہیں ہے لیکن اپنی افادیت کے اعتبار سے اس کی اہمیت مسلّم حقیقت بن گئی ہے۔

تنقید کی تاریخ میں مقدمہ کی اہمیت اس وجہ سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ حالی نے نظریۂ ادب کو انسانی مزاج کے قریب تر کر دیا ہے۔ انسان اپنی ذات میں محشر بھی ہے اور محشرِ خیال بھی وہ خواب و خیال کی دنیا میں محصور و مقید رہنا چاہتا ہے۔ اور بسا اوقات اس قید و بند کی زندگی سے بغاوت کر بیٹھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ حسین خیالات اور رنگین خوابوں کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ اس بغاوت کے ذریعہ اپنی مادی ضروریات کا اقرار و اعتراف بھی کرتا ہے۔ چونکہ ادب ترجمانِ زندگی ہے۔ اور خادمِ انسانیت بھی۔ اس وجہ سے ادب کو ہمارے مزاج سے قریب تر ہونا چاہیئے بعض اوقات وہ ہمارے لئے ایک ہتھیار بھی بن جاتا ہے۔ جس کی مدد سے ہم انسانیت دشمن عناصر کی

سرکوبی کرتے ہیں۔ جیمس نیرل کے الفاظ میں ادب پیرو دگیندہ بھی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہر پروپگنڈہ ادب ہوتا ہے۔ اعلیٰ ترین قدروں اور اعلیٰ ترین اصولوں کو عام کرنا ہر بھلے مانس کا شیوہ ہے۔ اس وجہ سے ایک ادیب و شاعر بھی اعلیٰ ترین قدروں کو عام کرنے کےلئے ادب کو استعمال کرتا ہے۔ حالیؔ نے اسی متوازن نظریئے کو مقدمہ میں پیش کیا ہے۔ جہاں وہ شاعری میں مقصدیت، واقعیت اور حقیقت پر زور دیتے ہیں۔ وہیں وہ سچائی، سادگی اور خلوص کے بھی قائل ہیں۔

حالیؔ بحیثیت نثر نگار اپنے ہمعصروں سے پیچھے نہیں ہیں۔ انھوں نے مقدمہ لکھکر جہاں اپنے تنقیدی شعور کو منوایا ہے وہیں سادہ نثر کا بہترین نمونہ بھی چھوڑا ہے۔ حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدیؒ اور یادگارِ غالبؔ حالیؔ کے نثری اور سوانحی کارنامے ہیں۔ ہمیں اس بات کا حق حاصل ہے کہ حالیؔ کی ان تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیں اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیت سوانح نگار حالیؔ کامیاب نہ رہے۔ کیونکہ سوانح نگاری کی پابندیوں کو وہ قبول کرتے نظر نہیں آتے۔ حیاتِ جاوید ہو کہ حیاتِ سعدیؒ یا پھر یادگارِ غالب ہر جگہ حالیؔ جانبدار نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے شبلیؔ نے ان کی سوانح نگاری کو "قصیدہ خوانی" سے تعبیر کیا ہے۔

شبلیؔ نعمانیؒ ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں میں جنکا تعلق شبلیؔ کے دور سے رہا ہے شبلیؔ سب سے ذہین اور صاحب الرائے انشاپرداز مانے جاتے ہیں۔ وہ دوراندیش بھی تھے اور دوربین بھی۔ ان کی انفرادیت مسلّم حقیقت ہے۔ اس وجہ سے ان کو پہلا ہندوستانی کہا گیا جو یونانی فکر و خیال کا مالک ہے۔ شبلیؔ اپنے عصر سے اختلافات بھی رکھتے ہیں۔ اور وہ اپنے سماج کا جز وبھی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ سماج کے مسائل سے واقف ہیں۔ لیکن ان کا فکر طائرِ قفس نہیں ہے بلکہ وہ شاہین وار فضا کی بلندیوں میں پرواز کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی کیفیت عقاب کی سی ہے جو فضاؤں میں پرواز تو کرتا ہے۔ لیکن جسکی نظر ہمیشہ اپنے نشیمن پر ہوا کرتی ہے۔ برخلاف اس کے سرسید اور حالیؔ اپنے وطن اور اپنے سماج میں محبوس و مقید نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں دروں بینی تو ہوسکتی ہے لیکن دور بینی نہیں ہے۔ شخصیتوں کا یہ اختلاف فکر و خیال میں دوری پیدا کرتا ہے اور اس وجہ سے ان لوگوں نے آگے کو چلکر اپنی نئی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے سرسید ہوں کہ حالیؔ یا شبلیؔ ہم ان کی تحریروں میں۔ ان ہی نقوشِ قدم کو دیکھتے ہیں جو کبھی ایک ساتھ نظر آتے تھے۔ لیکن بعد کو وہ جدا ہو جاتے ہیں۔

شبلیؔ نے حالیؔ کی طرح ملت کی زبوں حالی پر آٹھ آٹھ آنسو بہائے ہیں اور شبلیؔ نے سرسید کی طرح اصلاحِ ملت کیلئے عملی قدم اٹھایا ہے وہ حالیؔ اور سرسید کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ علیگڈھ یونیورسٹی سے وابستگی اس کا بیّن ثبوت ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ سرسید نے مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کو اختیار کرلینے میں ملت کی نجات سمجھی برخلاف اس کے شبلیؔ "مغربی تعلیم کو نسخۂ کیمیا تو سمجھتے ہیں لیکن مغربی تہذیب ان کے لئے زہر کا حکم رکھتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ بنیادی فرق ہے۔ جس کی بناء پر شبلیؔ علیگڈھ کی راہ چھوڑکر "ندوہ" کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

شبلیؔ بیک وقت شعر و نثر میں دخل رکھتے تھے۔ بلقان کی جنگ کے تعلق سے انھوں نے اپنے جن تاثرات کو

منظوم کیا ہے اردو شاعری کی تاریخ میں ہم انھیں آسانی سے فراموش نہیں کر سکتے۔ باوجود اس کے شبلیؔ شاعر نہیں ہیں۔ وہ انشا پرداز ہیں۔ بحیثیت نثر نگار انھیں تاریخ میں سوانح نگاری اور تحقیق میں کافی اہمیت حاصل ہے۔

بحیثیت نقاد شبلیؔ کا مرتبہ بلند نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے تنقید کے کسی نظریہ کو پیش نہیں کیا۔ برخلاف اس کے حالیؔ نے مقدمہ لکھ کر اپنی اولیت کو تسلیم کرا لیا ہے۔ لیکن شبلیؔ کے یہاں عملی تنقید کے نمونے ملتے ہیں جبکہ حالیؔ کا سرمایہ عملی تنقید کے تعلق سے صفر ہے۔ یعنی تنقید کے میدان میں شبلیؔ حالیؔ سے ایک قدم آگے ہیں۔ موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ اور شعر العجم وغیرہ شبلیؔ کے تنقیدی شعور کا عملی ثبوت ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ہم شبلیؔ کے تنقیدی شعور سے اختلاف کریں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ موازنہ سے پہلے تنقید کا کوئی عملی نمونہ ہماری تاریخ میں موجود نہیں۔ شبلیؔ کے ان تنقیدی کارناموں کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ شبلیؔ کا شعور تنقیدی تھا۔ اور وہ اپنا ایک نظریہ بھی رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کوئی نقاد بغیر نظریۂ تنقید کے شعر و ادب کا جائزہ نہیں لے سکتا۔ شبلیؔ کے نظریۂ تنقید کو نہ پیش کرنے کی بنیادی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ شبلیؔ نے ہمیشہ نظریہ سے بڑھ کر عمل پر زور دیا ہے۔ وہ عملی آدمی تھے۔ حالیؔ اور شبلیؔ کے نظریہ و شعور میں بنیادی فرق ہے۔ حالیؔ یونانی اور فارسی ادب سے متاثر رہے ہیں۔ ان کا ذہن اسلامی فکر سے قریب تر ہے۔ جبکہ حالیؔ مانگے تانگے کے چراغ جلاتے ہیں۔ ان کے چراغ میں جو تیل ہے وہ دیسی نہیں ہے۔ مغربی ہے۔ حالیؔ مغربی ادب سے واقف نہ سہی آشنا ضرور تھے اور یہ آشنائی سماعی تھی۔ تاہم جہاں تک نظریۂ تنقید کا تعلق ہے۔ حالیؔ کا نظریۂ تنقید کہیں زیادہ فائدہ مند نظر آتا ہے۔ کیونکہ حالیؔ نے ادب کو انسانی قدروں اور انسانی اصولوں کا پاسدار سمجھا ہے وہ تنقید کی اصلاح میں ادب برائے ادب کے نہیں بلکہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔

دیگر فنون کی طرح سوانح نگاری کا فن بھی انسانوں کا فن ہے۔ فرشتوں کا نہیں۔ لیکن ایک سوانح نگار یا مورخ تخلیقی ذہن رکھنے کے باوجود اس فرشتے کی طرح ہوتا ہے جسے کسی انسان کے اعمال کا حساب کتاب رکھنے کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ مورخ کا غیر جانبدار ہونا نہ صرف ضروری ہے۔ بلکہ یہ شرط اول ہے کہ وہ کسی شخصیت یا شخصیتوں کے حالات لکھتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے اس کا رویہ غیر جانبدارانہ ہو اور وہ وہی کچھ لکھے جیسا کہ وہ دیکھتا یا پاتا ہے۔ فنِ تاریخ کے ان اصولوں کے پیش نظر جب ہم شبلیؔ کے کارناموں کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم بلا شبہ کہہ سکتے ہیں کہ شبلیؔ کچھ نہ سہی لیکن وہ بڑے مورخ گزرے ہیں۔ سیرت النبیؐ، الفاروق اور المامون وغیرہ تاریخ و سیرت کی ایسی کتابیں ہیں جن سے اردو کا سوانحی اور تاریخی سرمایہ بہت زیادہ وزنی اور وقیع ہو جاتا ہے۔ شبلیؔ کے علاوہ حالیؔ نے بھی اور حالیؔ کے ساتھ ساتھ سرسید نے تاریخ نویسی کے نمونے چھوڑے ہیں۔ حالیؔ کی حیاتِ جاوید، حیاتِ سعدیؒ اور یادگارِ غالب اسی زمرے میں آتی ہیں۔ سرسید نے اسباب بغاوتِ ہند لکھ کر اپنے آپ کو مورخوں کی فہرست میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرسید کا ذہن مخصوص ذہن تھا۔ ان کی اپنی تحریک تھی اور ان کا اپنا ایک لائحہ عمل بھی تھا۔ اس وجہ سے شاید وہ تاریخ نگاری کا حق ادا نہ کر پائے ہیں۔ اسباب بغاوت ہند میں ان کی جانبدارانہ روش عیاں ہے۔ اس وجہ سے اسباب

بغاوت ہند میں ہم سرسید کی فکر کی جھلکیوں کو تو دیکھ سکتے ہیں لیکن ہم اس دور کے سیاسی حالات کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتے۔ حالی کی حیثیت فن شاعری میں مرثیہ گو کی ہے۔ اور فن تاریخ کے مدنظر وہ نثر میں قصیدہ گو نظر آتے ہیں۔ حیاتِ جاوید اور یادگار غالب اس کا بہترین ثبوت ہیں۔

حالی کا خلوص مسلمہ حقیقت ہے لیکن ان کا جانبدارانہ رویہ بھی مانی ہوئی بات ہے۔ محمد حسین آزاد نے آبحیات لکھی اور اردو کے شاعروں کے تذکرے میں یا تو انھوں نے غالب کو نظر انداز کر دیا یا پھر انھوں نے غالب پر قلم اٹھایا بھی ہے تو بے حد مختصر۔ یادگار غالب آبحیات کے جواب میں لکھی گئی کتاب ہے۔ حالی ابتدا میں غالب کے شاگرد رہے ہیں جس انداز میں غالب کی سیرت و شخصیت کی اور ان کی شاعری کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حق نمک ادا کرنا چاہتے ہیں۔ یہی کیفیت حیاتِ جاوید کی بھی ہے۔ وہ سرسید کے ان مقلدوں میں شامل ہیں جنکی اپنی کوئی نظر نہیں ہوتی اور جب انھوں نے سرسید کی حیات کو قلمبند کیا ہے تو ان کی نظر سرسید کی اچھائیوں پر پڑتی ہے۔ کمزوریوں پر نہیں اور اگر وہ سرسید کی کوتاہیوں اور کمزوریوں سے واقف بھی ہیں تو ان کا اظہار خلافِ مصلحت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سوانح نگاری کا فن مصلحت پسندی نہیں ہے۔

شبلی کی تاریخ نگاری ان ساری آلودگیوں سے پاک ہے۔ ویسے بھی شبلی نے جن شخصیتوں پر قلم اٹھایا ہے انکا تعلق ماضی سے ہے حال سے نہیں۔ سیرت النبیؐ، المامون اور الفاروق کے مطالعہ کے بعد ہم صرف شبلی کی تحریر سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ ان تاریخی واقعات کے اظہار کا جو انداز انھوں نے اختیار کیا ہے۔ اس سے بھی بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ شبلی نے اپنی تاریخ نگاری کی مدد سے شخصیت کو اور شخصیت کے پورے دور کو زندہ کر دکھایا ہے۔ یہ شبلی کی تاریخ نگاری کا کمال ہے۔

پرانی دہلی کے محاورے اگر آج بھی زندہ ہیں تو ان کو زندگی دینے والے نذیر احمد ہیں۔ دلی کے یہ محاورے کبھی دلی والوں کو حسین و خوبصورت لگتے ہوں لیکن آج خود نذیر احمد کی رواں دواں تحریر میں روڑوں اور پتھروں کی طرح اٹکتے اور راستہ روکتے نظر آتے ہیں۔ فرحت اللہ بیگ اور علی عباس حسینی نے یہی کچھ اعتراض اپنے انداز میں کیا ہے لیکن اس سے نذیر احمد کے کارناموں کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی بلاشبہ انکا انداز بیان اور زبان آزاد، شبلی اور حالی سے کمتر سہی لیکن جہاں تک موضوع اور مواد کا معاملہ ہے کسی طرح کم نہیں۔ نذیر احمد کی شخصیت اپنے ہمعصروں کی موجودگی میں دبی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہمارے ادب کی یہ کوئی نمایاں شخصیت نہیں ہے۔ ان معنوں میں کہ نذیر احمد نے آزاد کی طرح نہ تو کوئی آبحیات لکھی ہے اور نہ کسی انجمن کی انھوں نے داغ بیل ڈالی ہے۔ شبلی کی تاریخ نگاری وقیع اور جاندار ہے انکا تنقیدی شعور کہیں زیادہ پختہ تھا اور انھوں نے علی گڑھ تحریک سے منہ موڑ کر اپنا ایک الگ دبستان فکر قائم کرنے کی کوشش کی ایسا کوئی کارنامہ نذیر احمد کا نہیں اور نذیر احمدؒ حالی بھی نہیں ہیں۔ یعنی انھوں نے تنقید سوانح نگاری اور نظم میں

مسدس کی طرح اپنا کوئی کارنامہ نہیں چھوڑا ہے۔ سرسید ریفارمر کی حیثیت سے آتے ہیں۔ وہ اپنی فکر کے مطابق اصلاح معاشرے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے سرسید نے اول اول "تہذیب الاخلاق" جاری کیا اور بعد کو مدرسے کی بنیاد ڈالی۔ آگے چلکر یہی مدرسہ ایک عظیم یونیورسٹی میں تبدیل ہوگیا۔ علیگڈھ یونیورسٹی علیگڈھ تحریک کا منبع بھی تھا۔ اور مرکز بھی بیچارے نذیر احمد اپنے ان قوی ہیکل ہمعصروں کے سامنے کہیں بھی ٹکتے نظر نہیں آتے۔ باوجود ان تمام باتوں کے نذیر احمد بھی اُردو کے عناصر خمسہ میں شامل ہیں۔ درحقیقت نذیر احمد اپنی ناول نگاری کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ویسے تو نذیر احمد نے بچوں اور عورتوں کے لیے قلم اٹھایا لیکن "ابن الوقت" اور "توبۃ النصوح" ایسے دو ناول ہیں جو اردو ناول کا نقطۂ آغاز سمجھے جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے نذیر احمد کے نام کو شہرت دوام بھی حاصل ہوئی ہے۔ نیلڈانگ نے ناول نگاری کے فن کو سوشیل ہسٹری کا نام دیا ہے۔ نذیر احمد کے ناول اسلامک سوشیل ہسٹری آف انڈیا ہیں۔ توبۃ النصوح ہمارے سماج کا آئینہ دار ہے۔ نذیر احمد کے دور میں اسلامی معاشرہ اپنے زوال کو پہنچ چکا تھا۔ ایک تباہ شدہ سماج کی جو کچھ بھی کیفیت ہوتی ہے اور جیسا کچھ بھی سماج کے افراد کا مزاج ہوتا ہے وہ سب کچھ "توبۃ النصوح" میں موجود ہے۔ "ابن الوقت" نذیر احمد کے سیاسی شعور کا ترجمان ہے اور اپنے عصر کے سیاسی حالات کا آئینہ دار بھی۔ نذیر احمد نے شبلی کی طرح سرسید کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ نذیر احمد نے "ابن الوقت" لکھکر سرسید پر طنز کرنے کی کوشش کی ہے۔

سرسید کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ لیکن ان کی فکر میں گیرائی اور گہرائی نہیں تھی۔ اور بعضوں کا خیال ہے کہ سرسید کوتاہ بین تھے۔ ان کی نظر مسلمانوں کے حال پر تھی چونکہ وہ تاریخی بصیرت سے محروم تھے اس وجہ سے انھوں نے مستقبل کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ جہاں تک اس قسم کے اعتراضات کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ اعتراضات بالکلیہ الزام نہیں ہیں بلکہ ان میں کچھ صداقت بھی ہے۔ نذیر احمد کے الفاظ میں وہ "ریفارمر" "مصلح" تھے لیکن عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ سرسید مفکر نہیں تھے کسی بھی عظیم شخصیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف مفکر ہو بلکہ اس کا مدبر ہونا بھی ضروری ہے تفکر اور تدبر ایسی دو اعلیٰ ترین صفات ہیں جو انسان کی تکمیل میں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ سرسید ہی پر کیا منحصر ہے خود شبلی بھی ان معنوں میں عظیم انسان نہیں ہیں۔ جب ہم سرسید اور شبلی کی شخصیتوں کا موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک مفکر ہے اور دوسرا مدبر۔ صفات کا یہ بٹوارہ شبلی اور سرسید کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے اور صفات کی اسی تقسیم کی وجہ سے شخص واحد پیدا نہ ہو سکا اور اس عظیم شخصیت کے عدم وجود کی وجہ سے تحریک کو جس تیزی کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے تھا بڑھ نہ سکی۔ شبلی نے علیگڈھ سے منہ موڑا اور "ندوہ" کی راہ لی۔ لیکن تدبر کی کمی کی وجہ سے ان کا خواب شرمندۂ معنی نہ ہوا۔ وہ "ندوۃ العلماء" کو علیگڈھ کی طرح تحریک کی شکل نہ دے سکے۔ یہ شبلی کی زندگی کا اور ساتھ ساتھ ملتِ اسلامیہ کا بھی زبردست المیہ ہے۔ سرسید

تدبیر کرنا جانتے تھے اور وہ عملی آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے اطراف چند مخلص اور آہنی انسانوں کو جمع کر لیا تھا۔ وہ ان ہی احباب کی مدد سے آگے بڑھتے رہے۔ اور بالآخر اپنے "مشن" میں کامیاب ہوئے۔ یہ سرسید کی زندگی کا اور خود ملتِ اسلامیہ کا خوش آئند واقعہ ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید شبلی کی فکر کو قبول کر لیتے تو علیگڈھ تحریک کی یہ جزوی کامیابی مکمل ہوتی۔ لیکن یہ تو شخصیتوں کی بات ہے۔ دو ایسی شخصیتیں جو "انا" کی مالک ہیں کبھی ایک ساتھ کام نہیں کر سکتیں۔ ویسے بھی فکر کا اختلاف عمل کی راہوں کو جدا کر دیتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے سرسید اور شبلی ایک نہ ہو سکے۔ یا پھر تیسری ایسی کوئی شخصیت اس دور میں موجود نہیں تھی جو شبلی کی فکر اور سرسید کی عملی قوت دونوں کی مالک ہو۔ سرسید کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرنے والوں جن میں آل احمد سرور بھی بلاشبہ شامل ہیں اس اندیشہ کا اظہار کیا کہ سرسید نے مسلمانوں کے حال پہ نظر تو رکھی لیکن وہ مستقبل سے لاپرواہ رہے۔ برخلاف اس کے شبلی کی نظر ملت کے حال پر تو تھی ہی وہ مستقبل کی طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے اختیار کر لینے سے موجودہ جمود تو ٹوٹ سکتا ہے لیکن مرض کا یہ مکمل علاج نہیں ہے۔ اسلام سے دوری کی صورت میں ایک دوسرا مرض پیدا ہو جائیگا۔ نذیر احمد نے بھی "ابن الوقت" میں اسی اندیشہ کا اظہار کیا ہے۔ ان کے اپنے الفاظ میں مسلمان نوجوان مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب سے آشنائی حاصل کرنے کے بعد ڈپٹی اور بابو تو بن جائیں گے لیکن اسلامی تعلیمات اور اسلامی روح سے کورے ہی رہیں گے۔ یہاں یہ بات واضح ہونا چاہیئے کہ شبلی بلکہ نذیر احمد اور پھر بعد کو اکبر اور اقبال نے بھی علیگڈھ تحریک کے بنیادی طریقہ کار سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن نذیر احمد کے یہاں ٹھوس اور بنیادی وجہ نظر نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ وہ مغربی تعلیم اور مغربی فکر سے خائف تھے۔ اکبر مشرق پرست تھے۔ مشرقی تہذیب ان کے یہاں ایک "بتِ طناز" کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس وجہ سے وہ مغرب سے "حذر" کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے اقبال اختلاف کی ایک اساس رکھتے ہیں۔ وہ شبلی کے خطوط پر سوچتے ہیں وہ مغربی تعلیم سے فیضیاب ہیں۔ اور مغربی تعلیم کی فیض رسانی کے قائل بھی ہیں۔ لیکن مغربی فکر ان کے یہاں عریاں ہے اور واقعی مغربی تہذیب کی عریانی مشہور زمانہ بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال انسانی تقدس اور انسانی عظمت کو اولیت دیں گے۔ اسی وجہ سے انھوں نے ایک ایسے نظامِ حیات کی بنیاد دی جو انسانیت کا پاسبان اور رہنما ہے۔ مغربی تہذیب سے "حذر" بھی کیا ہے اور "انحراف" بھی تو وہ عریاں تہذیب سے بیزار نظر آتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا سرسید مغرب کی تعلیم اور مغربی تہذیب کی اس عریانی سے کماحقہٗ واقف بھی تھے یا نہیں۔ لیکن یہ بدیہی حقیقت ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی فلاح کیلئے ثقافتی اور تہذیبی اقدار سے روگردانی کی ہے۔ آج ایک صدی کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرسید مسلمانوں کو سیاسی بصیرت عطا کرنے اور تعلیمی زیور سے آراستہ و پیراستہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں تو یہ بات پہلی بات سے

متضاد اور مختلف تو نظر آتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شبلی نے جن اندیشوں کا اظہار کیا تھا وہ بھی سچ ثابت ہوئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر شخص جو اصلاحِ معاشرہ کا حوصلہ لے کر آگے بڑھتا ہے وہ بعض اوقات ایک برتر مقصد کے حاصل کرنے کے لیئے چند بنیادی قدروں کو نظر انداز بھی کر دیتا ہے۔ لیکن ہم اس کو اس کی کوتاہی قرار نہیں دے سکتے یہ مصلحت ہے۔ شبلی اپنے عصر سے آگے کے انسان تھے وہ قبل از یں پیدا ہو گئے۔ آج جبکہ علیگڑھ تحریک اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہے۔ شبلی کے خطوط پر سمجھتے ہوئے ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہیئے جو سرسید کے طریقۂ کار کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ اس طرح ہم موجودہ دور میں سرسید اور شبلی کی نظر اور عمل کو ہم آہنگ کر سکتے ہیں اور ان شخصیتوں کی دوئی کو اکائی میں بدلا جا سکتا ہے۔ یہی عصرِ حاضر کا تقاضہ بھی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۴ سے آگے)

اور ضیاء و ساغر کی داستانوں کی بدولت عوام میں مایوسی، بزدلی اور عیش و عشرت کے اثرات ہو گئے تھے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں آزادی کی تحریک پیدا ہوئی، اس سلسلے میں سرسید، شبلی، حالی، آزاد، نذیر احمد کی تحریروں نے ہمارے معاشرے پر بڑا اثر ڈالا۔ اردو ادب میں ادب برائے زندگی کے آثار اجاگر ہوئے۔ اشتراکیت کی اشاعت سے ترقی پسند ادب کی بنیاد پڑی اور اردو ادب میں نئے نئے نظریات فروغ پانے لگے۔

۵۔ فکر و نظر کے تحت باغ و بہار پر، فسانۂ عجائب میں سرور کا علمی اور ادبی مذاق اور فسانۂ آزاد میں لکھنوی تہذیب و معاشرت پر علی الترتیب ادبی، علمی اور تہذیبی نقاطِ نظر سے عمیقانہ اور طائرانہ تنقیدیں کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ نذیر احمد اور امراؤ جانِ ادا کے کرداروں کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

(۶) جائزے کے تحت غالب کے خطوط کا اُن کے طرزِ تحریر، شوخی و ظرافت، ادبی نکات اور علمی مباحث کی روشنی اور ابو الکلام آزاد کے خطوط یعنی غبارِ خاطر کا نجی معاملات، تاریخی اور ادبی یا فلسفیانہ مسائل کی نظر سے اور رشید احمد صدیقی کا اُن کے خاکوں کے آئینے میں (جن میں اُن کے اندازِ بیان، اُن کی باغ و بہار شخصیتیں اور مردم شناسی نمایاں ہوتی ہے) سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

(۷) نظرِ انتخاب کے تحت مصحفی کو ادبی نظر سے اور آتش کو فلسفۂ حسن و عشق کی روشنی میں اُن کے شعری کلام پہ سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں۔

(۸) مثنویات کے تحت سحر البیان اور گلزارِ نسیم پر الگ الگ اصولِ تنقید کی روشنی میں بھر پور نظر ڈالی گئی ہے۔

(۹) ضمیمہ کے تحت جامعہ کے شعبۂ اردو کی سرگرمیوں کا حال درج ہے۔

غلام رسول

حرمت الاکرام

مجبوروں نے یہ مجھ سے سر کہسار کہا ہے
بے رحم چٹانوں کا جگر پھوٹ بہا ہے
چھونے سے لگی ہے مرے زخموں کو کوئی آنکھ
اک ہاتھ مرے دل کی طرف دیکھ رہا ہے
افکار کے زینوں سے اتر آئے یہ کہہ دو
احساس کے روزن سے کوئی جھانک رہا ہے
شعلوں نے رقم کی ہے مرے دل کی کہانی
شبنم نے مری آنکھ کا افسانہ کہا ہے
مجھ میں جو اک آذر ہے نکھر جائے فن اس کا
پتھر کی طرح اس لئے ہر وار سہا ہے
سینوں میں ہمارے ہے عجب گنج معانی
الفاظ نے یہ خامۂ شاعر سے کہا ہے
جمنا کوئی ابھرے تو نمو پائے دو آبہ
گنگا کی طرح پیار کا اک گیت بہا ہے
حرمتؔ یہ دھڑکتا ہے کہ گرتے نہ توازن
دل میرے خیالوں کی گرہ کھول رہا ہے

باقر منظور

جہاں رسم محبت اک مذاقِ عام ہو جائے
اسی منزل پہ یارب زندگی کی شام ہو جائے
محبت جب حدِ آخر پہ بھی ناکام ہو جائے
تصور حسنِ فطرت کا خیال خام ہو جائے
کوئی بیدرد میرے دل کی دھڑکن سن نہیں سکتا
نگاہوں کی زباں اس موڑ پر پیغام ہو جائے
پیام موت اگر آئے محبت کی زباں بن کر
صدائے دل شکن بھی سازِ خوش انجام ہو جائے
اسیران ہوس کے دل میں ہے شوقِ جبیں سائی
کہیں ایسا نہ ہو ذوقِ وفا بدنام ہو جائے
اگر اپنی زباں سے گنگنائیں وہ غزل میری
سنے جو اہلِ دل وہ بندۂ بے دام ہو جائے
ہمیں جینا ہے ساقی کی نگاہیں دیکھ کر باقرؔ
یہ ممکن ہی نہیں ہے دل نشانِ جام ہو جائے

بیتاب بیلی بھیتی

کھل رہے ہیں چمن میں کیسے پھول کوئی افسردہ اور کوئی ملول
دورِ حاضر کے آدمی کا دوست! کوئی کردار ہے نہ کوئی اصول
بِک رہے ہیں قدم قدم پہ ضمیر اب حمیت کی بات ہی ہے فضول
اک چبھن اک خلش سی رہتی ہے زندگی ہے کہ نوکِ خارِ ببول
ہم سے قیمت ہمارے لمحوں کی زندگی کر رہی ہے آج وصول
صبحِ روشن کی آرزو میں دوست کرلیا شام تیرگی کو قبول
کچھ کہے کوئی اب فریبِ خلوص بنتا جاتا ہے روز کا معمول
حق کی خاطر کوئی نہیں جو آج پھر کرے دار اور صلیب قبول
بھول بیٹھا محبت و اخلاص آدمی اتنا ہو گیا مشغول
ہم سمجھنے لگے خدا خود کو یہ بھی دانستہ ہو گئی اک بھول
سارا عالم ہی جیسے صحرا ہے ہر طرف اُڑ رہی ہے دھول ہی دھول
خوبی وقت سے برابر ہیں آج معقول اور نامعقول
ہو گیا چپ یہ سوچ کر بیتاب
بات کو دے کوئی کہاں تک طول

مست فتحپوری

خبر اپنی نہیں لیتا ہے ناداں
زمیں سے تا فلک پہنچا ہے انساں
گلستاں میں نہیں حسنِ گلستاں
شمیم آوارہ، گل ہیں چاک داماں
شعورِ حسن میں ہے عشق پنہاں
شفق میں جس طرح خونِ شہیداں
جھپک جائیں نہ کیوں آخر یہ آنکھیں
کہاں نظریں، کہاں دیدارِ جاناں
ہوئی جب دوستوں میں کچھ صفائی
نظر آنے لگے دشمن پریشاں
بہت مشکل ہے اب کشتی بچانا
جدھر دیکھو اُدھر طوفاں ہی طوفاں
نہ محمل ہے، نہ لیلیٰ ہے، نہ مجنوں!!
نظر آئے نہ کیوں خالی بیاباں
خداوندا نظر کو ہو گیا کیا!!
نہیں پہچانتا انساں کو انساں
بالآخر مٹ گئے دونوں ہی ضدیں
نہ کشتی رہ گئی باقی نہ طوفاں
وہی باتیں حقیقت بن رہی ہیں
جنھیں سمجھا کئے خوابِ پریشاں
خدارا مست کا عالم نہ پوچھو
مژہ نم، زرد چہرہ، چشم حیراں

رونق دکنی سیمابی

وہ صبح کی زرخیز کرن جاگ پڑی ہے
سوئی ہوئی تقدیر چمن جاگ پڑی ہے

ہے شہر تمنّا کا ہر اک موڑ معطل
بے ساختہ خوشبوئے بدن جاگ پڑی ہے

پھر مستیٔ پندار سے بوجھل ہیں نگاہیں
پھر آنکھوں میں ڈوروں کی چبھن جاگ پڑی ہے

اب سایۂ گیسو میں بھی آرام نہیں ہے
ناگن کوئی کھولے ہوئے پھن جاگ پڑی ہے

تخریب کے سایوں میں ہے تنظیم گلستاں
پھولوں سے جو یہ بوئے کفن جاگ پڑی ہے

اب جبر مشیت کے قدم جم نہ سکیں گے
مجبور کے ماتھے کی شکن جاگ پڑی ہے

گیسوئے پریشاں میں گرہ اور پڑے گی
وارفتگیٔ دار و رسن جاگ پڑی ہے

پھر زخم تمنّا مرے لَو دینے لگیں گے
پھر جینے کی دل میں جو لگن جاگ پڑی ہے

دل اہل غربت جو ہوا جاتا ہے رونق
بے مہریٔ یارانِ وطن جاگ پڑی ہے

عبدالمتین نیاز

لوگ اپنے ہی احساس کے شعلوں میں تپے ہیں
ہم تو غمِ دوراں کے جہنم میں جلے ہیں

محسوس ہوا ہے کہ ادھوری ہے ابھی زیست
جس راہ میں جس موڑ پہ ہم تم سے ملے ہیں

تہذیب تباہی کے دہانے پہ کھڑی ہے
چپ چاپ ہیں اربابِ خرد سوچ رہے ہیں

خوابوں سے جگا دے گی انھیں وقت کی ٹھوکر
خوابوں کی کمیں گاہ میں جو لوگ چھپے ہیں

گو صبح کے آنے میں بہت دیر ہے لیکن
سنتا ہوں اندھیروں کے بدن ٹوٹ رہے ہیں

دانشورِ پرواز خلاؤں کی مبارک!!!
حال ان کا بھی پوچھ کہ جو دھرتی پہ کھڑے ہیں

سچ بات یہی ہے کہ نیاز آج کے انساں
خود اپنے ہی ادراک کی سولی پہ چڑھے ہیں

نقد و نظر

صریرِ خامہ

یہ جامعۂ سندھ پاکستان کا ادبی مجلّہ ہے۔ سال میں ایک مرتبہ شائع ہوتا ہے۔ اس کی ہر اشاعت خصوصی ہوتی ہے۔ زیرِ نظر رسالہ بابت ۱۹۶۷ء تنقیدی ادب نمبر ہے، جو ۲۷۰ صفحات کو محیط ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک میں کہنہ مشق اساتذہ کے مضامین ہیں، جو زیادہ تر پاکستان کے مختلف کالجوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں تین ہندوستان سے متعلق ہیں۔ اس حصے کے مضامین بلند اور وقیع ہیں۔

دوسرا حصہ کالج کے طلبار سے مختص ہے۔ اس میں حسبِ ذیل عنوانات کے تحت تنقیدی مضامین لکھے گئے ہیں۔ یہ حصہ بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ مضمون نگاروں نے موضوعات کے مدّنظر سلجھے ہوئے انداز میں اپنے خیالات پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جن سے طلبار میں ادبی تنقید کے اچھے شعور کا ثبوت ملتا ہے۔

(۱) تنقید کے تحت پہلے یورپ اور اردو کے مشہور نقادوں کے اقوال دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد جمالیاتی تنقید میں اس کے آغاز اور ارتقا سے بحث کر کے شبلی نعمانی اور مہدی افادی کی تحریروں میں اس کی جھلکیاں دکھائیں اور نیاز فتحپوری اور فراق گورکھپوری کو اس کا رہنما بیان کیا ہے۔ سائنٹیفک تنقید کی روشنی میں ولی، مصحفی اور غالب کی شاعری اور سرسید کے مضامین کا جائزہ لیا ہے۔ پھر حالی سے لے کر وحیدالدین سلیم، مولوی عبدالحق، پنڈت کیفی، سید مسعود حسن رضوی، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر زور، مجنون، فراق، وقار عظیم، اکرام اور اختر اورینوی وغیرہ کو اس تنقید کے نقادوں میں شمار کیا ہے۔

(۲) ارتقا کے تحت جدید اردو تنقید کی بنیاد ۱۸۵۷ء کے بعد مغربی نظریات پر بتلا کر مولوی محمد حسین آزاد کی تصنیف آبِ حیات کو اردو تنقید کی پہلی کتاب قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد سرسید، حالی، شبلی، امداد امام اثر، وحیدالدین سلیم، مہدی افادی، مولوی عبدالحق، نواب صدر یار جنگ، سید مسعود حسن رضوی ادیب، حامد حسن قادری، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا بادی، پنڈت کیفی، پروفیسر محمود شیرانی، ڈاکٹر زور، عبدالقادر سروری، نیاز فتحپوری، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، اختر حسین رائے پوری، سید اختر حسین، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، ابواللیث صدیقی، وقار عظیم، ڈاکٹر سید عبداللہ، عبادت بریلوی، رشید احمد صدیقی، محمد حسین ادیب، اختر انصاری، اکرام، عزیز احمد، اختر اورینوی، ڈاکٹر عبداللطیف، صلاح الدین احمد، ڈاکٹر تاثیر، عندلیب شادانی، نورالحسن ہاشمی، طاہر فاروقی کی تنقیدی کتابوں، مضامین، تحریرات اور نظریات کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔

(۳) تذکروں کے بارے میں تذکرہ کا آغاز، تذکروں کی خصوصیات، ان کی اہمیت اور تحریر کے اسباب بیان کرتے ہوئے

طبقہ اوّل اور دوم کے تذکروں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

(۳) نقد و نقاد کے تحت سرسید کی تصانیف سے اُن کی قدیم اور جدید نثر نگاری کی روشنی میں انھیں اردو ادب میں سادگی، ندرت اور سنجیدگی کا بانی قرار دیا ہے۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے کا تذکرہ کرتے ہوئے آب حیات اور نیرنگ خیال کتابوں پر تنقیدی نظر ڈال کر آزاد کو نقاد ثابت کیا ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری، حیات جاوید، حیاتِ سعدی، یادگار غالب، مقالاتِ حالی، مقدمات اور تبصروں میں جو تنقیدی نظریئے پائے جاتے ہیں۔ اُن کے لحاظ سے حالی کو اردو سائنٹفک تنقید کی بنیاد والا قرار دیا ہے۔ شبلی کو اُن کی تصانیف شعر العجم اور موازنۂ انیس و دبیر میں جن تنقیدی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اُن کی روسے مشرقی تنقید کا نقاد کہا گیا ہے۔ نیاز فتح پوری کو اُن کی انتقادیات، مشکلات غالب اور مالہ و ما علیہ کتابوں میں جو تاثراتی تنقید کے خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ وہ مغرب سے ہمارے ہاں آئے ہیں۔ اس تنقید کا بانی بتلایا گیا ہے۔ عبدالماجد دریا بادی اگرچہ زیادہ تر مذہبیات کے صاحب قلم ہیں۔ لیکن اُن کی کتابوں سے تنقیدی نظریات کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ آل احمد سرور کی کتابوں، تنقیدی اشارے، نئے پرانے چراغ اور تنقید کیا ہے؟ میں جو خیالات بیان کئے گئے ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ادب کو زندگی کا ترجمان اور اس کی تنقید کو حیات سمجھتے ہیں۔

(۴) تخلیق و تنقید کے تحت ڈرامے کی سرسری تاریخ بیان کرتے ہوئے، امانت لکھنوی کی اندر سبھا سے لے کر احسن لکھنوی، طالب بنارسی اور آغا حشر کاشمیری کے پیشہ ورانہ ڈراموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مرزا ادیب، امراؤ علی، ظفر علی خاں، اظہر، حکیم احمد شجاع، شوق قدوائی، اور مرزا رسوا کو ڈرامانویسوں کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور آخر میں امتیاز علی تاج کو جدید اردو ڈرامانگاروں میں ممتاز قرار دیا ہے۔

اردو افسانے کے بارے میں خیالی اور رومانی داستانوں سے لے کر اردو ناولوں اور مختصر افسانوں تک ذکر کیا گیا ہے۔ منشی پریم چند کو مختصر افسانے کا بانی قرار دیا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور فرائیڈ پرست تحریک کا بھی سرسری ذکر کیا گیا ہے۔ ان تحریکوں کا اثر افسانوی ادب پر بھی پڑا، جن کی وجہ سے اردو افسانوں میں زندگی کی حقیقتوں کا رجحان، سیاسی مسائل اور جنسی حقیقت نگاری کے خیالات پیدا ہوئے۔

اردو ادب میں طنز و مزاح کے ضمن میں اس کی تعریف، اس کے بعد اردو نظم میں جعفر زٹلی سے لیکر شاہ حاتم، سودا، میر تقی میر، انشا، مصحفی، غالب، اکبر اور اقبال تک اور اردو نثر میں خطوط غالب اور اودھ پنچ اخبار اور مزاحیہ نگاروں میں۔ نواب سید محمد آزاد، اکبر الٰہ آبادی، سجاد حسین، سرشار، پطرس، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، عظیم بیگ، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، ملا رموزی، سلطان حیدر جوش اور سجاد علی کی طنز نگاری کا مختلف زاویوں سے سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

ترقی پسند ادب اور ہمارے معاشرے کے ذیل میں قدیم ادب میں حسن و عشق کے تصوّں۔ گل و بلبل کے افسانوں

(باقی صفحہ نمبر ۵۱ پر)

نتائج امتحانات ادارہ ادبیات اردو منعقدہ دسمبر ۱۹۶۷ء

امتحان اردو دانی

مرکز آرمور:- کامیاب بہ امتیاز-

۱- سید معصوم حسین انور-

مرکز جے سی اسکول چھپا پیٹھ:- کامیاب بہ امتیاز

۲۳- گوردھن لال- کامیاب- ۴- محمد بشیر- ۵- محمد ہاشم

۷- عبدالستار- ۸- محمد شریف- ۹- نذیر- ۱۴- محمد وحید

۱۵- محمد شرف الدین- ۱۷- محمد یوسف- ۱۸- محمد شریف-

۲۰- علی شبیر- ۲۲- محمد صابر-

مرکز میلسور:- کامیاب بہ امتیاز- ۲۶- رفیق احمد

۲۶- رفیق احمد کامیاب ۲۸- افسر پاشا-

امتحان اردو زبان دانی

مرکز آرمور:- درجہ سوم-

۱- محمد عبدالرزاق- ۲- محمد احمد ۳- محمد عبدالجلیل

مرکز جے سی اسکول چھپا پیٹھ-

درجہ دوم:- ۹- محمد احمد- ۱۵- علی خان-

درجہ سوم:- ۱۰- محمد سلیم- ۱۲- نعیم حسین- ۱۴- عظیم الدین-

۱۹- ایوب بن احمد- ۲۱- عبدالرزاق-

مرکز ناگر کرنول (ذکور)- درجہ دوم-

۳۴- محمد مصلح الدین احمد- ۳۵- محمد محمود علی

درجہ سوم:- ۲۴- محمد حیات- ۲۵- محمد معین الدین

۲۶- محمد امجد اللہ- ۲۷- محمد اسحٰق- ۲۸- محمد رؤف الدین

۳۰- محمد نظام الدین- ۳۴- محمد عطاء الرحمن- ۳۶- محمد غیاث الدین

۳۷- محمد محبوب حسین- ۳۸- محمد بشیر- ۳۹- سید حامد حسین-

۴۰- محمد رشید احمد- ۴۱- سید اقبال علی سلیم- ۴۲- محمد لیاقت علی-

۴۴- خواجہ معین الدین- ۴۵- سید نعیم اللہ حسینی- ۴۶- محمد محبوب

مرکز اناث:- درجہ دوم-

۴۷- رضیہ بیگم- ۴۹- قمر جہاں-

درجہ سوم:- ۴۸- عابدہ بیگم-

مرکز بلدہ اناث- درجہ دوم-

۵۱- سعیدہ بانو ۵۲- حسن بانو-

امتحان اردو عالم

مرکز آرمور:- درجہ سوم-

۲- احمد عبدالحمید- ۳- محمد عبدالسمیع- ۴- محمد شریف الرحمن-

۵- سید خواجہ معین الدین- ۸- شیخ احمد- ۹- لطیف النساء

۱۰- سلطانہ بیگم-

مرکز میلسور:- درجہ دوم-

۱۹۵- برجیس سلطانہ- ۱۹۶- غوث النساء- ۱۹۷- الیاس قمر اللہ

۱۹۸- مہرالنساء (درجہ سوم)- ۱۸۷- محمد اکرم- ۱۸۸- میر فرزند

۱۹۴- خالدہ بانو-

مرکز ناگر کرنول:۔ درجہ دوم۔

۱۱۷۔ محمد حسین۔ ۱۱۸۔ محمد موسیٰ۔ ۱۱۹۔ محمد سراج الدین خاں۔
۱۲۰۔ شیخ سیادت علی۔ ۱۲۴۔ شیخ قطب الدین سرشاد۔ ۱۲۵۔ قمر سلطانہ
درجہ سوم:۔ ۱۱۴۔ محمد عبدالمجید ۱۱۵۔ محمد تراب علی۔
۱۱۶۔ محمد نصیر اقبال۔ ۱۲۲۔ شیخ مسعود۔

مرکز بانسواڑہ (ضلع نظام آباد) درجہ دوم:۔

۲۳۔ محمد عبدالسلیم۔ ۲۴۔ محمد صبغۃ اللہ انصاری۔ ۳۲۔ ناصرہ بیگم۔
درجہ سوم:۔ ۱۱۔ جلیل احمد۔ ۱۴۔ سید عثمان۔ ۱۶۔ سید حسین
۲۱۔ محمد سلیم الدین۔ ۲۲۔ شیخ اکرام حسین۔ ۲۵۔ سید عنایت الحسن
۲۷۔ شیخ احمد حسین۔ ۲۸۔ محمد عارف حسین۔ ۲۹۔ محمد اظہر حسین
۳۰۔ محمد الطاف حسین۔ ۳۱۔ ممتاز بیگم۔ ۳۳۔ نورجہاں بیگم۔

مرکز کرنول:۔ درجہ دوم:۔ ۳۷۔ سید عارف اللہ حسینی۔
۴۲۔ قادر ولی شیخ ۴۳۔ عبدالرشید ۴۷۔ عبدالکریم۔ ۵۹۔ حافظ
عبداللطیف (درجہ سوم) ۴۴۔ یس خواجہ حسین۔ ۴۸۔ عبدالرحیم خاں
۴۹۔ ایم عبدالاحد۔ ۵۰۔ حفیظ الرحمٰن۔ ۵۱۔ سید سلیم پاشاہ۔ ۵۲۔ سید ابوالحسن حسینی
۵۳۔ ڈی نظام الدین۔ ۵۵۔ مرشد پیر۔ ۵۶۔ محمد فضل الرحیم۔ ۵۷۔ عبدالحمید خاں
۵۸۔ سید حسین۔ ۶۰۔ محمد مصطفیٰ حسین۔

مرکز محبوب نگر:۔ درجہ دوم۔ ۶۲۔ محمد اسحٰق۔ ۶۷۔ محمد عبدالجلیل
۶۸۔ محمد مخدوم علی۔ ۶۹۔ سید اختر علی شاہ۔ ۷۰۔ راما چاری۔
۸۵۔ خواجہ معین الدین۔ ۹۸۔ میمونہ بیگم ۹۹۔ سلطانہ بیگم۔ ۱۰۰۔ اقبال النساء بیگم
۱۰۹۔ بی راما زجا ۱۱۱۔ طیبہ مبین زبیری۔
درجہ سوم:۔ ۶۴۔ گوردھن داس۔ ۶۶۔ ٹی اکرن سنگھ۔
۷۲۔ خواجہ نثار الدین احمد۔ ۷۳۔ محمد عبدالستار۔ ۷۴۔ احمد حسین
۷۶۔ محمد اسحٰق۔ ۷۷۔ محمد غلام دستگیر قریشی۔ ۷۸۔ سید نذیر الدین۔
۷۹۔ میر فرخندہ علی۔ ۸۱۔ محمد خواجہ ذرتی۔ ۸۲۔ محمد مقصود علی۔
۸۳۔ شیخ محمد۔ ۸۵۔ محمد مجیب الرحمٰن۔ ۸۶۔ محمد عبدالعزیز
۸۷۔ محمد باقر شریف۔ ۸۸۔ بے شنکر راؤ۔ ۸۹۔ محمد عمر شریف
۹۰۔ خواجہ شمس الدین۔ ۹۲۔ ٹھاکر کشن سنگھ ۹۳۔ محمد عبدالرؤف
۹۴۔ محمد رشید الدین۔ ۹۵۔ محمد خلیل الرحمٰن۔ ۱۰۴۔ شریفن بی۔
۱۰۶۔ محبوب خاتون۔ ۱۰۷۔ فرحت النساء۔ ۱۱۰۔ بدر سلطانہ
۱۱۲۔ مہر النساء۔

مرکز بلدہ:۔ درجہ دوم:۔

۱۳۱۔ سید شاہ حیدر حسینی۔ ۱۳۳۔ میر رضا علی کاظمی۔
۱۳۷۔ میر عارف علی۔ ۱۳۹۔ محمد منیر الدین۔ ۱۴۱۔ محمد عبدالعزیز
۱۴۵۔ اشفاق احمد۔ ۱۵۵۔ محمد نعیم الدین خاں۔ ۱۶۰۔ سعید الدین
۱۷۸۔ اقبال بانو۔ ۱۷۹۔ خورشید بانو۔
درجہ سوم:۔ ۱۲۶۔ خواجہ معین الدین احمد۔ ۱۲۷۔ محمد عبدالرحیم۔
۱۲۸۔ سکندر علی۔ ۱۳۸۔ سید خواجہ معین۔ ۱۴۰۔ شیخ ابراہیم۔
۱۴۲۔ محمد باسط علی۔ ۱۴۳۔ سید سلطان۔ ۱۵۱۔ محمود علی خاں
۱۵۲۔ محمد آصف حسین۔ ۱۵۴۔ محمد عبدالحفیظ۔ ۱۵۶۔ محمد
محبوب علی رشید۔ ۲۰۱۔ سید حسن عابد زیدی۔ ۱۵۸۔ محمودہ بیگم
۱۵۹۔ رحمت النساء بیگم۔ ۱۶۳۔ رفیق النساء۔ ۱۶۹۔ شہناز بیگم
۱۷۰۔ سرفراز بیگم ۱۷۴۔ رشید شرف الدین خاں۔ ۱۷۵۔ سعیدہ
خاتون۔ ۱۷۷۔ افضل النساء بیگم۔ ۱۸۲۔ ثروت سلیم۔

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء — جلد (۳۰) — شمارہ (۵)

مئی ۱۹۶۷ء

ماہنامہ
سب رس

زر سالانہ چھ روپے — غیر ممالک سے دس روپے
ششماہی تین روپے — فی پرچہ پچاس پیسے

نمونے کے پرچہ کے لئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے

پرنٹر و پبلشر سید محمد اکبر نے اعجاز پرنٹنگ پریس میں
چھپوا کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد سے
شائع کیا

ترتیب

حصہ نظم

نقد و نظر

اپنی بات

گذشتہ شمارے کو چھپ کر تیار ہونے کے باوجود ڈاک کے حوالے ہونے میں کافی تاخیر ہوگئی۔ اس کی تلافی تازہ شمارہ جلد پیش کر کے کردی جارہی ہے۔

ڈاکٹر محمد جمال شریف صاحب نے "نوسرہار" کا جائزہ لیا ہے۔ "نوسرہار" کے مصنف حضرت میراں جی شمس العشاق کے معاصر ہیں۔ ان سے عمر میں کم ہیں اس لئے برہان الدین جانم کے ابتدائی دور میں ان کے بھی معاصر ہیں ان سب کے کلام کا تقابلی مطالعہ لسانیاتی نقطہ نظر سے کافی اہمیت کا حامل ہوگا۔ لسانیات کے علما سے توقع ہے کہ وہ اس جانب توجہ فرمائیں گے۔

دوسرا مضمون غالب کے کلام میں قرآنی تلمیحات پر ہے۔ اردو ادب میں تلمیحات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جس کا ماخذ مختلف مذہبی کتابیں بھی ہیں اور مختلف اقوام و ملل کی روایات بھی۔ عربی ایرانی اور ہندوستانی روایات کچھ اس طرح اس میں رچ بس گئے ہیں کہ ان کی جانکاری سے مفر نہیں۔ اس سے ادب کا پلہ بہت وزنی ہوگیا ہے۔ پروفیسر وحید الدین سلیم مرحوم نے تلمیحات کی ایک بہت بڑی تعداد اپنے مضمون "تلمیحات" میں پیش کی تھی۔ اقبال نے جو تلمیحات استعمال کیں وہ تلمیحات اقبال کے نام سے منظر عام پر آئیں اور ایک کتاب تلمیحات بھی۔ لیکن پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تلمیحات کے موضوع پر کام کرنے کی گنجائش ہے اور اس کا ایک مبسوط لغت تیار ہونا چاہئے۔ غالب نے جو قرآنی تلمیحات استعمال کی ہیں اس پر ڈاکٹر ندوی صاحب نے ایک تفصیلی مضمون پیش کیا ہے۔ اس سے غالب کے مطالعہ کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔

ڈاکٹر صفدر علی بیگ صاحب نے شعرا کی نظر میں دولت اور ثروت کی اہمیت کو پیش کیا ہے۔ اس سے انکی بے نیازی اور استغنا کے تعلق سے خیالات پر ان کا اظہار کیا ہے لیکن دربار کے مداح شعرا پر شاید نظر نہیں گئی جو ہل من مزید کی رٹ لگائے رہتے تھے یا پھر ناقدری پر ہجو کا طومار باندھ دیتے تھے۔ ادب میں دونوں رنگ کے شعرا ملیں گے۔ صفدر صاحب نے صرف ایک ہی رنگ کو پیش کیا ہے۔

طیب انصاری صاحب نے "مرثیہ اور مقصد" کے زیر عنوان مرثیہ کا ابتدا سے اب تک کا جائزہ لیا ہے اور آخر میں وہ جو دلائل دے رہے ہیں اس کا تعلق مرثیہ نگاری اور مرثیہ خوانی سے زیادہ عقیدت سے ہے جس کی سرحدیں مذہب کو چھو لیتی ہیں۔ ادیب کو ان سرحدوں تک جانے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی وہ ادبی حدود میں رہ کر ہی اپنے مقصد کو پاسکتا یا اس کا اظہار کرسکتا ہے۔ انصاری صاحب بھی میں سمجھتا ہوں کہ یہی چاہتے ہیں۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ مرثیے لکھنے کے انداز میں جو تبدیلیاں عمل میں آئیں اب حالات متقاضی ہیں کہ شعرا کو حق و صداقت پر مائل کیا جائے اور مضامین مرثیہ کی روشنی میں اپنے لئے راہیں متعین کی جائیں اس سے غالباً کوئی اختلاف نہ کرے گا۔

پنڈت کا جواب مظفر حنفی صاحب کی کتاب پر راہی صاحب کا تبصرہ ہے حصہ نظم میں اکثر وہی شعرا ہیں جن کا کلام ہمیشہ سب رس کے صفحات پر پیش ہو کر داد حاصل کرتا رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد جمال شریف

اشرف اور ان کی مثنوی نوسرہار

"نوسرہار" دکنی زبان میں ایک قدیم مثنوی ۹۰۹ھ کی تصنیف ہے جو واقعہ کربلا پر ہے۔ واقعۂ کربلا اسلامی تاریخ کی یہ داستان درد وغم اور رنج والم ہے جس کی مثال تاریخ انسانی میں بمشکل مل سکتی ہے۔ اس واقعۂ جور وجفا اور کرب وبلا سے بلا لحاظ مذہب وملت اور فرقہ وجماعت ہر انسان کا دل متاثر اور اس پر خون کے آنسو روتا ہے۔ ہر مورخ کا قلم، ادیب کا دماغ، ہر شاعر کا دل واقعۂ کربلا سے ہمیشہ متاثر رہا ہے۔ اسی لئے واقعۂ کربلا پر عربی، فارسی اور اردو میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان زبانوں میں نثر ونظم میں اچھا خاصا ادب موجود ہے۔ عربی اور فارسی کی طرح ابتدائی اردو دکنی میں بھی شہادت حسینؑ سے متعلق کافی تصانیف موجود ہیں۔ ان ہی میں سے ایک "مثنوی نوسرہار" ہے اور بلحاظ قدامت دکنی ادب میں سے اولیت حاصل ہے۔ یہ دکنی زبان میں ایک بلند پایہ تصنیف اور لاقیمت جواہر پارہ ہے جو نہ صرف لسانی اور ادبی لحاظ سے بلکہ انداز بیان اور تاثیر کے اعتبار سے بھی ایک شاہکار ہے۔ دکنی ادب کے سرمایہ میں ایک شہ پارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی لسانی اہمیت ادبی حیثیت سے کہیں زیادہ ہے لیکن ادبی لحاظ سے بھی اس کی اہمیت کچھ کم نہیں۔

"نوسرہار" کے مصنف اشرف کے حالات وغیرہ کے بارے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر نذیر احمد، نصیر الدین ہاشمی اور سخاوت مرزا صاحبان وغیرہ نے کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی۔

اشرف کا نام سید محمد اشرف[1] ہے۔ آپ سید شاہ اشرف بیابانی اور شیخ اشرف بیابانی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ اشرف بانی خاندان بیابانی سید شاہ ضیاء الدین بیابانی معروف بہ شیخ ضیاء نقرآبادی (۸۱۱-۹۰۹ھ) ابن سید عبدالکریم کے فرزند ہیں۔ ۱۲ ذیقعدہ ۸۶۴ھ دوشنبہ کے دن بوقت ظہر قصبہ نقرآباد تعلقہ انبڑ ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور ۷۱ سال کی عمر میں ۹۳۵ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار قصبہ نقرآباد (انبڑ[2]) میں ہے۔

اشرف بیابانی کا زمانہ ۸۶۴ھ تا ۹۳۵ھ تقریباً پون صدی ہجری پر محیط ہے جو بہمنی سلطنت کے زوال اور نظام شاہی سلطنت کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس لئے اشرف بیابانی نظام شاہی دور کے شاعر قرار پاتے ہیں۔ اولاً اس لئے کہ ان کی ملاقات احمد نظام شاہ سے ہوئی۔ دوسرے ان کا وطن نظام شاہی سلطنت کے حدود میں شامل تھا۔ اور تیسری اہم بات یہ کہ مثنوی "نوسرہار" کا سال تصنیف ۹۰۹ھ ہے اور اس وقت تک احمد نظام شاہ کو برسر اقتدار آئے ہوئے ۱۴ سال گزر چکے تھے۔

---

[1] بحوالہ شجرہ خاندان سید شاہ ضیاء الدین بیابانی جو مقالہ نگار کے پاس ہے۔ [2] تذکرہ ضیاء بیابانی صفحہ ۱۲

اشرف بیابانی نے ابتدائی تعلیم کے علاوہ حقائق و معارف کی تعلیم بھی والد ہی سے پائی۔ ابتدا ہی سے صوم و صلوٰۃ کے پابند اور متقی و پرہیزگار تھے والد ماجد سے بیعت کا شرف حاصل کیا اور مرید ہونے کے بعد عبادات و ریاضات شروع کر دیں بنا نہ خلوت آپ نے مجاہدات و مراقبات کرتے ہوئے سلوک ختم کر لیا تو والد نے خوش ہو کر ۸۹۵ھ میں انھیں خلافت دی۔ والد کے ۹۰۱ھ میں انتقال پر مسند سجادگی پر بیٹھے۔ اپنے ماموں حضرت سید علی سانگڑے سلطان (قلندر طاری) کی صاحبزادی مریم بی بی صاحبہ سے عقد کیا۔ آپ زیادہ مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ بادشاہ احمد نگر کی ضیافت کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے۔

"بادشاہ احمد نگر بعزم سفر ادھر سے گذرے اور مخدوم شاہ اشرف بیابانی کی ملاقات کے لئے آئے تو ان کو مع لشکر خدامان سواری کو کھانا کھلایا۔ فقر و فاقہ اور جنگل میں مسکن ہونے کے باوجود یہ مہمان نوازی حیرت انگیز ہے بس اوسی سے یہ ضرب المثل بن گئی۔

شاہ اشرف بیابانی بھوکے کو بھوجن پیاسے کو پانی "[۱]

والد ماجد ہی کے زمانہ سے حضرت کے پاس معتقدین اور ارادت مندوں کا اجتماع رہتا تھا اور لوگ دور دراز مقامات سے آکر ٹھہرتے تھے جن کے کھانے پینے کا انتظام ہوتا تھا۔ اشرف بیابانی عالم باعمل تھے۔ زہد و تقویٰ میں بے مثال تھے شریعت پر سختی سے خود بھی عامل تھے اور دوسروں کو بھی پند و نصائح کے ذریعہ اس پر عمل کرنے کی ہدایت فرماتے تھے آپ نے ۷۰ سال کی عمر میں ۹۳۵ھ میں انتقال فرمایا۔ والدین کے قریب دفن ہوئے۔ آپ کا مزار شریف نقر آباد (انبڑ) میں زیارت گاہ عام ہے جس پر عالیشان گنبد بنا ہوا ہے جو کمرخی وضع کا نہایت خوبصورت اور فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ اور بے نظیر ہے کسی نے اس کی تعریف میں شعر کہے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے ؎

دیکھوں نادر بن گنبد کرے گفتار سوں کہ پانچوں کلس کے اوپر چندر آسمان سوں [۲]

اشرف بیابانی صاحب تصانیف گزرے ہیں۔ ان کی دو اردو تصانیف "نوسرہار" اور قصۂ آخرالزماں کے بارے میں مولف ضیاء بیابانی نے پنج گنج کے حوالے سے لکھا ہے کہ "حضرت مخدوم نے زبان ہندی میں" نوسرہار" و قصۂ آخرالزماں" وغیرہ تصنیف فرمائی ہیں"[۳] اور خود مصنف پنج گنج کے الفاظ یہ ہیں۔

"حضرت مخدوم در زبان ہندی نسخہ نوسرہار" و قصۂ آخرالزماں" وغیرہ تصنیف نمودہ"[۴]

"اس سے واضح ہے کہ اشرف بیابانی نہ صرف نوسرہار کے مصنف ہیں بلکہ قصۂ آخرالزماں بھی ان کی تصنیف ہے جس کا تا حال کوئی پتہ نہیں چلا۔ نیز" وغیرہ" سے اس بات کا قیاس ہوتا ہے کہ ان دو تصانیف کے علاوہ حضرت کی مزید تصانیف بھی ہوں گی ممکن ہے کہ آئندہ تحقیق میں منظر عام پر آئیں۔

---

[۱] ضیاء بیابانی ص۲۵ [۲] ضیاء بیابانی ص۲۷ [۳] ایضاً ص۴۹ [۴] پنج گنج ص۹ ۔ یہاں ہندی سے مراد مقامی زبان دکنی اردو ہے

اشرف کی پہلی تصنیف نوسرہار کا ایک قلمی نسخہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں موجود ہے۔ اور دوسرا انجمن ترقی اردو علی گڈھ میں۔ راقم کو ریسرچ کے دوران میں نوسرہار کے مزید نسخوں کا پتہ چلا۔ جن میں سے ایک مکمل اور دو ناقص ہیں۔ ان کی نقلیں راقم کے پاس موجود ہیں جن کی روشنی میں راقم مثنوی نوسرہار کو مرتب کر رہا ہے۔ بقول ڈاکٹر نذیر احمد صاحب یوں تو اچھے متن کی ہر وقت بہت ضرورت رہتی ہے مگر قدیم دکنی نظموں میں صحیح متن کی ضرورت کئی اعتبار سے ہے۔ دکنی نظموں کی لسانی اہمیت ادبی اہمیت سے کہیں زیادہ ہے۔ ان سے زبان کی ارتقائی داستان کا خاکہ مرتب ہوتا ہے لیکن یہ لسانی اہمیت بغیر صحیح متن کے واضح نہیں ہو سکتی۔ اچھے متن کا فقدان زبان کے ابتدائی خدوخال کے روشن کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسی لئے تمام نسخوں کی مدد سے صحیح متن تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ نویں اور دسویں صدی ہجری کی زبان کی خصوصیات سامنے آسکیں اور لسانیات کے محققین کو اس کی روشنی میں اردو زبان کے ارتقائی پہلوؤں کو نمایاں اور لسانیات کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملے۔

نوسرہار کمیاب ہے اور سنہ تصنیف کے اعتبار سے زیادہ قدیم اور اہمیت کی حامل ہے۔ یہ دکنی (ابتدائی اردو) میں اور واقعۂ کربلا پر سب سے پہلی مثنوی ہے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر کسی اور مثنوی یا منظوم کارنامہ کا پتہ نہیں چلتا۔ قدامت کے لحاظ سے اس کو اولیت حاصل ہے۔ زمانۂ تصنیف کا ذکر اشرف نے مثنوی میں دو مقامات پر اس طرح کیا ہے۔ ۹

ہجرت بنی نو سو نو (۹۰۹)　　　کہیا اشرف نوسریو

بازان جیون کی تاریخ سال　　　بعد از ہجرت بنی حال
نوسو ہوئے اگلے نو　　　یہ دکھ لکھیا اشرف تو

مثنوی قصہ متعلق حسین اور واقعۂ کربلا پر ہے اور ۹ ابواب میں منقسم ہونے کی وجہ سے نوسرہار نام سے موسوم ہوئی۔ چنانچہ اشرف نے کتاب کے نام۔ ابواب اور مثنوی کے بہت زیادہ قیمتی ہونے کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

نوسرہار اس دھریا ناؤں　　　جائی دیکھ تو اب ہر ٹھاؤں

ای نو بابان نوسر ہار　　　قیمت اس کی لاکھ ہزار

ناؤں دھریا اس نوسرہار　　　لیکن یہ سب دکھ کا بھار

نوسرہار کا تعارف سب سے پہلے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول کے ذریعہ کراتے ہوئے اردو ادب میں گرانقدر اضافہ فرمایا اور لکھا کہ" اس کتاب کا کوئی اور نسخہ کسی کتب خانہ میں موجود نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک نادر مخطوطہ ہے" نیز ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اپنے مضمون" نوسرہار مصنفہ اشرف یعنی واقعۂ کربلا پر ایک قدیم دکنی مثنوی" کے ذریعہ ڈاکٹر زور کے فراہم کردہ معلومات میں یہ کہہ کر مزید اضافہ فرمایا کہ" اس کتاب کا ناقص نسخہ انجمن ترقی اردو علیگڑھ میں موجود ہے"

اشرف بیابانی ابن سید شاہ ضیاء الدین بیابانی بانی خاندان بیابانی کا جدی سلسلہ حضرت سیدنا احمد کبیر رفاعی سے ہوتے ہوئے امیرالمومنین حضرت سیدنا علیؓ تک پہنچتا ہے اور ننھیالی سلسلہ ان کے ماموں اور خسر حضرت سانگڑے سلطان سے۔ اس لئے آپ کے مذہب اور عقائد مسلک کے بارے میں با سانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ سنی العقیدہ مسلمان تھے اور اپنے والد ہی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ قتل حسین پر مثنوی نوسرہار لکھنے سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید اشرف امامیہ مسلک کے ہوں۔ گو مثنوی واقعہ کربلا پر ہے جس میں حسینیوں کی شہادت اور یزیدیوں کے ظلم و بربریت کے واقعات کو بیان کیا گیا ہے مگر حمد اور نعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدح صحابہ کرام میں ہونے سے واضح ہوتا ہے کہ اشرف کا مذہب امامیہ نہیں تھا۔

مثنوی نوسرہار کی تصنیف کا سبب شاید یہ ہے کہ اشرف بیابانی کے والد سید شاہ ضیاء الدین بیابانی ماہ محرم کے عشرہ میں ہمیشہ مجلس منعقد کرکے اس میں شہادت امام حسین اور واقعات کربلا پر نہایت پراثر وعظ فرماتے تھے جس سے حضار مجلس اور تمام معتقدین پر ایک رقت کا عالم طاری ہوجاتا تھا اور حاضرین متاثر ہوکر انتہائی رنج وغم کے ساتھ آہ و زاری کرتے تھے اور خود حضرت پر بھی رقت طاری ہوجاتی تھی۔ اس لئے لازمی ہے کہ اشرف بیابانی بھی ان مجالس میں ضرور شریک رہتے ہوں گے۔

والد کی تعلیم و تربیت اور وعظ و نصیحت کا لازمی نتیجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشرف نے والد ماجد کی ۹۰۸ھ میں رحلت پر واقعہ کربلا کو اس وقت کی مقامی زبان دکنی میں منظوم کرنے کو مناسب سمجھا۔ اور مثنوی نوسرہار اسی ۹۰۹ھ میں لکھ کر بطور یادگار چھوڑی اور والد کی سنت کو نہ صرف باقی اور زندہ رکھا بلکہ زندہ جاوید بنادیا تاکہ مقامی لوگ اس کو آسانی سے پڑھ اور سن سکیں۔ اس وقت مجالس کے انعقاد اور ماہ محرم میں واقعات کربلا کو بیان کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نویں صدی ہجری میں آج سے تقریباً پانچسو سال پہلے دکن میں مجلسوں کا رواج تھا جس میں لوگ کربلا سے متعلق مصائب بیان کرتے۔ پڑھتے اور سنتے تھے۔

اشرف کا یہ منظوم کارنامہ" نوسرہار" دکنی ادب میں ایک لاقیمت شاہکار اور نایاب شہ پارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ دکنی میں اس قدر طویل مثنوی لکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اشرف ایک قادر الکلام شاعر تھے جنھیں مقامی زبان پر پوری طرح قدرت اور اپنے دور کی زبان پر استادانہ مہارت حاصل تھی۔ اشرف نے واقعہ کربلا اور شہادت امام حسین کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ قتل حسین کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے اور انداز بیان بھی اس قدر رواں اور پراثر ہے کہ دلوں پر نقش ہوجاتا ہے۔

اس طویل مثنوی کا ایک ہی نشست میں احاطہ ممکن نہیں اس لئے یہاں صرف نویں اور دسویں محرم کے واقعات کو پیش کیا جاتا ہے جو حضرت علی اکبر اور حضرت امام حسین کی شہادت عظمیٰ سے متعلق ہیں۔

نویں محرم کو حضرت علی اکبر کی شہادت ہوئی ۱۲ برس کا سن رخصت کا سماں۔ حضرت امام حسین کی بیقراری اور ماں کی گریہ وزاری اور دل پر پتھر رکھ کر لخت جگر کو دشمنوں کے مقابلے میں جانے کی اجازت دینے کا منظر پیش کیا ہے۔

حضرت امام حسین کے لخت جگر شبیہ رسول علی اکبر باپ کے پاس آئے دونوں پاؤں پر اپنا سر رکھا اور باپ پر جان قربان کرنے اور جنگ میں جانے کی اجازت چاہی۔ امام مظلوم نے بیٹے کا سر دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور سینے سے لگا لیا اللہ پر نظر کی اور مجبور ہو کر بیٹے کو اجازت دیدی پھر ماں نے بیٹے کو گلے لگا لیا اور یہ کہتے ہوئے رونے لگیں کہ تجھ پر بارہ لاکھ مرتبہ قربان جاؤں۔ میں نے تیرا دودھ بخشا۔ تیری معصوم جان پر اتنا بڑا صدمہ دیکھکر مجھ بدبخت کو کیسے چین مل سکتا ہے۔ میں تجھے کہاں چھپا کر رکھوں۔ بیٹے آؤ اور میرے پیٹ میں سما جاؤ۔ آخر بیٹے کی بے چینی اور جذبہ شوق شہادت سے مجبور ہو کر دل پر پتھر رکھا اور لخت جگر کو دشمنوں کے مقابلے کی اجازت دی۔ اس واقعہ کو اشرف کی زبانی سنئے ؎

وجہن باحسین نکل جیؤ ن بُنیاشاد حسین کا تیوں
اتر گھوڑے ہوا پاؤں علی اکبر اس کا ناؤں
دوڑ آیا حسین کن بارہ برس کیری سن
حسین کیری دونوں پاؤں پکڑ دھیا سر سوں لاؤں
بازاں امام حسین اٹھ دو نوں نینوا نجھو کھو ٹھ
بیٹے کا سر دونوں ہات لیکر لایا سینے سات
پکڑ رہے کیتے بار رو رو نینو لائے دھار
بازاں اٹھکر سرور شاہ کرد توکل بر اللہ
ہو اراضی ضرور آت بیٹے کیرا لیکر ہات
مائی آئی اِنہ پیار دکھ بھر آیا جیؤ نسار
بیٹے کوں لے گلے لاؤں واری اپس چومی پاؤ
رون لاگی یوں سکھہ واری تجھ پر باراں لکھہ
میں تجھ کیتا دود حلال پیاری توں مجھ یوں بحال
تجھ ننھی جیؤ پراتنا دکھ کیوں مجھ ڈائن کوں ہووے سکھ
کہاں راکھوں تجھ چھپاؤ آ د پیارے پیٹ سماؤ
جی توں جاتا دب کر آؤ ہوں میں ادبھی تیری چاؤ

غرضکہ علی اکبر لخت جگر حسین فاطمی ماہ رو میدان جنگ کی طرف روانہ ہوئے اور شامی لشکر میں کود پڑے بجلی کی طرح کوندتے ہو

دشمن کی فوج کے چھکے چھڑا دئے اور انھیں اس طرح بکھیر دیا جیسا چیتے کے خوف سے ہرن منتشر ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن آخر کار مقدر کا لکھا پورا ہوا اور ایک سنگدل کے ہاتھوں زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑے۔ حضرت امام حسین یہ منظر دیکھ کر دوڑتے ہوئے میدان میں گئے اور بیٹے کا سر زانو پر رکھ کر ملک الموت کے حوالے کیا۔ بے قابو ہو کر زور سے رونے لگے خیمہ میں آواز پہنچی اور ایک کہرام مچ گیا۔ قیامت کا سماں تھا۔ ماں باپ۔ عزیز و اقارب روتے روتے بیتاب ہو گئے۔

علی اکبر صورت سار کسوت زیبا مجلس بار
کوت اجالا گھر دیپک جگ منہ پیارا ان دھیرک
اوبھا ہوا جیسا چاند تیغ و ترکش کمر باند
فوج میں تھے چلیا یوں ابر میں تھے چندا جیوں
ہر نیاں بھیتر چیتا جیوں مار بکھیرے کافر تیوں
اپن بھی جگہ زخماں کھائے لال ہوا سب لہو نہائے
یہ جیو دیا راہِ خدا بیروں کیتا سیس جدا
جبھیں پر بابن مون بوت رھیا شاہ حسین مہوت
شاہ حسین یوں دیکھیا حال رون لاگے ھنیا کہال
عورتوں مردوں کیتا شور رون لاگے سب نا زور
رون لاگے یوں اس ٹھاؤں علی اکبر کا لے نانوں
یوں پر گزری روتیں رین کوئی ماباپ بھائی بھین
علی اکبر آیا رن رون لاگے سگلے جن
رد رو ہوئے یوں بیتاب نہ ان پانی نہ خوش خواب

اس اثنا میں ایک صحابی کی آنکھ لگ گئی کیا دیکھتے ہیں کہ خاتون جنت بی بی فاطمہ زہرا کربلا کی زمین اپنے دامن سے صاف کر رہی ہیں اور فرما رہی ہیں کہ میرے نازکا پالا بیٹا جگر گوشۂ رسول کربلا کے اس میدان میں دشمن کے ہاتھوں شہید ہو گا۔ اس کے نازک بدن میں یہ کنکر پتھر چبھیں گے۔

حسین کیری سگی ماں خاتون جنت شمع جہاں
فاطمہ زہرا جس کا نانوں سرکوں اوتر آئی پاؤں
جانوں ان پکڑیا اپن ہات دامنی کیری بالوں سات
کر میل کا سب جھاڑا انگن کنکر کیسٹ ساری تن

خار و خشت خاشاک — جھاڑ یا کیتا سکلا پاک
لاڈ کھیلا نازک تن — کہ اس کربل کیری صحن
انخوں ابیرون سیتیں لڑ — جیو را دے گا اینہاں پہ
یوں رو آکھی فاطمہ بات — سپناں دیکھیا ساری رات
جیئوں تھپ جاگیا صبح دین — رھیا نہیں ہوئے غمگین
اٹھ کر کہیے سگلے خواب — حسین دھریم یار اصحاب

دسویں محرم کو حضرت امام حسین اپنی بیوی۔ بہنوں اور عزیز و اقارب سے رخصت ہو کر جب میدان جنگ میں جاتے ہیں تو ہیبت سے یزیدی فوج میں لرزہ پڑ جاتا ہے بہادر سے بہادر سردار امام کے سامنے آنے سے گھبراتا ہے اور پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جو سامنے آتا ہے موت کے گھاٹ اترتا اور دوزخ میں پہنچتا ہے۔ آخر کار حضرت حسین سیکڑوں دشمنوں کو قتل کر کے تھک جاتے ہیں۔ دشمن کا تیر شہ رگ میں لگتا ہے۔ حضرت حسین گھوڑے سے زمین پر گر پڑتے ہیں۔

یوں پہ باز ان سب گھر میں — وداع کر اٹھ شاہ حسین
باہر آیا فوج سنوار — ہور ہی سیتیں جتنے بار
گھوڑے چڑھ کر ہو استقد — و بہن یا حسین نکلیا سید
بیا حسین نعرا مار — تھرہر کا پنیا سارا بھار
حملہ کیتا یوں ان مرد — کربل موں سب اٹھی گرد
سرور شاہاں پرور کوٹ — ترور بجلی مرور جوٹ
مار بچھڑ سب کافر — کربل بھیتر چھون دھر
یوں ان کیتا رن کھیتر — کھول نہ سکے کوئی نر
جدھر اٹھے یہ منہ دھر — دلوٹ پیادے سواروں پر
سواروں پیادوں لیتاران — کینہ پایالی نہ جیو دان
اکوں لیتا جنگل جھاڑ — اکوں کیتا ڈونگر آڑ
حسین کیری ایکس ہانک — پڑ دل پڑیا ایسا دھاک
یوں اپ بیری جاتی آئیں — میدان اندر شاہ حسین
ایسا حسین یوج کیا — جگ موں یاری ناؤں رھیا
اتے مارے کافر ے — ہر ہر حملے کیتے سپے

بازاں ہوا ماندا سخت — ہور بھی ہوا آخر وقت
جہیں بچوتا گل مون تیر — لہو چلیا بہہ جیوں نیر
تیر گذراتہ رگ پھوٹ — گھوڑے پر تھیں آسن چھوٹ
حسین کلماں عرض کیا — راہِ خدا میں جیو دیا

حضرت کا گھوڑا تنہا خیمہ میں آتا ہے اس کو خالی دیکھ کر خیمہ میں شور برپا ہوتا ہے اور سب لوگ رو رو کر بے حال ہو جاتے ہیں۔ حضرت حسین کی اہلیہ نے بالوں کا جوڑا کھول ڈالا۔ چوڑیاں پھوڑ دیں۔ کانوں کی بالیاں نکال پھینکیں۔ آنکھوں کا کاجل پونچھ ڈالا۔ بالوں کی پٹیاں نوچ ڈالیں اور آہ و زاری کرتی ہوئی سینہ کوبی کرنے لگیں کہ اے میرے مالک اب میرا کوئی سہارا نہیں رہا۔ شوہر کو یاد کرکے کہنے لگیں کہ اے میرے پیارے شوہر تم گھر آؤ۔ میں تمہاری راہ میں آنکھیں بچھا رہی ہوں۔ تمہارے بغیر دنیا ویران ہے کس پہ اب ناز کروں اور کون ہے جو میرے دکھ سکھ کی خبر لے افسوس کہ کوئی سسرال میں ہے نہ میکے میں۔ کیوں نہ میں جل کر مر جاؤں۔ میرے سر سے سایہ اٹھ گیا۔ اب میں کس کے آسرے بیٹھوں اور کس کے سہارے جیوں۔ کاش کہ میری ماں مجھے جنم نہ دیتی اور یہ مصیبت نہ پڑتی۔

جیوں سب لوکاں یکایک — خالی آسن گھوڑا دیکھ
آکم رہے حیران ہوئے — اٹھے سگلی ہائی ہائی روئے
ایسا اٹھیا گھر میں شور — کر نہ سکے کوئی ہور
بانو ہوئی او بھی باؤ — گھر تیں نکل آنگن آؤ
جوڑا کھولیا چوڑ ابھان — توڑن لاگی بالیاں کان
انکھوں کیرا کاجل پونچھ — بال پٹیاں سب لیناں نوچ
پیٹن لاگی ہا ہا بھر — کوٹن لاگی سینہ سر
تجہ بن مجہ جگ اوجاڑ — کس پر چلے دکھ سکھ لاڈ
وہ ساہوری پیوکی ناہیں کوئی — کیوں کہاوں جر مارا روئی
سر تے چھتر گیا ڈھل — اب کیوں جیوں کس کے بل
کس لگ بیٹھوں کس کے پاس — نہ پیو کا کوئی نہ سسر ساس
کاش کہ نہ جنتی مجکوں مائی — تو نہ پڑتا یہ دکھ آئی

حضرت حسین کے گرتے ہی دشمن گھیر لیتے ہیں اور سر مبارک جسم سے جدا کر دیتے ہیں اس طرح مقدر کا لکھا پورا ہوتا ہے اور ہاشمی خاندان کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ سے جاندار اور بے جان متاثر ہوتے ہیں۔ جہاں

تاریک ہو جاتا ہے ایسی آندھی اور طوفان اٹھتا ہے کہ چاند سورج چھپ جاتے ہیں۔ بادل گرجتا ہے زمین لرزتی ہے گویا قیامت معلوم ہوتی ہے۔ تعزیت کے لئے تمام فرشتے اور انبیاء حضرت کے پاس آتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لاتے ہیں۔ حضرت علی بی بی فاطمہ زہرا اور حور و رضوان آتے ہیں اور اس قدر روتے ہیں کہ میدان کربلا شاہ حسین کے نام سے گونج اٹھتا ہے۔

جہاں پڑیا سید راؤ   گھوڑے پیتے بھوئیں پر آؤ
آئے بیری اوپر داٹ   سیس مبارک لیتا کاٹ
تو کیا کہوں اے یار   جگ میں ہوئی یوں اندکار
ایسی اٹھی آندھی باؤ   چندر سورج روپ چھپاؤ
ہوا یوں تاریک جہاں   کر نہ سکے کوئی بیان
ابر گرجیا لرزی زمین   جانوں قیامت قایم ہوئی
شہید ہوئے سید شاہ   حاضر آئے سب ارواح
حوراں رضواں آیاں پاؤ   جہاں پڑیا سید راؤ
روحاں جملہ پیغمبر   حاضر آیاں تعزیت دھر
نبی محمد صلی اللہ   در حال آئے اور بی ماہ
علی کی بھی آئی روح   کروند ہر یک ہائے وہو
تو لک بی بی فاطمہ جان   ستیں حوراں چند رضوان
حوراں رضواں جملہ ملک   ارواح رسولاں سب جتیک
یہ سب روین لے بے نانوں   شاہ حسین جیں پڑیا ٹھانوں
آواز اٹھی کربل میں   واہ حسین لے شاہ حسین

اس غم کا اثر تمام جاندار اور بے جان چیزوں نے لیا۔ سمندر کا پانی اس صدمے سے کھاری ہوگیا۔ قاف دور ہٹ گیا۔ ہما دنیا سے بھاگ گیا۔ اور آسمانوں میں جا کر رہا۔ اس غم سے لنکا میں آگ لگ گئی۔ کوئل جل بھن کر کالا ہوگئی اور اس سوزش سے ہائے وائے کرتی ہوئی سمے کپڑے پہنے جنگل جنگل روئی۔ طوطوں نے سبز بن ہو کر منہ لہو سے سرخ کر لیا۔ اور بلبل آہ و فغاں کرنے لگے۔ سنبل نے اس رنج سے سینہ جلا لیا۔ اور سر کے لمبے بال توڑ ڈالے سوسن سر پیٹ کر دس زبانوں سے ماتم اور آہ و بکا کرنے لگی۔ پانی کا کلیجہ پانی ہوگیا اور آگ غم میں جل بھن کر کباب ہوگئی۔ ہوا کالی دھول اڑانے لگی چاروں طرف دنیا میں ہول اور دہشت پیدا ہوگئی اور اس واقعہ پر

آج بھی ساری دنیا روتی ہے اور قیامت تک روتی رہے گی۔

سمندر دوکھوں ہوا کھار — قاف اُڑ گیا پہلی بار
سیمرغ اندر قاف قرار — پکڑ رہیا جا کر ذہ کہار
ہماں گیا جگ تیں نخاس — جائے رہیا اب گگن آکاس
دوکھوں لنکا پکڑی آگ — جل بل کوئل ہوئی راک
کوئل جل بل کالی ہوئی — واہ وہ کہہ بن بن روئی
طوطی سبز کی تن ہر بالاں — بلبل ہوی درنالاں
راویوں سب تن ہر یا کر — مکھ سُبحا یا ہو جھر
سنبل اس دکھ سینا جال — سر کے توڑے بینے بال
سوسن سر بہل ماتم وار — دس جیباں سو کرے پکار
پانی سینہ کیتا آب — آتش جل بل ہوئی کباب
باؤ اور آئی کالی دھول — چہو دھر جگ میں پاڑی ہول
ہور بھی روے سارا جگ — اس دن تھے قیامت لگ

اس کے بعد خاتمے کے بیت ہیں جس میں تاریخ تصنیف، مثنوی کا نام اور زبان سب مذکور ہیں۔ اشرف نے کربلا کے مصائب کو نہایت واضح اور پُر اثر انداز میں لکھا ہے اس میں مصیبتوں کا وزن بھی ہے اور ایک ایک بول موزوں بھی ہے۔ داستانِ ظلم و ستم اور کرب و بلا کو اشرف نے غم کے آنسوؤں سے آنکھوں کو دھو دھو کر اور رو رو کر لکھا۔ اس کا ایک ایک بول موزوں ہے اس میں لڑائی کا پورا حال لکھا ہے۔ اس کو سن کر کانوں کے کیواڑ کھلتے ہیں اسکو پڑھ کر ساری دنیا روئے گی اور کلیجے سوز سے کوئلہ ہو جائیں گے۔ ان مصائب کو سنکر آنکھوں سے آنسو کی دھار رواں ہو گی اور دل مارے غم کے بیٹھ جائیں گے۔ سچ مچ وہ بڑا شقی اور سنگدل ہے۔ اس کا دل پتھر کا ہے جو ان مصائب کو سن کر نہ روئے۔ آخر میں اشرف اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے خداوندا جتنے لوگ اس مجلس میں بیٹھے ہیں سب پر رحم کر پڑھنے اور سننے والوں کو بخش دے۔ آمین الٰہی آمین۔

بازن تبیوں کی تاریخ سال — بعد از ہجرت نبی حال
نو سو ہوئے اگلے نو — یہ دکھ لکھیا اشرف تو
ناؤ دھریا اس نوسر ہار — لیکن یہ سب دکھ کا بھار
انکھیاں انجھو سب دکھ دھو دھو — لکھیا میں یہ دکھ رو رو

یکیک بول یہ موزوں آن — تقریر ہندوی سب بکھان
تو بر تکیات حرب — کھول کہے میں کتھا سب
تو یہ سنتے سگلے کوئی — یہ سب تکھیا میں دکھ روئی
تکیا سگلا خوب سنوار — یہ سن کھلتے کان کو اڑ
تیوں لاگے انجھو دھار — ہتیاں بکسی دکھ تہار

ایسا کون ہو سنگدل ہوئے — یہ دکھ سن کر وہ نا روئے
اشرف آکھے اپتے یار — جیوں تجکوں اے کرتار
سگلیوں باہیں رحمت کر — جتنے بیٹھے مجلس بھتر
پیرتیوں سنبتوں آمرزینا — آمین اللہ یا آمین

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی
وینکٹیشور یونیورسٹی، آندھرا پردیش

غالب کی شاعری میں قرآنی تلمیحات

یہ ایک دلچسپ موضوع ہے کہ غالب جیسے لاابالی مشرب شاعر کے یہاں قرآن مجید کے اثرات تلاش کئے جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کے تمام شعراء ادبی روایت کے طور پر قرآنی تلمیحات استعمال کرتے آئے ہیں غالب نے ان سے اپنی شاعری کو شوخی رعنائی اور حسن کی دولت عطا کی ہے اور اپنی فطری ظرافت سے ان سے نئے معانی، نئے اشارے اور نئے آفاق پیدا کئے ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ قرآن کے معروف عقائد کے علاوہ بسا اوقات غالب نے ان قرآنی نظریات سے فائدہ اٹھایا ہے جو ادبی روایت کی شان نہیں رکھتے ان سے ایسے مفاہیم اخذ کئے ہیں جن تک عام شعراء کی رسائی نہیں۔ قرآنی تلمیحات کا استعمال دراصل فارسی شاعری سے اردو شعراء کو ورثہ میں ملا ہے کلام غالب کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں تو ہمیں مندرجہ ذیل قرآنی معتقدات، نظریات، واقعات اور قصص کی جانب کثرت سے تلمیحات کا استعمال نظر آتا ہے۔

۱۔ جنت و دوزخ کے تصورات۔

۲۔ حور اور فرشتوں کا ذکر۔

۳۔ توحید پرستی۔

۴۔ ولی یعنی خدا کا دوست ہونا۔

۵۔ عقیدۂ جبر، اگرچہ یہ نظریہ قرآن سے براہ راست ماخوذ نہ سہی مگر اس کے ماننے والوں نے یعنی فرقۂ جبریہ نے دلائل قرآن پاک سے فراہم کئے ہیں۔ بہرحال جبر و اختیار کی بحث قرآن کے مباحث میں داخل ہے۔

۶۔ حشر و نشر

۷۔ حساب و کتاب

۸۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سے متعلقہ قصص مثلاً ید بیضا اور فرعون، عصائے موسوی، من و سلویٰ وغیرہ۔

۹۔ دیدۂ یعقوب۔

۱۰۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن اور زلیخا کا عاشقہ، عزیز مصر۔

۱۱۔ حضرت خضر علیہ السلام اور موسیٰ کی ملاقات۔ چشمہ حیواں، آب حیات۔

۱۲۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مسیحائی۔

۱۳۔ نار نمرود اور گلزار خلیل

۱۴۔ قرآنی نظریات کے بموجب مسلمانوں کا قبلہ کعبہ ہے جو توحید پرستی کا مرکز ہے اس کے برعکس بتخانہ ہے جہاں بتوں کی پرستش ہوتی ہے پھر بتوں کے سلسلہ میں تلمیحات وکنایات میں نئے مفاہیم کا غالب کے یہاں ایک سمندر جوش زن نظر آتا ہے۔

۱۵۔ ایمان خدا کے یقین کا نام ہے۔ قرآن مجید کے نظریہ کے مطابق جیسے کہ ارشاد ہوا " الذین یومنون بالغیب " یعنی بن دیکھے خدا پہ ایمان لانا۔ اس حقیقت کو چھپانا اور انکار کرنا کفر ہے کفر و ایمان کی یہ قرآنی اصطلاحات سے اردو شاعری پر ہے۔

۱۶۔ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے گیہوں کھانے کی وجہ سے نکالے گئے اور دنیا میں بھیجے گئے قرآن مجید نے اس قصئے کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ غالب کے یہاں بھی اس کی جانب تلمیحات موجود ہیں۔

۱۷۔ شیطان انسان کا دشمن ہے اور اس کو برائی کی جانب مائل کرتا ہے۔ اس سے محفوظ رہ کر تقوی کی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ اس تصور پر کثرت سے تلمیحات غالب کے یہاں ملتی ہیں۔

۱۸۔ جامۂ احرام حج کے موقع پر باندھا جاتا ہے اس کا ذکر بھی غالب نے کیا ہے۔

۱۹۔ اعجاز بھی قرآنی نظریات سے ماخوذ ہے یعنی ما فوق العادت وفطرت اشیاء کا ظہور جس کے لئے قرآن مجید میں لفظ " آیت " کا عموماً استعمال ہوا ہے۔

۲۰۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر جانا اور تجلی کا ظہور۔

۲۱۔ معراج کا واقعہ اور طوبیٰ وسدرہ کا ذکر۔

۲۲۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظمت شاہی اور قدرت قاھرہ

جنت و دوزخ کے سلسلہ میں غالب نے بڑی شوخی سے کام لیا ہے دلچسپ مفاہیم پیش کئے ہیں۔ اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

بعد یک عمر ورع ' بار تو دیتا ' بارے	کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی	گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
طاقت بیں نار ہے نہ مئے وانگبیں کی لاگ	دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست	لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو
دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے	نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے
کیوں نہ فردوس کو دوزخ میں ملا لیں یارب — سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہے بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے؟

ان بہت سے اشعار میں شاعر نے اپنی فکر رسا سے نتائج اخذ کرنے میں غیر معمولی ذہانت اور حقیقت کے ساتھ پرواز تخیل سے کام لیا ہے ان میں بعض اشعار تو ایسے ہیں جو ضرب المثل بن چکے ہیں۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

دیکھئے جنت کی شراب طہور سے غالب نے واعظ سے فنکارانہ طنز کیا ہے۔

ایک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے — حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے

اگرچہ یہ اشعار زیادہ جاندار نہیں مگر محبوب کی ذات سے ان بہشتی مخلوقات کو ملا کر شاعر نے ایک نئی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں جو حقیقت پیش نظر ہے وہ بہشت کے بارے میں قرآنی اصطلاحات کا استعمال ہے جنھیں شاعر نے اپنے مقصد کے مطابق استعمال کیا ہے۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم — کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
دیکھیو، غالبؔ سے گر الجھا کوئی — ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

قرآن مجید نے اولیاء اللہ کا ذکر بار بار کیا ہے اسلامی طرز فکر میں اور تصوف میں اس اصطلاح کا مفہوم بہت وسیع اور اہم ہے غالب نے اس سے بھی تلمیح کا کام لیا ہے اور بڑے سلیقہ سے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

کراماً کاتبین کے اس قرآنی نظریہ کو اردو شعرا نے طرح طرح سے بیان کیا ہے۔

میر صاحب فرماتے ہیں:- ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

مگر غالب نے اپنی ذہانت سے اسے ایک نیا رخ یہ کہہ کر دیا کہ فریقین کے بجائے صرف ایک ہی فریق کا گواہ ہے جبکہ عدالت و انصاف کے لئے دونوں کے گواہ درکار ہیں۔

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

غالب نے خونِ جگر کو "ودیعتِ مژگانِ یار" قرار دیکر ایک نیا پہلو نکالا ہے۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

یہاں بھی غالب نے قیامت کے مفہوم کو بڑے بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

جزا و سزا بھی قرآنی عقائد کا ایک اہم حصہ ہے غالب کی شوخی یہاں بھی نظر آتی ہے اور پوری رعنائی کے ساتھ

لرزتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

وائے اگر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

صور کا پھونکا جانا، حشر کا برپا ہونا، انصاف کے ساتھ فیصلہ ہونا اور قیامت کے دن کی سختی یہ سب قرآنی نظریات ہیں جن سے مذکورہ اشعار میں پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے بلکہ ان سے ان کو غیر موضوع وہ معانی کے لئے مستعار لیا گیا ہے۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

سو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مسیحائی اور ان کا مردوں کا زندہ کرنا، مادر زاد اندھے کو بینا کردینا اور دوسرے معجزات کا ذکر قرآن میں بہت سے مقامات پر کیا گیا ہے اسکو فارسی شعرا نے اپنایا اور ان سے اردو شعرا نے یہ مفاہیم اخذ کئے اور ان سے اپنی شاعری کو جاندار بنایا مومن اس بارے میں غالب سے آگے نظر آتے ہیں وہ کہتے ہیں:

منت حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہوں گے

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کیلئے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

حضرت خضر اور موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات کا ذکر قرآن نے بڑی تفصیل سے سورۂ الکہف میں کیا ہے ہم بلاشبہ کہہ سکتے ہیں کہ اس واقعہ سے اتنے دلچسپ مفاہیم کسی اردو شاعر نے اخذ نہیں کئے ہیں جتنے ہم کو غالب کے یہاں ملتے ہیں۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنان مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

یوسف علیہ السلام کا قصہ اور ان کی جدائی پر حضرت یعقوب کی آنکھوں کا رونے کی شدت سے جاتی رہنا یہ تمام واقعات قرآن نے تفصیل سے بتائے ہیں پھر یوسف علیہ السلام سے زلیخا کا عشق اور پھر ان کی قید و بند وغیرہ معروف اسلامی و قرآنی روایات ہیں جن سے اردو و فارسی شعراء نے کماحقہ فائدہ اٹھایا ہے

صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا
ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا

بہرحال اس موضوع پر باوجود بہت سے اشعار ہونے کے غالب کے یہاں جاندار اشعار ہیں۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا :

حضرت ابراہیم اور نمرود کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے۔ غالب نے بڑے اچھے اور انوکھے انداز میں شکایت کے طور پر نمرود کی بے وقعتی کا ذکر بھی کر دیا ہے شاید اس موضوع پر اردو میں اس پائے کا شعر نہیں۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

عرش کا مفہوم بھی قرآنی ہے عرش سے پرے مکان بنانا شاعر کی بلندی پرواز کی انتہا ہے جو اسے ہماری شاعری میں ایک غیر معمولی اہم مقام عطا کرتی ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہاں بھی حضرت آدم کے جنت سے نکلنے کے قصے سے دلچسپ انداز سے اپنے نکلنے کو مماثل قرار دیا ہے آج یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

طاعت و زہد پر ہزاروں اشعار ہیں مگر اس شعر کا جواب اردو میں ملنا مشکل ہے۔

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے　　آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

مے سے جامۂ احرام کو آلودہ کر کے ایک شاعرانہ لطف پیدا کیا ہے۔

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر　　دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب　　آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

اللہ تعالیٰ کی طور پر تجلی اور موسیٰ علیہ السلام کی بیہوشی کا ذکر قرآن مجید میں تفصیل سے درج ہے۔ اس واقعہ سے غالب نے مذکورہ دو ایسے جاندار اور اعلیٰ تخیل سے حامل اشعار پیش کیے ہیں جن سے ہماری شاعری عبارت ہے۔

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک

اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

حضرت عیسیٰ کی مسیحائی اور حضرت سلیمان کی شان و شکوہ کا ذکر قرآن میں موجود ہے یہ شاعرانہ تعلی کی اچھی مثال ہے

کعبے کس منہ سے جاؤگے غالب　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالب نے اس شعر میں کئی قرآنی تصور یکجا کر دیے ہیں ایک توجہ بیت اللہ پھر گناہوں کی پشیمانی دونوں چیزوں کا تعلق قرآنی تصورات سے ہے پھر طرز بیان اور تخیل تو غیر معمولی عظمت کا حامل ہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے　　مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم　　الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بیخودی　　رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ　　شہیدان نگہ کا خوں بہا کیا؟

قرآنی نظریہ یہ ہے اگر کوئی کسی کو قتل کر دے تو اس کے بدلے میں یا وہ خود قتل کیا جائے یا پھر ایک مناسب رقم اس کے ورثا کو دی جائے بشرطیکہ وہ اسکو قبول کر لیں۔ غالب نے اسی تخیل سے فائدہ اٹھایا ہے اگرچہ شعر جاندار نہیں ہے۔

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم ثواب سے　　ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

پہلا شعر تو یوں ہی ہے مگر موخر الذکر اردو کے بہترین اشعار میں شمار ہونے کے لائق ہے قرآنی نظریہ یہ ہے کہ فرشتے کراماً کاتبین

انسان کے اعمال کو لکھتے ہیں۔

گر غالب نے ایک نیا لطف پیدا کیا کہ جب مقدمہ ہوتا ہے تو دونوں فریق کے گواہ ہونے لازم ہیں ایک فریق اپنی طرف سے لکھ لینے کا حق نہیں رکھتا۔

بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے — غلام ساقی کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے
کل کیلئے کر آج نہ خست شراب میں — یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

عجیب بات ہے کہ غالب کے یہاں جہاں بے راہ روی ملتی ہے وہاں مذہبی عقیدت اور مذہبی تصورات بھی کثرت سے ملتے ہیں یہ اشعار بھی اسی طرح کے ہیں، اور اسلامی عقائد کی ترجمانی کرتے ہیں۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ شعر اگرچہ شکایت آمیز انداز لئے ہوئے ہے مگر پرکشش ہونے میں شبہ نہیں۔

بیگانگی خلق سے بے دل نہ ہو غالب — کوئی نہیں تیرا تو مری جاں خدا ہے

یہ شعر تو بالکل ہی متوکل مسلمان کے عقیدہ کا حامل ہے اور نعم المولیٰ ونعم الوکیل کی تفسیر ہے۔

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے — آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

گنہگار اور کافر قرآنی اصطلاحات ہیں۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

قرآنی عقیدہ ہے کہ خدا کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں اس موقعے پر اس کا استعمال غالب نے بڑے حسین انداز سے کیا ہے۔

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں — گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

قرآن مجید نے کہا ہے "سیماہم فی وجوہہم من اثر السجود" مسلمانوں کے چہروں پر سجدہ کے نشان ہوتے ہیں اس تخیل سے غالب نے فائدہ اٹھایا ہے۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی — روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

عقیدہ ہے کہ قرآن مجید حضرت جبرئیل کے ذریعہ حضور پر نازل ہوا۔ گویا شاعر اپنی تعریف کر رہا ہے کہ باوجود حضرت جبرئیل کی عدم موجودگی کے میں ایسا کلام کہہ لیتا ہوں۔

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز — کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

ایمان کی حفاظت قرآن کے بنیادی تصورات میں ہے مگر یہاں غالب نے "بت" شے سے ملاکر اسے جاندار بنایا ہے حالانکہ اس کی مراد کچھ شاعرانہ انداز بیان سے ہے نہ کہ کفر و ایمان سے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نہ صرف خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ اس پر دلائل بھی فراہم کرتے ہیں۔ یہ سب شاعرانہ انداز بیان ہیں۔ انسانی قلب پر جو مختلف خیالات گذرتے ہیں انہیں شاعر بیان کرتا ہے۔ اس سے مثبت و منفی قطعی فیصلے کرنا محال ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔

اس مختصر سی بحث سے محض یہ حقیقت سامنے لانی مقصود تھی کہ ہمارے ایک عظیم شاعر غالب نے قرآن مجید سے کس طرح تلمیحات اخذ کر کے اپنی شاعری میں رنگ بھرا ہے نیز یہ کہ خود اردو شاعری میں قرآن مجید کے اثرات کس حد تک رچ بس گئے ہیں۔ امام غزالیؒ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "لا تنقضی عجائبہ" یعنی قرآن مجید کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون غالب کے دو نہایت منفکرانہ اور قرآنی مفاہیم سے پر اشعار پر ختم کروں۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ڈاکٹر صفدر علی بیگ

دولت و ثروت اور اس کا استعمال

عموماً صوفیہ اور صوفی شعراء نے فقر و درویشی اور قناعت کی تعلیم دی ہے لیکن ان کے تصور فقر کے چند اہم نکات کا واضح ہونا ضروری ہے۔ پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ فقر سے ترک دنیا، رہبانیت، غار و کوہ کی زندگی، گوشہ نشینی، بیکاری اور بے عملی مراد نہیں ہے۔ اور نہ پھٹا پرانا میلا کچیلا اور بد وضع لباس پہننا یا معمولی اور بدمزہ غذائیں کھانا ہے۔ کیوں کہ ایسا تصور حیات قرآن حکیم اور تعلیمات اسلامی پر مبنی نہیں ہے خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اے لوگو جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال اور پاکیزہ چیز (شوق سے) کھاؤ۔ ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے کہ" اے ایماندارو جو پاک چیزیں خدا نے تمہارے واسطے حلال کر دی ہیں ان کو اپنے اوپر حرام نہ کرو۔" اسلام اور صوفیہ نے جائز آمدنی اور دولت سے منع نہیں کیا ہے۔

روایت ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ایک معتقد علا ابن زیاد الحارثی نے آپ سے عرض کیا کہ میں اپنے بھائی عاصم ابن زیاد کی شکایت کرتا ہوں کہ وہ ایک عبا پہنے ہوئے دنیا ترک کر کے عزلت گزیں ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اسے ہمارے پاس لاؤ اور جب وہ حاضر خدمت ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اے اپنی جان کے دشمن تجھے خبیث شیطان نے حیران کر رکھا ہے۔ تو اپنے اہل و عیال پر بھی رحم نہیں کرتا۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ پروردگار عالم نے طیبات دنیا کو تیرے لئے حلال کیا ہے۔ اور تو اس بات کو بھی مکروہ سمجھتا ہے کہ تو ان میں سے کچھ حاصل کرے۔ تو اس عمل اور اس سمجھ کے باعث پروردگار کے سامنے بہت بے آبرو ہوا۔ عاصم نے جواب دیا کہ یا امیر المومنین میرا یہ عمل آپ کے ہی عمل کے مانند ہے آپ بھی تو موٹا اور چھوٹا کپڑا پہنتے ہیں اور بے مزہ اور بدذائقہ کھانا نوش فرماتے ہیں تو یہ سنکر آپ نے فرمایا "وائے ہو تجھ پر میں تیرے مانند نہیں ہوں (تجھے میری ہمسری زیبا نہیں) اس لئے کہ خداوند تعالیٰ ائمہ حق اور پیشوایان عادل پر فرض کر دیا ہے کہ وہ ضعیف اور محتاج نفوس کے سبب سے اپنے نفس پر سختیاں کریں تاکہ فقیر کا فقر اور محتاج کی محتاجی انہیں مضطرب نہ کر دے۔" جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز ہر ایک کے لئے نہیں ہوتی۔ اسلام نے عوام الناس کو اس طرح پابند نہیں کیا ہے۔ اگر اس طرح پابند نہ کیا جاتا تو نہ صرف یہ ایک غیر فطری بات ہوتی بلکہ شاید عوام الناس کے لئے قابل قبول بھی نہ ہوتی کیونکہ فطری طور پر انسان اپنی حالت درست کرنے اور اس کو ہر اعتبار سے بہتر بنانے کی طرف مائل ہے۔ مالی حالت اور معاشی حالت سنوارنے کی اس میں فطری طور پر خواہش موجود رہتی ہے اور یہ خواہش ناروا نہیں ہوتی۔ اونچے درجات اور جاہ و منصب کی طلب جو انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہے انسان میں موجود رہتی ہے۔

تصور فقر کو سمجھاتے ہوئے ابن قیم الجوزی کہتے ہیں کہ فقیر صرف وہی شخص نہیں جو مال و متاع اور ساز و سامان نہیں رکھتا اور

جس نے خدا کے عشق میں اپنے آپ کو دولت و عشرت سے بے نیاز کر لیا ہے بلکہ وہ شخص بھی فقیر ہے جو مال و دولت، جاہ و جلال اور شان و شوکت رکھتا ہو لیکن اس کو صرف خدا کی امانت اور اسی کی ملک سمجھتا ہو۔ اپنے آپ کو اس کا مالک نہیں سمجھتا۔ خدا ہی کے احکام اور مرضی کے مطابق اسکو صرف کرتا ہو اور اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے یا اپنی خوشی، مرضی اور رائے کے مطابق صرف نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کا قوی امکان رہتا ہے کہ اگر وہ اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق صرف کرے تو گناہ کے لئے بھی صرف کرے اور گمراہی میں پڑ جائے۔ دولت انسان کو فقر سے دور نہیں کرتی البتہ اگر انسان اس کو بھی اپنی ملکیت جان کر خدا کے احکام کے خلاف صرف کرے اور اپنے باطن کو آلودہ کرے تو فقر سے دور ہو جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس سونے اور چاندی کے پہاڑ بھی ہوں پھر بھی وہ دولت فقر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تو اس کو کوئی نقصان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض عظیم المرتبت انبیاء بھی نہایت دولت مند رہے ہیں جیسے حضرت سلیمان، حضرت داؤد اور حضرت شعیب وغیرہ لیکن پھر بھی ان کے فقر پر حرف نہیں آ سکتا۔ ابن قیم کے نزدیک ایک شخص دولت مند ہوتے ہوئے باخدا اور باعمل ہوتے ہوئے دولت مند رہ سکتا ہے۔ بلکہ صحیح مصرف اور کار خیر میں اس کو صرف کرنا ثواب کا باعث بن جاتا ہے۔

ابن قیم الجوزی نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو دولت کا مالک سمجھتا ہے اس کا تعلق اپنے مال کے ساتھ عاشق و معشوق کا سا ہو جاتا ہے اور مال کی جمع و تحصیل اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لئے حدیث شریف میں "بندۂ درہم و دینار" کے سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ایسا شخص فقر اور تنگدستی کے تصور سے بھی لرزہ براندام ہو جاتا ہے اور بعض وقت موت کو اس پر ترجیح دیتا ہے۔ برخلاف اس کے جو شخص دولت کو خدا کی ملکیت خیال کرتا ہے اور خدا کی مرضی کے مطابق صرف کرتا ہے مالی نقصان کی صورت میں بے صبر اور بے قرار نہیں ہوتا۔ امام غزالی کہتے ہیں کہ انسان دولت کی اتنی خواہش نہ رکھے کہ دولت ملنے سے اسکو خوشی ہوتی ہو اور نہ اتنی نفرت کرے کہ دولت کو باعث تکلیف محسوس کرے اس سے دست بردار ہو جائے۔ قشیری کہتے ہیں کہ اگر خدا مجھے غنی کرے تو میں خدا سے غافل نہ رہوں گا اور اگر مجھے فقیر بنا دے تو حریص اور خدا سے روگردان نہ ہو جاؤں گا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ صوفیانہ فقر ترک دنیا اور رہبانیت پر منحصر نہیں ہے۔ اس اہم نکتے کو واضح کرتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں:

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی — تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار — فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
یہ فقر مرد مسلماں نے کھو دیا جب سے — رہی نہ دولت سلمانی و سلیمانی

صوفیت کا مقصد ناجائز دولت اور دولت کے ناجائز استعمال سے منع کرنے اور جائز دولت کو راہ خدا اور کار خیر میں صرف کرنے کی تعلیم دینا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی کے لئے محنت، مشقت، جد و جہد اور کسب معاش ناگزیر ہے۔ حالی کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے

غریبوں کو محنت کی رغبت دلائی کہ بازو سے اپنے کرو تم کمائی
خبر تاکہ لو اس سے اپنی پرائی نہ کرنی پڑے تم کو در در گدائی

مال و دولت کسی انسان اور اس کے زن و فرزند کی فلاح و بہبود کے لئے بلکہ زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے جائز دولت سے بالکل ہاتھ اٹھا لینا دانشمندی نہیں ہے۔ حالی نصیحت کرتے ہیں کہ زن و فرزند کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا چاہئے اور انھیں معاشی مشکلات میں پریشان چھوڑ کر دنیا سے رخصت نہ ہونا چاہئے۔ یہ سوچنا چاہئے۔

لباس انکا اور اپنا ہوگا کفن کیا کہ بعد اپنے کھائینگے فرزند و زن کیا

ایک غور طلب امر یہ ہے کہ انسان صرف روح ہے اور نہ صرف جسم۔ اس کا وجود ان دونوں کے تعلق پر منحصر ہے۔ وہ اگر روح کے تقاضوں کو پورا کرے اور جسم کے تقاضوں کو پوری طرح نظر انداز کر دے تو اس کا جینا محال ہے۔ اسی طرح اگر جسم کے تمام تقاضوں کو پورا کرے اور روح کے تقاضوں سے منہ پھیرے تو خدا کو ناراض کرے گا۔ اس کو چاہئے کہ نیکی، شرافت اور دیانت داری کے ساتھ ساتھ جسمانی زندگی کے جائز تقاضوں کو بھی پورا کرنے کی کوشش کرے اسلام انسان کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر نہیں بٹھانا چاہتا اور یہ بھی نہیں چاہتا کہ انسان دنیوی زندگی اور کائنات مادی میں اس قدر محو ہو جائے کہ خدا، مذہب اور حیات بعد الموت کو بھول جائے۔ اسلام کو ایک ایسے انسان سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کے پیر زمین پر جمے ہوئے ہیں لیکن چہرہ اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں۔ یعنی دنیا و ما فیہا کے ساتھ ساتھ اس کی نظر خدا پر رہتی ہو۔ اسلامی تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ انسان کا عمل ناپاک، روح آلودہ اور اخلاق و کردار پست نہ ہونے پائیں۔ وہ دنیا میں اس طرح رہے جس طرح بطخ پانی میں رہتی ہے اور نہیں بھیگتی۔ کہتے ہیں کہ اس کے پروں پر ایک قسم کی چکناہٹ فطری طور پر ہوتی ہے جس سے اس کے پر بھیگنے نہیں پاتے۔ وہ جیسے ہی پانی سے باہر نکلتی اور پروں کو جھٹکتی ہے پورا پانی نکل جاتا اور پر خشک رہتے ہیں۔ انسان بھی دنیا میں اسی طرح رہے تو اس کی روح آلودہ نہیں ہونے پاتی۔

انسانی زندگی مادی، حیوانی، نفسی بھی ہے اور روحانی بھی۔ اس کا تعلق مخلوقات اور خالق دونوں سے ہے۔ خدا نے آدم کو مٹی سے بنایا اور اس میں اپنی روح پھونکی جیسا کہ خود فرماتا ہے کہ "ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی"۔ خود اللہ تعالیٰ مسلسل عمل پیرا ہے اور چاہتا ہے کہ انسان بھی شب و روز محنت، کشمکش اور جدوجہد میں زندگی گزارے۔ اس کے علاوہ انسان کے دل میں فطری طور پر بے شمار آرزوئیں، حسرتیں اور تمنائیں موجود رہتی ہیں۔ جہاں رنگ و بو اسے اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ دنیوی لذتیں اس کا دامن کھینچتی ہیں۔ آرام، چین اور سکون کے لئے وہ حیران و سرگرداں رہتا ہے۔ نفس انسانی جسم کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ جسم مادی میں ایک روح بھی ہوتی ہے جو انسان کے خیال اور فکر و نظر کو فرش سے ہٹا کر عرش پر جا دیتی ہے۔ بہرحال انسان نہ دنیوی زندگی سے کنارہ کش ہو سکتا ہے اور نہ روح کے تقاضوں اور خدا کے احکام سے روگردانی کر سکتا ہے۔ انسانی فطرت اور نفسیات کی اس کیفیت کو غالب نہایت خوبصورتی سے دو شعروں میں ظاہر کرتے اور کہتے ہیں کہ

میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں اور اس کے عشق میں گم ہوں۔ اور متاعِ عشق حاصل ہونے کے بعد کونین اور دولتِ کونین نظروں میں ہیچ ہو کر رہ جاتی ہے پھر بھی ایک عجیب بات یہ ہے کہ مجھے متاعِ عشق میسر حصول کے بعد بھی ہستی و مافیہا سے محبت ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دولت، ایمان و دین کے باوجود میں دنیا کو نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ یہ امر انسان کے لئے غیر فطری معلوم ہوتا ہے کہ وہ تارک الدنیا اور اپنی ہستی کو مٹانے کے درپے ہو جائے۔ انسانی زندگی کا تقاضہ ایمان و عشق کے ساتھ دنیا و مافیہا سے بھی ربط رکھنا ہے اور ایک کے لئے دوسرے کو چھوڑا نہیں جا سکتا کہتے ہیں۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

ثروت سے متعلق دوسرا اہم نکتہ جو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ دولت و ثروت، اور جاہ و مناصب کو غیر اصولی اور ناجائز طور پر استعمال نہ کیا جائے اس کے علاوہ دولت کی افراط کے سبب اگر انسان عیش و عشرت اور خواہشات نفسانی کی تکمیل میں محو ہو جائے دولت سے محبت کرنے لگے۔ خدا کو بھول کر درخشندہ فلزات کو اپنا خدا بنا لے، غرور اور گھمنڈ رکھے یا دولت کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچائے اور خدا کو ناراض کرے تو گویا خود اپنے جہنم کی آگ کو ہوا دیتا ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے متعلق ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ علاء ابن زیاد کا عالی شان مکان دیکھ کر ارشاد فرمایا تھا کہ "تو نے دنیا کے مکان کو وسیع کرنے کے لئے کیا کچھ کیا حالانکہ تو آخرت کے گھر کو وسیع و فراخ کرنے کا زیادہ محتاج ہے۔ ہاں اگر تو چاہے کہ اس (وسعتِ مکان دنیوی) کے باوجود آخرت میں بھی ایک وسیع مکان کا مالک ہو تو اس مکان میں مہمانوں کی ضیافت کر، صلۂ رحم بجا لا، لوگوں کے حقوق اس مکان میں رہ کر بہ وجہ شرعی ادا کر۔ اس وقت البتہ تو اپنی مراد کو پہنچ گیا۔" دولت کے صحیح اور جائز استعمال کا درس نہ صرف اولیاء اللہ، حکما اور صوفیہ نے دیا ہے بلکہ شعرائے اردو نے بھی نہایت خوبی سے اس بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ سراج دولت مندوں کو دولت کے فتنے سے بچنے اور غفلت و گمراہی اختیار نہ کرنے کی تعلیم ان لفظوں میں دیتے ہیں۔

تکیۂ مخملی سرہانے رکھ لیکن آنکھوں سے اپنے خواب نکال

خواجہ میر درد بھی قشیری کے ہم خیال ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا دولت دے یا گدائی دونوں پہ رضامند رہنا اور خدا کی مرضی کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔

نہ مطلب ہے گدائی سے نہ یہ خواہش کہ شاہی ہو الٰہی وہ ہی ہو جو کچھ کہ مرضی الٰہی ہو

ہر دولت مند کا فرض ہے کہ اپنی دولت سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے خصوصاً عزیزوں، محتاجوں اور حق داروں کو۔ وہ ایسا نہ کرے تو عالمِ انسانیت کی خوشی کا باعث بنتا ہے نہ خدا کی۔ ایسے انسان پر افسوس کرتے ہوئے وجدی کہتے ہیں کہ

تا ترے زر سے کسے ہے کچھ نفع (کسی کو نفع) نہ تجھے اس زر سے کچھ ہوگا وفا (ہوگا)

زر کی مارکھ میں گنوائی عمر سب — رات دن جی کو ترے زر کی طلب
فکر سے زر کے تجھے ہے مشغلہ — زر نہیں تو جی کو تیرے ولولہ
اس کسب سے کیوں خدا کو پائیگا — دین و دولت ملک کیوں ہاتھ آئیگا

دولت کو مخلوق خدا پر خرچ کرنا دنیا و آخرت دونوں میں فائدہ پہنچاتا ہے۔ قرآن حکیم نے نیکی کا بدلہ دس گنا۔ اور جو کچھ خدا کی راہ میں دیا جائے اسکو خزانہ غیب میں دینے والے کے لئے محفوظ بتایا گیا ہے۔ بلکہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اپنی کسی محبوب چیز کو بھی خدا کی راہ میں دے دو۔ ایسی ہی نصیحت کرتے ہوئے دہ (خدا کی راہ میں) دینے کے فوائد بتاتے ہیں۔

ہے اگر کچھ دل میں حق کی طلب — خرچ کر اس زر کو اس کی راہ میں اب
تجھ کو پیارا ہے جو کچھ سو ترک کر — بلکہ سارے جیو سے اپنے گذر
جیو تو آخر جائیگا اک روز وہیں — کاں (کہاں) یہ تیرا مال جب یہ جیو نہیں
راہ میں (وہاں) مولا کے جو کچھ ہے سو دے — چند از آں اس کا نفع تو دیکھ لے
جب تلک گذرا نہیں اس سب چیز سے — شبہ کیسے (کیسے یہاں) کیوں جائیگا دہیز سے

ایسی ہی نصیحت نظیر اکبرآبادی اور ذوق نے بھی کی ہے۔ نظیر کہتے ہیں۔

دولت جو ترے پاس ہے رکھ یاد تو یہ بات — کھا تو بھی اور اللہ کی کر راہ میں سوغات
دینے سے اسکے ترا اونچا ہے پھر ہات — اور یاں بھی تری گذرے گی سو عیش سے اوقات
اور واں بھی تجھے سیر یہ دکھلائیگی بابا

ذوق کہتے ہیں۔

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق — کچھ فائدہ بے دست کرم اٹھ نہیں سکتا

اگر دولت مند دولت کے نشہ میں، عیش و عشرت یا کاروبار دنیوی میں، یا پھر غرور اور گھمنڈ میں بھولا ہوا ہوتا ہے اکبر اس کی آنکھوں سے مال و دولت اور جاہ و ثروت کے زرین و رنگین پردے اٹھا کر اس کو اس تیرگی کا منظر دکھاتے ہیں جو قبر سے شروع ہوتی ہے۔

لحد کی فکر بھی لازم ہے منعم قصر عالی میں
مآل کار بھی کچھ سوچ لے اے بے خبر اپنا
اسی کو ہم تو سمجھتے ہیں مستند اکبر
جسے مشاغل دنیا میں فکر دیں بھی رہے

طیب انصاری

مرثیہ اور مقصد

مرثیہ کی تاریخ اور اس کے ارتقاء کی داستان اُردو زبان و ادب کی تاریخ ہی سے شروع ہوتی ہے اردو ادب کے ابتدائی دور میں مرثیہ نگاری کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ دکن وہ پہلا گہوارہ ہے جہاں زبان کی پرورش ہوئی اور ادب بھی پیدا ہوا۔ ایرانی ادبیات کے اثرات نے جہاں ہمارے قدیم ادب میں مثنوی کو شہرت دوام بخشا ہے وہیں مرثیہ نگاری کے لئے بھی میدان ہموار کیا ہے دکن کے بادشاہ ایرانی نسل کے تھے اور یہی اردو زبان و ادب کے سرپرست بھی۔ اور ہمارا ادب بھی فارسی ادب ہی کی کوکھ سے پلا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مرثیہ کا جلد آغاز تعجب خیز بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر زور کرم بیلی اور دیگر محققین کے بیان کے مطابق قلی قطب شاہ وہ پہلا دکنی شاعر ہے جس نے سب سے پہلے مرثیہ لکھا۔ مرثیہ کی موجودہ شکل و صورت ترقی یافتہ ہے اور قلی کے زمانہ کا مرثیہ اپنی ابتدائی شکل میں منو پاتا رہا ہے۔ چنانچہ " بارہویں صدی عیسوی تک دکن میں اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہو چکا تھا۔ قلی اور وجہی کے زمانہ تک اردو مرثیوں پر فارسی کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں لیکن مرزا اور شاہی نے مرثیہ کو نئی راہیں دکھائیں۔ اور اس کے لئے "قصہ" کا لفظ استعمال کیا۔ روایات اور مکالمے بھی مرثئے میں پائے جانے لگے۔ اسی طرح مرثیوں میں ڈرامائیت کی جھلکیاں اُبھرنے لگیں۔ مرثیہ کی ساخت اور کینڈا بھی بدلنے لگا۔ مسدس کی صورت میں بھی مرثیہ لکھے جانے لگے۔ جس میں کہا جاتا ہے کہ سودا نے پہلے پہل اس صورت میں مرثیے لکھے۔ ان باتوں سے یہی پتا احساس ہو جاتا ہے کہ دکنی مرثیوں میں وہ تمام چیزیں منتشر حالات میں موجود تھیں جو میر ضمیر اور ان کے بعد والے مرثیہ نگاروں کے ہاں ترقی یافتہ شکل میں پائی جاتی ہیں۔"
بارہویں صدی ہجری کے خاتمہ تک ایڈنبرا کے کتب خانہ میں قدیم اردو کے مراثی کے مخطوطات کا بڑا ذخیرہ ملتا ہے جس کا ذکر ڈاکٹر زور مرحوم نے کیا ہے۔ ان مرثیہ نگاروں کی تعداد تقریباً (۸۰) اسی ہے۔ کئی نامعلوم شعرا ہیں جنہوں نے تقریباً (۲۸۸) مرثیے لکھے ہیں۔ قطب شاہی بادشاہوں میں سلطان قطب شاہ، عبداللہ اور ابوالحسن کے مصاحبوں میں شاہ قلی خاں کے نام اہم ہیں۔ شاہ قلی ہی کے مرثیے ہاتھوں ہاتھ دہلی اور آگرہ پہنچے اور وہاں مجالس میں پڑھے جانے لگے۔ دکنی مرثیہ گو شعراء میں ولی ویلوری کی خاص اہمیت ہے اس نے " جنگ نامہ" کے ذریعہ مرثیہ کو نئی توانائی بخشی۔ ولی کا جنگ نامہ فارسی جنگ نامہ کا ترجمہ ہے لیکن ولی کی جدت طبع اور قلم کی روانی نے اس ترجمہ کو نیا پن اور نیا آہنگ بخشا۔ ولی کی زبان یقیناً قدیم ہے اور زبان کی یہی قدامت موجودہ زمانے میں اس کے اثر کو زائل کرنے کا اصل سبب بن گئی۔ ورنہ جہاں تک درد انگیزی اور کرب ناکی کا تعلق ہے، بیان انتہائی موثر، منظر بھی دردناک اور واقعات کچھ اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ بلا شبہ آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں۔ اور پھر

خون کے آنسو رونے لگتی ہیں۔ ولی کا جنگ نامہ جو روضۃ الشہدا کے نام سے بھی موسوم ہے آج بھی دکنی تعصبات دور بستیوں میں مقبول عام ہے۔ اس مقبولیت کی وجہ اس جنگ نامہ کا پُرتاثیر اور بے پناہ غم ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ واقعات کا تسلسل ٹوٹنے بھی نہیں پاتا اور کردار اپنی جگہوں پر حقیقی ہیں اور وہ بھی اپنے ماحول میں۔ یہی ولی کے مرثیہ کی خوبی ہے۔

بلاشبہ قلی قطب شاہ اور اس کے بعد کے شعرا نے مختصر نظموں کو مرثیہ کے لئے استعمال کیا ہے لیکن یہ مختصر مرثیہ جن "بین" کو اہمیت دی جاتی تھی ولی ویلوری تک پہنچتے پہنچتے بڑی حد تک مکمل شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ولی کے یہاں وہ سب کچھ ہے جو دبیر و انیس کے مرثیوں میں پایا جاتا ہے۔ بزم کی جلوہ آرائی بھی ہے اور رزم کے معرکے بھی خونیں مناظر پیش کرتے ہیں۔ بھوک و پیاس کی شدت کا بیان سامعین پر سکتہ کا عالم طاری کر دیتا ہے اور شہادت علی اکبر و علی اصغر پر تو مجمع پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔ یہ کہنا کہ میر ضمیر نے رزم و سراپا مرثیوں میں داخل کیا اور انہوں نے ہی روائتیں نظم کرنا شروع کیں صحیح نہیں ہے۔ روائتیں تو دکنی ادب میں عام تھیں نہیں معلوم کتنے مقامی شعراء نے روائتیں کہی ہیں جن کے نام ہمیں نہیں ملتے لیکن وہ روائتیں قلمی نسخوں کی شکل میں ایک کاپی سے دوسری کاپی میں نقل ہوتی جاتی ہیں۔ بزم و رزم کی ہنگامہ آرائیاں ولی کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ولی نے اپنے "جنگ نامہ" کو مجلسوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ جنگ نامہ اس قدر طویل ہے کہ مسلسل پڑھنے کو بیٹھ جائے پورے چوبیس گھنٹے صرف ہوں گے لیکن ان چوبیس گھنٹوں میں شاید ہی آپ کو اکتاہٹ محسوس ہو۔

دکنی مرثیہ نگاروں میں نادر الکلام مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے قادر بے حد مقبول رہا ہے جس نے تقریباً ستر۱۱ مرثیے لکھے ہیں غلامی نے بھی اتنے ہی مرثیے لکھے ہیں۔ نادر اور غلامی کے بعد مرزا اور رضا ہیں جنہوں نے پندرہ پندرہ مرثیے لکھے اور اشرف و ذوقی نے بالترتیب ۱۲ تیرا اور اٹھارہ مرثیے لکھے۔ ان ہی شعرا کے ناموں میں دو ہندو نام بھی نظر آتے ہیں وہ ہیں داس اور لچھمن۔ داس کے آٹھ اور لچھمن کے ایک مرثیہ کا ذکر ملتا ہے۔ دکنی مرثیوں کے اس کثیر ذخیرہ کو جو ظاہری اور معنوی اعتبار سے قابل لحاظ ہے پیش نظر رکھتے ہوئے اظہر علی فاروقی نے کہا ہے تو بے جا نہیں کہا کہ " بہرحال ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ اگر دکنی مرثیہ نگاروں کے مرثیے اس طرح منظر عام پر آجاتے جس طرح مرزا سودا کے کلیات منظر عام پر آگئے تو ہمیں اپنا یہ خیال بدلنا پڑا۔ سچ پوچھئے تو سودا ہی پر کیا منحصر ہے میر ضمیر کے وہاں بھی نقوش ملتے ہیں جو دکنی مرثیوں میں اثر انگیزی اور سوز و گداز سے ہٹ کر طوالت کے لحاظ سے بھی ولی کے مرثیہ کا جواب پیش کرنا مشکل ہے۔

ولی ویلوری نے اٹھارویں صدی کے اوائل میں یہ جو مرثیہ لکھا ہے یقیناً یہ اس کی ذاتی طبع آزمائی نہیں بلکہ ملا حسن کی فارسی تصنیف مجلس روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے جس طرح نظم طباطبائی کی ترجمہ نظم "گورغریباں" ترجمہ ہوتے ہوئے نظم کی تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کو پیش کرتی ہے اسی طرح ولی کا یہ مرثیہ اس کی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں اور مرثیہ نگاری میں کمال فن کو ظاہر کرتا ہے۔ مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے قطب شاہی عہد میں قلی نے جس صنف سخن کا آغاز کیا تھا وہ دکن میں

مغلیہ دور تک پہنچتے پہنچتے ایک مکمل فن کی صورت اختیار کر گیا اور اس دوران قطب شاہ، عبداللہ، قلی خاں، احمد، اشرف، صلاح، سید، غلامی، فائز، قادر، مرزا، مسکین، ہاشمی اور نہ معلوم کتنے دیگر شعرا ہیں جنہوں نے مرثیہ کے ارتقا میں گراں بہا خدمات انجام دیں۔ اور دکن کے سفیر ولی دکنی کے شمالی ہند کو پہنچنے سے قبل ہی ولی ویلوری نے مرثیہ کی بڑی حد تک تکمیل کر دی تھی۔ اس طرح جب ولی دکنی (۱۷۰۰ء) میں دہلی پہنچتا ہے تو یہ اجنبی شاعر وہاں پہنچ کر اپنے آپ کو اور اپنی زبان کو اجنبی نہیں پاتا۔ ایسے ایسا لگتا ہے کہ لوگ وہاں اس کی آمد سے قبل ہی دکنی ادب اور شاعری سے پوری واقفیت رکھتے ہیں چنانچہ ولی دکنی کو دلی کے مشاعرے لوٹنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

ہماری شاعری میں مرثیہ نگاری کے آغاز کا سہرا نوری (جہانگیری عہد) یا پھر سودا کے ہمعصر میاں سکندر اور فضلی کے سر باندھا جاتا ہے۔ درحقیقت اردو شاعری کے قدیم سرمائے سے عدم واقفیت کی بنا پر ایسا ہوا ہے اب جبکہ دکنی ادب کا گرانقدر سرمایہ منظر عام پر آتا جا رہا ہے سبھی اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے ہیں جمیل جالبی و ڈاکٹر زور کی تائید کرتے ہیں کہ قلی قطب شاہ ہی پہلا مرثیہ گو شاعر ہے۔ بعض محققین نوسرہار کے مصنف اشرف (۱۵۰۳ء) کو پہلا مرثیہ گو شاعر قرار دیتے ہیں۔ نوسرہار میں نو ابواب پر مشتمل واقعات حسینؑ قلمبند کئے گئے ہیں۔ اور دکنی مرثیوں کے مطالعہ کے بعد زبان کے نقص کو نظر انداز کر دیں تو معنوی اور فنی اعتبار سے ولی ویلوری کا طویل مرثیہ (جنگ نامہ) مرثیہ کی ارتقائی منزلوں کو طے کرتا ہوا نقطہ کمال تک پہنچا ہے اور وہ خوبیاں جو میر ضمیر اور ان کے ہمعصروں سے وابستہ کی جاتی ہیں ان شعرا کی فنی صلاحیتوں کو تسلیم کرتے ہوئے ساری خوبیوں کا اصلی مستحق ولی ویلوری ہی قرار پاتا ہے۔ البتہ جہاں تک تخلیقی مرثیہ کا تعلق ہے یقیناً سودا، میر ضمیر، اور مرزا دبیر و میر انیس کا مرتبہ تخلیقی فنکاروں کی حیثیت سے بہت بلند ہے۔

بلاشبہ لکھنؤ میں زبان کا بناؤ سنگار ہوا جو شستگی اور شائستگی، سلاست اور سادگی اور حسن و جاذبیت اردو زبان میں موجود ہے وہ دبستان لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں کی شب و روز محنت اور غیر معمولی دلچسپیوں کا نتیجہ ہے۔ رجب علی سرور کی فسانہ عجائب، عطا حسین خاں تحسین کی نوطرز مرصع اور شرر و سرشار کی تحریروں نے زبان و بیان میں نکھار پیدا کیا اور وہیں آتش و ناسخ، مصحفی اور انشاء اور دبیر و انیس نے اپنی شاعری کے ذریعہ اس زبان کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ میر کی شستہ زبان اور بے ساختہ بیان پر اہل لکھنؤ کو ناز ہے تو بے جا نہیں ہے۔ زبان نکھری اور ستھری اور بیان رنگین ہو تو فن لافانی بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے مرثیہ جب دکن سے لکھنؤ پہنچتا ہے اور حسین و رنگین زبان میں لکھا جانے لگتا ہے تو اس کے اثر میں دوگنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ دیگر اصناف شاعری کی طرح مرثیہ بھی دکن ہی میں تدریجی اور ارتقائی منازل طے کرتا ہے لیکن یہ صنف سخن لکھنؤ پہنچ کر مکمل فن بن جاتی ہے۔ مرثیہ جیسی صنف سخن کو فن اور لافانی فن میں تبدیل کرنے والے یقیناً شعرائے لکھنؤ ہیں!۔

سودا اور میر ضمیر سے پہلے لکھنؤ کے شعرا میں دو اور حریفان سخن کے نام ملتے ہیں، عزلت اور رفعا۔ مرثیہ کا بنیادی

مقصد ثنائیت ہے۔ تخلص سے عزلت اس بات کی طرف ایک مرثیہ میں اشارہ کرتا ہے۔

خام مضمون مرثیہ لکھنے سوں چپ رہنا بھلا
پختہ درد آمیز عزلت بات تو احوالات بول

مگر اس کا ہم عصر رضا اس کا جواب یوں دیتا ہے ؎

اے عزیزاں گرچہ عزلت مرثیہ میں یوں کہا
خام مضمون مرثیہ لکھنے سوں چپ رہنا بھلا
لیکن اس مظلوم کے سر کا بیان کرنا روا
تا کہ سن کر یو بیان ہوویں محبان اشکبار

سودا عزلت کے بیان پہ جان دیتے ہیں اور میر و ضمیر رضا کے "بین" پہ مرتے ہیں۔ سودا نے ان شعرا کی خوب خوب ہجو کی ہے جو محض ثنائیت کو حاصل مرثیہ سمجھتے ہیں۔ سودا کے نزدیک مرثیہ گوئی صرف رونے رلانے اور اظہار عقیدت کے لئے نہیں ہے بلکہ مرثیہ کو ہماری شاعری میں ایک اہم صنف بنانے کے لئے زبان و بیان کی شکست اور ریخت لازمی قرار دی۔ باوجود اس کے دو دو کے سودا مرثیہ گو شاعر نہیں کہلا سکے وہ درحقیقت قصیدہ گو تھے اور ان کی زبان کی آن بان اگر کہیں اپنے پورے جلال کے ساتھ کھپ سکتی تھی تو وہ مرثیہ نہیں قصیدہ ہی ہو سکتا تھا۔ میر نے بھی مرثیے کہے ہیں حالانکہ یہ غزل کا تاجدار تھا اور وہ ہمیشہ شان غزل ہی کہلائیگا مرثیہ کا میدان تو ضمیر کے لئے تھا یا پھر سکندر کے لئے۔ سکندر اور ضمیر نے مرثیہ کے فن میں جدت اور اختراع سے کام لیا ہے۔ میاں سکندر نے ایک نہایت دردناک مرثیہ مسدس کے طرز میں کہا اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حیدر شاہ نامی ایک شاعر بادشاہ دہلی محمد شاہ کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے پہلی مرتبہ مسدس میں مرثیہ کہا تھا۔ ضمیر نے مرثیہ کے عناصر کو شعوری طور پہ واضح کیا ہے۔ چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، رزم، شہادۃ، بین اور دعا ایک مکمل مرثیہ کے لئے ضروری عناصر ہیں۔ بلاشبہ یہ عناصر دکنی مرثیوں میں پہلے ہی سے بدرجہ کمال موجود تھے لیکن خصوصی توجہ تو اسی زمانہ میں دی گئی۔ ضمیر نے روایات کو منظوم کیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ "روایات" کا رواج پہلی مرتبہ رائج ہوا جب کہ دکن میں ہر چھوٹا بڑا شاعر مجلسوں کیلئے "روائتیں" لکھتا ہے۔ روائتوں کا ذخیرہ دکن میں وافر مقدار میں مل جائیگا۔ لوک گیتوں کی طرح روائتیں بھی دکنی معاشرہ میں مقبول و عام ہیں۔

سکندر اور ضمیر کے علاوہ دلگیر، فصیح اور میر خلیق اپنی مرثیہ گوئی کے لئے ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ مرزا رجب علی سرور نے فسانہ عجائب میں مرثیہ گویوں کا ذکر کرتے ہوئے دلگیر کی مدح کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرور مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے دلگیر کے قائل تھے جبکہ میر خلیق کے بھی اپنے معتقدین کثیر تعداد میں موجود تھے۔

دبیر کا زمانہ لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا دور سمجھا جاتا ہے۔ دبیر سے پہلے غزل کا چرچا عام تھا۔ ناسخ، آتش، مصحفی، انشا، اور میر نے غزل ہی میں سر مارا ہے۔ اس دور میں اگر مرثیہ کہا بھی گیا ہے تو وہ محض تجرباتی نقطۂ نظر سے اہم ہے۔ [illegible]

جو مرثیے لکھے گئے تھے وہ زبان کے اعتبار سے اس قابل نہیں تھے کہ ترقی پذیر زبان کا ساتھ دیتے اہل لکھنؤ نے اس مرثیہ کو فصیح و بلیغ اور شستہ و سادہ زبان میں ڈھالنا شروع کیا اور اس میں فطری طور پر نئے اضافے بھی ہوتے گئے۔ میر ضمیر میدان جنگ کی ہولناک تصویر دکھانے قتل و خونریزی کا نقشہ کھینچنے میں کامیاب ہوئے میر خلیق کا جوہر کمال لطف زبان کو خیالات درد انگیز کے ساتھ تراکیب دیکر اہل مجلس کو رولانا تھا فصیح نے بیان رزم مرثیوں میں شامل کرنے لگے۔ اس طرح مرثیہ دبیر و انیس تک پہنچتے پہنچتے زبان و بیان ہر دو لحاظ سے اس قابل ہو گیا تھا کہ اس فن میں معرکے شروع ہوں۔ مرثیہ نگاری کے ان معرکوں میں دبیر و انیس دو حریف ہیں اور اس میں مبالغہ نہیں کہ مرثیہ کے مرد میدان انیس قرار پائے اس میں انیس کے بیان سے کہیں زیادہ ان کی دردناک آواز اور اثر انگیز لحن کا دخل ہے۔

مرثیہ نگاری کے ان معرکوں میں لکھنؤ دبستان دو گروہوں میں بٹ گیا۔ ایک تو وہ تھے جو دبیر کے دقیق و بلیغ انداز بیان سے بے حد متاثر تھے دبیرئے کہلائے اور اپنے گروہ میں شیدائیان انیس شریک تھے۔ اختلاف اس حد تک تھا کہ مخالف گروہ والے ایک دوسرے کو کافر و ملحد سمجھتے رہے ہیں۔ مسابقت کا جذبہ ہمیشہ تعمیری اور صحت مند ہوتا ہے لیکن اس وقت یہی مسابقت مخاصمت میں بدل جاتی ہے جب اس میں تنگ نظری، کوتاہ بینی اور ذاتی عناد و بغض شامل ہو جاتے ہیں ظاہر ہے مخاصمت سے جو فضا اور ماحول پیدا ہوگا وہ انتہائی مضرت رساں اور غیر صحت مند ہوگا۔ دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول میں ہمیشہ چھیڑ چھاڑ چلتی رہی ہیں اور اسی طرح لکھنؤ اور دکن کا معاندانہ جذبہ بھی ابھرتا رہا ہے۔ اس قسم کی چھیڑ چھاڑ اور مسابقانہ جذبہ یقیناً ہماری زبان و ادب کے ارتقا اور ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوا لیکن بسا اوقات تنگ نظری اور کوتاہ ذہنی نے مکدر فضا کی پرورش کی ہے۔ کم و بیش یہی کیفیت ہر دور میں ہمارے شعرا کے درمیان بھی رہی ہے۔ میر و سودا، ناسخ و آتش، غالب و ذوق، اور دبیر و انیس کی گروہ بندیاں ہمارے ادب میں غیر معمولی اضافوں کا سبب بنے ہیں۔ ان چشمکوں کی افادیت کے باوجود سودا کی ذاتیاتی ہجو بڑی حد تک غیر مقبول رہی ہے کہ سودا اپنے حریفوں کا مذاق اڑانے میں بعض اوقات حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ کم و بیش یہی کیفیت دبیر و انیس کے دور میں بھی پیدا ہو گئی تھی لیکن کھلم کھلا یہ مکروہ ادب منظر عام پر نہیں لایا گیا انیس کی موت پر دبیر نے جو کچھ لکھا تھا پھاڑ پھینکا اور اس طرز عمل نے انیس کی اولاد کے دل میں دبیر کے مرتبہ کو بلند کیا اور انہوں نے وہ سارا مواد ضائع کر دیا جو انیس نے دبیر کے خلاف لکھا تھا۔ اس واقعہ کے بعد صرف وہی ادب بچ رہا جو صرف مسابقانہ جذبہ کے تحت لکھا گیا تھا اور یہی مواد درحقیقت مرثیہ نگاری کا گرانقدر سرمایہ ہے۔

میر انیس کی وفات (۱۸۷۴ء) کے ایک سال بعد دبیر کا بھی انتقال (۱۸۷۵ء) میں ہو گیا۔ ان دو عظیم مرثیہ گو شعرا کی موت درحقیقت فن مرثیہ کی موت ثابت ہوئی۔ میر انیس کے بیٹوں نفیس و مونس اور دبیر کے خاندان میں اوج نے مرثیہ نگاری میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کی کوششیں کی ہیں لیکن یہ تمام کوششیں کامیاب ثابت نہ ہوئیں۔

شبلی ہمارے ادب کے اولین نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں نے ادب کو زندگی عطا کی۔ اور یہی وہ ادیب ہے

جو شبلی اور ان کے ہمعصروں کی تنقید کی وجہ سے زندگی سے قریب تر ہو گیا۔ شبلی نے ہمارے ادب کی ہر صنف کو نئی توانائی بخشی ہے۔ تاریخ کو نیا رجحان دیا ہے۔ Essays ایسیز میں کمال پیدا کیا، شاعری کو نئے میلانات سے روشناس کرایا اور فن مرثیہ میں موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر پرانے معرکوں کو تازہ کیا۔ اس موازنہ کے نتیجہ میں دبیر و انیس پر تنقید کا ایک لامتناہی سلسلہ آج تک چل رہا ہے۔ کتنی کتابیں دبیر کی تائید میں اور کتنی کتابیں انیس کی تعریف میں اب تک لکھی جا چکی ہیں۔ مولانا آزاد نے بھی "آب حیات" میں اپنی اس رائے کو ظاہر کیا۔

"یہ بات درست ہے کہ مرزا دبیر کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ تھی لیکن حسن قبول اور فیض و تاثیر خدا نے دیا تھا۔ ان کا مرثیہ کوئی اور پڑھتا تو اکثر رلانے میں کامیاب ہوتا تھا کہ یہی اس کام کی علت غائی ہے"

گویا آزاد نے دبیر کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ برخلاف اس کے شبلی انیس کے قائل ہیں۔ لیکن رائے کچھ اس انداز میں دی گئی تھی کہ دبیر تو ناراض ہونے ہی بعض انیسیے بھی خوش نہ ہوئے۔ اس کی تردید میں کئی کتابیں شائع ہوئیں جن میں "المیزان" ادب اردو میں بیش قیمت اضافہ ہے۔ میر احمد علی علوی نے "مولف حیات دبیر" کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ "جب علامہ نے حیات دبیر کو پڑھا تو ان کی رائے تبدیل ہو گئی اور انہوں نے صاف صاف الفاظ میں اعتراف کیا کہ مجھ کو یہ حالات پہلے نہیں معلوم تھے۔ یعنی دبیر کا بہترین کلام علامہ شبلی کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ یہ بات زیادہ قرین قیاس نہیں ہے کہ شبلی اس طرح غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر موازنہ لکھتے۔ اگر واقعتاً ان سے ایسی غلطی ہو بھی گئی ہوتی تو یقیناً وہ ایک مضمون اس تعلق سے لکھتے یا کسی مضمون میں اس واقعہ کا ذکر کرتے۔ تاوقتیکہ شبلی کا تحریری ثبوت فراہم نہ ہو ہم کسی بھی مولف یا مصنف کے بیان پر یقین نہیں کر سکتے اور انیس و دبیر کے تعلق سے وہی رائے صحیح سمجھی جائیگی جو انہوں نے موازنہ میں ظاہر کی ہے۔

مرزا دبیر کا کلام وقیع و بلیغ ہے، الفاظ کا جلال اور بیان کی شان و شوکت پڑھنے والے ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ یعنی آفرینی اور سحر طرازی کے لئے کلام دبیر بے مثال ہے۔ "المیزان ہو" یا "حیات دبیر" یا پھر دیگر کتابیں مرزا دبیر کے دبیریے ان ہی خوبیوں کو بیان کرتے ہیں اور یہ وہ خوبیاں ہیں جن کی بنا پر وہ دبیر کو انیس پر ترجیح دیتے ہیں۔

میر انیس وہ خوش قسمت شاعر ہے کہ جسے قدرت نے شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ خوش الحانی بھی عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ میر انیس کا سا مرثیہ پڑھنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا۔ مسعود حسن رضوی کے قول کے مطابق انیس جب مجلس عزا میں ممبر پر بیٹھے ہوئے اپنا کلام اہل مجلس کو سنا رہے ہوں اس وقت ان پر محویت کا عالم طاری ہوتا تھا اور وہ اپنے کمال کے نشے میں سرشار ہو کر اس بلندی پر پہنچ جاتے تھے جہاں سے بے کمال کا درجہ خواہ وہ ریاست و امارت کا لباس ہی کیوں نہ پہنے ہو بہت پست معلوم ہونے لگتا ہے شاید اس سے مسعود صاحب کی مراد تخت و تاج کے اعلیٰ ترین منصب کو انیس کے درجہ کمال فن سے کم اہمیت دینا ہے۔ اس خوش الحانی اور محویت نے بھی کلام انیس کو شہرت عام بخشنے میں بے حد مددگار ثابت ہوئی جب کہ حریف دبیر کی زبان قدرت کے ستم کا شکار تھی زبان کی لکنت نے موثر کلام کے اثر کو بڑی حد تک کم اثر بنا دیا تھا۔

یادگار انیس

مسعود حسن رضوی نے مرثیہ انیس پر تبصرہ کرتے ہوئے انیس کو قادر الکلام شاعر قرار دیا ہے۔ الفاظ کا موزوں انتخاب اختصار پسندی واقعہ نگاری، جزئیات نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری اور سیرت نگاری بلاشبہ مرثیہ انیس کی وہ خوبیاں ہیں جو انیس کو دیگر مرثیہ گو شعراء سے ممتاز کرتی ہیں۔ لیکن یہ کہ وہ کس طرح خوبی کہلانے کے مستحق ہے کہ "انیس نے اشخاص مرثیہ کی جو سیرت دکھائی ہے وہ نہ خالص عربی ہے نہ بالکل ہندوستانی بلکہ دونوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ہندوستانیت عربیت سے زیادہ نمایاں ہے"؟ حالانکہ اشخاص کی سیرت وہی پیش کی جانی چاہئے تھی جو کہ اصل ہے۔ ہندوستانیت کا نمایاں اثر واقعہ کربلا کو خاص وعام میں عظمت اور اہمیت پیدا کرنے کے لئے ضروری نہیں بلکہ کلام کے تاثر میں یقیناً مفید ثابت ہوا۔ واقعہ کی اہمیت اور افادیت کا جہاں تک تعلق ہے سچے اور حقیقی کردار اور تصویروں کا پیش کیا جانا لازمی ہے۔

انیس کا مرثیہ حقیقت میں ایک خاص طرح کی رزمیہ نظم ہے جس کی ترکیب میں مرثیہ کا عنصر لازمی طور پر موجود ہے اس نظم کا میدان مسعود حسن کی رائے میں مرثیے سے کہیں زیادہ وسیع ہے بلکہ معنوی حیثیت سے شعر کی جتنی قسمیں کی جا سکتی ہیں یہ ان سب پر حاوی ہے۔ اس بنا پر انہوں نے ان لوگوں پر تنقید کی ہے جو اس حقیقت پر نظر نہیں رکھتے چنانچہ ایسے لوگوں میں حالی کا نام پیش کیا گیا ہے۔

حالی کا نظریہ شعری کسی سے پوشیدہ نہیں وہ نقاد ادب جس نے ہماری شاعری کو نئے میلانات سے روشناس واقف کرایا، بے داد و ردو الکلام کی راہوں کو متعین کیا، بے تکی اور بے مقصد شاعری کے خلاف عظیم تحریک چلائی اور زندگی و ادب کے رشتے ناطوں کو سمجھتے ہوئے ادب کو مقصد سے ہمکنار کیا۔ اسی مقصدیت کے پیش نظر اگر انہوں نے کلام انیس کا جائزہ لیا ہو اور کہا "مرثیہ میں رزم و بزم اور فخر و خود ستائی اور سراپا وغیرہ کو داخل کرنا، لمبی لمبی تمہیدیں باندھنا گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں کرنا اور شاعرانہ ہنر دکھانا مرثیے کے موضوع کے بالکل خلاف ہیں"۔ تو غلط نہیں کہا۔ آج تک ہماری شاعری میں جس قسم کے تصورات پنپتے رہے ہیں وہ حیات آفریں کیا خاک ہوتے؟ قوائے ذہنی کو معطل اور جسمانی کو ناکارہ بنا دیتے تھے ضرورت تھی کہ زندگی کے حرکی تصور کو عام کیا جائے۔ حالی جو نباض حیات تھے اور جو ادب کو [illegible] سمجھتے تھے یہ کیونکر گوارہ کرتے کہ ہمارا ادب خرافات کا مجموعہ کہلائے؟ اسی وجہ سے اگر وہ مرثیہ میں رزم و بزم فخر و خود ستائی اور لمبی لمبی تمہیدوں اور گھوڑے تلوار کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں و شاعرانہ ہنر دکھانے کو [illegible] جیسا کہ خود مسعود حسن کربلا کے واقعہ کی اہمیت کے معترف ہیں۔ حضرت حسینؓ نے جو قربانی دی تھی اس عظیم قربانی کا [illegible] تھا اور اگر وہی پس منظر ہمارے شعراء کی منظر نگاری کی نذر ہو جائے تو ظاہر ہے حالی جیسا باشعور نقاد [illegible] تھے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ انیس درد و تڑپ کو پیدا کرنے اور واقعات کی منظر نگاری میں اپنے ہم عصروں [illegible] انیس اور ان کے ہم عصروں سے پہلے اور بعد کے مرثیہ گو شاعروں میں وہ جذبہ اور وہ کیفیت کہیں نظر نہیں آتی [illegible] پڑھنے والے کے ذہن میں ہلچل مچا دے اور وہ عظیم مقصد سامنے آ جائے جس کے لئے حسینؓ نے قربانی [illegible]

برخلاف اس کے مسعود حسن کا یہ کہنا کہ "مرثیوں کی تصنیف کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ انھیں مقدس مجالس عزا میں پڑھے جائیں اور اسی لئے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کو ایک مذہبی عظمت بھی حاصل ہے" تو انیس اور دیگر مرثیہ نگار کے مرثیے اس مقصد پر پورے اترتے ہوں تو یہ الگ بات ہے اور یقیناً مرثیہ ان افراد کے لئے مفید ہو تو ہو جنکی زندگی کا مقصد اور عقیدہ "کربلا کے شہیدوں کیلئے صف ماتم بچھانا اور اس غم کو قیامت تک رکھنا ہے۔ حیات انسان میں غم اضمحلال، مایوسی اور جمود کو پیدا کرتا ہے اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ یہی غم زندگی کی نئی شاہراہوں کی طرف چلنے پر اکسائے، مرتے ہوئے انسان میں جینے کی تڑپ پیدا کر دے۔ غم دوسری نوعیت کا ہے تو اس غم کو یقیناً قیامت تک قائم رکھنا چاہئے لیکن غم کی اس اہمیت کے باوجود غم حاصل زندگی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ غم مقصد حیات نہیں بلکہ بھولی ہوئی منزل کے لئے کھٹک ثابت ہو سکتا ہے۔ جو لوگ حصول مقصد کے لئے سرگرداں ہیں جو حضرت حسینؑ کے مشن پر عقیدہ رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس عظیم منشا و مقصد کے لئے انہوں نے قربانی دی ہے وہ مقصد مستقبل میں پورا ہو جائے اور جو حق و باطل کی کشمکش میں ایقان رکھتے ہوئے حق کے لئے جہد مسلسل کے قائل ہیں ایسے افراد غم کو دلوں میں تازہ رکھیں گے لیکن یہ غم ان کی زندگی کے لئے تازیانہ کا کام دے گا۔ وہ صرف آنسو بہانے اور صف ماتم بچھانے پر کس طرح اکتفا کر سکتے ہیں؟ اسلام ایسے آنسو بہانے والوں کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ضرورت ان لوگوں کی ہے جو جد و جہد اور جہاد زندگانی پر یقین محکم رکھتے ہیں حالی ایسے ہی افراد میں شامل ہیں جنہوں نے حسینؑ کو مرقع سمجھا بہترین اور شریف ترین فضائل انسانی کا اور وہی شاعری اعلیٰ ترین شاعری کہلائے گی جو اس اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں مفید ثابت ہو۔

حالی کی اس تنقید کا شکار صرف انیس نہیں ہمارے پورے مرثیہ نگار ہیں جنہوں نے ایک محدود مقصد کے لئے صف ماتم بچھادی اور جنکے کلام پر ہزاروں کروڑوں انسان آج بھی خون کے آنسو بہاتے نظر آتے ہیں لیکن ان آنسوؤں کی سرخی میں وہ سرخی کہاں ہے جو حسینؑ کے خون میں موجود تھی۔ مرثیہ نگاری فن کی حیثیت سے ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ضرور ہے لیکن مقصد حیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے محدود مقصد کی وجہ سے ناکام رہا ہے۔ مناسب ہے کہ مرثیہ نگاری کا جواب بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اس کے پڑھنے کے رواج کو بھی ختم کر دیا جائے یا پھر جدید نقطہ نظر کے پیش نظر اس کے مقصد کو وسعت دی جائے تاکہ مرثیہ حیات انسانی میں نئی تبدیلیوں کا باعث بن جائے۔

غلام مرتضیٰ راہی

مظفر حنفی کا افسانوی مجموعہ

اینٹ کا جواب

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قصہ گوئی اور قصہ خوانی کا چلن انسان کی جہالت کی نشاندہی کرتا ہے یہ لوگ اپنی دلیل میں ایسی نیم وحشی اور غیر مہذب قوموں کا ذکر کرتے ہیں' جو نہ صرف افسانوں کی شوقین ہیں' بلکہ ان کا اعتقاد اور مذہب ہی قصوں سے لبس ہے — اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تہذیب و تمدن کی نشوونما' افسانوں کے لئے سخت مضر ہے — مگر ایسا نہیں ہے۔ آج ہر شعبۂ حیات میں بے پناہ ترقی کے باوجود' انسان قصہ کا دلدادہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بدلتے ہوئے نظام و شعور کے ساتھ' قصہ کی ساخت میں تبدیلی ہوئی ہے۔

عجیب بات ہے کہ پرانے وقتوں کے طویل ترین افسانوں میں جو تصوراتی فضا اور کردار ابھرتے تھے وہ آج بصورت دیگر حقیقت بن گئے ہیں۔ گویا اسوقت کے فنکاروں نے لاشعوری طور پر اپنے مستقبل کی نشاندہی کی تھی۔ جدید افسانوں میں بھی مہر و مریخ کی باتیں سرکت پرانے افسانوں کا چربہ ہیں۔ مگر کیا عجب کہ یہ بھی کمالِ آگہی کا ادنیٰ نمونہ ہوں۔ قدیم قصے جہاں معاشرہ کو دلچسپیاں' بہم پہنچاتے ہیں' وہاں کارِ اصلاح بھی کرتے ہیں۔ حکایات لقمان' کے صحت مند عناصر آج بھی اپنا اثر رکھتے ہیں۔ انجیل میں بھی قصوں کے پیرایہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کے سبق دیئے گئے ہیں۔

ہر صنفِ ادب میں ماحول اور وقت کی مناسبت سے ترمیم و تنسیخ ہوتی آئی ہے۔ چنانچہ آج کے مشینی و عدیم الفرصتی کے دور میں طویل افسانوں کی جگہ' مختصر افسانوں نے لے لی ہے۔ اردو میں مختصر افسانوں کی عمر اگرچہ نصف صدی سے زیادہ نہیں ہے' لیکن اس کم وقفہ میں بھی اس نے خاطر خواہ پیش قدمی کی ہے۔ آج کے مختصر افسانے' سماجی مسائل' معیشت' سیاست اور نفسیات کا بحسن و خوبی' احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

مظفر حنفی نے دنیائے ادب' میں بحیثیت افسانہ نگار قدم رکھا تھا۔ قلیل مدت میں ہی ان کے افسانے ہندو پاک کے معتبر و مقبول رسائل میں چھپنے لگے تھے۔ حالانکہ اب ان کی فکر و نظر میں شاعری رچ بس گئی ہے مگر وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کا زیر نظر افسانوی مجموعہ "اینٹ کا جواب" اکیس نمائندہ افسانوں سے مزین ہے۔ جسے مرکز ادب بھوپال نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کتابت و طباعت صاف ستھری سرورق جاذب نظر ہے۔

تہذیب و معاشرے کی اصلاح مظفر حنفی کا نصب العین ہے۔ اس نظریے کے اعتبار سے وہ پریم چند سے قریب ہیں۔ پریم چند نے اپنے ۱۹۳۶ء کے صدارتی خطبہ میں ادب کی وضاحت کچھ اس طرح کی تھی"...... مگر ہم ادب کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں

تنقیح، ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں۔"

پریم چند کی طرح مظفر حنفی بھی مقصد پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے کسی افسانے کی تخلیق بے مقصد نہیں کی۔ ان کے بیشتر افسانے مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہیں۔ مگر وہ محض واقعہ یا مشاہدہ کے اظہار پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ فلسفیانہ وجذباتی حقیقت کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ ان کی افسانے طلسم تخیل نہیں، سنگ حقیقت ہیں۔ وہ گرد وپیش کے گھناؤنے ملبہ سے واقعات وکیفیات کا انتخاب کرتے ہیں اور اپنے تخیل کے تعاون سے ایسی فضا تیار کرتے ہیں جہاں حقیقت کے خد وخال ذرا بھی مجروح نہیں ہوتے۔ اس عمل میں ان کے یہاں جذبات کا ہیجان وطغیان بہت ہے، مگر رعنائی خیال کا یکسر فقدان بھی نہیں ہے۔ ان کے افسانے باقاعدہ افسانے نہیں ہیں بلکہ خارجی وداخلی کیفیات کے مدوجزر کا ایک تصویر خانہ ہے۔ وہ واقعات اور کردار عوامی زندگی سے حاصل کرکے اپنے تخلیقی کینوس میں دیکھتے ہیں، اور اپنے محسوسات کو بجنسہٖ ضبط تحریر میں لانے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع خاص سے ہٹ کر فلسفہ طرازی کے قائل نہیں ہیں۔

مظفر حنفی کا اب ولہجہ قنوطی ہے اور یہ ان کی زندگی کی داخلی نیز خارجی ناہمواریوں کا ردعمل ہے۔ دل گرفتگی کا اظہار بہ انداز دیگر، انہوں نے جا بجا کیا ہے۔ ان کے اکثر افسانے انفرادی کیفیات ومحسوسات کے آئینہ دار ہیں، مگر ان کی انفرادیت میں غم دیگراں کی پرچھائیاں بھی نظر آجاتی ہیں۔ ان کے سماجی، معاشی، سیاسی، اقتصادی، علمی اور مذہبی رجحانات، ایک وسیع اور حقیقت آمیز فضا میں سانسیں لیتے ہیں۔

کشمکش (Suspense) مظفر حنفی کے افسانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ قاری کے ذہن میں کہانی کے انجام کی مختلف شکلیں ہر لمحہ ابھرتی رہتی ہیں اور افسانہ کے مطالعہ سے دلچسپی آخر تک قائم رہتی ہے۔ ان کے استعجابیہ افسانوں کا انجام عموماً خلاف توقع ہوتا ہے۔ افسانوں کی خصوصیات میں (Suspense) کا بھی شمار ہوتا ہے۔ حالانکہ جدید افسانے، کشمکش کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ چونکا دینے والا انجام، قرین قیاس نہ ہو تو افسانہ محض 'تخیلی فن' بن کر رہ جاتا ہے۔ مظفر حنفی کا (Suspense) اگرچہ بعید از ممکنات نہیں ہے مگر بعض جگہوں پر قاری کے لئے لمحۂ فکریہ ضرور بن جاتا ہے۔

محبت یا رومان ایک عالمگیر جذبہ ہے۔ رومان سے مراد جنسی جذبابیت، عریاں نگاری یا (Flirtation) نہیں تو مظفر حنفی رومان سے یکسر بے نیاز نہیں ہیں۔ ان کا رومان اگرچہ بہت محدود اور غیر ارادی ہے مگر منظر نگاری اور رومانی رنگ کی آمیزش سے ان کا تاثر برقرار رہتا ہے۔ ان کے رومان میں شوخی بھی ہے اور شرارت بھی مگر شہدپن نام کو بھی نہیں ہے۔ افسانہ "کہتے ہیں عشق جس کو" میں "آنا سے محبت ہو جانے تک بتا کچھ نہیں۔۔۔ اور یہ جذبات ان احساسات سے قطعاً مختلف تھے جو میرے آغاز شباب سے اب تک مختلف لڑکیوں سے ملاقات ہونے پر میرے دل میں پیدا ہوئے تھے اس بات سے محسوس کیا کہ عشق اور ہوس میں کیا فرق ہے"

پروفیسر محمد حسن کی رائے میں "۔۔۔۔۔ اثر پیدا کر دینے اور فوری طور پر ذہنوں کو متوجہ کر لینے کے لئے طنز ایک اچھا

حربے کا کام دیتا ہے، اسے مظفر حنفی نے خاصی کامیابی اور مہارت سے استعمال کیا ہے" ـــــ اس میں کوئی کلام نہیں کہ مظفر حنفی کی نثر و نظم دونوں ایک مخصوص تیکھے لب و لہجہ کی حامل ہیں۔ ان کا انداز بیان، ان کے استاد شاد عارفی مرحوم سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ شاد عارفی کی طرح مظفر حنفی بھی ضمیر فروش، پست کردار اور ناعاقبت اندیش افراد و معاشرہ کو سخت سست کہنے اور ہدفِ طعن و تشنیع بنانے میں ذرا بھی رو رعایت نہیں کرتے ـ ان کی بات بظاہر بہت تلخ ہوتی ہے، مگر غیرت مند معاشرہ پر اپنا صحت مند اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتی۔ ان کے طنزیہ نشتر گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ ضرب الامثال اور محاوروں کے برمحل استعمال سے یہ نشتر اور بھی تیز ہو جاتے ہیں۔ "مولانا میتّ"، "منت کی چادریں"، "وہ لوگ"، "اور ہم سب شریف ہیں"، ایسے ہی افسانے ہیں۔ جن میں زخم خوردہ سماج اپنی منظر ہے، مگر جہاں طنزیہ نشتر مرہم کی طرح "محوکار اصلاح" ہیں۔ "منت کی چادریں" میں ایک جیب کترے کا ذکر یوں کرتے ہیں "بہتر یا سونے والے بابو کی جیب کتر کر اس نے جو منی بیگ حاصل کیا تھا اس میں بہت سی نوکری کی درخواستوں کے ساتھ صرف ایک کھوٹی چونی نکلی تھی۔" افسانہ کتنے میں پان والا کہتا ہے" میں نے ایسے ایسے بزرگوں، پنڈتوں اور مولویوں کو اندر (طوائف کے گھر میں) جاتے دیکھا ہے جنکی ساری عمر انسانیت کے تحفظ میں گذری ہے" ـــ مولانا صاحب طوائف کے کوٹھے سے اپنے پاؤں واپس آتے ہوئے بڑبڑاتے ہیں "آج کمبخت میراثن کا حاضر ہے۔ (پچھلی شب چھوٹا بھائی موجود تھا) اب صبح سمجھونگا دونوں سے۔ آوارہ ہوتے جا رہے ہیں۔ حرامزادے" ـــــ واقعہ نگاری اور کردار نگاری میں مظفر حنفی کہیں کہیں صداقت سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ ایسے مواقع پر ان کا انداز بیان "تکلف اور تذبذب آمیز ہو جاتا ہے۔ جس کا ردعمل قاری کے ذہن پر بعینہٖ ہو جاتا ہے۔ مثلاً افسانہ "کتے" میں مولانا صاحب، ان کے بھائی اور صاحبزادے، تینوں کا بیک وقت عیش پرست ہونا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ پھر مولانا جیسے جہاندیدہ اور مصلحت بردوش بزرگ کا پان والے کے سامنے اعتراف حقیقت کرنا بھی بعید از قیاس ہے۔ "کہتے ہیں عشق جس کو" میں مظفر حنفی رقم طراز ہیں"...... میں نے نفی میں گردن ہلائی تو انہوں نے (چاچک جی) اتنی زوردار سرد آہ چھوڑی کہ مجھے اڑنے سے بچنے کے لئے پلنگ کا پایہ تھامنا پڑا" اس انداز بیان کی نفی میں مظفر حنفی کا ہی یہ شعر پیش ہے ؎

غلو حد سے گذر کر شعر میں اچھا نہیں ہوتا
غلط ہوگا اگر چھت کو اٹھا کر آسماں کر لیں

لیکن بحیثیت مجموعی، مظفر حنفی کے بیشتر افسانے جن میں "ندیر بابا"، "وہ لوگ"، "منت کی چادریں"، "ہم شریف ہیں"، "مولانا میتّ" اور "عشق پر زور نہیں"، بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان کے بہتر مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں کردار نگاری، منظر نگاری، ندرت بیان، جدت خیال و دیگر اصنافِ ادب بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مظفر حنفی طبیعت مزاح اور جنسیات کی طرف بھی مائل ہیں۔ زندگی کے ان پہلوؤں پر بھی ان کی نظر بہت گہری ہے۔ ان کا مزاح بیک وقت، مزاح بھی ہے اور طنز بھی ـ اور سامان تفریح بھی ہے اور لمحہ فکریہ بھی ـــ اسی طرح جنسیات کے ضمن میں بھی وہ مقصد سے قطع نظر نہیں کرتے۔ وہ اشاروں اشاروں میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ مگر کچھ اس انداز سے کہ رنگ تعیش پھیلنے ہی نہ پائے

طرف متوجہ ہو جائے — اس کا اصلاح میں مظفر حنفی نے بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے مظفر حنفی کے افسانے جدید ترین افسانوں سے مختلف ہیں۔ انہوں نے ضروری لوازمات افسانہ نگاری کو مدنظر رکھتے ہوئے قلم اٹھایا ہے۔ ان کا جذبہ تحریر محض اصلاح و تعمیر کے لئے ابھرتا ہے۔ اس لئے ان کی افسانوی پوزیشن کو جدید ترین طرزِ تحریر کے کینوس میں دیکھنا غیر مناسب ہوگا۔

سرشن چندر کی رائے میں "مظفر حنفی شعر بھی کہتے ہیں، فسانہ بھی — دونوں کا انداز بیان الگ الگ رکھتے ہیں۔ فسانے کو شعر اور شعر کو فسانہ نہیں بناتے۔ اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ میدان آخر شاعری کے ہاتھ رہیگا یا فسانے کے"۔

باوجود اس کے کہ افسانہ نگاری میں مظفر حنفی نے خاص شہرت حاصل کی، سردست وہ پورے طور پر شعر گوئی کی طرف مائل ہیں۔ اور قلیل مدت میں بحیثیت شاعر جو مقام انہوں نے حاصل کر لیا ہے، وہ افسانوی پوزیشن سے زیادہ خوش آئند اور دیرپا ہے۔ اس لئے میدان آخر شاعری کے ہاتھ لگنا ہی قرین قیاس ہے — لیکن ساتھ ہی ساتھ اگر مظفر حنفی عہد رفتہ کو آواز دیتے رہیں، تو افسانوی ادب میں بھی اضافہ کر سکیں گے۔

تعارف کے باب میں فراق گورکھپوری رقم طراز ہیں: "مظفر حنفی ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں ایک ہونہار ادیب ہیں۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کے کئی پہلوؤں کی عکاسی ہے۔ بیان نہایت سلجھا ہوا ہے۔ ان میں نیاپن ہے۔ ان کا انداز دلکش ہے۔ مکالمے فطری ہیں اور پلاٹ میں جدت ہے۔ پڑھنے والوں کو یہ افسانے کہیں سے گراں نہیں گذریں گے ان افسانوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر نوجوان مصنف اپنی کوشش جاری رکھیں تو وہ ترقی کی نئی منزلیں کامیابی سے طے کرتے جائیں گے ...... میں یہی کہوں گا کہ روشن خیال شائقین ادب اس مجموعہ کی خوبیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بحیثیت مجموعی ہمارے قومی شعور کی نئی بیداری اور ہمارے ادب کی نئی رنگارنگی کا تصور کر کے اپنے ذوقِ ادب کی تربیت کریں۔

بسلسلہ صفحہ ۴۸ سے :- تصانیف پر تعارفی حیثیت سے ہیں لیکن اس میں سب کچھ آگیا ہے جس کی ایک عامی کو ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں سیال صاحب نے خود لکھا ہے اور بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ کتاب کی قیمت جو دس روپیے رکھی گئی ہے شاید اس سے لاگت بھی نہ نکل سکے۔ اس قیمت پر تو کتاب کو بازار سے فوراً غائب ہو جانا چاہیئے۔

محمد اکبر الدین صدیقی

نعیم تقوی

سکونِ قلب کا ساماں تری زلفِ پریشاں ہے
شکن ہے تیری ابرو کی کہ یہ میری رگِ جاں ہے

لبوں پر دم ہے اور آنکھوں میں تصویرِ جاناں ہے
زمانہ رو دیا یہ عالمِ بیمارِ ہجراں ہے

صبا کا جرم ہی کیا ہے جو یوں آوارہ پھرتی ہے
مذاقِ جستجو ہر دم ہی گلشن کا ساماں ہے

چلی ہے نظمِ امکاں میں نہ پایا گر سکوں تو نے
نشیمن میں اماں تیرے لئے اے برقِ سوزاں ہے

بساطِ مبتدا سے بے خبر ہے زندگی اپنی
ہمیں آغاز تو معلوم ہے انجام پنہاں ہے

دلِ مایوس میں اس طرح تیری یاد آتی ہے
کہ اک سوکھے ہوئے جنگل میں آتش سی فروزاں ہے

جفاؤں کی قسم سینے میں ہم بھی قلب رکھتے ہیں
ہمیں بھی مسکرانے کا بڑی مدت سے ارماں ہے

اخلاق فتح پوری

تہمتِ بادہ گساری بھی اٹھالی ہم نے
آبروئے غم کی بہر حال بچالی ہم نے

رنگ اب تیری توجہ ہی بھرے گی اس میں
دل کی اجڑی ہوئی بستی تو بسالی ہم نے

پرسشِ غم پہ امڈ آئے تھے آنسو لیکن
بات چپکے سے تبسم ہی پہ ٹالی ہم نے

ہر نفس زندۂ جاوید بنانے کے لئے
تلخیٔ درد مسرت میں ملالی ہم نے

انتقام اپنی تباہی کا لیا ہے یوں بھی
اک ہنسی وقت کے ہونٹوں سے چرالی ہم نے

ہجر کی رات میں کرنے کو اجالے اکثر
شمع یادوں کی سرِ شام جلالی ہم نے

رسمِ بیدادگری توڑ دی تو نے لیکن
اپنی گرتی ہوئی حالت نہ سنبھالی ہم نے

جانِ اخلاق تری مست نگاہی کے نثار
اک نئی بزمِ تمنا کی سجالی ہم نے

ساحل مانکپوری

سالکِ راہِ محبت یہ رہے پیشِ نظر
راہزن ہیں بہت اس راہ میں بشکلِ رہبر
مجھ پہ ہوتا نہیں اب گردشِ دوراں کا اثر
اک زمانہ سے مرا دل ہے غموں کا خوگر
کوئی غم بھی نہ رہا جب کوئی اپنا نہ رہا
مجھ کو حاصل ہے سکونِ دل و جانِ مضطر
برق گرتی ہے تو گرتی ہے نشیمن پہ مرے
ہے گلستاں میں یہ مخصوص عنایت مجھ پر
ہائے اس بت کی وہ بیباک نگاہی ساحل
زخمۂ تارِ رگِ جاں ہوئی وہ شوخ نظر

اقبال منہاس

ہر سانس زیست پر ہے گراں دیکھتے چلو — اشکوں میں ڈھل رہی ہے زباں دیکھتے چلو
صحرا اُبل رہے ہیں بڑی تیز دھوپ ہے — گلشن سے اٹھ رہا ہے دھواں دیکھتے چلو
شاید کہ اب چمن کا مقدر سنور سکے — لہرا رہی ہے برقِ تپاں دیکھتے چلو
کچھ لوگ جس کو کہتے ہیں دریائے زندگی — اک جوئے آرزو ہے رواں دیکھتے چلو
ان کے گماں پہ کتنے تصدق یقیں ہوئے — میرا یقیں بھی ہے گماں دیکھتے چلو
اک مہ جبیں کے الجھے ہوئے گیسوؤں کے یاسمیں — خوئے سخن ہے شعلہ فشاں دیکھتے چلو
احساس کا فریب ہے پھولوں کی آبرو — اِن بلبلوں کا سوزِ نہاں دیکھتے چلو
نیلام ہو گئی ہیں ستاروں کی عصمتیں — پھر بھی سجی ہوئی ہے دکاں دیکھتے چلو
اقبال نیم باز نگاہوں میں اِن دنوں
سمٹے ہوئے ہیں دونوں جہاں دیکھتے چلو

غلام مرتضیٰ راہیؔ

دل میں گھٹ کر رہ گئے ایسے ارمانوں کی باتیں چھوڑ
ساحل سے دب جانے والے طوفانوں کی باتیں چھوڑ

رازِ محبت یہ کیا سمجھیں؟ یہ کیا جانیں شرحِ حیات؟
دُکھ کے کورے، درد کے سادے انسانوں کی باتیں چھوڑ

جینے کی خاطر جی لینا، ہستی کا مفہوم نہیں
سُن! کیا کہتی ہیں تحریریں، عنوانوں کی باتیں چھوڑ

پیمانوں کی قیمت کیا ہے؟ ٹوٹ گئے تو ٹوٹ گئے
دل کو رکھ ٹھوکر سے بچا کر، پیمانوں کی باتیں چھوڑ

زخموں کے گہرے دریا میں کب ملتی ہے درد کی تھاہ؟
لے ڈوبی اپنوں کی نوازش، بیگانوں کی باتیں چھوڑ

دیر و حرم سے وابستہ ہے اپنے لہو کی اک اک بوند
ان احسان فراموشوں میں، احسانوں کی باتیں چھوڑ

کب تک یہ تقلیدِ روایت، کب تک یہ توہینِ شعور
لے آئینہ دارِ حقیقت، افسانوں کی باتیں چھوڑ

اپنا حصہ دور کا جلوہ، دلِ ثابت، دامن محفوظ
پروانے نادان ہیں راہیؔ، نادانوں کی باتیں چھوڑ

میر یٰسین علی خان

یہ گھرا ابر، یہ موسم، یہ ہوا چپ نہ رہو
میکشو وقت ہے پینے کا ذرا چپ نہ رہو

کوئی کرتا ہے اگر تم پہ جفا چپ نہ رہو
کب تلک ضبطِ فغاں اہلِ وفا چپ نہ رہو

خضر کی طرح ہر اک بحرِ فنا سے گزرو
اور جب تک نہ ملے آبِ بقا چپ نہ رہو

بات بڑھ جائے تو ہر فرد بنے گا مجرم
اور کی، یا کہ وہ اپنی ہو خطا چپ نہ رہو

اردو سب کی ہے زباں اس کا تحفظ مانگو!
لوگ ہوتے ہیں تو ہونے دو خفا چپ نہ رہو

آج پھر دہر میں یٰسینؔ، بقولِ مخدوم!
"بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو"

▲

ریاض حسین چودھری

فریاد کی نہ آہ بھری دل فگار نے
نشتر چبھو دیئے ہیں مرے غم گسار نے

خود غرضیوں کا ہاتھ بھی شامل رہا مگر
چھینا ہے دوستوں کو غمِ روزگار نے

کیا خلوص کیسی مروت جنابِ دل
رسوا مجھے کیا ہے مرے انکسار نے

تھا پیکرِ جمال کہ کاغذ کا پھول تھا
لوٹا ہے مجھ کو آنکھ کے اس اعتبار نے

وہ جو غریبِ شہر کی محبوب تھی ریاضؔ
اس کا بدن خرید لیا ہے اک شہریار نے

میر یٰسین علی خاں

مناجات

(ماخوذ از جاوید نامہ" اقبال)

عہدِ حاضر کے لئے زنجیرِ پا دامِ خرد
کاسہ ہائے آسمان و مہر و مہ جامِ خرد

نخلِ فکرِ آدمی ہے نا امیدِ برگ و بر
ڈھونڈتا ہے وہ خود اپنے واسطے تیر و تبر

علمِ حاضر اک تماشا خانۂ انکار ہے
یاں تحرکِ "ناچتے ذروں" کا اک بازار ہے

بے تجلی مردِ دانا کا جنونِ خام ہے
نقش بندِ رنگِ حیرت خانۂ ایام ہے

آدمی افلاک پر معروفِ شب خوں ہے ابھی
در کشائے قصرِ عالی شانِ گردوں ہے ابھی

شورشِ تحقیقِ نو سے پُر ہے غوغائے حیات
اک معمہ بن گئی ہے تابشِ نورِ حیات

علم ہے محوِ تماشائے مقاماتِ بلند
روحِ آدم تک مگر پہنچی نہیں اس کی کمند

"اے خدا روزی کن آں روزے مرا
وا رہاں زیں روز بے سوزے مرا"

باقر منظور

کیا نشاطِ دید کا موسم گذر گیا
ہم دیکھتے رہے اِدھر آیا اُدھر گیا

دل درد بن گیا تو بڑھی آبروئے دل
احساسِ غم سے غم کا مقدر سنور گیا

لطفِ نظر سے بن گئی خلوت بھی انجمن
حُسنِ تصورات بڑا کام کر گیا

اب اور مجھ سے شرحِ محبت نہ پوچھیے
اک حرفِ دلپذیر تھا دل میں اتر گیا

ہر ہر قدم پہ روک رہا تھا فریبِ عقل
جو کم نظر تھا راہِ طلب میں ٹھہر گیا

کیا سود و سازِ عشق نے گہنا دیا اسے
کیوں آفتابِ حسن کا چہرہ اتر گیا

باقر مآلِ عشق کی تصویر دیکھ کر
جو ناشناسِ حسن تھا بے موت مر گیا

جہاں دار افسر

غم کا جو ہو شعور تو غم بھی حیات ہے
حساس آدمی کو خموشی بھی بات ہے

غمناک زندگی بھی مصیبت کی رات ہے
اب اور کتنی دور تو صبحِ نجات ہے

انداز گفتگو ہے کہ قند و نبات ہے!
اس گلبدن کی بات تو پھولوں کی بات ہے

وہ دن کہاں، حیات ہو خوابوں کی چاندنی
اب تو حیات کا نپتے سایوں کی رات ہے

ہر ناشناسِ دردِ محبت کو کیا خبر!
یہ زندگی کی بات، سمجھنے کی بات ہے۔

ہر جادۂ حیات پہ چلتا ہوں اس طرح
جیسے قدم قدم پہ کوئی میرے ساتھ ہے

اے کشتگانِ بے گنہی کچھ نہ کچھ کرو!
کیا انقلاب صرف کتابوں کی بات ہے

کیوں بندگانِ عام سے یہ سخت امتحان
پروردگار! یہ تو رسولوں کی بات ہے

افسر! حیاتِ نو کے لئے جستجو کرو
یہ زندگی تو سلسلۂ حادثات ہے

نقد و نظر

ناشرین سے درخواست ہے کہ وہ تبصرے کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجیں۔ جن کتابوں پر تبصرہ ہو جاتا ہے وہ ادارہ کے کتب خانہ میں داخل ہو جاتی ہیں، اور ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

مرقع یوسفی مرقع یوسفی مولانا محمد یوسف کاندھلوی کے مکتوبات اور تقاریر کا مجموعہ ہے۔ ویسے تو قبل ازیں مولانا موصوف کے بعض مکتوب اور تقریریں الفرقان، مدینہ اور دیگر اخبارات اور رسائل میں شائع ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک پاکستان سے کوئی مجموعہ اس طرح شائع نہیں ہوا تھا۔ اس میں صرف وہی مکتوب ہیں جو تبلیغی جماعت اور اس کے ذمہ دار افراد کو وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ ایسے بارہ مکتوب کے علاوہ دعوت اسلام کے سلسلے میں کی گئیں مولانا کی دس تقریریں بھی اس میں شامل ہیں۔ مولانا نے مقصد کی تکمیل کے لئے سلیس اور آسان اردو استعمال کی ہے اس کے باوجود تقریروں میں بعض مقامات تشریح طلب رہ جاتے ہیں مثلاً:

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کی تخریب و بربادی و موت کا منظر سارے عالم میں بکھرا ہوا ہے مگر حج کے موقعہ پر ساری امت محمدیہ کی زندگیوں کا طریقہ سمٹ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ حیات کی موت کا (عالمی) منظر سب کے سامنے آجاتا ہے۔ اب دردمند اور اللہ اور ان کے محبوب رسول کے ساتھ ذرا سا بھی تعلق رکھنے والوں کا اعلیٰ ترین تقرب و محبوبیت اور اطاعت و عبدیت کا عمل یہ ہے کہ اس منظر کی تبدیلی کے لئے اپنی جانوں کو پوری طرح جھونک دیں۔ دین کے لئے جان کھپانے کے اعمال پر ان کے ڈالنے کے لئے پوری طرح سعی کی جائے" صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷

محترم پروفیسر محمد ایوب قادری نے مقدمہ میں مولانا موصوف کے سوانحی حالات بیان کرنے کے علاوہ تبلیغ اسلام کا مختصر تاریخی جائزہ لے کر جہاں تبلیغ اسلام کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر زور دیا ہے وہاں مولانا کی تقریروں کے بعض ایسے مقامات کی تشریح و توضیح کی ذمہ داری بھی قبول کر لی ہوتی تو کتاب کی افادیت میں اور اضافہ ہو جاتا۔

بزرگان دین نے "خدا کی راہ کی تکالیف کو بالذات محبوب یقین کیا ہے" یہ ہماری طرف سے انھیں نہ کسی صلہ کی خواہش نہ معاوضہ کی پروا۔ مسلمان بنایا، ایمان درست کیا "إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ" لیکن ہم انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں گویا معاوضہ دے دیا گیا۔

"حضرت مولانا محمد یوسف کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ حضرت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بھی کچھ اسی طرح

طرح کے ہوں گے ۔ ۱؎

بات تو صرف تشبیہ کی ہوتی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ کے پھیر سے فتنے پیدا ہوتے ہیں یا مٹتے ہیں۔

مولانا یوسف نے دعوت اسلام کے سلسلے میں چند بنیادی اور اصولی باتیں بھی بتائی ہیں ۔

" ہر مسلمان کا بحیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہونے کے اکرام بھی کرنا ہے، ہر امتی کے آگے بچھ جانا، ہر شخص کے حقوق کو ادا کرنا اور اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کرنا جو آدمی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ جل شانہ اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے ....۲؎

اس (شیطان) کے مکر سے تحفظ اس کے سوا ممکن ہی نہیں کہ جتنی بھی عالی صورتیں اللہ رب العزت اپنے فضل سے پیدا فرمادیں اپنے انکسار و تواضع کی مشق کو بڑھایا جائے۔ ایک دوسرے کی قدر دانی و اکرام و اعزاز کی پوری پابندی کی جائے ....؟ ۳؎

اتحاد، انکسار، تواضع، دلجوئی، اکرام و تکریم وغیرہ کے تعلق سے مولانا کے بہت سے اقوال زیر کتاب میں ملتے ہیں لیکن کتاب کے مقدمہ میں کہیں کوئی متضاد اثر بات پائی جائے تو اس کے ذمہ دار مولانا نہیں ۔

" بھئی حکیم صاحب میں تو آپ کا شکر گذار ہوں کہ اس تبلیغی جماعت کی بدولت میری التحیات درست ہوگئی ورنہ ہم نے تمام عمر نماز غلط ہی پڑھائی یہ وہابی بہرحال کچھ کام تو کر رہے ہیں۔ نماز اور کلمہ درست کرواتے ہیں۔ ان سنیوں کی مجالس و محافل میں تمام عمر گزر گئی میری نماز جیسی تھی ویسی ہی رہی "۴؎

کیا دل آزار طریق کار میں تبدیلی کی توقع کی جاسکتی ہے ۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ۝ پروفیسر الحاج سید حمید شطاری .

خواب شیریں

جے کرشن چودھری ۔ ناشر انجمن ترقی اردو دھنبا علی گڈھ ۔ سائز ڈیمی صفحات ۱۱۶ قیمت ندارد

خواب شیریں سنسکرت کے مشہور ڈراما نگار بھاس کے شہرہ آفاق ڈرامے "سوپن واسودتم" کا اردو ترجمہ ہے جے کرشن چودھری اردو والوں کے لئے نئے نہیں وہ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ انھوں نے اس سے پہلے اور بھی کئی کتابیں سنسکرت سے اردو میں منتقل کرکے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ پیش نظر ڈرامہ میں چودھری صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں بھاس کی سوانح حیات اور تصانیف وغیرہ کا اظہار کرتے ہوئے تبلایا ہے کہ بھاس پانچویں تا ساتویں صدی قبل مسیح میں کسی وقت تھا بعض محققین اس کو تیسری تا پانچویں کا شاعر اور ادیب مانتے ہیں اس کے وطن کے تعلق سے بھی کوئی قطعیت نہیں دی جاسکتی۔ قیاس ہے کہ وہ شمالی ہند میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے ڈراموں میں بعض مقامات کے نام دئے ہیں۔ اس کی تصانیف کی تعداد کا بھی کوئی تعین نہ کیا جاسکا کسی نے کہا کہ اس نے تئیس ۲۳ ڈرامے لکھے اور کسی نے تیس ۳۰ کا اظہار کیا لیکن ہم تک صرف تیرہ ڈرامے پہنچے ہیں۔ اس نے

۱؎ مقدمہ مرتبہ یوسفی صفحہ (۵۰) ۲؎ ایضاً صفحہ (۷۰) ۳؎ ایضاً صفحہ (۹۱) ۴؎ ایضاً صفحہ (۵۶)

دوں کو نہایت پاکیزہ خیالات سے آراستہ کیا ہے اور زندگی کی نہایت اعلیٰ وارفع قدریں پیش کی ہیں۔
ماجہ اودین' وزیر یوگیند رائن' رانی واسودتا اور رانی پدماوتی اس ڈرامے کے نہایت محبوب اور اہم کردار ہیں اور ان کے کارنامے
حیات کو لافانی بنا دیتے ہیں۔ چودھری صاحب نے نثر اور نظم دونوں میں ترجمہ کیا ہے اور اصل کی دلاویزی کو باقی رکھنے
ش کی ہے جو یقیناً اس سے بڑھی ہوئی ہوگی۔ اشعار میں تاثر اور دلاویزی کم ہے اور اس کا سبب غالباً ترجمہ ہی ہو سکتا ہے
بحیثیت مجموعی پڑھنے پر ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کیا واقعی قبل مسیح میں زندگی کی قدریں اتنی بلند اور بادشاہوں اور
ان کے اخلاق اتنے اعلیٰ اور ارفع ہوں گے۔ سنسکرت ادب سے قریب ہونے کے لئے لازماً یہ ڈرامہ دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

ک ادب ناظر انصاری :- ناشر :- بشیر احمد انصاری۔ انصاری پبلی کیشنز متصل مسجد قسمت پورہ جلگاؤں مہاراشٹرا
سائز ۱/۱۶ کراؤن صفحات ۲۴۰ مجلد مع گرد پوش قیمت تین روپے ۵۰ پیسے
(ناظر انصاری جلگانوی۔ چمن نگر۔ پانچویں گلی۔ مالے گاؤں (ناسک) مہاراشٹر)

ناظر صاحب زندگی بھر درس و تدریس کے پیشے سے منسلک رہے ہیں اس طرح انھیں علمی اور ادبی خدمات بجالانے کے کافی مواقع ملتے رہے ہیں۔ آپ کے متعدد مضامین ملک کے موقر رسایل میں چھپے ہیں۔ اس لئے ادبی دنیا سے بھی آپ متعارف ہیں۔ "ک ادب" انھیں مضامین کا مجموعہ ہے۔ کل دس مضامین ہیں۔ جو سراج' انیس' حالی' اقبال (کلام میں طنز و ظرافت) مجاز' جگر ن لکھنوی' محروم' اور اختر الایمان کی کتاب یادیں پر لکھے گئے ہیں۔ سراج کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ سراج نے ولی کا زمانہ دیکھا تھا" تاریخی اعتبار سے غلط ہے سراج ۱۱۲۷ھ میں پیدا ہوئے اور ولی ۱۱۱۹ھ میں انتقال کر چکے تھے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ ولی کی محفلوں کے بعد اورنگ آباد کی تمام علمی و ادبی محفلوں اور شاعروں کی صدارت سراج ہی کرتے تھے' اس کی کوئی سند نہ یں حالانکہ اور کئی معمر شعرا اور اساتذہ سخن اس وقت اورنگ آباد میں موجود تھے۔ انیس کے مراثی کے علاوہ غزل اور رباعی پر بھی خیالات ظاہر کئے ہیں۔ حالی کے مراثی پر لکھتے ہوئے حکیم محمود خاں کے مرثیے کو جو دراصل دہلی مرحوم کا مرثیہ ہے نظر انداز کیا ہے۔ اقبال کے کلام میں اکبری اقبال کے علاوہ بانگ درا سے بہت سی نظمیں اور غزلیں پیش کرکے ان میں طنز و ظرافت کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے کہیں تو وہ کامیاب ہیں اور کہیں جسارت بے جا معلوم ہوتی ہے۔ مجاز' محروم' جگر اور وی وغیرہ پر اپنے خیالات کا نہایت حسن و خوبی سے اظہار کیا ہے اور فن شعر میں ان کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ بحیثیت مجموعی کتاب معلومات آفریں اور قابل مطالعہ ہے۔

ادب اور جدید ذہن :- دیوندر اسر۔ ناشر مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی ۶
مصنف کا پتہ 2/52 - راجندر نگر نئی دہلی۔ دیوندر اسر) سائز ۱/۱۶ کراؤن صفحے ۲۰۶ مجلد
مع گرد پوش چار روپے پچاس پیسے

دیوندر اسر ملک کے مفکر ادیبوں میں ہیں وہ اردو ادب کی رفتار سے بھی آگاہ ہیں اور انگریزی ادب پر بھی ان کی نظر

گہری ہے اسی لئے انہوں نے ہمارے ادب کے ان تمام گوشوں کا جائزہ لیا ہے جہاں انگریزی ادب کا اثر شدت سے کارفرما نظر آتا ہے" ادب اور جدید ذہن" اردو ادب میں ایک نئے موضوع کی نشاندہی کرتی ہے اس سے ہمارے قاریوں اور ادیبوں دونوں کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے جس طرح معاشیات میں طلب و رسد کی اصطلاحیں مارکٹ میں چلتی ہیں ادب کا مارکٹ بھی انہیں اصطلاحوں کو سامنے رکھ کر کام کرتا نظر آتا ہے۔ ادب کے لئے مختلف گوشوں کا انتخاب کرکے فاضل مصنف نے جدید ذہن کی عکس کشی کی ہے۔ سولہ مضامین کا یہ مجموعہ ہماری اس مشینی دور کی روح کو پوری طرح عریاں اور عوامی شعور کا تجزیہ کرتا ہے۔ عوام میں شکست خوردگی اور مایوسی کی وجہ سے جو چڑچڑاپن پیدا ہو رہا ہے اس کی تصویریں جابجا ملتی ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف ہندوستان کا حال نہیں ساری دنیا ہی خلفشار میں ہے اور ڈھنگ کی کوئی بات کسی کردار سے ادا نہیں ہو پاتی۔ زندگی ایک ایسے موڑ پر آکر کھڑی ہوئی نظر آتی ہے جہاں ادب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر کوئی کتاب پڑھی بھی جاتی ہے تو اس کی روح سے زیادہ اس کے غلاف سے بحث ہوتی ہے اس لئے کہ کتاب کے تعلق سے بحث کرنا فیشن ہے بلچر ڈ ہونے کی علامت ہے۔

کتاب بہت غور و فکر سے پڑھنے کے قابل ہیں اور فاضل مصنف نے جس عمیق نظر سے جائزہ لے کر انہیں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

نگارشات بہادر یار جنگ مرتبہ نذیرالدین احمد کن ملدیہ۔ سائز ۲/۱ کراؤن خوبصورت گٹ اپ صفحے ۱۱۲ قیمت Rs.1/50 محمد بہادر خاں (بہادر یار جنگ) نے جاگیردار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ نہایت ناز و نعم میں پرورش پائی لیکن علم کے شوق نے انہیں سچا طالب علم بنایا۔ جذبہ ہمدردی نے قومی خدمت کے لئے ابھارا اور وہ اپنی زبان اور قلم سے خدمت کے لئے آگے بڑھے۔ انہوں نے خطابت میں جو بلند مقام پایا وہ ہندوستان میں آج تک کسی کو نصیب نہ ہوا۔ وہ عالموں کی محفل میں علم کے، مدبروں کی محفل میں تدبر کے اور عام جلسوں میں اپنی خطابت کے جوہر دکھاتے تھے۔ ان کی تقاریر کے مجموعے قبل ازیں شائع ہو چکے ہیں لیکن تحریروں کا مجموعہ منظر عام پر نہ آیا تھا۔ نذیرالدین صاحب نے نواب صاحب کی تمام تحریروں اور تقریروں کو ایک جگہ جمع کرکے شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ پیش نظر کتاب نواب صاحب کی ابتدائی تحریروں پر مشتمل ہے یہ تمام تحریریں جمع کرنے کے بعد موضوع کے اعتبار سے علحدہ جلدوں میں یا علحدہ عنوانات کے تحت شائع ہوتیں تو بہتر ہوتا۔ اب متعدد موضوعات پر مضامین ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں اور پڑھنے والے پر نواب صاحب کی صلاحیتوں کا جو تاثر پیدا ہونا چاہئے نہیں ہونے پاتا۔ تاہم یہ کیا کم ہے کہ یہ تحریریں ایک جگہ جمع ہو کر محفوظ ہو گئیں۔ نذیرالدین احمد صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ایک بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور سلیقے سے انجام دے رہے ہیں خدا کرے کہ تکمیل کو پہنچے۔

حیات طیبہ حصہ اول (رسول اکرم کی مکی زندگی) مولفہ غلام محمد نظام الدین بی ایم اے (عثمانیہ) صفحات ۳۲ - ناشر مکتبہ اردو مدرسہ اسلامیہ سنگاریڈی۔ حیدرآباد اے پی۔

یہ ایک مختصر سا کتابچہ ہے جس میں رسول اکرم صلعم کی مکی زندگی پر مختصر مگر جامع حالات بیان کئے گئے ہیں۔ آج جبکہ

جن کو دنیاوی کاروبار سے فرصت نہیں ملتی اور دینی کتابوں کی طرف راغب نہیں ہو سکتے ایسے مختصر کتابچے نہایت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہی کتابچے آگے چل کر تفصیلی مطالعے کا شوق پیدا کریں۔ قاری اور مولف دونوں خدمت دین کے صلے سے بہرہ ور ہوں۔ زبان کی سلاست کا لحاظ کرتے یہ بچوں کے ادب میں بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔

احوال و نقد غالب مرتبہ پروفیسر محمد حیات خاں سیال۔ ناشر نذر سنز ۲۲۱۔ مرکلر روڈ نزد گورنمنٹ کالج جھنگ صدر مغربی پنجاب اردو بازار۔ لاہور سائز ۳۰/۲۰ کراؤن۔ صفحات ۸۴۵ مجلد خوبصورت گرد پوش قیمت دس روپے۔

برصغیر ہند و پاک کی آزادی سے پہلے جتنی کتابیں غالب پر لکھی گئیں جتنی شرحیں ان کے دیوان پر لکھی گئیں اور جتنا کام ان پر اس لئے کیا گیا کہ ان کے محاسن یا معائب کو منظر عام پر لایا جائے یا اس کام کے توسط سے خود منظر عام پر آئیں اور کسی پر نہ ہوا۔ اس کام میں اعلیٰ درجہ کا بھی کام ہوا اور معمولی بھی۔ کام کرنے والے غالبیات کے امام قرار پائے ان مولوی مہیش پرشاد، جناب امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر بجنوری، ڈاکٹر لطیف اور جناب مالک رام کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے علی گڑھ میگزین کی ادارت کے موقع پر غالب نمبر شائع کیا احوال غالب اور نقد غالب اسی کی یادگار ہیں۔ محمد حیات خاں سیال صاحب کی جب پیش نظر کتاب آئی تو یہی خیال ہوا کہ شاید انھیں دونوں کتابوں کو یکجا کر دیا ہو مگر ایسا نہیں ہے۔ سیال صاحب نے غالبیات پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے سب کھنگالا اور اس میں سے غالب کی شخصیت کو ابتدا تا آخر پیش کرنے والے تمام مضامین یکجا کئے اور ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ اردو اور فارسی کے منتخب اشعار کا بھی رکھا اور غالب کے مصرعے "بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل" کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا۔ بوئے گل غالب کی سوانح سے متعلق ہے اس میں آٹھ مضامین ہیں دوسرا حصہ نالۂ دل اشعار کا انتخاب ہے۔ تیسرا حصہ تنقیدی اور سب پر غالب ہے اس میں ۵۴ مضامین ہیں اور ۵۴ نمبر کا مضمون جو کتاب میں ۶۲ پر ہے "جوہر اندیشہ" کے عنوان کے تحت ہے اور اس میں غالب کے متعلق تذکرہ نگاروں کی آرا کے اقتباسات ہیں۔ تذکروں میں گلشن بے خار، خارستان تا تاریخ اردو، آب حیات، گل رعنا، افکار غالب (خلیفہ عبدالحکیم) تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) کاشف الحقائق اور مختصر تاریخ ادب اردو شامل ہیں۔

سیال صاحب غالب کے متعلق اتنے مضامین جمع کر رہے تھے کیا اچھا ہوتا کہ وہ غالب پر لکھے ہوئے مضامین کی فہرستیں بطور مقالہ تیار کر دیتے اور اپنی کتاب کا اشاریہ بھی دے دیتے جس سے قاری کو سہولت ملتی۔ اب کسی واقعہ کی تلاش کے لئے کافی وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

غالب پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سب کا یکجا ہونا تو مشکل ہے لیکن سیال صاحب کی اس کتاب نے غالب کے بارے میں جاننے والوں کو دوسری کتابوں اور رسائل خاص نمبروں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ سیال صاحب نے اس کی ترتیب میں کافی محنت اٹھائی ہے۔ اتنے سارے مضامین جمع کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں کتاب کے ابتدائی مضامین سوانح اور

[illegible]

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۶ء جلد (۳۰) شمارہ (۶)

جون ۱۹۶۶ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

پروفیسر سید علی اکبر ایم، اے (کینٹب)

مجلس مشاورت

میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ،

ڈاکٹر غلام عمر خاں، محمد منظور احمد

معتمد

محمد اکبرالدین صدیقی

مہتمم

محمد جمال الدین

منتظم

وقار خلیل

زر سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے

ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

نمونے کے پرچہ کے لئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس

میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد

حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

پیش کردہ شمارے میں ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی نے ایک نیا موضوع پیش کیا ہے۔ حیوانات کو ان کی خصوصیات کا لحاظ کرتے ہمارے شعراء نے اپنے کلام میں جگہ دی۔ زبان اور اظہار خیال کو وسعت و بینائی عطا کی۔ تلمیحات کا اپنا مقام ہے اسی طرح حیوانات کا بھی۔ جب تک ہم کسی پرندے یا جانور کی خصوصیات سے جس کا ذکر شاعری میں کیا جا رہا ہو واقف نہ ہوں تو لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

دوسرا مضمون سرور ڈنڈا کی شاعرانہ عظمت پر ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ ڈنڈا نے دکھنی زبان سے زیادہ حالات حاضرہ کی سیاست پر طنز کو اپنا موضوع بنایا۔ اور اسی خصوصیت نے ان کو شہرت دی۔ مرحوم کے پڑھنے کے انداز نے بھی عوام کے قلوب کو لبھایا بھی اور گرمایا بھی۔ انہیں سننے کے لئے کافی اژدحام ہوتا ہے اور سیاست پر ان کی چوٹیں لطف دے جاتیں۔ موت نے ایک ہر دلعزیز اور مقبول عام شاعر کو ہم سے چھین لیا۔

قیوم صادق صاحب نے مرزا غالب کی مقبولیت پر اظہار خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر وشنو سروپ نے عبدالرحیم خانخاناں کی ہندی شاعری میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر جو اشارے ملتے ہیں ان کا اظہار کرتے ہوئے شاعرانہ خوبیاں پیش کی ہیں۔

جناب جمال کرنولی شعبہ تعلیمات سے متعلق ہیں اور طلباء سے بہت قریب ہیں۔ اس لئے بدنظمی اور بے ضابطگی کے اسباب کی چھان بین کی ہے۔ وہ جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بدنظمی ارباب سیاست کی پیدا کردہ ہے۔ طلباء کا اسمیں اتنا دخل نہیں جتنا قایدین قوم کا ہے۔ قایدین کی مرضی ہے وہ چاہیں تو معمار بنیں چاہیں تو تخریب کار۔ چاہیں تو نئی نسل کو صحیح راستے پر لگائیں اور چاہیں تو بے راہ روی پر ڈال دیں۔ طلباء آلہ کار ہیں اور قایدین عامل۔ ہر شخص کے اپنے اغراض و مقاصد ہیں ان کی تکمیل بہر صورت ضرور سمجھی جاتی تھی۔ آخری مضمون افسانہ ہے جس کے متعلق افسانہ نگار نے یہ تیقن دیا ہے کہ اسمیں ۷۵٪ حصہ صحیح اور ۲۵٪ حصہ زیب داستاں کیلئے بڑھایا گیا ہے۔

نظموں کا حصہ ہمارے قلمی معاونین کے افکار سے مزین ہے۔

جون ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات کا مہینہ ہے۔ ۲، ۳ اور ۴ جون کو امتحانات اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم اور اردو فاضل ایک ساتھ مدراس، محبوب نگر، کاغذ نگر، سنگاریڈی، نارائن کھیڑ، محمد آباد اور حدود تعلقہ جنگاؤں کے علاوہ مستقر حیدرآباد میں انوار العلوم کالج، سنٹرل جیل اور جونیر سرٹیفائیڈ اسکول، چمپا پیٹھ پر منعقد ہوئے امیدواروں کی تعداد تین سو سے زاید رہی۔

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ محمد اکبر خاقانی نے کراچی میں بعارضہ کینسر دوشنبہ ۲۰ مئی کو انتقال کیا۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے ہونہار ممتاز طلباء میں تھے۔ طبیعت آزاد پسند تھی اس لئے ملازمت نہ کی اور وکالت کرتے رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی کوئی محفل ان سے خالی نہ ہوتی۔ وہ حیدرآباد کے مشہور فنکار مصور قیوم صاحب کے دوستوں میں تھے انہوں نے پندرہ روزہ اخبار "حسن کار" شائع کیا جو ۲۱ صفر ۱۳۵۴ھ میں نکلا اور تقریباً دو سال بعد بند ہو گیا۔ وہ شاعر بھی تھے ڈرامہ نگار بھی اداکار بھی اور ادیب بھی۔ بذلہ سنج بھی اور آتش بیان مقرر بھی۔ ۱۹۴۸ء کے بعد وہ پاکستان منتقل ہو گئے تھے۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے۔

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی
(وینکٹیشور یونیورسٹی۔ آندھرا پردیش)

حیوانات آئینہ شاعری میں

یہ ایک دلچسپ موضوع ہے کہ مختلف حیوانات کے خصائص اور ان کی اہمیت کا مطالعہ اردو شاعری کے آئینہ میں کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری شاعری کا ایک بڑا حصہ ان روایتوں سے وابستہ ہے جن کا تعلق پرندوں اور جانوروں سے ہے۔ عربوں نے اس موضوع پر صدیوں پہلے کام کیا تھا اور ان کے یہاں متعدد ناقدوں اور مصنفین نے ایسی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جو آج بھی حوالہ کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہیں اور جن میں فکر و نظر کے لئے بڑا مواد موجود ہے۔ ان مصنفین میں عمرو بن بحر جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) بہت مشہور ہے جس نے کتاب الحیوان تین جلدوں میں مرتب کی تھی اور حیوانات سے متعلق تمام اشعار کو بحث و تبصرہ کے ساتھ پیش کیا تھا۔ دراصل اس میں بے شمار بحثیں زبان و بیان کی ایسی آگئی ہیں جو اس کی زندگی کی ضمانت پیش کرتی ہیں۔ اردو میں اس موضوع پر ابھی تک کسی نے توجہ نہیں کی ہے مگر میرا خیال ہے کہ ہماری شاعری میں اس سلسلہ میں کافی مواد موجود ہے جو فکر و نظر کے سامنے نئے گوشے پیش کرتا ہے۔

اردو شاعری میں حیوانات کے سلسلہ میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ان کے ذکر کو تین اقسام میں منقسم کیا جاسکتا ہے

۱۔ شعراء نے مختلف پرندوں کی صفات و خصوصیات اور ان کے ذریعہ اردو شاعری میں رمز و اشارہ کی پوری دنیا قائم کردی ہے مثلاً اقبال نے شاہین کی صفات سے فائدہ اٹھایا۔ بلبل، کوئل اور پپیہا وغیرہ بھی اپنی صفات کی وجہ سے اردو شاعری میں جگہ پا گئے ہیں۔

۲۔ پرندوں کا ذکر ادبی روایت کے طور پر اردو شاعری کا جزو رہا ہے چنانچہ عنقا اور ہما ایسے ادبی پرندے ہیں جن کا خارجی زندگی میں کہیں وجود نہیں مگر اردو شاعری میں ان کے وجود کو سمجھے بغیر اس کی روح تک پہونچنا ممکن نہیں۔

۳۔ طیور کے علاوہ جانوروں میں بعض جانوروں کا ذکر اردو شاعری میں عام ہے جیسے ہرن کا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری!

مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جو مرتبہ اردو شاعری میں بلبل، کوئل، پپیہا، شاہین، عنقا اور ہما کو حاصل ہے وہ جانوروں میں شاید کسی کو حاصل نہیں۔ عربوں میں گھوڑے اور اونٹ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے ان کی زندگی میں بھی اور ان کی شاعری میں بھی۔

لیکن اردو شاعری میں ان جانوروں کو کوئی درجہ اس بنا پر نہ مل سکا کہ یہ ہمارے نازک ذوق و فکر پہ بار محسوس ہوتے ہیں۔ ہاں قصائد میں کچھ جانوروں کا ذکر آجاتا ہے مثلاً سودا کا قصیدہ "تضحیک روزگار" ہے جس میں گھوڑے کی ہجو کی گئی ہے۔

انسانی زندگی عملی طور پر حیوانات سے اس قدر امتزاج و اختلاط رکھتی ہے کہ اس کے بغیر زندگی کا تصور ہی محال ہے بالکل اسی طرح چونکہ ادب زندگی کی عکاسی کرتا ہے اس لئے اس میں بھی حیوانات کے بغیر زندگی کی ترجمانی کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

حیوانات کی مختلف صفات نے ادب کو بال و پر دئے ہیں۔ خصوصاً اردو شاعری تو بڑی حد تک حیوانات کی مختلف صفات کے ذریعہ اظہار کے لئے توانائی حاصل کرتی ہے اور شعراء پرندوں کے ذریعہ اپنے ما فی الضمیر کو کما حقہ ادا کرتے ہیں۔

اس طرح دراصل ادب نے مختلف صفات کے بھرپور اظہار کے لئے جانوروں کا انتخاب کیا ہے حیوانات کی مخصوص صفتوں کو عموماً تشبیہ اور استعارہ میں پیش کیا گیا ہے بلکہ ایک مجازی زبان ہی اردو شاعری میں وجود میں آگئی ہے۔ یہاں تک کہ بغیر حیوانات کی کیفیات کو سمجھے ہوئے کوئی شخص اردو شاعری سے لطف اندوز ہی نہیں ہو سکتا حقیقت یہ ہے کہ جو تحریک اشاریت یورپ میں چلی اور جس نے وہاں کے ادب اور شاعری کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ اس کی تحریک کی روح تو ہمارے یہاں تغزل میں پوری طرح موجود ہے اشاریت تغزل کی جان ہے اور اس نے اس میں رنگ بھرا ہے رمزیت سے غزل کو شوخی، رنگینی، تاثیر، تصویر کشی اور شگفتگی ملی ہے جس طرح مختلف خوشنما رنگ کے پھولوں سے مالی گلدستہ تیار کرتا ہے بالکل اسی طرح شاعر مختلف استعاروں اور تشبیہوں کا حسین و رنگین ہیولی بناتا ہے اور اس پردۂ زنگاری کے ذریعہ اظہار مطلب کرتا ہے۔ اردو تغزل حقائق کو سراپا مجاز کے ریشمی پردوں میں طیور کے ذریعہ پیش کرتی ہے اس انداز کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں مختلف حیوانات کی صفات و احوال کے سہارے شعرا نے عظمت و بلندی کے جلوے دکھائے ہیں اور فکر و فن کے معجزے پیش کئے ہیں حالانکہ گوہر مقصود خود انسان کی ذات ہے۔ یہ اعلیٰ خیالات جس فنکارانہ رمزیت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر مغربی ناقدوں کی بعض تعریفات اور بیانات پر غور کریں تو ایسا محسوس ہوگا کہ اردو شاعری تو ابتدا ہی سے رمزیت کی اعلیٰ مثال رہی ہے۔

ہماری شاعری کا ایک نہایت جاندار تصور پرندوں کے شکار کے بارے میں ہے۔ اسی طرح ان کی آشیاں سازی اور بجلی گرنے کے پردہ میں شعراء طرح طرح کے انسانی زندگی کے پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ مثلاً غالب کہتے ہیں۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

شاعر نے نہایت عمدہ انداز سے انسانی نفسیات کو پرند کی زبان سے ادا کیا ہے۔ مومن کا شعر ہے۔

برق کا آسمان پر ہے دماغ   پھونک کر میرے آشیانے کو

اس موضوع پر دو شعر ہیں

تو دہی کیا تھا جلائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاک نشیمن پر

پروفیسر مسعود حسن رضوی نے "ہماری شاعری" میں اس شعر کی بڑی عمدہ وجدانی تعبیر پیش کی ہے۔ کتنے ہی ایسے حسرتناک مواقع ہیں جہاں یہ شعر قلب کا ترجمان بن جاتا ہے۔

اصغر نے اس ادبی روایت سے بڑا کام لیا ہے اگر اس دور میں جنگ آزادی کو پس منظر میں رکھ کر مندرجہ اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو نہایت اعلیٰ مطالب و مقاصد رمز و اشارے کی زبان میں نظر آئیں گے۔

قفس کیا ' حلقہ ہائے دام کیا ؛ رنج اسیری کیا!
چمن پر مٹ گیا جو ہر طرح آزاد ہوتا ہے

یہ سب نا آشنائے لذتِ پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

ان اشعار میں اصغر نے زندگی کے اعلیٰ مقصد یعنی آزادی کو بحیثیت ایک قدر کے پیش کیا ہے اور اس راہ مصائب کو نعمت عظمیٰ قرار دیا ہے مگر رمز کی زبان میں۔ اسی طرح آخری شعر تو نہایت اعلیٰ تخیل کا حامل ہے۔

اردو شعرا نے اعلیٰ انسانی صفات کو حیوانات کی زندگی' صفات اور ان کے ان کارناموں کے ذریعہ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو انسان کو خوشی و مسرت کا سرمایہ مہیا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے تاریک پہلوؤں کی ترجمانی حیوانات سے کم کی ہے اس کے برعکس زندگی کی اعلیٰ صفات کو واضح کرنے کے لئے ان کی مختلف عادتوں اور کیفیتوں کا سہارا لیا ہے مثلاً علامہ اقبال نے شاہین کو ایک آئیڈیل کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور بڑی کامیابی کے ساتھ۔

پرندوں کی آشیاں سازی' ان کا تنکے جمع کرنا' شوق و ذوق سے اپنا آشیانہ تیار کرنا پھر اس میں حسب مرضی آزادانہ زندگی گذارنا پھر اسی کے ساتھ صیاد کی حیلہ سازیاں" پرندوں کا پکڑنا اور انھیں آزادانہ زندگی سے محروم کر دینا یہ دونوں پہلو دراصل انسانی آزادی و غلامی کے لئے بہترین رمز ہیں جن کو اردو شاعری نے فارسی سے اخذ کر کے نہایت بلیغ انداز سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح جب پرندے اپنا آشیاں بنا لیتے ہیں تو کبھی کبھی ان پر بجلی بھی گرتی ہے اس کیفیت سے بھی شعراء نے پورا فائدہ اٹھایا ہے دیکھئے جگر کتنے موثر اور شاعرانہ انداز میں اپنے وطن پر اپنا حق ظاہر کرتے ہیں۔

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر
کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں' مری ملکیت یہی چار پر

غالب کتنے حسین انداز سے انسانی زندگی کے سکون و راحت کو پرندوں کے رمز کے لباس میں پیش کرتے ہیں۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں   گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

حالانکہ زنداں میں تکلیف ہونی چاہئے مگر شاعر اس سے ایک نیا تخیل، سکون تنہائی کا نکال لیتا ہے۔

غالب اپنی کوشش کی مثال اس طرح پیش کرتے ہیں۔

مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر   کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو جو مذکورہ تخیل سے متضاد ہے۔

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا   کاش کہ ہوتا قفس کا در کھلا

غالب کی تخیل کی پرواز ملاحظہ ہو:-

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا   میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

ایک اور دلچسپ تخیل وہ اس طرح پیش کرتے ہیں:-

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے   طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

غالب کے ذوق اسیری کا عالم یہ ہے کہ:-

مژدہ اے ذوق اسیری کہ نظر آتا ہے   دام خالی، قفس مرغ گرفتار کے پاس

یہ چند اشعار تھے غالب کے جو اگرچہ اعلیٰ درجہ کے نہیں لیکن مختلف رجحانات کا پتہ ضرور دیتے ہیں۔
اب ہم یہاں چند اشعار بلبل کی نغمہ سرائی پر پیش کرتے ہیں۔ "بلبل" اردو شاعری میں حسن و نغمہ رعنائی و دلکشی اور نشاط و زندگی کا نشان یعنی (Symbol) تصور کی جاتی ہے۔

غالب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟   پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار   دل پروانہ چراغاں، پر بلبل گلنار
خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو   وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

ایک شعر طاؤس سے متعلق ملاحظہ ہو:-

نقش نازِ بت طناز بہ آغوش رقیب   پائے طاؤس پئے خامہ مانی مانگے

یہ تمام اشعار بلبل کے رمز میں اپنے اندر زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ شاعر بلبل سے ایک جذبہ حسن پرستی، قلب پر تاثیر، خزاں کی آمد، بہار کی آمد اور انسانی زندگی کی لذت و اذیت کے لئے بلبل کو استعمال کرتا ہے کہیں قفس سے انسانی زندگی کی تنگ دامانی مراد ہے کہیں نالۂ بلبل سے نالۂ دل

انسانی مطلوب ہے اسی طرح دوسری تمام شاعرانہ تلمیحات اور گل و بلبل کی داستان کو رمز کے پیرائے میں انسانی زندگی کے حقائق سے تعبیر کیا جانا مناسب ہے کہ یہ طریقہ صراحت سے زیادہ موثر اور دلکش و اثر آفریں ہے داغ کتنے حسین انداز سے کہتے ہیں :

آرزو منہ کی تھی تجھے گل کے روبرو کرتے　　　　ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

اقبال نے رمز حقائق کا عجب زعفران زار پیش کیا ہے جس میں فکر و فن کے جلوے دل کو روح نشاط میں ڈبو دیتے ہیں اور حسن و نور کے ایسے دریا رواں نظر آتے ہیں کہ فکر و خیال کو اپنے ساتھ بہائے جاتے ہیں۔

چونکہ اقبال ایک پیامبر شاعر ہے جس کے یہاں فکر و نغمہ کے ساتھ ساتھ حسن و عظمت کے جلوے بکھرے ہیں اسی بنا پر اقبال کے حسین اشعار کے دامن میں ان کے افکار ستاروں کی طرح منتشر نظر آتے ہیں۔ ان کا بلند آہنگ نغمہ سرور ہی نہیں بخشتا بلکہ جھنجھوڑتا اور جگاتا ہے فکر و نظر کو قوت و عظمت کے سرچشموں کی طرف کھینچتا ہے اور علم و یقین کے نگارخانہ میں انسان کو پہونچاتا ہے جہاں خودی کی جلوہ گری ہے جہاں انسانی زندگی کی بلندیوں اور وسعتوں کو بے نقاب ہونے کی ترغیب ملتی ہے جہاں نشہ پلا کر گرایا نہیں جاتا بلکہ گرتوں کو تھام لیا جاتا ہے اس لئے اقبال نے نشیمن، قفس، صیاد، قمری، بلبل، پروانہ اور دوسری رمزیاتی روایتوں کو مقصد کے رنگ سے رنگ دیا ہے اور ان کی شاعری میں یہ حیوانات اور ان کے افعال دراصل ان کے مقصد کی تکمیل کے ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ بن گئے ہیں۔ اقبال کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے انداز نظر کے مطابق اصطلاح کی کیفیت کو جنم دیتے ہیں اسی بنا پر ان کے یہاں ملا، مجاز، خودی، شیشہ گری اور دوسرے الفاظ ایک اصطلاحی مفہوم کے حامل ہیں اسی طرح " شاہین " کو وہ خاص مفہوم سے پیش کرتے ہیں۔

انھوں نے اپنے مکاتیب میں کسی صاحب کو لکھا ہے کہ اس کے اندر چند اعلیٰ صفات موجود ہیں ان میں ایک تو یہ کہ شاہین شکار کر کے کھاتا ہے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ وہ آشیاں نہیں بناتا - وہ قانع ہے۔ اور وہ مردہ گوشت نہیں کھاتا۔ اقبال اپنا " فلسفۂ طاقت " درحقیقت شاہین کے رمز میں پیش کرتے ہیں وہ موتی پر اپنی نظم میں کہتے ہیں کہ ضعیفی کی سزا موت ہے جس طرح معرّی نے اس پرندہ کو مخاطب کر کے پوچھا تھا کہ لوگ تجھکو کیوں پکڑ لائے ؟

اے مرغک بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو　　　　تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جسکی مکافات

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو　　　　دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے　　　　ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　　　　کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام ترا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقین سے کنجشک فرو مایہ کو شاہیں سے لڑا دو

ان اشعار میں اقبال نے "شاہین" کو قوت و غلبہ کے مظاہرہ کے لئے ایک رمز بنا کر پیش کیا ہے ان کے کلام میں شاہیں بہت استعمال ہوا ہے۔

اقبال نے دوسرے طیور سے بھی فائدہ اٹھایا ہے:۔

اڑالی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے

چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے

عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

اقبال نے مختلف انداز سے "حیوانات" کو پیش کیا ہے۔ دراصل انسانی زندگی کی اعلیٰ قدروں کا یہ ایک ذریعہ پیش کرتا ہے جس سے اثر بڑھ جاتا ہے۔ انسانی قدروں کی بلندی میں مبالغہ اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اصل میں اعلیٰ اقدار کو مبالغہ کے ذریعہ پیش کرنے کا سب سے موثر ذریعہ حیوانات اور نباتات ہیں جو انسان کے مشاہدات میں رہتے ہیں اس لئے ان کی صفات سے واقفیت تاثر کی کیفیت کو بڑھا دیتی ہے۔

آشیاں سازی اور آشیاں سوزی سے انسانی تعمیر و تخریب کے عظیم حقائق کو شعراء نے پیش کیا ہے نعیں کا شعر ہے

چمن میں غارت گلچیں سے جانے کیا گذری

قفس سے آج صبا بے قرار گذری ہے

یہاں بلبل کا نام نہیں مگر چونکہ بلبل کا معشوق گل ہے اس لئے گلچیں کی زد براہ راست بلبل پر پڑتی ہے گویا یہ اضطراب بلبل ہے کہ دیکھئے چمن میں گلوں کا کیا حال ہو؟ کیفیت کسی انسانی سماج اور اس کے مختلف حالات پر بھی چسپاں ہو سکتی ہے۔

اقبال جگہ جگہ حیوانات کے رمز سے اپنی شاعری کو دلکش بناتے ہیں کتنا جاندار مفہوم اس شعر میں ملتا ہے۔

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور خون گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

اسی تیور کے دوسرے اشعار ملاحظہ ہوں۔

اس چمن میں پیرو بلبل ہو یا تلمیذ گل	یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

"آہو" کو اقبال نے بڑے شاعرانہ انداز سے استعمال کیا ہے۔

مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے	مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر	کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام قفس سے بہرہ مند

وہ "جواب خضر" میں آہو کے ذریعہ ایک دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام	وہ خضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ میل

آگے چل کر محنت و سرمایہ میں فرماتے ہیں۔

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر

شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

اسی میں وہ مسلماں کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔

میان شاخساراں صحبت مرغ چمن کب تک

ترے بازو میں ہے پرواز شاہین قہستانی!

وہ مغرب کی بے روح زندگی کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

یہ سرود قمری و بلبل فریب گوش ہے	باطن ہنگامہ آباد چمن خاموش ہے

زندگی کی طاقت کا بیان ساقی نامہ میں اسطرح کرتے ہیں۔

کہیں جرہ شاہیں سیماب رنگ	لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور	پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

اب اگر ہم حیوانات کی تقسیم ان صفات کے لحاظ سے کریں جن سے وہ معروف ہیں اور جن کا استعمال ادب و شاعری میں حسب موقع ہوتا رہتا ہے تو وہ سرسری طور پر حسب ذیل ہوں گے۔

نغمہ طرب و حسن و جمال کی علامت کے طور پر بلبل، طوطی، کوئل، پپیہا، طاؤس، قمری، طوطا، مینا، کبوتر۔ بہادری کی علامت کے لئے شاہین، عقاب، باز، شکرہ، جرہ۔ ضعف کی علامت کے لئے کنجشک، فاختہ، قمری دراج و سار، تیہو تڑپ اور محبت کی علامت کے لئے کبک دری (چکور) بزدلی، کم ہمتی اور مردار خواری کیلئے کرگس (گدھ) قربانی تڑپ اور انتہائے عشق اور جاں نثاری کے لئے پروانہ بہادری کے لئے گھوڑا۔ خوبصورتی اور نزاکت کیلئے ہرن (غزال) بھدا پن اور قناعت کے لئے ہاتھی اور نحوست کے لئے الو استعمال ہوئے ہیں۔ ان سے شاعر کو کوئی کام نہیں وہ صرف ان کی صفات سے غرض رکھتا ہے اور ان صفات کو انسان پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

ڈنڈا کی شاعرانہ عظمت

کسی بھی زبان اور ادب کے عروج وارتقاء کا ایک دور ہوتا ہے اور زبانیں مخصوص حالات، مخصوص ادوار اور مخصوص علاقوں میں بہار وشباب کی منازل سے ہمدوش وہمکنار ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں سنسکرت اور فارسی کا بھی یہی حال رہا کبھی ان زبانوں کا ستارہ اقبال پر تھا آج ان کا دائرہ محدود ہے۔ دکنی بھی ان کیفیات سے دوچار تھی اور آ سلطنت بہمنیہ کی جانشین سلطنتوں میں" جن میں قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتیں قابل ذکر ہیں دکنی کا سکہ جاری تھا، دکنی ہر حیثیت سے ان سلطنتوں کی عوامی زبان تھی۔ ان سلطنتوں کے فرمانروا نہ صرف خود شخصی طور پر شعر وادب کا ذوق رکھتے تھے بلکہ شاعروں اور ادیبوں کی بھی فیاضانہ سرپرستی کی جاتی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، اور علی عادل شاہ کے علاوہ ملا وجہی، ہاشمی، نصرتی اور ملک خوشنود وغیرہ دکنی کے نامور ادیب اور شاعر گذرے ہیں۔ ان سلطنتوں پر کیا زوال آیا دکنی ادب کی تخلیق بھی کم سے کم تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ سلطنت آصفیہ کے قیام کے بعد اردو علمی وادبی زبان کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ لیکن جہاں دکن میں ہر طبقہ کی خواتین عموماً دکنی ہی میں اظہار خیال کرتی ہیں آندھرا اور میسور کے بیشتر علاقوں خصوصاً مواضعات میں دکنی ہی عوام کے مافی الضمیر کو ادا کرنے کا ذریعہ ہے دکنی میں ان دنوں نثر نگار تو بے حد کم ہیں شاعر بھی دو چار سہی اس زبان کو آب ورنگ دیتے آرہے ہیں۔ عصر حاضر میں غلام سرورخاں ڈنڈا دکنی زبان کے ممتاز شاعر کی حیثیت رکھتے تھے دکنی شاعری فی زمانہ ' ہنسی مذاق' دل بہلاوے اور تفریح طبع کا ذریعہ متصور کی جاتی ہے۔ شعر وسخن کی محفلوں اور مشاعروں میں دکنی زبان کے شاعر کو " کان کا ذائقہ " بدلنے کے لئے سن لیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ دکنی کے بعض شاعر اسی سلوک کے حقدار ہیں کیوں کہ آج کے دکنی کے کہے جانے والے شاعروں میں بیشتر ایسے ہیں جو انوں (انہوں کی جگہ) پو (پر کی جگہ) نیئں (نہیں جگہ) اور ایسے ہی چند الفاظ جو عام طور پر مستعمل بھی ہیں استعمال کرکے اس زبان کے شاعر کہلاتے ہیں۔ جبکہ اُن کے ہاں مجموعی طور پر دکنی کا حسن اور بانکپن مفقود ہوتا ہے لیکن خصوصاً ڈنڈا نے دکنی کو دکنی کی صورت میں استعمال کیا ہے۔ ہوسکتا ہے اُن کے ہاں ادھر کے چند الفاظ آچکے ہوں لیکن اپنی بیشتر منفرد لسانی خصوصیات کے ساتھ ڈنڈا کے ہاں دکنی موجود ہے۔ سرور ڈنڈا نے اردو سے دکنی کا سودا نہیں کیا۔ انہوں نے دکنی کو دکنی ہی رہنے دیا یہی ان کا کمال ہے۔ یہاں میں دکنی کی لسانی خصوصیات شمار کرنا نہیں چاہتا لیکن ڈنڈا کے ہاں اسم کی جمع بنانے کے لئے واحد کے آخر میں " اں" کا استعمال، جمع والے الفاظ کی بھی جمع " میں" کی جمع " ہمن" مصدر کی علامت " نا" یا " ن " ہائے مخلوطی کا گرادینا

جیسے "ہاتھ" کی بجائے "ہات" "کچھ" کی بجائے کچ، بعض درمیانی حرف صحیح کو مشدّد بنا دینا عام ہے، جن سے دکنی کا خمیر بنتا ہے۔ ڈنڈا کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن پر شبہ ہوتا ہے کہ یہ سرور ڈنڈا کے ہیں یا قطب شاہی دور کے شاعر کے، مثلاً ؎

جو بھی تم کو چاہا گیا گھاٹ پہ اُن
میری جان انجیوں ہیں سٹکتے سٹکتے
سورج بن کے جگ پو چھاجا
چاں کے جیسا گھٹ نکو رے

سرور ڈنڈا کی شاعری میں مسائل حیات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ سرور ڈنڈا نے گذشتہ ربع صدی کے شاعروں کی طرح زمانے کے کئی انقلاب دیکھے، کئی زیر و زبر کا سامنا کیا انہوں نے اپنے اشعار میں سطحی اور تفریحی عناصر کی بجائے عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کو سمو دیا ڈنڈا کی عوامی مقبولیت کا ایک اور سبب اُن کی آواز، اُن کا منفرد اسٹائل، اُن کا رنگ ترنگ انداز اور اُن کا لب و لہجہ تھا جن میں "دکنیت" تمام برنائیوں کے ساتھ موجود تھی۔

ڈنڈا کو اکبر الہ آبادی سے مماثلت دی جاسکتی ہے۔ ڈنڈا بھی اکبر کی طرح طنز کی تلخی کو مزاح کی شیرینی میں لپیٹ کر پیش کرتے ہیں۔ مزاح کی ایسی شیرینی سے ان کا اسلوب منفرد ہو جاتا ہے۔ زندگی کے داغوں بھرے چہرے سے وہ کچھ اس پرکاری سے نقاب اٹھاتے ہیں کہ زندگی بڑی حسین دکھائی دیتی ہے مفلس کی زندگی کا حال سننے کہ سامع تبسم بہ لب ہو جاتا ہے ؎

نحوست کا مری گھڑسی میں جب سے بول بالا ہے۔
مرا جینا فقط یا رو بینا کا گیت مالا ہے

ڈنڈا کا کمال اور اُن کے کلام کی مقبولیت کا سبب اُن کی شاعری کے موضوعات کی عمومیت اور کلیتہً عوامی نقطہ نظر سے ان موضوعات پر طبع آزمائی ہے۔ ڈنڈا کی شاعری میں آپ کو کسی نوع کا فلسفہ نہیں ملے گا۔ نہ وہ کسی "ازم" کے حامی ہیں اور نہ اُن پر "کوئی پسند" ہونے کا لیبل چسپاں کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی وہ کبھی کسی سداچار کمیٹی کے رکن رہے۔ اُن کی شاعری کا سراپا ٹھیٹ عوامی ہے موضوعات کے اعتبار سے بھی اور اسلوب کی حیثیت سے بھی ـــــ غربت، فاقہ، افلاس، ٹکس، بیماری اور تعلیم عوامی مسائل ہیں۔ ڈنڈا ان مسائل سے دوچار عوام کی صعوبتوں کو خوب سمجھتے تھے چونکہ اُن کے ہاں صحت مند شعور تھا اس لئے انہوں نے ان مسائل سے تنگ آکر انہیں طنز و مزاح کا لباس پہنایا اور زندگی کی تلخیوں کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیا۔ نظم "اِدے نا دیشم" (یہی میرا دیش ہے؟) میں وہ ملک اور اہل ملک کے مسائل و احساسات کی تصویریں کھینچتے ہیں ؎

جاں جینے پو نکساں جاں مرنے پو نکساں

جاں جنور سے بدتر ہیں بے چارے انسان

جاں ملنا بھی مشکل ہے بیڑی کے دو دَم

اِدے نا ما دیشم، ادے نا ما دیشم

ہمارے ملک میں امیر و غریب کے مابین جو اقتصادی خلیج واقع ہے ڈنڈا کی زبان سے وہ بھی سن لیجئے ؎

سداں میرے گاؤں پو غربت کا موسم

نہ فاقوں سے فرصت نہ دم پیچھے دم

یاں لنگی بھی گت نئیں واں ان کو ہے ریشم

اِدے نا ما دیشم، ادے نا ما دیشم

اسی خیال کو غزل کے شعر میں یوں پیش کرتے ہیں ؎

بھاگاں میں اُن کے لکھیا ہے کمخواب و مشجّر

بھاگاں میں اپنے لکھیا ہے پیرا پھٹا پُرانا

عصر حاضر میں سائنس کی ترقی اور صنعتی و زرعی پیداوار کے بڑے بڑے اعداد و شمار کے باوجود آج کا انسان اپنی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل میں بھی ناکام ہے۔ زندگی اپنا مذاق آپ اڑا رہی ہے اور زندگی و موت کے درمیان تعین حد دشوار ہے۔ ڈنڈا نے عام آدمی کے احساسات کی ترجمانی یوں کی ہے ؎

نہ مرنے میں" شامل نہ جینے میں شامل

کئی سال گزریں لٹکتے لٹکتے

یو نیچ عمر کٹ گئی نہ ڈنڈے حضت کی

زمانہ کا گردا جھٹکتے جھٹکتے

ڈنڈا کے ہاں طنز کی دھوپ ہی نہیں مزاح کی چھاؤں بھی ہے، مسائل اور موضوعات پر طنز دھوپ اور لہجہ و اسلوب چھاؤں ـــــ اس دھوپ چھاؤں میں وہ اپنے قاری کو لئے لئے چلتے ہیں۔ اُن کے قارئین، دھوپ کی شدت کو سامنے دکھائی دینے والے سایہ کے باعث نہ صرف برداشت کر لیتے ہیں بلکہ دل کھول کر داد دینے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ قارئین اور سامعین محسوس کرتے ہیں کہ اُن پر بھرپور وار کیا جا رہا ہے لیکن ڈنڈا کے لہجے کی شیرینی اور حلاوت کے باعث کراہنے کی بجائے مسکرانے کو جی چاہتا ہے۔ ڈنڈا کے طنز کا نشانہ ایک عام انسان، نچلا اور متوسط طبقہ ہی نہیں اونچے طبقے کے افراد، اعلیٰ عہدیدار اور ارباب سیاست بھی ہوتے ہیں۔ کل ہند مشاعروں میں جب ڈنڈا لہک لہک کر اپنے خاص انداز میں کلام

سناتے تھے تو یہ افراد شاعر کے طنز کو محسوس کرتے ہوئے اس سے محظوظ بھی ہوتے "شاہ پور واڑی" اور "سنجیوا ریڈی ماما" ان موضوعات پر ڈنڈا کی کامیاب ترین نظمیں ہیں کہ ان کو عصر حاضر کے منتخبہ ادب میں شامل کرنا چاہئے۔ ان نظموں میں ڈنڈا نے جس جرات مندی اور بے باکی سے نظم ونسق اور سیاستدانوں کا کچا چٹھا پیش کیا ہے موجودہ دور کے شاید ہی کسی شاعر نے مسائل کا اس نقطہ نظر سے تجزیہ کرتے ہوئے گندگیوں اور بدعنوانیوں کو برسر عام لایا ہو۔ طوالت کے خیال سے ان نظموں کا انتخاب دینے سے احتراز کرتے ہوئے میں یہاں صرف چند اشارے پیش کروں گا۔ سکریٹریٹ کو بیاد فتر قرار دینا جہاں ہر کارروائی لیٹ ہو جاتی ہے اسمبلی ہال کو ایسا مقام بتانا جہاں "سیاسی دلال" رہتے ہیں اور دفتر تعلقات عامہ کو "پریوں کا ہنگامہ" کہنا صرف ڈنڈا ہی کے بس کی بات ہو سکتی تھی "سنجیوا ریڈی ماما" میں وہ کہتے ہیں ؎

پولس کی ڈائری میں
ڈنڈے کی شاعری میں
فل اسٹاپ ہے نہ کاما
سنجیوا ریڈی ماما سنجیوا ریڈی ماما

سیاست کی تعریف ڈنڈے کے الفاظ میں سنئے اور داد دیجیے کہ عصر حاضر میں سیاست یہ نہیں تو اور کیا ہے ؎

تعریف سیاست کی صرف اتنی ہے یارو
جس کو ملیا موقع اُنے دھول جما نا

ویز سیاست کا حاصل اس کے سوائے کیا ہے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ڈنڈا کو سیاستدانوں کے سامنے ناصح کے روپ میں دیکھئے ؎

کھیل سیاسی کھیلنے ہارے
شام صبوحیت پٹ نکورے

ملازمت اور سفارش میں جو قریبی تعلق ہے آج کے خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوان تو اسی تعلق کے مارے ہوئے ہیں ملازمت اور سفارش کے مابین اس تعلق کو استوار کرنے میں سیاستداں، وزراء، ارکان پارلیمان و اسمبلی جو مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں وہ بھی کس سے مخفی ہے۔ ڈنڈا نے اور کچھ نہیں اس حقیقت کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہے اور بس۔ ؎

بڑے منّت مُراداں سے ترقی منیجے ل رئی تھی
مرا حق مارتے ہارا تو ایم۔ ال۔ اے کا سالا ہے

ان سب کے باوجود اہل سیاست اپنی معصومیت کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں یہ تضاد بڑا دلچسپ ہے۔ سیاستدانوں کے اس موقف کی بھی سماعت فرمائیے ؎

چور سنتے پو پہنچے جو سیاست کی تو بولیں
اندھا ہوں مائی باپ مجھے رستہ بتانا

قانون کی حکمرانی کا مطلب مظلوم کی دستگیری اور کمزور کے مفادات کا تحفظ ہونا چاہئے لیکن چشم گنہگار یہی دیکھتی ہے کہ بھینس اُسی کی ہے جس کے پاس لاٹھی ہے۔ جمہوریت اور عوامی مساوات کے بلند بانگ دعوے کرنے والوں کے لئے یہ کھلا چیلنج ہے۔ ڈنڈا کے کلام میں اس کی جلوہ گری یوں ہے ؎

قانون نرالا پیچ ہے عمل میں اُن کی آڑ
کمزور نا توانوں کو اوٹ بیٹھ کرانا

ڈنڈا نے زندگی دوست شاعر کی طرح زندگی کے ہر موضوع اور ہر پہلو کو اپنی شاعری کا عنوان بنایا ہے ایسا شاعر قومی مسائل سے چشم پوشی کس طرح کر سکتا ہے۔ ہماری شمالی سرحدات پر کمیونسٹ چین کا جارحانہ حملہ اولین اہمیت کا حامل قومی مسئلہ تھا اور ہے۔ ہندوستانی عوام خواہ وہ زندگی کے کسی شعبہ اور پیشہ سے وابستہ ہوں چین کی جارحیت پر مشتعل اور متردد رہے اور اپنے اپنے طور پر قومی دفاعی تیاریوں میں مشغول ــــ ایک شاعر ایسے موقع پر اپنے کلام سے اہلِ وطن کا دل بڑھا سکتا ہے اور عوام کے اتحاد اور یکجہتی کی ترجمانی میں بھی پیش پیش ہوتا ہے۔ ڈنڈا نے اس موقع پر بے حد موثر اور ولولہ انگیز نظم " سمٹے تو ہم ہمالہ " لکھ کر اپنا فرض پورا کیا وہ ہندوستانی عوام کی طاقت اور ان کے اتحاد کا اظہار کرتے ہیں۔ ؎

ہم ہندو ہور مسلمین، سکھ، پارسی، عیسائی
دشمن کے حق میں بن گئیں بندوق، برچھی، بھالا
اے اہل چین سن لیو، ہم کون تم کو معلوم
پھیلے تو گھو کرو ہیں سمٹے تو ہم ہمالہ ـــــ

ہندوستان کی دفاع پر توجہ دینے کے بعد سرحدات پر موقف اور چین کا کھسیانہ پن ڈنڈا کے الفاظ میں آپ بھی سنئے ؎

دشمن کے چھکے چھوٹ گئے بگیا بغلاں بھی بہانے
بھارت کا ویر بڑھ کر جب مورچہ سنبھالا

آخر میں " اللہ صاحب " سے ٹھیٹ دکنی انداز میں ڈنڈا کی دعا ؎

دن رات اللہ صاحب ڈنڈے کی یہ دعا ہے
بیگی سے دشمنوں کا بھارت سے مو ہو کالا

بین الاقوامی سطح پر امن کی باتوں سے ڈنڈا بھی واقف ہیں لیکن آستین میں دشنہ پنہاں اور ہاتھ میں خنجر کھ

ہونے سے تو بات نہیں بنتی ۔ آج عالمی بڑی طاقتیں امن کے خوشگوار دعوے ضرور کرتی ہیں، بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد بھی ہوتا ہے چونکہ خلوص کا فقدان ہے اور طاقت کے بل پر بات چیت کرتے ہوئے ہر فریق اپنے موقف کو بالاتر رکھنا چاہتا ہے لہٰذا ایسی صورت میں امن کی کوششوں اور ایسی کانفرنسوں کا انجام ~~معلوم~~ کے ان رموز کو ڈنڈا کی سہل اور عام فہم شاعری میں سن لیجئے ؎

امن کی باتاں امن سے کرنا

ہاتھ میں برچھی لٹ ٹکورے

ڈنڈا کی شاعری کے یہی عوامی موضوعات، مسائل، اُن کا جاگتا احساس، اُن کا تابندہ خلوص، عام فہم سلیس اور سادہ انداز ان کی شاعری کو دلنشین بنا دیتے ہیں ان کی شاعرانہ عظمت کا راز انہی میں مضمر ہے ۔

قیوم صادق

مرزا غالب : سارے جہاں کے .....

سارے جہاں میں مرزا اسد اللہ خاں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ غالب ہر دلعزیز مشہور و مقبول ہوتے جا رہے ہیں۔ کیوں نہ ہو! ان کا کلام پڑھ کر ہر ایک یہی محسوس کرتا ہے کہ بس ..... غالب میرے دل کی بات ہی کہہ رہے ہیں۔ غالب کا وصال ہو کر ایک صدی گزر گئی لیکن وہ آج بھی زندہ نظر آتے ہیں اپنے کلام و مکتوب نگاری کی وجہ سے چنانچہ آج برطانیہ، روس، امریکہ، کینیڈا، فرانس اور جاپان کے علاوہ مشرق وسطیٰ کی یونیورسٹیوں میں غالب کا کلام پڑھایا جاتا ہے اور مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی کیا جا رہا ہے۔ اس طرح غالب کی شہرت نہ صرف ہندوستان، پاکستان میں بلکہ سارے جہاں میں ہے۔

ہندوستان کا یہ پہلا اردو شاعر ہے جو ساری دنیا کا پسندیدہ شاعر بن گیا ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے غالب زندہ رہیں گے اور اردو جوں کی توں قائم رہے گی۔ بقول شخصے غالب اردو ادب میں ہری جھنڈی بنے ہوئے ہیں۔ اس جھنڈے تلے ہر مذہب و ملت کا فرد آنا باعث فخر سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ غالب کا انداز بیان کچھ ایسا ہے جو ہر ایک کو متاثر کرتا ہے۔

اردو کے مشہور ادیب غالب کے بارے میں کہتے ہیں :-

بجنوری " ہندستان کی مقدس کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوان غالب۔

رشید احمد صدیقی " مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف تین نام لوں گا۔

غالب —— اردو اور تاج محل "

آل احمد سرور " اردو میں پہلی بھرپور اور رنگا رنگ شخصیت غالب کی ہے "۔

" غالب ہماری ادبی تاریخ میں ایک نئے دور اور ایک نئی روایت کا خالق اور پیشوا ہے "۔

" دیوان غالب کو ہم نئی نسل کی انجیل قرار دے سکتے ہیں "۔

گذشتہ سو سالوں میں غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ حالی کی یادگار غالب " سے لیکر ظ۔ انصاری کی " غالب شناسی " تک کم و بیش ڈیڑھ سو کتابیں لکھی گئیں (یو پیا اسٹوڈنٹس سرکل بمبئی کے تحت " یوم غالب " منایا گیا تھا جس میں غالب پر جتنی کتابیں چھپی ہیں نمائش کے لئے رکھی گئی تھیں۔ سب ڈیڑھ سو کے قریب ہوں گی) دیوان کے

سینکڑوں مختلف ایڈیشن شائع ہوئے۔ غالب کی شخصیت اور فن پر ہزارہا مضامین لکھے گئے۔ اشعار اور افکار کی بہت سی تفسیریں اور تعبیریں ہوئیں۔ اس سرمایہ کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ حیات غالب کا کوئی گوشہ اور گفتۂ غالب کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اہل نظر نے سیر حاصل بحث نہ کی ہو۔ لیکن پھر بھی لوگوں کی طبیعت سیر نہیں ہوئی اور غالبیات میں برابر اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔

ہر چند غالب بعض اوقات صرف یہ کہہ کر دامن چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں ؎

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا　　کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

لیکن اس راکھ میں جب پھونک کر چنگاریاں تلاش کی جاتی ہیں، تو جوہر اندیشہ کی گرمی سے صحرا تک جل اٹھتے ہیں۔ غالب کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس قدر تحقیق و تنقید کے بعد بھی .... حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا .... روز نئے نئے پہلو سامنے آتے رہتے ہیں اور ان کی روشنی میں غالب کے بت بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ گر موضوع ابھی فرسودہ نہیں ہوا اس میں ابدی تازگی ہے۔

غالب کو اپنی بوقلموں شخصیت، شاعرانہ عظمت اور انشا پردازی کی وجہ سے اردو ادب میں جو انفرادیت حاصل ہے اردو کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں اور دنیا جتنی ترقی کرتی جاتی ہے غالب پرستوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ کبھی تو یہ خیال تھا کہ یہ شاعر مہمل گو ہے۔ پھر ایسا زمانہ آیا کہ غالب اور اس کا کلام دوبارہ پیدا ہوا اور جس چیز کو پہلے جنس کاسد سمجھکر رد کردیا گیا تھا، اس کو متاع از دست رفتہ سمجھ کر سینے سے لگایا جانے لگا۔ اور اب نقادان فن کی یہ رائے ہے کہ غالب کا ایک ایک لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم ہے اور ایک ایک شعر مطالب کا بحر بیکراں ہے جس کی گہرائیوں تک پہنچنا انسانی دماغ کی مجال نہیں غالب خود بھی اپنی پوشیدہ صلاحیتوں اور اپنے اندر چھپے ہوئے امکانات سے واقف تھے اور انہوں نے بجا طور پر پیشین گوئی کردی تھی ؎

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

غالب کی ہستی ہمارے ادب میں جس قدر و منزلت کی حامل ہے وہ اقبال کے علاوہ اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ مرزا کی شخصیت در اصل ان کے کلام میں ہی ابھری ہے۔ جب انہوں نے بہت سے جذباتی تقاضوں اور بہت سی ناکامیوں اور نامرادیوں کا ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے۔ یہ تبسم، یہ برداشت اور یہ وسعت قلب ان کی عام زندگی میں بھی موجود تھی لیکن بھرپور اظہار غالب کے کلام ہی میں نظر آتا ہے۔ غالب ہمیں اس لئے بھی عزیز ہے کہ ہم انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ بات ان کے خطوط کے مطالعہ سے حاصل ہوئی۔ اگر غالب خطوط نہ لکھتے تو ہماری زبان اور ادب کا اس سے جو زیاں ہوتا وہ الگ بات ہے۔ ہم انہیں کبھی جان نہ سکتے۔ رشید احمد صدیقی کہتے ہیں۔

غالب زندہ ہوتے تو میں ان سے دوستی کرتا۔ میں کہتا ہوں غالب مرے ہی کب تھے وہ آج بھی زندہ ہیں اور میری ان سے دوستی بھی ہے۔ جب جی چاہتا ہے ان کے خطوط اٹھا کر پڑھ لیتا ہوں اور ہجر میں وصال کے مزے اٹھا لیتا ہوں۔"

غالب اردو ادب کے والٹیر ہیں۔ ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت جو ان کے اور سترہویں صدی کے انگریزی شاعر ڈن (Donne) کے یہاں مشترک ہے رمز بلیغ (Conceit) کا استعمال ہے۔ شیکسپیر کے کلیات میں جو جذبات انسانی کے مرقعے ہیں۔ وہ گویا زندگی کے مماثل معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں تخیل سے رنگین ہیں۔ اور یہی رنگ ہے جو شیکسپیر کے کلام کو لافانی بناتا ہے۔ مرزا غالب کی مصوری شیکسپیر کی مصوری ہے۔

غالب کا کلام ہندی مسلم تمدن کی روح کا عکس پیش کرتا ہے۔ ان کے یہاں ہمیں انسان کی عظمت کا احساس، زندگی میں نئے امکانات کی تلاش کا جذبہ، قومی اور معنی خیز احساسات کو اظہار بیان کی گرفت میں لانے کی کوشش اور کائنات کی دلفریب اور دلکش اشیاء سے لطف اندوز ہونے کی حرص، پوری طرح نظر آتی ہے۔ اردو غزل میں غالب جدت ادا کا امام ہے۔ میر اور مومن بھی لفظوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن غالب انہیں فاتحانہ انداز میں برتتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ جن لفظوں کو برت رہا ہے وہ اسی کے لئے بنے ہیں۔ جدید ذہن کا بڑا کامیاب نمونہ ملتا ہے۔ اس ذہن کی خصوصیات، اس کی ندرت، پیچیدگی۔ ذہنی اور جذباتی کشاکش کے باوجود توازن، وحدت اور ترتیب قائم کرنے کی طرف میلان کا پایا جانا ہیں۔ ذہنی بیداری اور چوکناپن نظر آتا ہے۔ ایک شدید اندرونی کشمکش اور تصادم کی بیداوار ہے اسی لئے اس کے ایک سے زیادہ رنگ ہیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اس میں اور رنگوں کا اضافہ ہوگا ایک گرہ کھلے گی تو سو گرہیں اور پیدا ہوں گی۔ ایک آئینہ کے بعد دوسرا آئینہ، ایک تعبیر کے بعد دوسری تعبیر اور ایک پردے کے پیچھے ستر پردے نظر آئیں گے۔ غالب نے ان پردوں پر اپنی روح کو بے نقاب کیا ہے جن کی غزلوں سے ایک پوری داستان مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس کے لئے انہیں جلنے کتنے زہر پینے پڑے ہوں گے۔

اردو شاعری میں غالب کی اہمیت کا اندازہ ان تین نمایاں خصوصیات سے ہوسکتا ہے۔ ۱۔ اس کی انفرادیت پسندی (۲) اس کے شاعرانہ تجربات میں خیال اور جذبے کی آمیزش اور (۳) اس کے انتخاب الفاظ اور لب و لہجہ میں بول چال کی زبان سے انحراف۔

اردو شاعری پر غالب کے اثرات کا جائزہ لینے کے لئے غالب کے بعد سے لیکر اب تک اپنی شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالئے۔ حالی کو ذکر چھوڑ دیئے کہ اس نے دل کی رام کہانی چھوڑ کے ایک اور وضع اختیار کی تھی جو بذات خود ایک مستقل موضوع ہے۔ داغ کی غزل گوئی پر غالب کا سایہ نہیں پڑا۔ اس کا اپنا ایک رنگ ہے جسے رنگ غالب سے کوئی خاص نسبت نہیں۔ غالب کے بعد کا دور عموماً غزل کی شاعری کا دور نہیں رہا۔ حسرت، اصغر، فانی، جگر، اچھے خاصے شاعر ہیں مگر حقیقی معنوں میں بڑا شاعر ان میں سے شاید کوئی بھی نہیں ہے۔ ہاں ان سب کا اپنا اپنا خاص رنگ ہے، ان میں سے کسی نے بھی کسی سکہ بند رنگ کی پیروی نہیں کی جو پرانے غزل گوؤں کا عام دستور تھا، بلکہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی انفرادیت کے اظہار پر زور دیا ہے۔ یہ

ش اردو میں غالب نے بنائی تھی اور ان شعرا نے اختیار کی۔

یہ تو غزل گو شاعروں کا ذکر تھا جو غزل کی صدہا سال کی روایت سے یکسر آزاد ہو ہی نہیں سکتے، خود غالب بھی اس سے سر آزاد نہیں تھا، انفرادیت کے مکمل اور بے باک اظہار کے لئے۔ "تنگنائے غزل" سے زیادہ نظم کی صنف موزوں ہے کہ اس کی فضا کچھ اور "وسعت" لئے ہوئے ہوتی ہے، نظم کے شعراء اپنی شخصیت اور انفرادیت کے اظہار سے یادہ شغف رکھتے ہیں۔ اس انفرادیت پسندی کی ابتداء غالب سے ہوئی اور ہمارے ہاں کے جدید رنگ کے شعراء ابھی سا اسی نہج پر چل رہے ہیں۔ اقبال کی دنیا غالب کی دنیا سے کسی قدر مختلف ہے۔ ان دونوں میں واقعی بعد المشرقین ہے

غالب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں سب سے پہلے اپنے کھلنڈرے اور بے فکرے کردار نمایاں کیا ہے ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

تو ہمیں ایک بڑے دماغ اور ایک بڑے کردار کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایک ایسے کردار کی جو دنیا کی کلفتوں اور ناکامیوں و خاطر میں نہیں لاتا اور نہ ان سے بزدل ہی ہوتا ہے، غالب اپنے تجربوں کے اعتبار سے اہمیت رکھنے والا شاعر ہے۔ س نے اردو شاعری کے افق کو وسیع کیا جب وہ کامیاب ہوتا ہے تو اپنے نادر اور جدید تجربوں کو جذبی، تخیلی اور سالی حیثیت دے کر شاعرانہ بنا دیتا ہے۔

غالب کے کامیاب حصہ کلام میں غیر معمولی معنویت اور تاثیر پائی جاتی ہے۔ معنی آفرینی صناعت کی سب سے بڑی کامیابی ہے، س اعتبار سے غالب ایک بڑا صناع، ایک ذہین فنکار، ایک حسن آفریں شاعر ہے۔ غالب ایک عندلیب گلشن نا آفریدہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی قدر مستقبل میں ہوئی ؎

"لوح سے تمت تک مشکل سے سَو صفحے نہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں ہے۔ کونسا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔" (بجنوری)

غالب کے پیرایہ بیان کی یہی وہ خوبی ہے جس نے ڈیڑھ ہزار اشعار کے مختصر سے سرمائے ہی سے ان کی وہ ساکھ قائم کر دی ہے کہ باید و شاید۔ ان کے اسلوب کی یہی ہمہ گیری ان کی ہر دم بڑھنے والی عزت و شہرت کی ضامن ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہر موقع و محل کے لئے ان کے مختصر سے دیوان کے برجستہ و برمحل اشعار بے تکلف زبان پر آ جاتے ہیں اور یہی وہ بات ہے جس کی بناء پر ہم غالب کو اپنی تہذیب اور اپنے کلچر کا ایک عظیم نمائندہ مانتے [illegible]

اردو ادب میں تنقید کی اہمیت مرزا غالب کے عہد سے نئے ڈھنگ سے شروع ہوئی ہے ڈاکٹر [illegible]

؎ حوالہ: [illegible] غالب، مرتبہ پروفیسر [illegible] خاں [illegible]

غالب کے نقادوں میں سب سے پہلا نام تو غالب ہی کا ہے جنہوں نے بڑی بے دردی سے اپنے ضخیم دیوان کو چند مختصر اوراق میں منتخب اور محدود کر دیا۔

شیفتہ، غالب کے پہلے نقاد ہیں جن کا شعری شعور غالب کے تخلیقی عمل میں بھی کسی حد تک کارفرما نظر آتا ہے۔ حالی سے اردو میں نئے تنقیدی شعور کی داغ بیل پڑی۔ میر نے عہد کے مذاق سے اپنی طرز کو علحدہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ۔۔۔

کیا جانیں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے

کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

حالی نے بھی استفہامیہ غالب کے کلام کے بارے میں قائم کیا۔ انہوں نے غالب کے نغموں میں ایک نئی صورت اور نئے آہنگ کا پتہ لگایا۔ اس صورت و نغمہ کی انوکھی دلکشی کے مختلف عناصر گنوانے کی کوشش کی۔ لیکن آخر غالب کے نغمے میں یہ تبدیلی صورت و آہنگ کا یہ اختلاف کیوں پیدا ہوا اور اس کے بنیادی عناصر کیا ہیں؟ اس کا جواب ان کے پاس نہیں ملتا۔

مہدی افادی نے "یادگار غالب" کے بارے میں لکھا تھا" ایک شریف انسان نے ایک شریف انسان کی ہلار سرگزشت لکھی ہے اور آشنائے فن ہو کر لکھی ہے۔

حالی کے بعد آزاد کا تبصرہ یادگار غالب سے پہلے آتا ہے۔ لیکن اہمیت کے اعتبار سے اس کا ذکر بعد میں ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے یوں تو مرزا کے کلام میں" معنی آفرینی اور نازک خیالی کی دو خصوصیات کی تلاش زیادہ اہم نہیں، پھر بھی آزاد کا یہ فیصلہ کہ غالب نے آتے ہی ایک چوب زور سے نقارے پر ماری کہ کچھ سمجھے اور کچھ نہ سمجھے۔ مگر سب کے منہ سے بے اختیار واہ نکل گئی گویا غالب کے دور کے مذاق سخن کی غمازی کرتا ہے۔ جب جدت طرازی کو قدامت نے شرف قبول نہ بخشا تھا۔ اور مرزا بانکپن اور بیدل پرستی طعن و تشنیع کا مورد بنی ہوئی تھی۔

بجنوری کا مطالعہ غالب دراصل اسی روحانی ہم آہنگی کی صدائے بازگشت ہے" تنقید غالب نہیں" غالب کی عظمت نے نئی نسل کا خراج عقیدت ہے۔ بجنوری کے نزدیک کلام غالب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ:

"وہ کونسا نغمہ ہے، جو ان تاروں میں خوابیدہ یا بیدار نہیں"!

ڈاکٹر عبداللطیف بھی دراصل غالب کو ایک مفکر کی حیثیت سے دریافت کرنے کی سعی کر رہے تھے۔ اور جب کچھ تو غزل کے آرٹ کی حد بندیوں کی بنا پر، کچھ غالب کے ذہنی ارتقاء کی مختلف اور پر پیچ منزلوں کی بناء پر اور کچھ واقعی مربوط فلسفہ، فکر کی عدم موجودگی کی وجہ سے انہیں اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی، تو انہوں نے اسے روحانی ہم آہنگی کی کمی سے تعبیر کیا۔

غالب میں اس فلسفیانہ یک جہتی کے عدم وجود کا جواز محمد اکرم نے" غالب نامہ" میں اس طرح پیش کیا:

ہر بڑا شاعر زندگی پر اثر ڈالتا ہے۔ اور انتہائی شاعرانہ عظمت کے معیار ہی میں انسانی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہے۔ لیکن اس اثر اندازی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ شاعر کسی معین فلسفہ زندگی یا پیغام کا حامل بھی ہو یہی نہیں بلکہ دنیائے شعر میں انتہائی عظمت اکثر انہی لوگوں نے حاصل کی ہے جنہوں نے انسانی عقائد اور زندگی کے فلسفوں کو تو نہیں چھوا۔ لیکن اپنے کلام میں تخیل کی تربیت اور نشوونما کا ایک ایسا سامان چھوڑ گئے۔ جس سے انسانی فطرت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ ایک پہلو پر زور تو وہ دے جیسے دوسرے پہلو نمایاں نظر نہ آتے ہوں "

اکرام نے غالب کے مطالعہ کے سلسلے میں تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اکرام کی رسائی غالب کے فکری تجزیئے تک نہیں ہوئی۔ آخر اس طرز نو اور طرفگی ادا۔ اس تنوع اور انسان دوستی کی بنیادیں کیا ہیں۔ اس سوال کا جواب اکرام کے پاس نہیں ہے۔

عہد جدید میں بھی غالب کا مطالعہ ہر مکتبہ تنقید کے سمجھنے والوں کے لئے دلکش موضوع رہا ہے ان میں فیض احمد فیض ہیں۔ جنہوں نے غالب کے کلام میں ایک واضح اور نمایاں وحدت کی تلاش کی اور اس بنیادی کیفیت یا موڈ کو اداسی کا نام دیا۔ یہ اداسی قنوطیت نہیں، بلکہ ان کے الفاظ میں کچھ ماضی کی یاد اور اس کے کھو جانے کا غم۔ کچھ حال کی بے کیفی اور ویرانی کا احساس اور کچھ مستقبل میں ماضی کے لوٹ آنے کی حسرت' ناامید اور ناامیدی سے مل جل کر تشکیل پاتی ہے اس اداسی کو فیض نے ایک فرد کی ذاتی کیفیت کے بجائے" ایک نسل ایک دور کی اجتماعی کیفیت قرار دیا ہے اور یہ دور چونکہ ہمارے ماحول اور ہماری یہ اجتماعی واردات سے بہت مختلف نہیں ہے لہذا غالب کا جادو آج بھی چلتا جا رہا ہے۔

ہمارے اپنے عہد کے نقادوں میں ڈاکٹر سید محمود اور قاضی عبدالغفار ہیں۔ جنہوں نے غالب کے جسم پر ایک انقلابی قبا آراستہ کر دی۔ اور غالب کے آرٹ کو محض آرٹ کی بجائے ایک ایسے وجدان سے تعبیر کیا جو "انہیں زندگی کے اس خارزار کی طرف لئے جا رہا تھا۔ جہاں ہر کانٹے کی نوک ہماری قومی زندگی کے خون سے رنگین تھی" اسی دور کے نقادوں میں محی الدین قادری زور' مجنوں گورکھپوری' کلیم الدین احمد' وقار عظیم' آل احمد سرور' احتشام حسین کے نام بھی آتے ہیں۔

احتشام حسین دراصل غالب کے کلام میں طرفگی مضامین اور جدت ادا کی مادی بنیادوں کی تلاش کرتے ہیں۔ ان کا استفہام یہ ہے کہ غالب کے کلام میں جس ندرت کا احساس حالی کے دور سے لے کر آج تک برابر کیا جا رہا ہے اس کے سماجی عوامل کیا تھے" جہاں وہ غالب کے ذہنی پس منظر اور اس دور کی فلسفیانہ روایت کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہاں اس جدید عنصر کو کم و بیش غالب کے کلکتہ کے سفر کا اثر قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ کلکتہ سرمایہ دارانہ تصورات کا منبع تھا۔ اور کلکتے کے باہر بنگال کے دوسرے علاقوں میں وہ عوامی طبقاتی کشمکش بھی بہت غیر واضح شکل میں شروع ہو چکی تھی۔ جو ڈاکوؤں، سنیاسیوں اور ٹھگوں کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔

سلگتے سا سفر کیا حقیقتاً غالب کی زندگی اور فن میں اس قدر عہد آفریں رہا ہے؟ کیا واقعی ان کے کلام میں طرفگی اور خیالات میں بانکپن سلگتے کی سرمایہ دارانہ تہذیب کے زیر اثر ہی آیا ہے؟ یہ سوالات اس وقت تک پوری طرح حل نہیں ہو سکتے جب تک غزلیات کی صحیح تاریخ تصنیف اور غالب کی فکر کے مختلف ادوار کا صحیح تعین نہ کیا جائے۔

آل احمد سرور نے صحت مند تشکیک کو غالب کا سرمایہ قرار دیا۔ یقیناً غالب صوفی نہ تھے۔ وہ فلسفی بھی نہ تھے۔ لیکن ان کے پاس ایک ایسے ہوشمند کا دل و دماغ ضرور تھا جو پرانے تصورات سے نہیں بہلتا۔ اور روایات کے آئینہ خانے میں گم ہو جانے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔ یہ صحت مند تشکیک کے بل بوتے پر کبھی بے دلی اور کبھی رندی و قلندری اور کبھی فلسفیانہ سپردگی کی مدد سے زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سیکھ لیتا ہے۔ لیکن آل احمد سرور بھی اس صحت مند تشکیک اور ذہنی رجحان کے اجزائے ترکیبی تک جانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ وہ سوال ہیں جن کے جوابات عصری تنقید نے نہیں دیئے ہیں۔ ان کے یہاں بھی تشنہ رہ جاتے ہیں۔

بہر حال غالب کی فکر کے نقش و نگار گلستان در گلستان تنقید کی نظروں کے سامنے جلوہ فروش ہوتے آئے ہیں شیفتہ اور حالی سے لے کر آج تک گو اس کے اسرار و رموز، اس کے دلنواز گوشے اور دلکش پہلو بے نقاب ہوتے رہتے ہیں۔ پھر بھی غالب کی فکر کا مکمل تصور ہنوز اپنے کولمبس کے انتظار میں ہے اور یہ عظیم دریافت اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک علوم متعلقہ کی مدد سے غالب کے عہد اور ان کے فن کے ارتقاء کا ایک مربوط خاکہ تیار نہ ہو جائے۔

کسی شاعر کے لئے یہ شرف معمولی نہیں ہے کہ اس نے عمرانی اور سیاسی انقلابات سے بے پرواہ ہو کر اپنی آواز سے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ اور اس درجہ متاثر کیا ہے کہ آج بھی ہر نوجوان کے لئے نشاط و الم، تنہائی اور سرمستی کی ہر منزل میں غالب مونس ہمراز اور جلیس کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ سچ مچ ان کے منہ پر یہ دعوے پھبتا ہے۔ ؎

و پیرم رندم ندیم شیوہ ہا دارم

اور ان کے تقریباً ہر نقاد نے کسی نہ کسی حیثیت سے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ؎

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

مرزا غالب ۸ رجب المرجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) کی رات آگرہ میں پیدا ہوئے۔ بحوالہ "احوال غالب" مختار الدین احمد صفحہ ۱۹۱ " مرزا غالب دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، دوشنبہ کا دن ہے۔ دوسری ذیقعدہ بارہ سو پچاسی ہجری اور پندرہویں فروری اٹھارہ سو انہتر عیسوی (تقویم کی رو سے دوشنبہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ہے تیسری ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ مگر جب وہ لوگ جو اس وقت دلی میں موجود تھے یک زبان ہیں کہ اس دوشنبے کو ذیقعدہ کی دوسری تھی۔ تو معلوم ہوا کہ دلی میں ذی قعدہ کا چاند ۱۳ فروری کو دیکھا گیا تھا ایسی صورت میں تقویم کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ ایک چیز

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر)

ڈاکٹر وشنو سروپ

زندگی کے نقاد ہندی شاعر عبدالرحیم خانخاناں

شاعروں کی ایک قسم ایسی ہے جو پڑھنے والے کے جذبات اور تصورات کو بہت زیادہ وسعت دیتی ہے اور ایک ایسی بھی ہے جو دنیاوی امور کی وضاحت کرتی اور دماغ پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن ان دونوں سے ہٹ کر ایک شاعری ایسی بھی ہے جس میں نہ تو جذبات ہی کو زیادہ دخل ہوتا ہے اور نہ پند و موعظت کا دفتر بن جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ دل و دماغ پر یکساں طور پر اثر کرتی ہے۔ زندگی کی اصل حقیقت گویا اس کی محنت و شعور نہیں ہے۔ اس میں سے وہ دانائی ہو سکتی ہے کہ گل کھلاتی ہے۔ رحیم کی شاعری ایسی ہی دانائی اور فراست کی شاعری ہے جس میں زندگی کی حقیقتوں کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایسی شاعری صرف وہی شاعر کر سکتا ہے جو زندگی کے موافق یا ناموافق حالات کا خود مستقل مزاجی سے مقابلہ کرتا رہا ہے، اس کا ضمیر خود حالات کیسے ہی ہوں ان کا جائزہ لیتا ہو۔ ان سے ہمیشہ بلند و برتر رہتا ہے۔

رحیم کو ان حالات سے گذرنے کا موقع ملا تھا اس نے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے کبھی تو اس نے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات حاصل کئے اور شاہی مقرب بنا اور کبھی انتہائی مصائب و آلام کا شکار رہا۔ ایک وقت تو مغلیہ سلطنت کا وکیل مطلق رہا اور کبھی قیدی کی زندگی بسر کی۔ ایک وقت تو بڑی بڑی فوجوں کو ہرا کر وسیع و عریض صوبوں پر اقتدار قایم کیا اور حکومت کی اور کبھی تو اس کو اپنی ہی فوج کے ہاتھوں پریشان ہو کر بھاگتے پھرنا پڑا۔ اکبر نے تو اس کو اپنا بیٹا سمجھا اور اس کی قدر افزائی کی اور جہانگیر نے اس کو ہمیشہ نظر انداز ہی نہیں بلکہ مخالفت کرتا رہا۔

زندگی کے ان مختلف اور متضاد تجربات کے نتیجہ کو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں ذہانت اور فطانت کی وجہ سے اس نے اپنے شعر میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ اپنے تجربات کو شعر میں اس انداز میں ڈھالا کہ ان میں کوئی تصنع اور بناوٹ نظر نہیں آتی بلکہ حقیقت کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ محض خیالی نہیں ہے ان کا تصوراتی دنیا سے لگاؤ نہیں بلکہ وہ رحیم کے پاس بالکل عملی شکل میں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں زندگی گذارنے کے لئے پوری طور پر سچائی کا اظہار ممکن نہیں ہو سکتا لیکن آخرت کے لئے یہ سچائی اتنی ہی ضروری ہے۔ ہر ذی ہوش انسان اس کشمکش میں ہمیشہ مبتلا رہتا ہے کہ کونسی راہ اختیار کرے۔ وہ کہتے ہیں۔

اب رحیم مشکل پڑی گاڑھے دوؤ کام ۔ سانچے سے تو جگ نہیں جھوٹے ملیں نہ رام

عام طور پر سنت رشی اور بزرگان دین آخرت کا خیال ذہن میں رکھ کر سچائی کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ دنیاوی اعتبار سے دیکھا جائے تو جھوٹ سے مفر بھی نظر نہیں آتا۔ اس کو تسلیم کر لینا ہی عقلمندی ہے۔ رحیم چونکہ جنگ و جدال اور سیاسی داؤ پیچ میں

ہمیشہ الجھے ہوئے رہے اس لئے ممکن ہے کہ یہ تصور انہوں نے وہیں سے حاصل کیا ۔

زندگی کی کچھ قدریں ایسی بھی ہیں جنھیں کسی قیمت پر بھی قربان نہیں کیا جاسکتا ۔ وہ ابتدا ہی سے زندگی کی اصل ہوتی ہیں ۔ ورنہ زندگی بے حقیقت ہو کر رہ جائیگی ان قدروں کے تحفظ کے لئے اپنا سب کچھ لٹایا جاسکتا ہے بلکہ زندگی کو بھی قربان کر دیا جاسکتا ہے ۔ رحیم خودداری کو یہی مقام عطا کرتے ہیں ۔ خودداری کو ٹھیس پہنچانے سے بہتر یہ ہے کہ انسان موت کو قبول کرے یہ دانائی کی بات ہوگی ۔

رحمن ہیں نہ سہائے' امی پیاوے مان بنو   برورش دئے بلائے' مان سہت مرن بھلو

رحمن تب لگ ٹھہرے دان مان تن مان   گھٹت مان دیکھئے جب ہی' ترت ہی کرئے پیان

تدبیر اور تقدیر پر ہمیشہ بحث ہوتی رہی ہے اور ان میں کون قوی ہے اس پر غور کیا جاتا رہا ہے ۔ زندگی کی حقیقت سے ناواقف شخص ہی صرف تدبیر کی حمایت کرسکتا ہے ۔ رحیم تقدیر کے قائل ہیں لیکن تدبیر سے گریز کرتے یعنی تقدیر پر بھروسہ کرکے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی تائید میں بھی نہیں ہیں ۔ دونوں کے بارے میں ان کی رائے بہت متوازن ہے وہ کہتے ہیں ۔

بنج کر کر با رحیم کہی' سدھی بھاوی کے ہاتھ   پانسے اپنے ہاتھ میں' داوں نہ اپنے ہاتھ

تاریخ انسانی کا مطالعہ بھی تقدیر ہی کو طاقتور مانتا ہے ۔ راماین اور مہابھارت کی مثالیں لے کر بھی انہوں نے بطور شہادت تقدیر کو زبردست ٹھہرایا ہے حالات نے بھی ان کو تقدیر کا قائل بنا دیا تھا

رام نہ جاتے ہرن سنگ سیبہ نہ راون ساتھ   جو رحیم بھاوی کتہوں' ہوت آپنے ہاتھ

جو برش آرت سے کتہوں سینچی ملتی رحیم   پیٹ لاگی بیراٹ گھر تپت رسوئی بھیم

اگر انسانی تدبیر   کیلئے راجہ وراٹ کے گھر کھانا پکانے کی زحمت

تقدیر کی طاقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ زندگی ناپائدار اور موت ناگزیر اور اٹل ہے اس کے مقابلے میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ثابت ہوسکتی ۔ انسان اپنی قوت ارادی کی ایک حد رکھتا ہے اور یہ بات خود جذبہ پیدا کرنے والی ہے رحیم نے اس جذبہ کو جہاں ظاہر کیا ہے وہ ہمیں بہت زیادہ گہرائی کے ساتھ ملتا ہے ۔

سدا نقارہ کوچ کا باجت آٹھوں جام   رحیم یا جگ آئی کے کو کری سکا مقام

اس جذبہ کے متعلق اگر ہم غور کرتے رہیں تو دماغ (ذہن) پر ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو دولت اور آرام میں انسان کو مغرور نہیں بناتی اور مصائب اور آلام سے بھری ہوئی زندگی گذارنے ۔۔ مایوس نہیں کرتی ۔ اسی لئے حد سے زیادہ سخی رحیم سے سوال کیا جاتا ہے ۔

سیکھے کہاں نواب جو ایسی دینی دین

جوں جوں کر اونچے کروتیوں تیوں نیچے نین

تو اس کا جواب انہیں اس دوہے میں ملتا ہے جس سے ان کی عاجزی وانکساری بے غرضی اور کسر نفسی کا اظہار ہوتا ہے ۔

[illegible]

جمالؔ کرنولی

"طلبا میں بے ضابطگی و بد نظمی"

آج کل اخبارات میں جلی حرفوں اور عنوانات کے تحت یہ خبریں پڑھنے میں آرہی ہیں کہ کس طرح طلبا میں بے ضابطگی کا مسئلہ روز بہ روز زور پکڑتا جارہا ہے یہ دیکھ کر اور بھی حیرت ہوتی ہے کہ حال ہی میں دہلی یونیورسٹی کے لا کالج کے طلباء نے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ دیگر یونیورسٹیوں کے طلباء سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہیں۔ طلباء کا ہڑتال کرنا پولیس سے ٹکر لینا۔ عوام اور حکومت کو نقصان پہنچانا قانون کی خلاف ورزی کرنا اور اسی قسم کی دیگر حرکات ایسے وقت میں جبکہ ملک انتصادی بحران سے گزر رہا ہے۔ قوم کے لئے تباہ کن ہیں۔ طلباء میں بدنظمی اور بے ضابطگی ایک وبا کی طرح ملک کے اس کونے سے اس کونے تک پھیلتی جارہی ہے۔ اگر اس کا علاج بروقت نہ کیا جائے تو یہ وبا ایک مہلک مرض ثابت ہوگی۔ انگریزی میں ایک ضرب المثل ہے کہ لوہے پر ضرب اس وقت لگاؤ جبکہ وہ گرم ہوکر تپ گیا ہو۔ اس کی روشنی میں ہمارے ماہرین تعلیم اور سیاستدانوں کا فرض ہے کہ وہ اس مسئلہ سے متعلق وجوہات دریافت کریں اور کوئی مفید حل تلاش کریں۔

آج سے دو سال پہلے بیکانیر میڈیکل کالج کی فضا اسی بے ضابطگی کی وجہ سے مکدر ہوگئی تھی۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے طلباء اپنے وائس چانسلر کے خلاف بغاوت کر بیٹھے۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اس معاملہ میں اپنے دور کے طلباء سے دو قدم آگے ہیں۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے طلبا کب خاموش بیٹھنے والے تھے۔ انہیں بھی دیکھنا تھا کہ وہ علی گڑھ کے طلبا سے آگے نہ سہی پیچھے بھی نہیں ہیں کہ ان کے طلباء کو "غذائی مسئلہ" کی تحریک میں حصہ لیکر یہ بتانا مقصود تھا کہ انہیں کے علاوہ سیاسی تحریک میں بھی حصہ لینا آتا ہے۔ مدراس یونیورسٹی کے طلباء نے "ہندی" کے خلاف مہم چلائی اور اس سے جو مالی اور جانی نقصان ہوا اس کی تلافی ہو ہی نہیں سکتی۔ اڑیسہ میں انجینیرنگ کالج کے طلباء نے تین ہفتہ ہڑتال کی اسکی وجہ سے حکومت نے ان کے وظیفوں میں اضافہ کر دیا۔ بنگال کے طلباء امتحان دینے سے اس لئے انکار کر بیٹھے کہ امتحانات کے پرچے مشکل تھے۔

ورنگل کالج کے طلباء نے حال ہی میں تقریباً چھ ہفتہ ہڑتال کی۔ اس سے صرف ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ انہیں بھی انتظامی معاملات میں دخل دینے کا حق دیا جائے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا اور پڑھا کہ کس طرح عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء نے نئے وائس چانسلر کے تقرر کے خلاف اپنی آواز بلند کر کے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ وجے واڑہ اور گنٹور کے طلباء نے اسٹیل پلانٹ کے لئے جو مالی اور جانی نقصان پہنچایا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ حال ہی میں مدراس کے طلباء اور ٹرانسپورٹ ورکرس میں

جو دبعطر ہوئی اس کا سبب بالکل معمولی تھا۔ غرضکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر طلباء میں اشتعال پیدا ہونا روزمرہ میں شامل ہو چکا ہے۔

آج کے طالب علم کی ذہنیت بدل چکی ہے۔ آج سے دس یا پندرہ سال پہلے جو اخلاقی قدریں تھیں وہ ٹوٹتی جا رہی ہیں۔ آج کے طالب علم نے زندگی کو "زندہ دلی" کا نام دیکر محنت سے کنارہ کشی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ بعض طلباء نے زندگی کے تلخ حقائق سے گھبرا کر فرار اور گریز کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ڈاکٹر ایچ۔ ڈی۔ باداں گجرات یونیورسٹی کے علم نفسیات کے پروفیسر نے حال ہی میں 1744 طلباء کا انٹرویو لیا جن میں 380 لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ اکثر طلباء جن کا انہوں نے انٹرویو لیا ہے یہ دکھایا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے بیزار تھے۔ ان میں سے چند خودکشی کے لئے بھی تیار تھے۔

تعلیم اور سماج:- طالب علم سماج کا ایک فرد ہے۔ ماحول کا اس پر اثر پڑنا لازمی بات ہے۔ اس کے اردگرد جو کچھ ہوتا ہے اس سے وہ متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ آزادی سے پہلے "انقلاب زندہ باد" کے جو نعرے لگائے گئے تھے وہ آج بھی اس کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ وہ ان نعروں کا غیر شعوری طور پر دلدادہ ہو گیا ہے۔ پھر آزادی کے بعد اس کی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ میں کیا ہو رہا ہے اور کیسے ہو رہا ہے۔ قوم کے رہنماؤں کا آپس میں کیا سلوک ہو رہا ہے۔ کس طرح یہ باعزت لوگ اخلاقی حدود کو پھلانگ کر بڑی تیزی سے اور بے خطر آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہی نہیں وہ اس حقیقت حال سے بھی آگاہ ہیں کہ سماج کا وہ طبقہ کے **با اثر افراد** ...... کس طرح دن کے "اجالے" میں کالے بازار" کا دھندا چلا کر بھی "کالا پانی" جانے سے بال بال بچ جاتے ہیں .... اس راز سے بھی واقف ہیں کہ کس طرح دفتر کی چار دیواری میں رشوت خوری کو "معمول" اور "تحفوں" کے مہذب الفاظ کے غلافوں سے ڈھانپا جاتا ہے۔ غرض کہ زندگی کے ہر موڑ پر خود غرضی کا ناگ اپنا پھن پھیلائے ڈسنے کو چلا آ رہا ہے تو ہمارے صرف طلباء ہی کو کیا پڑی ہے کہ وہ بے غرضی کے ماحول کا انجکشن لیکر بے ہوشی کے عالم میں پڑے رہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ بھی بہت سے موقعوں پر اس بات کا ثبوت دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بھی اس سوسائٹی کے افراد میں سے ہیں جن کے پاس ہر ناجائز چیز جائز، ہر غیر قانونی حرکت قانونی اور ہر بے عملی باعملی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

تعلیم اور سیاست ہر "اسکول ڈے" یا "کالج ڈے" کی صدارت کے لئے کسی سیاسی لیڈر کو مدعو کیا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے اکثر موقعوں پر بھی وزراء یا سیاسی رہنماؤں کو مدعو کیا جاتا ہے

اس طرح کسی مدرسہ یا کالج کا سنگ بنیاد رکھنے یا دیگر تقاریب میں بھی سیاسی رہبروں کے بغیر کام نہیں چل رہا ہے۔ سیاست کو غیر ضروری طور پر تعلیمی میدان میں اہمیت دینے کے باعث سیاسی لیڈر اپنا الو سیدھا کرنے کی غرض سے تعلیمی روزمرہ معاملات میں بھی دخل اندازی شروع کر چکے ہیں۔ یہی سیاسی رہنما اپنے کسی خاص مقصد کے تحت طلباء میں کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر قانون کی خلاف ورزی کے خطرناک جراثیم پھیلا دیتے ہیں۔ طلباء جو اکثر سادہ لوح ہوتے ہیں دور رس نتائج کا خیال کئے بغیر تنگ نظر سیاسی چالوں میں پھنس جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انہیں سیاسی چالوں کی

کی وجہ موجودہ طریقہ تعلیم میں بھی آئے دن تبدیلیاں دیکھنے میں آرہی ہیں۔ اساتذہ کے تقررات اور تبادلے بھی بہت حد تک سیاسی اثرات کے حامل نظر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اساتذہ کو بھی کسی نہ کسی سیاسی مدرسہ فکر سے کبھی کھلے طور پر اور کبھی ادھ کھلے طور پر وابستہ ہوجانا ہی پڑتا ہے۔

طلباء اور اساتذہ :- اس دور کے بہت سارے اساتذہ ریڈیو' گراموفون' یا ٹیلی ویژن کے مانند محض ضابطہ کی پابندی کا خیال کرتے ہوئے میکانیکی طور پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان میں وہ دکھ' درد' تڑپ اور لگن موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ طلباء کو ایک بہترین شہری بنا سکے۔ آج کے طالب علم اور مدرسین میں برائے نام ایک قانونی رشتہ کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ ایک وہ دور بھی تھا جب سر رادھا کرشن (سابق صدر جمہوریہ) میسور یونیورسٹی چھوڑ کر جا رہے تھے تو طلباء انہیں ایک دیوتا سمان ایک سجی سجائی گاڑی میں بٹھا کر اس گاڑی کو یونیورسٹی کے احاطے سے ریلوے اسٹیشن تک خود کھینچتے ہوئے لائے۔ جب ریل چھوٹنے کا وقت قریب آیا تو دیکھا گیا کہ طلباء کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔

یہ تھی طلباء کے دل میں اساتذہ کی کشش اور محبت۔ اس قسم کی اور بہت سی مثالوں میں سے ڈاکٹر ذاکر حسین (موجودہ صدر جمہوریہ)' سر کشمن سوامی مودلیار' اور سر سی' پی' آئنگار کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

لیکن اس قسم کے اساتذہ کی موجودہ دور میں کمی پائی جاتی ہے' جن میں جاذب نظر شخصیت اور کمالات پائے جاتے ہوں۔ آج کل اساتذہ طالب علم کی شخصیت کو ابھارنے' سنوارنے اور اس میں ہمہ قسم کی خوبیاں پیدا کرنے سے قاصر ہیں اس کے کئی ایک اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک سبب یہ ہے کہ قابل اساتذہ کی کمی ہے اور دوسرا سبب اساتذہ اور طلباء کا تناسب بہت بڑھ گیا ہے۔ جس کی وجہ طلباء پر انفرادی توجہ جیسی کہ چاہیئے نہیں دی جارہی ہے۔

ہاسٹل اور دیگر سہولتیں :- آزادی کے بعد سے مدرسوں اور کالجوں کی تعداد میں جہاں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے' وہاں ان اداروں میں جو سہولتیں ہونی چاہئیے وہ خاطر خواہ مہیا نہ ہوسکیں اکثر مدارس میں جگہ کی تنگی اور ساز و سامان کی کمی کی شکایت باقی ہے۔ بعض کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلباء کی رہائش کا اچھا بندوبست بھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بہتر غذا' کھیل کود کا بہتر انتظام اور سیر و تفریح کی اچھی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ طلباء کی صحت پر اس کا گہرا اثر پڑ رہا ہے۔

یہ بات بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ اساتذہ کے لئے بھی یونیورسٹی کے احاطے میں رہائشی مکانات نہ ہونے کے باعث اساتذہ طلباء سے کوئی خاص ربط پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں پھر ٹیٹوریل طریقہ بھی کوئی اچھے پیمانے پر نہیں چل رہا ہے جس سے کوئی خاص فائیدہ ہو۔ حال ہی میں روس کے ایک ماہر تعلیم نے حیدرآباد کا دورہ کیا۔ اس نے یہ بات بتائی کہ ہندوستان کی بہ نسبت روس کی تعلیمی درسگاہوں میں عام طور پر چھٹیاں بہت کم ہوتی ہیں۔ امریکہ کے ایک ماہر تعلیم نے بتایا کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم بہت قدیم ہوچکا ہے۔ اب اس میں موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے۔

فالتو وقت اور مفید کام:- یہ بات مشہور ہے کہ انسان کے دماغ میں شیطان بستا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ انسان کو کسی حالت میں بھی بیکار وقت گذارنا نہیں چاہئے۔ یورپ کے مدارس میں طلباء کے فالتو وقت کو مفید کاموں میں صرف کرنے کی بہت ساری سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ اساتذہ خود اپنا فالتو وقت مفید بنانے کے لئے بڑی جماعتوں میں نئے پارٹ ٹائم کورس یا ریسرچ لیباریٹریوں میں داخلہ لیکر اپنی تعلیمی فنی استعداد کو بڑھانے کی سعی کرتے ہیں۔ اس طرح "پڑھو اور پڑھاؤ" کی اسکیم کو آگے بڑھانے میں مددگار و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے سوا طلباء بھی اپنے فالتو وقت کو برباد کرنے کی بجائے ان مفید کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ خود بھی مشغول رہتے ہیں بلکہ ایک حد تک اپنے اخراجات کی کفالت کرنے میں بھی کامیاب رہتے ہیں۔ بعض طلباء ٹیوشن کرکے روپیہ کماتے ہیں۔ بعض طلباء اخبار و رسائل فروخت کرتے ہیں۔ بعض طلباء پارٹ ٹائم ملازمت اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح اپنے فالتو وقت کو کارآمد اور مفید بناتے ہیں۔ جس سے قومی آمدنی اور معیار زندگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ طریقے ہندوستان میں بھی رائج کئے جاسکتے ہیں تاکہ ہم بھی ان مقاصد میں کامیابی حاصل کرسکیں جن سے انسانی توانائیوں کو بروئے کار لاکر لوگوں کے معیار زندگی کو بہتر بنایا جاسکے۔

ملازمتوں کی ضمانت طلباء کے دماغوں میں ہمیشہ یہ سوال بار بار اٹھتا ہے کہ آیا انہیں ملازمت ملے گی بھی یا نہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ باوجود بہت سی نئی اسکیموں اور پلانوں کے آج ملک میں بہت سے انجینیر اور دیگر تعلیم یافتہ نوجوان بے روزگار ہیں۔ ایک دفعہ انجینیرنگ کالج کے تمام طلباء تقسیم اسناد کے موقع پر جلسہ گاہ سے اٹھ کر چلے گئے۔ ان کی یہ شکایت تھی کہ حکومت کی جانب سے انہیں ملازمتوں کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی۔ حکومت کے بہت سارے فریضوں میں سے یہ بھی ایک فریضہ ہے کہ وہ تمام پڑھے لکھے لوگوں کو کوئی نہ کوئی معقول ملازمت فراہم کرے خواہ وہ سرکاری ہو یا نیم سرکاری یا غیر سرکاری۔ اگر کسی سبب سے کسی کو کوئی کام نہ مل سکا اور وہ بے روزگار ہے تو اس کو ایمپلائمنٹ ایکسچینج یا انشورنس کے ذریعہ معقول رقم بطور الاونس کے ملنی چاہئے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ حکومت ملک کے ہر فرد کو اس کی تعلیمی اور فنی قابلیت کے لحاظ سے کوئی نہ کوئی کام دلانے کی ضمانت دے تاکہ وہ سوسائٹی میں آرام و سکون کی زندگی بسر کرسکے۔

اس کے لئے حکومت کو چاہئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیہی کالج اور جونیر ٹیکنیکل کالج کھولے۔ گھریلو چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فنی تربیت اور معلومات فراہم کرے۔ ہر ضلع کی سطح پر صنعتی تعلیم کے رہنما مراکز قائم کئے جائیں تاکہ طلباء کی ذہنی قابلیت دلچسپی اور جسمانی قوت کا اندازہ کرتے ہوئے مخصوص کورس حاصل کرنے کا صلاح و مشورہ دے سکے۔ اس طرح کی سہولت نہ ہونے کی وجہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر طلباء ایسے کورس یا سبجکٹ چن لیتے ہیں جن میں انہیں کسی بات کی دلچسپی ہی نہیں ہوتی۔

اخلاقی تعلیم ہندوستان ایک سکولر اسٹیٹ ہونے کی وجہ یہاں کے مدرسوں اور کالجوں میں مذہبی تعلیم دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اخلاقی تعلیم ضرور دی جاسکتی ہے۔ ہر مذہب کے بہترین اخلاقی اصول تاریخی واقعات اور

پیش کئے جائیں کہ طلباء میں برادری اُخوت پیدا ہو اور ایک دوسرے کے رسم و رواج عقائد وغیرہ کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوجائے۔ ایسا کرنے سے بہت سارے شکوک رفع ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مذہبی تقاریب میں ایک دوسرے کی شرکت طلباء میں وسعت قلبی پیدا کرنے میں ممد ثابت ہوگی۔ اس کے علاوہ تاریخ کی ایسی کتابوں کو جو تعصب کی بنیاد پر لکھے گئے ہوں ان کا پڑھنا اور پڑھانا ممنوع قرار دیا جائے۔ کسی ایک صوبے کے طلباء کو دیگر صوبوں میں پڑھنے اور ملازمتوں کی بہت ساری سہولتیں بھی طلباء میں بدنظمی کو دور کرنے میں مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔

طلباء میں جو ذہنی انتشار پھیلا ہوا ہے انہیں روکا جاسکتا ہے۔ البتہ اس کے لئے سیاسی دیوتاؤں اور تعلیمی رہنماؤں کو چاہئے کہ وہ اس مسئلہ پر اہم اور ٹھوس اقدامات کریں طلباء کے والدین بھی اس اہم مسئلہ سے غافل ہو نہیں سکتے ان پر بھی کئی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ انہیں بھی کھل کر اس پر بحث کرنی چاہئے اور ٹھوس تجاویز پیش کرنا چاہئے۔

▲ بقیہ سلسلہ صفحہ ۲۲ سے آگے ؎ جب آنکھ سے دیکھا ہی تو تخمین کا کیا دخل) چنانچہ سن ہجری کی رو سے ۲ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ (مطابق ۲۲ فروری ۱۹۶۶ء) کو سنہ سال بیت گئے ان سو سالوں میں غالب کو سارے جہاں نے پہچانا۔ اور کلام ابھی تک سمجھا جا رہا ہے۔ ان کی شاعری اب بھی جواں ہے ہر دم جواں رہے گی۔ ہر ایک شاعر غالب سے متاثر نظر آتا ہے اور غالب اب بھی سب پر غالب نظر آتے ہیں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

▲ ▲ بقیہ سلسلہ صفحہ ۲۱ سے :- دین ہار کو ؤ اور ہے بھیکھ سو (دہی) دن دین ؛ لوگ بھرم ہم پے دھریں یاتے نیچے نین کیونکہ ؎ بڑے بڑائی نا کہیں ' بڑہ نا بولیں بول رحیمن ہیر (ہیرا) اک کہے لاکھ ٹکا مورو مول

زندگی کے تجربات سے جو دانائی حاصل ہوتی ہے اس سے ایک طرف تو اس طرح کی پاکیزہ اور لطیف زندگی کے نظریے ملتے ہیں اور دوسری طرف زندگی سے بے نیازی اور استغنا کا انداز نظر آتا ہے۔

چاہ گئی چینتا مٹی منوآ بے پرواہ جن کو کچھو نہ چاہئے وے ساہن کے ساتھ

زندگی ایک سمندر ہے۔ اس سمندر کے کنارے بیٹھنے والا یا اس کی لہروں سے سطحی طور پر کھیلنے والا یا تیر کی طرح ڈوب جانے والا اس سے کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ صرف وہی شخص زندگی سے کچھ حاصل کرسکے گا جو اپنے میں کچھ جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

رحیمن نیر (پانی) پکھان (پتھر) بوڑے پے سیجھے نہیں جیسے مورکھ گیان بوجھے پے سوجھے انہیں

رحیم میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔

اندرجیت دت

معاوضہ

"فرمایئے! ناچیز کیا خدمت کر سکتا ہے آپ کی؟"

بل کی ادائیگی کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالنے پر جب مجھے بٹوہ غائب ہونے کا علم ہوا تو گھبراہٹ سے میرا برا حال تھا۔ اب مجھے یاد آ رہا تھا کہ ہوٹل میں داخل ہوتے ہی کوئی اسمگلنگ میں مجھ سے ٹکرا گیا تھا اور میرے پیچھے آتے ہوئے ایک نوجوان نے ٹکرانے والے سے الجھ کر حاضرین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتے ہوئے مجھے اپنی خفت چھپانے کا پورا موقع دے دیا تھا۔ اب وہی نوجوان میرے قریب آکر زیر لب مسکراتے ہوئے کسی خدمت کے لئے پوچھ رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اسے دخل در معقولات کا موزوں جواب دیتا۔ لیکن اس وقت وہ مجھے ایک فرشتۂ رحمت سے کچھ کم دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے اپنا بٹوا کھو جانے کے بارے میں کچھ کہہ پاتا۔ اس نے اپنی جیب سے اپنا بٹوا نکال کر بل ادا کر دیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ باہر آکر اس نے مجھے ایک خوبصورت کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور گاڑی اسٹارٹ کرکے پوچھا۔

"ہاں تو انکل! آپ سیدھے اپنے بنگلے پر جانا چاہتے ہیں یا اس غریب کے جھونپڑے پر قدم رنجہ فرما کر عزت افزائی کا شرف بخشیں گے؟"

"کون انکل اور کیسا بھتیجا۔"؟

مجھے سوالیہ نظروں سے گھورتے ہوئے پا کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور پھر بولا۔

"میرا نام بھارتی ہے۔ میں آپ کے جگری دوست مسٹر بکرم کا بھانجہ ہوں۔ اس لئے آپ کا بھی بھانجہ ٹھہرا۔ آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو کئی بار ان کے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔"

بکرم واقعی میرا گہرا دوست ہے۔ اس نے ایک آدھ بار بھارتی کا ذکر بھی کیا تھا۔ لیکن جن الفاظ میں اس نے یہ ذکر کیا تھا وہ اس کی موجودہ شخصیت کے عین برعکس تھے۔ اور ان پر یقین کر لینے کے بعد مجھے بھارتی کے اس رویہ پر اور بھی حیرانی ہو رہی تھی۔ بکرم نے مجھے بتایا تھا کہ بھارتی بچپن کے کئی سال اس کے پاس گزار چکا ہے اور آج کل خفیہ محکمے میں ایک مانا ہوا جاسوس ہے۔ اس نے اسے اس عہدے تک پہنچانے میں ازحد محنت کی ہے لیکن بھارتی احسان فراموش ثابت ہوا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ گاہے گاہے سامنا ہو جانے پر اسے نقصان پہنچانے اور بے عزت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ میں سوچ میں ڈوبا ہوا پا کر بھارتی نے مجھے ٹھوکا دیا اور جیب سے ایک بٹوہ نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

"جب آپ گیلارڈ میں داخل ہو رہے تھے تو اتفاق سے میں آپ کے پیچھے تھا۔ اس گرہ کٹ کے آپ سے ٹکرانے کے انداز سے مجھے اس کے مقصد کا علم ہو چکا تھا۔ اسی لئے میں جان بوجھ کر اس سے ٹکرا گیا تھا۔ یعنی آپ کا بٹوا اس کی جیب میں جاتے ہی میری جیب میں آ چکا تھا۔ میں اپنی میز پر بیٹھا اس لمحے کے انتظار میں تھا۔ جب آپ کو بٹوے کی ضرورت محسوس ہو اور بٹوا غائب پا کے آپ مجھے خدمت کا موقع دے سکیں۔"

میرا سر بھارتی کے اس کردار اور احسان پر عقیدت کے جذبات سے جھکتا جا رہا تھا۔ اب میرے ذہن میں یہ خیال بار بار چکر لگا رہا تھا کہ بکرم نے کس مصلحت کے زیر اثر آج تک بھارتی کو مجھ سے متعارف نہ ہونے دیا تھا۔ آخر میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے کہا۔

" میرے عزیز! بٹوے سے بڑھ کر مجھے تم جیسے فرض شناس اور سعادت مند انسان سے ملنے کی خوشی ہے۔ تمہارا یہ احسان مجھے تا عمر یاد رہے گا۔"

" بس بس رہنے دیجئے انکل! میں اتنا شریف نہیں ہوں جتنا کہ آپ سمجھ بیٹھے ہیں۔ آپ سے میرا ذکر ماموں جان نے جن الفاظ میں کیا ہوگا وہ لفظاً لفظاً صحیح اور سچ ہیں۔"

" اسی لئے تو میں تذبذب میں ہوں کہ بکرم نے آج تک مجھے تمہارے بارے میں اندھیرے میں کیوں رکھا؟"

" کیا انہوں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ بھارتی ایک نامی چور تھا اور اب بھی ہے۔"

" لیکن اس سے آگے اور کچھ نہ بتا کر وہ میرے دل میں اپنے لئے غلط فہمی پیدا کرنے کے ماسوا تمہارے بارے میں کوئی پختہ رائے قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

" اچھا تو یہ بات ہے۔ کیا آپ نے کبھی ان سے تفصیل سے بتانے کی فرمائش نہیں کی؟"

" یہ میرا ذاتی معاملہ ہے"۔ کہہ کر وہ ہر بار مجھے خاموش کر دیتا ہے۔"

اب کار ایک وسیع لان کے گرد چکر کاٹتی ہوئی ایک خوبصورت بنگلے کے پورٹیکو کے نیچے آ کر رک گئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی ایک نوجوان خوبصورت لڑکی نے نمستے کہی تو بھارتی نے اپنی بیوی شانتا کا تعارف کروایا۔ پھر اس کے تینوں بچے کمل، نیجے اور انیتا کمرے میں آ کر اپنے ڈیڈی سے لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر کھلواڑ کرنے کا موقع دے کر شانتا انہیں دوسرے کمرے میں لے گئی تو ہمیں تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقع ملا۔

"کہئے انکل! پسند آیا آپ کو غریب کا جھونپڑا؟"

"اسے اگر جھونپڑا کہا جائے تو پھر محل کس وضع کا ہونا چاہیئے۔؟"

" محل تو اسے ہی کہا جا سکتا ہے جس میں آپ یا ماموں جیسے بڑے لوگ رہتے ہیں۔"

" ہاں تو تم بکرم کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے۔"

"میری کیا مجال جو میں ان کی شان میں کوئی گستاخی کرسکوں۔ البتہ بھارتی کے بارے میں جو بھی آپ سننا چاہیں گے مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔"

"چلو بکرم کے بارے میں نہ سہی۔ تم اپنے ہی بارے میں کچھ بتاؤ۔ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں آجائیگا۔"

"جب میری ماں مجھے ان کے سپرد کرکے گئی تو میں پندرہ سال کا تھا۔ میری پیدائش پونہ کی ہے۔ میرے ڈیڈی چکلالہ ورکشاپ میں سپروائیزر تھے اور پاکستان بننے پر انہیں پونہ میں کمانڈ ورکشاپ میں جگہ دی گئی تھی۔

میرا نام بھارتی رکھا گیا۔ وہ مجھے از حد پیار کرتے تھے۔ لیکن زیادہ مصروف رہنے کی وجہ سے انہیں ہماری دیکھ بھال کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ ماں کے لاڈ و پیار نے مجھے بگاڑنے میں کافی مدد دی۔ اسکول میں برے لڑکوں کی صحبت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور میں چھوٹی موٹی چوریاں کرنا سیکھ گیا۔ آٹھویں جماعت میں فیل ہوجانے پر جب میں نے پڑھنے سے صاف انکار کردیا تو مجھے ہنرمند بنانے کی غرض سے مجھے ایک ورکشاپ میں داخل کروادیا گیا۔ بری صحبت وہاں بھی میرے خیر مقدم کے لئے موجود تھی اور میں اب پوری آوارگی کی راہ پر چل نکلا۔ ورکشاپ سے پرزے چرا کر بازار میں بیچتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر والدین پر میری خصلت کا راز پہلی بار ظاہر ہوا تو مجھے راہ راست پر لانے کی سرتوڑ کوشش شروع ہوئی۔ بڑے بھائی نے مار کٹائی کرانیا یا تو ماں نے نصیحت اور طعنہ زنی کا سہارا لیا۔ ماں کو میری حرکتوں اور اڑوس پڑوس کی عورتوں کی باتوں سے تنگ آکر اپنی چھاتی پیٹنے کے سوا کچھ آتا ہی نہ تھا۔"

"پھر سکھلائی کا بندوبست ایک اور ورکشاپ میں کیا گیا۔ جہاں پر میری کڑی نگرانی بھی کی جاتی تھی۔ لیکن چوری اور آوارہ گردی کی لت میری نس نس میں گھر کرچکی تھی۔ میں موقع ملتے ہی من مانی کرلیتا۔ ان ہی دنوں ہمارے محلے میں واقع ایک کارخانے میں چوری ہوگئی۔ حالانکہ اس چوری سے مجھے دور کا واسطہ بھی نہ تھا پھر بھی محلے کے چند شرارتی لوگوں کے اکسانے پر پولیس شک میں میرا پیچھا کرنے لگی اب مجھے پونہ سے دور بھیجنے کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھ کر ماں مجھے دہلی میں مقیم اپنے بھائی بکرم کے سپرد کرنے لے آئی۔"

"اور بکرم نے اپنی بہن کی محبت سے مجبور ہوکر تمہیں پناہ دینا منظور کرلیا"۔ میں نے بھارتی کی سرگزشت میں گہری دلچسپی لینے کے ثبوت میں کہا۔

"ہاں انکل آپ کا اندازہ کسی حد تک درست ہے۔ شاید وہ انکار کردیتے لیکن جب میری نانی کی آنکھ بند ہوئی تو وہ چھ برس کے تھے۔ میری ماں نے ہی انہیں اپنے بچے کی طرح پالا اور پوسا تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھ جیسے بچے کو راہ راست پر لانا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہوگا۔ یہ ذمہ داری قبول کرلی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بھی بچپن میں آفت کے پرکالے رہ چکے تھے۔ کوئی دھندہ ان سے چھوٹا نہ تھا۔ لیکن انہیں اپنی کم مائیگی کا بروقت احساس ہوگیا تھا اس لئے وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہونے میں کامیاب رہے تھے۔"

اب میں ان کے ایک دوست کی ورکشاپ میں ملازم تھا' جہاں میری کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ رات کو ماموں کے گھر پہ مجھے پڑھاتے تھے۔ چند ماہ بخیریت گزرنے پر وہ دل ہی دل میں خوش ہو ہی رہے تھے کہ اچانک ایک دن ان کے دوست نے ٹیلیفون پر جلد ورکشاپ آنے کو کہا۔ معاملہ یہ تھا کہ میں دو تین اور لڑکوں کی شراکت سے کافی سامان چرا کر [illegible] یہ

کی بڑی بازار میں فروخت کر رہا تھا اور جب اس پر بھی اکتفا نہ کرتے ہوئے موقع پا کر خالہ جی کی الماری سے پانچسو روپے چرا لئے تھے۔ میرے ایک ساتھی سے ہلکا اشارہ پانے کے بعد میری اصلیت ظاہر ہو چکی تھی لیکن میں کسی قیمت پر اقبال جرم نہ کر رہا تھا۔ ماموں جان جلد ہی نقصان پورا کرنے کا وعدہ کر کے مجھے گھر لے آئے اور میں پولیس کے دخل میں آنے سے ایک بار پھر بال بال بچ گیا۔"

شانتا چائے کی ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوئی اور بھارتی کے یکلخت خاموش ہو جانے پر مسکرا دی۔ بھارتی نے کھسیانے پن کے انداز میں اُسے دیکھا اور وہ سر جھکائے لوٹ گئی۔

" انکل شانتا میرے اس طرح ہر ایک پر اپنے ذاتی معاملات ظاہر کرنے کو ناپسند کرتی ہے۔ لیکن آپ ہی بتائیے کہ میں لوگوں کو اپنے بارے میں کیوں کر، اندھیرے میں رکھ سکتا ہوں۔"

"بھئی وہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ لوگ کسی کی کمزوری سے واقف ہو کر اس کی صاف گوئی سے متاثر ہونے کی بجائے اُسے غلط رنگ میں پیش کرنے میں فخر سمجھتے ہیں۔ اور کوئی بھی بیوی اپنے شوہر کو دوسروں کی نظروں میں ذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

" خیر اب آپ کو تو پوری داستان سننی ہی پڑے گی ورنہ ہو سکتا ہے کہ ادھوری بات سن کر آپ بھی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں۔"

" ارے بھئی میں کب چاہتا ہوں کہ تم اپنی داستان یہاں پر ہی بند کر دو۔ بلکہ میں تو پورا قصہ جان کر ہی یہاں سے اٹھنے کی سوچوں گا۔"

اس ذرہ نوازی کا شکریہ! اب ماموں ہر وقت مجھے اپنی نظروں کے سامنے رکھنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ پند و نصائح کا بھی بازار گرم تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جیب کترا قاتل سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ کیونکہ جیب میں چوری کرتا ہوں یا کسی کی جیب کاٹتا ہوں تو مجھے یہ علم نہیں ہوتا کہ میرے شکار نے وہ رقم کن کن مصارف کے لئے اٹھا رکھی ہو گی۔ ہو سکتا ہے اس نے اس رقم سے اپنے بیمار والدین، بھائی بہن یا اولاد کے لئے ضروری دوا اور خوراک مہیا کرنی ہو اور رقم نہ رہنے پر وہ ان کا انتظام نہ کر سکا ہو۔ اس صورت میں ایسے بے گناہوں کی موت کی تمام تر ذمہ داری مجھ جیسے گمراہ لوگوں پر آتی ہے۔"

" اور تم یہ سب سمجھ اور جان لینے کے بعد بھی چوری سے باز نہ آتے تھے ؟"

" مائی ڈیر انکل! آپ نے شاید میری داستان کے اس پہلو پر غور نہیں فرمایا۔ جس کا نام عادت ہے۔ اس مرض کے جراثیم میرے تن بدن میں کچھ اس طرح سرایت کر چکے تھے کہ لاکھ چاہنے پر بھی میں چوری کرنے سے قاصر نہ رہ سکتا تھا۔ میری حالت ایک پکے شرابی کی مانند ہو جاتی جس کے سامنے شراب رکھ کر اُسے نہ چھونے یا پینے کی تلقین کی جا رہی ہو۔ خصوصیت سے ان تلقین کے دوران زمانے میں ماموں میری کوئی اور ملازمت کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ ایک رات اچانک نیند کھلنے پر انہیں علم ہوا کہ میں اپنے بستر سے غائب ہوں۔ جب میں لوٹا تو وہ جاگ رہے تھے۔ میں ایک کونے میں جہاں [illegible]

چھپاکر چپ چاپ اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ میں سو چکا ہوں تو انہوں نے ٹارچ کی مدد سے ایک جوتے میں سے اندر سے بٹوہ نکال لیا تھا۔ بٹوے میں لگی مالک کی تصویر دیکھ کر وہ اوپر والے رہنے والے کرایہ دار کے کمرے میں گئے اور چپ چاپ بٹوہ اس کی جیب میں رکھ کر آ گئے۔ دوسرے دن بٹوہ وہاں نہ پا کر میری حالت دگرگوں تھی۔ لیکن مجھے ماموں جان کی اس حرکت کے بارے میں قطعی شک نہ تھا۔ اُسی شام وہ مجھے اوپر لے گئے اور جب اس آدمی نے ہماری تواضع کے لئے کچھ منگوانے کی غرض سے وہی بٹوہ نکال کر اپنے نوکر کو کچھ پیسے دیئے تو میں ماموں جان کی ہوشیاری پر دل ہی دل میں پانی پانی ہو چکا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر ان کی طرف سے لعن وطعن سننے کی پوری توقع تھی۔ لیکن انہوں نے اس بارے میں ایک لفظ بھی اپنی زبان پر نہ آنے دیا۔"

"اب میں ان کی راتوں کی نیند بھی حرام کر چکا تھا۔ لیکن ایک رات انہیں گہری نیند میں پا کر گھر سے نکلا اور ایک جوہری کی دوکان کے عقب میں جا کر جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرا پیچھا نہیں کیا جا رہا ہے تو میں چپ چاپ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ جب میں باہر آیا تو میرے ہاتھوں میں قیمتی زیورات سے بھرا ہوا ایک صندوقچہ تھا۔ میں نے اُسے راستے میں ایک کھنڈر میں چھپا دیا اور جب گھر لوٹا تو ماموں جان اُسی حالت میں سو رہے تھے۔ دوسرے دن یہ خبر تمام مقامی اخباروں کی سرخی بن چکی تھی۔ جوہری کی دوکان پر پہرہ بٹھا دیا گیا تھا۔ پولیس نے نامی چوروں اور غنڈوں کو حراست میں لے کر دعویٰ کیا تھا کہ وہ جلد ہی اس چوری کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا لیکن کبھی کبھی ماموں جان کی اتنی خاموشی مجھے بے قرار کر دیتی۔"

"جب جوہری کی دوکان سے پہرہ اٹھا لیا گیا اور پولیس کی سرگرمیاں کم ہو گئیں تو میں وہاں سے رفوچکر ہونے کے منصوبے باندھنے لگا۔ ایک رات کو ماموں جان کو بے خبر پا کر میں گھر سے نکلا اور سیدھا کھنڈر میں پہنچا۔ اُسی کونے میں سے صندوقچہ نکالنے کے لئے جھکا ہی تھا کہ مجھے اپنی گردن پر کسی کڑی گرفت کا احساس ہوا۔ میں ڈر کر چیخنے ہی والا تھا کہ ماموں جان کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

"بیٹا ہو چکی محنت، چلو اب گھر چلیں"

"میرا خیال تھا کہ اب کی بار ماموں جان خود اپنے ہاتھوں مجھے حوالہ پولیس کر دیں گے۔ لیکن گھر پہنچ کر ایک الماری میں سے ایک بنڈل نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے مجھ سے یوں مخاطب ہوئے:-"

"بھارتی! قدرت نے تمہیں راہ راست پر آنے کا آخری موقع عطا فرمایا ہے۔ جس دن تم چوری کرنے گئے تھے میں تمہارے تعاقب میں تھا۔ میں ہی صندوقچہ نکال کر جوہری کی دوکان میں واپس چھوڑ آیا ہوں لیکن پولیس کا پہرہ اٹھ جانے کے بعد۔ وہاں ایک الماری میں اچانک میری نظر ان رجسٹروں پر پڑ گئی تھی۔ یہ رجسٹر ان زیورات سے کئی گنا زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں اسمگل شدہ زیورات کا اندراج اور بہت ساری اور غیر قانونی باتوں کا احوال ہے۔ اگر تم یہ رجسٹر محکمہ انکم ٹیکس تک

دو تو تم ایک معمولی چور سے او پر اٹھ کر بہت بڑے فرض شناس اور ایماندار آدمی بن سکتے ہو "۔

" آفریں! بکرم نے تمہیں راہ راست پر لانے کی غرض سے اپنی عزت کو بھی خطرے میں ڈال دیا "—— میرے مونھ بے اختیار یہ جملہ نکل گیا۔ بھارتی خوش ہونے کی بجائے سخت ناراضگی کے عالم میں مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

" اس میں کوئی شک نہیں کہ ماموں جان کے اس فعل نے میرے خیالات کے دھارے کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ میں نے اس سے ایک ایماندار اور نیک شہری بننے کا پیمان اپنے دل سے باندھ لیا تھا۔ رجسٹر اور کاغذات متعلقہ محکمے کے افسران تک پہنچے وری ردعمل جوہری کی دوکان پر چھاپے اور اس کی گرفتاری کی شکل میں ہوا۔ لاکھوں روپے کے جواہرات اسمگل ہونے کا چلنے کے علاوہ ہزاروں روپے کے انکم ٹیکس کی چوری کا راز بھی افشا ہو گیا تھا۔ میرے اس کارنامے کی داد تمام اخبارات ل کھول کر دی اور جلد ہی مجھے خفیہ محکمے کے دفتر میں ملازمت مل گئی۔ اپنے فن اور صلاحیتوں کو جائز استعمال کرتے ہوئے ت سے کروڑوں روپے کی چوری کے کیس طشت از بام کر چکا ہوں۔ اب میرا شمار ملک کے بہترین جاسوسوں میں ہوتا ہے۔ یہ جنگ میں اہم فوجی راز افشا کرنے کے صلے میں حکومت کی طرف سے مجھے بہترین تحفہ ملنے کی سفارش بھی ہو چکی ہے "۔

" لیکن اتنا سننے کے بعد ہر ذی ہوش انسان یہی کہے گا کہ تمہیں اپنے ماموں سے ناراض ہونے کی بجائے تاعمر اس کا دام غلام رہنا چاہئے تھا۔"

" انہوں نے اس غلامی کا کیا معاوضہ مجھ سے وصول کیا۔ اس کا علم ہونے پر یقیناً آپ کو اپنے الفاظ واپس لینے ا گے۔ انکل! "

" بکرم نے اس فریضے کے عوض تم سے کوئی معاوضہ لیا ہوگا۔ یہ بات کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

" تو سنئے! جب وہ میری عادات سدھارنے کی کوشش کر رہے تھے تو اس دوران میں ان کی نسبت پڑوسی یک لڑکی سے طے پا گئی تھی۔

لیکن ماموں جان ایک بہت ہی امیر لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے میری ری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس مفلس اور غریب لڑکی کی شادی مجھ سے کر دی۔ اور خود اس لڑکی سے شادی کر کے لاکھوں روپے ئیداد پر قابض ہو گئے۔

جب میں نے ان سے اس بد دیانتی کا ذکر کیا تو انہوں نے معاوضے والی بات کہہ کر ے تن بدن میں انگارے چھپا دیئے۔ اگر مجھے ان کے احسانات کا پاس نہ ہوتا تو شاید وہ اس وقت اس دنیا میں نہ ہوتے۔

اب جو آپ کا جی چاہے (؟) اجازت

ظریہ آپ میرے اور ماموں جان کے بارے میں قائم کریں مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ لیکن آپ کو تسلیم ضرور اعتراف کرنا پڑے گا کہ انہوں نے اپنی خدمات کا جو معاوضہ مجھ سے وصول کیا ہے وہ کتنا بھاری اور اذیت ناک تھا۔——

روشؔ صدیقی

جام لبریز ہے نہ دیدۂ پرنم کیا ہے
ساقیِ محفلِ امکاں ہے ترا غم کیا ہے
خود شناسی کے سب اسرار عیاں ہوں مجھ پر
اور مقصود صنم خانۂ عالم کیا ہے
گرد ہے نکہتِ گل، رنگِ شفق، نورِ قمر
کہہ سکے کون کہ وہ حسنِ مجسم کیا ہے
کون حسنِ رخِ آدم سے اٹھائیگا نقاب
عشق ہی عشق ہے حسنِ رخِ آدم کیا ہے
زلف برہم، نظر آشفتہ، تکلم بے ربط
رہزنِ قافلۂ ہوش یہ عالم کیا ہے
مل گیا مجھ کو سکونِ دلِ گیتی کا سراغ
کیا کہوں تجھ سے کہ وہ گیسوئے برہم کیا ہے
عشرتِ دہر نے چہرے سے اٹھایا تو نقاب
یہ نہ دیکھا کہ مرا حوصلۂ غم کیا ہے
مژدۂ دوست کی دولت مرے آنسو ہیں روشؔ
چشمِ خورشید سے پوچھے کوئی شبنم کیا ہے

گوہر تند رشک

پرندوں کی چہک پر سوچتا ہوں
میں اپنے جسم میں شاید سزا ہوں
فروزاں مشعلِ جہد و عمل ہے
بھٹکتے خواب زاروں کا پتا ہوں
نہ بجھ جائے کہیں احساس کی لَو
تبسم کی لکیریں بانٹتا ہوں
مجسم مظہرِ دردِ محبت
مکمل آنسوؤں کا سلسلہ ہوں
فضائے وادیٔ دل مضمحل ہے!
جمودِ پردہ در دیکھتا ہوں
ستاروں سے سحر کی بھیک مہمل
میں نبضِ زندگی پہچانتا ہوں
فریبِ امنِ عالم دینے والو
میں توپوں کی گرج میں سوچکا ہوں
نظر میں زمزمِ انجم بھی ہے لیکن
میں خود ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہوں
فضائیں روند سکتی ہیں مشینیں!
میں شاعر ہوں کہ سوچوں کی چتا ہوں
رواں ہیں آنکھ سے اے رشک آنسو
ادا مفہومِ عشرت کر رہا ہوں

مظیر ہوشیارپوری

کسے خبر ہے کہ پھر نقش پا ملے نہ ملے
قرارِ سجدہ سلامت خدا ملے نہ ملے

قدم بڑھا کہ ابھی دل میں جل رہے ہیں چراغ
پھر اس کے بعد کوئی رہنما ملے نہ ملے

کمند ڈال تو دی ہم نے آسمانوں پر
سکوں ملے نہ ملے، مدعا ملے نہ ملے

قدم بڑھا تو دئے ہم نے اشکِ دیدۂ تر!
رہِ وفا میں ہمیں آسرا ملے نہ ملے

ملی جفا جو تری دو جہاں کا عیش ملا
"وفا اسیر" ہمیں ہوں، وفا ملے نہ ملے

عملِ حیات کا حاصل سعیٔ کمالِ بشر
تلاش فرض ہے اس کا پتہ ملے نہ ملے

مظیر درد کے طالب کو دردِ دل ہی گیا
دوا کی فکر عبث ہے دوا ملے نہ ملے

رؤف خیر

صبح نو کے سورج نے خوب گل کھلائے ہیں
آدمی سے قد آور آدمی کے سائے ہیں

آئینہ گری یوں بھی میرا فن ہی ٹھہرا ہے
لوگ کتنے ناداں ہیں مجھ کو منہ چڑائے ہیں

ریگ زار ساحل پہ تیرا نام لکھا تھا
کتنے جزر و مد اٹھ کر مجھ پہ مسکرائے ہیں

تشنگی کے صحرا میں ایک بوند کی خاطر
دور تک بگولے بھی ساتھ ساتھ آئے ہیں

کھلکھلا کے کیا ہنستا بلبلا کے رویا ہوں
تیری یاد کے لمحے جب بھی گدگدائے ہیں

خون کیوں ٹپکتا ہے چاندنی کی پلکوں سے
گیت ہی تو لکھے ہیں زخم کب دکھائے ہیں

خیر رو نہیں سکتے آہ بھر نہیں سکتے
اپنے واسطے بھی ہم ان دنوں پرائے ہیں

معصوم شرقی

چاک گریباں، سر میں سودا
عشق نہیں ہے پھر بھی رسوا
میری خطائیں صحرا صحرا
اس کی رحمت دریا دریا
فانی ہے دنیائے فانی
مورکھ مت بن اس کا شیدا
چہرۂ یار کی تابانی سے
اور بھی نکھرا رنگ سحر کا
عشق کے غم میں حسن ہے مضطر
بہنے لگی ہے الٹی گنگا
دیوانوں کے مونس ہیں یہ
خار بیاباں، گرد صحرا
"ناحق خون بہانا سیکھو"!
اب ہے یہی آئین جہاں کا
رسنے لگے یادوں کے پھوڑے
بہنے لگی ہے پیپ والی گا
ظالم انساں بھی ہوتا ہے
قسمت کے ہاتھوں میں کھلونا
عشق کا جذبہ ٹھہرا پانی!
اور ہوس ہے چڑھتا دریا
میری وفا بدنام ہے ہر سو
ان کی جفا کا کچھ نہیں چرچا
غم میں بھی معصوم ہنسو تم
اشک بہانے سے حاصل کیا

ریاض حسین چودھری

موجِ غم دل میں رواں ہو تو غزل ہوتی ہے
درد فرقت بھی جواں ہو تو غزل ہوتی ہے
لذتِ غم سے شناسا تو سبھی ہوتے ہیں
یہ "مگر" دل میں تپاں ہو تو غزل ہوتی ہے
دشتِ وحشت میں ہوا ان کا پتہ دیتی ہو
ان کے پاؤں کا نشاں ہو تو غزل ہوتی ہے
آتشِ گل میں سلگتا ہو بہاروں کا شباب
درِ شبنم کا زیاں ہو تو غزل ہوتی ہے
اک طرف ایک تمنا سی دلِ شاعر کی،
اک طرف سارا جہاں ہو تو غزل ہوتی ہے
اک طرف ان کی نگاہوں کا تصور دل میں
اک طرف مے کدہ کی دکاں ہو تو غزل ہوتی ہے
گردشِ جام ضروری تو نہیں فن کے لئے
ان کی آنکھوں کا بیاں ہو تو غزل ہوتی ہے
سر میں سودا ہو تیرے در پہ جبیں سائی کا
راہ میں سنگ گراں ہو تو غزل ہوتی ہے
چند الفاظ کی بندش کو تغزل نہ کہو،
زورِ غم زورِ بیاں ہو تو غزل ہوتی ہے
پا بہ زنجیر صلیبوں پہ ہوں دیوانے ریاضؔ
خونِ جیب رقص کناں ہو تو غزل ہوتی ہے

ساحل مانکپوری

جسے ہو فکر و غم گلستاں نہیں ملتا
چمن نواز کوئی باغباں نہیں ملتا
قرارِ خاطر و آرامِ جاں نہیں ملتا
سکونِ قلب تہہِ آسماں نہیں ملتا
نہیں کہ میر سر کارواں نہیں ملتا
غیور و صاحبِ عزمِ جواں نہیں ملتا
کوئی نتیجۂ آہ و فغاں نہیں لیکن
سکونِ دل کو بغیر فغاں نہیں ملتا
ہے دشمنوں کے مظالم کا ذکر کیا ہمدم
کہ اب مزاجِ دلِ دوستاں نہیں ملتا
کسا گیا ہے شکنجہ میں جب سے اردو کو
نشاطِ خاطر و لطفِ زباں نہیں ملتا
حرم میں دیر میں ڈھونڈا ہے میکدے جاکے
کہیں بھی ساحلِ رنگیں بیاں نہیں ملتا

—

ابوسعید

کبھی ہم ترک مے کر دیں تو میخانوں کا کیا ہوگا
سبو و ساقی و مینا و پیمانوں کا کیا ہوگا
شکایت ناخدا کی اور نہ کشتی کا ہی غم ہوگا
اگر ساحل پہ ہی ڈوبے تو طوفانوں کا کیا ہوگا
وہی ظلمت کدہ ہے آج بھی دنیا جو پہلے تھی
جہاں ہو علم نذرِ جہل، فرزانوں کا کیا ہوگا
محبت کی نمائش میں فریب نفس شامل ہے
خدا کی یاد میں تسبیح کے دانوں کا کیا ہوگا
وہ جس کی یاد میں تسبیح کے دانے ہیں گردش میں
اسی کی یاد میں پینے سے پیمانوں کا کیا ہوگا
تمنائیں ہزاروں خانۂ دل میں جو مہماں ہیں
اگر یہ گھر اُجڑ جائے تو مہمانوں کا کیا ہوگا

ابوسعید

تیر خنجر کا ان کا دل پر ستم کم نہیں
طاقتِ صبر کا بھی کرم کم نہیں
ان کی محفل میں اپنا بھرم کم نہیں
حسن کا پھر بھی جور و ستم کم نہیں
حریت میں بھی فکر و الم کم نہیں
دورِ ماضی کا اب بھی ستم کم نہیں
امن عالم کی تخریب کے واسطے
آج بھی نظم دیر و حرم کم نہیں
رہنمائی میں بھی رہزنی ہے روا
اب بھی انسانیت پر ستم کم نہیں
منزل کارواں سے ہے ناآشنا
اس قیادت کا اب بھی بھرم کم نہیں

محمد شفیع الدین خاں شفیع

تشنگی اور بڑھی دید سے کچھ کم نہ ہوئی
یہ عنایت بھی مرے زخم کا مرہم نہ ہوئی

کچھ تو آسودگئ دل کا سبب بن جاتی
ہائے وہ اک نگہہ ناز جو پیہم نہ ہوئی

جام پر جام تو دیتے ہو، مگر یاد رہے
کیا کرو گے جو مری تشنہ لبی کم نہ ہوئی

غمِ انساں کی بدولت، غمِ انساں کی قسم
زندگی اور سنورتی گئی برہم نہ ہوئی

کبھی اُن کی کبھی آئینِ وفا کی خاطر!
شدتِ غم میں بھی ہونٹوں پہ ہنسی کم نہ ہوئی

عبدالمتین نیاز

"آواز"

اندھیرے تمہارے تعاقب میں ہیں
رہرو یاد رکھو!
وہ جن راستوں سے تمہارا گذر ہے
اُنھیں راستوں پر
اندھیروں کی گہری، بھیانک، بہت گہری ہر گام پر کھائیاں ہیں
بہت فاصلے ہے، بہت مرحلے ہیں
ارادوں میں تھوڑی بھی لغزش نہ آئے
اُجالوں کی منزل کی جانب
یہ بڑھتے قدم ڈگمگانے نہ پائیں
وگر نہ اُجالے
اندھیروں کی گہری بھیانک سی ان کھائیوں میں ہی دم توڑ دیں گے
یہ غبارۂ ہستی کا یہ خوبصورت سا غبارہ پھٹ جائے گا۔
اس کے ٹکڑے ہوا میں بکھر جائیں گے

شاہد ساحلی

ایک خط کا اقتباس

یاد ہو گا تمہیں
میرے چہرے پر افسردگی کی لکیروں کو پڑھ کر
کبھی تم نے پوچھا تھا۔
کیا بات ہے؟
کون ہے وہ؟
بتاؤ نہ مجھے
میرے لائق بھی ہے کوئی خدمت؟"
مگر میری غیرت نے مجھ کو اجازت نہ دی تھی
کہ میں رکھ سکوں اپنا دل کھول کر
آج جب تم پر
ہر راز میرا عیاں ہو چکا ہے،
میری آرزوؤں کا
تم کیوں گلا گھونٹنا چاہتے ہو؟"

کسرِ التماس

اے دردِ دل! کہیں وہ ہنگام آ نہ جائے
تکلیف بڑھتے بڑھتے آرام آ نہ جائے

پھر درد کی کمی کا احساس بڑھ چلا ہے
ڈرتا ہوں پھر کسی کا پیغام آ نہ جائے

راہِ وفا میں اے دل! رکھنا قدم سنبھل کر
پھر اور کوئی تجھ پر الزام آ نہ جائے

ان گیسوؤں کے سائے میں جو کبھی ملا تھا
پھر یاد اب کہیں وہ آرام آ نہ جائے

اے کاوشِ مسلسل اس کا خیال رکھنا
بے ساختہ زباں پر وہ نام آ نہ جائے

مطلب کی بات ان سے کہنے جھجک رہا ہوں
آغاز ساتھ لے کر انجام آ نہ جائے

سمجھا رہا ہوں دل کو میں ضبط کے سلیقے
ایسا نہ ہو کہ ان پر الزام آ نہ جائے

مجھ کو معاف رکھنا اب میرے غمگسارو!
دل کو تسلیوں سے آرام آ نہ جائے

آغاز کی بہاریں ہیں جانفزا تو کیا ہے!
لیکن خزاں کی صورت انجام آ نہ جائے

"ممکنات"

جمال کڑپوی

آج بنیادوں کو باطل کی ہلا سکتے ہو تم
آج بھی کھوئی ہوئی عظمت کو پا سکتے ہو تم

فتنہ و شر کو زمانے سے مٹا سکتے ہو تم
اس جہاں میں پھر پیامِ حق سنا سکتے ہو تم

نورِ روح القدس سے حاصل اگر ہو روشنی
قُم باذنی کہہ کے مردوں کو جلا سکتے ہو تم

یہ حقیقت ہے اگر ہو شاخِ گل تک دسترس
پھر چمن میں آشیاں اپنا بنا سکتے ہو تم

شک نہیں اس راہ میں اک اپنی خوبیٔ تدبیر سے
آج بھی بگڑی ہوئی قسمت بنا سکتے ہو تم

رفعتِ شمس و قمر کا تذکرہ کیا چیز ہے!
عرشِ اعظم کو بھی جب منزل بنا سکتے ہو تم

کشورِ لا دین میں کردار سے اپنے جمالؔ
دینِ حق کا سب کو گرویدہ بنا سکتے ہو تم

معظم بھٹکلی

مل کے بیٹھیں کبھی کبھی ہم تم
عظمتِ دوستی بلند کریں

ہاں تو ہو جائیں محوِ راز و نیاز
کار و بارِ نبات و قند کریں

آؤ مل بیٹھیں کھل کے باتیں ہوں
تازہ اعلانِ تاشقند کریں

لبِ شیریں کا تذکرہ چھیڑیں
لذتِ گفتگو دوچند کریں

نقدِ دل بھی ہے، نقدِ جاں بھی ہے
آپ چاہے جسے پسند کریں

اے غمِ زندگی بتا تو سہی
تجھ کو کس طرح ارجمند کریں

تہ ہے کچھ دامنِ تقدس بھی
دفترِ پند آپ بند کریں

فرض اک سمت، شوق اک جانب
کسے چھوڑیں، کسے پسند کریں

ہاں بہ ایں اہتمامِ دار و رسن
ہم یوں ہی نامِ حق بلند کریں

شارق جے پوری

میری محبت نے حسن والوں کو زندگی کا شعور بخشا
کبھی دیا جذبۂ ترحم، کبھی ستم کا غرور بخشا

مجھے سمجھ لو زمانے والو میں دشمنِ تیرگیٔ شب ہوں
تجلّیٔ خونِ دل سے میں نے حیاتِ انساں کو نور بخشا

تجھے یہ خود آگہی مبارک مگر مِرے ظرف کو دعا دے
مٹا کے اپنی متاعِ ہستی تجھے مذاقِ غرور بخشا

یہ سربلندی ملی ہوئی ہے ہمارے سجدوں ہی کی بدولت
مٹا دی اپنی خودی مگر یہ مقام تم کو ضرور بخشا !

یہی تھی شاید تری مشیت کہ کچھ کمی بھی رہے جہاں میں
بنایا اک شاہکار مجھ کو مگر دلِ ناصبور بخشا

حیاتِ انساں یہی ہے شارق کہ زندگی ہو برائے انساں
جہاں کی پیاسی تمام روحوں کو میں نے کیف و سرور بخشا

نقد و نظر

ناشرین سے درخواست ہے کہ وہ تبصرے کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجیں۔ جن کتابوں پر تبصرہ ہو جاتا ہے وہ ادارے کے کتب خانے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اوقات ادارہ میں ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ریاست یا تحقیق عدل:۔ افلاطون۔ مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ناشر ساہتیہ اکاڈیمی۔ نئی دلی۔ سائز ڈیمی صفحہ ۴۵۵ قیمت کپڑے کی جلد پندرہ روپے۔ سادہ جلد بارہ روپے پچاس پیسے۔

افلاطون کی تصنیف "ریاست یا تحقیق عدل" مشہور عالم ہے۔ وہ ۴۲۷ ق م میں اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوا اور سقراط کی شاگردی میں اپنی اعلیٰ تعلیم کے منازل طے کئے۔ جب اس نے یونانی خانہ جنگیوں پر غور کیا تو اس کو زندگی گذارنے کے لئے اعلیٰ قدریں پیش کرنے کا خیال پیدا ہوا جس کا نتیجہ "ریاست یا تحقیق عدل" ہے۔ افہام و تفہیم کے دلنشین انداز اور انسانی زندگی سے قریب ترین تعلق رکھنے والے موضوع نے اس کو بہت جلد ہر دلعزیز بنا دیا۔ نظریہ اجتماعیت نے عوام کے دلوں میں یہ تصور پیدا کیا کہ ملک کا ہر فرد اور طبقہ اپنا فرض منصبی پورا کرتا ہے۔ اس کی توضیح اس نے جس طرح کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعلیمات پر کوئی مقالہ ہے۔ اس نے عدل کی ماہیت بھی بتلائی اور تعلیم اور معیشت کا نظام بھی پیش کیا۔ کتاب کے دس حصے ہیں اور ہر حصہ کو کتاب کا نام دیا گیا ہے۔ آخر میں ضمیمات اور دیگر ضروری معلومات سے کتاب کی افادیت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

قبل ازیں محترم ڈاکٹر صاحب نے اس کو انگریزی سے ۱۹۳۲ء میں اردو میں منتقل کیا اور یہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع ہوئی۔ اب بہ نظر ثانی کے بعد ساہتیہ اکیڈیمی نئی دلی نے کاغذ اور طباعت کے اعلیٰ معیار کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ملک کے ماہران تعلیم سے ہیں۔ اور تعلیمی مسائل پر ان کی تصانیف نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ افلاطون کی ریاست کی اہمیت کسی دور میں بھی کم نہیں ہوئی اور نہ مستقبل میں اس کو کسی کمی کا اندیشہ ہے۔ جب تک انسان باقی ہے۔ ریاست میں بتائی ہوئی تعلیمات بھی باقی رہیں گی اس لئے کہ اس کا موضوع ہی انسان ہے مثلاً صرف ایک فقرہ لیجئے۔

"میں"۔ تو ذرا سوچو کہ اگر کسی شہر میں وہ کیفیت پیدا ہو جسے ہم نے فساد کا نام دیا ہے۔ یعنی شہر میں دو فریق بھی ہوں اور یہ دونوں لگیں ایک دوسرے کی زمینوں کو تاخت و تاراج کرتے اور مکانوں کو آگ دینے تو یہ لڑائی کس قدر فتنہ خیز

ہو جائے گی۔ ملک کا کوئی سچا محبت کرنے والا کس طرح اپنے کو اپنی ماں (مادر وطن) اور دائی (پرورش کرنے والے دلی) کے ٹکڑے کرنے پر آمادہ کرسکے گا۔ البتہ فاتح اگر مفتوح کو اس کی سالانہ فصل سے محروم کردے تو اس میں پھر بھی کچھ معقولیت ہے۔ لیکن اس میں بھی ان کے دلوں میں صلح اور امن ہی کا خیال ہوگا اور وہ ہرگز ہمیشہ برسرپیکار رہنے کا ارادہ نہ کریں گے۔

یہ بات اس نے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے کہی لیکن آج کے دور پر بھی وہ منطبق ہوتی ہے۔ اس طرح ابتدا سے آخر تک فکر انگیز خیالات دلاویز پیرایہ میں ملتے ہیں اور فاضل مترجم کی شستہ اور رواں زبان قاری کی توجہ کو ہٹنے نہیں دیتی۔ ہوسکتا ہے کہ یونانی میں اس کی دلکشی بڑھی ہوئی ہو لیکن پیش نظر کتاب بھی اصل کے لطف سے خالی نہیں اور بجائے خود تازہ تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ اکاڈمی قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب کی اشاعت کو ضروری سمجھا جس کے دوسری زبانوں میں تو کئی ایڈیشن نکلے لیکن اردو میں ایک سے دوسرے کی نوبت ربع صدی گذرنے پر بھی نہ آئی اور قارئین نایابی کے شکوہ کناں رہے۔

سوویٹ سفارت خانے میں - ایکز نڈر کزنا چیف

ترجمہ - مخمور سعیدی، پریم گوپال متل، سیدہ انجم

ناشر - نیشنل اکاڈمی - ۹ - انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی ۶

اس کتاب میں روسی ڈپلومیٹ متعین برما نے اپنے ذاتی تجربات بیان کئے ہیں۔ روسی ڈپلومیٹ ایکزنڈر کزنا چیف نے ۱۹۵۹ء میں مغرب میں سیاسی پناہ لی۔

آج سوویٹ یونین ایک آہنی پردے والا ملک، یا بقول چرچل "ایک پر اسرار پہیلی" نہیں کہا جاسکتا۔ اب اس کے مقاصد کامیابیاں اور ناکامیاں سب کچھ ہمارے سامنے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سوویٹ یونین نے کمیونسٹ بلاک کے باہر ترقی پذیر ملکوں میں کمیونزم کی توسیع کی جو مہم جاری کر رکھی ہے اس کے داؤ پیچ اور طریقہ کار بھی سامنے آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم کو روس کی نوجوان نسل کی نفسیات سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے آج مارکسزم اور لینن ازم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

آج اہم روسی شخصیتوں اور ڈپلومیٹوں کا مغرب میں سیاسی پناہ حاصل کرنا ایک عام بات ہوگئی ہے شاید اس کی وجہ کمیونزم کا غیر فطری نظام زندگی ہے۔ جس میں شخصی آزادی پر خلوص اور بے لوث دوستی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کتاب کے پڑھنے سے سوویٹ یونین کے بارے میں ناظرین کی معلومات میں اہم اضافہ ہوگا۔

نیا طبقہ - ملوون جلاس - مترجم جلیس عابدی۔

ناشر - نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی ۶

طوون جلاس یوگو سلاویہ کمیونسٹ پارٹی کے اہم ترین لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ کمیونزم سے محض اصولی بنیاد پر اس وقت دستبردار ہوئے جب کہ طاقت کی باگ ڈور ان کی پارٹی کے ہاتھ آچکی تھی۔

اس کتاب میں انہوں نے کمیونزم کے نظریہ اور عمل کے بُعد کو واضح کیا ہے۔ کس طرح نظریاتی طور پر انسانی مساوات کی باتیں کرنے کے باوجود ایک نظام حکومت میں ایک مراعات یافتہ طبقہ وجود میں آجاتا ہے۔ کس طرح اس نظام حکومت میں بھی لوٹ کھسوٹ ہوتی ہے۔ اور ایک کی محنت سے دوسرا فائدہ اٹھاتا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ کمیونزم میں ایقان رکھنے والے افراد کے لئے نہایت ہی فائدہ مند ہوگا۔ ایک عام آدمی بھی کمیونزم کے روشن اور تاریک پہلوؤں سے متعارف ہو جاتا ہے۔ نظریہ عمل کی کسوٹی پر پرکھے جانے کے بعد ہی ان کے بارے میں زیادہ صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

چھپائی اور سرورق عمدہ ہے۔ لیکن کتابت کی غلطیاں جابجا موجود ہیں۔

فرزانہ انصاری

روح کلام غالب مرزا عزیز بیگ مرزا مرحوم مرتب حواشی۔ سید افتخار حسین زیدی۔ ناشر۔ نشریات ادب اکیڈمی بازار نخاس سہارن پور۔ یو۔پی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کراؤن صفحات ۲۵۶ مجلد معہ گرد پوش روح کلام غالب غزلیات غالب کی شعری تشریح ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرزا مرحوم نے ہر غزل کی اس انداز میں تضمین کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب کے کلام کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ یہ کتاب اس سے پہلے ۱۹۳۵ء شائع ہوئی تھی۔ اب یہ ۱۹۶۶ء میں دوبارہ شائع کی گئی ہے۔ اس میں اکثر مقامات پر اپنے اشعار کے بارے میں غالب نے اپنے دوست احباب کو جو کچھ لکھا یا مولانا حالی نے جو تشریح کی اس کا سید افتخار حسین صاحب زیدی نے حاشیہ میں ذکر کرکے اس کی افادیت بڑھادی ہے۔ اشعار غالب کے مطالب کئی شارحین نے سمجھائے ہیں اور انہیں آسان طریقے پر بتلایا ہے لیکن اس کے باوجود بعض اشعار یا تو سمجھ میں نہیں آتے یا اپنے اندر کوئی دو معنی بھی رکھتے ہیں اور اس طرح شارحین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ تضمین کے ذریعہ شعر کا مطلب ادا کرنا نثر کے مقابلے میں مشکل ہے اور اکثر مقامات پر مفہوم گنجلک ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مرزا مرحوم نے ادائی مطلب کے لئے اپنی امکان بھر کوشش کی ہے۔ مثال کے لئے دو تین بند پیش ہیں۔

شرط ہے اس کا ذرا جلوہ نما ہو جانا پھر تو آساں ہے مجھے محو لقا ہو جانا
راحت جزو نہیں کل سے جدا ہو جانا عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

ایک اور غزل سے دوسرا بند۔

رفوگر کس طرح شک ہو بھلا تیرے سگھڑاپے میں کہ بیٹھا ہے رفو کرنے مرے زخموں کے دامن میں
سمجھ لیتا جو ہوتی تجھ کو کچھ بھی آگہہ اس فن میں نہیں ہے زخم کوئی بخیہ کے در خور مرے تن میں
ہوا ہے تار اشک یاس رشتہ چشم سوزن میں

ایک اور بند۔

آہ کرتے سے غضب اس کا سوا ہوتا ہے نالہ کرتا ہوں تو سرگرم جفا ہوتا ہے
لب ہلانا سبب ترک وفا ہوتا ہے شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

غرض اس طرح غزلوں کی تضمین ہوتی ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر شعر تضمین کی وجہ سے سمجھا جاسکے۔ لیکن غالب دوستوں کے لئے یہ بھی ایک اچھا تحفہ ہے اور ایسے وقت اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے جبکہ ہر طرف غالب کی صد سالہ یادگار منانے کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں۔ اس لئے توقع ہے کہ یہ کافی دلچسپی سے پڑھی جائیگی۔

نغمۂ شعور۔ عبد المتین نیاز۔ ناشر مرکز ادب (بدھوارہ) بھوپال ملنے کے پتے: ۱۔ ثروت منزل۔ موتیا پارک بھوپال اور مکتبہ بزم سخن شاہجہاں آباد بھوپال۔ مجلد صفحے ۱۱۲ قیمت دو روپے۔

عبد المتین نیاز اردو رسائل پڑھنے والوں کے لئے نئے نہیں ہیں وہ اکثر رسائل میں اپنی آزاد نظمیں اور غزلیں شائع کرتے رہتے ہیں۔ غزلوں میں کہیں تو قدامت کی جھلکیاں لئے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں اسلوب میں جدت آگئی ہے۔ وہ اپنے جذبات اور احساسات کو روانی اور شدت کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس سے شعر میں بے ساختگی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے چونکہ کلام میں فنی اعتبار سے بظاہر نقص نظر نہیں آتا اس لئے اشعار کبھی گراں نہیں گزرتے اور اسکی وجہ کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا ہے۔ جس کو آج کل کے نوجوان شعرا خلاف شان سمجھتے ہیں۔

غزلوں کے مطالعہ سے ایک عام تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ طبیعت بہت شائستہ پائی ہے اور جو بحریں منتخب کی ہیں نہایت مترنم اور رواں ہیں اس میں انتخاب الفاظ کو بھی دخل ہے عصر حاضر کی سیاست بھی کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے اور مقامی سیاست سے زیادہ عالمی سیاست پیش نظر رہتی ہے اس لئے مسئلہ کسی رنگ نسل ملک اور قوم کا نہیں بلکہ انسان کا ہے۔

زندگی۔ ایک نظم کا عنوان ہے جس کے تین مصرع اس طرح ہیں۔

زندگی ایک ایسا پتھر ہے
سعی جہد و عمل کے آذر سے
گر تراشو تو یہ نگینہ بنے

یہاں آذر ابراہیمؑ کے والد یا صنم تراش نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیشہ یا چھینی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ غزلوں سے کچھ شعر پیش ہیں۔

دھوپ ہی دھوپ ہے ہر سمت غموں کی یارو اب کہاں سایۂ دیوار نظر آتا ہے

سینکڑوں غم ہم کو سنجتے ہیں خوشی کے نام پر
تیرگی دنیا نے دی ہے روشنی کے نام پر

جرم کیا دست صبا کا جب خط تقدیر میں
چالک دامانی لکھی ہے ہر کلی کے نام پر

اندھیروں میں چمکتے تھے مہتاب بن کر
اجالوں میں پرچھائیاں ہوگئے ہم

قدم قدم پہ نشیب و فراز کی فکر میں
سزائے دار سے کیا کم ہیں آدمی کے لئے

اٹھاؤ تیشۂ ادراک اہل فکر ذرا
نئے دماغ تراشو نئی صدی کے لئے

محمد اکبر الدین صدیقی

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء | جلد (۳۰) | شمارہ (۷)

جولائی ۱۹۶۸ء

ماہنامہ

سب رس

— نگران —

پروفیسر سید علی اکبر ایم، اے (کینٹب)

— مجلس مشاورت —

میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ، ڈاکٹر غلام عمر خاں، محمد منظور احمد

— معتمد —

محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم محمد جمال الدین

منتظم۔ وقار خلیل

▲ زر سالانہ چھ روپے

▲ ششماہی تین روپے

▲ غیر ممالک سے دس روپے

▲ فی پرچہ پچاس پیسے

▲▲ نمونے کے لئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپکر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

یوم قلی نمبر کو بہت پہلے شائع ہوجانا چاہئے تھا لیکن چند در چند موانعات نے ہمیں اس سے باز رکھا۔ یہ یوم ۲۵، ۲۶ اور ۲۷ فبروری کو منایا گیا۔ اس کا افتتاحی اجلاس گنبد محمد قلی قطب شاہ کے وسیع و عریض چبوترہ پر منعقد ہوا جس کی صدارت جناب سید قمر حسن صاحب سابق جج ہائی کورٹ نے کی۔ جلسہ کا آغاز محمد قطب شاہ کی مناجات سے ہوا۔ یوم محمد قلی کے معتمد جناب رمن راج صاحب سکسینہ شریک معتمد عمومی ادارہ ادبیات اردو نے خیر مقدمی تقریر کی جناب صدر جلسہ کی تقریر کے بعد جناب پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ نے پیامات سنائے۔ جناب کے کشار ڈپٹی صاحب میئر حیدرآباد۔ جناب خواجہ محمد احمد صاحب اور جناب سید شاہ عباس منصوری صاحب کی تقاریر اور محترمہ بانو طاہرہ سعید جناب مخدوم محی الدین جناب حسن طبسی نیر کی نظموں کے بعد مزار محمد قلی پر چادر گل چڑھائی گئی قرآن خوانی ہوئی اور محمد قلی کا مرثیہ پڑھا گیا۔ پروگرام کا آخری جز جناب عزیز احمد خاں صاحب وارثی کی قوالی تھا۔

۲۶ فروری ۱۹۶۸ء کو ایوان اردو کے خوش نما ہال میں ادبی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت جناب سری کشن سنہا صاحب (آئی۔ اے۔ ایس) نے کی مس نجمہ صدیقہ نے "میر محمد مومن کی شاعری" پر مقالہ پڑھا ڈاکٹر مغنی تبسم نے وجہی کے اسلوب نثر پر اظہار خیال کیا۔ پروفیسر عبدالوہاب نظوری نے "قطب شاہی عہد کے چند اطبا پر اپنا مقالہ سنایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ اسکالر نجم صدیقی صاحب نے قطب شاہوں کے تعلیمی مراکز پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی پرنس نقی علی خاں ثاقب ' قمر ساحری اور بشیر انور صاحبان نے اس موقع کے لئے لکھی ہوئی نظمیں سنائیں۔ جناب میر حسن معتمد کے شکریہ پر یہ اجلاس اختتام کو پہنچا۔

اسی دن شب میں جناب عبدالوحید خاں صاحب ناظم آثار قدیمہ کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا اور معتمدی کے فرائض محترمہ بانو طاہرہ سعید نے انجام دئے۔

۲۷ فروری کو ڈاکٹر پی ورگیا صاحب کی صدارت میں ایوان اردو میں تلگو اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں ڈاکٹر ٹی۔ نارائنا شاستری، ڈاکٹر پی ' مادھوا شرما اور شری ایم سیوا پرشاد نے قطب شاہوں کے کارناموں پر روشنی ڈالی شری سی' سنکر معتمد نے شکریہ ادا کیا۔

اس سلسلہ میں بین کلیاتی تحریر اور بیت بازی کے مقابلے منعقد کئے گئے تحریری مقابلوں کے لئے ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب کنوینر منتخب ہوئے اور بیت بازی کے مقابلوں کے لئے جناب صلاح الدین نیر صاحب تحریری مقابلے میں پہلا انعام محمد حسین صاحب

متعلم ایوننگ کالج دوسرا انعام سید مجیب الدین صاحب متعلم ایوننگ کالج اور تیسرا انعام قدر بانو متعلم زنانہ کالج نے حاصل کیا۔

بیت بازی کے مقابلے میں پہلا انعام نظام کالج کی ٹیم نے حاصل کیا اس میں تین طلبا ۔ ۱ ۔ واصف علی صاحب ۔ ۲۔ محمود علی خاں صاحب اور ۳ ۔ انیس الدین صاحب شریک تھے ۔ دوسرے انعام کی مستحق انوار العلوم کالج کی ٹیم قرار پائی جو دو طلبا میر ناظم علی صاحب اور مرزا کبیر بیگ صاحب پر مشتمل تھی بیت بازی کے مقابلوں میں حصہ لینے والے حسب ذیل طلبا کو خصوصی انفرادی انعامات بھی دئے گئے ۔

۱۔ محمد عبدالمغیث ۔	مختار کالج	۲ ۔ ایم اے ماجد	اردو آرٹس کالج		
۳۔ محمود علی خاں	نظام کالج	۴ ۔ محمد حمید الدین	سائنس کالج		
۵۔ مرزا کبیر بیگ	انوار العلوم کالج	۶ ۔ سعادت علی	سیف آباد سائنس کالج		

بیت بازی کے مقابلے علی کاٹیج میں منعقد ہوئے جس کے لئے ادارہ نواب طاہر علی خاں صاحب کا ممنون ہے جس کے فرائض ڈاکٹر رشید موسوی اور جناب ناصر کرنولی نے انجام دئے ادارہ ان کا بھی شکر گذار ہے ۔

رمن راج سکسینہ
(معتمد یوم محمد قلی)

خطبۂ استقبالیہ یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۶۸ء

جناب صدر، معزز خواتین و حضرات!

آج ہم جس عظیم المرتبت شخصیت کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں وہ نہ صرف ایک الوالعزم فرمانروا تھا بلکہ وہ ایک بلند پایہ شاعر، قومی یکجہتی کا علمبردار، علم و ادب کا سرپرست دکنی تمدن کا معمار اور شہر حیدرآباد کا بانی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ ایک ایسا عوامی بادشاہ گذرا ہے جس کی رعایا پروری انصاف رسانی اور مذہبی رواداری کی داستانیں آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں۔ اس نے رعایا کی فلاح و بہبود اور رفاہ عام کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اس کی بدولت اس کا دور حکمرانی تاریخ دکن کا زرین باب تصور کیا جاتا ہے۔

اس تاجدار گولکنڈہ کی یاد تازہ کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اس کے بلند قومی کردار سے درس عمل حاصل کریں اور اس کے نقش قدم پر چل کر اپنے دلوں میں باہمی میل ملاپ اتحاد و اتفاق قومی یکجہتی اور رواداری کے جذبات پیدا کریں۔

اگر میں اس تاریخی تقریب کے موقع پر ادارۂ ادبیاتِ اردو کی کارکردگی کا سرسری خاکہ پیش کروں تو بے محل نہ ہوگا جیسا کہ آپ بخوبی واقف ہیں ادارۂ ادبیاتِ اردو ہندوستان میں لسانی تحقیقاتی کام کا اہم مرکز ہے جو اردو ادب کی ترقی اور دکنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت میں سرگرم عمل ہے۔ اس سال ادارے کے تمام شعبوں کی کارکردگی میں قابل لحاظ اضافہ ہوا۔ شعبہ امتحانات کی جانب سے امتحان اردو دانی۔ اردو زبان دانی۔ اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات میں مراکز بلدہ۔ جونیئر سرٹیفیکیٹ اسکول چیپا پیٹ۔ سنٹرل جیل بودھن۔ بوتھ۔ نظام آباد۔ محبوب نگر۔ بانسواڑہ۔ آرمور۔ کرنول۔ اور میسور سے جملہ (۴۹۲) طلبا و طالبات نے شرکت کی۔ سنٹرل جیل کے قیدی امیدواروں اور جونیئر سرٹیفائیڈ اسکول کے قیدی بچوں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی اور ان کو ادارے کی جانب سے نصابی کتابیں بلا معاوضہ فراہم کی جاتی ہیں۔

اس سال ادارے کے کتب خانے میں (۶۳۳) مطبوعات اور (۱۲۵) مخطوطات کا اضافہ ہوا۔ اور سیکڑوں ریسرچ اسکالرز نے کتب خانے کے ذخیرے سے استفادہ کیا۔

شعبہ دارالمطالعہ میں ہند اور بیرون ہند کے (۱۹۴) اخبارات و رسائل وصول ہوئے اور ناظرین کی تعداد (۷۲۰۴) ہوگیا۔ ادارے کا میوزیم دکنی تہذیب و ثقافت کا اہم مرکز ہے۔ اس سال اس کے نوادر میں نواب عنایت جنگ مرحوم

اور ڈاکٹر غیاث صدیقی کے عطایا کی بدولت قابل لحاظ اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے علاوہ دیگر اشیاء کے مدرسہ محمود گاواں کی عمارت کی ایک نادر پینٹنگ عطا فرمائی ہے جو اورنگ زیب کے زمانے کی ہے۔

جہاں تک ادارے کے شعبۂ تالیف و اشاعت کا تعلق ہے ہم یہ کہنے کے موقف میں ہیں کہ ڈاکٹر زور مرحوم نے سلسلۂ مطبوعات کشمیر کے نام سے کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کی چوتھی کتاب "برف میں آگ" ادارے کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کی رسم اجرائی اس اجلاس میں عمل میں آئے گی۔

پروفیسر جاوید وششٹ صدر شعبہ اردو دہلی کالج کی تالیف "مغز ال رضا" جو محمد قلی قطب شاہ کے منتخب کلام پر مشتمل ہے زیر طبع ہے۔ توقع ہے کہ یہ کتاب بہت جلد شائع ہو جائے گی۔ عہد آصف جاہ اول کی مستند تاریخ مآثر نظامی مولفہ لالہ منسارام کو مولوی سید محی الدین صاحب یم۔ اے نے ادارے کی جانب سے مرتب کیا ہے جس کی اشاعت حکومت ہند کی امداد سے عمل میں آئے گی۔

تذکرہ مخطوطات کی تدوین کا کام ایک کمیٹی کے حوالہ کیا گیا ہے جو ادارے کے چند قابل اصحاب پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ تذکرہ مخطوطات جلد اول و دوم کی طبع ثانی بھی اس سال ادارے کے زیر غور ہے۔

ادارے کا ترجمان ماہنامہ سب رس نہ صرف پابندی سے شائع ہو رہا ہے بلکہ اس کے معیار اور مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

یہ بات ہمارے لئے باعث مسرت ہے کہ اس سال ملک اور بیرون ملک کے مشاہیر نے ادارے کا معائنہ کیا اور اس کی کارکردگی پر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ بالخصوص معزز صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے ادارے کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ صدر محترم نے کتب خانے کے قدیم مخطوطات اور میوزیم کے نوادر کو نہایت دلچسپی سے ملاحظہ فرمایا۔ معائنہ کے بعد موصوف نے ادارے کی کارکردگی پر مسرت کا اظہار کیا۔

اس موقع پر اگر میں ہندوستان کے لسانی مسئلہ پر اظہار خیال کروں تو بے موقع نہ ہوگا۔ جیسا کہ آپ حضرات بخوبی واقف ہیں ہندوستان کا لسانی مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اور ہر محب وطن کی خواہش ہے کہ اس کو اس طریقہ سے حل کیا جائے کہ ہندوستان کی ہر زبان کو اس کے جائز حقوق ملیں اور اسے پھولنے پھلنے اور ترقی کرنے کے مواقع فراہم ہوں۔ جہاں تک کہ اردو زبان کا تعلق ہے اردو کو کسی زبان سے کوئی رقابت نہیں۔ بلکہ اردو والوں کی یہ خواہش ہے کہ اردو کے ساتھ دیگر ہندوستان کی تمام زبانوں کو ترقی کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے۔ جو ہندوستان میں پیدا ہوئی پروان چڑھی اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں کثرت سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کی مقبولیت اور ہمہ گیری خود اس کی بقاء کی ضامن ہے۔ ہمیں قوی امید ہے کہ اردو کو جو بلا امتیاز مذہب و ملت ہندوستان کے باشندوں کی مشترکہ میراث ہے جائز حقوق سے

محروم نہیں کیا جائے گا۔

ڈاکٹر زور مرحوم کی یاد کے بغیر میری یہ تقریر نامکمل ہوگی جو اس تاریخی تقریب کے بانی اور روحِ رواں تھے۔ آج ہم یہاں محترم نواب مہدی نواز جنگ مرحوم کی کمی محسوس کرتے ہیں جو "یوم محمد قلی قطب شاہ" کی تقاریب میں ہمیشہ عملی حصہ لیتے تھے اور سال گذشتہ آپ نے اس مقام پر افتتاحی اجلاس کی صدارت فرمائی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نواب صاحب کے انتقال سے ملک ایک محب وطن، ماہر نظم و نسق، قدیم وضعدار اور علم دوست شخصیت سے محروم ہوگیا۔

میں پھر ایک بار جناب صدر اور معزز خواتین و حضرات کا خیر مقدم کرتا ہوں اور شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی شرکت سے اس اجلاس کو کامیاب بنایا۔

مناجات

محمد قلی قطب شاہ

مناجات میرا تو سن یا سمیع
منجے خوش تو رکھ رات دن یا سمیع
بھلا کر بھلا منج سوں جو ہوئے گا
برا کر برا منج سوں جن یا سمیع
مرے دوستاں کوں توں نت دے جنت
مرے دشمناں کوں اگن یا سمیع
سکل تخت پر میرا یوں تخت کر
انگوٹھی پہ جوں ہے نگیں یا سمیع
مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع
مرادات کا جم ترنگ سار قطب
او سے سار بہت دے نبیں یا سمیع

یوم محمد قلی قطب شاہ

مشاہیر کے پیامات

پیام سری (وی). وی. گیری

نائب صدر جمہوریہ ہند۔

ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام ۲۵/۲۶/اور ۲۷/فروری کو یوم محمد قلی قطب شاہ کی جو سہ روزہ تقاریب منائی جارہی رہیں ہیں ان کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

پیام سری پوتم اے تھانو پلے

گورنر آندھرا پردیش

مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام ۲۵/۲۶/اور ۲۷/فروری ۱۹۶۹ء کو یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب منائی جارہی ہیں میں ان تقاریب کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

پیام ڈاکٹر بی. گوپال ریڈی

گورنر اترپردیش

مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ آپ شہر حیدرآباد کے بانی محمد قلی قطب شاہ کی یاد میں یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب ۲۵/۲۶/و ۲۷/فروری کو منارہے ہیں جس کا آغاز ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے کیا تھا۔ ڈاکٹر زور اب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب کو جو انہیں عزیز تھیں جاری رکھنا چاہیے۔ میں ان تقاریب کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

جناب فخر الدین علی احمد صاحب

وزیر صنعتی ترقیات حکومت ہند

آج جب کہ فرقہ واری اور علاقائی اختلافات پھر ابھر رہے ہیں اور ملک کے بعض حصوں میں ناخوشگوار حادثات پیش آرہے ہیں محمد قلی قطب شاہ کے اصولوں کا تذکرہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم محمد قلی قطب شاہ کی زندگی سے سبق

نہ سمجھو لینے والا سبق لیں اور نتیجہ میں باہمی روا داری انسان دوستی اور قومی وحدت کو تقویت پہنچائیں۔

جناب ڈی. ایس. ریڈی

وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی

یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب منائی جا رہی ہیں۔ اس کی یاد منانا نہ صرف اس لئے ضروری ہے کہ وہ اس تاریخی شہر حیدرآباد کا بانی تھا بلکہ اس لئے کہ اس نے اردو اور تلگو زبان کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ اس تہذیب و ثقافت کا معمار تھا جو اس شہر اور ریاست حیدرآباد کی اہم خصوصیات میں داخل ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور

معتمد عمومی انجمن ترقی اردو (ہند)

آپ یہ یوم منا کر نہ صرف ایک ادیب فرمانروا کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں بلکہ اردو کی خدمت کرنے والوں کے لئے حوصلے اور خدمت کی شاہراہ دکھاتے ہیں اور اس زبان کی ترقی و آبیاری کا سر و سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ آپکا یہ کاروبار شوق قابل صد ہزار تحسین و ستائش ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین

محمد قلی قطب شاہ کی گوناگوں خدمات نے اس کی شخصیت کو قطب مینار کی طرح بلند و مستحکم بنا دیا ہے۔ وہ ثقافتی زندگی کا ایسا نمایاں سنگ میل ہے کہ کوئی معقول مورخ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس عظیم المرتبت ہستی کی یاد تازہ کرنا تاریخ و انسانیت کی رگوں میں خون دوڑانا ہے۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی

ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ۔ بمبئی

یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ جشن کمیٹی اس سال بھی اپنا سالانہ جشن اپنی روایتی شان و شوکت سے منا رہی ہے واقعہ یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ صرف دکن کی تاریخ و تہذیب کی ایک اہم ہستی ہے بلکہ ادب کی سلطنت کا بھی ممتاز سلطان گذرا ہے اور جب تک ہماری زبان اردو و ادب باقی ہے اس کا احسان اور اس کی یاد ہمیشہ محبت کے ساتھ باقی رہے گی۔

سید احتشام حسین

تہذیبی انتشار، تنگ نظری، تعصب اور لسانی جارحیت کے اس دور میں یوم محمد قلی قطب شاہ منانا مبارک ہو! مجھے یقین ہے کہ یہ دن روشنی پھیلانے کا دن ہوگا اور آپ کی جد و جہد سے تاریخ کا وہ باب روشن ہو کر سامنے آئیگا جسے آج بھلایا جا رہا ہے اس وقت ہم آہنگی، قومی اتحاد، فراخ حوصلگی اور بے تعصبی کی ضرورت سب سے زیادہ ہے قلی قطب شاہ کی ذات ان خصوصیات کی علامت تھی مجھے امید ہے کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی یہ دن اسی جوش و خروش سے منایا جائے گا جو حیدرآباد کی خصوصیت ہے میں اس تقریب کا دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔

پیام

از پروفیسر یس ہمنت راؤ

میرے الفاظ اس پیام سے زیادہ موثر نہیں ہو سکتے جو گولکنڈہ اور حیدرآباد کی حسین یادگاروں اور دلکش پینٹنگ میں ملتا ہے اور اس زمانے کے سلاطین کے کلام اور ان شعراء کی شاعری میں نمایاں ہے جن کی قطب شاہوں نے سرپرستی کی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے جو ہمایوں اور اکبر کا ہم عصر تھا بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ چار مینار کے قریب جامع مسجد کے کتبہ پر اسے شاہِ شاہان اور شاہجہاں سے مخاطب کیا گیا ہے۔ اس نے ۱۵۸۹ء میں شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھی اور ۱۵۹۲ء میں پرشکوہ عمارت چار مینار کی تعمیر ہوئی۔ دو سال بعد اس کے چاروں راستوں پر ایک دوسرے کے مقابل نہایت ہی شاندار چار کمانیں بنوائی گئیں۔ اس زمانے میں ان کے اطراف متعدد عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں جن میں سے ایک عاشور خانہ کی عمارت بھی ہے۔ یہ عمارت ۶۶ ہزار روپیوں کی لاگت سے تیار ہوئی تھی جو خطاطی کے نمونوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ یہ خطاطی ان نامور خوشنویسوں کی ہے جو ایران سے بلائے گئے تھے۔

۱۶۰۳ء میں ایران سے آئے ہوئے ایک سفارتی وفد کا اسی شہر میں شاندار طور پر استقبال کیا گیا تھا۔ ۱۶۰۷ء میں اس کی بیٹی حیات بخشی بیگم کی شادی نہایت دھوم دھام سے رچائی گئی تھی۔ ۱۶۱۲ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کا داماد محمد قطب شاہ اس کا جانشین ہوا۔

گولکنڈہ کے شاہی گنبد دکن کے شاندار مقبرے تصور کئے جاتے ہیں۔ ان میں محمد قلی قطب شاہ کا مقبرہ سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ یہ سطح زمین سے (۱۸۰) فیٹ بلند ہے۔ فرانسیسی سیاح تھیونو نے ۱۶۶۷ء میں لکھا ہے کہ "اس آرام گاہ کا فرش قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور قبر پر اطلس کی چادر رہتی تھی جس پر سفید پھول چڑھے رہتے تھے۔ اور اوپر زریں شامیانہ ہوتا تھا۔ عود، پھولوں کی خوشبو اور تلاوت قرآن سے ہر وقت ایک سماں بندھا رہتا تھا جس سے گنبدوں کی شان اور تقدس کا اظہار ہوتا تھا"

اس کے وارث سلطان محمد قطب شاہ نے ۱۶۲۶ء میں انتقال کیا۔ چونکہ اس کے بیٹے کی عمر صرف بارہ سال تھی اس لئے اس کی ماں ملکہ حیات بخشی بیگم نے سلطنت کا نظم و نسق سنبھالا۔ اس خاتون نے اپنی اعلیٰ درجہ کی ذہانت سے ملک کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ رکھا۔ چنانچہ ان کی یادگار کے طور پر [illegible]

کے مقبرہ کی طرح ایک شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

میں اب اپنی گفتگو ان اشعار پر ختم کرتا ہوں جو سلطان محمد قطب شاہ کی تخت نشینی کے وقت کہے گئے تھے۔ اور جنہیں پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے اپنی تاریخ گولکنڈہ میں نقل کیا ہے۔

با محبت باز بستم عہد و پیمانے نو ے   گشتہ جلوے می نشانم پیش جانان نو ے
سر مہ شد خاکِ تلنگانہ ز فرخ پائے تو   اے فدائے خاک پایت ہر زماں جانِ نو ے
گر صفاہاں نو شد از شاہ جہاں عباس شاہ   حیدرآباد از نو شد شاہ صفاہانِ تو ے

۱۴۹۳ء میں سلطان قلی تلنگانہ کا حاکم مقرر ہوا۔ اس وقت سے ۱۵۴۳ء تک جب کہ اس نے ۹۹ سال کی عمر میں انتقال کیا تقریباً (۵۰) سال کی طویل مدت تک سلطان قلی نے اپنے حقیقت پسندانہ طرز عمل کے ذریعہ علاقہ تلنگانہ میں امن و امان قائم رکھا۔ اور اس کے بیٹے ابراہیم نے وجیا نگر میں طویل قیام کی وجہ سے کونڈ کنڈہ کے نائک واڑیوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی جو اس کے لئے بعد میں معین و مددگار ثابت ہوئے

اس نے (۳۰) سال (۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء) حکومت کی اس طرح (۸۰) سال جو مضبوط بنیادوں پر سلطنت قائم رہی اس کی بدولت محمد قلی قطب شاہ اور اس کی زندگی حیات بخشی بیگم نے حیدرآباد کو سو سال سے زیادہ عرصہ تک اس کے لئے بام عروج پر پہنچا دیا۔ حیدرآباد اس زمانہ میں یقیناً دولت کا مرکز تھا جس کی بدولت حریص فاتحین کی نظریں بھی اس پر پڑتی تھیں۔

جسٹس سید قمر حسن

خطبۂ صدارت یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۶۸ء

محترم خواتین و حضرات کرام
شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے گلستاں میں ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بہ خیر
گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نہ ماند

نوشیرواں کے نام کے زندۂ جاوید ہو جانے کی علت شیخ شیراز نے خیر کو قرار دیا ہے۔ خیر کے تصور میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جن سے بنی نوع انسان کے کسی بڑے یا چھوٹے طبقہ کو روحانی یا مادی فائدہ بھی پہنچا ہو یا ان کی زندگی سنواری ہو۔ زندگی کے تنوع کے لحاظ سے خیر کے مظاہر مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتے۔ منبع خیر کبھی روحانیین ہوتے ہیں جو بنی نوع کے لئے اخلاقی اقدار اور تعامل معاشری کے معیار قائم کرتے ہیں جس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان من حیث المجموع بہ وابستگی ضمیر امن و صلح پسندی کی زندگی بسر کرے۔ یہ طبقہ اپنی کوششوں میں جبر سے کوسوں دور رہتا ہے اور حکمت و موعظت سے سیدھے راستہ کی طرف بلاتا ہے تاکہ ضمیر صالح ہر فرد کا دبیر کامل ہو سکے۔ یعنی دوسروں کا "جبر" انسان پر نہ ہو بلکہ ہر انسان خود اپنا حاکم ہو۔ جب معاشرہ تنظیمی یا نیم تنظیمی شکل اختیار کرتا ہے تو معاشرہ کے معاشری پہلو کے نظر کرتے قائد معرض وجود میں آتا ہے یا اس کا انتخاب کیا جاتا ہے کہ وہ قیادت کے فرائض اپنے ذمہ لے تاکہ معاشرہ کا نظم و نسق افراد معاشرہ کے مادی و روحانی فلاح و بہبود پر منتج ہو۔ عقل عمومی نے ایک زمانہ تک بادشاہت کے تصور کو معاشرہ کا بہترین دستور سمجھا اور اس پر کاربند رہی اور قانون سازی کو اس کے دائرہ سے باہر سمجھا جس کا منبع روحانیین کی تعلیمات ہی رہیں۔ جن شخصیتوں نے اپنی مفید قیادت کے دوران میں اکثر افراد معاشرہ کو حصول حیثیت سے فائدہ پہونچا وہ صاحبان خیر میں شمار کی گئیں اور ان کے ذکر "خیر" کے ساتھ باقی رہ گئے۔

انسانی حافظہ اپنی کوتاہی کے لئے مشہور رہے۔ انگریزی کا ایک جملہ Lest We forget ہے یعنی مبادا ہم بھول جائیں آپ نے اکثر عمودی میناروں کے پائیں پر کندہ دیکھا ہوگا یہی جذبہ آج کے اجتماع میں بھی کارفرما ہے اور مقصد وحید یہ ہے کہ پچھلے ازمانوں کے صاحبان خیر کی زندگی کے کارنامے فراموش نہ ہو جائیں۔

کائنات میں کوئی زندہ یا بیجان حالت جمود میں نہیں ہے بقول اقبال "ثبات صرف تغیر کو ہے زمانہ میں" آپ کے اور محمد قطب شاہ کے زمانہ میں چار صدیوں کا فصل ہے۔ ان چار صدیوں میں دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی دنیا کے سیاسی اور اقتصادی نظریات بدل گئے کہیں کہا جا سکتا کہ موجودہ نظریات کب تک

قائم رہیں گے کسی شخص کی عظمت و بزرگی کو جانچنے کے لئے یہ دیکھا جائے گا کہ اپنے زمانے کے ماحول میں وہ شخص کیا تھا اور اس دھرتی کے باسیوں کے لئے اس نے کیا کیا۔

اس معیار پر شاہان گولکنڈہ کے کارناموں پر نظر کیجئے۔ اس خاندان کے نامور بادشاہوں کے سوانح حیات کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ بھارت کے مختلف قطعات پر مختلف زمانوں میں حکومت کرنے والے بادشاہوں اور راجاؤں کے عظیم الشان کارناموں سے ان کے کارنامے کم نہ تھے۔ معاشی و مالی حالت کے لحاظ سے اب بھی یہ ضرب المثل ہے کہ ہن برستا تھا۔ ادبی نقطۂ نظر سے ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑی جواب بھی مائل بہ ترقی ہے۔ مذاق شعر میں نہ صرف فارسی کو دخل تھا بلکہ تلنگی و ہندی بھی فیض یاب تھی۔ فن تعمیر میں ایسے شاہکار معرض وجود میں آئے جن کی شہرت مقامی نہ رہی بلکہ ہر قوم کے ناقدان فن سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں اور رفاہ عامہ پر سعی مرکوز تھی چھوٹے کنویں تالاب اور کاروان سرائے اور مختلف مقامات پر آمد و رفت کے لئے راستے بن سکتے ہیں بنیں تاکہ خلق خدا کے لئے آسانیاں فراہم ہوں۔ اگر مذہبی تنگ نظری کو روا نہ رکھا جائے تو مسجد و مندر کا پہلو بہ پہلو ہونا موجودہ زمانہ کے تصور حکمرانی کا پیشرو کہا جا سکتا ہے۔

آج کی خصوصیت کے لحاظ سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد تازہ کرنا ہے اس پر بہت کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ میں اس امر پر اضافہ نہیں کر سکتا۔ اس پر آج بھی مختلف عنوانوں کے تحت آپ بہت کچھ سنیں گے۔ البتہ میں خصوصیت کے ساتھ آپکی توجہ اس تقریر مطبوعہ کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جو جناب کرشنا سوامی مدیراج صاحب نے ۱۱ر جنوری ۱۹۵۹ء کی منعقدہ محفل میں فرمائی تھی حق ناشناسی ہوگی اگر اس سلسلہ میں میں سید محی الدین قادری زورؔ، غلام یزدانی، غلام ربانی، محی الدین احمد، سید علی اصغر بلگرامی، سراج الدین علی خاں، ڈاکٹر مسیح الزماں اور جمال کرشنویدی صاحبان کا ذکر نہ کروں اگر ان بزرگواروں کے مضامین ادارہ ادبیات اردو کے سلسلہ مطبوعات میں آپ ملاحظہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا ایک ناموافق ماحول میں انہوں نے کس خلوص سے مورخانہ انداز میں بدل سعی کی ہے اور ہماری بھولی بسری ہوئی تاریخ دہرائی ہیں۔ ان مضامین میں تبصرہ خوانی نہیں ہے۔ بلکہ تاریخی تدقیق ہے۔

سید محی الدین قادری مرحوم کی یادگار میں ادارہ ادبیات اردو باقی ہے۔ یہ اور اداروں کے علاوہ اردو کی ترویج و اشاعت کا اہم مرکز ہے، ادارہ کی علمی و ادبی کارکردگی کی روداد آپ نے سن لی جو یقیناً آپ کی مسرت کا باعث ہوئی ہوگی، آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ اس ادارہ نے جو ادبی و ثقافتی کارنامے انجام دئے ہیں وہ نہ صرف قابل امتنان بلکہ لائق فخر ہیں اور یہ بات بھی باعث طمانیت ہے کہ ڈاکٹر زورؔ کے انتقال پر ملال کے بعد ادارہ کی باگ ڈور ایسے اصحاب کرام کے ہاتھوں میں ہے جن پر مرحوم کو کامل اعتماد تھا اور جن کی قابلیت اور بے لوث خدمات مسلمہ ہیں۔ اگر میری یہ گزارشات درحقیقت تحسین ناشناسی نہیں ہے تو آپ اس ادارہ کی ہمت افزائی فرمائیے۔ ؎ نام نیک رفتگان ضائع مکن ٭ تا بماند نام نیکت برقرار

خاتمہ کلام یعنی آپ سے سمع خراشی کا عذر خواہ اور صمیم قلب سے متمنی ہوں جلسہ کی کارروائی مابعد میں آپ کی دلچسپی اور علاقہ مندی شامل حال رہے۔

حسن مثنیٰ نیّرؔ

نظم فارسی

بمناسبت جشن سالیانہ محمد قلی قطب شاہ در قلعہ گولکنڈہ حیدرآباد (اے پی)

در و دیوار دکن مدح و ثنا خوان تو ہست
این ہمہ موہبت از منشاء ایمان تو ہست

مادر و ہر نزاید پسری بہتر از این
گر بزاید پدر ش عاشق عرفان تو ہست

شاہ و ہم عالم و ہم صوفی و ہم بندۂ حق
نیست حاجت بہ بیان دفتر دیوان تو ہست

از زبان تلگو ہم بزبان اُردو
ہندی و فارسی از قدرت ارکان تو ہست

سر بر افلاک زند سرو و گلُ از ملک دکن
نغمہ خوان در چمنش بلبل بستان تو ہست

ای کہ با ختم رسُل نور خدا ہمنامی
زاین سبب مہ بہ سما سلسلہ جنبان تو ہست

از شہنشاہ عدالت عمل از ارکانش
خور شہنشاہ و ضیا از مہ تابان تو ہست

شعرا بندہ مخلص عرفا نغمہ سرا
واین ہمہ شوکت و دانش ہمہ از کان تو ہست

عدل و انصاف و مروت بہ دکن نقش کنان
ہر کہ رای نگرم شاکر احسان تو ہست

آفرین باد بر آن جان گرانمایہ آن
کہ زجان تابع و ہم بندہ فرمان تو ہست

بگذر از نیّرؔ بیچارہ اگر گفت خطا
کاندرین ملک دکن ساکن و مہمان تو ہست

میر حسن

تعارف ادبی اجلاس یوم محمد قلی قطب شاہ

معزز خواتین اور حضرات

یوم محمد قلی قطب شاہ کے آج کے ادبی اجلاس کے صدر جناب سری کرشنا سنہا ہیں۔ فاضل مقرروں میں ہیں۔ مس نجمہ صدیقہ، ڈاکٹر مفتی تبسم نجم صدیقی، پروفیسر عبید الوہاب علوی پرنسپل طبیہ کالج کے نام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس محفل میں پرنس تقی علی خاں ثاقب بشیر انور اور جناب قمر ساحری اپنی نظمیں سنائیں گے۔

سری کرشنا سنہا صاحب ہمارے اسٹیٹ کے ممتاز افسروں میں سے ہیں۔ آپ نے مرکزی حکومت کے تحت دلی میں اور ہندستان کے باہر چیکوسلواکیہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

دکنی تہذیب سے سنہا صاحب کو خاص دلچسپی ہے چنانچہ اس ملک کے ازمنہ وسطی کی تاریخ آپ نے انگریزی زبان میں لکھی ہے۔ یہ تاریخ سررشتہ آثار قدیمہ آندھرا پردیش کی جانب سے شائع ہوئی جسے ماہروں نے پسند کیا ہے۔ اس کا دوسرا حصہ اس وقت زیر طبع ہے۔ اپنی تاریخ دکن کو سنہا صاحب نے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے مقدس نام سے معنون کیا ہے جس سے آپ کی وسعت قلب اور رواداری کا پتہ چلتا ہے۔

ادارہ ادبیات اردو کے لئے سنہا صاحب نئے نہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر زور مرحوم بانی ادارہ نے "رنگ بزم" کے نام سے سنہا صاحب کے اردو افسانوں کا مجموعہ کئی سال قبل شائع کیا تھا۔ اردو سے سنہا صاحب کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ آپ کے مضامین مختلف مفید ادبی سماجی اور دوسرے موضوعات پر اردو رسالوں اور اخباروں میں چھپے ہیں۔

یوم محمد قلی کے سلسلے میں بین کلیاتی تحریری مقابلہ منعقد کیا گیا تھا۔ بزم مقالات میں سب سے پہلے جناب محمد حسین جعفری متعلم بی۔اے۔ سال دوم ایوننگ کالج اپنا وہ مضمون سنائیں گے جسے انعام اول کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ عنوان ہے "دکنی تمدن قطب شاہی عہد میں"۔

زاں بعد مس نجمہ صدیقہ اپنا مقالہ سنائیں گی عنوان ہے "میر محمد مومن"۔ عہد محمد قلی کا فارسی شاعر۔

قطب شاہوں کے تعلیمی مراکز کے زیر عنوان جناب نجم صدیقی صاحب ریسرچ اسکالر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مختصر مگر اپنے موضوع کے پیش نظر دلچسپ مضمون سنائیں گے۔

اپنی اور ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ شعرا صاحبان پرنس تقی علی خاں ثاقب اور جناب قمر ساحری اور جناب بشیر انور صاحب کے بھی ہم شکر گزار ہیں۔ دوسرے حاضرین جلسہ کے بھی ہم شکر گزار ہیں۔

جیسا کہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ آج رات نو بجے اسی ایوان میں یوم محمد قلی کا سالانہ مشاعرہ جناب عبدالوحید خاں ناظم آشنا قدیمہ کی صدارت میں منعقد ہوگا۔ اس مشاعرے کی استقد محترمہ بانو طاہرہ سعید ہیں۔ امید کہ آپ حضرات اس محفل میں شریک ہوکر ادارے کو ممنون فرمائیں گے۔

نعت

محمد قلی قطب شاہ

تج مکھ اجت کی جوت تھے عالم دین ہارا ہوا
تج دین تھے اسلام سے مومن جگت سارا ہوا
یک لک اسی پیغمبراں اُپجے جگت میانے ولے
تج پر نبوت ہے ختم سب تھے توں ہی پیارا ہوا
انبر ترنگ، زین چند نوا، چابک سرنگ تس اچھلی
سورج کرن پرچم دسے، غاشا بدل کارا ہوا
جنت کتے ترجگ جس سو یک چمن تج باغ کا
کرسی عرش تج گھر انگن ہو لامکاں تھارا ہوا
باتاں گہرسیاں زلیاں واریا جو تیرے ناؤں پر
سو جائے کر اعلان پو ہر یک بچن تارا ہوا
صدقے نبی جم راج کر قطب زماں آنند سوں
قدرت تھے کہکشاں آئے کر دنیاں کے سو آرا ہوا

سری کاکرشنا سہنا (آئی اے ایس)

صدارتی تقریر ادبی اجلاس یوم محمد قلی قطب شاہ

"تاجدار گولکنڈہ" بانی حیدرآباد، جگیلم کی رقاصہ بھاگ متی کا عاشق، محمد قلی قطب شاہ ہندوستانی تاریخ کا ایک بے مثل ہیرو ہے
ہر سال یوم قلی قطب منایا جاتا ہے اس سال بھی اس تقریب کے سلسلہ میں آج ہم سب یہاں جمع ہیں مجھے تو بہت عرصہ بعد یہ موقع
ملا کہ میں اس میں شریک ہو سکوں۔ آپ نے اس تقریب کی صدارت کی بھی عزت بخشی، اس کا میں ممنون ہوں۔

اس مبارک موقع پر میری یاد مرحوم ڈاکٹر زور کو ڈھونڈتی ہے جن کے ساتھ میری دیرینہ وابستگی تھی کیونکہ ان کی طرح
میں بھی دکنی تاریخ اور روایات کا پرستار رہا ہوں۔ جب ڈاکٹر زور نے ایسی کوئی رسم رچائی۔ میں گو یہاں نہیں تھا مگر میرا دل و
دماغ ڈاکٹر زور کے ساتھ رہا کیا۔ ڈاکٹر مرحوم نے دکن اور دکنی ادب کی جتنی خدمت کی ہے اتنی شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔
ہر دکنی ان کا احسان مند ہے کہ انھوں نے دکنی تہذیب و تمدن کو ہندوستان کے نقشے پر آشکار کیا، مگر آج ضرورت اس بات کی
ہے کہ ہم دبی زبان میں نہیں بلکہ ساری طاقت اور توانائی کے ساتھ اس حقیقت پر زور دیں کہ دکن نے سب سے اعلیٰ ادنچا اور شمالی
ہندوستانی تمدن پیدا کیا ہے۔

ہندوستان میں بہت سی قومیں آئیں اور گئیں شمالی ہندوستان نے سکندر اعظم سے لیکر ترک، منگول، مغل کو بہ دفعات
حملہ آور یا فاتح کی حیثیت سے دیکھا۔ لیکن ہر صورت میں یہی ہوا کہ فاتح نے مفتوح پر اپنا تمدنی تسلط جمایا۔ مفتوح کے
لئے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ بیرونی غازے سے اپنا رنگ نکھارتا۔ لیکن دکن کے میدانوں نے اپنا کوئی اور طور و طریقہ رکھا۔
آنے والوں کو اپنے سینے میں جگہ دی اور ان کو پوری طرح سے اپنا لیا۔ جنوبی ہند کی طرح دکن میں آنے والوں سے بے رخی
نہیں بلکہ اپنی بنیادی تمدنی حیثیت کو قائم رکھتے ہوئے اس نئے آنے والوں کی خوبیوں کو اپنایا اور اپنے تمدنی خزانہ کو
باہر کے زر و جواہر سے مالا مال کیا۔ اس اعتبار سے دکن کی تاریخ شمال و جنوب کے تمدنی ارتقاء پر مسلسلہ طور پر ایک
گراں بہا اضافہ ہے۔

جب بہمنی سلطنت کا ستارہ غروب ہوا اور دکن میں پانچ مسلم سلطنتیں قائم ہوئیں تو ہر سلطنت نے اپنے کو مقامی
تمدنی دھارے میں سمو دیا۔ کیا بیجاپور کے عادل شاہی، کیا احمد نگر کے نظام شاہی یا پھر گولکنڈہ کے قطب شاہی سبھوں
نے مقامی دکنی کلچر کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ اس کو ترقی دی۔ عادل شاہیوں نے مقامی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا

اور عادل شاہی فرمان "از دربار سرسوتی" کے عنوان سے جاری ہوتے تھے۔ نظام شاہیوں نے بھی اپنے کو مقامی روایات اور طریقوں سے اس طرح ملبوس کر دیا کہ کسی منزل پر بھی یہ شبہ نہیں ہوتا کہ نظام شاہی حکمران باہر کے آئے ہوئے تھے۔ گولکنڈہ کے قطب شاہیوں نے کم و بیش اسی طرح سے عمل کیا اور ان میں قلی قطب نے تو چار چاند لگا دئے۔ اس نے دکنی وضع قطع اختیار کی۔ لباس دکنی، سر کی پگڑی دکنی سلطان کا زیورات پہننا دکنی داڑھی صاف اور ہاتھوں میں جڑاو کے کڑے ہی نہیں بلکہ جیلم کی تقاضہ بھاگ متی کے ساتھ بیاہ کیا۔ نوروز سنکرات، بسنت کے تہوار کروفر سے منائے۔ مقامی تلگو زبان کو اختیار کیا اور اس میں شعر و شاعری کی۔ یہ میل ملاپ ہم آہنگی اور تمدنی امتزاج اپنی جگہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے جس کی مثال نہ شمال کی تاریخ اور نہ جنوب کے اتہاس میں مل سکتی ہے۔ اس اعتبار سے دکنی تمدن اپنی جگہ خاص روایات کا حامل ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ دکنی تاریخ کے اسباق کو نمایاں کیا جائے تاکہ ہندوستانی تاریخ کے پس منظر میں اشوک اور اکبر کے ساتھ دکنی حکمرانوں کو بھی امتیازی جگہ مل سکے۔

دو اور حیثیتوں سے قلی قطب کو جانچا جا سکتا ہے۔ ایک بحیثیت معمار اور دوسرے بحیثیت شاعر۔ حیدرآباد کی تاسیس اور تعمیر قلی قطب کے ہاتھوں ہوئی۔ بھاگ متی کے نام سے بھاگ نگر بسایا گیا۔ جب بھاگ متی کا نام حیدر محل ہوا تو بھاگ نگر حیدرآباد کہلایا۔ جان سے زیادہ عزیز قلی قطب کی ساری تمناؤں کا مرکز حیدرآباد اپنی جگہ ایک باترتیب شہر بنا۔ شہر کے بیچ میں چار مینار اور چاروں طرف سیدھی کشادہ سڑکیں، لب سڑک مکان، مدارس، شفاخانے، مسجدیں، مسافرخانے، میوے اور ترکاری کی منڈیاں، محلات شاہی، چندن محل، گگن محل، سجن محل۔ حقیقتاً حیدرآباد محمد قلی قطب کے اعلیٰ ذوقِ تعمیر اور اس کی ذاتی شان و شوکت کا مظہر ہے۔

قلی قطب نے دعا مانگی تھی:۔

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھا جیوں توں دریا میں من یا سمیع

یہ دعا قبول ہوئی اور فرشتہ جس نے اکبر کے بنائے ہوئے لاہور، آگرہ، فتح پورسیکری کو دیکھا تھا حیدرآباد کے متعلق لکھتا ہے کہ اس شان و شوکت کا شہر ہندوستان میں کہیں نہیں ہے۔ مآثر عالمگیری میں بھی لکھا ہے "ٹھنڈی ہوا بہتا ہوا پانی، زرخیز زمین کے باعث سارا علاقہ سبزہ زار ہے اور پھولوں سے معمور ہے۔ پھول جواہر کی طرح چمکتے ہیں" آج حیدرآباد ہندوستان کی ایک بڑی ریاست کا دارالخلافہ ہے۔ رہنے اور بسنے والے حکمران اور محکوم کچھ دیر کے لئے محمد قلی قطب کو یاد کریں اور سچے دل سے اس بڑے معمار کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کریں۔

قلی قطب نے اپنے تیس سالہ دورِ حکومت میں اردو زبان اور تلنگی کی بڑی خدمت کی۔ پہلے صاحبِ دیوان قلی قطب نے نظمیں، غزلیں، قصائد، رباعیات اور مثنویاں لکھیں۔ اس کا اردو کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس کو بڑی محنت اور کاوش سے ڈاکٹر زور نے ترتیب دیا ہے۔ قلی قطب نے اپنے کلام میں زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ اور سب سے امتیازی بات یہ ہے کہ قلی قطب نے اپنی زبان کے رچانے کے لئے مقامی زبانوں کے الفاظ کا بے ساختہ استعمال کیا ہے۔ تشبیہات اور استعارے بھی مقامی ہیں۔ قلی قطب کی نظمیں بسنت کی رنگ رلیوں، نوروز کا جشنِ طرب، پھر کڑی بچہ کے کھیل، محرم، شاہی سالگرہ،

عید میلاد، ہولی، ہر مقامی تقریب اور موضوع کی آئینہ داری اس شاعر نے زندگی کو اپنی شاعری کی اساس بنایا اور اس چشمے کا ایسا کوئی دھارا دتھا۔ جس سے اُس کے چمن کی آبیاری نہ کی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلی قطب نے فارسی سخن گوئی کی دیرینہ روایات کو ملحوظ خاطر نہ رکھ کر اپنا ایک مکتب خیال قائم کیا۔ غالباً اس کا اندازہ اس مصرع سے ہوتا ہے۔

مسلماں ریت کا فربیت کیا ریت نہ جانوں میں

فارسی شاعری کا تصوری ساقی قلی قطب کے پاس مفقود ہے۔ اس کا محبوب کم سن نہیں، سرمست شباب ہے۔ تصوری نہیں بلکہ جیتی جاگتی تصویر ہے۔ رنگ روپ کی کل ہے۔ بارہ پیاریوں والی نظم میں قلی قطب نے اپنی دکن کی کونلی، ہندی گوری، سانولی، نمی، چھبیلی کا تذکرہ جس لطف سے کیا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں کم ملتی ہے۔ اُس کی معشوق کے نینوں میں مد اور مکھ پر کنول، رخساروں پر بوس و کنار کے نشان ہیں۔ حسن و عشق کا جو تذکرہ قلی قطب نے کیا ہے۔ اُس سے مردے بھی جی اٹھیں۔ قلی قطب کی شاعری میں سوز نہیں، ساز ہی ساز ہے، رنگ رلیاں ہیں۔ کافر جوانی کا بانکپن ہے۔ اونچے سروں میں بجھنے والے اور جھوم جھوم کر گائے جانے والے گیت ہیں۔ اُس کی شاعری خزاں کا گیت نہیں، نغمۂ بہار ہے۔ اُس کا معشوق اس کی آس اور سانس ہے، زندگی کے ہر نفس میں، شراب ناب کے ہر جام میں، اُس نے عشق و عاشقی کا ایک مجسم نمونہ دیکھا۔ وہ خود کہہ اٹھتا ہے۔

پیا باج پیالا پیا جائے نا
پیا باج اک تل جیا جائے نا

یا پھر وہ آواز دیتا ہے :-

ساقیا آ شراب ناب کہاں
چند کے پیالے میں آفتاب کہاں

مس نجمہ صدیقہ
(ایم۔اے۔ عثمانیہ)

میر محمد مومن

عہد محمد قلی قطب شاہ کا ایک فارسی شاعر

مجموعی طور پر عہد قطب شاہیہ میں فارسی علم و ادب نے جو ترقی کی اس کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت ایک امر مسلمہ کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کا عہد اس اعتبار سے زیادہ درخشاں عہد تھا۔ چونکہ محمد قلی قطب شاہ خود شاعر ہونے کے علاوہ علم دوست اور ادب پرور بھی تھا لہٰذا اس کا دربار علامہ میر مومن استر آبادی، فرسی، قاضی سمنانی، مرزا محمد سیتافی اور میرک معین سبزواری جیسے بلند پایہ شعراء سے آراستہ تھا۔ ان تمام میں بھی میر مومن کو جو مقام حاصل تھا وہ اوروں کو نہ ہو سکا۔

علامہ میر مومن کا اصلی نام میر محمد مومن تھا۔ عام طور پر میر صاحب یا میر مومن کے نام سے مشہور ہوئے۔ خاندان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ استر آباد کے سادات عظام میں سے تھے۔ فرشتہ اس تعلق سے یوں رقمطراز ہے "میر مومن استر آبادی کہ آباء و اجداد نزد سلاطین ایران مقرر و مکرم بودند" مولانا فخر الدین ساکی سے قریبی رشتہ داری تھی یعنی میر صاحب کی والدہ مشہور عالم و فاضل امیر فخر الدین ساکی کی ہمشیر تھیں۔

اگرچہ میر محمد مومن دو بادشاہوں کے عہد میں پیشوائے سلطنت اور مختار کل جیسے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے لیکن قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کوئی خطاب قبول کرنا پسند نہیں کیا۔ لیکن باوجود اس کے قطب شاہی عہد کی تاریخوں اور مابعد تاریخوں میں انہیں کئی القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ جیسے "حدیقۃ السلاطین" میں ان کے لئے " نواب علامی فہامی پیشوائے عالیان میر محمد مومن " " نواب مرتضائے ممالک اسلام میر محمد مومن " کے القاب استعمال کئے گئے ہیں۔ اسی طرح " حدیقۃ العالم" میں "جناب سیادت منزلت مہر سپہر فضل و کرامت پیشوائے عالیان، المدیہ بتائید المہیمن میر محمد مومن" اور تاریخ قطب شاہی میں "قدوۃ، پیشوائے بحضرت رسالت میر محمد مومن" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ان کی تاریخ ولادت ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکی لیکن یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ۹۸۵ھ میں جبکہ وہ ایران چھوڑ کر ہندوستان آئے تو ان کی عمر کسی طرح تیس سال سے کم نہ تھی۔ آباء و اجداد نے بچپن ہی میں ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام اس قدر موزوں طریقے پر کیا کہ جس کے نقوش عمر کے آخری حصے تک بھی ان کی شخصیت سے جدا نہ ہو سکے۔ ابتداء میں خود ان کے ماموں یعنی مولانا فخر الدین ساکی نے انکو علوم عقلی و منقول کی تعلیم دی اور بچپن ہی تواضع، فروتنی، کسر نفسی اور خوش خوئی کی کچھ ایسی عادت ڈال دی کہ وہ تمام عمر اس پر عمل پیرا رہے علی ابن طیفور بسطامی نے لکھا ہے کہ "در ایام جوانی کہ بہار زندگانی است تحصیل کمالات نفسانی از حد حال بزرگوار خود نمودہ در علوم معقول و منقول نقش ہمت بر ضمیر طلبہ علوم مشتاق

بصفت تواضع و فروتنی و کسر نفسی و خوش خوئی اتصاف داشتند دوال باب مبالغہ می نمود" لیکن میر صاحب نے صرف ماموں ہی سے تحصیل علم پر اکتفا نہ کیا بلکہ علاوہ دینی و مشہور کتب احادیث سے بھی مستفید ہوئے اور مختلف علوم الٰہیہ میں کمال حاصل کیا۔

تحصیل علوم و فنون کے بعد جب وہ دربار شاہی میں پہنچے تو اس وقت ایران میں شاہ تہماسپ صفوی سریر آرا تھا۔ جب بادشاہ کو ان کی قابلیت کا علم ہوا تو اس نے انھیں نہ صرف شاہانہ نوازشات سے سرفراز کیا بلکہ فرزند ارجمند شہزادہ سلطان حیدر مرزا کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی ان کے ہی سپرد کر دی۔ اس سلسلے میں بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے انھیں شہزادے کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ اس امر کی شہادتیں ہمیں مختلف تاریخوں اور تذکروں میں ملتی ہیں۔ چنانچہ "ید بیضا" میں لکھا ہے کہ "در عہد شاہ طہماسپ بمنصب معلمی شہزادہ سلطان حیدر سرفرازی داشتہ۔"

اگرچہ انھیں ایران میں ایک خاص مقام حاصل تھا لیکن بہ تقاضائے حالات وہ اس بات پر مجبور ہو گئے کہ ترک وطن کر کے دکن میں قیام پذیر ہو جائیں۔ شہزادہ سلطان حیدر مرزا کی وفات ہی وہ پہلا محرک ہے جس نے انھیں ایران سے دل برداشتہ کر دیا۔ اس کے علاوہ ہم چشموں کا شدید حاسدانہ رویہ وغیرہ یہ تمام باتیں ایسی نہ تھیں کہ نظر انداز کی جا سکتیں۔ ان ہی تمام وجوہ کی بناء پر انھوں نے آخر کار ترک وطن پر کمر باندھی اور حج و زیارات کے فرض سے سبکدوش ہوتے ہوئے دکن آ پہنچے۔ دکن کا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کم عمر اور مطلق العنان بادشاہ محمد قلی قطب شاہ تخت سلطنت پر متمکن تھا۔

چونکہ وہ درباری زندگی کے سرد و گرم سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے انھوں نے یہاں آتے ہی شاہی دربار میں باریابی حاصل نہ کی بلکہ کچھ عرصہ تک چپ چاپ زہد و تقویٰ اور درس و تدریس میں مصروف رہے۔ اور جب بادشاہ کے ہاں ان کی رسائی ہوئی تو بادشاہ نے بڑے اعزاز و اکرام سے ان کا خیر مقدم کیا۔ محمد قلی ان سے بڑی عقیدت کے ساتھ پیش آتا تھا اور سلطنت کے تمام اہم معاملات میں انھیں دخل حاصل تھا۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ وہ بادشاہ کے دست راست سمجھے جاتے تھے۔ علاوہ سیاسی امور کے تعمیری کاموں کے سلسلے میں بھی بادشاہ نے ان سے ہمیشہ مشورہ کیا کرتا تھا۔ چنانچہ شہر کے نقشہ میں چارمینار، دار الشفاء اور خود دائرہ میر مومن کے محل وقوع وغیرہ سے متعلق امور بھی موصوف ہی کی رائے سے قرار پائے تھے۔

ڈاکٹر زور نے میر مومن کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میر صاحب کا کلام اس قابل ہے کہ اس کی خصوصیات پر تفصیل سے نظر ڈالی جائے اور ان کے پیش رو اور معاصرین شعرا کے ساتھ ان کا موازنہ کر کے فارسی شاعری میں ان کا درجہ متعین کیا جائے۔ لیکن میر مومن کے بارے میں خود ڈاکٹر زور کی یہ رائے تھی کہ "حیات میر مومن کا مطالعہ کرنے والے ان کے کلام کے مطالعہ سے یقیناً محروم رہیں گے کہ میر صاحب کوئی معمولی درجہ کے شاعر نہیں تھے کہ ان میں ایک استادانہ شان پیدا ہو گئی تھی" خیال کیا جاتا ہے کہ ان کا دیوان مشتمل بر قصائد، غزلیات اور رباعیات اب بھی حیدرآباد میں موجود ہے لیکن ٹھیک طور پر یہ معلوم ہو سکا کہ کہاں ہے۔ البتہ اودھ لائبریری کی مخطوطات کی فہرست Sprenger

نے تیار کیا ہے اس کے ذریعہ یہ حوالہ ملتا ہے کہ وہاں میر مومن کے دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے۔ فن طب میں بھی انہیں دخل حاصل تھا لہٰذا انہوں نے طبی اوزان وغیرہ پر ایک رسالہ موسوم بہ "رسالہ مقداریہ" لکھا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے نیز مختلف طبی تصانیف میں اس کی نقلیں یا اس کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ ایک اور کتاب موسوم بہ "کتاب رجعت" ان ہی کی تصانیف میں سے بتائی جاتی ہے۔ اس کے سوا ان کی تصانیف کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

میر صاحب کم و بیش عرفی شیرازی اور ابو الفضل و فیضی کے معاصر ہیں۔ اور میر صاحب کے کلام میں وہ اجزا اور عناصر ہیں جو ان کے ہم عصر اکابر شعرا کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اس دور کے شعرا نے اپنی شخصیت کا مشاہدہ ایک ایسے نقطۂ نظر سے کیا تھا جہاں سے وہ اپنی عظمتوں کو پہچان سکیں اور اس خود شناسی نے ان کے کلام میں ایک ایسا وصف پیدا کر دیا جسے ادبی تعلی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر شخصیت کے ساتھ مناسب انصاف کیا جائے تو اس طرز فکر کی قدر کی جا سکتی ہے۔ مثلاً فیضی کہتا ہے ؎

فیضی احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز
گرم دارد تو ہنگامۂ رسوائی را

عرفی کا شعر ہے ؎

عدلی ہمت عزفیت فطرت ساقی
کہ عالم دگراں وگدائے خویشتن است

میر مومن کے یہاں بھی اس طرح کی تعلی ملتی ہے ؎

تا بہ شاگردیِ عشق تو قدم فرسودیم
بوعلی را نہ رسد دعویٰ استادی ما

عرفی اور فیضی کے یہاں لاف و انانیت کسی استدلال کے بغیر ہے۔ میر مومن اپنی اہمیت کی سند عشق کی بارگاہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے یہاں جذبہ اور فکر کی ایک محتاط روش پائی جاتی ہے۔ مکتب عشق میں جب سے انہوں نے سبق لینا شروع کیا ہے اس کے بعد سے اب بوعلی کا وہ مرتبہ نہیں رہ گیا کہ وہ ان کی استادی کا دعویٰ کرے۔ گویا ان کا علم بھی فیضانِ عشق کا مرہونِ منت ہے، اور اسی کو وہ ام الکتاب سمجھتے ہیں۔

میر مومن اپنی فکر اور اسلوب دونوں میں عرفی سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ دونوں کم گو اور پر گو ہیں۔ دونوں نے عشق اور غم کی آگ میں تپ کر اپنی شخصیت کو نکھارا ہے اور غزلیاتی ادب میں عشق اور غم کے تصورات کو ایک نیا مزاج عطا کیا ہے۔ دونوں کے یہاں "عشق اور غم" کے تصورات بڑی حد تک مشابہ اور مماثل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حکیم عرفی کا مقام ہر حیثیت سے بہت بلند اور منفرد ہے لیکن میر مومن عرفی سے بہت قریب ہیں۔

یہ وہ مرتبہ ہے جو میرے خیال میں عرفی سے شیفتہ کو بھی باوجود کوشش کے حاصل نہ ہوسکا۔

عرفی اور مومن نے تصورات عشق کو نیا مزاج نئی تہذیب، اور نیا کردار عطا کیا ہے۔ دونوں عشق کی گرمی سے زمانے کے سامنے سرخرو اور سربلند ہیں اور دونوں عشق کی بارگاہ میں اپنے آپ کو حقیر سمجھتے ہیں۔ عرفی کہتا ہے کہ مکھی کو پروانہ بننے کے شوق نے جلا دیا ورنہ وہ تو عرفی کی طرح ننگ عشق تھی ؎

مگس را رغبت پروانگی سوخت
وگرنہ مثلِ عرفی ننگ عشق است

میر مومن بھی جب معیارات عشق پیش کرتے ہیں تو عشق مجنوں کو بھی کمینہ مرتبہ سمجھتے ہیں۔ اور اپنے معیار سے خارج قرار دیتے ہیں۔ ان کا شعر ہے ؎

کمینہ مرتبہ عشق، عشق مجنوں است
مجنتے کہ ازیں داخلِ محبت نیست

لیکن پھر وہ چونکتے ہیں کہ مجنوں کا نام خارج نہیں کیا جاسکتا اور اپنے دل کو ہوشمندی کی تلقین کرتے ہیں ؎

اے دل بہ ہوش باش کہ در شرعِ عاشقی
رفعِ قلم ز مردم مجنوں فکردہ اند

عشق میں چاشنی درد اور ذوق ملامت کے بارے میں عرفی نے کہا تھا ؎

بیا اے شوق و رسوائے جہانم کن کہ یکچند ے
نصیحت ہائے بے درد شنیدن آرزو دارم

میر مومن اس لذت درد اور اس انبساط ملامت کا تذکرہ یوں کرتے ہیں ؎

لذت ز درد، ذوق ز محنت گرفتہ ایم
مارا دو سرخوشی، ز ملامت گرفتہ ایم

عشق کے سبق اول کے بارے میں عرفی نے کہا تھا کہ ؎

عشق می خوانم و می گریم زار
طفل نادانم و اول سبق است

لیکن میر مومن نے طفلی اور نوآموزی ہی کے زمانہ میں مصحف مہر و محبت از بر کر لیا ؎

کم سِنی طفل نوآموز و علم را در عشق
مصحف مہر و محبت ہمہ از بر کردہ

اسی نوآموزی کے زمانے کا ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ؎

زدم بہ عشق جنون تختہ بر سر مجنوں
کہ دست سعی مریزاد کار فرما را

تصورات عشق کے سوانح کے تصورات بڑا بھی عرفی اور میر مومن ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں
عرفی نے کہا تھا کہ عشق نے اس کا دل آباد جب خریدا تھا تو ایک جو بھی قیمت ادا نہیں کی تھی لیکن وہ اپنے دل ویراں کو دو عالم کے داموں بھی بیچنے پر آمادہ نہیں ہے ؎

عرفی دل آباد بہ یک جو نہ خرد شوق
من این دل ویران بہ دو عالم نہ فروشم

میر مومن کہتے ہیں کہ اس معاملہ میں ان کو بھی ایک "عقل معاشی" حاصل ہے اور وہ بھی دونوں عالم کے عوض یہ سودا کرنے آمادہ نہیں ہیں۔ ان کی رباعی ہے ۔

غم نیست کہ دل جنون فاشی دارد
کز بے خبری و خوش انتعاشی دارد
سودائے ترا بہر دو عالم ندہد
دیوانۂ ما عقل معاشی دارد

عرفی نے اپنی مصاحبت کی ایک شرط یہ بتلائی تھی کہ جانگداز باتیں سننا پڑیں گی ؎

مصاحب غم عرفی شوی اگر خواہید
کہ استماع سخن ہائے جانگداز کنید

اس کے علاوہ بھی عرفی کے یہاں ایسے بہت سے اشعار ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عرفی کو کوئی ہمراہ موافق نہیں مل سکا جو نشیب و فراز اور خوشی و ناخوشی میں اس کا ساتھ دے سکتا۔ اور اس معاملہ میں جو مدعی بھی آگے بڑھا وہ پہلے ہی قدم پر ہمت ہار گیا۔ میر مومن کو بھی یہی شکایت ہے کہ انہیں کوئی "حریف ہم سفری" نہیں مل سکا ؎

با ما حریف ہم سفری نیست ہر کسے
کیں کارواں در اول شب بار می نہد

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے عرفی و مومن دونوں غم کو اپنی اقالیم سمجھتے تھے اور غم کی لذت سے آشنا تھے۔ عرفی کا تو یہ حال تھا کہ ان کے لئے حجلۂ گل بھی آراستہ کیا جائے تو انہیں دیوار گلستاں سے سر ٹکرانا پسند تھا۔ اور ہر شب وہ ہزار غم کدوں کا طواف

اس لئے کرتے تھے کہ خود کو حلقۂ شیون میں لا سکیں ؎

ہر شب ہزار غمکدہ را می کنم طواف
تا خویش را در حلقۂ شیون در آورم

اب میر مومن کا حال ملاحظہ فرمایئے۔ وہ کہتے ہیں۔

شادمانیست بندۂ غم ما | عالم دیگر است عالم ما
چند عشق از تنیجہ بلا | اے خوشا روزگار برہم ما
شاہ اقلیم درد و غم مائیم | ملک ہجراں سواد اعظم ما

یہ چند مثالیں اس غرض سے پیش کی گئی ہیں کہ عرفی اور میر مومن کے کلام میں جو مماثلت ہے اس کی وضاحت ہو سکے۔ اس میں شک نہیں کہ عرفی اور میر مومن میں ایک لحاظ سے بڑا فرق ہے کہ عرفی کی زندگی محض شاعرانہ زندگی تھی اور وہ جواں مرگ ہوا۔ میر مومن ایک شاعر محض کے علاوہ ایک تہذیب اور ایک تمدن کے معمار بھی ہیں۔ اور انھوں نے بڑے بڑے کام کرنے کے لئے طویل عمر بھی پائی۔ لیکن یہاں صرف دونوں کی شاعرانہ شخصیت کا چند اشارات میں موازنہ کیا گیا ہے جو ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ دونوں کے یہاں جذبات تہذیب یافتہ اور مرتکز، تخیل بلند و لطیف ہونے کے علاوہ فکر آمیز و فکر انگیز ہے۔ دونوں کی شاعری خودداری کی آئینہ دار اور کردار ساز ہے۔ دونوں حرکت اور انقلاب کے دلدادہ ہیں۔

مولانا رومی نے کہا تھا کہ ؎

پس قیامت شو قیامت را ببیں
دیدن ہر چیز را شرط است ایں

اور میر مومن کہتے ہیں کہ انہوں نے قیامت آفرینی کا کام کر کے قیامت دیکھ لی ؎

اگر دیدم قیامت را عجب نیست
کہ کارم با قیامت آفرینی است

اس ساری قیامت آفرینی کے باوجود انھیں اس کا احساس ہے کہ دنیا بے حسی کی ایک چٹان ہے۔ ساری مہمات فرد کو خود طے کرنی پڑتی ہیں اور کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ وہ کہتے ہیں کہ برسوں ان لوگوں کے ساتھ ٹھیرا جو "کس" سمجھے جاتے تھے اور ان لوگوں کے ساتھ بھی جو "ناکس" سمجھے جاتے تھے لیکن خلوص کسی کے یہاں نہیں پایا۔

سالہا گشتیم در کوئے کسی و ناکسی
روئے گرمی کس ندید ما تمونہ غیر از آفتاب

ابوطالب کلیم اگرچہ میر مومن کے بعد کا شاعر ہے اس نے بے وفائی حیات کو دو روز سے تعبیر کیا تھا۔ لیکن میر مومن

نے کہا ایک روز تو اس نے دیکھا ہے لیکن دوسرے دن کا تو صرف ذکر ہی ذکر ہے دیکھا کسی نے نہیں ؎

یک روزہ بود صحبتِ عالم ہمہ یک روز
زاں روے قیامت بہ زمانہا ہمہ فرداست

اس مضمون میں مختصر طور پر میر مومن کی غزل کے اشعار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ غزلوں کے علاوہ ان کے قصائد جدا طور پر توجہ چاہتے ہیں۔ میر مومن کے کلام پر ڈاکٹر زور کی اس رائے کے ساتھ یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے۔

" اگرچہ کلام مومن میں حافظ کی طرح رندی و بے باکی نمایاں نہیں ہے لیکن سوز اور جذبۂ شوق کی گہرائیوں کی وجہ سے اس کا پڑھنے والا ایک خاص وجدانی فضا میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ صاحبانِ دل اس کے کلام سے خاص طور پر متاثر ہوں گے۔"

نجم صدیقی (ایم۔ اے)
ریسرچ اسکالر آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

قطب شاہوں کے تعلیمی مراکز

یہ بات باعث مسرت ہے کہ ان تقاریب کی وجہ سے دکن کی تاریخ کا وہ دور جو نہایت باعظمت و شاندار مگر اسنادات کی کمی و کمیابی کی وجہ سے تاریک ہو گیا ہے۔ اب ظلمت سے نور کی طرف متحرک ہو چکا ہے اور اسی طرح کی مسلسل کاوشوں کا نتیجہ قطب شاہی حقیقتوں کو آشکار کرتا رہیگا۔

قرون وسطیٰ میں تعلیم کی یا نظام تعلیم کی کوئی مکمل تاریخ اس لئے نہیں کہ اس وقت لوگ تعلیم کو انسان کی بنیادی ضرورتوں میں شمار کرنے اور ان کے ریکارڈ کرنے کی طرف زیادہ ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے اس لئے اسوقت کا ابتدائی کمتی تعلیمی نظام جو تحتانوی درجہ کی حیثیت رکھتا تھا سیکھو اور سکھاؤ تھا اور حکومت بھی محض اسی وجہ اس طرف زیادہ توجہ نہیں دیتی تھی بلکہ ہر مدرسہ مکتب تھا اور ہر عالم معلم۔ علم جو فرض کفایہ تھا اس کی تکمیل علماء و شیوخ کے ذریعہ ہوتی تھی اور حصول علم کے شائق پروانوں کی طرح ان کے گرد جمع رہتے تھے۔ مختلف قسم کے علوم کے لئے مختلف علماء مقرر تھے اور یہی وجہ تھی کہ طالب علم کسی علم کے اکتساب اور مہارت کے لئے کوسوں سفر کرتا محنت شاقہ کرتا اور تکمیل کرتا تھا۔

وسطی دور میں فتوحات اور شکست کا اس تعلیم پر زیادہ اثر اس لئے نہیں پڑ سکا کہ یوں بھی علما مستغنی ہوا کرتے تھے اور حکومت کی امداد حاصل کر کے درس دینے کو معیوب سمجھتے تھے اس بارے میں ان کا استدلال تھا کہ حکومت امداد دیکر ان پر طرح طرح کی پابندی عاید کر دے گی اور علم اپنی اصلی حیثیت میں برقرار نہیں رہ سکے گا۔ اور جو امداد حکومت سے جاری رہتی تھی وہ وقف کی صورت میں ہوتی تھی اس لئے اس امداد پر فتح و شکست کوئی آنچ نہ لاسکی جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا کہ مدارس و مکتب میں یہ پابندی نہیں تھی کہ مختص مضامین ہی پڑھے جائیں اس لئے طلباء کو اساتذہ کا علم اپنی طرف کھینچتا تھا اور یہ طلب علم میں حرکت کرتے رہتے تھے۔ ان مدارس میں مقررہ مضامین نہیں ہوتے تھے یا یہ جماعتیں تقسیم ہونے سے جماعتی نصاب syllabus مقررہ نہیں تھا بلکہ کتابیں جو ابتدائی وسطی اور منتہی معیار کی ہوتی تھیں انہی سے طلباء کا معیار جانچا جاتا تھا۔ شلاً کسی طالب علم کا معیار معلوم کرنا ہو تو پوچھ لیا جاتا تھا کہ کونسی کتاب پڑھی جارہی ہے اور وہی کتاب اس کا علمی معیار ہوتی تھی۔

غرض ۱۵۱۸ء میں قطب الملک جو قوم میر علی سے تھا جس نے مشکلین وقت سے اپنی بہبودی کے لئے دعائیں حاصل کی تھیں سلطان محمود کے پانچ وزیروں میں سے ایک یہ بھی وزیر تھا۔ اس کی آنکھیں محمود گاواں جیسے بہمنی وزیر اور

علم کو ترجیح دیتی تھیں اسی نے محمود گاواں کے مدرسہ بیدر کو دیکھا تھا۔ علما کی صحبت سے فیض یاب ہوا تھا۔

دکن میں جس وقت ادب کا آغاز ہوا اس وقت بہمنی حکومت قائم تھی سلطنت مستحکم ہو چکی تھی نظم ونسق اچھا تھا علماء وصوفیا کی قدردانی ہوتی تھی صوفیائے کرام اور اولیائے عظام وعظ ونصیحت ارشاد وہدایت کا کام انجام دے رہے تھے علماء فن درس وتدریس میں مشغول تھے۔ گولکنڈہ اور اس کے اطراف واکناف کی دیگر بیرونی ریاستیں بھی مدرسہ گاواں سے متاثر تھیں اس لئے یہاں بھی اسی طرز پر مدرسہ کو عام کرنے کی جد وجہد ہونے لگی۔

سلاطین قطب شاہیہ کی تعلیم دوستی اس عہد میں اتنا عام نہیں ہوئی جتنی توقع کی جا سکتی تھی۔ البتہ اس دور کے چند مدارس بہت شہرت پائے جن میں چار مینار، جامع مسجد، قلعہ کا مدرسہ اور حیات نگر کا مدرسہ مشہور ہیں۔

چار مینار کے متعلق سے تاریخی خلاصہ میں ایک حد تک بڑی دلچسپ بحث اٹھائی گئی تھی جس کو مورخین نے قبول نہیں کیا اور وہ بات جوں کی توں رہی۔ گو دھاروار پرشاد کہتے ہیں مدرسہ سے ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں تمام اشیاء با آسانی دستیاب ہو سکتی ہوں اور چار مینار کے چاروں طرف بازار کا ہونا ثابت ہے جو ان کے قول کی دلیل بن سکتا ہے۔ ان کا کہنا ہے ممکن ہو اس لحاظ سے اس کا نام مدرسہ پڑ گیا ہو۔

عجیب بات یہ ہے کہ دور سابق کے جتنے بھی مورخین گزرے ان کو دربار سے کچھ نہ کچھ ملا ہوا تھا۔ اس لئے وہ فارسی نثر نگاروں کی مبالغہ آمیز تحریر کو اپنانے پر مجبور تھے اور بادشاہوں کی تعریف و توصیف کے پل باندھ دیا کرتے تھے۔ زمانہ زیادہ ترقی پر تھا اور حق پرستی کا ساتھ تھا اس لئے ہر معاملہ کو مذہبی رنگ دیکر اجاگر کر دیا کرتے تھے کہ کلمہ حق کہنے کے لئے فلاں بادشاہ نے جہاد کیا اور آناً فاناً اس نے اتنے بت گرائے مندروں کو مدرسوں میں تبدیل کیا اور مساجد و خانقاہیں تعمیر کیں۔ ایسے مورخین کے اجتماع نے چار مینار جیسی عمارت کو مدرسہ لکھدیا تو کوئی تعجب نہیں اور ان کے مخطوطات بطور ماخذ استعمال میں آنے لگے تو چار مینار مدرسہ نظر آنے لگا۔

مدرسہ کے قیام کے لئے جگہ، مقصد اور معیار سابقین سے مقرر ہو چکا ہے۔ ان اصول میں سے کسی ایک پر بھی یہ عمارت ٹھیک نہیں اترتی۔ جیسے مدرسہ گاواں عملاً شاہد ہے کہ مدرسہ ایسی جگہ بنایا جاتا ہے جہاں آبادی کی چہل پہل کم ہو۔ سواریاں زیادہ نہ چلتی ہوں اور وہاں پڑھنے والوں کی توجہ کسی بیرونی اثر سے بھٹکنے نہ پائے۔ دھوپ اور بارش سے طلبا کی مکمل حفاظت ہو سکے۔ اگر ان اصول پر چار مینار کو جانچا جائے تو معلوم ہوگا چار مینار چاروں سمت سے اتنا کھلا ہوا ہے کہ اس کے درمیانی حوض کو چھوڑ کر اس میں بارش سے پناہ لینے والا کوئی شخص بھیگے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دھوپ کا بھی وہی حال ہے خواہ مشرق کی شعاعیں ہوں یا مغرب کی۔ ہر طرف کی آمد ورفت طلباء کی توجہ منتشر کرنے میں بے مثال ہے۔ اب ایسے میں اس عمارت میں مدرسہ قائم کرنا قرین قیاس نہیں ہو سکتا اگر اس کے اوپر کی منزل بغرض مسجد کو دیکھ کر مدرسہ کہہ دیا گیا تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ مدرسہ میں پچھلے وقتوں کا نظم وضبط مکمل ہوتا تھا اور آداب کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ کوئی مدرس بلاوجہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتا تھا۔ طلبا خاص اہتمام سے اپنی جماعتوں سے

باہر نکلتے اور مدرسین کا ادب و احترام کرتے تھے نیز مختلف مضامین جو مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں ان کی مختلف جماعتیں ہوتی ہیں ان جماعتوں کو چلانے کے لئے کمروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کسی جماعت میں اس زمانے میں ۲-۴ طلباء تعلیم نہیں پاتے تھے بلکہ طلباء کی کثرت ہوتی تھی۔ نیز مدرسہ کا خود ایک اقامت خانہ ہوتا تھا کہ طلباء قیام کرسکیں۔ بنابریں فارسی تاریخ دانوں کی مبالغہ آمیزی سے آج ہم عقلی و مشاہداتی دور میں متاثر نہیں ہوسکتے۔

دوسری طرف اس کے بالمقابل جمعہ مسجد کا مدرسہ اپنی زبان حال سے آپ کو بتائے گا کہ وہ مدرسہ بننے کے قابل تھا۔ طلباء کے قیام کی ساری سہولتیں اس میں ہیں طلباء اس میں قیام کرتے اور درس لیا کرتے تھے۔ جس کو اب مدرسہ کے ایک عالم مولوی شجاع الدین صاحب کے نام پر مدرسہ شجاعیہ کہا جاتا ہے حال ہی میں اس مدرسہ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی ہے۔

قلعہ گولکنڈہ کی مسجد اور مدرسہ جو لنگر حوض کے قریب واقع ہونا بیان کیا جاتا ہے اس کے آثار اس مدرسہ کے وجود کا اس طرح پتہ نہیں دیتے جس طرح حیات بخشی بیگم کا مدرسہ حیات نگر اپنی پوری آب و تاب سے ہر دیکھنے والے کو عظمت رفتہ کی داستان سناتا ہے۔ ملا اماں کا یہ مدرسہ واقعتہً بے مثال تھا شہر سے شمال مشرق کی طرف بلدہ سے تقریباً ۱ میل دور ایک مسجد دو منزلہ کمروں کے ساتھ آج بھی پرانی یادوں کو تازہ کر رہی ہے۔

ان مدارس کے تفصیلی نصاب اور کتب وغیرہ پر انشاءاللہ تفصیلی نوٹ ادارہ ہذا کے سپرد کیا جائے گا جن کی وجہ سے باشعور سماج ترقی پاتا رہا۔

یہ سمجھنا کہ سماج کے بدلنے میں صرف مدارس کا حصہ ہی ہے بالکل ادھوری بات ہوگی۔ اس زمانے کے علما اور مشائخین بھی خانقاہی نظاموں کے ذریعہ افراد کو مکمل باشعور شہری بنانے میں ہاتھ بٹاتے رہے جن میں خصوصاً حضرت حسین شاہ ولی۔ حضرت میر مومن۔ حضرت محمود شاہ قادری، حضرت شاہ راجو قتال حسینی اور حضرت محمد حسن برہنہ شاہ جیسے بزرگوار قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کا حلقہ ارادت بہت وسیع تھا۔ مریدین و خلفا کی کثرت تھی درباری شعرا جیسے ملا وجہی، غواصی، احمد میر مومن، ملا خیالی۔ فیروز اور ابن نشاطی وغیرہ بھی کسی طرح پیچھے نہ تھے۔

پروفیسر حکیم عبدالوہاب ظہوری

قطب شاہی دور کے چند اطبار

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن کی سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے قطب شاہی خاندان نے گول کنڈہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں "بھاگ نگر" کا نام حیدرآباد رکھا گیا اور اس کو ایک نئی طرز سے بسایا گیا اس خاندان کے نامور بادشاہوں کی طبی دلچسپیوں اور ان کے درباری اطبا، اور ان کے چند طبی کارناموں سے حیدرآباد میں طب یونانی کی تاریخ کے باب کا آغاز کیا جارہا ہے۔ سرزمین دکن پر قطب شاہی خاندان تقریباً دو سو سال (۹۲۴ھ تا ۱۰۹۸ھ) آب و تاب کے ساتھ حکمران رہا۔ اس طویل مدت میں اس خاندان کے افراد نے علم و حکمت اور تہذیب و تمدن کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں وہ نہ صرف دکن کی بلکہ ہندوستان کی تاریخ کا سنہری باب ہیں اس خاندان میں کل آٹھ بادشاہ گزرے ہیں ان میں سے تین قابل ذکر تین بادشاہ ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ (عہد حکومت ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء تا ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۲ء) سلطان محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۲ء تا ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء) عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء تا ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء) ان کے دور میں حدود سلطنت نہایت وسیع ہو گئے تھے ایک نئے شہر حیدرآباد کی تعمیر ہو گئی تھی اور یہ تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا تھا جو عالموں اور فاضلوں طبیبوں تاجروں شاعروں اور سفیروں کا ملجا و ماوی تھا تمدن و ثقافت نے ایک خاص رنگ اختیار کر لیا تھا علم و ادب سے دلچسپیاں بڑھ گئی تھیں۔ اور طبی سرگرمیوں میں خاص اضافہ ہو گیا تھا۔

تاریخ نویسوں اور تذکرہ نگاروں نے اس عہد کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈالی ہے مگر اس دور کی طبی سرگرمیوں اور اطباء کے کارناموں پر پہلی بار روشنی ڈالی جارہی ہے طبی مخطوطات کی فراہمی اور چھان بین کے سلسلے میں ہمیں جو معلومات دستیاب ہوئی ہیں ان سے قطب شاہیوں کی طبی سرپرستی اور اطباء کی قدر دانی کا پتہ چلتا ہے ان کے دربار میں علما و فضلا اور اطباء کا جمگھٹ تھا جہاں دور دراز گوشوں سے علم و فن کے پروانے کھینچ کے چلے آتے تھے اس عہد کی طبی تالیفات طب کے مختلف شعبوں میں مفید اور قابل قدر اضافوں کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں طبی کتابوں کے نقل و ترجمہ اور تصنیف و شرح کے علاوہ تحقیقات و تجربات کا گراں قدر مواد بھی موجود ہے۔ اطباء کی شاہانہ قدر و منزلت اور ان سے فیاضانہ سلوک اور ان کے درباری تعلقات کا حال سن کر بغداد و قرطبہ کے خلفاء و اطباء کے باہمی روابط کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی سلطنت میں غیر معمولی تمدنی ترقیاں ہوئیں اس کے دور میں ایک نئے شہر حیدرآباد کی عجیب ڈھنگ سے تعمیر ہوئی چارمینار بنا اور دارالشفا تعمیر کیا گیا "مولف ماہ نامہ" نے اس دور کے

شفا اور مہمان سرائے کی ایک جھلک ان الفاظ میں پیش کی ہے۔ (فارسی عبارت کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے)

"دارالشفاء میں لگ بھگ چار ہزار بیماروں کے رہنے کا انتظام تھا ان کے کھانے پینے اور پرہیز کا معقول بندوبست کیا گیا تھا اطبا ان کا علاج کیا کرتے تھے (۵۲) سرائیں تھیں جہاں دور دور کے مسافر جن میں ترک و تاجیک بھی تھے مقیم تھے ان کی غذا اور ضروریات کی فراہمی کا انتظام تھا صاحبان حمام کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ جو بھی بے مقدور حمام میں آئے سرکاری اصلاح ساز اس کے بال تراشنے کے بعد اسے حمام میں لے جائیں اور نہلائیں اور اس کا کوئی معاوضہ طلب نہ کریں چنانچہ ہر روز ماہران حمام ہاتھوں میں لنگیاں لئے ہوئے اجنبی مہمانوں کے آنے کے منتظر رہا کرتے تھے۔" ("ماہ نامہ ورق" ۱۰۲ ب مخزونہ کتبخانۂ آصفیہ)

آج بھی محلہ دارالشفاء زبان حال سے گذشتہ دور کی طبی سرگرمیوں کی داستان دہرا رہا ہے یہ عمارت آج تک محلہ "دارالشفاء" میں اپنی یاد تازہ کر رہی ہے اس عمارت میں ایک مربع صحن تھا اور چاروں طرف دو منزلہ حجرے ہوئے اور یہی بیماروں کے رہائشی کمرے تھے۔ تاریخ قطب شاہی کا مولف لکھتا ہے۔

"در بلدہ حیدرآباد مسجد جامع باہتمام رسانید ند در پہلوئے آں مسجد حمامے درکمال لطافت ترتیب یافتہ ان ضعفے گذار بے مزد مقرر شدند"

شہر حیدرآباد میں ایک جامع مسجد تعمیر کی گئی اور اس کے پہلو میں ایک حمام نہایت سلیقہ اور پاکیزگی کے ساتھ ترتیب دیا گیا۔ سرکار کی طرف سے مفت میں کام کرنے والے حماموں کا تقرر کیا گیا۔

حمام کے قریب چار طاق (یعنی کمانیں) بنائے گئے تھے جن کی تیاری میں تقریباً تین لاکھ ہون صرف ہوئے اور ۔قوں میں سے آمد ورفت کا راستہ مقرر ہوا۔

"بجہتہ اطباء بہ سمت راستہ شمال باتمام رسانیدند در جنب آں نیز حمامے احداث نمودند اطبا ذکور بجہت محنت بمعالجہ مریضان حاضر باشند و مواجب ایشان از سرکار بود و ادویہ از دواخانہ سرکاری رسانیدند۔"

(تاریخ قطب شاہی صفحہ ۱۶)

قطب شاہی دور کے بہت سے اطبا کے نامی کارناموں اور ان کے علمی کارنامے حادثات زمانہ کی نذر ہوگئے۔ تلاش و تلاش کے دوران ایسی جو طبی دستاویزیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے طبی کارناموں اور ان کے معالجاتی خدمات اور سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔

میر محمد مومن - طب کے مولفین اور سرپرستوں میں میر محمد مومن کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ جنہیں قطب شاہی دور میں وہ بلند مقام حاصل ہوا جو کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا اس پر اسرار اور مقدس شخصیت نے قطب شاہی

سلطنت میں انتہائی عروج و اقتدار حاصل کیا دو بادشاہوں محمد قلی قطب شاہ اور سلطان محمد قطب شاہ کا دور دیکھا اور دونوں کے دور میں پیشوائے سلطنت کے عہدہ جلیلہ پر فائز اور مختار کل بنے رہے۔

طبی تالیفات

تذکرہ نویسوں نے میر محمد مومن کی طبی تالیفات میں سے صرف رسالہ مقداریہ کا ذکر کیا ہے جو سلطان محمد قطب شاہ کی فرمائش پر تالیف کیا گیا تھا لیکن ان کی ایک اور طبی تالیف کا پتہ چلا ہے جو "اختیارات قطب شاہی" کے نام سے محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں بادشاہ کی فرمائش پر لکھی گئی ہے اس کتاب کے دو نسخے کتب خانہ سالار جنگ بہادر میں محفوظ تھا اور نوادر میں ان کا شمار کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا تیسرا نسخہ پروفیسر شیرانی کے کتب خانہ میں ہے اس کے متن اور فہرست ہر دو کے صفحہ اول پر سلطان محمد قطب شاہ کی ہاتھ کی لکھی ہوئی عبارت موجود ہے اور سلطان کی مہر بھی ثبت ہے۔

موصوف نے دیباچہ میں تالیف کتاب کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کو علم و فن سے کافی دلچسپی تھی اکثر اوقات علماء و فضلاء کی صحبت میں تحقیق مسائل میں سرگرم رہا کرتا اور طبی مسائل میں گفتگو اور بحث ہوتی اختیارات بدیعی کا مطالعہ کرتا رہتا اور اکثر امور میں اس کتاب کی طرف رجوع ہوتا کیونکہ یہ کتاب بیشتر ادویہ مفردہ و مرکبہ کی جامع ہے اور اس میں جن دواؤں کے افعال وخواص اور تراکیب لکھے گئے ہیں وہ اس فن کی مقدمتر اول معتبر کتابوں مثلاً قانون منہاج جامع ابن بیطار جوامع اور تقویم الادویہ سے ماخوذ ہیں لیکن کتاب بعض خامیوں اور فروگذاشتوں سے خالی نہیں ہے اس لئے محمد مومن کو حکم دیا گیا کہ معتبر حکماء عصر کی امداد و اشتراک عمل سے اس کتاب کے ماخذوں کی طرف رجوع کریں اور موافق و مخالف پہلوؤں سے رجوع کریں اور موافق و مخالف پہلوؤں کی تحقیق و تنقیح کریں جو چیزیں موافق ہوں اس کی موافقت کی طرف اشارہ کریں اور اگر کچھ مخالف امور نظر آئیں تو ان کا بھی تذکرہ کر دیں اگر ماخذ کی عبارت کے حل کرنے یا سمجھنے میں مولف سے کوئی کوتاہی یا غلطی سرزد ہوئی ہو تو اس کی اصلاح کر دیں چنانچہ اس کتاب میں ان ہی مذکورہ امور کی رعایت رکھی گئی ہے پہلے اصلی عبارت نقل کی گئی ہے اور لفظ اصلی کو سرخی سے نمایاں کیا گیا ہے اس کے بعد جو زوائد و ملحقات ہیں لفظ "ملحق" سے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔

میر صاحب کی دوسری تصنیف "رسالہ مقداریہ" ہے جسے میر صاحب نے سلطان محمد قطب شاہ کی فرمائش پر ترتیب دیا تھا معلوم یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ نے قانونی ضرورت کے لئے شرعی وطبی اوزان وغیرہ کے معاملات میں مختلف ماہرین کے آپس میں اختلاف رائے دیکھ کر میر صاحب سے خواہش کی کہ وہ ایک ایسی محققانہ کتاب لکھ دیں جو قول فیصل کا کام دے چنانچہ خود میر صاحب لکھتے ہیں۔

"چون قدر و مقدار بعضے وز ہا دیپیا نہا دانستنی است و بجہت رعایت بعضی امور شرعیہ وبعضے اعمال طبیبہ و[illegible] ضروری است بنابریں دریں باب چند کلمہ کہ مناسب حال و مقتضائے ضیق مجال باشد مرقوم و معروض می گردد بہ حکم اشارت

واجب الاطاعت اعلیٰ حضرت اشرف اقدس"

یعنی شرعی اور طبی امور کے لئے بعض اوزانوں اور پیمانوں کا ٹھیک طور پر جاننا ضروری ہے اس لئے سلطان محمد قطب شاہ کے حکم کی بناء پر جو کچھ مجھ سے ہوسکا لکھ رہا ہوں۔

رسالہ مقداریہ بہت مقبول ہوا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس کو ایک مستند حوالہ کی کتاب سمجھ کر اس کی نقلیں اپنے یہاں رکھتے اور وقت بروقت مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس وقت اس رسالہ کے کئی قلمی نسخے موجود ہیں۔ ان میں سب سے اہم مخطوطہ خود میر محمد مومن کا لکھا ہوا یعنے مصنف کا اصلی مسودہ ہے جو نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس کے سرورق پر سلطان محمد قطب شاہ کی حسب ذیل مہر ہے۔

بندہ شاہ نجف سلطان محمد قطب شاہ

۱۰۲۰ھ

۲۔ شمس الدین علی الحسینی الجرجانی ماہر امراض چشم (کحال) قطب شاہی دور میں لکھے ہوئے جو طبی مخطوطات ہمیں دستیاب ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عالمین طب نے معالجات عامہ سے قطع نظر طب کے خصوصی شعبوں پر بھی توجہ صرف کی تھی علم الادویہ وہ اساتذی امراض چشم حفظان صحت جیسے اہم طبی موضوعات ان کے فکر و عملی کا مظہر تھے اس دور میں کئی نامور طبیب اور معالج امراض چشم (کحال) گذرے ہیں جن میں الجرجانی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے گو انہوں نے کحالتہ پر کوئی مستقل کتاب تالیف نہیں کی لیکن عرب طبیب وکحال علی بن عیسیٰ الکحال کی شہرہ آفاق کتاب "تذکرۃ الکحالین" کا فارسی ترجمہ کیا اور اس کتاب کو نظر اور عمل کی بنیاد قرار دی اور مریضوں کے معالجات چشم [illegible] پہلی بار روشناس کرایا

مترجم کتاب الجرجانی کے بیان کے بموجب اس کے دور میں بہت سے ماہر جراح موجود تھے [illegible] چشم میں ید طولیٰ رکھتے تھے الجرجانی نے ان کے عملیات کو بچشم خود دیکھا اور ان کو مختلف مریضان چشم پر آزمایا تھا [illegible] لکھی ہوئی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے اپنے آقائے ولی نعمت سلطان [illegible] شاہ کے حکم کے مطابق عرب طبیب علی بن عیسیٰ کحال کی مشہور کتاب تذکرۃ الکحالین کا عربی زبان سے فارسی میں ترجمہ (نقل) ہی نہیں بلکہ موصوف کے اقوال اور تجربات کی جانچ پڑتال بھی کی گئی ہے۔

۳۔ شمس الدین بن نور الدین۔

طب کی غرض وغایت حفظ صحت اور ازالہ مرض ہے اطباء نے ہر دور میں حفظان صحت کی اہمیت کو کبھی فراموش نہیں بلکہ سب سے پہلے اس کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیا قطب قطب شاہی دور کے طبیب شمس الدین بن نور الدین [illegible] جنہوں نے ابوالمظفر سلطان محمد قلی شاہ کے عہد میں حفظ صحت پر ایک رسالہ زبدۃ الحکم کے نام سے لکھا ہے یہ مختصر رسالہ حفظان صحت [illegible] پر بحث کرتا ہے جس میں بالخصوص اغذیہ واشربہ اور ان کے مفید مضر اثرات وخواص کی تحقیقات لکھی گئی ہیں۔

۴۔ عبد اللہ طبیب۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور میں ایک اور طبیب عبد اللہ نامی گذرے ہیں جنہوں نے علاج بالمفردات کی اہمیت پر ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام طب فریدہ رکھا ہے اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ امراض کی مختصر ماہیت علامات اور اسباب بیان کرنے کے بعد علاج ادویہ مفردہ کا تذکرہ کیا ہے اور اکثر امراض میں مفرد اغذائیں بھی لکھی گئی ہیں اور ہر نظام کے تحت مختصر اصول علاج بھی لکھے گئے ہیں۔ جابجا اطبا یونان و عرب کے اقوال و تجربات پیش کئے گئے ہیں۔

۵۔ تقی الدین محمد صدر الدین علی۔

قطب شاہی دور کے نامور فرماں روا سلطان محمد قطب شاہ (۱۰۳۵ - ۱۰۲۰) کے عہد میں بھی فاضل اور سربرآوردہ اطبا موجود تھے جن میں تقی الدین محمد بن صدر الدین علی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انہوں بادشاہ کے فرمان پر باشندگان دکن کے مزاج وطبیعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادویہ کے مزاج اور ترکیب پر ایک رسالہ "میزان الطبائع قطب شاہی" کے نام سے تالیف کیا۔

مولف نے تالیف کتاب کا سبب دیباچہ میں یہ بیان کیا ہے کہ سلطان محمد قطب شاہ کی محفل میں اکثر روسا اعیان حکومت کے علاوہ علما و فضلا بھی شریک ہوئے دستور تھا کہ اس محفل میں مختلف علوم و فنون پر مباحثے ہوا کرتے تھے ایک روز حسب دستور علمی مسائل کے ضمن میں چند طبی امور بھی زیر بحث آ گئے اور تفریح طبع کی خاطر بعض مفرحات اور معجونوں پر بھی خیال آرائی ہونے لگی۔ درباری طبیب تقی الدین نے عرض کیا کہ بندہ نے کچھ عرصہ قبل ادویہ کے اوزان و طبائع اور تراکیب کی تحقیق میں ایک رسالہ تالیف کیا تھا جو شاہی کتب خانہ میں موجود ہے یہ سن کر بادشاہ نے حکم دیا کہ اس پر نظر ثانی کر لی جائے اور جدید انداز میں ترتیب دیا جائے انہوں نے حکم کی تعمیل کی اور قدیم نسخہ کو سامنے رکھ کر نئے سرے سے رسالہ کا نام "میزان الطبائع قطب شاہی" رکھا۔

اس کتاب کی ابتدا میں غذا و دوا کی تعریف قوانین مزاج ادویہ و اغذیہ مفردہ و مرکبہ قانون ترکیب ادویہ مقادیر و اوزان و مرکبات کے مزاج کی پہچان کے بارے میں تفصیلی مباحث و معلومات پیش کی ہیں صفحہ ۶۷ سے ان مشہور مرکبات کا تذکرہ ہے جو معتبر اور مروجہ طبی کتابوں میں پائے جاتے ہیں مثلاً قانون ذخیرہ منہاج جوامع اور قرابادین قلانسی وغیرہ نیز ان مرکبات کے درجات طبائع بھی درج کئے گئے ہیں۔

تریاق فاروق کے اجزا مزاج اور تیاری کا طریقہ تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

اس کتاب کے مولف نے اختیارات بدیعی سے بھی استفادہ کیا ہے۔ صفحہ (۱۶۹) پر چند وہ خاص خاص نسخے لکھے ہیں جنکو علامہ میر محمد باقر داماد نے ایران سے بادشاہ کے لئے تحفۃً خاص طور پر دکن بھیجے تھے۔

۶۔ نعیم الملک گیلانی۔

قطب شاہی دور کے پہلے حکمران سلطان عبد اللہ قطب شاہ کے دور میں بھی بہت سے نامی گرامی اطبا گذرے ہیں جن میں سے ایک نامور طبیب نظام الدین احمد حکیم الملک گیلانی بھی ہیں جو اپنے وطن گیلان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور شاہجہاں کے عہد کے مشہور سپہ سالار مہابت خاں خانخاناں سے وابستہ ہو گئے مہابت خاں اور اس کے بیٹے خانہ زمان سے ان کے اچھے تعلقات رہے

جن کی محفل علماء ہند و ایران سے ہمیشہ آراستہ رہا کرتی تھی۔ ۱۰۴۲ھ میں قلعہ دولت آباد کی فتح کے بعد مہابت خاں اور حکیم الملک کے تعلقات کشیدہ ہوگئے ۱۰۴۴ھ میں مہابت خاں کی وفات کے بعد حکیم الملک اپنے دوستوں اور عزیز و اقارب کی ملاقات کی غرض سے عراق کا رخ کیا مچھلی بندر پر پہنچنے سمندر میں طغیانی کے سبب جہاز دستیاب نہ ہو سکا اور دوسرے موسم کا انتظار رہا اتنے میں تاجدار دکن سلطان عبداللہ قطب شاہ کا فرمان آیا اپنے حضور میں آنے پر بہت کچھ اصرار کیا گیا تھا جسے قبول کرنا پڑا دوئم بعد رخصت سفر باندھا اور عازم حیدرآباد ہوئے بادشاہ کے مقربان خاص میں جگہ پائی۔ چونکہ ان کا سرمایہ کتب نذر آتش ہو گیا تھا۔ اس لئے شاہ نے ان کے لئے کتب خانہ فراہم کیا اور ضروری کتابیں اس میں رکھوادیں حکیم الملک نے علمی و فنی خدمات کے علاوہ تعمیری خدمات بھی انجام دی ہیں۔

انہیں فن تعمیر میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا "حکیم پیٹھ" انہیں کا آباد کیا ہوا ہے جو بطور ایک زندہ یادگار کے آج بھی ان کے نام کو اجاگر کر رہا ہے یہ موضع قلعہ گولکنڈہ کی شمالی جانب ایک نہایت دل فریب اور پر فضا پہاڑی پر واقع ہے۔ اس پہاڑ پر انہوں نے ایک عالی شان قصر اور حوض تعمیر کیا تھا۔ محل ایرانی و ہندی صناعی کا نمونہ تھا جا بجا نقش و نگار اور گل بوٹوں سے آراستہ صحن میں سنگ مرمر کا فرش بچھا ہوا حوض کے کنارے روشن لگی ہوئیں فوارے بہتے ہوئے پہاڑ کے دامن میں ایک پر فضا باغ لگایا گیا تھا۔ پہاڑ کا نام "جبلی نور" رکھا گیا تھا راتوں میں چراغاں ہوتا تھا تو مہر تاباں کا شبہ ہوتے لگتا تھا اس دور کے متعدد شعرا مثلاً نورا گیلانی نصیری سیار قرا ملوی قاری دوانی وغیرہ نے "جبل نور" اور اس پر قصر، حوض اور مسجد کی تعمیر کو دیکھ کر حکیم الملک کو خراج تحسین ادا کیا ہے ان کے تعمیری ذوق کو سراہا ہے تاریخیں لکھی ہیں" جو "شجرہ دانش" حکیم الملک کی تصنیف کے آخری تیس صفحات پر مشتمل ہیں۔

تصنیفات حکیم الملک گیلانی نے علم کے ہر شعبہ پر رسالے لکھے ہیں۔ مختلف علوم و فنون میں ان کے رسائل دو ناموں کے تحت دستیاب ہوتے ہیں۔

۱۔ اوراق دانش آل بینش

۲۔ شجرہ دانش

ہمارے پیش نظر جو مجموعے ہیں ان میں سے ایک کا نام مجموعہ حکیم الملک ہے اور دوسرے کا "شجرہ دانش" اول الذکر میں فارسی رسائل کی تعداد زیادہ اور عربی رسالوں کی کم ہے اور دوسرے میں عربی، فارسی دونوں مخلوط ہیں۔ دونوں مجموعے قدیم ہیں اور بعض رسالے دونوں میں مشترک و مکرر ہیں ان میں سب سے زیادہ قدیم اور نادر مجموعہ "شجرہ دانش" ہے جو مصنف کی حیات میں لکھا گیا ہے بعض رسائل اور اشارات خود مصنف کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی رسائل کا کاتب ملا محمد لاری لاہوری ہے جو اکثر موصوف کے مسودوں کی کتابت کیا کرتا تھا شجرہ دانش کی تالیف و ترتیب کا سنہ ۱۰۵٦ھ ہے۔

محمد حسین جعفری (بی اے)

دکھنی تمدن قطب شاہی عہد میں

شمال اور جنوب کی تہذیبی لڑائی آریائی اور دراوڑی تمدن کے اختلاط اور عالمی تہذیبی رجحانات کا اثر دکن کے اعتدال پسند سرزمین میں اشوک اعظم کے دور سے قطب شاہوں کے وقت تک ایسا رہا کہ محفوظ سطح مرتفع دکن ہمیشہ تہذیبوں کا گہوارہ رہی۔ بیرونی سیاحوں اور تمدنی فن کاروں نے دکن کو وہ سارے عجائب دئے جو اس علاقہ کی تہذیب کو انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ اس سرزمین میں پہنچ کر علم کو شادابی۔ امن کو ترقی اور قوموں کے اتحاد کو توانائی نصیب ہوتی ہے۔ یہہ بات عہد قدیم سے آج تک کبھی جھٹلائی نہ جاسکی کہ طوفانوں نے اس تمدنی قلعہ سے ٹکرا کر ایسے تہذیبی لین دین کے راستے اختیار کئے جن کے شاہکار اہل قدیم کی نقاشی ہی میں نہیں بلکہ دور وسطی کی رنگ کاری اور گل کاری میں بھی نمایاں ہیں۔ دور وسطی میں دکن کو بیرونی عناصر کے اختلاط سے پیدا ہونے والی وہ تہذیب عطا کی جس کو دیکھ کر مورخین یہہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ دنیا بھر کا علم وفضل اور زمانہ بھر کا فنی ارتقاء دکن کی آغوش میں دیکھا جاسکتا ہے۔

قطب شاہی دور دکن کے ایسے تمدنی موڑ کا آئینہ دار ہے جس میں ایران۔ توران۔ فارس اور عرب ہی نہیں بلکہ اسپین اور بدخشان کی تہذیبوں کو ایک ایسے کوزہ میں سمو یا گیا۔ جس نے سب پر دکن کا رنگ چڑھا دیا۔ گولکنڈہ کی تعمیر دورویہ سرائیں۔ عالیشان شاہراہیں شاندار عمارات۔ خوبصورت مندرتیہ اور فن تعمیر کی شاہکار مسجدیں ہی نہیں بلکہ قطب شاہی گنبدیں بھی تمدن کے طالب علم کو اس ٹھنڈی ہوا کا سرمایہ دے رہی ہیں جو دکنی تمدن کا طرہ امتیاز ہے۔

یہاں پہنچ کر زبان میں میٹھاس، مزاج میں اعتدال اور خیالات میں بلندی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کے شاعر ایک بار اس خط میں آئے تو یہاں ایسے گم ہوئے کہ جیسے یہہ کوئی شہد کی کان تھی۔ علم موسیقی کے آفتاب بھی دکن ہی میں پیدا ہوئے اور جنوبی ہند کی موسیقی کو شمال کے تال سُر کا ہم آہنگ بنانے کا کام اسی خطہ ارضی نے کیا۔ قطب شاہی دور میں اعلی درجہ کے موسیقار۔ بہترین معمار۔ اونچی سطح کے عالم اور لاجواب صنعت کار ہی نہیں بلکہ ہر زبان کے بڑے بڑے شاعر جمع ہوگئے۔ ان میں قابل ذکر غواصی اور وجہی کے ساتھ گنگا دہر اور تنگا آریہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جن کے شاہکار دکنی تمدن کا کنگورا بنے ہوئے ہیں۔

خود محمد قلی قطب شاہ ایک صاحب دیوان شاعر تھے اور انہوں نے دکنی زبان کو وہ روح عطا کی جو آج دکن کے کلچر میں ہر سمت رچی ہوئی ہے۔ یہاں کے تہوار یہاں کے کھیل کود اور یہاں کی رسمیں یہہ ظاہر کرتی ہیں کہ تہذیبوں کے اس سنگم میں انسان

کرنے کے بعد دلوں سے کدورتیں دھل جاتی ہیں پیار اور محبت و رومان کا وہ ماحول پیدا ہوتا ہے جو علم و فن کی ترقی کے لئے ہمیشہ سازگار سمجھا جاتا ہے۔

دکن کے گیت اور یہاں کی رسمیں ہندوستان کے ہر گوشہ کی تہذیبی جھلک پیش کرتی ہیں اور یقیناً اس تمدنی عروج کا سہرا قطب شاہی دور کو حاصل رہا جس نے جنگ و جدال کی مختصر مدت کو بے چینی سے ختم کرکے امن و آشتی حسن و جمال کی نکہتیں اور جاہ و جلال کی تصور سازی اگر قطب شاہی دور کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا تو اس کے وزیر مادنا کی سیاسی سوجھ بوجھ ایک ایسی کتاب ہے جس کے مطالعہ سے رنگ، نسل، مذہب اور طبقہ کی لڑائیاں مٹ جاتی ہیں۔ اس نقش جمیل نے سادگی و پرکاری جیسی دلربا کیفیتیں یقیناً قطب شاہوں نے پیدا کیں اور یہی وجہ ہے کہ دکن کبھی ان کے احسانات کو فراموش نہیں کرسکتا۔

قطب شاہی تمدن کی عمارت محض ایرانی درباریوں سے ہی نہیں بلکہ بطور خاص دکھنی امراء سے سجائی گئی تھی جن میں آسیراؤ۔ دہرماراؤ۔ جگپت راؤ۔ سری راؤ۔ سایاجی۔ بھالے راؤ۔ مکندراج۔ شنکرراج۔ ہری چند را۔ راجندر۔ راونت راؤ۔ کرشناراج وغیرہ کے ساتھ شاہ میر۔ امین الملک۔ فتح الملک۔ خداوند خاں۔ عبدالکریم۔ حسن علی اور انور خاں کے علاوہ میر جملہ ادلی شامل تھے۔

بھاگ متی کے اس دیش میں صرف لذتوں کے دسترخوان ہی نہیں بلکہ روحانی بالیدگی کا سامان بھی تھا۔ مذہبی آزادی اور انسانیت نوازی کے داد محل اور خداداد محل اگرچہ تاریخ کی زینت بن گئے ہیں لیکن ان سے پیدا ہونے والی رواداریاں دکھنی زندگی کے ذرہ ذرہ میں نمایاں ہیں۔ آزادی اور عروج انسانی کے قدردان دکن کو ہر دور میں اپنی حریت پر در تو انائیوں سے سینچتے رہے۔ انقلابات نے اس تمدن کی عمارت سے ایک اینٹ بھی نہیں نکالی بلکہ چند منزلیں اور بڑھادی۔ یہہ دلکشی اور رومانیت قطب شاہی ذہن کی اس شادابی کا نتیجہ ہے جس نے ان بادشاہوں کے دل کو سب کے لئے محبت سے بھر دیا تھا۔ یہی وہ وجہ ہے کہ تاریخ دور وسطیٰ کے بجھتے ہوئے چراغ کی لو میں بھی قطب شاہی زندگی کی کرنیں دیکھ سکتی ہے۔ ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا نے دکنی تمدن کے اس دور کو سنہرے دور سے یاد کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنے کا سہرا قطب شاہوں کی سر ہے۔ جن کی بے تعصب نگاہیں اور وسیع النظر تہذیبی یادگاریں آج بھی قدم قدم پر اس دور کی یاد دلاتی رہتی ہیں۔

دکن میں چار مینار گیطرح رود موسیٰ کے کنارے پروان چڑھنے والے تمدن کی لازوال طاقت قطب شاہی دور کا معجزہ ہے۔ صنعتی ترقی۔ زرعی شادابی، معاشی خوشحالی اور علمی چہل پہل حضرت میر محمود اور میر مومن کے روحانی فیضان سے یہہ ثابت ہوتا ہے کہ دکن میں جذباتیت پر فکر و عملی کی حکمرانی رہی اور یہی وجہ ہے کہ تلنگانہ آج بھی قطب شاہوں کے امن و شانتی کے راگ الاپتا ہے۔ ملی جلی شادیاں اور ملے جلے رسم و رواج کے ساتھ مہمان نوازی کی روایات دکھنی تمدن کو زندہ جاوید بنانے والی صفات اگر قطب شاہی دور میں آراستہ ہوئی تھیں تو اس دور کے گلستان کی خوشبو آج بھی

ہماری زندگی میں مشترکہ اقدار زندہ ہے ۔

دیکھنے والی نگاہیں دکن کی عظمتوں میں ایک جیتی جاگتی روح کو آج بھی تلاش کرتی ہیں جس کا نام تھا محمد قلی قطب شاہ۔ اس کے فیضِ نظر نے اگر فرخندہ بنیاد کو انسانوں کی بلند پروازیوں کا گہوارہ بنایا و ہیں اس دور کے آثار ہمیں دعوت دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ۔

"یہ جنتِ نگاہ یہ فردوسِ گوش ہے"

دکھنی کلچر انہیں خوبیوں کی بدولت آج بھی ہماری قومی زندگی کا سرور بنا ہوا ہے ۔

(یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۶۶ء کے بین کلیاتی تحریری مقابلہ میں انعام اول کا مستحق مضمون جو ادبی اجلاس میں پڑھا گیا)

سید مجیب الدین (بی اے)

"دکھنی تمدن قطب شاہی عہد میں"

(بین کلیاتی تحریری مقابلہ یوم محمد قلی ۱۹۶۸ء میں انعام دوم کا مستحق)

قطب شاہی خاندان کی بنا ۹۲۲ھ م ۱۵۱۶ء میں سلطان قلی قطب شاہ ہمدانی نے ڈالی۔ اور اس سلطنت کا اختتام ۱۰۹۸ھ ۱۶۸۷ء میں اس کے آخری فرماں روا سلطان ابوالحسن قطب شاہ (تاناشاہ) کی اورنگ زیب کے مقابلہ میں ایک طویل اور صبر آزما جنگ میں شکست پر ہوا۔ اس کے بعد تقریباً پچاس برس تک ملک دکن میں سیاسی بدامنی کے بادل چھائے رہے۔ اس طرح دوسو سال کے عرصہ میں جو عہد قطب شاہی پر محیط ہے دکھنی تمدن کی ترقی و ترویج کا آفتاب عالمتاب اپنے نصف النہار پر ضوفشاں تھا۔

اس دور کے دکنی تمدن پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بہترین نظم ونسق عوامی بھائی چارگی اور رواداری۔ علماء فضلاء کی سرپرستی۔ عربی، فارسی، اردو اور تلنگی میں نایاب اور نادر روزگار تصانیف اور ذخیرے کا اضافہ۔

تعمیراتی کاموں کا ایک نیا سلسلہ اور نئے اسلوب اور پرشکوہ و پائیدار عمارات کا تیار ہونا اس سلطنت کے لئے ایک ایسی عام بات ہوچکی ہے جس سے اہل دکن کا بچہ بچہ بخوبی واقف ہے۔ اس کے علاوہ زراعت اور صنعت و حرفت کو اس قدر ترقی حاصل ہوئی کہ گولکنڈہ ایک عصری مملکت بن گیا تھا۔ لکڑی اور لوہے کی صنعتیں ترقی کی معراج پر تھیں۔ لوہے کے ہتھیار بیرون ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ ملبوسات بھی تن زیب۔ چھینٹ اور قلمکار (قلم کار) تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ مسولی پٹنم کے قلمکار جو آج بڑے بڑے خاندانوں میں دستیاب ہیں وہ قطب شاہی دور کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

اگرچہ دکن کا قطب شاہی دور بھی کم و بیش ہندوستان کے شمال میں مغلیہ سلطنت کا ہم عصر تھا لیکن قطب شاہوں کو ان کی رواداری بلند ہمتی انصاف رسانی اور دریادلی نے اکبر۔ جہانگیر اور شاہجہاں جیسے عظیم المرتبت بادشاہوں سے کسی درجہ کم نہ رکھا جس کا ثبوت مندرجہ ذیل چند خیالات اور حقائق سے ہوسکتا ہے جنہیں بیرونی سیاحوں اور مورخین نے ملک دکن کا دورہ کرنے اور یہاں بود و باش اختیار کرنے کے بعد ظاہر کئے تھے:

چنانچہ فرانسیسی سیاح "ٹیونر" شہر حیدرآباد کو پاکیزہ شہر اور ولیم میتھولڈ نے "ہندوستان کا بہترین شہر" کے نام سے یاد کیا ہے۔ مورخ ابوالقاسم فرشتہ نے جو ہندوستان کے تمام شاہی شہروں یعنی اکبرآباد سیکری وغیرہ سے

واقف تھا لکھتا ہے کہ :۔ ۱؎

" شہرے کہ در تمامی ہندوستان شرقاً غرباً شمالاً جنوباً مثلِ آں لطافت وصفا
ہرگز یافت نمی شود "

محمد ساقی جو اورنگ زیب کا خاص مورخ ہے لکھتا ہے :۔

" آرامگاہے است بر قطعہ زمین و بہشت راحتِ جسم و آرام جاں، آبادی وسیع تراز احاطۂ
خیال عمارات وسیع تراز پایۂ اندیشۂ ہندویں وادانی چشمہا شادابی سبزہ بہ رتبہ کہ پنداری کہ گل و
سبزہ ایں زمین را آبِ رنگِ زمرد دسل است "

عالمگیر جیسے عظیم شہنشاہ نے بھی جو کشمیر سے راس کماری اور گجرات سے بنگال تک سارا ہندوستان گھوم چکا تھا اس سرزمین
پہ قدم رکھا تو یہاں کی عالیشان اور فلک بوس عمارتوں کو دیکھ کر حیرت سے دریافت فرمایا کہ ۲؎

" ایں عمارتہا بلند بلند چیست "

جس کے جواب میں اس کے ندیم خاص نے برجستہ فرمایا " بلندہمت بود کہ عمارات پائے بلند ساختہ " دوسری جگہ اورنگ زیب
دکن کے بارے میں یوں رقمطراز ہے ۔ ۳؎

" یک قطعہ زمین بے مزروع نیست "

یعنی (No tract of land is left uncultivated). اور جب اورنگ زیب محمد قلی قطب شاہ کے اس
دادمحل کو جہاں عوام کی دادرسی کے لئے کوئی طلائی زنجیر نہیں بلکہ عوام کے دیوں کا درد سلاطین قطب شاہی اپنے خلوص
اور درد مندی کی زنجیروں سے محسوس کرتے تھے دیکھا تو فرمایا ۔

" ایں دادمحل است کہ شداد محل "

دراصل اورنگ زیب کے اس ایک جملے میں سلطنت مغلیہ سے قطب شاہی عمارات کا امتیاز اور برتری صاف ظاہر ہو رہی
ہے۔ دکن کے نظام آبرسانی، نہروں اور تالابوں کے بارے میں عالمگیری عہد کے مورخ خافی خاں نے منتخب اللباب جلد دوم کے
صفحہ ۸۶ پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے :۔

"It is not passible for me to do justice to the fountains and reservoirs, the loveliness of the weather, the beauty of darkish complexion and human form and figure of that fertile area."

۱؎ ۲؎ ۳؎ محمد قلی قطب شاہ

قطب شاہی دور کی تمام عمارتوں یا اس دور کے سامنے علماء اور شعراء پر روشنی ڈالنا اس مختصر سے مضمون کے بس کی بات نہیں پھر بھی ایک نہایت مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

ابراہیم قلی قطب شاہ کی تعمیری سرگرمیوں کے علاوہ علمی ماحول بھی بڑا سازگار تھا۔ اس کے دور میں رفیع الدین ابراہیم شیرازی نے جو دو وقت دکھن آیا تھا اپنی کتاب تذکرۃ الملوک میں لکھا ہے کہ ابراہیم قلی نے مدرسے قائم کئے تھے جہاں مفت تعلیم کے علاوہ طلبہ کو وظائف اور انعامات بھی دئے جاتے تھے۔ وہ شاعروں اور عالموں کی اتنی قدر کرتا تھا کہ جب بھی اس کے یہاں باغوں سے میوہ آتا تھا۔ تو اس کا کچھ حصہ وہ ان کے لئے ضرور روانہ کر دیتا تھا۔ اس نے لنگر خانے کی امداد میں اضافہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے علماء و شعراء کو فراغ حالی نصیب ہوگئی تھی۔ ابراہیم قلی کے دور میں اردو شاعروں میں ملا خیالی۔ سید محمود اور فیروز کا تذکرہ ملتا ہے اس کے علاوہ تلنگی کے شاہکار " سمپورن یا کھیانم " اور " بیاتی جیدند " اس کی علمی یادگار ہیں۔ قطب شاہی بادشاہوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ انکی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کے باعث اردو نظم اور نثر کے شاہکار مرتب ہوئے جو آج تک باقی ہیں اور ان سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔

قطب شاہی بادشاہوں میں سے آخری چار بادشاہ یعنی محمد قلی قطب شاہ۔ سلطان محمد قطب شاہ۔ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ نہ صرف شعراء اور ادیبوں کے سرپرست تھے بلکہ خود بھی صاحب کمال شاعر تھے۔ خصوصاً محمد قلی قطب شاہ قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے فارسی اور اردو کے علاوہ تلنگی میں بھی شاعری کی ہے۔ اس کا اردو شاعری کا دیوان دکھنی تہذیب و تمدن کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔

قطب شاہی دور میں بیسیوں اصحاب علم و فضل ایران سے گولکنڈہ آئے ان میں سے بعض اعلیٰ ترین عہدوں پر بھی فائز رہے۔ ان میں قاسم بیگ شیرازی (جو اپنے زمانے کے جالینوس مانے جاتے تھے) علامہ میر محمد مومن جو علامہ فخرالدین سماکی کے بھتیجے تھے (جنھیں شہر حیدرآباد کا آرکیٹکٹ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا) قاضی محمد سیستانی، میرک معین الدین شیرازی، مرزا محمد ابن شہرستانی (جنھوں نے خمسۂ نظامی کے جواب میں چار مثنویاں لکھی تھیں) سید کمال الدین مازندرانی، سید محمد سفر ایمنی، علامہ نقائی، مرزا فیض اللہ شیرازی المتخلص بہ برہان (آپ نے برہان قاطع جیسی نایاب لغت مرتب کی جوایران میں بھی مشہور ہے، یہ لغت گولکنڈے میں تصنیف ہوئی اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے نام پر معنون ہے) اور مرزا نظام الدین احمد شیرازی (آپ نے حدیقۃ السلاطین لکھی) قابل ذکر ہیں۔ [1]

قطب شاہی دور میں علم و فن اور شعر و ادب کی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں چنانچہ سلطان محمد قطب شاہ کو علم و فن سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کا زمانہ ادبی اور علمی مجلسوں ہی کے باعث شہرت رکھتا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور سے پتہ چلتا ہے کہ خود بادشاہ کی موجودگی میں رات رات بھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ ہر منگل کے روز جو عام تعطیل کا دن تھا بادشاہ کا مشغلہ یہ تھا کہ شعر و سخن سے

---

[1] دکھنی کلچر ۔ نصیرالدین ہاشمی

ہے۔ ان کی سلطنت کے فقہا و علماء ... ... روشناس ہوتا رہے۔ وہ فقہا کے کلام پر تنقید و تبصرہ بھی عمل میں لاتا تھا۔ اس کے زمانے میں علامہ نظام الدین احمد قابل ذکر ہیں۔ علامہ ابن خاتون (جن کا مزار پرانی حویلی سے جانب منڈی میر عالم صرف چند گز کے فاصلہ پر ہے) اگرچہ وزیر اعظم کی خدمت پر مامور تھے۔ لیکن اس کے ساتھ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا ان کا دولت خانہ ایک طرف حکومت قطب شاہی کا باب حکومت اور دوسری طرف تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کی وجہ سے دارالترجمہ اور یونیورسٹی بنا ہوا تھا۔ اس دور میں نہ صرف دکھنی فارسی اور عربی شاعری پروان چڑھی بلکہ تاریخ، فلسفہ، ریاضی، منطق اور ادب کی کتابیں بھی مرتب ہوتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تلنگی ادب کی سرپرستی بھی ہوتی تھی بلکہ قطب شاہی دور کو تلنگی ادب کا سنہرا دور کہا جا سکتا ہے۔ قطب شاہی دور کا ایک امیر امین الملک تھا اس کا باغ آج بھی (Govt. Maternity Home) کی صورت میں موجود ہے۔ اس امیر کا متوسل ایک تلنگی شاعر "پونی گنتی تیلگنا" تھا۔ جس نے اپنی ایک طویل نظم "پیاتی چرتر" میں اپنے محسن امین خاں کی تعریف میں پانچ سو سطریں وقف کردیں۔ جس وقت وہ نظم سنانے کے لئے اس کے دربار میں باریاب ہوا تو کہتا ہے کہ [1]

"مجسم اخلاق امین خاں نے مجھے اپنے قریب بیٹھنے کی عزت بخشی میرے جسم پر خوشبوئیں لگائی گئیں۔ ایک جناب عمدہ کیسری رنگ کا شال میرے کندھوں پر ڈالا گیا۔ اور جواہر کا ایک ڈبہ جس میں کئی لعل تھے مجھے دیا گیا۔ اور اس کے بعد نظم سنانے کی فرمائش کی گئی"

علمی اور ادبی خدمات کے بعد ایک سرسری نظر قطب شاہی عمارتوں پر ڈالے بغیر یہ تذکرہ نامکمل رہے گا کیونکہ قطب شاہوں کے طریق بود و باش کا اندازہ ان کی عمارتوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ بعض عمارتیں آج تک موجود ہیں اور بعض کی صفحات تاریخ پر تعریف رہ گئی ہے۔ شاہی بارگاہ تو گویا ان کے رہنے کے قصر بھی اس قدر بلند تھے کہ ان کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اندر سے بہترین قالینوں کا فرش اور چینی و بلوریں آلات کی سجاوٹ اور باہر سے عمارتوں کی رفعت و باغبانی بڑی کیفیت پیدا کرتی تھی۔ اس کا اندازہ اس ایک مثال سے مل سکتا ہے کہ ایک مغل شہزادے کام بخش نے جو شاہ جہاں کے محلات کا رہنے والا تھا قطب شاہی سلطنت کے خاتمے کے بعد جب حیدرآباد میں بحیثیت صوبہ دار قیام گزیں ہوا تو اس نے "چار محل" کو جو اس دور میں جدید ترین محل کی حیثیت رکھتا تھا محض اس میں رہنے اور فرش و فروش کا انتظام نہ کر سکنے کی بنا پر چھوڑ کر اپنے لئے ایک علحدہ حویلی موجودہ سٹی کالج کی جگہ بنانی شروع کی۔ اور نگ زیب کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے فرزند کو ڈانٹا کہ [2]

"باوجود بودن مکانہائے متعدد قطب شاہی از سر نو عمارت تو بہ احداث درآوردن اسراف بیجا است"

---

[1] داستان ادب حیدرآباد مصنفہ ڈاکٹر زور [2] حیدرآباد فرخندہ بنیاد از ڈاکٹر زور

معلوم نشد کہ کدام فائدہ از آں مترتب بودہ باشد عاجلہ بعزض رسانند ۔"

اس کے جواب میں شہزادے نے لکھا۔

......" اما فدوی را باوجود صوبہ داری و مختاری حیدرآباد و ممالک محروسہ متعلقہ آں مقدوری نیست کہ روشنی چراغ ہائے معمولی شام درآں عمارات عالیشان کہ بذاتہ می نمودہ باشد۔ تا بہ روشنی تمام شب و بودن درآں جا و بسر بردن دو تا تہا چہ رسد۔ ایں حوصلہ ہماں شاہانِ بابرکات و سلاطین صاحب نیات بودہ کہ دریں عمارت روشنی باکردہ تماشا ہا دیدہ ۔ و خود تعمیر درآوردہ جشن ہائے شاہانہ نمودہ سکونت ورزیدہ اند"

(گلزار آصفیہ)

حویلی کام بخش شہر حیدرآباد میں زمانہ حال تک موجود تھی۔ پتھر گٹی کی سڑک کی توسیع کے لئے اس کے دونوں طرف کے مکان منہدم کر دئے گئے۔

گولکنڈے کے شکستہ محل اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان مکینوں کے مکان کس وضع اور کس نہج کے ہوتے تھے اور انھیں باغوں چھتوں آبشاروں حوضوں اور نہروں سے کس قدر دلچسپی اور دلبستگی تھی۔ ان محلوں سے اب بھی یہ پتہ چلتا ہے قصر و ایوان کی اوپری منزل پر بھی حوض بنائے جاتے تھے اور چمن بندی کی جاتی تھی۔ محلوں کے دروازے وسیع، کرسی مرتفع، حجرے کشادہ اور شہ نشین بلند و بالا ہوتے تھے۔ قطب شاہی عہد کی مسجدوں میں سب سے پرانی مسجد قلعہ کی جامع مسجد ہے جو مسجد صفا کے نام سے مشہور ہے بانی سلطنت نے اسے تعمیر کروایا جس کی گواہی آج تک بھی اس کے کتبے سے ظاہر ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کے پچیس سال بعد وہ اس مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے ۹۹ سال کی عمر میں شہید کیا گیا۔ چارمینار کے اوپر کی مسجد اور اس کے بازو جامع مسجد بھی اپنے اور اپنے معماروں پر فخر کرتی ہیں۔ قطب شاہی مقبروں میں حیات بخشی بیگم کے مقبرے سے متصل اس نیک بخت ملکہ کی مسجد کلاں ہے اور اس کے مقبرے کی سیڑھیوں سے متصل ایک چھوٹی سی مسجد ہے اور اسے اورنگ زیب نے اپنے لئے گولکنڈے کے محاصرے کے وقت تعمیر کروائی تھی۔ مکہ مسجد کی نسبت فرانسیسی سیاح تھیونو کا بیان[1] ہی کافی معلوم ہوتا ہے:-

"پچاس برس ہوئے جب سے یہاں ایک عظیم الشان مسجد بن رہی ہے اگر پوری ہوگئی تو یقیناً تمام ہندوستان کی مسجدوں سے بڑی اور تمام ایشیاء کی عمارتوں سے بہتر ہوگی"

مگر افسوس کہ یہ مسجد نہ سلطان محمدؒ کے عہد میں پوری ہوئی نہ قطب شاہی عہد میں۔ اورنگ زیب نے اسے جوں توں ختم کرا دیا۔ اگر یہ اپنے اصلی نقشے کے متعلق بنتی تو تھیونو کی پیشن گوئی پوری ہوتی۔ اس کے علاوہ امیر المسجد، مشیر آباد کی مسجد قطب شاہی

---

[1] حیدرآباد فرخندہ بنیاد

اورکاروان کی ٹولی مسجد اور ایسی ہی دیگر سیکڑوں قطب شاہی مساجد ہیں جن میں سے ہر ایک پر (ایک ہزار الفاظ سے زیادہ) مضامین لکھے جاسکتے ہیں۔ دیگر عمارتوں میں چار مینار' چار بازار۔ چارکمان' کمان سحر باطل' چارسو کا حوض' دارالشفاء' یلغ محمد شاہی اور ایسی ہی دیگر عمارتیں رفاہ عام کے لئے بنائی گئی تھیں۔ محلات میں دولت خانہ عالی۔ چندن محل۔ سجن محل' اعلیٰ محل' حنا محل' دادمحل' ندی محل' قطب مندر۔ ملک محل۔ محل کوہ طور۔ چار محل۔ حویلی اکلم بخشی اور خدا داد محل جسکی آٹھ منزلیں تھیں اور جن کے نام الہیٰ محل محمدی محل' حیدر محل۔ حسنی محل' حسینی محل' جعفری محل۔ موسوی محل وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ سلطان محمد قطب شاہ نے کئی محل مثلاً محل نبات گھاٹ۔ نئی باغ حوض گوشہ محل۔ باغ دلکشا اور گگن محل وغیرہ تعمیر کروائے۔

سلطان محمدؐ قطب شاہ کے تعمیری ذوق اور اسکی عمارتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے عہد میں شہر حیدرآباد میں جتنی عمارتیں' مسجدیں اور گنبد تعمیر ہوئے وہ سب مصفیٰ اور تراشیدہ پتھروں سے بنائے گئے تھے اور ان پر بیرونی طرف گچے کی استرکاری نہیں کی جاتی تھی محمد قلی قطب شاہ کی بنائی ہوئی عمارتیں چونے کی استرکاری اور نقش و نگار سے آراستہ ہوتی تھیں۔ اس کے برخلاف سلطان محمدؐ نے یہی کام پتھر کو صاف اور مصفیٰ کرکے اور اس پر نقش و نگار کندہ کرکے لیا تھا۔ سلطان محمدؐ کے بعد اس قسم کی عمارتیں صرف عہد آصفجاہ سابع میں بنوائی گئیں چنانچہ عدالت العالیہ اور جامعہ عثمانیہ کا آرٹس کالج اس عہد کی اس طرح کی ایک تعمیری یادگار ہے جس طرح کی سلطان محمدؐ کی یادگار مکہ مسجد۔

قطب شاہی عہد کے بزرگان دین اس دور کے سکوں' مہروں' گنبدوں اور ایسی ہی دیگر کئی اہم چیزوں کو نظرانداز کرتے ہوئے مختصر طور پر اُس زمانے کے لباس پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ تاریخ گولکنڈہ سے پتہ چلتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ سر پہ سمور کی کلاہ کے بجائے دکھنی وضع کی پیچ دار پگڑی' پوستین اور ایرانی قبا کے عوض ململ کا جامہ اور شبنم کا نیمہ پہنتا تھا۔ اور ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے ہوتے تھے۔ امراء اور عوام بھی یہی لباس پہننے لگے تھے۔ بجائے قبا اور پوستین کے جو ترکستان اور ایران سے آئی تھیں جامہ اور نیمہ پہنتے تھے اور کم درجے کے لوگ ململ کا انگرکھا اور چہ بند پہنتے تھے جو خاص دکھن کا ہوتا تھا۔ سر پر دکھن وضع کی سفید یا رنگین پگڑی باندھتے تھے اور پیر میں آ شاہی جوتی ہوتی تھی۔ سپاہیوں کے علاوہ عام لوگ بھی باہر نکلتے تو کمربستہ اور مسلح ہوتے تھے اور تقریباً ہر شخص تلوار اور لکڑی کے ہاتھ جاتا تھا جو دکھن کا خاص فن تھا۔ جب امراء دربار میں جاتے تو سر پر دکھنی دستار پہنتے تھے اور کمر میں گلوبس باندھتے تھے۔

قطب شاہی دور میں عید۔ شب برات۔ عید میلاد۔ ہولی اور بسنت کے علاوہ محرم بہت شان اور عقیدت و احترام سے منائے جاتے تھے۔ سارے تہواروں میں ہندو مسلم عوام برابر شریک ہوتے اور قومی عید کی طرح مناتے تھے۔ محمدؐ قلی قطب شاہ اپنے مذہب اور خاص طور پر اہل بیت رسولؐ کا بہت زیادہ معتقد اور پیرو تھا۔ چنانچہ جہاں بھی وہ اپنی بارہ پیاریوں کا ذکر کرتا ہے وہیں وہ بارہ اماموں کو بھی نہیں بھولتا۔ اُس کے دیوان کی ہر نظم' غزل اور مرثیہ اس بات کے شاہد ہیں۔ ایک ہزار سے بھی زیادہ صفحات پر مشتمل اس کا یہ عظیم کلیات نہ صرف اپنے خالق کی یاد کو

(باقی ص ۴۵ پر)

قدر بانو (بی، اے عثمانیہ)

"دکنی تہذیب و تمدن قطب شاہی عہد میں"

(یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر منعقدہ بین کلیاتی تحریری مقابلہ کا مضمون (انعام سوم)

فنون لطیفہ میں شاعری، موسیقی، مصوری اور سنگ تراشی کو خاص اہمیت حاصل ہے چونکہ کسی سماج کو سمجھنے میں ان سے بڑی مدد ہی نہیں ملتی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں تمدن نے کتنی ترقی کی تھی۔ ان خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کا عہد بھی اپنی تہذیبی، مجلسی اور مذہبی روایات کے اعتبار سے ایک ایسا ترقی یافتہ عہد تھا جس نے ایک نئے کلچر کو وجود بخشا۔ دکھنی تہذیب اسی کے عہد کی صورت گری کرتی ہے۔ اس عہد میں جتنی تخلیقات وجود میں آئیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب فن کمال کو پہنچ جاتا ہے تو ابدیت اس کی حفاظت کرتی ہے اور خواب اجل بھی اس کو موت کی نیند نہیں سلا سکتی۔ آنے والی نسلیں اس کی تنویر میں چلتی ہیں جو اس کی تخلیق کارناموں کی حیثیت میں باقی رہتی ہیں۔ یہ تفصیل کا محل نہیں ہے۔ اختصار کو ملحوظ رکھتی ہوں۔

اس تمہید سے میرا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کا عہد بھی ایک تخلیقی عہد تھا۔

محمد قلی قطب شاہ ۱۷ رمضان ۹۷۳ھ ۱۵۶۶ء میں پیدا ہوا۔ ابراہیم قطب شاہ کے تیسرے فرزند تھے۔ ۹۸۸ھ میں ابراہیم قطب شاہ کے انتقال کے بعد پندرھویں برس کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ تخت نشینی کے بعد سلطان محمد قلی نے ایک قطب شاہی امیر میر شاہ تقی عرف امیر شاہ میر اصفہانی کی دختر سے اپنا عقد کیا۔ اس نے حیدرآباد میں تیس (۳۲) سال تک شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی جس کی وجہ سے وہ دکن کے بہت بڑے سورما اور معمار تہذیب سمجھے جاتے ہیں۔

سلطان محمد قلی جنہیں شہر حیدرآباد کے معمار اول ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ ایک وسیع النظر، وسیع المشرب بادشاہ تھا۔ اس زمانے میں قطب شاہی سلطنت نصف النہار پر پہنچ گئی۔ ان ہی دنوں میں قلعہ محمد نگر (گولکنڈہ) میں جہاں پایہ تخت سلطنت تھا۔ گولکنڈہ میں آبادی کثرت کی وجہ سے نیا شہر حیدرآباد بسایا گیا۔ قلی قطب شاہ نے موسیٰ ندی کے کنارے اس عظیم شہر کو بساتے ہوئے یہ دعا کی تھی کہ میرا شہر ہمیشہ لوگوں سے معمور رہے اور ان کی یہ دعا تھی کہ شہر کی آبادی میں ایسا اضافہ ہو جیسے پانی میں مچھلیاں پھلتی پھولتی ہیں۔ خدا نے ان کی یہ دعا قبول کی ہے کہ اس وقت

سے لیکر آج تک ہمارا شہر پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے اور اس کی آبادی میں روزانہ اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ گولکنڈہ کے عوام کے لئے حیدرآباد تک پہنچنے کی خاطر ابراہیم قطب شاہ نے پرُانا پل تعمیر کروایا۔ چنانچہ بھاگ متی خود دربارشاہی کی منظورِ نظر طوائف تھی۔ اس لئے قلی قطب شاہ نے مچلم کے پاس ہی شہر کی بنیاد ڈالی اور اس نئی بستی کا نام بھاگ نگر کر دیا بھاگ متی کی وفات پر جسکو دربار شاہی سے حیدر محل کا لقب مل چکا تھا اس شہر کا نام دفاتر میں حیدر محل، حیدرآباد سے بدل دیا گیا۔

بادشاہ نے اس شہر میں علاوہ زمین دوز نہروں، فوارہ، فوارں۔ چارمینار۔ چارکمان۔ حوض چارسو۔ جامع مسجد۔ دارالشفاء۔ دولت خانہ عالی۔ عاشور خانہ شاہی۔ تالاب میرجملہ وابراہیم پٹن۔ لنگر دوازدہ امام۔ نبات گھاٹ۔ کوہ طور۔ باغ دلکشا۔ باغ محمدی اور متعدد فلک بوس محلات اور بازاروں سے اپنے نئے پایہ تخت کی آرائش کرکے اس شہر کو ایک شگفتہ چمن بنا دیا۔ ان کے علاوہ قطب شاہی مساجد کی تعمیروں میں محمدؐ قلی کی بنائی ہوئی مسجد کو اولیت حاصل ہے جو گولکنڈہ میں واقع ہے۔

ہندوستان میں لوگ شہنشاہ اکبر کو ہی ان خصوصیات کا بانی سمجھتے ہیں مگر تاریخ ہند لکھنے والے اس کو بھول جاتے ہیں کہ اکبر سے پہلے ہی دکھن میں قلی قطب شاہ نے اس ہندوستانی کلچر کی تعمیر کا کام شروع کردیا تھا۔ اس بادشاہ کو اپنے ملک میں ایک مشترک تمدن کے رواج دینے کا اتنا زیادہ خیال تھا کہ چارمینار بنوایا تو اس پر مسجد کے سامنے مندر بنایا اور اپنا گنبد بنوایا تو اس میں اسلامی طرز تعمیر کے ساتھ ہندو مندروں جیسے چھجے اور باب الداخلہ بنوائے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس خاندان کے آخری دور میں جب موسیٰ خاں نے ٹولی مسجد بنوائی تو اس میں بھی مندروں کی طرح دھارے بنوائے۔ چارمینار کی مقبولیت اور اس کی وضع تمام ہندوستان میں اتنی پسند کی گئی کہ اکبر بادشاہ کے مقبرہ کے باب الداخلہ کی تعمیر میں چارمینار کی نقل کی گئی۔ جب ہی تو فرنیسی سیاح تھینونو Theono نے کہا تھا کہ چارمینار دنیا کی اہم بلند شان عمارت ہے۔ اس شہر کی تعمیر کے بعد جب باہر کے مورخین تشریف لائے تو اس شہر کو دیکھ کر سب کے سب دنگ رہ گئے۔ اور ان کے قلم کچھ نہ کچھ تعریف کے چند سطور لکھے بغیر نہ رہ سکے۔ مورخ فرشتہ اس شہر کو ہندوستان کا بےنظیر شہر کہتا ہے۔ ولیم میتھولڈ ——— (William Methold) کہتا ہے کہ یہ ہندوستان کا بہترین شہر ہے۔ مغل مورخ خافی خاں اور شہنشاہ اورنگ زیب کے مورخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کی تعریف ناممکن ہے۔ یہاں پر ایک اور امر بھی قابل صراحت ہے وہ یہ کہ محمد قلی کا خداداد محل جو سات منزلہ ایوان تھا اس کی ہر منزل آرٹ اور مصوری کی ایک نمائش گاہ تھی۔ ایک منزل پر بہترین آرٹ کے نمونے جمع کئے گئے تھے۔ ایک منزل میں کتب خانہ تھا۔ ایک منزل میں جلد سازی اور کاغذ کو منقش کرنے کا کام ہوتا تھا اور پھر اسی محل کے درو دیوار پر مصوری کے جو نقش کئے گئے تھے

دہ قابل دید تھے ۔ کہیں بادشاہ کے دربار اور جلوس کی نقاشی تھی تو کہیں ایران کے بادشاہ خسرو کا دربار تھا۔ کہیں شکار کا منظر تھا اور کہیں بزم رقص و موسیقی کی عکاسی کی گئی تھی ۔ دوسرے معنوں میں شاہی محل کیا تھا ایک عجائب گھر یا میوزیم کی حیثیت رکھتا تھا ۔ اس کے عہد میں میلاد النبی کے موقع پر ہر عام و خاص کے لئے شاہی محل کے دروازے کھول دیئے جاتے تھے تاکہ عوام شاہی محل کے عجائبات دیکھ سکیں ۔

قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر مانا جاتا ہے ۔ اس دور کی علمی اور ادبی چہل پہل اور خاص طور پر شاعری اور ادب مل کر ایک مکمل اور حسین تصویر پیش کرتے ہیں جس وعشق سے فطری لگاؤ نے اس میں شعر و شاعری کی امنگ پیدا کر دی تھی ۔ اس لئے اس نے اردو اور فارسی کے پیش رو شعرائے کے کلام کا مطالعہ کیا ۔ اور سب سے زیادہ حافظؔ سے متاثر ہوا ۔ یہی وہ مایہ ناز شخصیت ہے جس نے دکھنی زبان کے ادب اور ارتقاء کی تخلیق میں ایک اہم بنیادی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے ۔ محمد قلی کثیر المحبوب شاعر تھا ۔ اس نے محبت کو کبھی ایمان اور عبادت کا درجہ نہیں دیا ممکن ہے کہ یہ فطرت سلطانی کا نتیجہ ہو ۔ بلکہ محض عیش و عشرت اور تفریح کا وسیلہ سمجھتا رہا ۔ غزل گوئی کے لئے جیسی داخلی کیفیت اور خارجی ماحول کی ضرورت ہے وہ محمد قلی کو میسر تھا ۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ جو اردو زبان و ادب کے لئے سرمایہ ناز ہے اس کا ضخیم کلیات ہے ۔ محمد قلی نے فارسی اور تلنگی میں بھی ہزاروں شعر کہے ہیں ۔

محمد قلی نے اکثر مقامات پر اسمات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے جو کچھ بھی مطالعہ کیا ہے وہ صرف شاعری کے شوق میں اور یہ شوق عشق و عاشقی کی خاطر تھا ۔ یوں تو بلندی تخیل اور مسلسل مشق ہی وہ خوبیاں ہیں جو کسی شاعر کو عروج کمال تک پہنچانے کی ضامن ہوتی ہیں ۔ یہ تمام خوبیاں پورے طور پر اس میں جمع تھیں ۔ اس کا دربار بڑے بڑے شاعروں سے معمور تھا ۔ مشاہدے اور تخیل سے بڑھ کر عیش و عشرت کی زندگی نے اس کی شاعری کے پروان چڑھنے میں مدد دی خدا نے اس کے قسمت میں محفل عیش و عشرت کے ساتھ ساتھ محفل ادب بھی لکھا تھا جس کی بناء پر وہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر بنا ۔ عشق و عاشقی کے بعض عریاں مضامین کے ساتھ صوفیانہ مسائل کی ترجمانی بھی کی ہے ۔ اس کی اس شاعری کا سماج پر یہ اثر ہوا کہ سارے سماج جو اس عہد میں مرتب ہوا اس کی شاعری کا ترجمان بن گیا ۔ اور کسی عہد میں بھی اس کی ترقی میں کمی واقع نہیں ہوئی اور یہ سماج دکھنی ادب اور دکھنی تہذیب کے نام دہلی کے سب سے بڑے مشہور شاعر میر محمد تقی میر کے عہد تک قائم رہا ۔ محمد قلی کے کلام میں فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ سوز نشتریت اور وہ کیف بھی نہیں ہے جو دل کو درد آشنا بناتا ہے ۔ اس کے کلام میں محرومی اور شکوہ کہیں نہیں ملتا سوائے رنگینیوں اور رعنائیوں کے غرض آسودگی کے تمام روپ محمد قلی کے شاعری میں اپنی ساری خوبصورتیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہیں ۔

محمد قلی سے دور میں رہن سہن، طور طریقوں، رسم و رواج اور قومی اتحاد کے نقوش نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے اس کے پاس مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی بڑی سے بڑی خدمت پر فائز تھے۔ اور بادشاہ نے کبھی اپنی رعایا پر برتری نہیں جتائی جس سے اس کا فاتح ہونا ظاہر ہو، وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں اور عیدوں میں خود دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی بہت سی رسوم و رواجوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بھاگ متی سے محبت کر کے ساری دنیا کو قومی یکجہتی کا سبق سکھلایا ہے۔

میری اس تمام بحث اور گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ دکنی ادب، تہذیب و تمدن نے جو روایات قائم کی ہیں وہ ایک مستقل اور پائیدار اقدار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نئے بھارت کی تعمیر میں اُن سے مدد لی جارہی ہے اور ہمیشہ لی جاتی رہے گی۔

بہ سلسلہ صفحہ ۴۴ سے | تازہ کر رہا ہے بلکہ اپنے عاشق شیدائی اور مرتب ڈاکٹر زور مرحوم کی ثنا خوانی میں رطب اللساں ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہمیں دکنی تمدن کو قطب شاہی دور میں نہ دیکھنے کا اتنا افسوس نہیں کیونکہ اس تمدن کے علمبردار حضرت مکانی ڈاکٹر زور نے عوام کو اتنا کچھ واقف کرا دیا ہے کہ اُن کا اٹھنا بیٹھنا پہننا اوڑھنا، چال ڈھال، بات چیت، لکھنا پڑھنا، تعمیر ترسیم، علماء کی خدمت، عوام سے محبت اور شاعروں سے الفت نے وہ مقام پیدا کر دیا تھا کہ آج دکنی تمدن اور اردو زبان قلی قطب کے الفاظ میں ڈاکٹر زور کے لئے یوں نوحہ کناں ہے ؎

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا جلد شمارہ
۱۹۳۸ء ۳۰ ۸

اگست ۱۹۶۸ء

ماہنامہ

سب رس

نگران
پروفیسر سید علی اکبر ایم اے کنٹیب

(مجلس مشاورت)
میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ
ڈاکٹر غلام عمر خاں - محمد منظور احمد

(معتمد)
محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم: محمد جمال الدین
منتظم: وقار خلیل

زر سالانہ چھ روپے غیر ممالک سے دس روپے
ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

نمونے کے پرچہ کے لئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے
پرنٹر و پبلیشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

گزشتہ شمارہ یوم قلی نمبر تھا، اس کی اشاعت میں کافی تاخیر ہوئی۔ بہ پیش نظر شمارہ مختصر ہے محض اس لئے کہ اس عمل سے ہم وقت کی پابندی کر سکیں گے۔

پہلا مضمون جناب یوسف کمال صاحب بخاری کیپرر کارڈز بھوپال کا ہے۔ آپ نے جمشید بیگم کے خطوط کے مجموعے کو متعارف کیا ہے۔ واجد علی شاہ اختر کی بیگمات کے خطوط اس سے پہلے بھی شایع ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ ایک مکمل مجموعہ ہے جسکو اشاعت پذیر ہونے کا موقع نہ ملا۔ دوسرا مضمون جناب حسرت کاسگنجوی صاحب کا ہے۔ شاہد احمد ایڈیٹر ساقی نے جو ادبی خدمات انجام دیں وہ بھلائی نہ جاسکیں گی۔ ان کے کارنامے ہمیشہ احترام سے یاد کئے جاتے رہیں گے۔ اکبر وفا قانی ڈاکٹر زور مرحوم کے دوستوں میں تھے۔ طرز تحریر اور فنون لطیفہ پر ان کی نظر گہری تھی۔ آرٹ سے متعلق اپنے خیالات کے اظہار کیلئے انھوں نے پندرہ روزہ اخبار "حسن کار" جاری کیا تھا۔ طیب انصاری صاحب نے وفا قانی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ جناب اشرف الدین صاحب فیضی نے رحیم کے دس دوہوں کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ عبدالرحیم خاں خاناں کی دریا دلی کے قصے آزاد نے بڑے دلچسپ انداز میں لکھے ہیں لیکن ان کی ہندی شاعری پر جس تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہیئے تھا نہیں لکھا۔ خانخاناں کے دربار میں شاعر، ادیب، مصوّر سبھی موجود تھے اور کارناموں پر نوازے جاتے تھے۔ لیکن اس کا فیض صرف فن کاروں کی قدردانی تک محدود نہ تھا بلکہ فن پر بھی اس کی توجہ مرکوز تھی۔ ہندی شاعری میں رحیم ولاس اور رحیم ست سئی ہمیشہ باقی رہیں گے۔ ایک ایک دوہے میں اس نے جو باتیں بیان کی ہیں، جو شاعرانہ نزاکتیں اور خوبیاں بھری ہیں، جو تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے ہیں وہ کبھی نظر انداز نہ کئے جاسکیں گے بلکہ قاری کو ہمیشہ ایک نیا لطف حاصل ہوتا رہے گا۔ آئیندہ بھی ہم چند دوہے پیش کریں گے۔

حصۂ نظم بھی اس دفعہ وقیع ہے۔ امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

آخری حصہ تبصروں پر مشتمل ہے ــــــ مظفر حنفی صاحب نے "ایک تھا شاعر" "نثر و غزل دستہ" اور "زبان" شایع کر کے ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ آئیندہ شمارہ میں بعض اہم کتابوں پر تبصرہ پیش ہوگا۔

محمد اکبر الدین صدیقی

یوسف کمال بخاری

خطوط واجد علی شاہ بنام جمشید بیگم

نیشنل میوزیم، نئی دہلی کے شعبۂ مخطوطات میں ایک خطی نسخہ موسوم بہ تواریخ جمشیدی موجود ہے۔ یہ نسخہ درحقیقت واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے خطوط کا مجموعہ ہے جو شاہ موصوف نے اپنی چہیتی ملکہ نواب جمشید بیگم کو بہ زمانۂ قید مٹیا برج، کلکتہ سے تحریر کئے تھے۔ متذکرہ بالا نسخہ ۱۹۵۳ء میں نیشنل میوزیم کی فنون لطیفہ کی مجلس خریداری نے لکھنؤ کے کسی سوداگر سے خرید کر داخل کتاب خانہ کیا۔ اس کتاب میں ۲۴ خطوط ہیں جن کو مکتوب الیہ نواب جمشید بیگم نے تاریخ وار ترتیب دے کر ایک کتابی شکل میں محفوظ کر دیا۔ ترتیب کا کام مظفر علی کو جو شاہ کا نمک خوار و وفادار تھا سپرد کیا گیا اور اس نے قطعہ تاریخ بھی کہا ہے جو خطوط کے آخر میں درج ہے۔ مظفر علی کا تخلص ہنر تھا۔ قطعہ تاریخ سے سن ہجری ۱۲۷۶ھ نکلتا ہے۔ گویا ۱۰۸ سال پرانا نسخہ ہے۔ کاغذ نہایت عمدہ ہے جس پر مطلا و مذہب کام کیا ہوا ہے۔ حاشیہ پر بیل بوٹے اور نقش و نگار دیدہ زیب و پر فریب نظر آتے ہیں ہر صفحہ پر بنت البحر یعنی نصف بالائی حصہ عورت کا اور زیریں حصہ مچھلی کا بنا ہوا ہے۔

گو یہ خطوط کوئی تاریخی اہمیت نہیں رکھتے۔ خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہم عصر سیاست پر بالقصد کوئی اظہار خیال نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن داخلی کیفیات و قلبی تاثرات کا ذکر غیر شعوری طور پر ضمناً آ گیا ہے اور اس سے بادشاہ کی ذہنی بے چینی اور جلد رہائی کی امید کا اندازہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی باتوں کا قلمبند کرنا بادشاہ کیلئے ممکن نہ تھا کیونکہ ڈاک پر کڑی نظر رکھی جاتی ہوگی۔ خطوط برطانوی عملہ حکومت کی نظر سے گذرنے کے بعد ہی مکتوب الیہ کو پہونچائے جاتے ہوں گے۔ لیکن ان خطوط کی افادیت ادبی نقطۂ نظر سے اہم ہے اور ہمیں اسی حیثیت سے ان کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

اسی قسم کا ایک مجموعہ خطوط شائع ہو چکا ہے جس میں واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی ہے من و عن درج ہیں یہ خطوط بھی بادشاہ نے مٹیا برج، کلکتہ سے بہ زمانۂ حبس اپنی بیگمات کو بھیجے تھے اور ان کے جواب بادشاہ کو موصول ہوئے تھے (بحوالہ تاریخ اودھ حصہ پنجم مصنفہ حکیم محمد نجم الغنی خاں، مطبوعہ ۱۹۱۹ء لکھنؤ صفحہ ۱۰۶) بقول مصنف کتاب ہٰذا اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل بیگمات کے خطوط شامل ہیں، رشیدا بیگم، حور بیگم، فاطمہ بیگم، دلپذیر بیگم، مہندی بیگم، منور بیگم، فرخندہ محل، کنیز فاطمہ، نواب وزیر صاحبہ،

مناجان صاحبہ، امراؤ محل، اور نوروزی بیگم اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس مجموعہ میں نواب جمشید بیگم کے خطوط شامل نہیں ہیں۔ ہمارے میوزیم کے نسخے کی مکتوب الیہ یہی بیگم ہیں اور یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ خطوط ابتک نظر سے پوشیدہ اور غیر مطبوعہ ہیں جنھیں آج میں منصۂ شہود پر لا رہا ہوں اور سامعین کرام کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

ادب کی جملہ اصناف میں خواہ شعر ہو یا نثر شاعر یا نثار اپنی ذاتی شخصیت اور انفرادی کردار کو بجنسہ ظاہر نہیں ہونے دیتا بلکہ رمزیت و اشاریت کے لباس میں ملبوس منظر عام پر آتا ہے۔ کہیں تصنع کی جلوہ گری ہوتی ہے تو کہیں رکھ رکھاؤ اور خودداری کی نمائش، لیکن خط نویسی ایک ایسی صنف ادب ہے جہاں مصنف یا کاتب کی ذاتی شخصیت آئینہ کی طرح عریاں ہوجاتی ہے۔ نواب واجد علی شاہ کی شخصیت تاریخی اعتبار سے کچھ ہی ہو لیکن اردو ادب، حسن و عشق اور غزل و شاعری میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ ان خطوط میں تلو سال پرانی اردو کا نمونہ، بادشاہ کا طرز خط نویسی، القاب و آداب، خیالات، جذبات، اظہار تعشق، تغزل، فرقت و ہجر، قید کی کلفتیں، امید موہوم کا عکس جھلکتا نظر آتا ہے۔

تواریخ جمشیدی یعنی خطوط واجد بنام جمشید کا دیباچہ اور ان خطوط کا سبب تالیف خود نواب جمشید بیگم کی زبان سے سنئے۔ رواج زمانہ کے مطابق پہلے تو حمد باری تعالیٰ، نعت سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) منقبت حیدر کرارؓ اور اس کے بعد اصل دیباچہ کا مضمون قلمبند کیا ہے سنئے

کمترین ناموس، شہنشاہِ والا تبار، وکہترین بانوانِ سلطانِ گردون وقار، نظر کردہ جانِ عالم نواب جمشید بیگم جلوہ آرائی عروس مدعا ہے اور نگار بند شاہد صدق و صفا ہے کہ گلہائے بوستانِ خوبی اور ریاحین گلستانِ محبوبی اعنی محبت نامجاتِ عزیزِ مصر جاہ و جلال فرمانروائے اقلیم حشمت و اقبال السلطان ابن السلطان ابن السلطان الخاقان ابن الخاقان ابن الخاقان صاحب سیف و قلم اعنی جانِ عالم نادمجتہم بریہے نام کلکتہ سے آئے اور ان کے مطالعہ سے دل نے محبتِ منزل کا لطف تازہ اور حظ بے اندازہ اٹھائے بہذا خاطر میں گذرا کہ منسلک کرنا۔ ان درہائے غلطاں کا اور گلدستہ بنانا ان گلہائے گلستاں کا از واجبات ہے۔ کس واسطے کہ معشوق کی کتابت عاشق کے حق میں بمنزلہ حدیث و آیات ہے۔ پس شوقِ تمام کلام الملک و ملک الکلام کو مرتب کیا اور نام اس تالیف کا تواریخ جمشیدی رکھا واللہ جامع المتفرقین ایاک نعبد وایاک نستعین۔

کتاب کے آخر میں قطعہ تاریخ لکھا ہے جو مندرجہ ذیل ہے ؂

بلقیس کو لکھا ہے سلیمان جہاں نے	اس نثر کا پریوں کی زباں پر ہے فسانہ
بے ساختہ لکھا ہے ہنر مصرع تاریخ	مجموعۂ تحریر سلیمان زمانہ

ھ ۱۲ ۷۶

اِن مراسلات میں ہجر و وصل، اشتیاق و فراق، سوز و نیاز اور اکثر خطوں میں تو اور و تکرار بھی ہے - قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی نے زبان کے لطف کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے - ان رقعوں کے القاب قابل دید ہیں نواب واجد علی شاہ لکھتے ہیں بونسہ، خوش جمال، رشکِ خورشید، نواب جمشید، محبوبہ نمکیں، یادِ پُر تزئین، مہ لقا، خوشنما، جادو نگاہ، معشوقہ شاہ، گلِ رعنا، پری چہرہ، مطلوبۂ رنگین ادا، دلکش خورشید نواب جمشید، شمع شبستان وصال، نور حدیقۂ حسن کمال، آئینۂ زیب و ادا، پرتوِ جمال، مہر دفالخالِ رخسار ملاحت، نمک مذاقِ صباحت، رشکِ مہر و خورشید نواب جمشید، رنگ و بوئے گل، محبتِ آب و تاب، گوہر الفت، لیلیٰ نجد، اتحاد بلقیس سبا، روداد دل آرام گلفام دمساز مایہ ناز سیمبر، عشوہ گر، گلبدن، غنچہ دہن، لالہ رو، سمن بو، پری جمال، خود تمثال، شیریں شمائل عذرا خصائل، دلفریب، قرار ناشکیب، آئینۂ رخسار دِلدار، طرحدار، چالاک، بیباک، فرید در حشم، جمشید بیگم، سرمۂ چشم رعنائی، غازۂ چہرۂ زیبائی، رنگ و بوئے گل خوبی، آب و تاب گوہر محبوبی، رشک حورا، غیرتِ جو ترا، عدیم المثال، شیریں مقال، دارا حشم جمشید بیگم، محبوبہ ہماری، جانِ عالم پیاری، رشک دہ خورشید نواب جمشید، غیرت بخش گل خانِ جہاں، رونق دہ بہار چمنستان زماں، نواب جمشید بیگم، نازک اندام گلفام، سروِ دلکش خمخانہ محبت، جام دہ رحیق مودت، ساغر کش صہبائے مروت، ساقی انجمن آرائے خلوت و جلوت مسند آرائی جمشیدی قوت دہ حسرت و تمنا امیدی نواب جمشید بیگم وغیرہ۔

نامۂ ہفتم دو صفحات پر مشتمل مختصر سا خط ہے بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیے "محبوبہ ہماری جانِ عالم کی پیاری رشک دہ خورشید نواب جمشید بیگم صاحبہ زاد حسنہا ۲ تاریخ شہر حال کو ہمارے رفع ملال کو نامہ رنگین بعبارت نمکین انجم الدولہ بہادر کی معرفت آیا - تمہارے ہر فقرے میں جانِ عالم کے لکھنے نے مزہ دکھایا - اس سے صاف ثابت ہے کہ تم کو ہماری یاد نہایت ہے - اے جانی اسی طرح ہمکو بھی تمہاری یاد ہے - ہر دم لب پر نالہ و فریاد ہے - ہر وقت تمہارا چرچا ہے - ہم نشینوں میں بیان ہے - ہر دم تمہارا ذکر ہے - یہی داستاں اور تم کو فقط ہماری محبت ہے - ہم کو دیکھو کہ کس کس سے بچھڑے ہیں اور کس کس کی مفارقت ہے فقط مرقوم ۲۵ جمادی الاخر ۱۲۷۳ ہجری راقم جانعالم -

حسرت کاسگنجوی

شاہد احمد دہلوی

فن اور شخصیت کے آئینے میں

"بعض چہرے بڑے دھوکے باز ہوتے ہیں"۔

سراپا دیکھیے تو یقین ہی نہ آئے کہ یہ شاہد احمد دہلوی ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ جی بھر کے بدصورت ہیں۔ میری ملاقات ان سے بڑی افراتفری میں ہوئی بس دیکھتا ہی رہ گیا کسی طرح بھی یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ یہ ریڈیو پاکستان کی عمارت سے نکلنے والا شخص شاہد احمد ہو سکتا ہے لیکن جس طرح ڈاکٹر صفدر ان سے بغل گیر ہوئے مجھے یقین کر لینا ہی پڑا۔

شاہد صاحب ۱۹۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد دکن، علی گڑھ، دلی کے انگریزی اسکول، ایف سی کالج لاہور اور سینٹ اسٹیفن کالج دہلی سے اپنی تعلیم مکمل کرلی۔ ۱۹۴۶ء میں انھوں نے مسلم لیگ کی کھل کر حمایت کی۔ تقریبا قریب تیس سال سے وہ موسیقی کے ماہر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ بہت سی ادبی انجمنوں، موسیقی کے اداروں اور صحافتی سوسائیٹیوں کے سرپرست رہے۔ ۱۹۳۰ء میں "ساقی" کا اجرا ہوا جو آج بھی زندہ ہے اس کے علاوہ شاہ جہاں، انقلاب اور نقش کی ادارت کے بھی فرائض انجام دیئے۔ دو سو سے زیادہ کتابیں شائع کیں خود وہ قریب قریب چالیس کتابوں کے مصنف یا مترجم تھے ترجموں میں فاوسٹ، پھانسی، اور قہرمان بلطرا اور اوریجنل کتابوں میں گنجینۂ گوہر، دلی کی بپتا، اور اجڑا دیار مشہور رہیں۔ مشہور ادیبوں میں سے سید رفیق حسین، کرشن چندر، عصمت چغتائی، منٹو، عظیم بیگ چغتائی اور محمد حسن عسکری کو ادبی حیثیت سے متعارف کرایا جمیل جالبی نے ایک بڑے انہیں کو تو کالموں میں جوڑ توڑ کر کے اس کا کرتا دھرتا بننا چاہتا تھا اور شاہد صاحب کا مخالف تھا شاہد صاحب کا تعارف اس طرح کرایا "چالیس کے قریب تو ان کی کتابیں اس وقت موجود ہیں۔ پانچ سو سے زیادہ ان کے مضامین چھپ چکے ہیں اتنی ہی چیزیں وہ ریڈیو کے لیے لکھ چکے ہیں۔ ترجمہ کرنے میں وہ خاص مہارت رکھتے ہیں۔ رپورتاژ اور خاکے لکھنے میں تو ان کا جواب ہی نہیں ہے۔ ان جیسی زبان لکھنے والا اب اور کوئی نہیں ہے۔ صاحب طرز ادیب ہیں۔ اب آپ کو معلوم ہوا ان کا کنزلی بیوشن کیا ہے؟ اپنی ادبی خدمات اور قابلیت کی وجہ سے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے ادبی اجتماعوں میں بلائے جاتے ہیں اور تو اور تھائی لینڈ اور فلپینیز میں ثقافت پاکستان پر لیکچر دینے کے لیے پورے پاکستان سے شاہد صاحب ہی منتخب کر کے بھیجے گئے تھے۔ پورے پاکستان کے تمام زبانوں کے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دینا اور گلڈ کی

خشتِ اوّل رکھنا بھی شاہد صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔ آپ تو ان کی پھٹی اچکن اور ٹوٹی جوتی دیکھتے ہیں آپ کو وہ لعل کیسے دکھائی دے سکتا ہے جو اس گدڑی میں چھپا ہے۔

شاہد احمد نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا وہ زندگی کے بے حد نشیب و فراز سے گذرے تھے۔ ان کے والد نے پچاس ہزار روپیہ اور ڈھائی سو روپیہ ماہوار کی آمدنی چھوڑی تھی جس میں سے پچیس تیس ہزار روپیہ انھوں نے "ساقی" کو مقبول بنانے میں گنوا دیا۔ پھر اپنے ہم عصروں کی کتابیں چھاپ چھاپ کر ساقی بک ڈپو کی ساکھ قائم کی اور پھر یہ سب کچھ دلّی میں ہی رہ گیا۔ لاکھوں میں کھیلنے والا شخص پریشان حال لاہور آیا اور پھر کراچی میں آباد ہو گیا اونچی حویلی میں رہنے والا شخص مارٹن روڈ کے تنگ و تاریک کوارٹر میں چوبیس افراد کے ساتھ مقیم ہوا۔ وہیں ساقی کا دفتر بھی بنایا گیا جس نے ہزاروں روپیے شاعروں اور ادیبوں کو پیشگی بانٹے اور جو اُسے واپس نہ ملے وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ گانا اور موسیقی سے دلچسپی رکھنا کوئی بری بات نہیں لیکن شاہد احمد کو محض پیٹ پالنے کے لیے اسے پیشے کے طور پر اپنانا پڑا۔ زیڈ۔ اے۔ بخاری نے انھیں وقتی طور پر موسیقی کے شعبے میں سپروائزر کی جگہ دے کر اُسے مزید پریشانیوں سے بچا لیا تھا اور پھر ان ہی حالات میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان ساری باتوں کا یہاں دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ انکی زندگی میں کس قدر نشیب و فراز تھے۔ زندگی کے ان ہی نشیب و فراز نے انھیں بے باک بنا دیا تھا۔

شاہد صاحب کے ہاں بے تکلفی ہے، فنی خلوص ہے، مشاہدے ہیں تجربے ہیں۔ بعض اوقات اِن کے یہ تجربے تلخ ہونے کی صورت میں بڑی تیکھی اور ترش باتیں لکھ جاتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں حقیقت سے بعید نہیں ہوتیں۔ یہ تلخی بھی ان کے خاکوں کے اثر کو زائل نہیں ہونے دیتی — اور سب سے زیادہ دلکش شاہد صاحب کے ہاں کوئی چیز ہے تو وہ ان کا اسلوب ہے۔ وہ انگریزی، فارسی اور عربی الفاظ سے گریز کرتے ہیں۔

شاہد صاحب بڑے ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے جوش میں بہت کم آتے تھے جوانی کا حال مجھے نہیں معلوم میں ان سے اس وقت ملا جب وہ بوڑھے ہو رہے تھے۔ میرا ایک مقالہ "ساقی" میں عزیز احمد پر چھپا۔ ایک صاحب نے اس کے خلاف ایک مضمون (خط کی صورت میں) "زاویے" حیدرآباد میں شایع کر دیا۔ اس میں مجھ پر جو تنقید تھی وہ تو تھی ہی۔ سب سے زیادہ، انھوں نے شاہد صاحب کے بارے میں لکھا کہ وہ عزیز احمد کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور ہر ممکن طریقے سے عزیز احمد پر ادبی وار کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ شاہد صاحب نے وہ مضمون نہیں پڑھا تھا میں نے سنایا تو ہنسنے لگے۔ یہ ہیں کون ذاتِ شریف؟ میں نے جب نام بتایا تو کہنے لگے۔ کہنے دو بیچارے کو کچھ وہ بھی تو کہے۔

ترقی پسند تحریک کی بات تھی کون نہیں جانتا کہ شاہد صاحب نے شروع شروع میں اس کا کتنا ساتھ دیا۔ کرشن، عسکری، منٹو اور عصمت جیسے لوگوں کو ابھارنے اور متعارف کرانے میں شاہد اور ساقی نے

جو کام سر انجام دیا اُسے کون فراموش کر سکتا ہے لیکن ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ایک یعنی سجاد ظہیر نے اپنی کتاب "روشنائی" میں شاہد صاحب کا ذکر کیا ہے کہ انھیں خود غرض اور مفاد پرست ثابت کیا جا سکے۔ انھوں نے کہا کہ شروع شروع میں انھوں نے اِس تحریک میں حصہ لیا لیکن جب تحریک پر پابندی لگی تو شاہد صاحب کنّے کترا کر نکل گئے اور اس تحریک سے بے تعلقی کا اظہار کرنے لگے۔ اصل بات یہ تھی کہ ترقی پسند تحریک سیاسی اصولوں کے تحت وجود میں آئی تھی مقصد صرف اشتراکیت کی تبلیغ تھا۔ ادب کو تو ذریعہ بنایا گیا تھا لیکن جس پُر فریب انداز سے اس تحریک نے ادب کی خدمت کا ڈھنڈورا پیٹا تھا بہت سے لوگ اس سے دھوکا کھا گئے تھے۔ خود پریم چند اپنی عمر کے آخری دور میں اس ترقی پسندی سے عاجز آ گئے تھے۔ مولوی عبدالحق۔ نیاز فتح پوری اور اسی طرح کے دوسرے ادیبوں نے اس تحریک سے کنارہ کشی اختیار کر لی اس سیاسی تحریک میں کون ملوث ہوتا اور وہ ایسی تحریک جو غیر ممالک کے ذی اثر حضرات چلا رہے تھے۔ کمیونزم کی تبلیغ مقصد تھا یہی ہوا کہ یہ تحریک محض اپنی سیاسی نوعیت کی وجہ سے اپنا اعتماد کھو چکی -- اگر شاہد صاحب نے اسے چھوڑ دیا تو کیا بُرا کیا -- میں نے جب ان سے پوچھا تو کہنے لگے "روشنائی" میری نظر سے نہیں گذری کبھی آؤ گے تو ترقی پسند تحریک پر تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

ہمارے ناشران اور مدیران حضرات کا یہ اصول رہا ہے کہ نئے ناموں سے گریز کرتے ہیں کسی بھی نئے ادیب کو محض اس لیئے نہیں چھاپتے کہ کہیں ان کے کاروبار پر اثر نہ پڑ جائے۔ نامور ادیب اگر گالیاں بھی لکھ دینگے تو اس سے خاصا نفع کمایا جا سکتا ہے نئے ادیب نے کیا لکھا ہے اُسے پڑھنے کی وہ کبھی زحمت نہیں فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کے بہت سے ادیب جن میں ابھرنے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ مدیران کے اس اصول کی نذر ہو جاتی ہیں اور اس طرح اردو ادب بہت سے اچھے ادیبوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ شاہد صاحب نے اس بُت کو توڑا۔ انھوں نے نئے لوگوں کو اُبھرنے کا موقعہ دیا ان کی ہمت افزائی کی اور ادیبوں کی ایک پوری کھیپ تیار کر دی۔ قرۃ العین حیدر کو بھی وہی سامنے لائے تھے اور پھر ایک مدت گذر جانے کے بعد قرۃ العین حیدر کی بھتیجی شہناز حیدر کو افسانہ نگار کی حیثیت سے ساقی میں پیش کیا۔ مجھ سے بہت معمولی صاحب سلامت تھی۔ مجھے مضامین لکھنے کے لیئے اکسایا ہر قدم پر میری راہ نمائی بھی کی مجھے مفید مشورے بھی دیئے اس سے بڑھ کر اور کیا حوصلہ افزائی ہو سکتی ہے کہ ساقی میں مسلسل میرے پانچ مقالے شائع کیئے خطوط یا فون سے جب بھی ملاقات ہوئی انھوں نے جی بھر کے سراہا۔

دلی جو تھی۔ دلی جو مٹ گئی اسی اجڑے دیار کی تہذیب کی عکاسی ہمیں شاہد صاحب کے ہاں ملتی ہے۔ وہ دلی کے شرفا میں سے تھے۔ وضع داری اور رکھ رکھاؤ کے طریقے جانتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ شاہد صاحب نے ایک پوری تہذیب کو الفاظ میں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ دلی اسکول کی نثر میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ جس سلیقے سے وہ زبان کا صحیح استعمال کرتے -- وہ بہت کم ادیبوں کو نصیب ہے اور کیوں نہ ہو

یہ چیز تو انھیں وراثت میں ملی ہے۔ وہ ہر لفظ ہر محاورے اور ہر روزمرہ کا صحیح تصرف جانتے تھے۔ اسی لیے ان کی تحریر میں جو لفظ جہاں لگ گیا اپنی جگہ نگینہ ہو گیا بقول جمیل جالبی "شاہد احمد دہلوی کے ہاں نہ استعارے کی کثرت ہے اور نہ محاوروں کی۔ ان کی عبارت میں نہ وہ شوخی ہے جو آزاد کے ہاں نظر آتی ہے اور نہ وہ ظرافت جو نذیر احمد کے ہاں ملتی ہے۔ لیکن ان دونوں صاحب طرز ادیبوں کی نثر کے امکانات جس نقطے پر ملتے ہیں۔ وہاں سے شاہد احمد دہلوی کی نثر پیدا ہوتی ہے۔ جس میں استعارے، محاورے، روزمرہ اور رچی ہوئی زبان، ٹھاٹ باٹ اور ٹھسے سے استعمال میں آتے ہیں کہ انھیں کسی دوسرے لفظ یا محاورے سے نہیں بدلا جا سکتا نہ وہ بہت دور تک نذیر احمد کے ساتھ چلتے ہیں اور نہ محمد حسین آزاد کے ساتھ لیکن دونوں کو اپنے ساتھ لیے دونوں کے مزاجوں کو اپنے مزاج کے خمیر میں گوندھ کر ایک نیا مرکب تیار کرتے ہیں۔ آپ کو اُن کے ہاں ان دونوں کی گونج تو ضرور سُنائی دے گی لیکن ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ہو گا کہ یہ ان دونوں سے مختلف ہے شاہد احمد کی نثر میں نذیر احمد اور محمد حسین آزاد موجود بھی ہیں اور نہیں بھی۔ ان کی نثر نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی نثر کا ایک نیا امکان ہے"۔

میراجی کی نظمیں آج بھی مبہم ہی سمجھی جاتی ہیں۔ آزاد اور معرا نظموں کو یوں بھی ناشر چھاپتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ شاہد صاحب نے میراجی کی نظموں کو اس وقت چھاپا جبکہ وہ بہت مقبول تھیں اور نہ صرف چھاپا بلکہ میراجی سے آزاد نظموں کے کئی مجموعے خرید کر رکھ لیے۔ قیمت ادا کر دی تاکہ میراجی مالی مشکلات میں مبتلا نہ ہو جائیں وہ اردو ادب میں پہلے ناشر تھے جو ادیبوں کو پیشگی روپیہ دے دیا کرتے تھے تقسیم ہند کے وقت کوئی پندرہ سولہ ہزار روپیہ انھوں نے تقسیم کیا تھا۔ جس میں سے غالباً کرشن چندر نے لکھنے پر رقم واپس کر دی تھی۔ باقی سب لوگوں نے شیر مادر سمجھ کر ہضم کر لیے۔ دو لاکھ کی تو صرف ساقی بک ڈپو کی ملکیت تھی دوسری چیزیں الگ تھیں۔ یہاں جو کچھ ان پر گذری ایک لمبی داستان ہے۔ لیکن انھوں نے کبھی کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا اور نہ اپنی گذشتہ خدمات کا صلہ چاہا بلکہ وہ جو کچھ بھی دوسروں کے ساتھ کر سکتے تھے وہ کرتے رہے اور کسی کو اس کا علم تک نہیں ہونے دیا۔

خاکہ نگاری بڑا مشکل فن ہے۔ افسانہ نگاری سے بھی زیادہ مشکل۔ افسانے میں افسانہ نگار کو مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے موضوع کے مطابق اپنے کرداروں کی تخلیق کرے اور جس طرح چاہے اپنے خیالات کا اظہار کرائے لیکن خاکے میں یہ آزادی نہیں ایک لحاظ سے خاکہ نگاری حقیقت نگاری کے بہت قریب آ جاتی ہے۔ خاکہ کردار نگاری ہی کی شکل ہے۔ منٹو نے موذیل لکھا لیکن موذیل کوئی خاص کردار نہیں تھا۔ موذیل منٹو کے ذہن کی پیداوار تھی اس لیے منٹو نے موذیل کو جس طرح

یا پیش کر دیا ایسا ہی خاکہ عصمت چغتائی کا "دوزخی" ہے لیکن یہ کچھ مختلف ہے دوزخی ایک حقیقی کردار ہے۔ ایک بہن نے ایک بھائی کو دوزخی قرار دیا ہے۔ یہ خاکہ نگاری اور افسانہ نگاری کے بین بین کر جانے نگاری کی ایک مثال تھی اس افسانے یا خاکے نے (دوزخی نے) لوگوں میں بڑی غلط فہمی پھیلائی۔ ایک پڑھے لکھے شخص سے جب پوچھا گیا کہ اردو کے کسی سوانح نگار کا نام بتاؤ تو اس نے بے جھجک عصمت کا نام لیا اور "دوزخی" کا حوالہ دیا۔ کہا کہ اردو میں اس سے بہتر سوانح نگاری آج تک نہیں ہوئی — سوانح نگاری، خاکہ نگاری اور افسانہ نگاری میں فرق ہے۔ خاکہ نگاری میں فنی پہلوؤں سے زیادہ اس کی شخصیت پر زور دیا جاتا ہے۔ خاکہ کسی انسان کے خد و خال کو اجاگر کرتا ہے۔ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ابھارتا ہے اور ان واقعات کو پیش کرتا ہے جو لکھنے والے کو خلوت و جلوت میں پیش آتے ہیں۔ انسان انسان ہوتا ہے فرشتہ نہیں اس لئے اس سے لغزشیں بھی ہوتی ہیں خاکہ نگار انسان کی عظمتوں اور لغزشوں کے تاثرات کو بڑی شگفتگی اور بے باکی سے بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ دراصل یہی یہ بے باکی ہی خاکے میں رنگ بھرتی ہے اور قاری یہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ خود اس کردار سے مل رہا ہے۔ قوتِ مشاہدہ، اندازِ بیان، واقعات کی ترتیب خاکہ نگاری کے ہتھیار ہیں۔ سیرت نگاری خاکہ نگاری سے کسی قدر مختلف چیز ہے جدید خاکہ جدید افسانے کے بہت قریب آ گیا ہے۔

شاہد احمد کا اندازِ بیان، قوتِ مشاہدہ اور واقعات کو ترتیب دینے کا ڈھنگ بہت اچھا ہے ان کی بے باکی اور علمیت نے ان کے فن کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ ساقی کے مدیر ہونے کی حیثیت سے انھیں بہت سے شاعروں، ادیبوں، ڈرامہ نگاروں سے ملنے کے مواقع فراہم کر دیئے تھے بابائے اردو نے چند ہم عصر لکھ کر خاکہ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا تھا۔ ان کے بعد رشید احمد صدیقی نے اس فن کو اور آگے بڑھایا۔ یہ خاکے مختصر افسانے کے بین بین نہیں چلتے لیکن یہ اتنے کامیاب اور اچھے خاکے ہیں کہ اردو ادب میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے والی چیز بن گئے ہیں۔

شاہد احمد صرف مدیر ہی نہیں تھے۔ انھوں نے سوائے شاعری کے اردو ادب کی ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کی تھی ان کے ترجمے فاؤسٹ اور پھانسی وغیرہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ترجموں پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ انھوں نے "دلی کی بپتا" لکھ کر رپورتاژوں میں ایک بے بہا اضافہ کیا ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ان کے خاکے ان کی ہر چیز سے بہتر ہیں حتیٰ کہ ان کے رپورتاژوں سے بھی بہتر ہیں ان خاکوں میں ہمیں اصلی شاہد احمد نظر آتے ہیں دیکھئے جگر کو کس طرح متعارف کراتے ہیں۔

"کالا گھٹا ہوا رنگ، اس میں سفید سفید کوڑیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں، سر پر الجھے ہوئے پٹھے، گول چہرہ، چہرے کے رقبے کے مقابلے میں ناک کسی قدر چھوٹی اور منہ کسی قدر بڑا، کثرتِ پان خوری کے

باعث منہ اُگالدان' دانت شریف کے بیچ اور لب کلیجی کی دو بوٹیاں۔ بھرواں کالی داڑھی ایڈورڈین کی' سر پر ترکی ٹوپی' بر میں اچکن' آڑا پاجامہ' نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئی' پاؤں میں پینٹ کی گرگابی بائیں ہاتھ میں ایک میانہ قدوقامت کا اٹاچی کیس' جگر صاحب کی جوانی کی مکمل تصویر ہماری آنکھوں سے اس طرح سے گذرنے لگتی ہے جیسے وہ واقعی ہمارے سامنے مدہوش حالت میں کھڑے ہیں"۔

شاہد صاحب کے سینے میں ایک ہمدرد دل تھا میراجی کا خاکہ لکھتے ہوئے انھوں نے ان کی جملہ خرابیوں کو نظرانداز کر دیا ہے اور کس طرح فنکاری سے اپنے فنی خلوص اور انسانیت کے بول بالا کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"انھیں دیکھکر اندر سے دل کہتا تھا کہ یہ ایک عظیم انسان ہے اور عزّت و احترام کا مستحق نہ جانے اس شخص میں کیا بات تھی کہ اِتنی نفرت انگیزیوں کے باوجود دل اسکی طرف کھینچتا تھا۔ ایسا مقناطیسی شخصیت کا انسان میں نے کوئی اور نہیں دیکھا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کا ظاہر باطن ایک تھا۔ انھوں نے اپنے عیبوں کو کبھی نہیں چھپایا اور نہ کبھی اپنی خوبیوں کو سراہا۔ ریاکاری ان میں نام کو نہ تھی ان کے خلوت اور جلوت دونوں ایک تھے۔ اخلاقی قدریں اضافی تو ہوتی ہیں۔ ان کے نزدیک مروّجہ اخلاق کی کوئی حیثیت نہیں تھی بلکہ وہ انھیں برا سمجھتے تھے اور ان کی تحقیر کرتے تھے یا شاید انھوں نے انتقاماً ظاہر کو تج دیا تھا اور ان کا باطن ہی ظاہر بن گیا تھا اور شاید یہی ان کی عظیم شخصیت کا راز ہو"۔
اسی شخص میراجی کا دوسرا نقشہ بھی ملاحظہ ہو۔

"میراجی بڑے گندے آدمی تھے۔ وہ ان میں سے تھے جو کہتے ہیں کہ یا نہلائے دائی یا نہلائیں چار بھائی۔ انھیں کسی نے کبھی نہاتے نہیں دیکھا بلکہ منہ دھوتے بھی نہیں دیکھا۔ بال کٹوانے کے بڑے چور تھے۔ وحشیوں کی طرح ہمیشہ بڑھے رہتے اور ان میں کبھی تیل نہ ڈالتے اور نہ انھیں بناتے۔ جب بمبئی آئے تھے تو مونچھیں بھی مونڈ ڈالی تھیں۔ ایک دفعہ دل میں جانے کیا سمائی کہ چار ابرو کا صفایا کر گلے میں سادھوؤں کی سی کنٹھی بھی ڈال لی تھی۔ ہمیشہ سنجیدہ صورت بنائے رہتے تھے' انھیں قہقہہ مار کر ہنستے میں نے کبھی نہیں دیکھا باتیں اکثر ہنسنے ہنسانے کی کرتے مگر خود کبھی نہ ہنستے تھے۔ بہت خوش ہوئے تو خندۂ دنداں نما فرمایا ان کے نچلے پن سے بڑی گھن آتی تھی مگر یہ ان گھناؤنی چیزوں میں سے تھے جنھیں اپنے سے دور نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی قلندرانہ اور حرکتیں مجذوبانہ۔ دو چار آدمیوں نے مل کر ایک کمرہ کہیں بھاڑے کی لے رکھا تھا مگر رات کو اگر کہیں گھاس پر پڑے رہے تو وہیں سو گئے اور اگر پیڑی پر بیٹ گئے تو وہیں صبح ہو گئی۔ ایک دو دن نہیں برسوں یہی حال رہا...... بس مسلمان اس لیے تھے کہ مسلمان کے ہاں

پیدا ہو گئے تھے۔ جو شخص اخلاقی ضابطوں کی پابندی کرنا بھی ضروری نہ سمجھتا ہو وہ بھلا مذہبی قید و بند کیسے گوارا کر لیتا؛ میرا جی کے دِل اور دماغ دونوں ہی کافر تھے۔"

گو شاہد بھائی اب مرحوم ہو گئے ہیں لیکن وہ آج بھی موجودہ خاکہ نگاروں میں ایک اونچا مقام رکھتے ہیں انھوں نے اپنے لب و لہجے، طرزِ بیان اور بامحاورہ ٹکسالی زبان سے خاکہ نگاری کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ خاکہ نگاری کا فن ادب کی مقبول ترین صف بن گئی ہے۔

شاہد احمد اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور برجستہ کہنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ذہین تھے اور بے باک بھی۔ ادب اور موسیقی کی کوئی محفل ایسی نہ ہوتی تھی جہاں وہ نہ بلائے جاتے ہوں۔ ترجموں میں وہ ایسی مہارت رکھتے تھے کہ اصل سے زیادہ لطف آجاتا تھا ان کے ترجمے ایک پُر وقار، بلند آہنگ، توئی تنومند اور شگفتگی کی بہترین مثال ہیں۔

جب پہلی دفعہ ان پر دِل کا دورہ پڑا تھا تو میں کراچی میں ہی تھا۔ انھیں جناح اسپتال کے دِل کے مریضوں کے شعبے میں داخل کر دیا گیا تھا۔ میرا خیال تھا شاہد صاحب کے پاس ایک جمگھٹا لگا ہوگا۔ مجھے کون ملنے دے گا۔ اور دل کے مریض کے پاس یوں بھی نہیں جانے دیا جاتا۔ مجھے جو بیڈ بتایا گیا تھا وہاں صرف دو آدمی تھے۔ میں نے پہلے ایک دفعہ شاہد صاحب کو دیکھا تھا لیکن اس وقت نہ پہچان سکا خود ان سے ہی پوچھا۔ شاہد صاحب سے ملنا ہے۔ ایکدم چونک پڑے۔ جی فرمائیے۔ مجھے کہنا کیا تھا۔ مبہوت بنا دیکھتا رہا۔ سارا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ پیٹ پھولا ہوا تھا وہ اس وقت سخت تکلیف میں مبتلا تھے۔ کہنے لگے۔ ڈاکٹروں نے سگریٹ کے لیے منع کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے پیٹ پھول گیا ہے۔ بغیر سگریٹ کے میں کیسے رہ سکوں گا۔ دوسری یا تیسری ملاقات میں کہا۔ مجھے یہاں بڑی وحشت ہوتی ہے۔ کیسی عجیب و غریب جگہ ہے۔ انسان ابھی بات کر رہا ہے گردن گھما کر دوسری طرف دیکھیے پہلے والا شخص جو باتیں کر رہا تھا ملک عدم پہنچ جاتا ہے۔ میں یوں اور بھی گھبراتا ہوں روز میرے پڑوس میں نئے مریض آتے ہیں۔ شام کو تو دیکھا صبح اس کی جگہ دوسرا شخص ملا۔ معلوم ہوا وہ صاحب رات ہی کو سدھار گئے کبھی اِس طرف کی بیڈ خالی ہوتی ہے کبھی اُدھر کی۔ یوں تو میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن یہ جو تماشا ہوتا ہے وہ وحشت ناک ہے۔ پھر بڑے موڈ میں آکر کہنے لگے یہ جو صاحب فلمی دھن گنگناتے رہتے ہیں سخت ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں۔ انھیں کوئی شعر پورا یاد نہیں ہے۔ کبھی غالب اور مومن کے اشعار ملا کر پڑھتے ہیں کبھی ترنم سے داغ کا کلام پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن شعر کبھی پورا نہیں پڑھتے۔ انھیں مصرعے بہت سارے یاد ہیں۔ سگریٹ کے لیے منع کیا گیا ہے۔ مگر خدا کا بندہ تین تین چار چار پیکٹ روز کے پی جاتا ہے۔ نرسوں کو مسکرا مسکرا کر للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور آدھا پونا (باقی صفحہ نمبر ۱۵ پر)

طیب انصاری

آہ! اکبر وفاقانی

مادرِ علمیہ جامعہ عثمانیہ نے حیدرآبادی زندگی کو بہت جلد ایک نئی تہذیب اور ایک نئے سماج سے روشناس کرایا۔ نئے ذہن کی تعمیر کی اور چند نئے افراد، نئی شخصیتیں بھی اُبھر آئیں۔ جنھیں عثمانی عہد کی تہذیب کے علمبردار کہنا بے جا نہ ہوگا اور ان ہی علمبرداروں کے پہلے جتھے میں جہاں معین الدین قریشی، محی الدین قادری زورؔ، جلال الدین اشک، اور شیخ چاند شامل ہیں۔ وہیں اکبر وفاقانی بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ ادبی مضامین لکھے، ڈرامہ سوسائٹی کے رکن رہے، ڈرامے پیش کئے اور خود بھی ڈرامے لکھے۔ مصوری سے دلچسپی تھی اسلئے ملک کے مشہور آرٹسٹ قیوم کی شاگردی قبول کی جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد جب معین الدین قریشی اور ڈاکٹر زورؔ کی کوششوں سے ۱۹۲۷ء میں "مجلہ عثمانیہ" کی اجرائی عمل میں آئی یہ دوسرے سال معین الدین قریشی کے اشتراک کے ساتھ مدیر منتخب ہوئے۔

جامعہ عثمانیہ سے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے باوجود ادب سے عشق جاری رہا اور پھر ۵ نومبر ۱۹۳۲ء کو "حسن کار" کی صورت اختیار کر گیا۔ اکبر وفاقانی حسن کے شیدائی تھے اسلئے انھوں نے حسن پرستی شعار کی۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ بوالہوس تھے! حسن کا احساس زندگی کی اعلیٰ قدروں کا احساس ہے، حسن ابدی ہے لافانی ہے۔ یہ زمانہ کی سچائی ہے اسلئے حسن کی محبت سچائی سے پیار ہے، حسن زندگی کی راہوں میں ہماری دستگیری کرتا ہے اور رہبری بھی! اکبر وفاقانی نے زندگی کے ہر شعبہ میں حسن کے اسی احساس کو باقی رکھا۔ ان کے یہاں حسن مہدی افادی کی طرح "بت طناز" نہیں تھا۔ ایک احساس تھا جو زندگی کے روشن پہلوؤں کو عیاں کر دیتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ادب میں بھی حسن ہی کے نظریہ کو اختیار کیا۔ ویسے تو "حسن کار" میں ادبی رجحانات اور بدلتے ہوئے اقدار سے بحث کی جاتی رہی لیکن ان سارے نظریوں میں حسن کاری ہی کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ جلد اول کے پہلے شمارہ میں لکھتے ہیں:۔

"حسن کاروں میں ادب، شاعری، موسیقی، آزادی اور تعمیر کاری داخل ہیں
اس وسعت مضامین کو ہم نے موجودہ صورت میں حسن کار کے لیئے قبول کر لیا تاکہ
ایک طرف حسن کاری کو اُردو میں لایا جاسکے تو دوسری طرف اس کو اس قدر دلچسپ
بنایا جائے کہ وہ اپنی چھوٹی سی دنیا میں بہت سی دلکشیاں جمع کرلے 'حسن کاری
پھر قوم کی تہذیب میں یادگار رہے"۔

چنانچہ ظاہری اور معنوی دونوں لحاظ سے بھی "حسن کار" کو سنوارنے، سجانے کی کوشش کی۔ دیدہ زیب سرورق پر "نیا پل" کی تصویر، جانب شمال چار مینار کا سہ منزلہ باب الداخلہ اور ہائیکورٹ کی پرعظمت گنبدوں کی تصویریں دی گئی تھی اور اس خوبصورت انداز میں اردو و انگریزی دونوں زبانوں میں "حسن کار" لکھا گیا۔ یہ نیم ماہی رسالہ ۵ر نومبر ۱۹۳۲ء سے باہتمام مقبول علی صدیقی دفتر حسن کار واقع معظم شاہی جاری ہوا اور دو سال تک برابر نکلتا رہا۔ خاص مضامین کی فہرست سرورق پر ہی دی جاتی تھی۔ اس رسالہ کے لکھنے والوں میں روشن راے، سید شاہ محمد، سعید باراس، ابوالمحاسن میتن حسینی، سعید الحق انصاری، عبدالمجید صدیقی، بدر شکیب، بشنکر راو، غلام رسول، عبدالقیوم خان باقی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور شامل تھے "حسن کار" کے ظاہری حسن میں اکبر وفا قانی کا ذوقِ حسن اور سعید الحق انصاری کا خونِ جگر شامل ہے۔ مولوی سعید الحق انصاری جن کا حال ہی میں پاکستان میں انتقال ہوا ہے۔ اچھے ادیب ہی نہیں اچھے آرٹسٹ بھی تھے حسن کار کے اندرونی و بیرونی خوبصورتی میں اضافہ کرنے میں ان کی بھی محنت اور دلچسپی شامل رہی ہے۔

"حسن کار" خالص ادبی رسالہ تھا جس میں افسانہ، مضامین، نظمیں اور تنقیدوں کے علاوہ ادبی مسائل بھی پیش کئے جاتے رہے۔ صحافت اور طباعت پر اداریہ اور مضامین شائع ہوئے۔ "نسوانی گفتگو" کے عنوان سے ۲ر جنوری ۱۹۳۳ء سے خواتین کیلئے چند صفحات مختص کر دیئے گئے جس کو مسز ناظرہ مرتب کرتی تھیں۔ تصاویر کے ساتھ ساتھ کارٹونوں کا دلچسپ طریقہ بھی شروع کیا گیا۔ انجمن صحافت کا جب قیام عمل میں آیا تو "حسن کار" کے ذریعہ اکبر وفا قانی نے اس کا خیر مقدم کیا۔ "حسن کار" کے عام شماروں کے علاوہ اس کا "سالگرہ نمبر" بھی شائع ہوا۔ لیکن یہ "سالگرہ نمبر" روایتی نہیں تھا۔ اس میں روایتی قصیدہ خوانی سے احتراز کیا گیا۔

"حسن کار" میں جن مسائلی موضوعات کو چھیڑا گیا ان میں ادب اور حسن کاری مستقل موضوع تھا۔ اور آج بھی ہمارے جدید ادب کا یہی بنیادی مسئلہ ہے۔ اکبر وفا قانی ادب میں بھی اور زندگی میں دونوں میں حسن کاری کے قائل تھے اس لئے انھوں نے حسن کار میں حسن کاری کی وکالت کی ہے "ٹالسٹائی کا نظریۂ حسن کاری" (روشن راے) حسن کاری اور موسیقی (عبدالقیوم خاں باقی) دانتے (عبدالقیوم خاں باقی) اور "صحافت اور حسن کاری" (اکبر وفا قانی) جیسے مضامین اسی نظریہ کی غمازی کرتے ہیں۔ غلام رسول صاحب طبع زاد اور ترجمہ دونوں قسم کے افسانے پیش کرتے رہے لیکن ان کا دلچسپ مضمون "نئے خلا سفر ــ کارلائل!" اسی رسالہ میں شائع ہوا۔ "ادبیات اور سیرت" (سید محمد) "۲۰۳۰ء میں" (سعید باراس) "ماتاہری" (سید شاہ محمد) "شہر حیدرآباد کا آغاز" (ڈاکٹر زور) "عہد قطب شاہیہ کی دو ہم عصر منظوم تاریخیں" (ملک سردار علی) "دنیائے تعشق" (عبدالقادر سروری) "حیدرآباد کے کتب خانوں کے بعض اہم فارسی مخطوطات" (سروری) "مومن کی یاد" (باقی) "شمالی ہند کی چند مثنویاں"

(اعجاز علی شہرت) اور "احمد نگر اور اس کی تاریخ" (عبدالمجید صدیقی) جیسے معلومات آفریں مضامیں "حسن کار" میں شائع ہوئے اور ان ہی مضامین کی وجہ سے "حسن کار" کے معنوی حسن میں اضافہ بھی ہوا۔

مستقل اداریوں میں صحافتی اور ادبی مسائل پر بحث کی جاتی تھی اور "الیوم" کے کالموں کے ذریعہ سے حیدرآباد کے لیل و نہار پیش کئے جاتے تھے۔ بحیثیت مجموعی حسن کار بہ مشکل تمام دو سال تک زندہ رہا لیکن اس نے حیدرآباد کی صحافت پر جو رنگین اور حسین نقش چھوڑے ہیں وہ آسانی سے مٹائے نہیں جاسکتے۔ پولیس ایکشن کے بعد اکبر وفا قانی پاکستان ہجرت کر گئے اور اب قدیم عثمانین اور ان کے دوست جناب بدر شکیب صاحب نے کراچی سے اطلاع دی ہے کہ وہ انتقال بھی فرما گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؁

ایک انسان جو انسانی قدروں کا پاسدار بھی رہا ہو اور جو ایک تہذیب کی شکست و ریخت میں قابل لحاظ فرد بن کر اپنا فرض انجام دیتا رہا ہو۔ وہ بھلایا نہیں جاسکتا۔

حیدرآبادی تہذیب کی تعمیر نو میں اکبر وفا قانی نے اپنے ہم عصروں کے ساتھ بہتر رول ادا کیا ہے۔ یہاں کی ادبی و صحافتی زندگی میں وہ روح رواں رہے ہیں۔ ایک زمانہ تک جامعہ عثمانیہ کی سرگرمیاں ان کی ذات سے عبارت رہی ہیں۔ "حسن کار" ہماری صحافتی زندگی کا ناقابل فراموش سرمایہ ہے اور یہ سرمایہ مولوی اکبر وفا قانی مرحوم ہی کا ورثہ ہے۔ معین الدین قریشی شیخ چاند اور ڈاکٹر زور کے بعد اکبر وفا قانی کا سانحۂ ارتحال یقیناً فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ان ہی افراد نے ایک جدید عثمانی تہذیب کو جنم دیا تھا ابھی یہ تہذیب پھلنے پھولنے بھی نہ پائی تھی کہ انقلاب زمانہ نے تار پود کو بکھیر دیا۔ اب اسی تہذیب کی نشانیاں بھی اٹھتی جاتی ہیں ؎

یہ کون اٹھ گیا بھر میکدہ سے اے مینا
یہ کس کے غم میں شکستہ پڑے ہیں پیمانے　　(مینا قاضی)

(صفحہ ۱۲ سے آگے) مصرع مزدور پڑھ دیتا ہے۔ خوب جی بھر کے قہقہے لگاتا ہے۔ یہ بھی چاہتا ہے کوئی اس کے ساتھ تاش بھی کھیلے اگر تاش نہیں کھیلتا تو نہ کھیلے مگر باتیں ضرور کرے۔ باتیں بھی نیم ادبی قسم کی۔ اسکے ملنے والے بے شمار آتے ہیں اسے اپنی موت کی معمولی سی بھی فکر نہیں ہے۔ بارہا کہتا ہے موت کا ایک دن معین ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نیند نہیں آتی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ آپ پر شدید قسم کا دل کا دورہ پڑ چکا ہے اور ابھی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ عجیب آدمی ہے۔

لوگ کہتے ہیں شاہد مر گئے لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ جب تک ان کی شگفتہ تحریر زندہ ہے۔ وہ کیسے طرح مر سکتے ہیں معلوم نہیں لوگ صحیح کہتے ہیں یا میں۔

جمال کرنپوری

اختر اور رومان

ادب اور زندگی کا تعلق چولی دامن جیسا ہے۔ رومان زندگی کا ایک نہایت ہی اہم جزو ہے اس لحاظ سے دنیا کی تمام زبانوں میں رومانی شاعری خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جذبات کی شدت اور تخیل کی جدت و ندرت کے حسین سنگم ہی کو رومانیت کہا جاتا ہے موجودہ اردو شاعری رومانی و انقلابی دور سے گذر رہی ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری اردو رومانی شاعری کی صحیح ترجمان ہے۔

اختر کی زندگی و شاعری کیٹس کی زندگی و شاعری سے بہت ہی مشابہت رکھتی ہے۔ کیٹس کی طرح اختر بھی اپنے عشق و محبت میں ناکام و نامراد رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ناکامیٔ عشق کے نوحہ خواں ہیں۔ کیٹس کی طرح اختر نے بھی حسن مجازی کے ذریعے حسنِ حقیقی تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ دونوں شراب کے متوالے تھے اور عین جوانی کے عالم میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

اختر رومانی شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کی شاعری میں انفرادیت پائی جاتی ہے وہ حال سے بیزار اور ماحول سے پریشان ہو کر شراب و شباب کی منزل پر گامزن ہونا چاہتا ہے اور تخیلات کی دنیا میں عشق و محبت کی ایک رنگین داستان سناتا ہے مگر اس کو اس میں سکون و قرار نہیں ملتا کیونکہ اس کی زندگی سراپا درد و الم کا مرقع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں قنوطیت کا عنصر غالب ہے۔

اختر جب ماحول کی تلخیوں سے گھبراتا ہے تو بس چلا اٹھتا ہے ؎

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہہ عالم سے لعنت گہہ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے اس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

لیکن وہ دنیا کے تلخ حقائق کو بھلا کر آنے والے حسین زمانے کے تصورات میں کھو کر لطف حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مری آغوش میں ہوگا وہ جسمِ مرمریں اس کا
وہ اس کے عزمہ کا کل وہ روئے نازنیں اس کا
وہ رُخسارِ جبیں اسکے وہ حُسنِ یاسمیں اس کا
وہ جس سے شوق کی دنیا کو مہکائے گی وادی میں
سُنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

سلمیٰ اختر کی شاعری کی روحِ رواں ہے۔ رات کی خاموش تنہا فضا میں اختر ہمیشہ اختر شماری کے ساتھ ساتھ اپنی محبوبہ کے متعلق سوچتا ہے جو اس سے بہت دور ہے ؎

تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے
شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے

سلمیٰ سے شاعر کو اس بات کی شکایت ہے کہ وہ باوجود دید کی تمنا و آرزو دیکھنے کے اس کو دکھائی نہیں دیتی

مگر مری نگہِ شوق کو شکایت ہے
کہ اس نے تم کو فقط ایکبار دیکھا ہے
دکھادو ایک جھلک اور بس نگاہوں کو
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو

اختر شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھا مصور بھی ہے۔ جب اس کو اپنا کوئی بچھڑا ہوا ہموطن مل جاتا ہے تو شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر سوالات کے ذریعے اپنے دیس کی ہلکے ہلکے اور خوبصورت رنگوں سے تصویر پیش کرتا ہے۔ اس کے دماغ کے تخیلاتی گوشے میں بیتی باتیں، چاندنی راتیں، پنگھٹ پر جوان سکھیوں کے رسیلے بول، گلیوں کی دھندلی شمعوں پر سایوں کا بسیرا، ساون میں برکھا کی بہاریں، معصوم گھروں سے چکی کی صدائیں، میکے بچھڑی ہوئی سکھیوں کے ترانے اور شام کے دھندلے سایوں میں بانسریوں کے نغمے، غرض اپنے دیہات کا سارا سماں گھومنے لگتا ہے۔ اختر نے "او دیس سے آنیوالے بتا" والی نظم میں ہندوستانی دیہات کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ اردو ادب میں اس قسم کی حسین اور دلکش پرچھائیاں بڑی ہی غنیمت ہیں اور انھیں دنیا کے اعلیٰ سے اعلیٰ ادب میں پیش کیا جا سکتا ہے ؎

کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر پنہاریاں پانی بھرتی ہیں
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں ...
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں

کیا شام پڑے سڑکوں پہ وہی دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے
اور گلیوں کی دھندلی شمعوں پر سایوں کا بسیرا ہوتا ہے
باغوں کے اندھیرے گوشوں میں جس طرح سویرا ہوتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا!

کیا گاؤں پہ اب بھی ساون میں برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں
معصوم گھروں سے بھور بھئے چکی کی صدائیں آتی ہیں
اور یاد میں اپنے میکے کی بچھڑی ہوئی سکھیاں گاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا!

اس نظم میں شاعر نے سلاست، سادگی، صفائی و شیرینی کے دریا بہائے ہیں۔ اختر کے کلام میں بعض جملوں کی تکرار سے یا چند ٹکڑوں کے بار بار دہرانے سے بحر میں ترنم پیدا ہو جاتا ہے جو شاعری کی جان ہے اور اس کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت۔

اختر کا فلسفۂ محبت اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اختر نے محبت ہی کو سب کچھ سمجھا ہے اس کے بغیر زندگی میں اسے کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی نظر میں دنیا کی ہر تحریک (یعنی حرکت) کے اندر محبت کارفرما ہے۔ اگر انسان کے دل میں محبت پیدا نہ ہوتی تو دنیا کی بہاریں اور قدرت کے نظارے بے اثر ہو جاتے —— یہاں تک کہ یہ زمین اور آسمان جنت اور اس کے خوشنما باغات وغیرہ کوئی وقعت نہ رکھنے پاتے۔ اسی حقیقت کو شاعر نے ذیل کے اشعار میں بیان کیا ہے اور انسانی دل میں طلوع محبت سے پہلے کی کیفیت کو اجاگر کیا ہے ؎

یہ زمیں سادہ تھی جنت نہ ہوئی تھی پیدا	زندگی میں کوئی لذت نہ ہوئی تھی پیدا
ذہن اور فکر میں عظمت نہ ہوئی تھی پیدا	جب تلک دل میں محبت نہ ہوئی تھی پیدا

اور جب محبت کا آفتاب بام عروج پر پہنچ جاتا ہے تو اختر کی حالت کیا ہوتی ہے یہ بھی اس کی زبانی سنئے ؎

محبت کیلئے آیا ہوں میں دنیا کی محفل میں	محبت خون بن کے لہلہاتی ہے مرے دل میں
ہر اک شاعر مقدر اپنا اپنے ساتھ لایا ہے	محبت کا جنوں تنہا میرے حصے میں آیا ہے
محبت ہی مرے نزدیک معراج عبادت ہے	محبت ہی مرے نزدیک سرتاج عبادت ہے
محبت مبدا میرا محبت منتہا میرا	حقیقت میں محبت ہی محبت ہے خدا میرا

اختر جیسا رند مزاج شاعر بھی دو دُسرا تھ کی فطرت کے حسین و رنگین نظاروں سے والہانہ محبت کرتا ہے۔ وہ ان دلچسپ رنگینیوں میں اپنے آپ کو کھو دینا چاہتا ہے تاکہ ابدی مسرت حاصل کرے۔ ذرا ملاحظہ ہو ؎

چمن کے مست نظارے مجھے مسرور رکھتے ہیں
مرے دل کو گداز نغمہ سے معمور رکھتے ہیں
اسیر کیف کر دیتی ہے یہ پھولوں کی آبادی
مجھے خوشبو سے بھر دیتی ہے یہ پھولوں کی آبادی
شراب رنگ و بو ایسی برستی ہے نظاروں سے
لپٹ جاتا ہوں آغوش بیخودی میں شاخساروں سے

اسکے علاوہ "دعا" "نورجہاں" اور "آج کی رات" والی نظموں میں فطرت کی گلکاریاں موجود ہیں

رومانی شاعری کی ایک اہم خصوصیت درد ہے جو پڑھنے والے کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔ اختر کے سینے میں جو درد ہے وہ لاوے کی شکل اختیار کرتا ہے اور شدت جذبات میں لاوا پھوٹ پڑتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جبکہ اختر کی شاعری کی حسین اور تھرتھراتی لکیروں میں جان پڑجاتی ہے ؎

آہ وہ راتیں وہ باتیں یاد آتی ہیں مجھے
فقط اتنا بتا دو کیا وہ راتیں پھر نہ آئیں گی
وہ راتیں جن میں دل کی دھڑکنیں بیدار ہوتی تھیں

وہ راتیں وہ باتیں اور دل کی دھڑکنوں میں کتنی تلخ گہرائی اور کتنا حسین مفہوم پوشیدہ ہے۔ دیکھیے دوسری حسرت و تمنا اور یاس و التجا کے ملے جلے جذبات کو شاعر نے کس سلیقے سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

گنوا نہ سوگ میں اپنے شباب کی راتیں
نہ ہاتھ آئیں گی پھر ماہتاب کی راتیں
رنگہتوں کا ہجوم اور یہ خواب کی راتیں

فضا یہ خواب کی مانند چھا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

اس سلسلہ کی دوسری نظمیں جن میں درد اور تڑپ کے علاوہ زور بیان ہے وہ حسب ذیل نظمیں ہیں (۱) کلیاں۔ "مجھے تو کچھ انہیں پیار کلیوں سے محبت ہے" (۲) اے عشق ہمیں برباد نہ کر (۳) میرا ننھا جوان ہوگا (۴) اسے دیس سے آنے والے بتا۔

اختر کی شاعری کا دوسرا پہلو فرار اور گریز کی جانب لے جاتا ہے۔ جب زمانے کے حادثات سے اس کا دل چور چور ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو لاشعوری طور پر اس طرح سمجھاتا ہے ؎

خزاں کے بعد آتی ہیں بہاریں باغ عالم میں
بہاریں ختم ہونے پر خزاں کا دور آتا ہے
چمن روتا ہے اک دن دوسرے دن مسکراتا ہے

مگر جوں ہی وہ لاشعور کی وادی سے نکل کر شعور کی منزل میں قدم رکھتا ہے تو اس کو اس بات کا تلخ احساس ہوتا ہے ؎

تو اپنے رنج کو راحت بنا سکتا نہیں اے دل
بلا کر عشرتِ رفتہ کو لا سکتا نہیں اے دل

اس کی نظریں مستقبل کی جانب اُمید بھری ہونے کے باوجود اس کا دل یاس انگیز طوفان میں ڈوبنے لگتا ہے ؎

میرا دل ڈوبنے لگتا ہے اس انبارِ ارماں سے
یہ کشتی تہہ نشیں ہوجاتی ہے ٹکرا کے طوفاں سے

اختر صرف رومانی شاعر ہے۔ اس کے کلام میں انقلاب پسند عناصر تلاش کرنا نادانی ہے لیکن اس کی صرف ایک نظم "ساقی اٹھ تلوار اٹھا" کی اٹھان بلند حوصلوں اور پُر اُمید ارادوں سے اُٹھتی ہے مگر آخر اس کی تان بھی وہی قنوطیت پر آکر ٹوٹتی ہے۔ جہاں فرار و گریز کا عنصر پایا جاتا ہے ؎

مانا کہ کوئی ذرہ بھی یہاں آزادِ غم ایام نہیں
قابو میں کسی کے صبح نہیں قبضے میں کسی کے شام نہیں
پر عشقِ وطن کے ماروں کا مرنے کے سوا کچھ کام نہیں
آنکھیں ہوئیں کیوں خونبار اُٹھا
اُٹھ ساقی اُٹھ، تلوار اُٹھا

اختر ہمیشہ ماحول کے اُبلتے ہوئے انگاروں اور زمانے کے دہکتے ہوئے شعلوں سے دور رہنے کی سعی کرتا ہے وہ اپنے آپ کو عشق و محبت کے ان حسین تخیلات میں کھو دینا چاہتا ہے جن میں حسن کی رعنائیاں، پھول کی لطافتیں، شراب و شباب کی سرمستیاں اور شعر و سخن کی پرسوز اور دل گداز محفلیں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی مکر سے بھری ہوئی دنیا کو دیکھتا ہے تو عشق کے سایہ میں سر چھپاتا پھرتا ہے۔ اس کے دل میں دنیا کو بدل دینے کی تمنا ہے مگر اس کے مقابلے کی تاب اپنے میں نہیں پاتا ؎

دنیا کا تماشہ دیکھ لیا غمگین سی ہے بے تاب سی ہے
اُمید یہاں ایک وہم سی ہے تسکین یہاں ایک خواب سی ہے
دُنیا میں خوشی کا نام نہیں، دنیا میں خوشی کو یاد نہ کر
دنیا میں خوشی کو یاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اردو نظم میں ہیئت کے نئے نئے تراکیب و تراشے بہت اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔ اختر کی بہت سی نظموں میں

ہیئت کے نئے تجربے ملتے ہیں۔ آل احمد سرور اپنی کتاب "ادب اور نظریہ" میں لکھتے ہیں" اختر شیرانی کی رومانیت انھیں سانیٹ کے تجربے کی طرف لے گئی۔ سانیٹ اردو میں اس وجہ مقبول نہ ہوا کہ اس کے فارم میں کوئی ایسی بات نہ آ جو ہمارے دوسرے اصناف کی مدد سے نہ کہی جا سکتی ہو مگر اختر شیرانی کا ایک اور تجربہ اہم ہے اور وہ ہے ان کا وہ عجیب تصور جو کبھی سلمیٰ کے رومانی آئیڈیل میں نظر آتا ہے اور کبھی اس زندگی کے چاند تاروں اس کے کوہ و دریا اس کی حسین وادیاں اور اس کی سلمیٰ عذرا ریحانہ اور ناہید کی حوران ارضی میں (صفحہ ۲۴۴) وہ قدیم شعرا کی طرح اپنے محبوب کو نہ تو پردہ راز میں رکھا اور نہ ہی اس کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کیا۔ اختر شیرانی نے ایکانکی ڈرامہ بھی لکھے۔ ان میں سے "وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھو" اسکول اور کالج کے طالب علموں میں کافی مقبول ہوا۔

رومانیت کا بھرپور اثر اختر کی غزلوں میں بھی پایا جاتا ہے ان کی غزلوں میں قنوطیت اور رومانیت کے ملے جلے اثرات ملتے ہیں جو اپنے اندر داخلی کیفیت اور خارجی جذبات بھی رکھتے ہیں اور محاکات بھی ان کے اکثر و بیشتر اشعار پڑھنے والے دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی — شراب لا مری حالت خراب ہے ساقی
شباب کے لیے توبہ عذاب ہے یا رب — شراب لا مجھے پاسِ شباب ہے ساقی

یوں نرگس پھول سے رنگت زندگی بو نہ گئی — اے محبت! مرے پہلو سے مگر تو نہ گئی

جنابِ شیخ پہنچ جاتے حوضِ کوثر تک — اگر شراب سے میخانے میں وضو کرتے
غمِ زمانہ نے مجبور کر دیا ورنہ ! — یہ آرزو تھی کہ بس تیری آرزو کرتے

وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں — محبت کریں خوش رہیں مسکرا دیں
جوانی ہو گر جاودانی تو یارب ! — تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں
شبِ وصل کی بے خودی چھا رہی ہے ! — کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں
ترے وصل کی بے خودی کہہ رہی ہے — خدائی کو کیا ہم خدا کو بھلا دیں

ان کا زانو تھا مرا سر مرا دل ہات ان کا — بے خودی تیرا بُرا ہو مجھے کب ہوش آیا

غموں کی فصل ہمیشہ رہی تر و تازہ
یہ وہ خزاں ہے کہ شرمندۂ بہار نہیں

شرف الدین فیضی

رحیم کے چند دوہے

عبدالرحیم خانخاناں کی شاعری پر ہم نے ڈاکٹر وشنو سروپ کا ایک مضمون جون ۱۹۶۸ء کے شمارے میں شایع کیا تھا ہم ممنون ہیں کہ جناب فیضی صاحب نے رحیم کے دوہے ترجمے کے ساتھ عنایت فرمائے ہیں۔ ہم انھیں رسم خط کی تبدیلی کے ساتھ شائع کر رہے ہیں (ادارہ)

جو لوگ حقیقی طور پر نیک اور پرہیزگار ہیں۔ اُنھیں بری سے بری صحبت بھی کیوں نہ ملے اُن کی طبیعت میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور وہ بُرے ماحول سے متاثر ہو کر اپنا نیک رویہ نہیں بدلتے'

جو رحیم اُتم پرکرتی کا کری سکت کوسنگ
چندن وِش ویاپت نہیں لپٹے رہت بھجنگ

طبیعت' خصلت = (پرکرتی)' نیک' شریف = (اُتم)
یہ لفظ ہمیشہ اسم کے پہلے آ کر صفت کے معنیٰ دیتا ہے'۔ بد' زشت = (کُو) صحبت بد = (کوسنگ)
صحبت = (سنگ)' (ویاپت) = بھرا ہوا' پھیلا ہوا' سانپ = (بھجنگ)

اے رحیم! جو لوگ شریف اور نیک خصلت ہوتے ہیں۔ ان کو کسی بدخو اور شریر النفس کی صحبت نہیں بگاڑ سکتی اور وہ اپنی پرہیزگاری کو ترک کر کے' بدوں کی صحبت سے متاثر ہو کر بد نہیں بن سکتے جیسے سانپ صندل کے درخت سے لپٹا رہتا ہے مگر صندل پر اُس کے زہر کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ اسی قسم کا ایک اور لاجواب دوہا ہے۔ جو متذکرۂ بالا دوہے سے بھی بہتر ہے ؎

رحیمن لاکھ بھلی کرو' اگنی اگن نہ جائے
راگ سنت پیہ پی اتھو' سانپ سہج دھری کھائے

آ حرفِ نفیٰ' برائی = (اگن)' بدخصلت = (اگنی)' دودھ = (پیہ) بانسری یا تمڑی کا راگ گیت = (راگ)

اے رحیمن! بروں کو احسان و عنایت سے مطیع کر کے نیک بنانے کی لاکھ کوشش کرو مگر وہ خصلتِ بد سے باز نہیں آتے جیسے سانپ راگ سنتا ہے' دودھ پیتا ہے اور اُسکے باوجود ڈسنے میں کبھی

پیچھے ہیں ہٹتا یہ کہ دودھ پلانے یا راگ سنانے کا اُس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔
مشاہدہ سے ظاہر ہے کہ برے ماحول سے نیک انسان اور بہترین اشیاء کی قدر و منزلت میں فرق آجاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی نیک طینت اور پرہیزگار کسی شدید ضرورت سے مجبور ہو کر شراب خانہ یا سیندھی خانہ میں چلا جائے تو دنیا اُس کے نیک طرز عمل اور پرہیزگاری کو نظر انداز کر کے خواہ مخواہ شرابی یا نشہ باز قرار دیتی ہے۔

رحیمن نیچن سنگ بسی لگت کلنک نہ کاہی
دودھ کلارن کر گہے، مدسو جھو سب تاہی

دھبہ، عیب = (کلنک) نیچی اُس کی جمع ہے، کمینہ، رذیل = (نیچ) شراب = (مد) ہاتھ = (کر) زنِ مے فروش = (کلارن)۔

اے رحیمن! رذیلوں اور کمینوں کی صحبت میں رہنے سے کس کو بٹہ نہیں لگتا؛ سب کا دامنِ عزت داغدار ہو جاتا ہے۔ جیسے زنِ مے فروش جو ہمیشہ شراب فروشی کرتی ہے اگر اتفاق سے دودھ فروخت کرنے لگے تو لوگ اُس کو شراب ہی تصور کریں گے۔

صرف یہی نہیں کہ برے ماحول سے اچھی اشیاء کو بٹہ لگتا ہے بلکہ بروں کے کرتوتوں کا خمیازہ ناکردہ گناہ اچھوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ نواب عبدالرحیم خانخانان بہادر نے ایک نادر مثال سے اس کو یوں واضح کیا ہے ؎

کوٹلن سنگ رحیم کا ہی ساد ھو بچتے ناہیں
جیوں نینا سینا کریں اورج او بیٹھے جاہیں

کوٹل کی جمع، برے لوگ = (کوٹلن) برا، بد رویہ = (کوٹل) پرہیزگار، عابد = (سادھو) یہاں آنکھوں کو برے لوگوں سے تشبیہ دی ہے، آنکھیں = (نینا) سینہ، چھاتی = (اُر) ایک دوسرے کو آنکھ سے اشارہ کرنا = (سینا) (اُرج) = اُر معنی چھاتی اور "ج" معنی پیدا اس لیے "اُرج" کے معنی وہ جو چھاتی میں سے پیدا ہو یعنی پستان یہاں پستانوں کو سادھو سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پکڑے جانا = (او بیٹھے)

رحیم کہتے ہیں کہ سادھو اور پرہیزگار بد طینت اور بد رویہ لوگوں کی صحبت میں رہیں تو ان کو بھی بد رویہ لوگوں کے برے کاموں کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ جیسے نائکہ نائک سے ملنے کے لیے آنکھ سے اشارہ کرتی ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ نائک اُس کے سینہ پر ہاتھ ڈالتا ہے اور آنکھ کے قصور کی سزا سینے کو ملتی ہے ؎

نظر نظر سے لڑی دل میں اضطراب ہوا   قصور کس کا تھا اور کس پہ یہ عذاب ہوا

اسی قسم کا ایک لاجواب دوہا ہے جو متذکرہ بالا دوہے سے بھی بہتر ہے۔ اس کے پڑھتے ہی بیساختہ شاعر کی قوت متخیلہ کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ دوہا کلام ہندی میں حسن تعلیل کی بہترین مثال ہے۔

رحیمن نیچ پرسنگ تے، نت پرتی لابھ وکار
نیر چوراوتی سمپتی، ماسہت گھر آر

ہمیشہ = (نت پرتی)، میل ملاپ = (پرسنگ) نقصان، خرابی = (وکار)، ملنا۔ پانا = (لابھ)، گھنٹہ (گھر آر)، کٹوری = (سمپتی)، پانی = (نیر)

اے رحیمن! کم ظرفوں اور رذیلوں کے میل ملاپ اور اُن کی صحبت سے بڑوں کو ہمیشہ نقصان ہی ہوتا آیا ہے۔ جیسے کٹوری پانی چراتی ہے اور مار گھنٹے پر پڑتی ہے۔

اسی مضمون کا ایک اور دوہا ہے یہ دوہا بھی ہندی کلام میں حسن تعلیل کی بہترین مثال ہے کہتے ہیں کہ راون والیٔ لنکا بہت شریر، ظالم اور بدی کا پتلا تھا اس میں اس قدر طاقت تھی کہ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتا تھا، سمندر کو متحرک کر سکتا تھا۔ دیوتا اُس کی خدمتیں انجام دیتے تھے۔ جب اُس نے ناسک (پنچوٹی) سے سیتا جی کو جبر سے اپنے ساتھ لے جا کر قید رکھا تو سری رامچندر جی بحر ہند پر پل باندھ کر لنکا پہنچے اور سیتا جی کو قید سے رہائی دلائی۔

بس کسنگ چاہت کسل، یہ رحیم جس سوس
مہا گھٹی سمودر کی، راون بسیو پروس

امن و امان، خیر و عافیت = (کسل)، صحبت بد = (کسنگ)، قدر و عزت، شان و شوکت = (مہا)، افسوس = (سوس)، لنکا کا راجہ جس کو رامچندر جی نے قتل کیا تھا = (راون)، ہمسائیگی = (پروس)

اے رحیم! اُس شخص پر افسوس ہے جو بری صحبت میں رہ کر اپنی بھلائی چاہتا ہے۔ بُری صحبت میں رہنے ... کسی طرح آرام نہیں پا سکتا بلکہ تکلیف ہی اٹھانی پڑتی ہے۔ دیکھو جب راون سمندر (بحر ہند) کے پڑوس میں آ بسا تو اُس (بحر ہند) کی بزرگی گھٹ گئی اور باندھا گیا۔

کہو رحیم کیسے نبھے، بیر کیر کو سنگ
وے دولت رس آپنے، اُنکے پھاٹت انگ

یہاں مراد شریف، کیلے کا پودا = (کیر)، یہاں مراد رذیل، بیر کا درخت = (بیر)، ذوق = (رس)، مراد بیر کی ڈالیاں، وہ = (وے)، جسم = (انگ)، جھومتی ہیں = (ڈولت)

رحیم! بیر اور کیلے کی دوستی کیسے نبھ سکتی ہے؟ کیونکہ جب ہوا سے بیر کی کانٹے دار ڈالیاں مست

ہو کر جھومنے لگتی ہیں تو اُن کے کانٹوں سے کیلے کے چکنے پتے پھٹ جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ رذیلوں کی دوستی شریفوں کے لیے باعث تکلیف ہے۔ ہم مذاق لوگ ہی ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔

ایک اور نادر مثال دے کر اس طرح سمجھایا ہے کہ نیکوں ہی کی صحبت اختیار کرنی چاہیئے۔

رحیمن اُجلی پرکرتی کو نہیں نیچ کو سنگ
کریا باسن کر گہے، کا لکھ لاگت انگ

خصلت = (پرکرتی)، اچھی نیک = (اجلی) برتن = (باسن) کالا = (کریا) لینے سے = (گہے) ہاتھ = (کر)

اے رحیمن! نیک خصلت اور شریف لوگوں کو رذیلوں کی صحبت سے احتراز کرنا چاہیئے کیونکہ کالا برتن ہاتھ میں لینے سے ہاتھ ضرور کالے ہو جائیں گے۔

اوچھے شخص کے خوش ہونے یا رنجیدہ ہونے پر دونوں حالتوں میں بھی اُس کا ساتھ ضرر رساں اور تکلیف دہ ہے، اسکو اس طرح واضح کیا گیا ہے۔

رحیمن اوچھے نرن سوں، بیر بھلو نا پریت
کاٹے چاٹے سوانکے، دوؤ بھانتی وپریت

نر واحد معنی لوگ = (نرن) ہلکے، رذیل = (اوچھے) کتا = (سوان) دوستی = (پریت)، دشمنی = (بیر)، بربادی۔ نقصان = (وپریت) طرح = (بھانتی)

اے رحیمن! رذیل اور اوچھے شخص سے نہ تو دشمنی بھلی ہے اور نہ دوستی بہتر ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کتا محبت سے چاٹنے لگ جاتا ہے تو جسم کو نجس اور ناپاک کر دیتا ہے اور جب دشمن بن جاتا ہے تو کاٹ کر زخمی کر دیتا ہے ظاہر ہے کہ کتے کے ہر دو عمل باعث تکلیف اور قابلِ نفرت ہیں۔

ایک اور لاجواب دوہا کہا گیا ہے۔

رحیمن جیوہا باوری کہی گئے سرگ پتال   آپو تو کہی بھیتر رہی، جوتی کھات کپال

ناسمجھ، دیوانی = (باوری)، زبان = (جیوہا)، تحت الثریٰ = (پتال)، آسمان = (سرگ)، کھوپڑی کاسۂ سر = (کپال)، اندر = (بھیتر)

(کہی گئے سرگ پتال) = زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ اُلٹا سیدھا بک گئی۔

اے رحیمن! ناسمجھ زبان نے جو جی چاہا کہہ دیا اور زمین اور آسمان کے قلابے ملانے کے علاوہ دوسروں کو بُرا بھلا کہکر خود تو پردہ پوش ہو گئی مگر اُس کی صحبت میں رہنے سے اُس کے افعال کا خمیازہ سر کو بھگتنا پڑا کہ سر پر اتنی جوتیاں پڑیں کہ چندیا خوب گنجی ہو گئی۔

مظفر حنفی

کسی کو میری طرح زخم بے حسی نہ لگے
کہ اس کی یاد بھی آئے تو اس میں جی نہ لگے
وہ زندگی جسے اوپر سے دیکھتے ہیں لوگ
مری نگاہ سے دیکھیں تو زندگی نہ لگے
بجا کہ جاگتی آنکھوں کے خواب جھوٹے ہیں
تو پھر کرے بھی کوئی کیا جو آنکھ ہی نہ لگے
ہر ایک موج ہے بیتاب سر پٹکنے کو
حباب کی یہ تمنا کہ ٹھیس بھی نہ لگے
خود اپنے در پہ بھی سجدہ ہے ایک پاگل پن
دعا کرو کہ خودی کا مرض کبھی نہ لگے
میں اس کے روپ میں پہچانتا ہوں اپنے کو
اسے یہ خوف کہ اس کو نظر مری نہ لگے
گلہ نہیں ہے لکیروں کے ان فقیروں کا
نئی غزل انھیں اچھی نہیں لگی نہ لگے
ملیں گے ہم بھی مظفر سے ایک دن صاحب
خلوص کہتا ہے شاید وہ فلسفی نہ لگے

مست فتحپوری

کرتا ہوں اگر ضبط فغاں اور زیادہ
بڑھ جاتا ہے کچھ سوز نہاں اور زیادہ
ہونے ہیں انھیں وہم وگماں اور زیادہ
سنتے ہیں اگر میرا بیاں اور زیادہ
جب دل نے مرے شمع محبت کی جلائی
پُر نور ہوئے کون و مکاں اور زیادہ
سنگ درِ جاناں کا بھرم بڑھ گیا کچھ اور
ابھرے مرے سجدوں کے نشاں اور زیادہ
جس وقت تسلی کوئی دیتا ہے الم میں
دل ہوتا ہے سرگرم فغاں اور زیادہ
جب ہم نے دعا جلد اجل آنے کی مانگی
تھم تھم کے چلی عمر رواں اور زیادہ
دھندلا ہوا جس وقت محبت کا تصور!
تاریک ہوئے دونوں جہاں اور زیادہ
آمد ہوئی جب موسم گل کی تو چمن میں
بڑھنے لگے آثار خزاں اور زیادہ
دنیا میں لٹی مست کی دنیا کی کمائی
کیا پوچھتے ہو سود و زیاں اور زیادہ

ساحلؔ مانکپوری

ہونٹ گلابی لال کپول
آنکھ میں چپلا باہیں گول
بیت نہ جائے رُت انمول
نیند کے بھوگی آنکھیں کھول
کھانا ہے کیوں رشت میں ہول
بھرت نہیں یہ جھینگر بول
تیز بہت ہے غم کی دھوپ
حُسن کی دیوی آنکھیں کھول
میں اور تجھ کو بھول گیا ہوں
پیتم اتنا جھوٹ نہ بول
اشک کی قیمت تم کیا جانو
یہ موتی ہیں بابا مول
مجھ پہ تہمت دھرنے والے
تو بھی اپنے دل کو ٹٹول
ٹھیک نہیں بے پردہ ہونا
سب کی نیت ہے ڈانواڈول
ساحلؔ کی اب بات نے ان
چھوڑ بھی دے یہ ٹال مٹول

طربؔ میرٹھی

ہستیٔ دل کو مٹایا اور بہ چشمِ تر اُٹھے
بزمِ جاناں سے وفا کا یہ صِلہ لیکر اُٹھے
یک بیک محوِ تماشا ہوگئے دونوں جہاں
اک قیامت خیز انگڑائی وہ یوں لیکر اُٹھے
فکرِ رسوائی کیسے ہے خوف بربادی کسے
عشق کی راہوں میں یہ طوفان تو اکثر اُٹھے
پھر نگاہِ فتنہ ساماں کو ذرا جنبش تو دو
اک زمانہ ہوگیا دِل میں کوئی محشر اُٹھے
ساقیا عہدِ جوانی کا رہے کچھ تجھکو پاس
ہر گھڑی اب جام چھلکے ہر گھڑی ساغر اُٹھے
موت سے ٹکرا گئے جو دِل میں لیکر تیری یاد
اِس جہاں میں وہ پیامِ زندگی بنکر اُٹھے
آ رہی تھیاں ظلم و ستم کی لاکھ یہ دنیا اُٹھائے
آستانِ یار پر جھک کر نہ پھر یہ سر اُٹھے
ہم نہ کہتے تھے طربؔ خوئے جنوں بس چھوڑ دے
آپ آخر اُس گلی سے خاک میں مل کر اُٹھے

بیتاب پیلی بھیتی

شغلِ بادہ کا اہتمام کریں
غم کو پھر آج نذرِ جام کریں
گفتگو اس طرح تمام کریں
زندگی کا ہی اختتام کریں
دیدہ و دل ہیں منتظر دونوں
آپ چاہیں جہاں قیام کریں
جو غمِ روزگار دے فرصت
پھر ترا ذکر صبح و شام کریں
ہنسنے والے ہنسیں مگر اے دوست
میرے غم کا بھی احترام کریں
اپنے افسانۂ تباہی کو
کس سے منسوب کس کے نام کریں
اپنا بس ہو تو زندگی کو دوست
ہم ابھی سو دفعہ سلام کریں
جب نگاہیں ہوں ترجماں دل کی
کیوں بھلا زحمتِ کلام کریں
جب نظر پر بھی لگ گئے پہرے
ہم تمہیں کس طرح سلام کریں
ہو جو خاطر انہیں مری منظور
اپنے ہاتھوں سے پیش جام کریں
زخم رسنے لگیں نہ پھر بیتاب
قصۂ غم کو اب تمام کریں

شمشاد ادیب سہارنپوری

اس وہم سے کہ اب نہ سفر میں خلل پڑے
خود میرِ کارواں بھی مرے ساتھ چل پڑے
پوچھا کسی نے ہم سے جو حالِ دلِ تباہ
بے ساختہ مژہ پہ کچھ آنسو نکل پڑے
تم نے دیا سہارا جو اک تیرہ بخت کو
لاکھوں چراغ راہِ محبت میں جل پڑے
آیا جو میکدہ میں وہ سرمایۂ نشاط
رندوں کے دستِ شوق میں ساغر اچھل پڑے
اُن رہروں نے لیلیٰ منزل کو پالیا
راہِ جنوں میں جن کے قدم برمحل پڑے
کس حسنِ اہتمام سے مضرابِ غم پڑی
دل کے شکستہ ساز سے نغمے اُبل پڑے
چھیڑ دو چمن میں آج وہی نغمۂ خروش
جس سے بہارِ گل کی سواری نکل پڑے
لوٹی ہے جس نے اپنی متاعِ سکونِ دل
کیسے کہوں کہ اس کے سکوں میں خلل پڑے
بے کل ہوں جس کی یاد میں دن رات اے ادیب
اُس کو بھی بن مرے کہیں پہلو نہ کل پڑے

باقر منظور

یوں کیف پرور فکرِ سخن ہے
جیسے نشاطِ صبحِ وطن ہے

اے دوست تیرا طرزِ تغافل
خورشید غم کی پہلی کرن ہے

تم کو سکونِ دل ہم نے سمجھا
یہ بھی ہمارا اک حسنِ ظن ہے

نازش ہے ہم کو اپنی وفا پر
وہ کہہ رہے ہیں دیوانہ پن ہے

پھر اک توجہ اے چشمِ ساقی
ماحول کتنا توبہ شکن ہے

دل پر تصرف اُردو زباں کا
نظروں میں حسنِ گنگ و جمن ہے

کُنجِ قفس ہو یا صحنِ گلشن
ہر اک فضا میں حبِ وطن ہے

دامن کشاں ہیں وہ مجھ سے باقر
انجامِ الفت کیسا دل شکن ہے

صلاح الدین نیّر

ہر اک ادا تری مائل بہ دلنوازی ہے
مرے رفیق! یہ کیا شانِ بے نیازی ہے

حیات زخم بنی، زخم بن گئے ناسور
نفس نفس مرا محتاج چارہ سازی ہے

دِوانے شہر کی گلیوں سے دار تک پہنچے
خلوصِ عشق! یہ سب تیری سرفرازی ہے

بجز خلوص، ہر اک جنس ہو گئی ارزاں
جہاں بھی جاؤ رفیقو! زمانہ سازی ہے

چلے بھی آؤ کہ تجدیدِ آرزو کر لیں
میں جانتا ہوں کہ ہاری ہوئی یہ بازی ہے

قتیلِ زیست ہوں، مجرمِ وفا تو نہیں
پھر اس کے بعد میں کب ناز پا کیا زی ہے

وفا شعار جو تھے مصلحت شناس بنے
ہمارے دور کی نیّر یہ کارسازی ہے

رؤف خیر

دیکھکر کہ ابھی فن کی مانگ ہی کم ہے
بہت دنوں سے مرا جوشِ آذری کم ہے
نام مانگتے احساسِ برتری سے کہو
کہ مجھ غریب میں احساس کمتری کم ہے
رے خون سے لکھی گئی ہیں نارنگیں
عجیب تو یہ ہے کہ اب اپنا ذکر ہی کم ہے
رست ہے کہ تعارف نہیں کوئی ہم میں
یہی بہت ہے کہ انداز اجنبی کم ہے
ئے دیئے جو پرانے دیئے بجھا کے چلے
میں دیکھتا ہوں کہ ان سب کی روشنی کم ہے
بتوں کی عمر بڑھے کیا نہیں ہے پاس اپنے
بس اتنا ہے کہ ذرا امن و آشتی کم ہے
ہ لوگ خیر جنھیں اگلا دور روئے گا
ہم ان کے ساتھ ہیں یہ بھی خوشی کوئی کم ہے

کرار نوری

خود فریبی ہے کبھی اور کبھی دانائی ہے
کبھی اُلجھی ہے طبیعت کبھی اُلجھائی ہے
دل کو تو لالۂ صحرا کی ادا بھائی ہے
ہائے کس وقت گلستاں میں بہار آئی ہے
دیکھتا ہوں میں ہر اک سمت بہ اُمید کرم
جیسے ہر شخص سے دنیا میں شناسائی ہے
کتنا بیباک ہوں ہر بات میں بول اُٹھتا ہوں
جیسے ہر بات مجھے آپ نے سمجھائی ہے
پھر نظر گل پہ پڑی پھر ہے چمنِ خلد نظر
پھر کوئی شکل ملاقات نکل آئی ہے
آدمی محض ہے آوارۂ احساس و خیال
ہر نظر اپنی جگہ اپنی ہی سودائی ہے
ہوش نے پھر مجھے آغاز پہ لا کر چھوڑا
پھر وہی میں ہوں وہی میری جبیں سائی ہے
گاہے گاہے تو سمندر بھی ہے اک قطرۂ آب
اور سمندر کی کبھی قطرہ میں گہرائی ہے
کون ہے گوش بر آواز سرِ عرشِ بریں
کس نے روداد مری حشر میں دہرائی ہے
اہلِ دل اہلِ نظر آتے ہیں نوری کی طرف
مژدہ اے لالۂ صحرا کہ بہار آئی ہے

غلام مرتضیٰ راہی

زندگانی کی شرح مبہم ہے
امتزاجِ مسرت و غم ہے
دن میں بھی تیرگی کا عالم ہے
جیسے سورج میں روشنی کم ہے
تیرا جلوہ تو عام ہے لیکن
مجھکو اپنی نظر کا ماتم ہے
کیوں نہ ٹھیرائیں موردِ الزام
دامنِ گل پہ داغِ شبنم ہے
اور اونچی کر دو لویں غم کی
آنسوؤں کا مزاج برہم ہے
دردِ دل ایک، اور اشک ہزار
ایک پہلو، ہزار میں ضم ہے
لغزش آگہی، ہمیشہ سے
طرۂ امتیازِ آدم ہے
آج کیا حادثہ ہوا راہیؔ
غنچے غنچے کی آنکھ پُر نم ہے

شجاع خاور

کبھی بارِ غم کبھی کیفِ دل کبھی سیلِ فکر کی سنسنی
کوئی شغلِ زیست کو چاہیئے نہیں اٹھتا بارِ ایک تنی
میں قدم قدم پہ کشاں کشاں ہے تری نگاہ تنی تنی
مری ایسی زندگی تا بہ کے مری گمرہی تری بدظنی
نہیں رہزنوں سے شکایتیں کہ یہی ہے شریعتِ رہزنی
مجھے لوٹ کر مجھے دے رہے ہیں جو طعنۂ تہی دامنی
یہ تو ہیں اثاثۂ خشک و تر مرے آبلوں کو بھی کیا خبر
وہ فسانہ ہائے رہِ طلب، جو نہ گفتنی نہ شنیدنی
اِسی ایک عذرِ گناہ میں اسی ایک سادہ نگاہ میں
کبھی کیفِ لمحۂ بیخودی کبھی کربِ عالمِ جاں کنی
کبھی دردِ زیست کا شور و شر کبھی کارزارِ ستم گر
ہمہ زمانہ سازی کی رہگذر جہاں اپنے آپ سے ہی ٹھنی
وہ شعور و فکر کی بستیاں وہ خرد آشنائی کی وادیاں
ترے التفات کو کیا خبر مری خود نوائی پہ کیا بنی
وہ تو خاورؔ آپ میں دفن ہیں جو بنے تھے بندۂ مصلحت
وہ جو ناشنیدنی سن گئے وہ جو کہہ بھی پائے نہ گفتنی

سید انوار ظہوری

کچھ نہ دیں گی بستیوں کی جاگتی راتیں ہمیں !
دشتِ ہستی میں اکیلے ہیں تو آوارہ پھریں
ختم ہو سکتی نہیں پیہم یہ تنہا ساعتیں !
دل کے عقل و دل رہے جب تک باہمی کوشش کریں
خواب کے صحرا سے گزریں ہم تو اے بیدادِ غم
اک ابھرتی سرسراتی جاگتی آہٹ سنیں
زندگی جھوٹے سہاروں سے بسر ہوتی نہیں
دور تک منزل بہ منزل حسن کیا دے گا ہمیں
پار جانا ہے اسی طوفاں کا سینہ چیر کر
ہم کوئی تنکے نہیں کیوں موج کے رُخ پہ بہیں
بے سبب طاری نہیں خوئے تبسم کا نشہ
جشن آمادہ ہیں دل میں غم کی رقصاں لذتیں
عصرِ حاضر میں ظہوری کیا ملے گی دادِ فن
رات بھر غزلیں کہیں پھر بیٹھکر خود سر دھنیں

ناشاد کانپوری

فضائے ہر دو عالم جگمگائی
یہ کس نے پھر نقابِ رُخ اٹھائی
کھلے غنچے ستارے مسکرائے
جھلک کس نے پسِ پردہ دکھائی
بڑھائی ان سے جب رسمِ محبت
حیاتِ چند روزہ مسکرائی
یہ سب ہیں دل کے بہلانے کی باتیں
قفس سے اور اُمیدِ رہائی
انھیں بھی اب حجاب آنے لگا ہے
محبت رنگ لائی، رنگ لائی
نہ کچھ اب تک ہوا ہے اور نہ ہوگا
بہت ناشاد قسمت آزمائی

اطہر نقوی

صنم خانۂ تخیل

تیری آنکھوں سے اُبلتی مئے گلرنگ کا کیف
جیسے نغمات کا بہتا ہوا دریا کوئی
تیری آواز میں پوشیدہ ترنم لاکھوں
رقص کرتے ہوئے لمحات کی لے پہ جیسے
وقت گاتا ہو سُریلا کوئی گیت
سیکڑوں صبحیں مچلتی ہیں ترے چہرے پہ
جیسے انوار کی پو پھوٹ پڑے ......
تیرے سینے میں چھپی ہے کوئی گمبھیر تڑپ
جو لرزتے ہوئے ہونٹوں سے نکلنے کیلئے
ایک ناکام سی کوشش میں ہے گم
لگ گئی جیسے کنول میں آگ
جیسے سورج کی پگھلتی ہوئی دھوپ
نرم بادل سے چھلکنے لگ جائے
ترا نازک سا مہکتا ہوا گلنار بدن
دامنِ گل پہ لرزتی ہوئی شبنم جیسے
اُسکے سید ہے جو یہ کچھ مصرعے لکھے ہیں اور یہ
ہیں صنم خانۂ تخیل کے دھندلے سے نقوش
جو مرے ذہن سے کاغذ پہ اتر آئے ہیں
چاہتا ہوں کہ اسی طرح ہمیشہ اُسے دوست
اپنے افکار کے اصنام کو دھا ہم کرو ا

زہرہ نگار

نہیں نہیں!

یہ حسیں، رنگیں، لامحدود دنیا!
شہکارِ دستِ قدرت
خوبصورت!
اہلِ دانش کے لئے کچھ بھی نہیں ہے
بارگاہِ مادیت کہہ رہی ہے
بس پگھلتی آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے!
اشرف المخلوق یہ انسان
جس کی روح
لامحدود روشن ہیکلاں ہے
اہلِ دانش کی نظر میں کچھ نہیں ہے
بارگاہِ مادیت کہہ رہی ہے
پُتلۂ انسان ایٹم سے بنا ہے
اینٹ، پتھر، آدمی میں فرق کیا ہے؟
عقل کچھ مرعوب ہو تو عار ہی ہے
دل مگر باغی سا ہوتا جا رہا ہے
بارگاہِ مادیت کی دلیلیں سن کے
بے قابو سا ہو کر کہہ رہا ہے
یوں نہیں ہے، یوں نہیں ہے، یوں نہیں ہے

نقد و نظر

جن کتابوں پر تبصرہ ہو جاتا ہے وہ ادارہ کے کتب خانہ میں داخل
کی جاتی ہیں اور اوقات ادارہ میں ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

اردو میں قصیدہ نگاری | ڈاکٹر ابو محمد سحر۔ ناشر نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ صفحات ۴۰۸ مجلد مع گرد پوش قیمت چار روپے

اردو میں قصیدہ نگاری کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے اور نقش ثانی کہلانے کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں بہت زیادہ اضافے کر کے اس کو کما حقہ مکمل بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پہلے دکنی قصائد کیلئے ابتدائی نمونے کا عنوان دیا گیا تھا محض اس لئے کہ دکنی قصاید تک [illegible] رسائی نہ ہو سکی تھی لیکن اب دکنی قصاید علیحدہ عنوان کے تحت زیر بحث لایا گیا ہے اور ان پر تنقیدی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد چار دور کر کے سودا، انشا، ذوق اور میر اور ان سب کے معاصرین کی قصیدہ گوئی پر تفصیل سے نہایت فاضلانہ اور وقیع انداز میں رائے پیش کی ہے۔ ضخامت کے خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے کم سے کم نمونے دیئے ہیں۔ اس میں قصیدہ نگاروں میں بعض ایسے شعرا بھی نظر آتے ہیں جن کا کلام ابھی تک شایع نہیں ہوا اور فاضل مصنف نے قلمی دواوین سے ان کے قصائد کے نمونے دیئے ہیں۔ بعض ایسے شعرا بھی ہیں جن کے قصاید تک رسائی نہ ہو سکی لیکن تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں ان کی قصیدہ نگاری کا ذکر کیا ہے اس لئے ان کی آرا تذکروں سے لے کر پیش کر دی گئی ہیں۔

اردو غزل گوئی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور دوسرے اصناف سخن بھی زیر بحث آ گئے ہیں خصوصاً مرثیہ، مثنوی اور رباعی پر مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں فاضل مصنف نے قصیدہ پر [illegible] کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ تفصیلی مطالعے کے بعد قاری یہ محسوس کرے گا کہ کوئی بڑا شاعر جس پر بحث کی جا سکتی تھی چھوٹنے نہیں پایا اور ایسے شعرا جنھوں نے ایک دو قصیدے لکھے۔ ضمناً ان کے نام بھی ظاہر کر دیئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب [illegible] ہم ان کی اس گراں قدر تصنیف پر مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔

ایک تھا شاعر | مرتب مظفر حنفی۔ میواتی پورہ بھوپال گیٹ [illegible]۔ ایم پی۔ ناشر نسیم بکڈپو لکھنؤ۔ صفحات ۸۰ مجلد مع گرد پوش قیمت [illegible]

شاد عارفی اردو کے طنز نگار شعراء میں اکبر الہ آبادی کے بعد سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے سماج کے معائب اور نقائص کو پردے ہی پردے میں بیان کرنے کی کوشش کی وہ برطانوی ہند کے رہنے والے تھے۔ اس لئے ایک خاص ماحول میں ان کو شاعری کرنے کا موقع ملا اور اس کے برعکس شاد نے اپنی ساری عمر رامپور میں گذاری اور رامپور کی سوسائٹی جاگیردارانہ نظام سے متوسل سوسائٹی تھی۔ وہ تمام نقائص جو دولت کی فراوانی اور رسامراجیت اور جاگیرداری سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس نظام میں موجود تھے۔ شاد نے انھیں سے بغاوت کی انھیں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ در پردہ نہیں بلکہ دو بدو اور دو ٹوک بات کہہ دی۔ اسی لئے وہ ہمیشہ سوسائٹی میں خار کی طرح کھٹکتے رہے اور مفلسی و فلاکت کی زندگی گذارنے پر مجبور رہے۔ دولت استغنا ہمیشہ ان کے قدم چومتی رہی اور وہ ہر مصیبت کا ہو کر بے جگری سے مقابلہ کرتے رہے۔ رئیسوں سے مرعوب ہو کر کبھی انھوں نے اپنی روش میں تبدیلی نہ آنے دی اور ان کو اچھال اچھال کر بتایا۔ ان کی غزلیں ان کی نظموں کی غماز بن گئیں اور انھوں نے وہی انداز اختیار کرلیا جو ایسے خیالات کی ادائی و اظہار کے لئے ضروری تھا۔ ایسے شخص کی موت بھی کس مپرسی کی ہوتی ہے وہ اسی عالم میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ یار لوگوں نے جیتے جی ان سے بہت کچھ کام لیا لیکن زندگی کا آرام نہ دے سکے۔ فاضل مرتب مظفر حنفی صاحب نے مرنے کے بعد ان کی یاد کو تازہ رکھنے کیلئے ان پر تنقیدی مضامین لکھوائے اور مجموعے کی شکل میں شائع کئے یہی "ایک تھا شاعر" کی شکل میں پیش نظر ہیں۔ مقدمہ محترمی جناب امتیاز علی صاحب عرشی نے لکھا ہے۔ کتاب چار حصوں میں تقسیم ہے پہلا حصہ ہے "زندگی تیرے لئے" اس میں شاد کی زندگی اور فن پر مضامین ہیں، مضامین ایسے ادیبوں کے ہیں جو شاد سے بہت قریب تھے۔ یہ حصہ کافی ضخیم یعنی صفحہ ۱ سے شروع ہو کر ۲۰۰ پر پہنچتا ہے اور لکھنے والوں میں نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، ظ انصاری، ڈاکٹر محمد حسن، سید احتشام حسین، ڈاکٹر گیان چند، کوثر چاند پوری، احمد ندیم قاسمی، ماہر القادری، عرش ملسیانی، سلام مچھلی شہری، فشور واحدی، راہی معصوم رضا، گوپال متل، حرمت الاکرام، غلام احمد فرقت، مجروح سلطان پوری، شہرت بخاری، عابد رضا بیدار، اکبر علی خاں جیسے جانے پہچانے حضرات کے علاوہ اور کئی حضرات شامل ہیں۔ تمام مضامین پڑھنے کے بعد ایک اجنبی شاعر سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔

دوسرا حصہ شاد کے خطوط کا ہے جو زیادہ تر مدیروں اور شاگردوں کے نام لکھے گئے۔ یہ حصہ صفحہ ۲۰۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۰۷ تک چلا گیا ہے۔ مضامین میں ادیبوں نے شاد کے فن سے بحث کی ہے اور خطوط میں خود آپ پر سے پردہ اٹھایا ہے۔

تیسرے حصے میں "کچھ پھول عقیدت کے" عنوان کے تحت شاد پر نظمیں ہیں اور "جو ساعد جینے کے باعث" عنوان کے تحت پہلا مضمون شاد عارفی کے قلم سے ان کا اپنا تعارف ہے جو ایک ایڈیٹر کے مطالبہ پر لکھا گیا

[illegible] اور سلطان اشرف وغیرہ کے بعد استاد محترم کے عنوان سے [illegible]

جناب [illegible] صاحب نے مقدمے میں بجا ارشاد فرمایا ہے کہ "مظفر حنفی صاحب نے شاد عارفی کے فن اور شخصیت پر ایسی مستند دستاویز مرتب کر کے وہ کام انجام دیا جس پر ہمیں پیش پیش ہونا چاہیئے تھا۔ جو لکھنے والے آج اس طرح کے [illegible] ان کی بصیرت بیانی بیان ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ یہ نہ صرف آج بلکہ مستقبل میں بھی اُردو کے ایک اہم طنز نگار کو سمجھنے میں سنگِ میل ثابت ہوگی اور اس ایک چراغ سے اور بھی چراغ جلائے جائیں گے۔

"ایک تھا شاعر" شاد مرحوم پر ایک گراں قدر دستاویز ہے۔ ایک حوصلہ مند اور جوان ہمت شاگرد کا ہدیہ ہے ایک سدا [illegible] مفلوک الحال سماج کے مارے لیکن خوددار اور آن پر مر مٹنے والے اُستاد کی بارگاہ میں۔ مظفر حنفی صاحب بھی قابلِ مبارکباد ہیں اور ناشر بھی کہ اتنی ضخیم کتاب چھاپنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ہر دو کی قدر دانی اُردو خوانوں کا کام ہے۔

نثر و غزل دستہ مرتبہ مظفر حنفی۔ ناشر مرکز ادب بدھوارہ بھوپال۔ صفحات ۱۷۵ مجلد معہ گرد پوش قیمت آٹھ روپے۔

یہ کتاب شاد عارفی مرحوم کے مضامین اور چند نظموں کا مجموعہ ہے۔ مضامین میں کچھ تو جواباً لکھے گئے ہیں اور کچھ کسی کتاب پر تنقید یا تقریظاً یا تعارف کے طور پر ہیں۔ مطالعے کے عنوان سے نو مضامین ہیں جو کتابوں پر تبصرے ہیں شاد مرحوم ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے اور خاص نقطۂ نظر بھی یہ مضامین ان کی توضیح کرتے ہیں وہ زندگی میں کسی سے مرعوب ہوئے اور نہ کسی کی برتری کو زبردستی ماننے تیار ہوئے۔ ان مضامین کو پڑھ کر قاری اس نتیجہ پر پہنچے گا۔ انھوں نے اپنی تنقیدوں اور تبصروں میں جو اعتراضات وارد کئے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات کیلئے قابلِ قبول نہ ہوں لیکن غور و فکر کی دعوت ضرور دیں گے۔ ان کی تنقیدوں میں اسلوب بیان بالکل وہی ہے جو نظموں میں پایا جاتا ہے طرزِ تحریر کی یہ تلخی ممکن ہے کہ قاری کو گراں گذرے لیکن وہ اپنے اسلوب کو بدلنے سے قاصر تھے اسی لیے بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شخصی عناد کو بھی بنیاد قرار دیتے تھے۔ انھوں نے اپنی تنقیدوں میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ استدلال وزنی ہو اور کسی کو حرف گیری کا موقع نہ ملے۔

مجھے یہاں ایک مصرعہ کی صحت کرنی ہے۔ "فضا کوثری کے مجموعہ قطعات پر" تقریظ کے سلسلے میں کہا ہے حیدرآباد کے ان رباعی گو کا نام یاد نہیں آرہا ہے جن کی ایک رباعی کا یہ مصرعہ ہے ؎ "گھر کو جھاڑیں تو دھول بھی اڑتی ہے" مگر وہ سُنا ہے بہ اعتبار عمر رباعی اور قطعہ کیلئے مناسب تھے۔"

شاد عارفی کا سال پیدائش ۱۹۰۰ء ہے اور سید احمد حسین امجد حیدرآبادی کی یہ رباعی ان کے اس مجموعہ میں شائع ہو چکی تھی جو ۱۹۰۶ء میں چھپا اور جس کا بڑا حصہ ۱۹۰۸ء کی طغیانی رودِ موسیٰ میں بہہ گیا اس وقت امجد کی عمر ۲۵ سال کے ہونگے یہی وہ مجموعہ ہے جس پر علامہ شبلی، مولانا حالی، پروفیسر سلیم، علامہ اقبال، نظم طبا طبائی وغیرہ نے تبصرے کر کے شاعر کی حوصلہ افزائی کی۔ مذکورہ مصرعہ والا شعر اس طرح ہے ؎

ہوتا ہے نماز میں ہجوم خطرات ۔۔۔ گھر جھاڑتے وقت خاک بھی اڑتی ہے

دوسرا حصہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے جو کافی محنت سے اکٹھا کی گئی ہیں۔ نثر اور نظم دونوں میں طنز کے نشتر موجود ہیں اس خصوصیت کی بنا پر وہ ہمارے ادب میں باقی رہیں گے اور کوئی تعجب نہ ہوگا اگر ان کا مرتب بھی اسی بنا پر حیات جاودانی حاصل کرے۔

پانی کی زبان | مظفر حنفی ناشر شب خون کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی الہ آباد۔ مظفر حنفی میواتی پورہ بھوپالی گیٹ سیہور۔ بھوپال۔ مجلد خوبصورت ٹائیٹل صفحات ۱۴۶ قیمت تین روپے۔

مظفر حنفی کا نام اردو پڑھنے والوں کیلئے نیا نہیں انھیں عرصہ دراز سے ہم ایڈیٹر، شاعر اور ادیب کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک خاص بانکپن ہوتا ہے۔ جدت اور ندرت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اندازِ بیان میں تلخی بھی جو بعض حضرات کو گراں گذرتی ہے۔ انھیں خود بھی اس کا اندازہ ہے اور بقول آتش اچھی طرح جانتے ہیں کہ

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

"پانی کی زبان" ان کی غزلوں اور آزاد نظموں کا مجموعہ ہے ایک غزل کے بعد ایک آزاد نظم دی گئی ہے آزاد نظمیں پابند نظموں کا سا تاثر تو پیدا نہیں کرتیں لیکن بر موقع ان کا اثر پیدا ہوتا اور چند لمحوں تک باقی رہتا ہے۔ یہ نظمیں اکثر و بیشتر ہمارے سماج اور شعر و ادب پر طنز کی حامل ہیں۔ مظفر صاحب شاد عارفی مرحوم کے شاگرد ہیں اور شاد کی طرح ان کا طنز بھی در پردہ نہیں بلکہ علانیہ ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ سننے والے طنز کی شدت کو برداشت نہیں کر سکتے اور شاعر کو ان سے گلہ پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار مجموعہ میں اکثر جگہ ہوا ہے۔

غزلوں میں بھی مظفر صاحب نے اپنی اس جدت پسندی کی طرف اشارے کئے ہیں۔ دو تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

چلئے صاحب اور کوئی دروازہ دیکھیں ۔۔۔ آج مظفر کی باتیں بہکی بہکی ہیں

لاکھ نا قد ہوں مظفر کے مخالف لیکن ۔۔۔ شہ سواروں کیلئے بھیڑ بھی چھٹ جاتی ہے

اے مظفر ہم سے نالاں ہیں سبھی ماضی پرست ۔۔۔ جرم یہ ہے ہم غزل کہتے ہیں مستقبل نما

اس سے آگے بڑھ کر وہ کہتے ہیں ؎

[illegible] کے ندرت و جدت کو نا پیئے ۔۔۔ ہم اور چیز، غالب و میر و فراق اور

وہ غزل تو کہتے ہیں لیکن غزل جن روایات کی پابند ہے وہ اس سے گریزاں ہیں اور یہ کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں ؎

آج بھی لوگوں کو شعروں میں تغزل چاہیئے
اور ہم کو اس طرح کے چونچلے آتے نہیں

مگر جب "پانی کی زبان" میں غزلوں کا مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ مظفر نے جہاں جدت نگاری اور ندرت آفرینی کی کوشش کی ہے وہاں روایات کی پاسداری بھی کی ہے اور کہیں "نئے اسلوب" دے کر قارد فن کو نوجوان کر دیا ہے۔ اس کے ثبوت میں چند شعر پیش ہیں ؎

پاپائی نگاہ کا الزام تو ہٹے !
آنکھوں میں ہم نے ذات کے غم کو سمو لیا

شاید کہ بہار آئے جنوں پھر سے جواں ہو
کچھ روز ابھی اور نہ دامن کو سیا جائے

اس میں تو کوئی دل کی خطا ہو نہیں سکتی
جب آنکھ لگی آپ کا چہرہ نظر آیا

جب ٹھیس لگے تو بہہ نکلیں
اپنے کو حباب آسا رکھئے

یارو غرور فتح میں اتنا تو سوچئے
میں جان بوجھ کر تو نہیں مات کھا گیا

دنیا نے ہم کو چین سے جینے نہیں دیا
ویسے تو ہم بھی موت کو دیتے رہے ہیں مات

بھرپور اک نگاہ سے دل ہو گیا۔ کہ تھا
اتنا وسیع جس میں سما جائے کائنات

آزاد نظموں میں جگہ جگہ حالات حاضرہ پر طنز ملتا ہے۔ غزلوں میں بھی وہ طنز کرنے سے نہیں چوکتے یہاں صرف دو تین شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

تم ہی جو اتحاد کے حامی ہو اس جگہ
موقع ملے تو گوشت سے ناخن جدا کرو

پہلو بچا کے طنز مظفر نے کر دیا
ہم سے نہیں تو خیر کسی سے وفا کرو

بس کیجئے یہ پرسش بیجا کہ ہم چلے
زخموں پہ یہ نمک تو گذرتا ہے شاق اور

کانٹے بھی خوب ہیں کہ سخاوت کے جوش میں
سارا لہو گلاب کے چہرہ پہ مل دیا

نمونتاً چند شعر پیش کر دیئے گئے ہیں ورنہ مجموعہ میں ایسے اشعار کی کمی نہیں اس لئے تفصیلی مطالعہ تشنگی ذوق کی تکمیل کر سکے گا۔

محمد اکبرالدین صدیقی

مرج البحرین

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ آپ کے کارنامے نہ صرف دینی و مذہبی حیثیت سے یادگارِ زمانہ ہیں بلکہ علمی و ادبی دنیا میں بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تفسیر، حدیث، عقائد، فقہ، تصوف، فلسفہ و منطق، تاریخ و سیر وغیرہ موضوعات پر آپ کی گراں قدر تصانیف ہیں۔ [illegible]

ایک "مرج البحرین" بھی ہے جس میں شیخ محدثؒ نے اہل فقہ اور ارباب حال کے اسود مابہ النزاع کو ظاہری اختلافات بتاتے ہوئے اس گتھی کو نہایت خوش اسلوبی سے سلجھایا ہے۔ شریعت و طریقت، فقہ، تصوف اور علم و عقل پر قرآن و حدیث کے حوالوں کے ساتھ دلنشین انداز میں بحث کی ہے۔ بقول شیخ محدث "حقیقت میں یہ کتاب عالم دین کو تصوف کی حلاوت بخشتی ہے۔ صوفی طریقت کو رموز فقہ سے آگاہ کرتی ہے اور مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیان کی منہ بولتی تصویر ہے۔"

زیر نظر کتاب اسی مرج البحرین کا اردو ترجمہ ہے۔ جس کے ترجمے اور ترتیب کا کام پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی نے نہایت کاوش سے انجام دیا ہے۔ ویسے تو مرج البحرین کا اردو ترجمہ اس سے پہلے مولوی غوث محمد فرخ آبادی نے بھی کیا تھا جو ۱۸۹۶ء میں مطبع نامی لکھنؤ میں چھپ چکا ہے لیکن ترجمہ پرانے اردو لفظی انداز میں ہونے کی وجہ سے اکثر مطالب تشنہ رہ جاتے ہیں اس لئے موجودہ دور کے اکبری نورتنوں کے فلسفۂ خیال سے عامۃ المسلمین کو واقف کرانے اور ملت اسلامیہ کے وحدت فکری کو دور حاضر کے فتنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کتاب کا ترجمہ سلیس اور عام فہم اردو میں پیش کرنے کی ضرورت داعی ہوئی۔ بحمد اللہ تعالیٰ صاحب موصوف پیرزادہ کی مساعی اس سلسلے میں کامیاب ثابت ہوئیں۔ کتاب میں مولوی خلیق احمد صاحب نظامی استاذ شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی نے شیخ محدثؒ کے حالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

کتاب کی اہمیت مسلّم اور افادیت برحق ہے۔ کہیں کہیں فاضل مرتب نے حاشیے میں تشریحات و تفصیلات کا مفید اور معلوماتی اضافہ بھی کیا ہے تاہم ایک دو ایسے بھی مقامات چھوٹ گئے ہیں جہاں فاضل مرتب کی طرف سے معلومات بہم پہنچائی جانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مثلاً صفحہ (۳۸) کے حاشیے میں متقدمین فقہاء اور مشائخ کی چند ایسی کتابوں کے نام درج کئے جاتے جن میں غیر اسلامی انداز فکر کی پرزور تردید کی گئی ہے یا وصال (باب) دوم کے تحت فلسفۂ یونان اور اس کے مضر اثرات کا حاشیے میں مختصر بیان عام نقطۂ نظر سے کتاب کی افادیت کو اور بڑھا دیتا۔

کتابت کی غلطیاں آج کل عام ہیں۔ یہ کتاب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں لیکن یہاں ان کی نوعیت جدا جدا ہے غالباً یہ بھی کتابت ہی کی غلطی ہے کہ شیخ محدثؒ کی تاریخ ولادت "شیخ اولیاءؒ" سے ۹۵۸ھ اور تاریخ رحلت "فخر عالم" سے ۱۰۵۲ھ نکالی گئی ہے۔ "فخر عالم" سے تو ۱۰۲۱ کا عدد برآمد ہوتا ہے۔ صفحہ بیس کی اسی سطر کے اوپر کی عبارت میں سنہ وفات ۱۰۵۲ھ ہجری لکھا گیا ہے۔ عیسوی سنہ کے لحاظ سے سنہ رحلت ۱۶۴۵ ہوگا۔ قرآن مجید کی آیتوں اور احادیث کی عبارت کے اعراب میں بھی چوک ہوگئی ہے۔ بعض اشعار بھی کتابت سے رہ گئے ہیں مثلاً صفحہ (۴۶) پر "مولانا نے خوب فرمایا ہے" کے بعد اور صفحہ (۵۱) پر "حضرت سلمان فارسیؓ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے کیا خوب فرماتے ہیں" کے بعد۔ "فقہاء کہتے ہیں نفس پر اس طرح عذاب کرانا اور حرام کو حلال کرکے اعتدال سے تجاوز کرنا قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاف ہے" (صفحہ ۷۰) قرآن کی آیت میں تو حلال کو حرام قرار دینے کی ممانعت ہے" یہ کام کرو گے تو

تنگ دستی اور عسرت جانی نظر نہیں آئے گی (صفحہ ۱۱۰) اس جملے میں لفظ "نہیں" غالباً اضافہ ہے۔ احتیاط کے باوجود کتابت کی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ دوسری اشاعت ان سے بری ہونے کی توقع ہے اور یہ کتاب اپنی افادیت کے اعتبار سے کئی بار طبع کئے جانے کے قابل بھی ہے۔

سید حمید شطاری

علامہ اقبال بھوپال میں | عبدالقوی دسنوی، سیفیہ کالج بھوپال، سائز ڈیمی، صفحات ۶۸ قیمت ایک روپیہ پچپن پیسے۔

یہ خوبصورت سا کتابچہ جناب عبدالقوی صاحب دسنوی کے قلم کا مرہون منت ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ پروفیسر محمود حسین رحمۃ میسور یونیورسٹی کا ایک مضمون "علامہ اقبال کی داستان دکن" سب رس میں شائع ہوا اور علیحدہ کتابچہ کی شکل میں بھی۔ اس میں پروفیسر صاحب موصوف نے علامہ اقبال کے سفر میسور سے متعلق تمام واقعات کو ایک جگہ کر دیا ہے۔ اسی طرح پیش نظر کتابچہ علامہ اقبال کے بھوپال کے سفر سے متعلق ہے۔

علامہ اقبال کے گہرے دوست اور سر سید احمد خاں کے پوتے بھوپال میں وزیر تعلیم تھے اور انھیں کی ایما پر نواب صاحب بھوپال نے علامہ اقبال کے علاج معالجہ کیلئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی تھیں اور قیام کیلئے شیش محل کا انتخاب کیا تھا۔ علامہ موصوف پہلی مرتبہ ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء سے ۱۸ مارچ ۱۹۳۵ء تک دوسری دفعہ ۱۷ جولائی ۱۹۳۵ء ۹ ستمبر ۱۹۳۵ء تک اور تیسری دفعہ ۲ مارچ ۱۹۳۶ء سے ۹ اپریل ۱۹۳۶ء تک بھوپال میں قیام پذیر رہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ قیام سوا چار ماہ کا ہوتا ہے۔ یہ سوا چار مہینے حیات اقبال کے لکھنے والوں کیلئے تاریکی میں تھے اور صرف اتنا ہی علم ہو سکا تھا کہ علامہ اقبال علاج کے سلسلے میں بھوپال میں قیام فرما تھے۔ اب اس کتابچہ سے دوران قیام کی ساری تفصیلات منظر عام پر آگئی ہیں اور حیات اقبال کا ایک گوشہ جو ابھی تک تاریکی میں تھا جناب دسنوی صاحب کی کوششوں سے منظر عام پر آگیا ہے۔ علامہ موصوف کے سر راس مسعود اور ان کے خاندان سے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے اور اس سے اقبال کے کلام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی طرح اور دوسرے مقامات کی تفصیلات بھی لکھنے کی طرف محققین توجہ فرمائیں تو حیات اقبال کی کڑیاں مل جا سکتی ہیں۔ جناب دسنوی صاحب کی اس کامیاب کوشش کو بہ نظر استحسان دیکھا جائے گا۔

محمد اکبر الدین صدیقی

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجرا: ۱۹۳۸ء

ستمبر ۱۹۶۸ء

جلد: ~~۳۱۱~~ ۳۰
شمارہ: (۹)

ماہنامہ

سب رس

(ادارہ نمبر)

نگران

پروفیسر سید علی اکبر

مجلس مشاورت

میر حسن • ڈاکٹر گوپی چند نارنگ • راج بہادر گوڑ • ڈاکٹر غلام عمر خاں • محمد منظور احمد

معتمد

محمد اکبرالدین صدیقی

منتظم

وقار خلیل

زرِ سالانہ: چھ روپے | ادارہ نمبر: ایک روپیہ | غیر ممالک سے: دس روپے
ششماہی: تین روپے | (نمونہ کا پرچہ: ۷۵ پیسے) | فی پرچہ: ۵۰ پیسے

پرنٹر پبلشر سید علی اکبر نے اہتمام سے خلیل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ایوانِ اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن ۴ (اے پی) سے شائع کیا

ترتیب

اپنی بات

"ادارۂ ادبیاتِ اُردو" اب سے ۴۵ سال پہلے جن اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے قائم ہوا تھا، وہ اپنا منصب اب بھی ادا کر رہا ہے۔ اس کا ماہنامہ ادبی ترجمان "سب رس" ادب کی اشاعت اور ترجمانی کا کام انجام دے رہا ہے۔ اس کا گرانقدر کتب خانہ (شعبۂ مطبوعات و مخطوطات) علمی ادبی اور تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لئے پوری ذمہ داریوں سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ "ایوانِ اُردو" کا دارالمطالعہ تشنگان علم و ادب کی تسکین طبع میں مصروف ہے اور ادارے کی طرف سے مختلف موقعوں پر کلچرل تقریبیں منعقد ہوا کرتی ہیں، سمپوزیم، ادبی اجلاس اور شعری محفلوں کے علاوہ علم و ادب، تنقید و تحقیق کے باب میں نئی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں اور ادارے کے زیر اہتمام کم پڑھے لکھوں کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے ادارے کے امتحانات اُردو عالم اور اُردو فاضل (مسلمہ جامعہ اُردو علی گڑھ) سے جو طالب علم استفادہ کرتے ہیں ان کو اُردو زبان کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کے حصول سے فیضیاب ہونے کے مواقع ملتے ہیں۔

اس رپورٹ کے ملاحظہ کے بعد قارئین محسوس کریں گے کہ سن ۱۹۷۶ء میں ادارہ کے تمام شعبوں نے اپنے اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دیئے۔ ادارہ ان اصحاب کرم فرماؤں کا بطور خاص ممنون ہے جنھوں نے میوزیم کے لئے نادر اشیاء اور کتب خانے کے لئے بیش بہا علمی و ادبی اور فنی کتابیں اور قدیم رسائل وغیرہ عنایت فرمائے۔

ادارہ کے میوزیم میں بھی اس سال قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے جس سے دکنی تہذیب و تمدن سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب استفادہ کرتے ہیں۔

یہ بات باعث مسرت ہے کہ ادارہ کے علمی و ادبی اور تہذیبی کاموں کو اُردو دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ صحافت اور دیگر ہمدردان ادارہ کے تعاون کا ادارہ دل سے شکر گذار ہے اور آئندہ بھی تعاون کا خواہشمند ہے

(ادارہ)

انشا :- میر سراج الدین علی خاں

ادارۂ ادبیاتِ اردو - ایوانِ اردو

ملک کے مایہ ناز سپوت ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے چند مخلصین کے تعاون سے ۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیاتِ اردو قائم کیا۔ اور ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کی جدوجہد اور مساعی کی بدولت ایوانِ اردو کی شاندار عمارت ساٹھ ہزار روپیوں کے صرفے سے تعمیر ہوئی جس کا افتتاح ۱۹۶۰ء میں عمل میں آیا۔

ادارے کے اہم اغراض و مقاصد میں اردو زبان کی توسیع و اشاعت، نوجوانوں میں علم و ادب اور انشاپردازی کا ذوق پیدا کرنا اور ان کی تصانیف کو شائع کر کے اُن کی ہمت افزائی کرنا دکنی ادب پر تلاش و تحقیق کے لئے سہولتیں مہیا کرنا، اردو کو مختلف زبانوں سے روشناس کرانا اور دکنی تہذیب، ثقافت اور آثار کی حفاظت داخل ہے۔

ادارے کے اِن اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے کئی شعبوں کا قیام عمل میں آیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا جس میں دکنی ادب، تاریخ اور مختلف علوم و فنون پر اُردو فارسی عربی اور ہندی میں بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا گیا چنانچہ کتب خانہ میں اس وقت ۲۵ ہزار مطبوعات اور ۵ ہزار مخطوطات موجود ہیں جن میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔ کتب خانے کے مخطوطات کی تشریحی فہرستیں پانچ جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں اور چھٹی جلد زیر تدوین ہے اور مطبوعات کی تین فہرستیں شائع ہو چکی ہیں۔

ادارے کا ایک اہم شعبہ میوزیم ہے جہاں دکن کے تاریخی و ثقافتی آثار کا بیش بہا ذخیرہ محفوظ ہے۔ میوزیم کی نادرات میں قطب شاہی، مغلیہ، عادل شاہی اور آصفیہ سلاطین کے اصل فرامین، و اسناد، دکنی خطاطی و مصوری کے نمونے، مشاہیر دکن و ہند کے مکتوبات، قدیم و جدید ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر، قدیم دستکاری کے نمونے، حیدرآباد کی قدیم سواریوں کے عکس، قدیم اسلحہ، بیدری ظروف، کتبات کے چربے، قدیم ٹھپّے اور نقشے وغیرہ شامل ہیں۔ میوزیم میں شہر حیدرآباد کا ایک قدیم ترین نقشہ موجود ہے جو ۱۱۸۱ھ م ۱۷۶۷ء میں تیار ہوا تھا۔ اس میں شہر کے حدود اور اس زمانے کی عمارتیں اور راستوں پر سواریاں بتائی گئی ہیں جس سے اس دور کے تمدن پر روشنی پڑتی ہے۔ نقشے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ نواب میر نظام علیخان آصفجاہ دوم کے عہد میں جب پایہ تخت اورنگ آباد کی بجائے حیدرآباد قرار پایا تو اس وقت شہر کی جو حالت تھی اس میں ظاہر

کی گئی ہے۔ مدرسہ محمود گاوان (بیدر) کی عمارت کی ایک قدیم ترین اور نادر پینٹنگ حاصل ہوئی ہے جو عہد اورنگ زیب کی ہے اس کے علاوہ میوزیم میں (۲۵۰) قدیم سکوں کا اضافہ ہوا ہے جو راجگان تلنگانہ، بہمنی، قطب شاہی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں بعض نہایت ہی نایاب ہیں۔

شعبۂ تصنیف و تالیف کی جانب سے اب تک (۳۰۹) کتابیں اردو، فارسی، انگریزی اور تلگو میں دکنی ادب، لسانیات و صوتیات، تاریخ و ثقافت دکن وغیرہ جیسے موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں۔ اور ادارے کے آئندہ کے لائحہ عمل میں کئی نادر مخطوطات اور مفید تاریخی و ادبی کتابوں کی اشاعت داخل ہے۔

شعبۂ مطبوعات کشمیر کے نام سے بھی ایک شعبہ قائم ہے جس کی جانب سے کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی کتاب "برف میں آگ" جو ڈاکٹر حامدی کشمیری کے منتخب افسانوں پر مشتمل ہے حال میں شائع ہوئی ہے۔

ادارے کا ایک اہم شعبہ شعبۂ امتحانات ہے جس کا قیام ۱۹۴۲ء میں عمل میں آیا۔ اس شعبے کی جانب سے سال میں دو مرتبہ اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات منعقد ہوتے ہیں جس میں سالانہ تقریباً (۵۰۰۰) طلبا و طالبات شریک ہوتی ہیں، اس وقت شہر، اضلاع اور بیرون حیدرآباد میں ان امتحانات کے گیارہ مراکز قائم ہیں۔

ادارے کا ترجمان ماہنامہ سب رس جنوری ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا اور تاریخ اجراء سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے اور حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کو باہر کی دنیا سے روشناس کروانے اور اُن کی ہمت افزائی کرنے کا اہم فریضہ ادا کر رہا ہے۔ اس میں ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم کے علاوہ آفرین مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اسکے بلندیٔ معیار کی ضامن ہے۔

شعبۂ دارالمطالعہ میں ہند اور بیرون ہند کے تقریباً (۲۰۰) رسائل اور اخبارات وصول ہوتے ہیں جو مختلف زبانوں اردو، فارسی، عربی، انگریزی، ہندی اور تلگو سے تعلق رکھتے ہیں۔

ادارے کی جانب سے ہر سال یوم زور اور یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب علمی پیمانے پر منائی جاتی ہیں یوم محمد قلی قطب شاہ کو تو اس قدر مقبولیت حاصل ہو گئی ہے کہ یہ اب حیدرآباد کا قومی تہوار تصور کیا جا رہا ہے جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت شہر کے باشندے شریک ہوتے ہیں۔ اور بانی شہر حیدرآباد محمد قلی قطب شاہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو ڈاکٹر زور مرحوم کا لافانی کارنامہ ہے۔ ادارہ ہندوستان میں لسانی تحقیقات کا اہم مرکز جو اُردو ادب کی ترقی اور دکنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت میں سرگرم عمل ہے اور بیشمار طالبان علم اس چشمۂ علم و ادب سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ سکارکنان ادارہ اُن مقاصد کی تکمیل میں پورے انہماک اور خلوص کے ساتھ منزل مقصود کی طرف گامزن ہیں جن کی بنیاد محترم ڈاکٹر زور نے رکھی تھی۔

یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ ملک اور بیرونِ ملک کے مشاہیر نے ادارے کی کارکردگی سے متعلق خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے ۔ چنانچہ ۱۹ ستمبر ۱۹۶۸ء کو معزز صدرِ جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے ادارے کے تفصیلی معائنہ کے بعد کتاب الرائے میں حسبِ ذیل تحریر درج فرمائی ہے۔

"ادارۂ ادبیاتِ اردو میں آج حاضری کا موقع ملا۔ یہاں کا کام اور اہتمام دیکھ کر جی خوش ہو گیا اور اس خوشی کے ساتھ ساتھ زور مرحوم کی یاد بھی بار بار آئی وہ بڑا کام کر گئے ہیں لیکن ہر بڑے کام کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں آنے والے اسے اور بھی بڑا بنائیں۔ حال پر ماضی کا یہ حق ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ حق پوری طرح ادا کیا جائے گا۔"

علمی، ادبی اور کلچرل تعاون

(سنہ ۱۹۶۷ء، ادارے کی ڈائری سے)

جناب وسیم اختر ایڈیٹر ماہنامہ "مکاتیب ڈائجسٹ" حمایت نگر حیدرآباد دکن کو رسالے کی اجرائی کے سلسلے میں علمی و ادبی معاونت کی گئی ۔

محترمہ سلطانہ شرف الدین صدر معلمہ مدرسہ فوقانیہ نسواں نامپلی حیدرآباد کو لوک چند محروم کے بارے میں ادارہ کی طرف سے ضروری مواد فراہم کیا گیا ۔

جناب مولانا سید معزالدین قادری ملتانی کو علمی وظیفہ کی کارروائی کے سلسلے میں ادارہ کی جانب سے صداقت نامہ قابلیت دیا گیا ۔

عطاء الرحمٰن صاحب ارشاد مینجر ماہنامہ "شاہکار" الہ آباد کو قیام حیدرآباد کے زمانے میں علمی و ادبی خدمات کے بارے میں ادارہ کی طرف سے مناسب رہبری کی گئی ۔

ساہتیہ اکیڈیمی دہلی کی خواہش پر ادارہ کی طرف سے اردو ڈرامہ کمیشن کے بارے میں مطلوبہ مواد فراہم کیا گیا ۔

ادبی ٹرسٹ بک ڈپو کے قیام کے سلسلے میں ادارہ کی طرف سے حیدرآبادی مصنفوں کی مطبوعات کے بارے میں تفصیلات معتمد صاحب ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے حوالے کی گئیں ۔

تاثرات

دوران سال ۱۹۶۷ء میں ادارۂ ادبیات اردو کے بارے میں جن اصحاب یا اداروں نے اپنے تاثرات تحریر یا تقریر کے ذریعہ ظاہر فرمائے یا شائع کئے۔ اُن کے چند ایک اقتباسات درج ذیل ہیں — (ادارہ)

---

(۱) جناب قاضی متین الدین لکچرار گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

"ایوانِ اردو" دیکھا، اور دیکھتا رہ گیا۔ اردو زبان و ادب کی خدمت اور فروغ کے لئے ایسی شاندار اور پرشوکت عمارت شاید ہی کہیں اور ہو۔ "ایوان اردو" دیکھنے کے بعد عاشقِ دکھنی زبان و ادب و کلچر ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی روح کو بے اختیار خراج تحسین ادا کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے مرحوم نے یہاں جس لگن، محنت اور خلوص سے کتابیں، مخطوطات، رقعات کے نمونے اور نادر تاریخی اشیاء اکٹھی کی ہیں، وہ زورؔ مرحوم ہی کا حصہ ہیں۔ حیدرآباد میں یوں تو کئی تاریخی آثار، عمارتیں اور اشیاء ہیں۔ "ایوان اردو" ان میں ایک بیش بہا اضافہ ہے، سالار جنگ میوزیم دیکھنے کے بعد آنکھوں کو سرور، دل کو ٹھنڈک اور زبان و ادب کی خدمت کرنے کا ولولہ و جوش کہیں پیدا ہو سکتا ہے تو وہ ہے ایوان اردو۔ اسے دیکھنے اور یہاں کے علمی سرمایہ سے استفادہ کرنے کے بعد بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیدرآباد کی تمام تاریخی عمارتیں و آثار وغیرہ دیکھ چکے ہیں۔ "ایوان اردو" میں آنے کے بعد بار بار آنے کی ہوس ہوتی ہے۔

(۴- جنوری ۱۹۶۷ء)

(۲) جناب ڈاکٹر جلال عبدہ

سفیر کبیر ایران متعینہ ہند

"ایوان اردو" کا دوبارہ معائنہ میری معلومات میں اضافہ کا موجب ہوا۔ اس بار مجھے یہ احساس ہوا کہ ایران اور ہندوستان میں لسانی نقطۂ نظر سے گہرے اور عمیق تعلقات ہیں۔ اور یہ ادارہ اُن تعلقات کا آئینہ دار ہے جس سے میں بیحد متاثر ہوا ہوں (فارسی)

(۹- جنوری ۱۹۶۷ء)

(۳) جناب جے، ایف، رچرڈز

ریسرچ اسکالر کیلی فورنیا یونیورسٹی، مقیم سکندرآباد (اے پی)

یہ بہت اچھا کتب خانہ ہوتا ہے۔ اس کو دیکھکر بہت خوشی ہوئی۔ یہاں کے مخطوطات کے کام اور ان کی فہرس حاصل کر کے مجھے مسرت ہوئی۔

(۵، فروری ۱۹۶۷ء)

○

(۴) جناب آفتاب لکھنوی

لکھنؤ (یو، پی)

"ایوان اردو" دیکھنے کا آج اتفاق ہوا مجھے حیرت ہے کہ میں ابتک کیوں اسقدر بدقسمت رہا کہ اس ادارہ تک میری پہنچ ممکن نہ ہوسکی، اب تک کہیں بھی ایسا ادارہ نہیں دیکھا۔ خدا برکت دے۔

(۲۲ - مئی - ۱۹۶۷ء)

○

(۵) جناب ہلال رضوی

(رام پور)

مجھے "زندہ دلانِ حیدرآباد" نے بلا کر مشاعرہ میں شرکت کا موقع دیا۔ مگر میں خوشی اس سے زیادہ محسوس کر رہا ہوں، اس لئے کہ مجھے ایوان اُردو دیکھنے کا موقع ملا۔ حقیقت میں یہ ادارہ اپنی شان کا واحد ادارہ ہے میں نے اس کو دیکھ کر بیحد خوشی محسوس کی۔ خدا اس کی عمر دراز کرے اور اسے پھلنے پھولنے کے اچھے مواقع فراہم ہوں۔

(۲۲-مئی-۱۹۶۷ء)

(۶) ڈاکٹر محمد اسلام

(ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی)

آج "ایوان اردو" دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں کی نادر کتابیں، مخطوطات اور مطبوعات ریسرچ اسکالرس کے لئے انتہائی اہم ہیں، یہاں کی نوادرات اور تنظیمیں دونوں لائق ستائش ہیں۔ ریسرچ اسکالرس کے قیام کا جو انتظام حیدرآباد ایسے شہر میں کیا گیا ہے، وہ بھی ایک طرح کی ادبی خدمت ہے کیونکہ یہاں قیام کر کے تحقیقی کام میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ خدا کرے کہ ایوان اردو خوب خوب ترقی کرے اور اپنی مثال آپ بن جائے

(۲، جولائی ۱۹۶۷ء)

○

(۷) جناب حبیب الرحمان چغتائی

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ)

کئی روز سے حیدرآباد میں تھا اور ادارہ کی لائبریری دیکھنے کا اشتیاق روز افزوں بڑھ رہا تھا۔ اور آج میں سب کام چھوڑ کر یہاں آ ہی گیا۔ لائبریری دیکھ کر بڑی خوشی ہوی، یہ کتب خانہ نہ صرف اُردو کی ترویج کا سبب ہے بلکہ عوام کو مفت میں استفادہ کا موقع فراہم کرتا ہے اور دوسری، اس کی خصوصیت یہ کہ محققین کے لئے یہاں کا ذخیرہ (خصوصاً مخطوطات) یقیناً بہت مفید ہے، یہاں اسٹاف نے جس خلوص کا ثبوت دیا وہ قابل ستائش ہے، جس کے لئے میں انتہائی شکرگزار ہوں

(۴ - جولائی ۱۹۶۷ء)

(۸) جناب پروفیسر احتشام حسین
لیکچرار شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی

یہاں میں نے فن و ادب اور تہذیب کے بہتر سے بہتر نمونے دیکھے۔ ایک بڑی تہذیب اپنے مشکل زمانے میں بھی اپنے دامن میں فن اور ادب کے اچھے سے اچھے جواہر پارے رکھتی ہے۔ یہی حال حیدرآباد اور ادارۂ ادبیات اردو کا بھی ہے یہ شہر اور یہاں کے ادارے اردو کی بقا اور ایک نہایت خوش آیند تہذیب کی آمد کا احساس دلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

(۱۲۔ جولائی ۱۹۶۷ء)

○

(۹) جناب ولی اللہ سلفی جزنیلیر چیلو (شعبۂ فارسی)
(پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ انڈیا)

میں میسا کیرانوی پر تحقیقی کام کر رہا ہوں اسی سلسلہ میں حیدرآباد آیا ہوا ہوں اور آج ایوان اردو میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ یہاں اخبارات و رسائل سے لیکر عمدہ اور نادر کتابیں بھی موجود ہیں۔ مطبوعات کا خزانہ زیادہ ہے اور مخطوطات کا کم لیکن مفید پرانے اخبار کافی ہیں یہاں لیکچر کا بھی انتظام ہے۔ میں منتظمین ایوان اردو کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے پوری لائبریری دکھلائی۔ (۲۹ر اگست ۱۹۶۷ء)

○

۱۰۔ بھارت رتن عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب
صدر جمہوریۂ ہند (نئی دہلی)

ادارۂ ادبیات اردو میں آج حاضری کا موقع ملا۔ یہاں کا کام اور اہتمام دیکھ کر جی خوش ہو گیا اور اس خوشی کے ساتھ زورؔ مرحوم کی یاد بھی برابر آتی رہی۔ وہ بڑا کام کر گئے ہیں۔ لیکن ہر بڑے کام کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں آنے والے اسے اور بڑا بنائیں۔ حال پر ماضی کا یہ حق ہے مجھے یقین ہے کہ یہ حق پوری طرح ادا کیا جائے گا۔

(۷۔ ستمبر ۱۹۶۷ء)

○

(۱۱) پدم شری حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی
متولی ہمدرد دواخانہ دہلی

ادارۂ ادبیات اردو جس کے متعلق میں اکثر سنتا رہتا تھا اور جسے میں کئی بار حیدرآباد آنے کے باوجود نہیں دیکھ سکا۔ آج دیکھنے کا موقع ملا، مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ مرحوم ڈاکٹر زورؔ صاحب نے اس ادارہ میں اتنی نادر اور قابل قدر تاریخی چیزیں اردو اور اردو والوں کے لئے جمع کر رکھی ہیں۔ مجھے یہ سن کر بھی اطمینان ہوا کہ اس ادارہ کو مرحوم بانی کے بعد مناسب طور پر چلاتے رہنے کے لئے چند مخلصین کوشاں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی کوششیں بارآور ہوں گی اور یہ ادارہ ترقی کرتا رہے گا۔

(۵ر ستمبر ۱۹۶۷ء)

○

(۱۲) جناب اے۔ ایف۔ انتیا
کنسلٹنگ انجینئر، بمبئی

ادارۂ ادبیات اردو کا ذخیرہ نہایت نایاب ... قدر ہے، اس کے دیکھنے سے مجھے بڑی مسرت ... میری دلی تمنا ہے کہ یہ ادارہ اسی طرح ترقی کی ... منزلیں طے کرتا رہے۔

(۱۰- ستمبر ۱۹۶۷ء)

○

۱) محترمہ تارا کشوری سنہا

ممبر پارلیمنٹ دہلی

مجھے ادارۂ ادبیات اردو کے معائنہ کی عزت ... یہاں علمی وادبی اور تمدنی ذخیرہ کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئی۔ مخطوطات اور قدیم اشیاء کا ... قدر ذخیرہ میری دلچسپی کا باعث بنا اور مجھے ... ہی مسرت حاصل ہوئی۔

(۱۴- ستمبر ۱۹۶۷ء)

○

۱۴) جناب محمد عبدالباری صاحب

منظم ممالک متحدہ امریکہ

آج قیام حیدرآباد کے مختصر عرصہ میں ادارۂ ادبیات اردو کو دیکھنے کا موقع ملا، مخطوطات اور دکھنی تہذیب کے نادر اور قابل قدر ذخیرے میں انتہا درجہ متاثر ہوا۔ افسوس ہے کہ کمی وقت کے باعث میں اس ذخیرہ سے استفادہ نہ کر سکا، اس ادارہ کے وجود سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو کے ساتھ خواہ کتنی ہی مخالفت اور ناانصافی کی جائے وہ زبان بہرحال زندہ رہے گی۔

(۱۴- ستمبر ۱۹۶۷ء)

○

(۱۵) جناب حفیظ میرٹھی

فیض عام انٹر کالج میرٹھ

— اور —

(۱۶) جناب م، نسیم صاحب

کاشانۂ بخشی گنج، لکھنو۔

لکھنو اور اس کے اطراف سے چند اردو پسند اردو کے لئے کامیابی کے خواہاں اور اردو میں کچھ لکھنا ایک اعزاز سمجھنے والے آئے اور یہ تصور لیکر گئے کہ شمال میں اردو جو کچھ کھو رہی ہے، جنوب اسے پاتا جارہا ہے۔

(۱۴- نومبر ۱۹۶۷ء)

○

(۱۷) جناب مختار احمد مظاہری

صدر ادارہ ادب اسلامی ہند ٹانڈہ، فیض آباد (یوپی)

ادارہ ادبیات اردو کی زیارت کا موقع ملا، یہ ادارہ ایک ایسا مینارہ نور ہے جس سے ملک کے تمام محبان اردو ہمیشہ روشنی حاصل کرتے رہیں گے۔ یہ ادارہ عزم وحوصلہ کا ایک ایسا نشان ہے، جو زندۂ جاوید ہے میں کارکنان کی محنت اون کی کاوشیں وکوشش کو ادارہ کی ترقی اور استحکام کا ضامن سمجھتا ہوں۔

(۱۴- نومبر ۱۹۶۷ء)

○

(۱۸) جناب عباد انصاری

ٹانڈہ، فیض آباد

ایوان اردو کا دیدار ہم محبان اردو کے لئے اس اردو کشی کے دور میں باعث تقویت اور مشعل راہ ہے۔ اللہ اسے نظر بد سے دور رکھے، اس کی سلامتی کے لئے خواہشمند ہوں

(۱۴ - نومبر ۱۹۶۷ء)

○

(۱۹) جناب سہیل احمد انصاری

(الہ آباد (یو، پی)

"ایوان اردو" دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا'

(۱۴ - نومبر ۱۹۶۷ء)

○

(۲۰) جناب شبنم سبحانی شریک مدیر "دوام"

(معتمد عمومی ادارہ ادب اسلامی ہند)

فیض آباد (یو، پی)

انسان کی قوت ارادی کیا کرشمے دکھا سکتی ہے "ایوانِ اردو" اس کا ایک زندہ ثبوت ہے زور مرحوم کی یادگار زندۂ جاوید ہے۔ اسے دیکھ کر ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ اردو ہمارے ماضی کی بہترین عکاس اور ترجمان ہے جس زبان کے دامن میں ایسے نادر جواہر ریزے ہوں وہ مر نہیں سکتی اور جس شہر میں اس زبان کی عظمت کے ایسے نقوش ہوں، وہ شہر اپنی تاریخی اہمیت نہیں کھو سکتا۔ خاص بات یہ ہے کہ اردو اس تاج محل کو اس کے پاسبانوں نے اپنے دل کا ایک ٹکڑا سمجھ کر اس کی حفاظت و نگرانی کی ہے۔ خدا ان کے خلوص اور جذبے کو سلامت رکھے۔

(۱۴ - نومبر ۱۹۶۷ء)

○

(۲۱) ڈاکٹر محمد عبدالمطلب

پروفیسر صدر شعبہ پبلک اڈمنسٹریشن جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

ادارہ ادبیات اردو قائم کر کے ڈاکٹر زور نے اردو ادب کی شاندار خدمت انجام دی ہے جس کا ذکر الفاظ میں کیا جانا مشکل ہے۔

(۱۹ - نومبر ۱۹۶۷ء)

○

(۲۲) جناب صباح الدین عبدالرحمٰن

<u>ہندوستان میں اردو کے تحقیقی ادارے ادارہ ادبیات اردو</u>

ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن میں ۱۹۳۱ء میں سر اکبر حیدری کی سرپرستی، نواب مہدی یار جنگ کی صدارت اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی نظامت میں قائم ہوا، اس ادارہ کے اصل روح رواں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اپنی وفات تک رہے اس کی تاسیس کے وقت وہ جامعہ عثمانیہ میں اردو کے استاد تھے۔ جب کہ انھوں نے ہندوستانی لسانیات اور اردو کے اسالیب بیان لکھ کر کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اور جب انہوں نے ۱۹۲۹ء میں اپنی کتاب اردو شہ پارے شائع کی، تو اہل نظر کو ان کے تحقیقی رجحانات کا اندازہ ہوا۔ اس میں اردو ادب کے آغاز سے ولی کے زمانے تک کے شاعروں اور نثر نگاروں کے شہ کاروں سے اہم انتخابات پیش کئے گئے ہیں

اقتباسات دینے سے پہلے مرتب نے بیجاپور کے یوسف عادل شاہ (۸۹۵-۹۱۶ھ) شاہ میران جی (۹۰۲ھ) اسمٰعیل عادل شاہ (۹۱۶-۹۴۱ھ) شاہ برہان الدین جانم (۹۹۰ھ) عادل شاہ (۹۶۵-۱۰۳۷ھ) علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷-۱۰۸۳ھ) شاہ ملک (۱۰۸۷ھ) سکندر عادل (۱۰۹۶-۱۱۰۳ھ) گولکنڈہ کے سلطان قطب شاہ (۹۵۰-۹۶۱ھ) ابراہیم قلی قطب شاہ عبداللہ قطب شاہ (۱۰۲۵-۱۰۸۳ھ) غواصی، وجہی، سالی، طبعی، ابوالحسن تانا شاہ (۱۰۸۳-۱۰۹۸ھ) لطیف، نوری، شاہی، جیون، عاجز، ذوقی، بحری، عشرتی - ولی دیلوری، اشرف، ولی اورنگ آبادی، امانی، رضا قادری، رائے چوری وغیرہ کے جو شروع میں مختصر حالات کے ساتھ اُن کی علم نوازی، علم دوستی، سخن پروری اور دوسرے علمی کارناموں کا ذکر ہے، اور ادب و تاریخ کا بڑا مفید کارنامہ ہے، ۱۹۲۹ء سے اب تک ان پر بہت کچھ معلومات فراہم ہو چکے ہیں - لیکن ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی یہ کتاب جب شائع ہوئی تھی، تو اس وقت کے لئے یہ بالکل ہی نئی چیز تھی، ان کو اس کتاب کی ترتیب میں لندن، آکسفورڈ، کیمبرج، پیرس اور انڈیا کے کتب خانوں کی قلمی کتابوں کی چھان بین کرنی پڑی تھی، ان میں بعض ایسی کتابوں کا انتخاب ہے جس کا اب صرف ایک نسخہ ہی موجود ہے -

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی اسی ابتدائی کوشش سے پتہ چل گیا تھا کہ دکنی ادبیات کا یہ جوہری اس خطے کے تمام جواہرات کو ایک دن اچھی طرح سجا کر رہے گا - اسی مخلصانہ جذبہ سے انہوں نے ادبیات اُردو قائم کیا، جس نے دکن میں اُردو ترویج و اشاعت کے لئے تمام ممکن وسائل اختیار کئے مختلف مرکز قائم کرکے اُردو کے امتحانات کا انتظام کیا - نوجوانوں میں تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا کیا - بچوں اور عورتوں کے لئے مفید کتابیں شائع کیں، ایک بڑا کتب خانہ جمع کیا جس میں ہر گوشہ دکنی ادبیات کو چن چن کر اکٹھا کیا - دکن کی پرانی تاریخ لکھوائی - اور دکھنی ادبیات پر محققانہ کتابیں شائع کیں -

دکن کی تاریخ کے سلسلہ میں اس کی طرف سے پروفیسر عبدالمجید صدیقی کی ایک مستند کتاب تاریخ گولکنڈہ شائع ہوئی ہے، جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کے سلطنتوں کے تعلقات کے ساتھ اس عہد کے تمدن علم و فضل کی تفصیلات بڑی محنت سے جمع کی گئی ہیں، پروفیسر عبدالمجید کی ایک دوسری کتاب مقدمہ تاریخ دکن بھی اس ادارہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے - گو یہ مختصر ہے لیکن ان میں انہوں نے سرزمین دکن کے پچیس حکمران خاندانوں کے عروج و زوال کے متعلق مفید معلومات فراہم کر دیئے ہیں، اس سلسلہ میں نظام الملک آصف جاہ از شیخ چاند، اعظم الامراء - ارسطو جاہ از پروفیسر عبدالمجید صدیقی سر سالار جنگ اعظم، از فیض محمد ناصر جنگ شہید، از معین الدین رہبر، عماد الملک از فیض محمد مرقع دکن جیسی چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں جو مختصر ہیں اور تحقیقی بھی نہیں ہیں، لیکن ان میں مفید تاریخی معلومات ملتی ہیں،

دکنی ادب پر ایک بہت ہی قیمتی سرمایہ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ ہے جو ادارہ ادبیات کی مطبوعات میں تو داخل نہیں، لیکن اس کے ناظم ڈاکٹر محی الدین قادری زور

کا علمی شاہکار ہے۔ اس میں گولکنڈہ کے پانچویں تاجدار محمد قلی قطب شاہ (۹۷۳-۱۰۲۰ھ) کے اردو کلام کو بڑی محنت سے جمع کر دیا گیا ہے۔ اس میں سلطان کے حالات اور اس کے کلام پر ۲۵۲ صفحے پر تبصرہ ہے۔ جو ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی علمی کاوش اور تحقیقی محنت کی اچھی مثال ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے دیباچہ اور اپنی دوسری تحریروں سے یہ واضح کر دیا کہ عام طور سے یہی سمجھا جاتا تھا کہ ولی اورنگ آبادی اردو زبان کا پہلا شاعر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دکن کی بہمنی سلطنت کے آخر زمانے اور اس کے بعد قطب شاہی اور عادل شاہی حکمرانوں کے عہد میں اس زبان نے اس قدر ترقی کر لی تھی کہ اس میں نظم و نثر کی اچھی کتابیں لکھی گئیں۔ خصوصاً قطب شاہی اور عادل شاہی خاندان کے علم دوست اور سخن گستر حکمرانوں نے اپنی سرپرستی سے اس کی ترویج و ترقی کی رفتار بہت تیز کر دی تھی۔ ان میں محمد قلی قطب شاہ بانی شہر حیدر آباد بہت اچھا شاعر تھا۔ اس کے زمانے میں اردو کے بہت سے شعرا اور مصنفین پیدا ہوئے اور اس کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہنا صحیح ہوگا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالات کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات درج کی ہیں۔ ان سے ان کی مورخانہ بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن وہ اپنے تحقیقی کاموں میں ڈوب کر لکھنے کے بجائے فرد فرد اجزا کو یکجا کر دینے کے قائل رہے۔

ڈاکٹر زور کا ایک دوسرا تحقیقی کارنامہ ان کی کتاب میر محمد مومن ہے اس میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر اعظم میر محمد مومن کے حالات زندگی اس کے علمی، رفاہی اور سیاسی کارناموں کا مفصل ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک اور تحقیقی کارنامہ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے کے مخطوطات کی فہرست ہے جو انھوں نے پانچ جلدوں میں ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۹ء تک برابر شائع کیں۔ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ان کو دکھنی ادبیات سے عشق تھا۔ اس لئے انھوں نے اس کے علمی دفینے کو ہر جگہ سے نکالا۔ اور ان پر توضیحی نوٹ لکھ کر اس کی اہمیت بتائی۔ پھر داستان ادب حیدر آباد اور دکھنی اردو ادب لکھ کر اور معانی سخن، مرقع سخن، فیض سخن، متاع سخن، اور کیف سخن میں دکن کے شعرا کو روشناس کرا کے شمالی ہند کے ارباب نظر کو دکن کی ادبیات کی طرف نظر اٹھانے اور ان کو قابل قدر سمجھنے پر مجبور کر دیا ان کا خیال تھا کہ اردو نے دکن کے گہوارے ہی میں پروان چڑھ کر کا فرجوانی میں قدم رکھا، اس خیال کو پھیلا کر انہوں نے دکن کے ادبی حلقے سے احساس کمتری کو دور کیا اور خود اعتمادی اور خود شناسی کا جذبہ بھی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کو دکن کی ہر چیز سے شیفتگی رہی۔ اسی دکھنی زمین کی وجہ سے گولکنڈہ کے قلعہ اور قطب شاہی تاریخ سے متعلق ان کو بہت سے معلومات حاصل تھے اور لوگ ان کو گولکنڈہ کے قلعہ اور قطب شاہی خاندان کا انسائیکلو پیڈیا سمجھتے تھے افسوس کہ وہ ۶۰ سال کی عمر میں ۱۹۶۲ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگر ان کی زندگی نے اور وفا کی ہوتی تو

ادارہ ادبیات اردو کی نئی عمارت ایوان اردو
(مستقل) ادبیات کا اوّل قطعہ ضرور بنا دیتے اس ایوان
میں ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے بہت سے اسناد
نوادر مخطوطات کتابت اور تصاویر جمع ہیں، جن
سے دکن کی سیاسی، علمی اور ادبی تاریخ کے بہت سے
روشن پہلو سامنے آسکتے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کے علمی پروگرام میں ایک اردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب بھی تھی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی نگرانی میں اس کا خاکہ بھی بن چکا تھا۔ لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے اُن کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ اس ادارہ کا ترجمان سب رس ہے۔ جس کو ڈاکٹر محی الدین قادری ہی کی علمی و ادبی یادگار سمجھنا چاہیئے۔

اقتباس "آجکل" دہلی تحقیق نمبر اگست ۱۹۶۷ء

قطعہ

چہ خوش تعمیر کردہ "ایوان اردو"
دو بالا گشت از وے شانِ اردو
زچشم بد خدا محفوظ دارد
جناب زورؔ، ہمہ ارکانِ اردو

عرشی حیدرآبادی

ادارے کا مہمان خانہ

ادارے کی اپنی تعمیر شدہ عمارت "ایوان اردو" میں دو کمروں اور ایک ورانڈے پر مشتمل ایک مہمان خانہ ہے جس میں دستور ہند کی مسلمہ چودہ زبانوں میں تحقیقاتی کام کرنے والے ریسرچ اسکالر ادیب شاعر اور صحافی ایک ہفتہ قبل معتمد ادارہ کو مطلع کرکے اور اجازت ملنے پر مقررہ تاریخ اور وقت سے قیام کرسکتے ہیں۔

ریسرچ اسکالروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شعبے کے صدر کی توثیقی تحریر کے ساتھ قیام کے لئے درخواست بھجوائیں ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کے لئے تعارفی مکتوب کا درخواست کے ساتھ ملنا ضروری ہے۔ مہمان خانے میں صرف چار یوم قیام کیا جا سکتا ہے۔ مزید ضرورت ہو تو صرف تین روز کی اجازت دی جائیگی، مہمانوں سے یومیہ مقررہ شرح پر کرایہ لیا جاتا ہے جس کے بارے میں مراسلت ضروری ہے۔ ایوان اردو کا مہمان خانہ ہند و پاک کی ادبی اور تہذیبی اداروں کی تاریخ میں اپنے وجود کے صحت مندبیں منظر کے تعلق سے اوّلیت اور اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں قیام کی سہولتیں مہیا ہیں۔ مہمان خانہ "ایوان اردو" سے ملحقہ عقبی حصے میں واقع ہے۔

اس سال الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر ظل حسنین صاحب صدر شعبہ اردو نے یکم جولائی ۱۹۶۷ء سے ۵ جولائی ۱۹۶۷ء تک (۵) یوم ادارے کے مہمان خانہ میں قیام کیا۔

مصروفیاتِ ادارہ

علمی ــــــ ادبی اور ــــــ ثقافتی

ادارے کی ۱۹۶۷ء کی ڈائری سے

جنوری ۱۹۶۷ء

چہارشنبہ ۴ جنوری، جناب قاضی متین الدین احمد صاحب لکچرار شعبۂ اردو گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج اورنگ آباد نے ایوان اردو کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا۔ وقار خلیل نے موصوف کو ادارے کے بارے میں تفصیلات سے واقف کرایا۔

پیر ۹ جنوری: ۱۱ بجے صبح، ڈاکٹر جلال عبدہٗ سفیر کبیر ایران متعینہ دہلی نے جناب حسین ضابطہ اور دیگر ایرانی باشندوں کے ہمراہ ادارۂ ادبیات اردو میں حاضری دی اور ایوان اردو کے ادبی اور تہذیبی ذخیرہ کا معائنہ کیا۔ جناب میر سراج الدین علیخاں اعزازی آفس سکریٹری نے موصوف کا خیر مقدم کیا۔

پیر ۱۶ جنوری:۔ روزنامہ سیاست حیدرآباد میں ادارہ کی مطبوعہ کتاب سانولی پر تبصرہ شائع ہوا، اردو کے جوان سال ادیب اور ڈرامہ نویس جناب اطہر افسر (آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد) کے ریڈیائی فیچر اور ڈراموں کا یہ مجموعہ ادارے نے شائع کیا تھا۔

چہارشنبہ ۱۸ جنوری ۵½ بجے شام۔ جناب پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر نشین ادارۂ ادبیات اردو کی صدارت میں مشاورتی کمیٹی یوم محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس ایوان اردو میں منعقد ہوا۔ اور طے پایا کہ ۲۵ تا ۲۸ فبروری کو شایانِ شان طریقے پر یوم محمد قلی کی سہ روزہ تقاریب اور بسنت میلہ منایا جائے اس سلسلے میں مختلف کمیٹیاں تشکیل دی گئیں، اور جناب زمن راج صاحب سکسینہ کو حسب سابق معتمد یوم محمد قلی اور الحاج سید تقی الدین قادری صاحب کو شریک معتمد و خازن چنا گیا نواب میر یٰسین علیخاں صاحب (معتمد میلہ کمیٹی) جناب میر حسن صاحب (معتمد ادبی اجلاس) ڈاکٹر غلام عمر خاں (معتمد بین کلیاتی تحریری مقابلے) محترمہ عائشہ رشاد صاحبہ (معتمد مشاعرہ) میر سراج الدین علیخاں صاحب (معتمد نمائش) جناب مولوی سید دلدار حسین صاحب (معتمد ساؤنیر کمیٹی) وقار خلیل (معتمد نشر و اشاعت) منتخب ہوئے، مشاورتی اجلاس یوم قلی میں پروفیسر ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ جنرل سکریٹری ادارہ مولوی دلدار حسین صاحب رکن مجلس انتظامی ادارہ، ڈاکٹر غلام عمر خاں، جناب میر حسن، نواب میر یٰسین علیخاں، محترمہ عائشہ رشاد،

سید تقی الدین قادری صاحب، میر سراج علی خاں صاحب، وقار خلیل، اور محمد جمال الدین صاحب مہتمم ادارہ نے شرکت کی۔

جمعہ ۲۰ر جنوری مقامی اخبارات میں ادارہ کے زیر اہتمام منائے جانے والے یوم محمد قلی قطب شاہ اور بسنت میلے کی تفصیلات اور کمیٹی کی روئداد شائع ہوئی۔

جمعرات ۲۶ر جنوری: ۴½ بجے شام ایوان اردو میں بسنت میلہ کمیٹی یوم محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس جناب میر لیئق علیخاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں، جناب میر حسن، جناب رمن راج سکسینہ، جناب میر سراج الدین علیخاں، اور وقار خلیل نے شرکت کی، اس اجلاس میں مزید کمیٹیوں کے قیام اور کام کے پھیلاؤ کے سبب افراد کو شامل کرلینے کے بارے میں غور کیا گیا۔

فبروری ۱۹۶۷ء

چہارشنبہ، یکم فروری، ایوان اردو کے اردو میوزیم کی تنظیم جدید کے سلسلہ میں نواب عنایت جنگ بہادر رکن مجلس انتظامی نے صبح ۱۱ بجے سے ۴½ بجے شام تک اپنا گراں قدر وقت ایوان اردو میں گزارا۔ اور اپنی نگرانی میں نوادر کی ترتیب کا کام انجام دیا۔

۲ر فروری: ـــ یوم محمد قلی کے سلسلہ میں بین کلیاتی تحریری مقابلے کے انعقاد اور یوم محمد قلی کی تفصیلات پر مشتمل خبریں مقامی اخبارات میں شائع ہوئیں۔

اتوار ۵ر فروری: ۳ بجے سہ پہر ایوان اردو میں نواب عنایت جنگ بہادر کی صدارت میں مجلس مشاورت یوم محمد قلی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں نواب میر لیئق علیخاں، جناب میر حسن، ڈاکٹر غلام عمر خاں، مسٹر و مسز عائشہ رشاد، جناب رمن راج سکسینہ، میر سراج الدین علیخاں

سید شاہ نقی الدین قادری اور وقار خلیل نے شرکت کی، ۴½ بجے شام کیلیفورنیا یونیورسٹی (امریکہ) کے مستشرق جناب سی، ایف رجبلر ڈ نے ایوان اردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ جناب محمد جمال الدین مہتمم ادارہ اور جناب ترصیص الدین انصاری نے علی الترتیب اردو میوزیم اور کتب خانہ کا معائنہ کیا۔

منگل ۷ر فروری: کمیٹی اردو امتحانات ادارہ ادبیات اردو کا اجلاس ۱۱ بجے صبح صدر اردو پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں بمقام انوار العلوم کالج منعقد ہوا۔ اور دسمبر ۱۹۶۶ء میں منعقدہ امتحانات کے نتائج کی منظوری دی گئی اور جون ۱۹۶۷ء میں منعقد ہونے والے امتحانات کی تاریخوں کا تعین کیا گیا۔ کمیٹی میں معتمد اعزازی اردو امتحانات جناب عارف الدین حسن کے علاوہ ارکین پروفیسر سید محمد، مولوی غلام رسول اور جناب اکبر الدین صدیقی صاحبان نے شرکت کی۔

• ادارے کے اردو امتحانات کے نتائج بغرض اشاعت اخبارات کو جاری کئے گئے۔

• نواب مہدی نواز جنگ سابق گورنر گجرات ایوان اردو میں تشریف لائے۔ اور دارالمطالعہ میں کچھ وقت گزارا۔ وقار خلیل نے نواب صاحب سے ہند و پاک کے ادبی رسائل کے بارے میں گفتگو کی۔

منگل ۱۴ر فروری: ۵ بجے شام، مشاورتی کمیٹی یوم محمد قلی کا اجلاس نواب عنایت جنگ کی صدارت میں بمقام "ایوان اردو" منعقد ہوا، اور طے کیا گیا کہ چند در چند وجوہ کے سبب یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب اپریل

کے پہلے ہفتے میں منعقد ہوں۔

اتوار ۱۹ر فروری:۔ صبح ۱۱ بجے ایوان اردو میں مشاورتی کمیٹی یوم محمد قلی کا اجلاس نواب عنایت جنگ کی صدارت میں ہوا۔ اور ۴ تا ۶ مارچ کو یوم محمد قلی منائے جانے کا تصفیہ کیا گیا۔ نواب میر یٰسین علیخاں، جناب میر حسن، جناب رمن راج سکسینہ، جناب میر سراج الدین علیخان اور ڈاکٹر خلیل صاحبان نے شرکت کی۔

۲۱ر فروری:۔ دہلی سے نکلنے والے اُردو ڈائجسٹ ’جمالستان‘ بابتہ فروری، مارچ ۶۷ء میں جناب برق آشیانوی کا "طنزیہ" ایک کتاب کی رسم اجرا "مطبوعہ سب رس" ڈائجسٹ ہوا۔

جمعہ ۲۴ر فروری: سابق فرماں روائے ریاست حیدرآباد نواب میر عثمان علیخاں حضور نظام مرحوم کی وفات حسرت آیات پر صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب اور معتمد ادارہ ڈاکٹر میر سراج سکسینہ صاحب نے نظام مرحوم کی علمی و ادبی اور فلاحی کاموں کو مشترکہ تعزیتی بیان میں بھرپور خراج عقیدت ادا کیا۔

ہفتہ ۲۵ر فروری: حضور نظام آصف جاہ سابع کی وفات پر ایوان اردو کے دفاتر ایک دن احتراماً بند رہے۔

اتوار ۲۶ر فروری: ۱۱ بجے ایوان اردو میں پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ کی صدارت میں جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ اور کرسیٔ صدارت سے اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع کی وفات حسرت آیات پر قرارداد تعزیت منظور کی گئی اور دو منٹ کی خاموشی کے بعد مرحوم کو فاتحہ گزرانی گئی۔ محمد جمال الدین صاحب منتظم ادارہ نے قرآن کی تلاوت کی۔

پیر ۲۷ر فروری ½۱۲ بجے۔ جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی لکچرار شعبۂ اردو و عربی سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی (آندھرا) نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

مارچ ۱۹۶۷ء

ہفتہ ۴ر مارچ۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ½۹ بجے شب نیرنگ پروگرام میں ادارہ کی مطبوعہ کتاب "سانولی" (اظہر افسر صاحب) ریڈیائی فیچر کا مجموعہ پر تبصرہ نشر ہوا۔

جمعہ ۱۰ر مارچ۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلہ میں جناب میر اکبر علی ناصری صاحب میئر بلدیہ عظیم تر حیدرآباد، علمی و ادبی اداروں کے سربراہوں اور مجلس مشاورت یوم محمد قلی، کے اراکین کی اپیل اخبارات میں شائع ہوئی۔

• روزنامہ سیاست حیدرآباد نے یوم محمد قلی کے موقع پر اپنے مخصوص کالم فکر و نظر میں یوم محمد قلی اور ادارہ کی علمی و ادبی خدمات کے بارے میں نوٹ شائع کیا۔

• روزنامہ ملاپ اور انگارے میں بھی یوم محمد قلی کے سلسلے میں ادارہ کی طرف سے فرستادہ مضامین نظم و نثر شائع ہوئے۔

ہفتہ ۱۱ر مارچ۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کا افتتاحی اجلاس ۵ بجے شام محمد قلی قطب شاہ کے گنبد پر منعقد ہوا جس میں ہزارہا افراد نے شرکت کی، بانیٔ شہر اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کو خراج عقیدت ادا کیا۔

اتوار ۱۲ر مارچ ½۱۰ بجے صبح یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں نمائش آثار قطب شاہیہ اور ادبی اجلاس کا انعقاد عمل میں آیا۔

• اسی رات ½۹ بجے ایوان اردو میں غیر طرحی مشاعرہ کنج بہاری لال صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔

• مشاعرہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی ریڈیائی رپورٹ
آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے ایوان اردو میں نشر کے لئے ریکارڈ کی۔

دوشنبہ، ۱۳ مارچ: ۵ ½ بجے شام ایوان اردو میں یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں تلنگو اجلاس منعقد ہوا۔

اپریل ۱۹۶۷ء

ہفتہ، ۱۹ اپریل:۔ مشہور ہفتہ وار جریدہ بلٹز اردو بمبئی کی اشاعت ۸ اپریل میں یوم محمد قلی قطب شاہ کی مختصر رپورٹ مرتبہ جناب قادر جاوید صاحب شائع ہوئی۔

۱۰ اپریل سارہ دادبی ڈائجسٹ ماہنامہ "شہکار" الہ آباد شمارہ ۵ / ۶۷ ۱۹ء میں سب رس میں مطبوعہ جناب اقبال اطہاس کی غزل بحوالہ ڈائجسٹ شائع ہوئی۔

مئی ۱۹۶۶ء

جمعرات، ۱۱ مئی۔ ۱۱ بجے صبح۔ جنوبی ہند کے مشہور شاعر جناب دانش فرازی اور آذر بیابانی نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۱۵ مئی "ہفتہ وار "پرجا" نظام آباد کی اشاعت ۱۵ اور ۲۵ مئی میں دو قسطوں پر یوم محمد قلی قطب شاہ کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی۔

۱۹ مئی :۔ ماہنامہ "جانثار" امرتسر بابتہ مئی ۱۹۶۷ء میں یوم محمد قلی کی تفصیلی رپورٹ مرتبہ ذکار خلیل شائع ہوئی

۲۰ مئی۔ جناب اقبال نقیب ایڈیٹر ماہنامہ "شجر" بدایوں اور جاوید صاحب حیدرآبادی نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۲۰ مئی۔ ماہنامہ "ماہ نو" دہلی بابتہ مئی ۱۹۶۷ء میں

جناب مبارز الدین رفعت کا سب رس میں مطبوعہ مضمون بعنوان "سرسٹ نام اور حیدرآباد ڈائجسٹ ہوا۔

جون ۱۹۶۷ء

۳ جون۔ ادارہ کے اردو امتحانات اردو فاضل، اردو عالم، اردو دانی، اور اردو زباندانی (بابتہ جون ۱۹۶۷ء) ۳ جون سے ۵ جون تک مراکز حیدرآباد اور اضلاع پر ایک ساتھ منعقد ہوئے۔ مرکز انوار العلوم کالج حیدرآباد پر جناب محمد اکبر الدین صدیقی نے صدر نگران کار اور حبیب عمر صاحب، ابو الفیض سحر صاحب، بشیر احمد خاں، اور حیدر علی صاحب نے معاون نگران کے فرائض انجام دیئے شعبۂ اناث کی صدر نگراں ڈاکٹر خالدہ بیگم صاحبہ اور مسز انسری محبوب اور مس آمنۃ الرشید نے معاون کی حیثیت سے تعاون دیا۔

مرکزی سنٹرل جیل پر محمد منظور احمد صاحب صدر نگران کار رہے اور مسرس وسنت راؤ حبلیہ، الف خاں، کرشنا مورتی وینکٹ ریا، محمد بشیر اور رائے گنیش پرشاد صاحبان نے تعاون عمل کیا۔ مرکز جونیر مرٹیکا بیڈ اسکول چمپا پیٹھ پر عبد القدوس صاحب نے صدر نگراں کار کے فرائض انجام دیئے۔ صدر مدرس صاحب اور جناب قطب الدین صاحب نے تعاون کیا۔

• مرکز بانسواڑہ ضلع نظام آباد پر شریف الدین صاحب شاکر نے ادارہ کی نمائندگی کی، ڈپٹی انسپکٹر اسکولس، اور نائب صدر پنچایت سمیتی اور ہیڈ ماسٹر سی پی لیبھ اسکول نے دوران امتحان معائنہ کیا۔

• مرکز بودھن ضلع نظام آباد پر عثمان بلخی خان صاحب نے

صدر نگار کار کے فرائض انجام دیئے۔

• مرکز بودھن ضلع عادل آباد پر ادارے کے امتحانات جناب احمد صاحب کی نگرانی میں منعقد ہوئے۔

• مرکز محبوب نگر پر ادارے کی طرف سے جناب طیب انصاری صدر نگران متعین کئے گئے تھے۔ مسز کاظمی، مس سوشیلا دیوی، محبوب علی فارقی، غلام محمود اور محمود علی صاحبان نے مخلصانہ معاونت کی۔

• مرکز نظام آباد پر ظہیر الدین صاحب صدر نگراں بنائے گئے۔ حافظ منظم علی صاحب معتمد مرکز نے تعاون عمل کیا۔

• مرکز آرمور ضلع نظام آباد پر عبدالوہاب صاحب نے ادارہ کی نمائندگی کی، عبدالمقتدر صدیقی صاحب کا تعاون حاصل تھا۔

۵؍جون، ماہنامہ تحریک دہلی (اقبال نمبر جون ۱۹۶۶ء) میں ادارہ کی مطبوعہ ڈاکٹر غلام عمر خاں کی دو کتابوں (اقبال کا تصور عشق اور اقبال کا تصورِ خودی) پر ڈاکٹر محمد یوسف الدین صاحب کے تبصرے شائع ہوئے۔

• ماہنامہ جمالستان دہلی (جون ۱۹۶۶ء) نے سب رس میں مطبوعہ شاہد صدیقی لکھنوی کی نظم "گواہی" اور پروفیسر افتخار احمد فخر کی غزل ڈائجسٹ کی۔

ہفتہ، ۱۰؍جون ۶½ بجے شام ایوان اردو میں پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں "یادگار شام افسانہ" کی محفل منعقد ہوئی۔ جس میں محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ اور صغرا مہدی صاحبہ دہلوی کا خیر مقدم کیا گیا اور ان خواتین افسانہ نگاروں کے علاوہ محترمہ جیلانی بانو، محترمہ زینت ساجدہ، محترمہ آمنہ ابوالحسن، محترمہ فاطمہ یزدانی اور محترمہ لکشمی دیوی راج نے اپنی تازہ اور دلچسپ کہانیاں سنائیں۔ شام افسانہ سے قبل کرسئ صدارت سے حضرت اثر لکھنوی اور جناب شاہد احمد دہلوی کی علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔ شام افسانہ کی تقریب میں حیدرآباد کی ممتاز خواتین کے علاوہ ادیبوں، شاعروں اور مشاہیر کی کثیر تعداد نے شرکت کی، محترمہ بانو طاہرہ سعید کنوینر شام افسانہ نے شکریہ ادا کیا۔

۱۹؍جون۔ جناب ہادی بلگرامی صاحب سابق ناظم اسٹیٹ آرکائیوز آندھرا پردیش نے ایوان اردو کے آڈیٹوریم، دارالمطالعہ اور میوزیم کا معائنہ کیا۔

۲۸؍جون، نواب مہدی نواز جنگ پرو چانسلر جامعہ عثمانیہ کی وفات حسرت آیات پر ایوان اردو کے دفاتر ایک دن کے لئے احتراماً بند رہے اور ادارہ کی طرف سے جلوس جنازہ میں شرکت کی گئی۔ صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر نے تعزیتی بیان جاری کیا۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ، جناب حامد علی عباسی صاحب رکن مجلس انتظامی ادارہ اور جناب میر سراج الدین علیخان آنرری سکریٹری ادارہ نے بیگم مہدی نواز جنگ کو اُن کے گھر پر تعزیت دی۔

جولائی ۱۹۶۶ء

یکم جولائی۔ ڈاکٹر ظل حسین لکچرار شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے ایوان اردو کے مہمان خانے میں قیام کیا اور ادارہ کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔

۲؍جولائی۔ ۱۰ بجے صبح [illegible] ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے جناب [illegible] گپتا صاحب کی صدارت میں نواب مہدی نواز جنگ کی خدمات

کو خراجِ عقیدت ادا کرنے کی غرض سے جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ پروفیسر سید علی اکبر، شاکر بی رام کرشنا راؤ (سابق گورنر یو پی)، بیرسٹر میر اکبر علیخان (ایم پی)، پروفیسر مہندر راج سکسینہ، راجہ بہادر پنالال پتی، محترمہ رودا مستری (ایم ایل اے)، مولوی خواجہ محمد احمد نے تقریریں کیں، ڈاکٹر غیاث صدیقی، قاری خلیل اور صلاح الدین نیر صاحبان نے منظوم خراجِ عقیدت ادا کیا۔ قاری وارث محمد خاں کی قراءت ہوئی۔ اور کرسی صدارت سے قرار دادِ تعزیت پیش اور منظور کی گئی۔

۲ر جولائی ۔ ڈاکٹر محمد اسلام صاحب ریسرچ اسکالر لکھنو یونیورسٹی نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۴ر جولائی ۔ جناب حبیب الرحمان چغتائی (آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڈہ) نے ادارہ کے تمام شعبوں بالخصوص کتب خانہ کا تفصیلی معائنہ کیا۔

● ادبی ڈائجسٹ ماہنامہ "جمالستان" دہلی بابتہ جولائی میں سب رس میں مطبوعہ باقر منظور صاحب کی غزل ڈائجسٹ ہوئی۔

۱۵ر جولائی :۔ کمیٹی اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو کا اجلاس پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ اور امتحانات منعقدہ جون ۱۹۶۷ء کی منظوری دی گئی اور اخبارات اور مراکز پر نتائج جاری کئے گئے۔ پروفیسر سید محمد، مولوی غلام رسول، جناب محمد اکبر الدین صدیقی اور معتمد اردو امتحانات مولوی عارف الدین حسن صاحبان نے کمیٹی میں شرکت کی۔

۲۴ر جولائی :۔ دن کے ۱۱ بجے ریاستی محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے ناظم نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

اگست ۱۹۶۷ء

۲ر اگست ۔ جناب نسیم اختر ایڈیٹر ماہنامہ ٹائمس ڈائجسٹ سکندرآباد (دکن) نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

پیر ۷ر اگست ، صبح ۹ ½ بجے ۔ مرکزی وزیرِ صنعتی ترقیات و مسلم اوقاف جناب فخر الدین علی احمد صاحب نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ صدر و معتمد ادارہ و اراکین نے موصوف کا خیر مقدم کیا اور گلپوشی کی گئی۔ وقار خلیل نے فی البدیہہ تہنیتی قطعہ سنایا۔ مرکزی وزیر نے دورانِ گفتگو ادارہ کی کارکردگی پر اظہارِ خوشنودی فرمایا اور غالب صد سالہ تقاریب کے سلسلے میں جس کے موصوف مرکزی کمیٹی کے معتمد بھی ہیں، ادارہ سے تعاون عمل کی خواہش کی۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد ادارہ نے موصوف کی خدمت میں غالب پر مطبوعہ ادارہ کی مطبوعات کا سٹ تحفتہً پیش کیا۔ اس خیر مقدمی محفل میں مولوی دلاور حسین، مولوی ابو النصر سلیم (ایم پی)، مولوی خواجہ محمد احمد، مولوی محمد اکبر الدین صدیقی، مولوی عارف الدین حسن، مولوی سید شاہ تقی الدین قادری، مولوی میر سراج الدین علیخان اور مولوی محمد جمال الدین اور جناب ترصیص الدین انصاری صاحبان شریک تھے۔

۹ر اگست :۔ ۳ بجے ۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین صدر معلمہ مدرسہ فوقانیہ نسوان ناملی نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔

● ۴ بجے ۔ مسٹر رچرڈ، امریکن ریسرچ اسکالر نے اردو میوزیم اور آثار قطب شاہیہ و مغلیہ کا ایوان اردو میں تفصیلی معائنہ کیا۔

۱۲ر اگست ، ماہنامہ "کتاب نما" دہلی بابتہ اگست ۱۹۶۷ء

میں ادارہ کی طرف سے مطبوعہ جناب اطہر افسر صاحب
کے ڈراموں کا مجموعہ "سانولی سے ایک پیچر" ذوقی
بحوالہ ڈائجسٹ ہوا۔

پیر، ۱۴ اگست۔ ۶½ بجے۔ اردو کے مشہور شاعر
جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر (دہلی) کی آمد اور
خیر مقدم میں ایک مخصوص محفل شعر "ایوان اردو" میں
منعقد ہوئی۔ علامہ حیرت بدایونی نے صدارت کی اور
وقار خلیل نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔
جناب سحر اور مہمان شاعر شمسی مینائی کے علاوہ حضرت
تاج قریشی، مرزا شکور بیگ صاحب، ڈاکٹر غیاث صدیقی،
سلیمان خطیب، عظمت عبدالقیوم، جرأت ندیم،
وقار خلیل، عشرت کرتپوری، نازحیدر، صلاح الدین نیر
میر سراج الدین علیخان، گیان سنگھ شاطر اور شمیم نصرتی
صاحبان نے کلام سنایا۔

۱۷ اگست:۔ مولانا سید معز الدین قادری ملتانی نے
ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۱۸ اگست:۔ عطاء الرحمن صاحب ارشاد منیجر ماہنامہ
شاہکار، الہ آباد نے ایوان اردو کے تمام شعبوں کو ملاحظہ
فرمایا۔

۲۸ اگست: ماہنامہ "آجکل" دہلی کے اردو تحقیق
نمبر (بابتہ اگست ۶۷ء) میں جناب سید صباح الدین
عبدالرحمن کا ایک طویل مقالہ "اردو کے تحقیقی ادارے
اور محققین" شائع ہوا جس میں ادارہ کی علمی ادبی خدمات
اور بانی ادارہ ڈاکٹر زور پر سیر حاصل تبصرہ شامل ہے
(یہ اقتباس "تاثرات" کے کالم میں افادیت کے
سبب شائع کیا جا رہا ہے)

۲۹ اگست۔ جناب ولی اللہ سلفی جونیئر
شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کے سلسلے میں
ایوان اردو کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا۔

۳۰ اگست، ماہنامہ "کتابی دنیا" کراچی بابتہ جون،
جولائی ۶۶ء میں یوم محمد قلی کی رپورٹ شائع ہوئی۔

ستمبر ۱۹۶۷ء

پیر ۴ ستمبر صبح ۹ بجکر ۴۰ منٹ پر عزت مآب عالیجناب
صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ادارہ ادبیات اردو
کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ ادارہ کی مجلس انتظامی کے تمام اراکین
اور مشاہیر نے صدر جمہوریہ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس
موقع پر پدم شری حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی متولی ہمدرد
دواخانہ دہلی نے بھی ایوان اردو کا معائنہ فرمایا۔

۵ ستمبر ۶ بجے شام، مجلس انتظامی ادارہ کا اجلاس
ایوان اردو میں پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی زیر صدارت
منعقد ہوا۔ پروفیسر ہندراج سکسینہ معتمد اعزازی ادارہ
نے موازنہ برائے منظوری پیش کیا۔ اس کے علاوہ کمیٹی نے
"یوم زور" کے انعقاد کی منظوری دی اور غالب صدسالہ
تقاریب کے لئے مولوی سید دلدار حسین صاحب کو مجاز گردانا
کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں۔ اس اجلاس میں راجہ جانکی
پرشاد صاحب، نواب عنایت جنگ بہادر، مولوی حامد
علی عباسی، مولوی سید دلدار حسین، سید شاہ تقی الدین صاحب
قادری اور آفس سکریٹری میر سراج الدین علی خاں صاحب
نے شرکت کی۔

۹ ستمبر:۔ جناب ٹی، ایف، اے اینیا کنسلٹنگ انجینئر [illegible] نے

سید دلدار حسین صاحب نے سابق چیف انجینئر دکن ادارہ کے ہمراہ ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۱۲ر ستمبر: ادارہ کی سالانہ رپورٹ" ادارہ سن ۱۹۶۶ء میں مرتبہ وقار خلیل اور سب رس کا ادارہ نمبر ایک ساتھ شائع ہوئے۔

۱۴ر ستمبر ۴ بجے شام۔ محترمہ تارا کشوری سنہا رکن پارلیمنٹ دہلی نے ممتاز شاعر مخدوم محی الدین صاحب اور جناب میر حسن صاحب ممبر اردو مجلس کے ہمراہ ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس موقعہ پر صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر بھی ادارہ میں موجود تھے۔

۱۹ر ستمبر: پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ نے سابق ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم ڈاکٹر بالام کرشنا راؤ کی وفات پر تعزیتی بیان جاری کرتے ہوئے آنجہانی کی ادارہ سے وابستگی اور ۱۹۵۵ء میں آنجہانی کا ایوان اردو کا سنگ بنیاد رکھے جانے کا ذکر کیا اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا۔

۲۳ر ستمبر۔ یوم زور کے سلسلے میں بعد نماز عصر مسجد افضل گنج میں ختم قرآن اور فاتحہ خوانی ہوئی اور بعد مغرب ڈاکٹر زور کے والد حضرت زعیم کے مزار واقع خانقاہ عنایت الٰہی پر چادر گل چڑھائی گئی۔

۲۴ر ستمبر۔ یوم زور منایا گیا۔ صبح ۹ ½ بجے ایوان اردو میں نمائش مطبوعات و آثار و تحریرات زور کا افتتاح نواب عنایت جنگ نے فرمایا۔ ڈاکٹر زور کی پانچویں برسی کے موقع پر ۶ ½ بجے ایوان اردو میں ادبی اجلاس راجہ جانکی پرشاد صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اسی روز ۹ بجے شب مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔

• یوم زور کے سلسلے میں روزنامہ سیاست میں بعنوان "ڈاکٹر زور" حافظ محی الدین حبیبی صاحب کا مضمون شائع ہوا۔

۳۰ر ستمبر۔ ماہنامہ محفل لاہور ستمبر ۱۹۶۷ء میں اندرجیت دت امرتسری کا سب رس میں مطبوعہ مضمون "چرخ شعبدہ باز" بحوالہ ڈائجسٹ ہوا۔

اکتوبر ۱۹۶۷ء

۵ر اکتوبر۔ ماہنامہ حیات اکتوبر ۱۹۶۷ء میں سب رس میں مطبوعہ محترمہ عابدہ حسین کی کہانی بعنوان "موم کی گڑیا" ڈائجسٹ ہوئی۔

۲۴ر اکتوبر۔ مشاعرہ یوم زور کی ریڈیو رپورٹ آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے نشر ہوئی۔ جناب مرزا اظہر افسر صاحب نے مرتب کیا۔

۲۹ر اکتوبر۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی صاحب بمبئی نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور ادارہ میں اردو تھیٹر کے سلسلہ میں مرزا شکور بیگ صاحب، میر حسن صاحب، مرزا اظہر افسر صاحب، ضیاء الدین احمد شکیب صاحب، میر سراج الدین عثمان اور وقار خلیل سے بات چیت کی اور دکن کی اردو تھیٹر کے سلسلے میں مطبوعہ مواد حاصل کیا۔

نومبر ۱۹۶۷ء

۲ر نومبر۔ ماہنامہ "حکمت" بمبئی نومبر ۱۹۶۷ء میں سب رس کے ادارہ نمبر ۱۹۶۷ء پر تبصرہ شائع کیا۔

۳ر نومبر۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے حیدر آباد کے علمی و ادبی اداروں کے ممبروں کی ایک میٹنگ منعقد کی گئی جس میں نائب صدر سہ ماہی

کے بارے میں غور کیا گیا۔ صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صدر غالب کمیٹی ادارہ، مولوی سید دلدار حسین اور کنوینر غالب کمیٹی۔۔۔ اور جناب میر سراج الدین علیخاں نے اس میں شرکت کی اور اس کمیٹی نے بھی جناب دلدار حسین صاحب کو مرکزی غالب کمیٹی حیدرآباد کا چیرمن اور پروفیسر سید علی اکبر صاحب اور جناب میر سراج الدین علیخاں کو مرکزی کمیٹی کے ارکین منتخب ہوئے

۱۳ نومبر:- جناب نذیر الدین احمد صاحب (مصنف رموز خطابت) رکن بلدیہ چیلہ پورہ، حیدرآباد نے اپنے چند احباب کے ہمراہ ایوان اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۱۴ نومبر:- ڈاکٹر محمد باری مقیم امریکہ اور دائرہ ادب اسلامیہ ہند کے چھ اراکین جناب م۔ نسیم (لکھنو) جناب حفیظ میرٹھی جناب مختار احمد میرٹھی، ڈاکٹر عباد احمد انصاری، جناب سہیل احمد زیدی اور جناب شمیم سجانی صاحبان نے ایوان اُردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۱۹ نومبر:- ڈاکٹر محمد عبدالمطلب پروفیسر و صدر شعبہ پبلک ایڈمنسٹریشن عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنی بیگم صاحبہ کے ہمراہ ایوان اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۵ بجے شام۔ ایوان اُردو میں مشاورتی کمیٹی یوم محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس پروفیسر سید علی اکبر کی صدارت میں منعقد ہوا اور طے کیا گیا کہ ۱۲ تا ۱۴ جنوری ۱۹۶۸ء کو سہ روزہ یوم محمد قلی قطب شاہ منایا جائے۔ اس کمیٹی میں نواب عنایت جنگ بہادر، ڈاکٹر ہندر راج سکسینہ جناب حامد علی عباسی، جناب رمن راج سکسینہ (معتمد یوم قلی) جناب سید شاہ تقی الدین صاحب قادری جناب میر حسن، جناب ضامن علی فاروقی، جناب نذیر الدین احمد، جناب ضیاء الدین احمد شکیب، جناب میر سراج الدین علیخاں جناب محمد اکبر الدین صدیقی، جناب ذوالفقار خلیل نے اور سید شاہ صفی الدین قادری صاحب نے شرکت کی۔

ڈسمبر ۱۹۶۷ء

۵ ڈسمبر:- ماہنامہ جہان ادب دہلی بابتہ ڈسمبر ۱۹۶۷ء میں سب رس میں مطبوعہ محترمہ صغرا مہدی کی کہانی "ایک کہانی" بحوالہ ڈائجسٹ ہوئی۔

۶ ڈسمبر:- ادارہ کی مجلس انتظامی کا اجلاس ایوان اُردو میں صبح ۱۰ بجے پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہو جس میں ادارے کے دستور کے بارے میں غور کیا گیا۔ جناب بل، ین، گپتا، نواب عنایت جنگ، مولوی سید دلدار حسین، مولوی حامد علی عباسی، جناب سید شاہ تقی الدین قادری اور جناب سراج الدین علیخاں صاحب نے شرکت کی۔

۱۴ ڈسمبر:- ایوان اردو میں صبح ۱۰ بجے ادارہ کے انتظامی مسائل پر غور کرنے کے لئے مجلس انتظامی کا اجلاس پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔

جناب حامد علی عباسی، جناب بل، ین، گپتا، جناب اکبر الدین صدیقی، جناب سید شاہ تقی الدین قادری اور جناب میر سراج الدین علیخاں نے شرکت کی۔

۲۴ ڈسمبر:- ادارہ کے اُردو امتحانات حیدرآباد اور اضلاع کے علاوہ میسور میں ۲۴ تا ۲۶ ڈسمبر ۱۹۶۷ء تین روز کے لئے ایک ساتھ شروع ہوئے۔ مرکز اردو امتحانات میسور کے لئے بحیثیت صدر نگران کار ادارہ کے مہتمم جناب محمد جمال الدین صاحب مقرر ہوئے تھے۔ حیدرآباد کے مرکز انوار العلوم کالج پر امتحانات پروفیسر محمد اکبر الدین صاحب صدیقی صدر نگران کار کی نگرانی میں انجام پائے

اسی مرکز پر شعبۂ آنانف کی صدر نگران ڈاکٹر خالدہ بیگم رہیں بیگم معاونین مرکز انوارالعلوم کالج میں بشیر احمد صاحب، سید علی صاحب، مہدی حسین صاحب اور آمنۃ الرشید صاحبہ قابل ذکر ہیں۔

اس مرکز پر دوران امتحان جناب محمد علی خاں صاحب پرنسپل انوارالعلوم کالج، پروفیسر سید محمد صاحب، مولوی عارف الدین حسن صاحب معتمد اردو امتحانات ادارہ اور جناب میر سراج الدین علی خاں آفس سکریٹری ادارہ نے معاینہ کیا۔

جناب محمد منظور احمد صاحب لکچرار کریمنگر کالج نے جے سی، اسکول چیپا پیٹھ کے مرکز پر امتحانات کی نگرانی فرمائی۔ مرکز کرنول کے صدر نگران، ظہیرالدین صاحب تھے۔ اور مرکز ناگر کرنول میں ادارے کے امتحانات شریف الدین صاحب کی نگرانی میں انجام پائے۔ مراکز محبوب نگر، بانسواڑہ اور آرمور پر علی الترتیب عبدالقدوس صاحب مدرس، عارف احمد صاحب اور مصباح الدین صاحب نے صدر نگران کار کی خدمات انجام دیں۔

ایوان اردو

دکھنی تہذیب کا مرقع ہے، اس کا اب بھی اگر آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا ہے تو اولین فرصت میں تشریف لائیے۔ اور اپنی تہذیبی سرمایہ کی باقیات کا اندازہ کیجئے

اعداد و شمار

استفادہ کتب خانہ و دارالمطالعہ عام ایوان اردو

جنوری تا دسمبر ۱۹۶۷ء

O

جنوری: (۳۷۲) افراد	جولائی: (۴۷۰) افراد
فروری: (۲۳۰) "	اگست: (۴۴۰) "
مارچ: (۳۴۰) "	ستمبر: (۳۵۵) "
اپریل: (۳۶۸) "	اکتوبر: (۴۰۳) "
مئی: (۴۷۰) "	نومبر: (۴۵۱) "
جون: (۲۶۲) "	دسمبر: (۴۹۳) "

کتب خانہ اور دارالمطالعہ

ایوان اردو

اوقات: ۱۰½ ساعت صبح تا ۴½ ساعت شام

اپنے علمی و ادبی ذوق کی تکمیل کیلئے اردو کی قدیم و جدید مطبوعات اور رسائل سے استفادہ فرمائیے۔

امتحانات ادارۂ ادبیات اردو

اردو فاضل، اردو عالم، اردو دانی، زباندانی میں شریک ہوکر بہ تدریج گریجویٹ ہو جائیے۔ (۲۰) پیسے کے ٹکٹ بھیجکر قواعد و ضوابط طلب کیجئے۔ شعبۂ اردو امتحانات، ایوان اردو حیدرآباد

یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۶۷ء

ایک جائزہ

مرتبہ ذوالفقار خلیل

اردو زبان کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور فرخندہ بنیاد شہر حیدرآباد کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی (۱۵۶۵ء تا ۱۶۱۱ء) کی ادبی تہذیبی اور تمدنی خدمات اور کارناموں کو ادارۂ ادبیات اردو" حیدرآباد کی جانب سے سہ روزہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب کے ذریعہ بھرپور خراج عقیدت ادا کیا گیا۔

محمد قلی کی (۳۵۵) ویں برسی کے موقع پر سہ روزہ تقاریب کا آغاز ۸ مارچ ۱۹۶۷ء کی سہ پہر گورستان شاہی (گولکنڈہ) میں محمد قلی کے وسیع و عریض چبوترے پر دوپہر ہی سے چہل پہل شروع ہوئی۔ یوم محمد قلی کے معتمد جناب رمن راج سکسینہ ایڈوکیٹ نے جلسے کے آغاز کا اعلان کیا۔ دکن کے علم دوست، معارف نواز اور بزرگ، پدما بھوشن نواب مہدی نواز جنگ (سابق گورنر گجرات) نے افتتاحی اجلاس کی صدارت فرمائی۔

مقبول ہ وسیقار عابد علیخاں نے محمد قلی کی مناجات ساز پر سنائی اور پھر ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد ڈاکٹر مہندر راج صاحب سکسینہ نے خیر مقدمی تقریر ارشاد فرمائی اور کہا کہ "تاریخ دکن میں قطب شاہی سلاطین" بالخصوص محمد قلی نے عدل و انصاف اور انسانیت کی جو مثالیں قائم کی ہیں، ان کی نظیر ملنا مشکل ہے" حضرت آصف سابع نواب میر عثمان علیخاں مرحوم کے زرین دور حکومت، علمی ادبی سرپرستی کو بھرپور خراج عقیدت ادا کیا، اور کہا کہ حضرت آصف سابع جدید حیدرآباد کے معمار تھے۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ ہم یہاں دکن کی دو عظیم المرتبت شخصیتوں کی یادتازہ کر رہے ہیں۔ محمد قلی نے اس شہر کی بنا ڈالی اور آصف سابع نے اس شہر کو ترقی دی اور اس کے حسن کو دوبارہ کیا۔"

نواب مہدی نواز جنگ نے افتتاحی تقریر ارشاد فرمائی اور کہا کہ اس گنبد کے اندر جو جسم دفن ہے، اس کی روح کے پیام کو سمجھنے اور مل جل کر رہنے کا سبق سیکھنا ہے۔ محمد قلی کی یاد کرنا تو اچھا کام ہے۔ مرحوم دوست ڈاکٹر زور نے اپنی فراست، دانشمندی اور تدبر سے اس تقریب کا آغاز کیا جو دکن کی تاریخ میں یادگاری حیثیت کی حامل بن گئی ہے

ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ ادبیات اردو نے اس موقع پر ملنے والے پیامات سنائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ ہند، محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند اور جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب غلام محمد صادق، ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر محمد مجیب اشرف ندوی نے اپنے پیامات میں محمد قلی کی روایتوں، عہد حکومت، شعر و ادب کی ترقی اور ہم آہنگی کو سراہتے ہوئے "یوم محمد قلی" کی تقاریب کی کامیابی کی تمنا ظاہر کیں۔

پیا است کے بعد عظیم تر حیدرآباد کے میئر جناب میر اکبر علی ناصر نے شہر حیدرآباد کے بانی کو خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ "آج ہندوستان محمد قلی کی روایات کا منتظر ہے، اس فرماں روا کی تہذیب اس کا طرز جہاں بانی ہندوستانی کلچر کے فروغ کی کوشش یقینی ہے، آندھرا ولس ہی نہیں پورے بھارت میں برقرار رہیں گی اور محمد قلی بھی زندۂ جاوید رہے گا' ارمان فاروقی نے ممتاز شاعر مخدوم محی الدین کی نظم "بھاگ متی" ترنم سے سنائی اور پھر صلاح الدین نیر نے "روشنی کا شہر" کے عنوان سے محمد قلی کو خراج عقیدت ادا کیا۔

جناب عابد علیخان ایڈیٹر روزنامہ سیاست حیدرآباد نے اپنی پُر اثر تقریر میں کہا کہ شہر حیدرآباد کے بانی محمد قلی نے ہمیں صرف ایک خوبصورت شہر ہی نہیں دیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ایسی عظیم اور تاریخی روایات کا ورثہ بھی دیا ہے جس کی وجہ سے ہمارا یہ پیارا شہر تمدن و تہذیب معیشت اور خوشحالی کا ایک قابل فخر سرمایہ اور قیمتی ورثہ ہے۔ گولکنڈہ کے شاہی خاندان نے عوام سے ربط ضبط، قریبی تعلق اور مقامی حالات و مسائل سے واقفیت کا وہ سلسلہ شروع کیا تھا وہ خانوادۂ آصفی کا بھی ورثہ رہا ہے۔ حضرت آصف سابع کا ذکر کرتے ہوئے جناب عابد علیخان نے بتایا کہ محمد قلی نے تہذیبی اتحاد اور فرقہ وارانہ دوستی اور رفاقت کی جو شمع جلائی تھی اس کی روشنی دکن میں آج بھی پھیلی ہوئی ہے اس روشنی کا جیتا جاگتا ثبوت ہمیں ابھی گذشتہ ماہ حضور نظام آصف سابع کے جلوس جنازہ میں ملا ہے۔

نواب مہدی نواز جنگ نے اس موقع پر ادارہ کی طرف سے مطبوعہ کتابوں کی رسم اجرائی انجام دی "اقبال کا تصور خودی" (ڈاکٹر غلام عمر خاں) تاریخ ادب اردو (مرتبہ ادارہ کا ساتواں ایڈیشن) سانولی" اجلا فنر گئے ڈراموں کا مجموعہ) کو اس کے مصنفوں نے قبول کیا اور اس کے بعد میں کلیاتی تقریری اور تحریری مقابلوں میں انعام اول و دوم پانے والوں نے ادارہ کی طرف سے انعامات نواب صاحب کے ہاتھوں خوشی اور مسرت کے ماحول اور تالیوں کی گونج میں حاصل کئے۔

جواں سال موسیقار عابد علی خاں نے محمد قلی کی غزل دلکش ترنم میں سنا کر داد حاصل کی اور پھر اندرون گنبد محمد قلی ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے نواب مہدی نواز جنگ، پروفیسر سید علی اکبر، میر بلند ناصری صاحب اور دیگر حضرات کی موجودگی میں مزار محمد قلی پر چادر گل چڑھائی گئی۔ ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی کی قرات اور فاتحہ خوانی کے بعد عباس عابدی صاحب نے محمد قلی کا دکنی مرثیہ سنایا۔

قوالی بھی ہوئی اور ۹ بجے شب مسٹر رمن راج سکسینہ معتمد تقاریب یوم محمد قلی کے شکریہ پر افتتاحی اجلاس کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

اتوار ۱۲ مارچ کی صبح ½۱۰ بجے "ایوان اردو" کی عمارت کے ایک حصے میں علم و ادب کے شیدائیوں نے نمائش آثار قطب شاہیہ ملاحظہ فرمائی۔ جناب میر سراج الدین علیخان کنوینر نمائش تھے۔

پروفیسر سید علی اکبر کی صدارت میں ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے "قطب شاہی ادب کی بازیافت" کے زیر عنوان علمی مضمون سنایا اور بتایا کہ قطب شاہی عہد کے گم گشتہ ادب پاروں کی اشاعت

کا آغاز اب سے ۳۵ برس پہلے ہوا۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری، پروفیسر سید محمد، محمد بن عمر اور دیگر محققوں نے مختلف شعری و نثری مخطوطات و مسودات کو تحقیق اور لگن کے ساتھ مرتب کر کے شائع کرنا شروع کیا۔"

ڈاکٹر سروجنی ریگانی نے انگریزی میں تاریخی حقائق پر مشتمل تقریر کرتے ہوئے "قطب شاہی عہد کی تہذیبی یکجہتی" پر روشنی ڈالی اور کہا کہ "اکبر کے بعد محمد قلی ہی وہ فرماں روا گذرا جس کا دور حکومت قومی اور تہذیبی ایکجہتی کے لئے درخشاں رہا ہے۔

جناب ضیاءالدین احمد شکیب نے محمد قلی کی شاعری کی خصوصیات کے بارے میں پر مغز مقالہ سنایا اور کہا کہ "محمد قلی بنیادی طور پر جذبہ اور نغمہ کا شاعر ہے اس کے کلام سے اس زمانہ کی معاشرت اور کلچر کا تصور قائم کیا جا سکتا ہے

جناب سرجیوا س لاہوٹی نے طویل اور معلوماتی مقالہ میں حیدرآباد میں قطب شاہی آثار" کا جائزہ لیا اور بتایا کہ "فن تعمیر کا دل پذیر اور عظیم نمونہ قطب شاہوں کا دور حکومت رہا ہے

مولوی خواجہ محمد احمد صاحب نے "دکنی آثار اور تمدن پر قطب شاہوں کا اثر" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "محمد قلی صرف حق پرست ہی نہیں تھا بلکہ وہ حسن آفرین بھی تھا"

جناب میر یٰسین علی خان محترمہ خورشید نذیر اور جناب سراج حیدرآبادی نے محمد قلی کی شخصیت، عہد، فکر و فن اور آثار قطب شاہیہ کے تعلق سے نظمیں سنائیں۔

پروفیسر سید علی اکبر نے صدارتی تقریر فرمائی اور کہا کہ اس تقریب کے بانی ڈاکٹر زور مرحوم نے دکنی ادب و تہذیب کی بازیافت اور اس کی نشاۃ ثانیہ میں گرانقدر حصہ لیا ہے، دکن میں محمد قلی اور حضرت سلطان العلوم آصف سابع مرحوم کے دور حکومت میں علم و ادب کی ترقیوں کے ساتھ محبت، شرافت اور رواداری کی قدریں بھی پروان چڑھیں اور اب ان اقدار کی حفاظت ہم سبھوں کا فرض ہونا چاہیئے۔ جناب ببر حسن معتمد ادبی اجلاس کے شکریہ پر ادبی اجلاس برخواست ہوا۔

اسی رات ۹½ بجے "ایوان اردو" کے جبین و جمیل آڈیٹوریم میں ایک یادگار غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ صدر مشاعرہ راجہ کنج بہاری لال معتمد صحت عامہ و حکومت مقامی آندھرا پردیش کی آمد کے فوری بعد دو مرتی شمعیں روشن کی گئیں محمد قلی کی غزل ارمان فاروقی نے ترنم میں سنا کر سامعین کو مسحور کر دیا۔ علامہ حیرت بدایونی، حضرت تاج قریشی، ضیاءالدین احمد شکیب، مظہر کامل، وقار خلیل، عنبرت کرتپوری، خورشید نذیر، اسد انصاری، صلاح الدین نیر، سراج آمنیر، سراج حیدرآبادی، فیض الحسن خیال، عباس عابدی، علی الدین نوید، نثار حسینی، ارمان فاروقی اور راجہ کرشن پرشاد کرن نے کلام سنایا۔ معتمد مشاعرہ محترمہ عائشہ رشاد تھیں۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے یوم قلی کے افتتاحی اجلاس اور مشاعرہ کی رپورٹ نشر کی گئی۔

دوشنبہ ۱۳ مارچ کی شام "ایوان اردو" یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب کا اختتام تلگو ادبی اجلاس پر ہوا۔ تلگو اور اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد نے اس جلسہ میں شرکت کی۔ ڈاکٹر وینکٹ اودھانی صدر شعبہ تلگو جامعہ عثمانیہ نے اس جلسہ کی صدارت کی۔

رپورٹ یوم زور

منعقدہ ۲۴/ستمبر ۱۹۶۷ء

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے بانی، ملک کے ممتاز محقق، اپنا ناز انشاء پرداز ادیب اور دبستانِ دکن کے معلم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی پانچویں برسی کے موقع پر "یوم زور" ۲۴/ستمبر ۱۹۶۷ء کو ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیر اہتمام ایوان اردو میں منایا گیا۔ ہفتہ ۲۳/ستمبر کو بعد نماز عصر مسجد فضل گنج میں قرآن خوانی اور فاتحہ ہوئی بعد مغرب ڈاکٹر زور کے والد محترم حضرت زخمی کے مزار واقع خانقاہ عنایت الٰہی پر چادر گل چڑھائی گئی۔

اتوار ۲۴/ستمبر کو صبح ۹ بجے ایوان اردو کے شعبہ دارالمطالعہ میں نمائش مطبوعات و آثار ڈاکٹر زور کا نواب عنایت جنگ بہادر کے ہاتھوں افتتاح عمل میں آیا۔ میر سراج الدین علیخان صاحب نے یہ نمائش بڑی محنت اور سلیقہ سے ترتیب دی تھی، علم دوست احباب کی خاصی تعداد نے اس نمائش کو دیکھا۔

اسی روز صبح ۱۰½ بجے ایوان اردو کے خوبصورت آڈیٹوریم میں جناب رائے جانکی پرشاد صاحب کی صدارت میں ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے اس تقریب کے مہمان خصوصی جناب جے، وی، نرسنگ راؤ صاحب وزیر تعمیرات و مواصلات آندھرا پردیش کی سماجی اور علمی و قومی خدمات کی ستائش کی اور ڈاکٹر زور کی یاد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "مرحوم نے اردو ادب کی ترقی اور دکنی کلچر کی بقاء کے لئے جو عظیم الشان کام کیا ہے۔ آج کے جلسے میں ممتاز مقررین اُن پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔ پروفیسر سید علی اکبر نے سرسری طور پر ادارے کے علمی و ادبی کاموں کا ذکر کیا۔

ریاستی وزیر جناب جے، وی، نرسنگ راؤ صاحب نے یوم زور کے ادبی اجلاس میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کی خدمات کی ستائش کی اور بتایا کہ "ڈاکٹر زور کا شمار عالموں میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے ملی جلی ہندوستانی تہذیب کی بنیادوں کو دکن میں مستحکم کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے ادارہ قائم کر کے دکنی زبان اور ادب کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ دکنیات پر نہ صرف خود انہوں نے تحقیقی کارنامے انجام دیئے بلکہ وہ اپنے ساتھ پروفیسروں، ادیبوں اور شاگردوں کے ایک قافلے کو لے کر آگے بڑھے اور میر کارواں کہلائے۔ ڈاکٹر زور بجائے خود ایک انجمن تھے۔" جناب نرسنگ راؤ صاحب نے آخر میں فرمایا کہ "بقول ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی، ڈاکٹر زور کی وفات سے نہ صرف اردو زبان کے تحقیقی کاموں کو نقصان پہنچا ہے بلکہ ہندوستان کی ثقافت کا بھی نقصان ہوا ہے۔ اب ہم سب کا فرض ہے کہ انہوں نے جو چراغ جلایا تھا اسے

اور روشن کریں اور اُن کے نقش قدم پر چلکر دکنی ادب اور دکن کے تمدن کو آگے بڑھائیں "

جناب رمن راج صاحب سکسینہ نے یوم زورؔ کے سلسلے میں آئے ہوئے پیامات سنائے جن میں ایچ ای ایچ نظام ہفتم نواب میر برکت علیخاں بہادر، پروفیسر ہمایوں کبیر، جناب جی ایم صادق چیف منسٹر کشمیر، ڈاکٹر تارا چند، نواب علی یاور جنگ وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر محمد مجیب جامعہ ملیہ دہلی اور نثار احمد فاروقی صاحب نے اپنے پیامات میں ڈاکٹر زورؔ کی علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا تھا۔

ممتاز اور صف اول کے شاعر جناب مخدوم محی الدین صاحب نے ڈاکٹر زورؔ کو بہ حیثیت استاد محقق، عالم اور ماہر صوتیات یاد کرتے ہوئے کہا کہ ادارہ ان کی بڑی یادگار ہے، ڈاکٹر مغنی تبسم نے ڈاکٹر زورؔ کی علمی اور قابل قدر تصنیف "روح تنقید" کے پیش نظر اردو تنقید میں ڈاکٹر زورؔ کا مقام" کے زیر عنوان علمی اور تحقیقی مقالہ سنایا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے ڈاکٹر زورؔ کے لسانیاتی شعور" پر اپنا مقالہ پڑھا اور کہا کہ "جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا لوگ زورؔ صاحب کے لسانیاتی شعور کا لوہا ماننے لگیں گے اور اس معلم اولین کی کوششوں کو بھلایا نہ جاسکے گا۔"

پروفیسر حسینی شاہد پرنسپل اردو کالج نے ڈاکٹر زورؔ کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی اور کہا کہ ڈاکٹر زورؔ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دکن میں شمال والوں کی مرعوبیت پر اُن کی ٹھیکے داری کا قلع قمع کیا "

پروفیسر عالم خوندمیری نے کہا کہ "ڈاکٹر زورؔ نے دکنی تہذیب کو نئی زندگی بخشی" ڈاکٹر غیاث صدیقی، جناب خیرات ندیم اور تاراچستی صاحب نے منظوم خراج عقیدت ادا کیا۔ جناب میر حسن کے شکریہ پر ادبی اجلاس برخواست ہوا۔

اسی رات ½۹ بجے ایوان اردو میں غیر طرحی محفل شعر جناب ہاشم علی صاحب ڈپٹی سکریٹری، حکومت آندھرا پردیش کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مشاعرہ کا آغاز ڈاکٹر زورؔ کے کلام کے ٹیپ ریکارڈ سے ہوا۔ مرزا شکور بیگ۔ بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر اختر احمد، ڈاکٹر غیاث صدیقی، خیرات ندیم، طالب رزاقی، ضیاء الدین احمد شکیب، وقار خلیل، خورشید مدبر، صلاح الدین نیر، فیض الحسن خیالؔ، داؤد نصیب، گیان سنگھ شاطر، تاراچستی، شمیم نصرتی، صمصام شیرازی، سراج حیدرآبادی، علی الدین نوید، فاضل ادیب، بصیر ابوالعلائی اور نعیم راہی نے کلام سنایا۔ محترمہ عائشہ رشاد معتمد مشاعرہ کے شکریہ پر محفل شعر اختتام کو پہنچی۔

ادارے کا ترجمان ماہنامہ سب رس

"ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" جنوری ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جنوری ۱۹۶۸ء سے یہ اپنی عمر کے اکتیسویں (۳۱) سال میں داخل ہو چکا ہے۔ اس طرح سب رس نے علم و ادب، تاریخ و تنقید، شعر و زبان کی تین دہائیوں کی سرحد عبور کر لی ہے۔ ادارہ کے بانی اور معتمد اول "سب رس" کے مؤسس اور نگراں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کی ادبی یادگار رہنے کا اعزاز بھی سب رس کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور کے بعد یہ رسالہ ملک کے نامور اور بزرگ ماہر تعلیم صدر ادارہ جناب پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی ادارت اور نگرانی میں ادارے کے قابل معتمد اعزازی پروفیسر مہندر راج صاحب سکسینہ صدر شعبہ نباتیات جامعہ عثمانیہ کے تعاون اور جناب محمد اکبر الدین صاحب صدیقی لکچرار اردو ایوننگ کالج کی معتمدی اور مجلس ادارت کے محترم اراکین جناب میر حسن ایم اے سابق اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو مدراس، جناب ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ریڈر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، ممتاز قانون داں جناب رمن راج سکسینہ ایڈوکیٹ اور جناب محمد منظور احمد صاحب ایم اے لکچرار اردو ایوننگ کالج کریم نگر کے تعاون عمل اور وقار خلیل منتظم انتظامی کے اشتراک سے "سب رس" ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۶۷ء میں سب رس نے اپنے پڑھنے والوں کو پورے بارہ (۱۲) شمارے دیئے، جن کے صفحات کی مجموعی تعداد (۵۹۰) ہوتی ہے۔

سب رس کو دکنی ادب سے متعلق مضامین اور تحقیقی مقالوں کی اشاعت میں شروع ہی سے امتیاز حاصل رہا ہے۔ ہند و پاک کی جامعات میں جہاں جہاں دکنیات پڑھائی جاتی ہے وہاں وہاں سب رس سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں ادارہ نمبر کے علاوہ دیگر پابندی سے شائع ہونے والے شماروں میں ادب، تحقیق، تنقید، شعر اور افسانے کے باب میں بہت سی معیاری تحریریں شائع ہوئیں، جنہیں دیگر معاصرین نے افادیت کے پیش نظر اپنے اخبارات و رسائل میں حوالے کے ساتھ ڈائجسٹ کیا ہے۔

ایک سال میں سب رس نے مختلف تحقیقی، تنقیدی، علمی اور شعری تحریریں شائع کیں، جن میں (۶۲) مضامین (۲۹) نظمیں (۱۷) غزلیں (۲) افسانے، ایک طنزیہ و مزاحیہ مضمون اور ایک ڈرامہ کے علاوہ (۶۴) نئی کتابوں اور (۲۲) رسالوں پر تبصرے وغیرہ شائع کئے۔ مضامین کی ایک جامع اور مکمل فہرست اور دیگر تفصیلات اگلے صفحات پر ریسرچ اسکالروں کے استفادہ کی غرض سے بصراحت پیش کی جا رہی ہے۔ (ادارہ)

فہرست مضامین مطبوعہ "سب رس" حیدرآباد دکن

جلد ۳۰ شمارہ ۱ تا ۱۲ — جنوری تا دسمبر ۱۹۶۷ء

نمبر	عنوان	مضمون نگار	اشاعت مہینہ
۲۷	ذوق جمال (ایک مطالعہ)	پروفیسر سلطان احمد صدیقی	مئی
۲۸	براہمی رسم الخط	ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی	جون
۲۹	دیوناگری رسم الخط	ڈاکٹر وی ایس اگروال	،،
۳۰	آصفجاہ اول و ثانی کی شعر و ادب کی سرپرستی	محمد اکبرالدین صدیقی	،،
۳۱	فن تذکرہ نویسی آغاز سے اختتام تک	زاہدہ ابوالحسن	،،
۳۲	امراؤ جان ادا	مصطفے کمال احمد	،،
۳۳	حکیم الدین احمد بحیثیت نقاد	طیب انصاری	،،
۳۴	ڈاکٹر محمد حسن فاروقی ممتاز ناول نگار	حسرت کاسگنجوی	،،
۳۵	عظیم آباد کی عظمت ادبی آئینہ میں	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	جولائی
۳۶	اُردو کا ایک قدیم لغت	سید خواجہ حسینی	،،
۳۷	اردو ناول نگاری پر ایک تنقیدی نظر	طیب انصاری	،،
۳۸	شمالی ہند کے ابتدائی نثری کارنامے	فرزانہ حمید	،،
۳۹	پشکن روس کا عظیم تر شاعر	مخمور جالندھری	،،
۴۰	مخدوم کی شاعری کا ابتدائی دور	داؤد اشرف	،،
۴۱	یہ دیار دکن (تاثرات)	علی جرار زیدی	اگسٹ
۴۲	معروضات (کلچرل ٹیپا)	وقار خلیل	،،
۴۳	ڈاکٹر اقبال اور سید سلیمان ندوی	ڈاکٹر سید یحییٰ احمد ہاشمی	ستمبر
۴۴	ناقد کے فرائض	ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی	،،
۴۵	ترقی پسند تحریک اور اس کا پس منظر	حسرت کاسگنجوی	،،
۴۶	تذکرہ گلستان زمانہ آزاد	اندر جیت ڈامر تسرک	ستمبر
۴۷	شاہان آصفیہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی	محی الدین حبیبی حافظ	،،
۴۸	مہدی نواز جنگ مرحوم	سید دلدار حسین	اکتوبر
۴۹	معاصر شعرا اقبال کی نظر میں	محمد عبداللہ قریشی	،،
۵۰	ذوق کا قصیدہ نگاری	فرزانہ حمید	،،
۵۱	عید آل ابراہیم نامہ کا مصنف	محمد جمال شریف	،،
۵۲	سرسید کے ادبی افکار	حاجی شمشیر انصاری	،،
۵۳	ادب کے زاویے سے تعمیر اخلاق	خواجہ غلام السیدین	نومبر
۵۴	ادبی تنقید میں نظریہ اظہاریت	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	،،
۵۵	دنیا کی بینباتی شعر اردو کی نظر میں	ڈاکٹر صفدر علی بیگ	،،
۵۶	آہ شاہد احمد دہلوی	حسرت کاسگنجوی	نومبر
۵۷	اردو نظم میں حالی کا مقام	سلیمان اطہر جاوید	،،
۵۸	یگانہ فن غالب	طیب انصاری	،،
۵۹	فیروز شاہ بہمنی	ڈاکٹر محمد جمال شریف	،،
۶۰	اردو شاعری کے مجدد حالی	ڈاکٹر گیان چند	ڈسمبر
۶۱	فارسی قصیدہ نگاری کے نقیب	محمد شکیل احمد صدیقی	،،
۶۲	مراثی انیس میں کردار نگاری	ڈاکٹر جعفر رضا	،،
۶۳	غبار خاطر۔ ادبی آئینہ میں	ڈاکٹر سید احتشام احمد	،،
۶۴	چند دکنی مرثیہ گو شعرا	وحید النساء	،،

نظمیں

"سب رس" جنوری تا دسمبر ۱۹۶۶ء میں جملہ انتیس ۲۹ نظمیں شائع ہوئیں۔ ذیل میں نظموں کے عنوانات اور شعراء صاحبان کے نام مندرج ہیں۔

(۱) تصویر از رشید انجم (۲) عزم از معلم بھٹکلی (۳) بھیگے خواب از قمر تابش (۴) نغمۂ عشق از رئیس انیس الیٹ/ از رجیت لال (۵) نرد ول شب از سروجنی نائیڈو / میر یسین علی خاں (۶) خوابوں کی رہگزر از یوسف خواہاں (۷) بھوک از رونق رکھنی سیمابی (۸) فکر و آگہی از وفا ملک پوری (۹) اندیشہ از محمد کیفیت (۱۰) پیاس از مخدوم کلکتوی (۱۱) کھوٹ از حسن فیاض (۱۲) گواہی از شاہد صدیقی لکھنؤی (۱۳) یہ کیا ہے؟ از دیپ بادل (۱۴) قطعات وفات حضور نظام و تخت نشینی آصف ثامن از عبدالقادر خان خسرو (۱۵) گولکنڈے کے سائے میں (غنائیہ) از خورشید احمد جامی (۱۶) روشنی کا شہر از صلاح الدین نیر (۱۷) بھاگ متی از پروفیسر جاوید وششٹ (۱۸) بھاگ متی از خورشید نذیر (۱۹) ترک تمنا از زبیدہ اختر (۲۰) حیات جاوداں از ساحل رشید (۲۱) قطعات از افلاق فتح پوری (۲۲) قطعات از انیس امام (۲۳) الوداع از وارث خواجہ معین الدین آرمت بدایونی (۲۴) تماشا از شہریت رضوی (۲۵) لمحۂ جاوداں از حمید احمد علی قادری (۲۶) آرزو کا سفر از شجاع قادر (۲۷) تیغ تسلسل از حمید رنایاب (۲۸) گیت از شہاب ممبرمی (۲۹) شہاب ثاقب از سہیل اختر

غزلیں

اس سال جملہ (۷۱) شعراء صاحبان کی غزلیں شائع ہوئیں اور بعض شعراء صاحبان کی ایک سے زیادہ غزلیں بھی اشاعت پذیر ہوئیں۔ ذیل میں شعراء کے نام نامی درج کئے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر سید اختر احمد، واحد پریمی، باقر منظور، محی الدین محمی، اکبر شاہ آبادی، سہیل اختر، عظیم آمبوری، یعقوب راہی، مظفر حنفی، سید حرمت الاکرام، گوہر رشک، ساحل ٹانک پوری، سلیمان اطہر جاوید، شارق ایچ پوری، عبدالمتین نیاز، راگھویندر راؤ جذب، عالمپوری، عنوان چشتی، انیس نقوی، شاکر جہ دلی، آذر بیابانی، ذہانت حسین عاصی، نیر پرواز، بیتاب کیلی، شیخ فرید، اختر حمیدی، قمر صدیقی، مرزا رہبر، صدیقہ کیفیت رضوانی، نم ساحری، فیض الحسن خیال، اقبال منہاس، عباس آزر، افتخار احمد قمر، آرزو رتی، محمد ضیاء الدین شکیب، ساجد اکبر الوار طہوری، حسن نجت، یوسف خواہاں، حسرت سہروردی، سیدو نایاب، ڈاکٹر دیو سنگھی، صلاح الدین نیر، اختر ہمیرپوری، رحمت فتحپوری، خورشید افسر بسوانی، تی۔ایم راہی، محمد نصیر الدین نصیر، اختر ثقفی، رونق کہنی سیمابی، تلوک چند محروم، ظفر بسوانی، حیات الیسی، جاوید شہیدی، حیرت بدایونی، نو منظر احمد علی جلیلی اور ہاشمی فتحپوری۔

افسانے

"سب رس" ۱۹۶۶ء کے دوران میں بارہ افسانے شائع ہوئے۔

(۱) جھوٹ از سہیل عرفان (۲) وہ رکشا والا از مالک حسنین

(۳) ایک کہانی از منور علی مہدی (۴) تعویذ از اندرجیت دت

طنز و مزاح

پر مشتمل ایک مضمون بعنوان "ایک کتاب کی رسم اجرا" از برق آشیانوی شائع ہوا۔ جو کئی رسائل میں ڈائجسٹ بھی ہوا

ڈرامہ

۱- عبدالرزاق لاری از موسیٰ کلیم یداللہی

تبصرے

سب رس نے ہمیشہ سیر حاصل اور معیاری تبصروں کو شائع کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں جملہ (۹۳) نئی مطبوعات پر اور (۲۲) رسائل و جرائد کے خاص نمبروں پر تبصرے شائع ہوئے۔ تبصرہ کرنے والوں میں پروفیسر جاوید وششٹ صدر شعبہ اردو دہلی کالج، جناب محمد اکبرالدین صدیقی ریڈر و صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی مولوی غلام رسول صاحب، پروفیسر مبارز الدین رفعت لکچرار مہارانی کالج میسور، ڈاکٹر محمد اسلام (لکھنؤ) جناب مرزا ظہیر نسر (آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد) وقار خلیل اور جناب طیب انصاری لکچرار گورنمنٹ کالج گلبرگہ (میسور) شامل ہیں۔

کتب

۱) مہر شاد نرائن آزر کی نظمیں مرتبہ- پریم پال اشک

۲. کتابیات (مجموعہ کلام) از ساجد رضوی

۳- فیض تحریر - مرتبہ مسعود حسین رضوی ادیب

۴- نثریات ماجد (حصہ اول) عبدالماجد دریابادی

۵- تلمیحات از محمود نیازی

۶- بزرگان لاہور از غلام دستگیر نامی

۷- تعلیم بیداری اور جمہوریت کا چیلنج از جان اے ٹی پال

۸- تین مسافر (سفرنامے) از ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی

۹- فہرست مخطوطات فارسی و عربی صولت لائبریری رامپور زبان انگریزی } مرتبہ امتیاز علی عرشی

۱۰- M-V-ANEN GINEARING WIZARD مرتبہ سید دلاور حسین

۱۱- شراب و ساقی (کلام) صابر جالندھری

۱۲- مولانا محمد احسن نانوتوی مولفہ محمد ایوب قادری

۱۳- چاند رات والی خالہ (حصہ سوم) مخلص بھوپالی

۱۴- ادھورے خاکے از شرف کمالی

۱۵- نوائے منیت از ڈاکٹر ظفر حمیدی

۱۶- انجمن آوازہ از ڈاکٹر اختر اورینوی

۱۷- ذوق جمال - از عنوان چشتی

۱۸- گنگا بہے نہ رات از کرشن چندر

۱۹- کائنات - ایک رباب (نظم) از سید حرمت الاکرام

۲۰- فن اور تنقید از انور کمال حسینی

۲۱- تعاقبات اردو از میر احمد علی خاں ادیب

۲۲- کمال اور زوال از طوسی ویدیسی / رہبر حسن

۲۳- ہم کہاں کے دانا تھے از پروفیسر محبوب بجرانی

۲۴- مکتوبات امام ربانی مولف سعید احمد نقشبندی

۲۵- راحت و جراحت (کلام) مرزا حسن بیگ سیمابی

۲۶- یادوں کے چراغ از صالحہ عابد حسین

٢٧۔ نقشِ قدم از جمیلہ خاتون
٢٨۔ سوانح حضرت تاج الدین شیر سوار مرتبہ عطاء اللہ علیاری
٢٩۔ رفیع صاحب کے مزار پر (نظم) جگن ناتھ آزاد
٣٠۔ دلی کی جامع مسجد از " " "
٣١۔ ماتم سالک از " " "
٣٢۔ اجنتا از " "
٣٣۔ شاعر کی آواز " از " "
٣٤۔ ذرا تشمیس از شاہ ولی اللہ دہلوی / اقبال احمد فاروقی
٣٥۔ آتھیلو از شکسپیر / سید سجاد ظہیر
٣٦۔ دبے پاؤں (کہانیاں) از اختر سلیمی
٣٧۔ اردو مثنوی کا ارتقاء از ڈاکٹر سید محمد عقیل
٣٨۔ ہانگ کانگ کی حسینہ از کرشن چندر
٣٩۔ خلش از امرتیہ پریتم
٤٠۔ بند گلی از ہنس راج رہبر
٤١۔ قصۂ چہار درویش از میر امن
٤٢۔ انگریزی کے عظیم ناول از سورن پنڈت
٤٣۔ میری سنو از خلیل جبران
٤٤۔ ١٩٦٦ء کی منتخب شاعری مرتبہ پرکاش پنڈت
٤٥۔ شرلیشمہ ہندی کہانیاں، نیلا کیلاش (امیٹھا)
٤٦۔ ببول کے پیڑ از گوپال متل
٤٧۔ سفرستان (کلام) ڈاکٹر نذر امام
٤٨۔ غبارِ خاطر از ابوالکلام آزاد
٤٩۔ محمد حسین آزاد کی رسمی کتابوں / مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی
سلسلہ ...

٥٠۔ رسوم دہلی - از سید احمد دہلوی
٥١۔ ملفوظات پیرس (اردو فارسی سندھی پنجابی) مرتبہ آغا نثار حسین
٥٢۔ شو بیزی از حاتم امین الدین
٥٣۔ اردو ادب میں عقیدہ کی اہمیت از قیوم صادق احمد پوری
٥٤۔ آتشیں از نسیم آروی
٥٥۔ نگار فکر از کریم اسدی
٥٦۔ گل گو (کلام) از واحد پریمی
٥٧۔ بے بات کی بات (انشائیے) سید نسیم چشتی
٥٨۔ جگر مراد آبادی احیات اور شاعری از ڈاکٹر محمد اسلام
٥٩۔ جگر معاصرین اور مخلصین کی نظر میں از " "
٦٠۔ نگارشات جگر " " "
٦١۔ جگر کے خطوط از " " "
٦٢۔ مختصر تاریخ غزل اردو از " " "
٦٣۔ بیسویں صدی کے چند اکابر غزل گو از " "

رسائل و جرائد کے خاص نمبر

سب رس میں معاصر رسائل و جرائد پر جو تبصرے شائع ہوئے۔ ذیل میں رسائل کے نام درج ہیں۔

١۔ ماہنامہ افکار کراچی (نئی تخلیق نمبر)
٢۔ ہفتہ وار "تمنا" کراچی
٣۔ ماہنامہ "روح ادب" ... کلکتہ
٤۔ " " تجلی" دیوبند (عامل عطاء اللہ نمبر)
٥۔ " خاتون دکن" حیدرآباد (سالنامہ ١٩٦٩ء)
٦۔ ماہنامہ "سیپ" کراچی۔

۷۔ ماہنامہ "نقوش" کراچی (افسانہ نمبر)
۸۔ سالنامہ "متاع" بہادر خاں کلینکل کالج حیدرآباد
۹۔ ماہنامہ "پیام تعلیم" دہلی (ذاکر حسین نمبر)
۱۰۔ " "گگن" بمبئی (اشاعت خاص)
۱۱۔ " "ادب لطیف" لاہور (سالنامہ)
۱۲۔ " شب رنگ الہ آباد
۱۳۔ سالنامہ "انوار" انوار العلوم کالج حیدرآباد
۱۴۔ سہ ماہی "اوراق" لاہور (سالنامہ)
۱۵۔ " "شیرازہ" سری نگر (ثقافت نمبر)
۱۶۔ ماہنامہ "صبا" حیدرآباد (مخدوم نمبر)
۱۷۔ " "پونم" حیدرآباد (طنز و مزاح کانفرنس نمبر)
۱۸۔ " "کتاب" لکھنؤ (سالنامہ)
۱۹۔ " "محفل" لاہور (" ")
۲۰۔ سہ ماہی تحریر دہلی
۲۱۔ سہ ماہی سیپ کراچی
۲۲۔ ماہنامہ "جائزہ" کراچی (افسانہ نمبر)
۲۳۔ مجلہ عثمانیہ حیدرآباد (مقالہ نمبر)
۲۴۔ سالنامہ "نوخیز" فوقانیہ نسوان مغلپورہ حیدرآباد

(بقیہ ۸۸ سے آگے) جو پہلے ریڈیو کے لئے لکھے گئے، سننے والوں کی فرمائش پر بار بار پیش کئے گئے اور جن میں سے اکثر اسٹیج بھی کئے جا چکے ہیں۔

آج جبکہ اچھے ڈراموں کا اردو زبان میں فقدان ہے، ادارہ ادبیات اردو قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ڈراموں کا یہ خوبصورت اور دلکش مجموعہ شائع کیا۔

جناب میر حسن نے اس کتاب کا تعارف لکھا ہے بقول جناب میر حسن "اظہر افسر کلی ہند معیاری زبان لکھتے ہیں صحیح قومی جذبہ رکھتے ہیں، مفید مطلب معلومات کی کارگزاری اشاعت کے گر سے یہ خوب واقف ہیں۔ اسلئے ریڈیو کے لئے لکھنے والوں کی صف اول میں نظر آتے ہیں۔

غرض "سانولی" ہمارے ڈرامائی ادب میں ایک اچھا اور قابل قدر اضافہ ہے، ناشر ادارہ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد ۸۲ سے طلب کیجا سکتی ہے

بشکریہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد

(۱۳ مارچ ۱۹۶۷ء)

سب رس (ادارہ نمبر)

حیدرآباد کے ادارۂ ادبیات اردو کی کارگزاری پر نظر پڑتی ہے تو طبیعت خوش ہوتی ہے اور دل کو راحت ملتی ہے ادارہ ادبیات اردو یا ادارہ اردو زبان اور ادب کے سلسلے میں بڑی خدمات انجام دے رہا ہے "سب رس" کے ادارہ نمبر کے ذریعہ ان تمام کاموں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے جو ادارے نے ۱۹۶۶ء انجام دیئے ہیں کہ اس ادارہ کا کتب خانہ اور دارالمطالعہ علمی ادبی اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے کافی مددگار ثابت ہوتا ہے (مطبوعہ ماہنامہ گگن بمبئی بابتہ نومبر ۱۹۶۶ء)

سب رس میں تبصرے کیلئے

دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

بعد تبصرہ یہ کتابیں

ادارہ کے کتب خانہ میں اردو والوں کے استفادہ کیلئے محفوظ کیجاتی ہیں۔

"سب رس" کے تبادلے میں آنے والے رسائل و جرائد کی تفصیلات

مندرجہ ذیل رسائل و جرائد ایوان اردو کے دارالمطالعہ عام میں قارئین کے مطالعہ کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک رسائل و جرائد کو چھوڑ کر باقی "سب رس" کے تبادلے میں آتے ہیں جن کی مجموعی تعداد (۱۰۱) ہے اور بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ) "ہندوستان کے کسی دارالمطالعہ میں، میں نے اسقدر تعداد میں معیاری رسائل و جرائد یکجا نہیں دیکھے۔ اس طرح ایوان اردو کا دارالمطالعہ اردو دنیا کا پہلا معیاری اور وسیع مطالعہ خانہ ہے۔"

ہم ان تمام ہند و پاک اور بیرون ہند کے مدیران جرائد کے ممنون ہیں جو پابندی کے ساتھ "سب رس" کے تبادلے میں اپنے رسائل و جرائد ارسال فرماتے ہیں، امید ہے کہ یہ تعاون مستقلاً برقرار رہے گا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ختم سال پر ایسے تمام رسائل و جرائد کی اچھی اور پائیدار جلدیں بنوائی جاتی ہیں۔ اور انہیں ادارے کے کتب خانہ میں درج رجسٹر کرکے استفادہ کے لئے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اور ہر دوسرے یا تیسرے سال ادارے کے کتب خانے کی کتابوں اور رسالوں کی ایک باضابطہ ضخیم فن واری فہرست اشاریہ کے ساتھ شائع کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اب تک فہرست کتب خانہ ادارہ کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور اب چوتھی جلد زیر ترتیب ہے۔ ادارے کے کتب خانے میں بے شمار اہم اور تاریخی کتب اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ کئی اہم رسائل و جرائد کی فائلیں بھی محفوظ ہیں،

۱۸۵۷ء سے پہلے اور اب تک کے نادر علمی اور ادبی ذخیرہ کے حامل اس کتب خانے سے آئے دن ادب دوست احباب اور ریسرچ اسکالرس صاحبان ہر روز ۱۱ تا ۵ ساعت استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ جمعہ کو ایوان اردو کے دفاتر بند رہتے ہیں۔

اس افادی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے قارئین اور ادب دوستوں کے ساتھ ساتھ مدیران رسائل و جرائد سے خواہش کریں گے کہ وہ اس قسم کے ریکارڈ کی فراہمی اور یکجائی میں ہم سے بھرپور تعاون فرمائیں اور جب کبھی نیا یا پرانا ادبی ذخیرہ، قدیم و جدید کتب و رسائل چھاپنا یا نکالنا چاہیں تو براہ کرم تحفۃً مرحمت فرمائیں جو معطی کے شکریہ کے ساتھ کتب خانے میں داخل کرلئے جائیں گے اور فہرست کتب خانہ میں معطی کے اسم گرامی کے ساتھ درج بھی ہوگا۔

امید ہے کہ معاصرین اور دیگر ادب دوست احباب اور مختلف علمی و ادبی تنظیموں کے سربراہ ہم سے تعاون عمل کرکے ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے۔

(ادارہ)

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زر سالانہ
		(سالانہ)			
۱	ادبیات	شعبۂ اردو، جموں وکشمیر یونیورسٹی (سری نگر، کشمیر)	عبدالقادر سروری	۲۰۰	۰۰
۲	انوار	انوار العلوم کالج، لے پلی، حیدرآباد دکن	ڈاکٹر خالدہ بیگم	۶۴	۰۰
۳	جرنل آف ریسرچ (انگریزی)	پنجاب اگریکلچرل یونیورسٹی (لدھیانہ)	برکت سنگھ	۱۰۰	۸۰۰
۴	جیوتسنا (لسانی)	شعبۂ اردو ایس، آر، آر، گورنمنٹ کالج کریمنگر (اے - پی)	محمد منظور احمد ایم اے	۸۰	۰۰۰
۵	شب تاب (سالانہ)	شعبۂ اردو، ایوننگ کالج، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	...	۱۲۶	۰۰۰
۶	صریر خامہ	سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد سندھ (پاکستان)	سید سخی احمد ہاشمی	۲۷۰	۰۰۰
۷	صناع	نظام اینڈ علاء الدین پالیٹیکنیکل کالج، تلک روڈ، حیدرآباد	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن	۱۲۰	۰۰۰
۸	قدیم اردو	شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد	پروفیسر مسعود حسین خاں	۳۰۰	۱۳۰۰
۹	مجلہ عثمانیہ (انتخاب)	" " "	زاہدہ ابوالحسن	۳۰۸	۵۳۰۰
۱۰	مشعل (دو لسانی)	حیدرآباد سائنس کالج حیدرآباد	—	۸۰	۰۰
۱۱	نظام ادب	شعبۂ اردو، نظام کالج، توپ کا سانچہ حیدرآباد	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	۱۰۰	۰۰
۱۲	تصنیف (چار لسانی)	ملٹی پرپز ہائی اسکول، ناپلی، حیدرآباد	رکن الدین ارشد	۱۵۰	۰۰۰
۱۳	نوخیز	مدرسہ فوقانیہ نسواں، نیلوفر، حیدرآباد	رضی الدین معظم	۸۰	۰۰۰
۱۴	سوسائٹی میگزین (لسانی)	ایس۔ آر۔ آر، گورنمنٹ آرٹس کالج، کریمنگر (اے، پی)	محمد عبدالغفار برقی	۸۰	۰۰۰
		سہ ماہی			
۱۵	اردو	انجمن ترقی اردو۔ ۱/۱ ے اردو روڈ۔ کراچی ۱	جمیل الدین عالی	۲۰۰	۱۰۰۰
۱۶	اردو نامہ	ترقی اردو بورڈ، اردو منزل، جمشید روڈ کراچی ۵	شان الحق حقی	۱۴۰	۴۰۰
۱۷	اوراق	چوک، اردو بازار، لاہور (پاکستان)	وزیر آغا	۳۲۰	۹۰۰
۱۸	اقبال ریویو (اردو)	اقبال اکیڈیمی ۲۳/۶ D بلاک ۶، پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹	بی، اے، ڈار	۱۴۲	۱۲ "
۱۹	" " (انگریزی)	" " " "	"	۱۶۶	" "
۲۰	امریکن ریپورٹر ریویو (انگریزی)	بہاول پور ہاؤس۔ سکندرا روڈ نئی دہلی ۱	آر۔ آر۔ بروکس	۹۴	۶۰۰

		سہ ماہی			
۲۱	امریکن ریویو (انگریزی)	بہادل پور ہاؤس سکندر روڈ نئی دہلی	آر۔ آر۔ بروکس	۱۱۶	۶۰۰۰
۲۲	بصائر	۳۰۔ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵	ڈاکٹر معین الحق	۱۹۲	۱۰۰۰
۲۳	پرابلم آف کمیونزم (انگریزی)	یو۔ ایس انفارمیشن ایجنسی، واشنگٹن ڈی۔ سی،	ابرام برم برگ	۷۶	—
۲۴	جسم و ذہن	مراد پور، پٹنہ۔ ۳ (بہار)	ڈاکٹر نذر امام	۹۶	۴۰۰
۲۵	سیپ	حلقۂ فکر نو، گارڈن آفیسرس، مراد خان روڈ، کراچی ۵	نسیم درانی	۲۵۰	۸۰۰
۲۶	شاخسار	بخشی بازار۔ کٹک (اڑیسہ)	امجد نجمی	۱۴۰	۳۰۰
۲۷	پیام دلی	محکمۂ تعلقات عامہ۔ اولڈ سکریٹریٹ دہلی ۶	گوپی ناتھ امن	۸۰	۳۰۰۰
۲۸	صحیفہ	مجلس ترقی ادب ۲۰، نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور	ڈاکٹر وحید قریشی	۱۱۰	۶۰۰
۲۹	نوائے ادب	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۸۰ نیفر ڈر روڈ۔ بمبئی	نجیب اشرف ندوی	۹۴	۲۰۰
۳۰	محب ہند	ریمن بازار، حیدر آباد ۶۳	عبدالغفار رفیق	۱۲	۲۰۰
۳۱	یونسکو نیوز لیٹر	یونسکو ٹیکنیکل سنٹر ۸/A ۲ پی، ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹	—	۲۸	۰۰
۳۲	یونسکو کرانیکل (انگریزی)	یونسکو ہاؤس پیرس	ناظم یونسکو		
		دو ماہی			
۳۳	ادبی تبصرے	انجم لاج۔ سلطان محل۔ دہلی	ڈاکٹر خلیق انجم	۴۸	۳۰۰
۳۴	تحریر	علمی مجلس۔ ۱۳۲۹۔ چھتہ نواب صاحب فراش خانہ دہلی	مالک رام	۲۵۰	۱۲۰۰
۳۵	شیرازہ	جموں، کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجیز سری نگر	محمد یوسف ٹینگ	۱۱۰	۱۰۰۰
		(ماہنامے)			
۳۶	آندھرا پردیش	جن سمبندھ شاکھا۔ کرم جاہی روڈ حیدر آباد	کنول پرشاد کنول	۴۸	۴۰۰۰
۳۷	آئندہ	روڈ ۱۳۔ آزاد نگر۔ مانگو، جمشید پور (بھارت)	سہیل واسطی	۸۰	۱۰۰۰
۳۸	آئینہ	شاہ عالم گیٹ۔ لاہور، ۲۷ (پاکستان)	محمد امین شرقپوری	۹۶	۷۰۰۰
۳۹	ادب لطیف	سرکلر روڈ لاہور (〃)	ناصر زیدی	۸۰	۶۰۰۰
۴۰	ادبی دنیا	مال روڈ۔ لاہور	محمد عبداللہ قریشی	۸۰	۹۰۰
۴۱	ارشاد	دار الارشاد۔ مغلپورہ حیدر آباد ۲ (اے۔ پی)	پیرزادہ جاوید قادری	۴۸	۵۰۰۰

۴۲	اسپان (انگریزی)	بہاولپور ہاؤس سکندرا روڈ نئی دہلی	ڈی۔ کے۔ براؤن	۵۸	۵۰۰
۴۳	اسرار حکمت	۱۰/A پیر مکی شریف۔ لاہور (پاکستان)	حکیم نور محمد چوہان	۳۲	۴۰۰
۴۴	اشارہ	صادق پور سرائے، پٹنہ (بہار)	قیوم خضر	۴۸	۹۰۰۰
۴۵	افکار	مکتبۂ افکار، رابسن روڈ۔ کراچی	صہبا لکھنوی	۱۰۴	۱۲۰۰
۴۶	البلاغ	دار العلوم۔ کراچی ۱۴ (پاکستان)	محمد تقی عثمانی	۶۴	۶۰۰
۴۷	الحق	۳۹۷-۱-۱۴ روبرو گیان باغ سینما امام باغ۔ حیدرآباد دکن	محمد انور حسن النعمانی	۴۸	حسب استطاعت
۴۸	الشجاع	ٹائمز پریس۔ صدر، کراچی (پاکستان)	سلمان الارشد	۷۴	۲۰۰۰
۴۹	التقدیر	صاف منظر، چھاؤنی نادر علی بیگ، حیدرآباد ۲۴ (بھارت)	احمد اللہ قدیری	۴	۹۰۰۰
۵۰	النفرشی	۱۱-۴-۱۵۷ چوراہا جنسی۔ حیدرآباد ۲ (اے۔ پی)	محمد ابراہیم مدنی	۱۶	۵۰۰۰
۵۱	المعرفۃ	سنٹر طبیب، حیدرآباد سندھ پاکستان	حشمت علی حماد	۶۴	۶۰۰
۵۲	امریکن لیبر ریویو (انگریزی)	چانکیہ پوری۔ شانتی پتھ، نئی دہلی ۱۲	پی ایچ، ہلین	۲۲	۱۰۰۰
۵۳	انڈین لٹریچر (انگریزی)	۲/A رام نگر نئی دہلی ۱	لکشمن شاستری	۳۲	۶۰۰۰
۵۴	انجمن اسلامیہ میگزین	۸۵ الف۔ کوچین والا مارکٹ کراچی ۲	انتظام اللہ شہابی	۶۴	۵۰۰
۵۵	بانو	آصف علی روڈ، اجمیری گیٹ۔ نئی دہلی	بیگم زینت کوثر دہلوی	۶۴	۱۰۰۰
۵۶	بچوں کی دنیا	شاہ عالم گیٹ۔ لاہور ۲ (پاکستان)	محمد امین شرقپوری	۴۸	۴۰۰
۵۷	برہان	جامع مسجد، اردو بازار، دہلی	سعید احمد اکبرآبادی	۶۰	۶۰۰
۵۸	بلٹن (انگریزی)	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈی (راشٹرپتی نواس) شملہ	کے۔ وینکٹ رامن	۲۰	...
۵۹	بیسویں صدی	انصاری مارکٹ دریا گنج، دہلی	خوشتر گرامی	۱۲۰	۸۰۰
۶۰	پگڈنڈی	ادبستان اردو، لال بازار، امرت سر پنجاب	[illegible] رگیتا آنند	۴۰	۶۰۰
۶۱	پونم	۳۰۱-۷-۶ اعظم پورہ۔ حیدرآباد (اے۔ پی)	ناصر کرنولی	۶۴	۱۰۰۸
۶۲	پیام تعلیم	جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵	محمد حسین حسان	۷۲	۵۰۰
۶۳	تجلی	دیوبند۔ ضلع سہارنپور (اترپردیش)	عامر عثمانی	۷۲	۷۰۸
۶۴	تحریک	۹۔ انصاری مارکٹ۔ دریا گنج دہلی ۶	گوپال متل	۶۰	۸۰۸

۶۵	تیرانسانیت	موچی دروازہ، لاہور (پاکستان)	عبدالحمید	۴۸	۸-۵
۶۶	شانتی	۱۰، گوتم بدھ مارگ - لکھنؤ (اترپردیش)	فیض علی نوشہ	۴۸	۴،۵۰
۶۷	ثقافت	ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور	شاہد حسین رزاقی	۶۲	۲،۰۰
۶۸	جاسوسی پنجہ	پنجابی پستک بھنڈار دریبہ کلاں دہلی ۶	ڈی۔ دہلوی	۱۲۰	۸،۰۰
۶۹	تبصرہ	بیرون دہلی دروازہ - لاہور	جانباز مرزا	۳۸	۹،۰۰
۷۰	جامعہ	جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵	ضیاء الحسن فاروقی	۴۸	۶،۰۰
۷۱	جاں نثار	۸۹، سبھاش نگر، کھڑہ شیر سنگھ، امرتسر پنجاب	میلارام وفا	۵۶	۱۰،۰۰
۷۲	جائزہ	۶، حجاز ہوٹل، گرانٹ روڈ کراچی	وسیم فاضلی	۱۴۴	۱۲،۰۰
۷۳	جدوجہد	ریلوے روڈ، لاہور	حامد امرتسری	۳۴	۴۰،۰۰
۷۴	جستجو	اندرون پنج محلہ - حیدرآباد ۲	سید عبداللہ	۲۲	۴،۰۰
۷۵	جمالستان	۳۹۴ - بازار، بیٹیا محل - دہلی ۶	نجم صدیقی	۶۴	۶،۰۰
۷۶	جھرنا	شیرین، منشیس لمرٹ لین - سری نگر - (کشمیر)	نثیر فرخ	۸۰	۶،۰۰
۷۷	چائنا ری کنسٹرکٹس (انگریزی)	عوامی جمہوریہ چین، پیکنگ	-	۸۴	۴،۰۰
۷۸	حریم	نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ (یو۔پی)	نسیم انہونوی	۴۸	۷،۰۰
۷۹	حامی	حامی منزل - پنجہ شاہ حیدرآباد ۲ (اے۔پی)	حمیدالدین عاقل	۶۴	۸،۰۰
۸۰	حنفی	کوچہ زینگراں، موچی دروازہ، لاہور	صوفی غلام غوث خان	۳۲	۳،۰۰
۸۱	خاتون دکن	22-3-329 گڑکی باؤلی، حیدرآباد ۲	صالحہ الطاف	۴۸	۶،۰۰
۸۲	خالقیہ	انجمن خالقیہ، بلاک نمبر ۱، سرگودھا (پاکستان)	تاثیر مرزا	۴۸	۵،۰۰
۸۳	دوام	ٹانڈہ ضلع فیض آباد (اترپردیش)	مختار احمد مظاہری	۶۴	۷،۰۰
۸۴	دی انڈین مارکسسٹ (انگریزی)	ایس / ۱۹، گریٹر کیلاش نئی دہلی	چھاجو رام	۴۸	۵،۰۰
۸۵	" " (ہندی)	" " "	"	"	" "
۸۶	روح ادب	۱۴- رفیع احمد قدوائی روڈ، کلکتہ ۱۳	نظام الحسینی	۱۳۲	۱۴،۰۰
۸۷	زاویے	کہکشاں - پکھا پیر - حیدرآباد سندھ (پاکستان)	حسن ظہیر	۸۰	۸،۰۰

۸۸	ساقی	پی آئی، بی، کالونی - کراچی نمبر ۵	عاصمہ بیگم شاہد احمد	۶۴	۱۰ ۰۰
۸۹	ساہتیہ اکیڈمی نیوز لیٹر جنرل	راجندر بھون نئی دہلی	پی، ماچوے	۴	۱= ۰۰
۹۰	شمع اسپورٹس میگزین	نزد کریم ہوٹل، جامع مسجد دہلی ۶	علیم الدین	۴۸	۶= ۰۰
۹۱	سروج	صدر بازار - دہلی نمبر ۶	سیفی پریمی	۴۸	۶= ۰۰
۹۲	سوز	۲۸ - مدن موہن برمن اسٹریٹ کلکتہ نمبر ۷	سوز سکندر پوری	۳۲	۵= ۰۰
۹۳	سوویت لٹریچر (انگریزی)	۹/۱۱ روبروسووا اسٹریٹ ماسکو (یو ایس ایس آر)	ورسلیوا ازیلو	۲۰۴	----
۹۴	سلسبیل	ادارۂ تصوف، اردو بازار - لاہور	محمد اقبال	۶۴	۷= ۰۰
۹۵	سہیل	پاری روڈ گیا (بہار)	ادریس سنہاروی	۳۲	۴= ۰۰
۹۶	سیارہ	مکتبہ سیارہ - ۶ پی، زیلدار پارک اچھرہ لاہور	نعیم صدیقی	۸۲	۱۰= ۰۰
۹۷	شاعر	مکتبۂ قصر الادب، پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۸ - (جی-آر)	اعجاز صدیقی	۸۰	۸= ۰۰
۹۸	شان ہند	۸- انصاری مارکٹ - دریا گنج دہلی ۶	سرور تونسوی	۴۰	۶= ۰۰
۹۹	شاہکار	۱۳۴ - بخشی بازار - الہ آباد ۳ (یو- پی)	محمود احمد ہنر	۱۲۰	۱۰- ۰۰
۱۰۰	شب خون	۳۱۳ - رانی منڈی - الہ آباد ۳ (یو- پی)	ڈاکٹر اعجاز حسین	۸۰	۱۰= ۰۰
۱۰۱	شب رنگ	۶۳ - زیرو روڈ - الہ آباد (یو- پی)	ڈاکٹر سید محمد عقیل	۸۰	۱۰= ۰۰
۱۰۲	شجر	جنتا لائبریری - چوک - برہان پور (ایم، پی)	اندرسین اثر	۴۸	۷- ۰۰
۱۰۳	شمع	آصف علی روڈ - اجمیری گیٹ - نئی دہلی	یوسف دہلوی	۱۲۶	۱۲ - ۵۰
۱۰۴	شبستاں	۸۴۸ - دریاباد - الہ آباد - ۳ (یو - پی)	اطہر علی فاروقی	۸۰	۱۳= ۰۰
۱۰۵	صبا	۱۷، مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد	سلیمان اریب	۹۶	۱۰= ۰۰
۱۰۶	صبح	انجمن ترقی اردو، علی منزل کوچہ پنڈت - دہلی	عبداللطیف اعظمی	۸۰	۸= ۰۰
۱۰۷	صبح امید	بلاسیس روڈ - بمبئی ۸	عبدالحمید بوہرے	۴۸	۶= ۰۰
۱۰۸	صبح نو	قطب الدین لین - پٹنہ - نمبر ۴ (بہار)	وفا ملکپوری	۴۰	۷= ۰۰
۱۰۹	طبیبہ کالج میگزین	۱۱۹- ملتان روڈ - لاہور (پاکستان)	عبدالباسط چشتی	۳۲	۴= ۰۰
۱۱۰	عارف	بل روڈ - لاہور - ، (پاکستان)	عبدالرحمٰن شوق	۴۸	۴= ۰۰

۱۱۱	فاران	کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی (پاکستان)	ماہر القادری	۶۴	۷-۰۰
۱۱۲	فارن افیرس ریکارڈ (انگریزی)	وزارت خارجہ حکومت ہند (شعبۂ تشہیر) دہلی	-	۹۴	-
۱۱۳	فروغ اردو	۷-۳ امین آباد پارک لکھنو (یو، پی)	پروفیسر احتشام حسین	۴۸	۴-۰۰
۱۱۴	فکر و خیال	پی، آر، ٹی، بی، سی، ایچ، کراچی ۲۹ پاکستان	شمیم جاوید	۸۸	۶-۰۰
۱۱۵	فیض الاسلام	اقبال روڈ۔ راول پنڈی (پاکستان)	غلام قادر غبار	۶۴	۵-۰۰
۱۱۶	قومی زبان	انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ کراچی ۱	مشفق خواجہ	۹۶	۱۰=۰۰
۱۱۸	کتاب	چوک۔ لکھنو ۳ (اُتر پردیش)	عابد سہیل	۸۰	۱۰=۰۰
۱۱۹	کتاب نما	مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵	ریحان احمد عباسی	۳۲	۲=۰۰
۱۲۰	کتابی دنیا	گیدول لیکھراج روڈ۔ کراچی ۱ (پاکستان)	ضیاء الدین احمد برنی	۳۲	۲=۰۰
۱۲۱	کشاف	اسٹیٹ ہیڈ کوارٹرس۔ دول گڑھ۔ حیدرآباد ۲	دستگیر عزمی	۲۲	۵=۰۰
۱۲۲	کلیان	نسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنو (یو، پی)	شمیم انہونوی	۵۰	۴-۰۰
۱۲۳	کھلونا	آصف علی روڈ نئی دہلی ۱	الیاس دہلوی	۵۸	۸=۰۰
۱۲۴	گلن	۴- الانا مینشن A/۱۹ ڈاکٹر آنندراؤ نائر روڈ بمبئی ۱۱ بی۔سی	شمس کنول	۶۶	۸=۰۰
۱۲۵	گل خندان	کشمیری بازار۔ لاہور ۸ (پاکستان)	عبدالرؤف ملک	۴۸	۴-۰۰
۱۲۶	گھریلو علاج	سدی عنبر بازار، حیدرآباد، ۱۳ (اے۔ پی)	ڈاکٹر جھیانند	۳۲	۳-۰۰
۱۲۷	ماہ نو	۲۔ روہتک روڈ۔ نئی دہلی ۵	نریندر سیٹھی	۶۴	۱۲=۰۰
۱۲۸	ماہ نو	ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی	شان الحق حقی	۸۰	۶=۰۰
۱۲۹	مجرم	آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۱	الیاس دہلوی	۱۶۰	۱۵=۰۰
۱۳۰	محفل	رائل پارک۔ لاہور (پاکستان)	طفیل ہوشیارپوری	۶۰	۹=۰۰
۱۳۱	مزاح	۱۔ ابراہیم پورہ اسٹریٹ، بھوپال ۱ (ایم، پی)	عیسیٰ صدیقی	۸۰	۱۲=۰۰
۱۳۲	معارف	دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ (یو۔ پی)	معین الدین احمد ندوی	۶۴	۸=۰۰
۱۳۳	نقش	کاشانۂ اردو۔ پوسٹ بکس ۳۰۲ کراچی ۱	شمس زبیری	۱۶۰	۱۵=۰۰
۱۳۴	منادی	درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء۔ نئی دہلی ۱۳	حسن ثانی نظامی	۴۸	۴=۰۰

۱۳۵	نیرنگ خیال	۱۳ - B لیاقت روڈ - راول پنڈی (پاکستان)	حکیم یوسف حسن	۸۰	۱۰=۰۰
۱۳۶	ہمایون	۲۴/E کملانگر - دہلی نمبر ۷	تاجور سامری	۸۰	۱۰-۰۰
		پندرہ روزہ			
۱۳۷	امریکن لیبر ریویو (انگریزی)	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس - سکندرا روڈ نئی دہلی ۱	موریس دیانبر	۲۸	۰=۰۰
۱۳۸	العرب (انگریزی)	۲۷ - سردار پٹیل روڈ - نئی دہلی ۱	محمود مہی	۱۶	۱=۰۰
۱۳۹	ترقی اردو	انجمن ترقی اردو - اردو ہال - حمایت نگر حیدرآباد	ڈاکٹر حبیبی ملتاحد	۱۰	۴=۰۰
۱۴۰	خون ناب	۱۰ - پولیس کوارٹرس شانتی نگر - حیدرآباد ۲۸ (اے پی)	عالیہ عروج	۱۲	۶=۰۰
۱۴۱	سرپنچ	نسیم بکڈپو - لاٹوش روڈ - لکھنؤ	شمیم انہونوی	۸	۴=۰۰
۱۴۲	سواد اعظم	موچی دروازہ - لال کھوہ - لاہور -	حکیم غلام معین الدین	۸	۶=۰۰
۱۴۳	سوویت دیس (اردو)	۲۵ - بارہ کھمبا روڈ - نئی دہلی	جمیل اختر	۴۸	۶-۰۰
۱۴۴	صراط (انگریزی)	۴۰۰ ۱۸ - کلاں محل - دہلی ۶	محمد غالب فدائی	۸	۷.۵۰
۱۴۵	کاکل	۱۰۸ - A - معظم پورہ - حیدرآباد (اے - پی)	احمد جلیس	۸	۳-۰۰
۱۴۶	نغمۂ حیات	کالاڈیرہ، حیدرآباد - ۲۶ (اے، پی)	انور کمال خوندمیری	۶	۴-۰۰
۱۴۷	علمی دنیا	نامپلی روڈ - حیدرآباد (اے، پی)	عثمان شیدا	۱۲	۶-۰۰
۱۴۸	ہمدرد	ہمدرد منزل - لال کنواں - دہلی	حکیم عبدالحمید دہلوی	۸	۲-۵۰
		ہفت روزہ			
۱۴۹	آندھرا پنچ	ادپل کلاں - حیدرآباد - ۱۳ (اے - پی)	ملک محمد علیخان	۸	۴-۰۰
۱۵۰	انتخاب	۸ ۲۱۹/۳ لیاقت آباد کراچی (پاکستان)	حافظ بشیر احمد	۲۰	۱۵-۰۰
۱۵۱	امریکن رپورٹر (انگریزی)	بہاولپور ہاؤس سکندرا روڈ نئی دہلی ۱	ڈونالڈ برومن	۸	۱-۰۰
۱۵۲	〃 〃 تلگو	〃	〃	〃	〃
۱۵۳	الیشیاء	اردو بازار - دہلی	ہزارا ئن	۱۲	۹-۰۰
۱۵۴	پرجا	اعظم روڈ - نظام آباد (آندھرا پردیش)	عابد انصاری	۸	۶-۰۰
۱۵۵	ترجمان حیات	۲/۳ ۲۳ ۵ - ۲ - ۲۲ قدیر بلڈنگ سری منزل - دبیرپورہ روڈ حیدرآباد ۲۴	محمد وحیدالدین سلیم	۸	۱۲-۰۰

۱۵۶	ترجمان سرحد	پشاور (مشرقی پاکستان)	امیر عالم اعوانی	۸	۶-۰۰
۱۵۷	تعمیر	کالج روڈ - محبوب نگر (آندھرا پردیش)	محمد عبد العزیز	۸	۱۲-۰۰
۱۵۸	خبرنامہ اردو	پریس بیورو عرب ری پبلک سفارت خانہ دہلی	—	۸	—
۱۵۹	رضائے مصطفےٰ	چوک، دارالسلام - گوجرانوالہ (پاکستان)	حفیظ بنارسی	۱۲	۶-۰۰
۱۶۰	ذوالقرنین	نظامی پریس - بدایوں (اترپردیش)	وحید الدین نظامی	۸	۶-۰۰
۱۶۱	سوویت جائزہ	تاس، ۲۵ بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	احمد منظم	۳۲	۳-۰۰
۱۶۱	شعور	بزنیہ غشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد - ۲۹ (اے، پی)	رحیم قریشی	۱۲	۸-۰۰
۱۶۳	عکاس	۵ - لورجیت پور روڈ - کلکتہ ۱	شہزادہ سلیم	۸	۸-۰۰
۱۶۴	فارم نیوز لیٹر (انگریزی)	وزارت اغذیہ وزارت حکومت ہند - دہلی	—	۸	برائے صحافت
۱۶۵	قومی محاذ	جونا بازار - اورنگ آباد - (مہاراشٹرا)	اثر فاروقی	۸	۱-۰۰
۱۶۶	نیوز فرام رومانیہ	سفارت خانہ عوامی جمہوریہ رومانیہ ۸۲ گالف لنک روڈ نئی دہلی	—	۱۲	برائے صحافت
۱۶۷	نیا آدم	۱۰۳ - جامباغ روڈ - حیدرآباد (۱) آندھرا پردیش	امجد باغی	۱۲	-۰۰
۱۶۸	مورچہ	بیراگی - گیا (بہار)	پروفیسر کلام حیدری	۱۲	۶-۰۰
۱۶۹	مکت دھارا (ہندی)	E 126 بھگت سنگھ مارکٹ نئی دہلی ۱	نریندر شرما	۲۲	۱۲-۰۰
۱۷۰	نیا آپ	۲۰ - بازار لین - راجندر نگر - نئی دہلی ۵	سودیش کمار	۱۲	۶-۵۰
۱۷۱	ہماری زبان	انجمن ترقی اردو ہند - علی گڑھ یو پی	پروفیسر آل احمد سرور	۱۲	۵-۰۰

دو روزہ

۱۷۲	آج کا امریکہ	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس - دہلی	...	۸	برائے صحافت
۱۷۳	خبریں اور رائیں	پریس انفارمیشن بیورو حکومت ہند - دہلی		۱۲	"
۱۷۴	پریس ریلیز (اردو)	تاس - ۲۵ بارہ کھمبا روڈ - پوسٹ بکس (۲۴) دہلی	—	۱۲	"
۱۷۵	سوویت یونین کی خبریں	تاس، ۲۵، بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	...	۱۲	"
۱۷۶	سوویت فیچر	" " "	...	۱۲	"
۱۷۷	افکار و جائزے	" " "	...	۱۲	"

۱۷۸	میڈیکل نیوز (اردو)	یونائیٹیڈ انفارمیشن سروسیس دہلی	...	۱۲	بلا معاوضہ
		روزنامے			
۱۷۹	خدمت	دی پنڈ۔ سری نگر ۔ کشمیر	پی۔ین' وزل	۴	۲۴-۰۰
۱۸۰	رہنمائے دکن	افضل گنج، حیدرآباد دکن (اے۔پی)	محمد منظور حسن	۸	۴۵-۰۰
۱۸۱	سیاست	جواہرلال نہرو روڈ حیدرآباد (اے' پی)	عابد علیخان	۸	۴۵-۰۰

۱۹۶۷ء میں ادارہ ادبیات اردو کی مطبوعات

نمبر	نام کتاب	مرتب مصنف	موضوع	صفحات	سائز	قیمت
۱	ادارہ سن ۱۹۶۶ء میں	دفتر خلیل	تذکرہ	۹۴	½ کراؤن	۱-۰۰
۲	برف بھی آگ	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	افسانے	۱۶۰	1/16 کراؤن	۲-۰۰
۳	سب رس (ادارہ نمبر)	مجلس ادارت سب رس	"	۶۴	"	-۵۰
	زیر طبع و منظورہ کتابیں					
۱	سراج سخن (طبع دوم)	پروفیسر عبدالقادر سروری	انتخاب کلام	-	1/16 کراؤن	
۲	بلاغت (")	ڈاکٹر قاری کلیم اللہ حسینی	ادب	•	"	
۳	غزال رعنا (انتخاب کلام)					
	محمد قلی مع مقدمہ	پروفیسر جاوید وششٹ	دکنی ادب	•	•	
۵	مآثر نظامی (لالہ منالام)	سید محی الدین (ایم' اے)	تاریخ	•	•	
۶	تذکرہ نوادر ایوان اردو (جلد دوم)	میر سراج الدین طالبجان	تذکرہ			
۷	فہرست کتب خانہ مطبوعات (جلد چہارم)	محمد اکبرالدین صدیقی	"			
۸	.... انتخاب کلام	کنول پرشاد کنول	شعر			
۹	غزل در غزل	ادیب لکھنوی	"			
۱۰	برق و شرر	آبدہ شہیدی	"			

ادارہ کی مطبوعات

معاصرین کی نظر میں

۱۹۶۶ء میں ادارہ کی مختلف تازہ مطبوعات اور رسالہ "سب رس" کے خصوصی شماروں پر ہند و پاک کے مختلف رسائل و جرائد میں جو تبصرے شائع ہوئے ان میں سے چند کے اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ اب تک ادارہ ادبیات اردو مختلف علمی و ادبی، تحقیقی، تہذیبی اور تاریخی موضوعات پر جن میں ادب اطفال بھی شامل ہے (۳۱۰) کتابیں شائع کر چکا ہے، ان مطبوعات کو علمی و ادبی حلقوں میں کافی قدر و منزلت سے دیکھا جا رہا ہے بالخصوص دکنیات کو دنیائے ادب سے روشناس کرانے میں ادارہ کی مطبوعات کا ملک بھر میں شہرہ رہا ہے۔ نیز ادارہ کی کئی ایک ایک کتابیں ایسی بھی ہیں جو ہندوستان کی مختلف جامعات اردو امتحانات اور فوقانی مدرسوں کے نصاب میں شامل ہیں ——— ادارہ

"سانولی" (ڈراموں کا مجموعہ) از مرزا اظہر افسر

ڈرامہ ایک ایسا آرٹ ہے جس کا عوام سے نہایت گہرا رشتہ ہے۔ فن ڈرامہ قدیم ترین انسانی تہذیب سے ہزاروں سال بعد تک اسلئے زندہ رہا کہ اس نے سماج کے افراد کے لئے تفریح و طبع کا سامان مہیا کیا۔

آج کے جمہوری اور عوامی دور میں ڈرامہ تیزی سے مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے، ادبی ڈرامے، ریڈیائی ڈرامے، اور اسٹیج ڈرامے کا فن پوری قوت سے عوام کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن پچھلے چند برسوں میں ہندوستان میں جتنے نیک کام ہوئے ہیں ان میں سے ایک ڈرامہ کی طرف توجہ کی تجدید بھی ہے۔ ابھی ڈرامے کا اچھا نہیں ہوا ہے اور اس کی طرف توجہ کا اچھا اہم ہے پھر بھی اردو نے جدید ہندوستانی ڈرامے کی جو خدمت انجام دی ہے وہ ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں سے چار پانچ زبانوں ہی نے کی ہوگی۔

اردو میں اسٹیج ڈراموں کے علاوہ ریڈیو کے وجود سے ڈرامہ نگاری کے فن کو زندگی ملی۔ ریڈیو کے نشر ہونے والے ڈراموں نے عوام کو پوری قوت سے اپنی طرف کھینچا اور حکومت نے بھی "قومی تعمیر" کی تکمیل اور اس فن کی حوصلہ افزائی کی خاطر مقابلوں کا انعقاد کر کے کئی سہولتیں فراہم کی ہیں۔

جناب اظہر افسر کے موجودہ منتخب ڈراموں کا یہ مجموعہ "سانولی" اس فن کی عظمت اور اس کی ترقی و مقبولیت کی سمت ایک خوش آیند مقام ہے اس مجموعے کی اشاعت سے فن ڈرامہ کو ایک دلپذیر اور اہم تحفہ ہاتھ آیا ہے سانولی کے بیشتر ڈرامے اسٹیج بھی ہو چکے ہیں اور نشر خاطر بھی ہوئے ہیں، ویسے یہ تمام ڈرامے ریڈیائی تکنیک کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے۔ مناسب ترمیم (ڈرامائی تبدیلیوں) کے بعد مصنف نے اسے عوامی ضرورتوں کے پیش نظر ادارہ ادبیات

اردو کی طرف سے شائع کردیا ہے اور بقول جناب میر حسن ڈاکٹر زور کا ادارہ قابل مبارکباد ہے کہ اس نے اس مجموعہ کی اشاعت کا انتظام کیا ہے۔ آج سے کوئی دس سال پہلے صاحبزادہ میکش مرحوم کے نثری نشانیوں کا مجموعہ "کاغذ کی ناؤ" بھی اسی ادارہ سے شائع ہوکر مقبول ہوا تھا۔

اظہر افسر کا شمار ملک کے ان چند ڈرامہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے مختصر عرصہ میں اپنی ذکاوت و ذہانت کے سبب اس فن میں مہارت تامہ حاصل کی ہے۔ ایک طویل عرصہ سے اظہر صاحب آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے منسلک ہیں اور ڈرامے، خاکے اور فیچر وغیرہ لکھنے کے فن سے خوب آشنا ہیں۔ ہندوستان کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے ان کے ڈرامے نشر ہوتے رہے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں ڈرامائی روایات کا التزام ملتا ہے۔ وحدت زماں، وحدت مکاں، وحدت عمل اور وحدت تاثر کے ساتھ ساتھ ایجاز و اختصار اور کردار میں انفرادیت اور ہمہ گیری ملتی ہے۔ انداز بیان کافی حد تک مؤثر ہوتا ہے جس سے مصنف کی اچھی تخلیقی صلاحیتوں اور فکر کی گہرائی و گیرائی کا سامع و قاری پر اچھا اثر مرتب ہوتا ہے۔ ان ڈراموں میں جہاں ادبیت کی چاشنی ملتی ہے وہیں عالم دلچسپی کے امکانات بھی جھلکتے ہیں

سانولی کے چودہ ڈراموں کا موضوع قومی تعمیر اور یکجہتی سماج سدھار، ادبیات اور ادبی شخصیتیں ہیں۔ جناب میر حسن نے ڈراموں کا تعارف کراتے ہوئے "سانولی" میں لکھا ہے کہ اظہر افسر صحیح قومی جذبہ رکھتے ہیں اور مفید مطلب معلومات کی کو گرا شاعت کے گُر سے ان کو اچھی خاصی واقفیت ہے، انہوں نے ان ریڈیائی ڈراموں میں آوازوں کی مدد سے کام کی باتیں بیان کی ہیں۔ قومی ڈراموں کی زبان فصیح اور معیاری ہے اور ان ڈراموں کے بیشتر موضوعات کا تعلق عصر حاضر کے سماجی معاشی اور سیاسی میلانات و رجحانات سے ہے "سانولی" اظہر افسر کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے اس سے قبل بچوں کے لئے ان کے فیچر اور ڈراموں اور کہانیوں کے کئی شگفتہ مجموعے چھپ چکے ہیں، امید ہے کہ مستقبل قریب میں ان کی فطانت طباعی اور مشاہدے کی گہرائی انہیں ایک اعلیٰ ڈرامہ نگار بنا سکتی ہے

روزنامہ سیاست حیدرآباد (مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۶۷ء)

۵

۲۔ ڈرامہ یونانی لفظ ہے ڈرا کا مطلب ہے کرنا اور ما کا مطلب ہے دکھانا، فن ڈرامہ ایک ایسا آرٹ ہے جس کا عوام کے رہن سہن اور جذبات کے اظہار میں گہرا رشتہ ہے۔ فن ڈرامہ کے قدیم ترین انسانی تہذیب ہزاروں سال بعد تک دائم و قائم رہنے کی یہی وجہ ہے کہ ڈرامہ نے سماج کے تقریباً سبھی افراد کی ذہنی ترجمانی کی ہے اور تفریح طبع کا سامان فراہم کیا ہے، آج کے جمہوری دور میں فن ڈرامہ بڑی تیزی سے مقبولیت کے مدارج طے کر رہا ہے ناطق فلموں کے وجود میں آنے کے بعد اردو کے اسٹیج ڈرامہ ختم ہوگیا ہوتا اگر ریڈیو ڈرامے نے اسے سہارا نہ دیا ہوتا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ آج کے اسٹیج ڈرامے پہلے ریڈیو کے لئے لکھے جاتے ہیں پھر انھیں مناسب تبدیلیوں کے بعد منظر عام پر پیش کیا جاتا ہے۔

سانولی اور دوسرے ڈرامے بھی اظہر افسر کے [۱۴] منتخب ڈراموں کا مجموعہ ہے (بقیہ صفحہ ۲۹ پر)

مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن

مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن ادارے کا ایک
ہم شعبہ ہے جو دکن کے تاریخی و ثقافتی ذخیرے کے فراہم کرنے
اور اسکو شائع کرنے میں سرگرم عمل ہے، چنانچہ اس شعبہ
ی جانب سے حدیقۃ السلاطین (فارسی) مولفہ نظام الدین
مد شیرازی مرتبہ علامہ سید علی اصغر بلگرامی، قطب شاہی سلاطین
ر آندھرا تمدن (تلگو) مرتبہ ڈاکٹر رام راجو، مکتوبات قطب شاہیہ
شاہان مغلیہ و ایران (فارسی) مرتبہ نواب علی حسین خاں، از تاریخ
گلکنڈہ (اردو) طبع ثانی مولفہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی
ی اشاعت عمل میں آچکی ہے، آصف جاہ اول کے عہد کی
ستند تاریخ مآثر نظامی (فارسی) مولفہ لالہ منسا رام،
جناب میر محی الدین صاحب ایم۔ اے نے مرتب فرمایا ہے
حکومت ہند کی امداد سے شائع ہوگی، اس کے علاوہ
زرائے سلطنت آصفیہ" کی تالیف کا کام بھی صاحب
موصوف انجام دے رہے ہیں۔

اس شعبے کے لائحہ عمل میں کئی نادر مخطوطات
کی اشاعت داخل ہے۔

میر سراج الدین علیخان

معتمد مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن

میوزیم ایوان اردو

ایوان اردو کے میوزیم میں دکن کے تاریخی و ثقافتی
آثار کا بیش بہا ذخیرہ محفوظ ہے۔ میوزیم کی نادر اشیاء میں
قطب شاہی، عادل شاہی اور آصفیہ فرامین و اسناد ی
کاغذات، دکنی خطاطی، و مصوری کے نمونے، مشاہیر کے مکتوبات
قلمی تصاویر، قدیم اسلحہ، بیدری ظروف، قدیم سکے اور نقشے
وغیرہ داخل ہیں،

آئے دن میوزیم کے نوادرات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے
چنانچہ اس سال نواب عنایت جنگ بہادر نے کئی نادر اشیا
عنایت فرمائی ہیں، جن میں قلمی تصاویر، مشاہیر کے خطوط،
تاریخی کاغذات، اور قدیم نقشے وغیرہ داخل ہیں، ڈاکٹر
غیاث صدیقی نے سکہ جات عہد مغلیہ، و ایسٹ انڈیا کمپنی
خطاطی کے نمونے، ٹکٹ، شہر ریاست حیدرآباد کا ایک سٹ
ایک قدیم نقشہ اور مدرسہ محمود گاواں کی نادر تختیک عطا فرمائی
ہے جو عہد اورنگ زیب میں بنائی گئی تھی، جناب مرزا
نکور بیگ صاحب نے تین عکسی تصویریں عنایت فرمائی ہیں۔

نواب عنایت جنگ بہادر نے میوزیم میں کئی دن صرف کر کے
میوزیم کی تنظیم جدید فرمائی ہے جس کے لئے ادارہ نواب صاحب کا شکر گزار ہے

میر سراج الدین علیخان

معتمد میوزیم

استفادۂ کتب خانہ

(اردو کے وسیع کتب خانہ (شعبۂ مخطوطات و مطبوعات اور دارالمطالعہ) "ایوان اردو" سے اردو زبان اور ادب کے شیدائی، طلباء و طالبات اور ریسرچ اسکالرس صاحبان بڑی تعداد میں استفادہ اور مطالعہ کی غرض سے دور و نزدیک کے مقامات سے آتے رہتے ہیں۔ ذیل میں چند اصحاب کے نام درج کئے جاتے ہیں جنھوں نے مختلف اوقات میں باحتواتر کمی روز ادارہ کے کتب خانے کے مخطوطات یا مطبوعات سے استفادہ فرمایا۔ مخطوطات کی ترتیب و اشاعت اور حوالوں کے سلسلے میں اُن کی تعلیمیں بی اے یا ایم، اے کے نصاب سے متعلقہ یا پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے حصول کے سلسلے میں مطبوعات کے ذخیرہ سے مواد حاصل کیا (ادارہ)

۱۔ محترمہ ذاکرہ غوث ریسرچ اسکالر مدراس یونیورسٹی مدراس
۲۔ جناب حمید شطاری صاحب ریڈر جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد
۳۔ ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اردو کالج جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۴۔ محترمہ خدیجہ عارف النساء جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد
۵۔ محترمہ معینہ سراج متعلم ایم، اے جامعہ عثمانیہ
۶۔ محترمہ نجمہ صدیقہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۷۔ جناب طیب انصاری، ایم اے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۸۔ جناب شمیم نصرتی 5-3-351 امیر آباد۔ حیدرآباد ۲۰
۹۔ جناب بشیر انور رکن حلقہ فکر و نظر چلپورہ حیدرآباد
۱۰۔ جناب ضیاء الدین احمد شکیب مددگار ریسرچ آرکائیوز حیدرآباد
۱۱۔ محترمہ بدر افضل صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۱۲۔ جناب امیر چند ریسرچ اسکالر
۱۳۔ جناب بدیع حسینی صاحب ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۱۴۔ جناب حمید آرزوری، ڈپٹی چیف ٹائپ رائٹنگ انسپکٹر حیدرآباد
۱۵۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں لکچرار جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۱۶۔ جناب قیوم صادق صاحب ریسرچ اسکالر بمبئی
۱۷۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۱۸۔ جناب محمد منظور احمد صاحب لکچرار آرٹس کالج کریمنگر
۱۹۔ مولانا محمد معز الدین قادری صاحب کشنہ تالاب میر جملہ حیدرآباد
۲۰۔ جناب سلطان رضا صاحب 5-9-199 چراغ علی لین حیدرآباد
۲۱۔ محترمہ رفیق فاطمہ صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۲۲۔ جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب ریڈر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۲۳۔ محترمہ حمیرہ جلیلی ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۲۴۔ جناب ڈاکٹر محمد جمال شریف اے جی، آفس، حیدرآباد

۲۵- ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ
۲۶- جناب سلیمان صاحب ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۲۷- محترمہ زاہدہ ابوالحسن ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ۔
۲۸- جناب تدبیر الدین صاحب ضیاء گوڑہ، حیدرآباد
۲۹- محترمہ فرزانہ صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۳۰- ڈاکٹر محمد عبدالمطلب صاحب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۳۱- جناب قاضی محمد ذکریا امیر عارفی صاحب ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ
۳۲- پرنس نواب میر نقی علیخان ثاقب شانتی نگر، حیدرآباد
۳۳- جناب ارشاد علی خان صاحب ایم اے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
۳۴، مولوی غلام رسول صاحب پائین درگاہ یوسفین نامپلی حیدرآباد
۳۵- جناب مصطفیٰ کمال احمد ایم اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۳۶- جناب قمر خلیل ۶۲۷-۳-۲۳ سلطان شاہی حیدرآباد ۲
۳۷- محمد مجیب الرحمٰن صاحب ڈرائنگ ماسٹر بی ایس ہی محبوب نگر
۳۸- جناب قاضی مبین الدین صاحب ریسرچ اسکالر اورنگ آباد
۳۹- جناب محمد رفیع الدین انصاری سابق ٹیچر کار تحقیل جنور
۴۰- جناب مجاہد الانصاری صاحب محکمہ اطلاعات، حیدرآباد
۴۱- ڈاکٹر انور معظم صاحب ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۴۲- محترمہ اقبال سلطانہ صاحبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۴۳- محترمہ ثریا جمال صاحبہ ایم اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۴۴- جناب مرزا اظہر افسر صاحب آل انڈیا ریڈیو۔ حیدرآباد
۴۵- جناب فرحت وہاب صاحب حیدرآباد،
۴۶- جناب میر حسن صاحب سابق اسٹیشن ڈائرکٹر اے آئی آر مدراس
۴۷- محترمہ سلمیٰ بلگرامی صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۴۸- علامہ حیرت بدایونی صاحب معظم پورہ حیدرآباد
۴۹- جناب میر سراج الدین علیخان صاحب سابق مددگار ناظم آرکائیوز

۵۰- جناب جمال الدین ارمان فاروقی متعلم ایم اے جامعہ عثمانیہ
۵۱- علامہ تلمیح قریشی صاحب مغلپورہ حیدرآباد ۲
۵۲- جناب قمر ساحری ایم اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۵۳، جناب حمید الدین سلیم ایڈیٹر ترجمان حیات، حیدرآباد
۵۴، جناب شفیع الدین صاحب حیدرآباد
۵۵، جناب نجم الدین صاحب ″
۵۶، خیر الدین صاحب سواجی گوڈہ
۵۷- جناب رؤف خلش صاحب ادارۂ مصنفین نو حیدرآباد
۵۸ ″ اکبر علی صاحب حیدرآباد
۵۹ ″ نجم عبدالقادر صاحب ″
۶۰ جناب میر احمد علی قادری شانتی نگر حیدرآباد
۶۱- ″ محمد اعظم صاحب ریسرچ اسکالر پونا یونیورسٹی
۶۲- ″ نظام الدین مغربی لکچرار اردو کالج حیدرآباد
۶۳- جناب افتخار علی عباسی صاحب پنجہ گٹہ روڈ حیدرآباد
۶۴ ″ قادر محی الدین صاحب حیدرآباد
۶۵ ″ احمد رسول صاحب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۶۶- مرزا جبار بیگ صاحب ″
۶۷- جناب حسین علیخان صاحب ″
۶۸- جناب محمود قادر صاحب ملک پیٹھ حیدرآباد
۶۹- جناب صلاح الدین نیر صاحب ادارہ خاتون دکن حیدرآباد
۷۰- جناب رزاق فاروقی صاحب لکچرار عثمانیہ کالج کرنول
۷۱- جناب شاہ سوار علی صاحب ارم منزل حیدرآباد
۷۲- پروفیسر ظل حسنین، شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی
۷۳- جناب فیض الحسن خیال صاحب موتی محل، حیدرآباد
۷۴- جناب افضل الدین فاروقی صاحب متعہد تعلیمات ″

۷۵۔ جناب ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب سکالی کمان حیدرآباد
۷۶۔ جناب حضرت کرمیدی صاحب ہمدرد کمپنی عابد روڈ
۷۷۔ جناب سید محمد زکی صاحب حیدرآباد
۷۸۔ جناب خواجہ معین الدین عارف بیابانی حیدرآباد
۷۹۔ جناب سید دلدار حسین صاحب سابق چیف انجینیر بجارد ہل حیدرآباد
۸۰۔ حضرت قدر عریضی صاحب باغ فریدون جاہ نبی علم حیدرآباد
۸۱۔ محترمہ مہر ورجہاں صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۸۲۔ جناب قطب الدین احمد صاحب اسٹنٹ آرکائیوز، حیدرآباد
۸۳۔ ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب لکچرار شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ
۸۴۔ جناب مولوی عارف الدین حسن صاحب ۸۷۰ آغاپورہ
۸۵۔ محترمہ رخسانہ سیدہ صاحبہ متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۸۶۔ محترمہ نفیسہ فریدہ صاحبہ " "
۸۷۔ جناب سردار مرزائی لکچرار گلبرگہ کالج
۸۸۔ محترمہ فاطمہ یزدانی صاحبہ بیگم ڈاکٹر یزدانی مرحوم پنجہ گٹہ روڈ
۸۹۔ محترمہ رفیق النساء بیگم صاحبہ ریسرچ اسکالر ناگپور
۹۰۔ جناب نجم الدین خلیخاں صاحب حیدرآباد
۹۱۔ محترمہ سرورجہاں صاحبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
۹۲۔ جناب بشیر احمد خاں صاحب ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۹۳۔ " اصغر علی انصاری صاحب ریسرچ اسکالر ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ
۹۴۔ محترمہ سرورجہاں صاحبہ حیدرآباد
۹۵۔ جناب نذیر الدین احمد صاحب کونسلر چیلہ پورہ حیدرآباد
۹۶۔ " یس جے صادق صاحب جامعہ عثمانیہ "
۹۷۔ محترمہ مہرالنساء صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۹۸۔ محترمہ فریدہ فاطمہ صاحبہ " "
۹۹۔ مولانا حافظ ابو یوسف (ایم پی سی) حیدرآباد

۱۰۰۔ جناب سید محی الدین صاحب اسٹنٹ آرکائیوز حیدرآباد
۱۰۱۔ " افضل علیخاں صاحب "
۱۰۲۔ نواب میر عسکر علیخاں صاحب زرافشاں شانتی نگر حیدرآباد
۱۰۳۔ پنڈت سری رام شرما لکچرار ہندی جامعہ عثمانیہ "
۱۰۴۔ جناب سید اختر علی صاحب شاہ متعلم اردو عالم "
۱۰۵۔ جناب نجم الدین صدیقی صاحب ریسرچ اسکالر آزاد انسٹی ٹیوٹ
۱۰۶۔ مولوی خورشید احمد جامی صاحب ۱۰۰، سلطان پورہ حیدرآباد
۱۰۷۔ " جناب حمید خاں سلیم سکنڈ لانسرز "
۱۰۸۔ " سید صفی الدین قادری تہنیت منزل، پنجہ گٹہ روڈ
۱۰۹۔ جناب قطب سرشار معتمد بزم ادب ناگر کرنول (اے۔ پی)
۱۱۰۔ " جواد عابدی صاحب ارم منزل، حیدرآباد
۱۱۱۔ " فرحت حسین، معتمد بزم انیس، پرانی حویلی بلدہ
۱۱۲۔ " باقر منظور صاحب چیچل گوڑہ، حیدرآباد
۱۱۳۔ " مرزا حسن بیگ صاحب سباجی یاقوت پورہ حیدرآباد
۱۱۴۔ " سید جمیل الرحمن صاحب نیا ملک پیٹھ حیدرآباد
۱۱۵۔ " جہاندار افسر صاحب سابق رکن بلدیہ، مغلپورہ
۱۱۶۔ " سنیواس لاہوٹی صاحب راجستھان بھون دارالشفاء
۱۱۷۔ محترمہ لیاقت بیگم صاحبہ منتظم ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۱۱۸۔ جناب شہریار سکاؤس جی، باغ عام روڈ حیدرآباد
۱۱۹۔ " یوسف سرمست صاحب یاقوت پورہ، حیدرآباد
۱۲۰۔ " سید رضی الدین قادری صاحب تہنیت منزل پنجہ گٹہ بلدہ
۱۲۱۔ " رحمن جامی صاحب مراد نگر۔ حیدرآباد
۱۲۲۔ " انور کمال خوندمیری صاحب ملک پیٹھ، حیدرآباد
۱۲۳۔ " رشید الدین صاحب ٹرانسلیشن آفس، افضل گنج حیدرآباد
۱۲۴۔ " احمد علیخاں صاحب ادیب، نقاد، اردو شریف حیدرآباد

امداد و اعانت

۱۹۶۷ء میں حسب ذیل اصحاب اور اداروں نے کتب خانہ میوزیم اور دارالمطالعہ کو اپنے گرانقدر عطایا سے نوازا جس کے لئے ادارہ ان اصحاب اور اداروں کا دلی شکر گزار ہے۔ خصوصاً ادارہ کی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات اور مطبوعات نوادرات ہند کے قدیم و جدید مختلف فنون کی کتابیں، رسالوں کی فائلیں کتب خانے کے لئے اور سب رس میں تبصرہ کی غرض سے وصول ہوتی رہی ہیں۔ ہم اپنے علم دوست قارئین سے خواہش کریں گے کہ وہ اپنے علمی و ادبی ذخیرے کو تلف ہونے سے بچائیں اور ایسی کتابیں، علمی و ادبی اور تہذیبی نادر اشیا "ادارہ ادبیات اردو" کو تحفۃً مرحمت فرما کر محفوظ فرمائیں۔ ادارے کو ملنے والے ایسے ذخیرہ کی سالانہ فہرست، معطی کے نام کی صراحت اور شکریہ کے ساتھ ادارے کے ترجمان ماہنامہ سب رس کی خاص اشاعت "ادارہ نمبر" میں شائع کی جاتی ہیں، تاکہ ان عطایا سے دیگر ارباب نظر، ریسرچ اسکالر اور اردو دوست حضرات واقف ہو سکیں۔

(ادارہ)

جناب مولوی سید دلدار حسین صاحب بیشر نوادرات حکومت ہند و سابق چیف انجینئر آندھرا پردیش نے ادارہ کے کتب خانہ کو (۲۷) اہم اردو مطبوعات تحفۃً مرحمت فرمائیں۔

ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے دوسرے سالانہ کل ہند مشاعرے میں حیدرآباد کے ممتاز فوٹوگرافر جناب شاہ علی (راٹل فوٹو اسٹوڈیو) نے ایوان اردو میں آویزاں کرنے کیلئے جناب مخدوم محی الدین کا پورٹریٹ تحفتہ دینے کا اعلان کیا اور صدر ادبی ٹرسٹ نواب مہدی نواز جنگ نے انھوں یہ پورٹریٹ نے مشاعرہ گاہ میں ونکار خلیل نے ادارہ کے لے حاصل کیا۔

ڈاکٹر غیاث صدیقی بہ توسط جناب میر سراج الدین علی خاں

آفس سکریٹری ادارہ کو اپنے والد نواب میر معین الدین علی خاں معین زخم خلف عظام الدولہ کی طرف سے ادارہ کے اردو میوزیم کے لئے مدرسہ محمود گاواں کی پینٹنگ، اور چند مخطوطات اور نادرات جن میں فن خط طی کے نمونے اور سکے وغیرہ شامل ہیں تحفتہً مرحمت فرمایا۔

جناب شاہ علی مالک راٹل فوٹو اسٹوڈیو حیدرآباد نے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا خوبصورت پورٹریٹ جس پر ڈاکٹر صاحب نے ایوان اردو میں اپنے دستخط فرمائے ہیں ایوان اردو کے آرٹ گیلری کے لئے نذر کیا۔

پدم شری جناب حکیم عبدالحمید دہلوی صاحب متولی ہمدرد دواخانہ دہلی نے ادارہ کو ایک ہزار روپیہ کا عطیہ مرحمت فرمایا۔

جناب اے یت، انیتا کنسلٹنگ انجینیر بمبئی نے ادارہ کی خدمات سے متاثر ہو کر ایک سو ایک روپیہ مرحمت فرمایا۔

جناب بی سوکارن صاحب بزنجنگ ڈائرکٹر ممبر اینڈ ٹریڈنگ کمپنی۔ وکٹوریہ ہاؤس وکٹوریہ گارڈن۔ بمبئی ۲۷ نے جناب سید الطاف حسین صاحب کی معرفت ادارہ کو تین سو روپیہ روانہ فرمائیے۔

جناب الحاج مرزا شکور بیگ صاحب نے ادارہ کے میوزیم کے لئے جامعہ عثمانیہ کی طرف سے ۱۹۲۲ء میں اسٹیج کئے گئے تین ڈراموں کے گروپ فوٹوز تحفتہً عنایت کئے۔

انجمن ہلال اسلام لاہور کی طرف سے ادارہ کے کتب خانے کے لئے (۱۱) مذہبی کتابیں تحفتہً وصول ہوئیں۔

جناب سعادت علیخان نے "مہدی نواز جنگ کی زندگی کے چند پہلو" نامی کتاب ادارہ کو نذر کی۔

انجمن ہلال اسلام لاہور نے بذریعہ ڈاک دو قسطوں میں (۲۰) اسلامی ادب پر مشتمل قدیم و جدید کتب رسائل کتب خانہ کو تحفتہً روانہ کئے۔

جناب عبدالشکور صاحب (حیدرآباد) نے مشہور ہفتہ وار "مدینہ" بجنور کے ۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۲ء کے فائل ادارہ کو تحفتہً نذر کئے۔

جناب عارف الدین حسن صاحب معتمد شعبہ اردو امتحانات نے نصاف اردو امتحانات کی مطبوعات کتب خانہ کے لئے عطا کیں۔

جناب رکن الدین احمد صاحب عزیز باغ دارالشفا حیدرآباد نے کتب خانہ کے لئے اپنے والد نواب دین یار جنگ کی سوانح کا انگریزی نسخہ ادارہ کو تحفتہً ارسال فرمایا۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف، وقار خلیل صاحب، طیب اللہ صدیقی صاحب اور نفیسہ ممتاز صاحبہ (میسور) نے چند اردو مطبوعات کتب خانہ کے لئے تحفتہً روانہ کیں۔

نواب عنایت جنگ بہادر نے شمس الاخبار ہفتہ وار کے ۱۵ رسائل اور چند مخطوطات اور مطبوعات کتب ادارہ کو تحفتہً عطا فرمائیں۔

جناب اسحاق ایوبی صاحب انفارمیشن آفیسر پبلک ان فارمیشن بیورو حکومت ہند حیدرآباد نے پبلی کیشن ڈیویژن کی مرتبہ و مطبوعہ انگریزی رپورٹیں (۲۵) عدد ارسال فرمائیں۔

انجمن اسلام لاہور کی طرف سے بطور تحفہ (۵۴) اردو مطبوعات ادارہ کے کتب خانہ کو وصول ہوئیں۔

اردو امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اردو

سنہ ۱۹۴۰ء سے ادارہ کے اردو امتحانات اردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم، اردو فاضل شعبہ اردو امتحانات کی مجلس مشاورت کے فیصلوں کے مطابق سال میں دو بار جون اور ڈسمبر میں اضلاع کے علاوہ شہر کے مختلف مرکزوں پر منعقد ہوا کرتے ہیں، جن میں اعلیٰ تعلیم کے خواہشمند اصحاب کے علاوہ جیل کے قیدی بھی بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔

ادارہ کے امتحان "اردو عالم" کی شہرت اور مقبولیت گذشتہ چند سالوں سے دو چند ہو گئی ہے۔ ایسے طلبہ و طالبات جو میٹرک یا اس کے مماثل امتحان کا بار اٹھا نہیں سکتے یا پھر کسی وجہ سے شرکت کے بعد ناکامی کا منہ دیکھنا ہوتا ہے وہ بجائے مایوس ہونے کے ایوان اردو کا رخ کرتے ہیں۔ اور ادارے کے امتحان اردو عالم میں شرکت کی درخواست دیتے ہیں۔

اردو عالم کے کامیاب امیدواروں کو جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحان "ادیب کامل" میں داخل جاتا ہے جس کا مقام علی گڑھ یونیورسٹی میں انٹر کے برابر ہے، اس کے بعد طلبہ یا تو علی گڑھ یونیورسٹی، جامعہ اردو یا پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے کورس سے فائدہ اٹھا کر دو تین سال کے عرصہ میں "بی اے او ایل" یا اردو پنڈت کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اگر وہ چاہیں تو ایم اے میں داخل ہو کر یا پھر انگریزی کا امتحان دے کر بی اے بھی ہو سکتے ہیں۔ یا ملازمت اختیار کر کے اردو دانی و تدریس کا کام آغاز کر سکتے ہیں۔

ادارہ ادبیات کے امتحانات کے اس پس منظر کے بعد سنہ [illegible] کے جون اور دسمبر کی میقاتوں کی شرکت کر کے کامیاب ہونے والے امیدواروں کی ایک مکمل فہرست درج کی جاتی ہے۔

(ادارہ)

نتائج اُردو امتحانات ''ادارۂ ادبیاتِ اُردو'' حیدرآباد دکن

منعقدہ جون ۱۹۶۷ء

امتحان اُردو دانی

۱۔ مرکز انوار العلوم کالج حیدرآباد

۱۰۔ مرزا عبدالقادر بیگ بابر مرزا (امتیاز)

۸۔ ریحانی بیگم (کامیاب)

۱۷۔ محمد اکبر (")

۲۔ مرکز بودھن (نظام آباد)

۹۔ محمد بشیر (کامیاب)

۱۲۔ مرزا کلیم بیگ (")

۱۵۔ وجہ الدین (")

۱۸۔ محمد ثناء الدین (امتیاز)

۱۹۔ لائق علی (کامیاب)

۲۲۔ محمودہ بیگم (")

۲۳۔ سیدہ زلیخا خاتون (")

۲۴۔ جمیلہ بیگم (کامیاب)

۲۵۔ خیر النساء بیگم (")

۲۶۔ سیدہ رقیہ خاتون (")

۳۔ مرکز نظام آباد

۲۷۔ محمد معین الدین (کامیاب)

۲۸۔ حافظ سید معظم علی (امتیاز)

۲۹۔ سید مظفر علی (")

۳۰۔ محمد عبدالرشید (کامیاب)

۳۱۔ احمد عبدالعزیز خاں (")

۳۲۔ قمر النساء بیگم (امتیاز)

۴۔ مرکز بوتھ (عادل آباد)

۴۷۔ عبدالقدوس (کامیاب)

۵۰۔ تاج الدین (")

۵۱۔ عبدالحکیم (")

۵۲۔ عبدالحلیم (کامیاب)

۵۳۔ محمد امام خان (")

۵۔ مرکز جونیئر سرٹیفکیٹ ہائر اسکول (بلدہ)

۵۶۔ نذیر ولد شیخ لال (کامیاب)

۵۷۔ عبدالستار (")

۵۸۔ شیخ عبدل (")

۵۹۔ نذیر ولد یوسف علی (")

(۶۰) محمد (")

(۶۱) عبدالرحیم (")

(۶۲) ہاشم (")

(۶۳) شیخ محمد (")

(۶۴) محمد یوسف (")

(۶۵) محمد شریف (")

(۶۶) پاشاہ (")

(۶۷) عبدالرفیع (")

۶۸ - محمد بشیر (کامیاب)

۶۹ - راجہ راؤ (")

۷۰ - محمد نعیم (")

○

امتحان اردو زبان دانی

○

۱ - مرکز آرمور (نظام آباد)

۲ - سید کلیم احمد (درجہ دوم)

۳ - محمد فرحت اللہ خاں (")

۸ - محمد عبدالعلیم (")

۴ - محمد نظام الدین (درجہ سوم)

۵ - طاہر ضیاء الدین خاں (")

۶ - احمد عبدالکلیم (")

۹ - سید عبدالمبین (")

○

۲ - مرکز انوار العلوم کالج حیدرآباد

۱۱ - سید زوار علیخاں (درجہ اول)

۱۲ - زینت عائشہ (درجہ سوم)

○

۳ - مرکز جونیئر سرٹیفکیٹ اسکول (بلدہ)

۲۰ - عبدالقادر (درجہ سوم)

۴ - مرکز (نظام آباد)

۳ - محمد عبدالوحید (درجہ سوم)

امتحان اردو عالم

۱ - مرکز آرمور (نظام آباد)

۵ - احمد عبدالعلیم (درجہ سوم)

۶ - محمد نعیم الدین آتن (درجہ سوم)

۸ - محمد فہیم الدین اعجاز (")

۹ - محمد محبوب علی (")

۱۱ - آمنہ خاتون صدیقی (")

○

۲ - مرکز بانسواڑہ (ضلع نظام آباد)

۱۰ - محمد عثمان خاں (درجہ دوم)

۱۳ - انتصار فاطمہ (")

۱۴ - سید محبوب علی (درجہ سوم)

۱۵ - سید خواجہ یوسف الدین قادری (سوم)

۱۹ - احمد پاشاہ (سوم)

۲۰ - [illegible]شن راؤ (")

۲۷ - عائشہ بیگم (")

۲۹ - فاطمہ بی (")

۳۱ - محمدی فاطمہ (")

۳۲ - طاہرہ بیگم (")

۳۴ - کلیم النساء بیگم (سوم)

۳۵ - نعیم النساء بیگم (")

○

۳ - مرکز انوار العلوم کالج بلدہ (ذکور)

۳۹ - حافظ محمد عبدالحق صدیقی دوم

۴۵ - علی بن عبداللہ (")

۴۷ - حاجی محمد غوث (")

۴۸ - حبیب نوزخاں (")

۵۲ - محمد سعید الدین (")

۵۳ - میر محبوب علی (")

۵۴ - عبدالرحمن (")

۵۹ - محمد عبدالوہاب چھیلی (")

۶۱ - حسن عرفانی (")

۷۰ - سید حفیظ الدین حسین (")

۸۸ - سید مظہر حسن (")

۱۰۲ - میر ریاست علی (")

۱۰۷ - سید عبدالوحید (")

۱۱۰ - محمد عبدالحی (")

۱۲۴ - محمد عبدالرحمن (")

۱۶۸ - سید احمد (")

۱۷۱ - سید رشید احمد (")

۱۸۲ - سید بشیر احمد (")

۱۷۷ - یٰسین زبوجی (")

٢٢٦- عبدالرحمن خان (دوم)
٢٢٩- محمد یوسف خان (")
٢٣٠- محمد سعادت (")
٣٨- محمد انور خان (سوم)
٤٤- عبداللہ ہندی (")
٤٩- محمد بن علی (")
٥٠- خواجہ کریم الدین انصاری (")
٥٨- سید جمال الدین (")
٦٠- سید سردار امام الدین (")
٦٢- سید عبدالقدیر حسینی (")
٦٥- محمد عبدالماجد حسینی (")
٦٦- شیخ عبدالغفار جیلانی (")
٦٧- شیخ احمد (")
٦٨- سید مہدی حسین (")
٦٩- مرزا جبار بیگ (")
٧١- سید محمود پاشاہ قادری (")
٧٢- سید قادر پاشاہ ملتانی (")
٧٣- سید خواجہ رؤف الدین (")
٧٤- محمد عبدالاحد (")
٨١- میر شجاعت علی (سوم)
٨٤- سید مخدوم حسینی (")
٨٥- محمد معزالدین (")
٩٠- سید عارف قادری (")

٩٤- سید شاہ شمیم الدین منور (سوم)
٩٥- محمد غوث (")
٩٦- طیب بن طاہر شان (")
٩٩- محمد نظام الدین (")
١٠٠- سید معزالدین احمد قادری (")
١٠٣- محمد اسد احمد حسینی (")
١٠٤- محمد آدم (")
١٠٥- محمد عبدالرشید رومی (")
١٠٦- محمد اختر حسین خان (")
١١١- سید خلیل الرحمن (")
١١٣- محمد ظہیر الدین (")
١٦٥- سید وجاہت علی خان (")
١٦٦- مرزا رفعت علی بیگ (")
١٧٣- محمد عبدالقادر (")
١٧٤- سید اصغر حسین (")
١٧٥- امتیاز الحق اقبال (")
١٨١- شیخ فرید اللہ (")
١٨٢- مظہر حسین (")
٢٠٥- محمد ضیاء الدین تقی (")

○

٤- مرکز انوار العلوم کالج طلبہ اناث

١٣٢- ساجدہ فصیح (درجہ دوم)
١٣٥- سیدہ اظہر (")

١٢٥- زیب النساء بیگم سوم
١٤٨- بلقیس فاطمہ (")
١٤٩- طلعت نسرین (")
١٥٠- اقبال سلطانہ (")
١٧٩- غوثیہ سلطانہ (")
١٨٥- انیس سلطانہ (")
٢٢٢- پروین (")
١١٤- نجم النساء بیگم درجہ سوم
١١٥- عزیز سلطانہ (")
١١٦- افضل جہاں بیگم (")
١٢٠- نسیم سلطانہ (")
١٢٣- سیدہ زہرہ (")
١٢٤- امتہ الفاطمہ (")
١٢٧- حشمت النساء بیگم (")
١٢٨- فریدہ بیگم (")
١٣٠- قدریہ سلطانہ بیگم (")
١٣١- فاطمہ بیگم (")
١٣٢- جمیل النساء بیگم (")
١٣٣- قمر النساء (")
١٣٤- سیدہ سراج النساء بیگم (")
١٣٦- سیدہ عزیز النساء بیگم (")
١٣٧- سیدہ النساء بیگم (")
١٣٨- حبیب النساء بیگم (")

۱۴۰۔ رضیہ سلطانیہ (سوم)
۱۴۷۔ رحیم النساء (〃)
۱۴۸۔ دیدارالنساء بیگم (〃)
۱۸۰۔ گوہر زلیخا (〃)
۱۸۳۔ سلمیٰ بیگم (〃)

○

۵۔ مرکز بوتھ (ضلع عادل آباد)

۲۳۴۔ عبدالسمیع (درجہ سوم)
۲۳۵۔ محمد زین العابدین خاں (〃)
۲۳۶۔ پی سنجیوا ریڈی (〃)
۲۳۷۔ محمد اختر علی (〃)
۲۳۸۔ یم نرسمہان داس (〃)
۲۳۹۔ آمنہ بیگم (〃)

○

۶۔ مرکز بودھن (نظام آباد)

۱۰۶۔ جلیل احمد (درجہ سوم)
۱۰۷۔ محمد عبدالمجید (〃)
۱۰۸۔ اسحاق احمد بخشی (〃)
۱۰۹۔ سید احمد (〃)
۱۹۰۔ شیخ داؤد (〃)

○

۷۔ مرکز نظام آباد

۱۹۱۔ محمد عبدالقدیر (درجہ سوم)

۱۹۲۔ محمد عبدالکریم فاروقی (سوم)
۱۹۳۔ سید عظمت اللہ (〃)
۱۹۶۔ حافظ ابراہیم محی الدین (〃)
۱۹۷۔ حافظ محمد عبدالمجید (〃)
۱۹۸۔ محمد عزیز احمد (〃)
۱۹۹۔ سید علی (〃)
۲۰۰۔ محمد سرور (〃)
۲۰۱۔ احمد حسین (〃)

○

۸۔ مرکز محبوب نگر

۲۰۵۔ محمد غوث (درجہ دوم)
۲۱۳۔ احمد اللہ شریف (〃)
۲۱۴۔ محمد عبدالغفار و عبدالکریم (〃)
۲۱۵۔ محمد عبدالغفار ابیسر علی (〃)
۲۳۲۔ محمد کریم الدین (〃)
۲۴۴۔ خیرالنساء بیگم (〃)
۲۰۳۔ محمد ولی الدین (درجہ سوم)
۲۰۴۔ محمد عباس علیخاں (〃)
۲۰۶۔ خلیل خاں (〃)
۲۰۷۔ محمد حسین (〃)
۲۰۸۔ احمد عبدالرحیم (〃)
۲۰۹۔ محمد کمال الدین (〃)
۲۱۰۔ ہیمنت راؤ کلیانی (〃)

۲۱۱۔ محمد قمرالزمان صدیقی (سوم)
۲۱۲۔ محمد حنیف (〃)
۲۱۷۔ سلیم النساء (〃)
۲۱۸۔ کریم النساء (〃)
۲۲۰۔ علی احمد (〃)
۲۲۳۔ سعیدہ سلطانہ (〃)
۲۴۲۔ سید رفعت اللہ کاظمی (درجہ سوم)
۲۴۳۔ رحیم النساء بیگم (〃)
۲۴۵۔ سید علی ابراہیم (〃)
۲۴۶۔ سید مسعود علی (〃)
۲۴۷۔ محمد شبیر علی (〃)
۲۴۹۔ افضل خاں (〃)

۹۔ مرکز نشرل جیل (حیدرآباد)

۱۵۱۔ سید عزیز احمد حمدانی (درجہ دوم)
۱۵۵۔ ایشور بھگت (〃)
۱۵۷۔ محمد غوث (〃)
۱۵۴۔ جی نرسملو (سوم)

اردو فاضل

۱۔ مرکز انوارالعلوم کالج (حیدرآباد)

۱۔ احمد رسول (درجہ دوم)

نوٹ: امتحان میں ناجائز ذرائع استعمال کرنے کی پاداش میں رول نمبر ۲۵ کو دو امتحانات اور رول نمبر ۲۴۷، ۲۳۴ کو ایک امتحان میں شرکت کی اجازت نہ ہوگی۔

نتائج اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

منعقدہ ڈسمبر ۱۹۶۷ء

امتحان اردو دانی

۱- مرکز آرمور (نظام آباد)

۱- سید معصوم حسین انور (امتیاز)

٥

۲- مرکز جے سی اسکول (حیدرآباد)

۲۳- گوردھن لال (امتیاز)

۲- محمد بشیر (کامیاب)

۵- محمد ہاشم (")

۷- عبدالستار (")

۸- محمد شریف (")

۹- نذیر (")

۱۴- محمد وحید (")

۱۵- محمد شرف الدین (")

۱۷- محمد یوسف (")

۱۸- محمد شریف (")

۲۰- علی بشیر (")

۲۲- محمد صابر (کامیاب)

اردو زبان دانی

۱- مرکز آرمور (نظام آباد)

۱- محمد عبدالرزاق (درجہ سوم)

۲- محمد احمد (")

۳- محمد عبدالجلیل (")

٥

۲- مرکز جے سی اسکول (حیدرآباد)

۹- محمد احمد (درجہ دوم)

۱۵- علی خان (")

۱۰- محمد سلیم (درجہ سوم)

۱۲- انجم حسینی (")

۱۳- عظیم الدین (")

۱۹- ایوب بن احمد (")

۲۱- عبدالرزاق (")

٥

۳- مرکز ناگرکرنول (محبوب نگر)

۲۳- محمد مصلح الدین احمد (درجہ دوم)

۳۵- محمد محمود علی (")

۳۷- رضیہ بیگم (")

۳۹- قمر جہاں (")

۲۴- محمد حیات (درجہ سوم)

۲۵- محمد معین الدین (")

(۲۶)- محمد امجد اللہ (")

۲۷- محمد اسحاق (")

۲۸- محمد رؤف الدین (")

۳۰- محمد نظام الدین (")

۳۴- محمد عطاء الرحمن (")

۳۶- محمد غیاث الدین (")

۳۷- محمد محبوب حسین (")

۳۸- محمد بشیر (")

۳۹- سید حامد حسین (")

۴۰- محمد رشید احمد (")

۴۱- سید اقبال علی سلیم (")

۴۲- محمد لیاقت علی (")

۴۳- خواجہ معین الدین (")

۴۵- سید نعیم اللہ حسین (")

۴۶- محمد محبوب علی (")

۴۸- عابدہ بیگم (")

٥

۴- مرکز انوار العلوم شعبۂ تبلیغ (حیدرآباد)

۵۱- سعیدہ بانو (درجہ دوم)

۵۲- حسن بانو (")

اردو عالم

۱- مرکز آرمور (نظام آباد)

۲- احمد عبدالحمید (درجہ سوم)

۳- محمد عبدالسمیع (درجہ سوم)
۴- محمد شریف الرحمٰن (")
۵- سید خواجہ معین الدین (")
۸- شیخ احمد (")
۹- لطیف النساء (")
۱۰- سلطانہ بیگم (")

O

۲- مرکز میسور (کرناٹک)
۱۹۵- بی جبین سلطانہ (درجہ دوم)
۱۹۶- عزت النساء (")
۱۹۷- یس، قمر النساء (")
۱۹۸- مہر النساء (")
۱۸۷- محمد اسلم (درجہ سوم)
۱۸۸- میر عزیز الدین (")
۱۹۴- خالدہ باقر (")

O

۳ مرکز ناگر کرنول (محبوب نگر)
۱۱۷- محمد حسین (درجہ دوم)
۱۱۸- محمد موسیٰ (")
۱۱۹- محمد سراج الدین (")
۱۲۰- شیخ سیادت سلطان (")
۱۲۳- شیخ قطب الدین شہنشاہ (")
۱۲۵- قمر سلطانہ (")
۱۱۴- محمد عبدالمجید (درجہ سوم)
۱۱۵- محمد تراب علی (")
۱۱۶- محمد انیس اقبال (")
۱۲۲- شیخ مسعود (")

O

۴ مرکز بانسواڑہ (ضلع نظام آباد)
۲۳- محمد عبدالسلیم (درجہ دوم)
۲۴- محمد صبغت اللہ الصلاحی (")
۳۲- ناصرہ بیگم (")
۱۱- جلیل احمد (درجہ سوم)
۱۴- سید عثمان (")
۱۶- سید حسین (")
۲۱- محمد سلیم الدین (")
۲۲- شیخ اکرام حسین (")
۲۵- سید عنایت الحسن (")
۲۷- شیخ احمد حسین (")
۲۸- محمد عارف حسین (")
۲۹- محمد اطہر حسین (")
۳۰- محمد ابطال حسن (")
۳۱- ممتاز بیگم (")

۳۳- نور جہاں بیگم (درجہ سوم)

O

۵- مرکز کرنول (آندھرا پردیش)
۳۷- سید عارف اللہ حسینی (درجہ دوم)
۴۲- قادر ولی شیخ (")
۴۳- عبدالرشید (")
۴۴- عبدالکریم (")
۴۵- حافظ عبداللطیف (")
۳۴- ایس، خواجہ حسین (درجہ سوم)
۳۸- عبدالرحیم خاں (")
۴۹- ایم، عبدالواحد (")
۵۰- حفیظ الرحمٰن (")
۵۱- سید سلیم باشاہ (")
۵۲- سید ابوالحسن حسینی (")
۵۴- ڈی، نظام الدین (")
۵۵- مرشد بصیر (")
۵۶- محمد فضل الرحیم (")
۵۷- عبدالحمید خاں (")
۵۸- سید حسین (")
۶۰- محمد مصطفیٰ حسین (")

۶- مرکز محبوب نگر (آندھرا پردیش)
۶۲- محمد اسحاق (درجہ دوم)
۶۷- محمد عبدالجلیل (")

۶۸- محمد مخدوم علی (درجہ دوم)
۶۹- سید اختر علی شاہ (")
۷۰- راما چاری (")
۷۵- خواجہ معین الدین (")
۹۸- میمونہ بیگم (")
۹۹- سلطانہ بیگم (")
۱۰۰- اقبال النساء بیگم (")
۱۰۹- بی، راما نجا (")
۱۰۲- طیبہ مبین زبیری (")
۶۴- گوردھن داس (درجہ سوم)
۶۶- ٹی، گرن، سنگھ (")
۷۲- خواجہ نثار الدین احمد (")
۷۳- محمد عبدالستار (")
۷۴- احمد حسین (")
۷۵- محمد اسحاق (")
۷۷- محمد غلام دستگیر قریشی (")
۷۸- سید وزیر الدین (")
۷۹- میر فرخندہ علی (")
۸۱- محمد خواجہ ذوقی (")
۸۲- محمد مقصود علی (")
۸۳- شیخ محمد (")
۸۵- محمد حبیب الرحمٰن نیاز (")
(۸۷) محمد عبدالعزیز (")

٨٧- محمد باقر شریف (درجہ سوم)
٨٨- جے شنکر راؤ (")
٨٩- محمد عمر شریف (")
٩٠- خواجہ شمس الدین (")
٩٢- ٹھاکر کشن سنگھ (")
٩٣- محمد عبدالرؤف (")
٩٤- محمد رشید الدین (")
٩٥- محمد خلیل الرحمن (")
١٠٣- شریفہ بی (")
١٠٦- محبوب خاتون (")
١٠٧- فرحت النساء (")
١١٠- بدر سلطانہ (")
١١٢- مہر النساء (")

○

٧- مرکز انوار العلوم کالج
حیدرآباد دکن

١٣١- سید شاہ حیدر حسینی (درجہ دوم)
١٣٢- میر رضا علی کاظمی (")
١٣٧- میر عارف علی (درجہ دوم)
١٣٩- محمد خیر الدین (")
١٤١- محمد عبدالعزیز (")
١٤٥- اشفاق احمد (")
٢٦- عبدالقدیر (")
٥٦- شیخ علی (")
٦٢- زاہدہ بیگم (")
١٥٥- محمد نعیم الدین (")
١٦٠- سیدہ پروین (")
١٦٨- اقبال بانو (")
١٧٩- خورشید بانو (")
١٢٦- خواجہ معین الدین احمد (سوم)
١٢٧- محمد عبدالرحیم (")
١٣٨- سکندر علی (")
١٣٨- سید خواجہ معین (")
١٤٠- شیخ ابراہیم (")
١٤٢- محمد باسط علی (")
١٤٣- سید سلطان (")

١٥١- محمود علی خان (درجہ سوم)
١٥٢- محمد آصف حسین (")
١٥٤- محمد عبدالحفیظ (")
١٨٦- محمد محبوب علی رشید (")
٢٠١- سید حسن عابد زیدی (")
١٥٨- محمودہ بیگم (")
١٥٩- رحمت النساء بیگم (")
١٦٣- رفیق النساء بیگم (")
١٦٩- شہناز بیگم (")
١٧٠- سرفراز بیگم (")
١٧٤- رشیدہ
شرف الدین خان (")
١٧٥- سیدہ خاتون (")
١٧٧- فضل النساء بیگم (")
١٨٢- ثروت سلیمین (")

○

فہرستِ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اُردو

بہ لحاظ حروف تہجی

جنوبی ہند (حیدرآباد دکن) کے سب سے بڑے علمی و ادبی مرکز ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے قیام ۱۹۳۱ء سے اب تک تقریباً تین سو نو (۳۰۹) کتابیں مختلف موضوعات پر شائع کی ہیں جن میں ادب، تحقیق، تنقید، تذکرہ۔ شاعری۔ افسانہ، تاریخ کلچر، سائینس ادب اطفال، سوانح۔ رپورٹیں۔ ترجمے۔ دکنیات۔ غرض سبھی موضوعات شامل ہیں۔

ادارۂ ادبیات اُردو نے خصوصاً دکنی کلچر اور تہذیب و ادب کے نادر اور اہم گوشوں پر گرانقدر ادب پیش کیا ہے اس کی کئی کتابیں ادب میں نہ صرف حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ سنگ میل قرار دی گئی ہیں۔ علمی۔ ادبی اور تحقیقاتی کام کرنے والوں کے نزدیک تو یہ مطبوعات اوراق گرانقدر سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ادارہ کی کئی ایک کتابیں اپنی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر سررشتہ تعلیم کے نصاب میں شامل ہوگئی ہیں۔ ذیل میں اب تک شائع شدہ مطبوعات ادارہ کی ایک مکمل فہرست بہ لحاظ حروف تہجی شائع کی جا رہی ہے۔ جس کتاب پر یہ ⊗ علامت ہو اسے خارج از اشاعت سمجھا جائے۔ (ادارہ)

سلسلہ نمبر	نام کتاب	مصنف / مرتب	قیمت	سلسلہ نمبر	نام کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۱	آب دوز اور سرنگ	فیض محمد صدیقی	۷۵ پیسے	۶	اُردو انسائیکلوپیڈیا	ادارۂ ادبیات اردو	۱/۲۵
۲	آبگینۂ شعر (۲ جلد)	بشیر النساء بیگم بشیر	۶/- روپے	۷	اردو دانی کی پہلی کتاب	اظہر الدین	-/۲۵
۳	آریائی زبانیں ⊗	ڈاکٹر سدھیشور ورما	۱/۵۰	۸	اردو دانی کی دوسری کتاب	اظہر الدین	-/۴۰
۴	ادبی تحریریں	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۲/۰۰	۹	اردو کی لاج	بشیر النساء بیگم بشیر	-/۱۵
	(مجموعہ مضامین ڈاکٹر زور)			۱۰	اردو مثنوی کا ارتقاء ⊗	پروفیسر عبدالقادر سروری	۲/-
۵	اردو املا	مولوی غلام رسول	-/۵۰	۱۱	اردو میں سائنسی ادب	خواجہ حمید الدین شاہد	۱/۵۰

۱۲	ارمغانِ امجد	خواجہ حمید الدین شاہد	۱/۰۰	۳۵	تاریخ ناندیڑ دکن	احمد علی بیگ چغتائی	۲/۰۰
۱۳	ارمغانِ جذب	راگھویندر راؤ جذب	۱/۰۰	۳۶	تحفۃ الشعراء (آغا افضال)	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۳/-
۱۴	ارمغان محمد قلی شاہ ۵	ادارہ	-/۵۰	۳۷	تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول ⊗	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۷/۰
۱۵	اسلامی عدل گستری	عبد الحفیظ صدیقی	۱/۶۲	۳۸	" " جلد دوم ⊗	" " "	۷/۰
۱۶	اشوک اعظم	سیدہ مہدی جعفری	۱/۵۰	۳۹	" " جلد سوم	" " "	۷/۰
۱۷	اقبال کا تصور عشق	ڈاکٹر غلام عمر خاں	۱/۷۵	۴۰	" " جلد چہارم	" " "	۷/۰
۱۸	اقبال کا تصور خودی	"	۳/۰۰	۴۱	" " جلد پنجم	" " "	۷/۰
۱۹	انوار	علی اختر	۲/۰۰	۴۲	تذکرہ نوادر ایوان اردو	" " "	۷/۰
۲۰	ایوانِ سخن	پروفیسر سید محمد	-/۷۵		جلد اول		
۲۱	باتیں	شجاع احمد قائد	۱/۰	۴۳	ترجمان زندگی	سید علی منظور	۲/۵۰
۲۲	بادۂ سخن ۵	ڈاکٹر زور	-/۷۵	۴۴	تعلیم کا مسئلہ	ڈاکٹر رضی الدین صدیقی	۱/۰
۲۳	باغ و بہار (ایڈیشن)	"	۲/۰۰	۴۵	تماشائے اہل ہنر	رشید الحسن ایم ۔ اے	۱/۵۰
۲۴	برف میں آگ	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	۲/۰۰	۴۶	تنویر تخیل	نجم الدین صدیقی	۳/۵۰
۲۵	بلاغت	ڈاکٹر سلیم اللہ حسینی	-/۷۵	۴۷	ٹھنڈی بجلیاں	بھارت چند کھنہ	۲/۰
۲۶	بلقان	عبد الحفیظ صدیقی	-/۷۵	۴۸	ٹیگور رابندر ناتھ کی شاعری ⊗	مخدوم محی الدین	۲/۵۰
۲۷	بہمنی سلطنت	پروفیسر مجید صدیقی	۲/۵۰	۴۹	جب میں طالب علم تھا	شاہ غیاث	-/۲۵
۲۸	پانی کی کہانی	فیض محمد صدیقی	-/۷۵	۵۰	چیونٹی ⊗	ڈاکٹر منور راج سکسینہ	-/۷۵
۲۹	پن چکی	مبارز الدین رفعت	۲/۰	۵۱	حدیقۃ السلاطین (فارسی)	علی اصغر بلگرامی	۱۰/-
۳۰	پودوں کی کہانی ⊗	پروفیسر سعید الدین خاں	۱/۰۰	۵۲	حرف شیریں	قاضی غلام محمد	۱/۵۰
۳۱	تاریخ ادب اردو	ادارہ	۲/۰۰	۵۳	حیات بخشی بیگم	نصیر الدین ہاشمی	-/۷۵
۳۲	تاریخ ادبیات عربی ⊗	سید ابو الفضل	۳/۰۰	۵۴	حیدرآباد	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	-/۶۲
۳۳	تاریخ باکنڈہ	منشی فیض الدین	۲/۵۰	۵۵	حیدرآباد فرخندہ بنیاد	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۲/۵۰
۳۴	تاریخ سیاسیات	پروفیسر مجید صدیقی	۳/۵۰	۵۶	حیدرآباد کے بڑے لوگ	غلام پنجتن شمشاد	۲/۰

۵۸	خطابیات	ڈاکٹر رحیم الدین کمال	۱/۷۵	۸۰	سب رس (بہادر شاہ ظفر)	محمد اکبر الدین صدیقی	۱/-
۵۹	دادا بھائی نوروزجی	ظہیر الدین احمد	-/۲۵	۸۱	" (ٹیگور نمبر)	" "	۱/-
۶۰	دارالعلوم کے سپوت	حافظ محمد مظہر	۱/۰۰	۸۲	" (زور نمبر با تصویر)	" "	۲/-
۶۱	داستان ادب حیدرآباد	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۱/۵۰	۸۳	" (عزیز جنگ نمبر)	" "	-/۵۰
۶۲	دفتری معلومات	ظہیر الدین احمد	-/۲۷	۸۴	" (یادگار علی نمبر ۱۹۶۶)	" "	۱/-
۶۳	دکنی ہند و اردو	نصیر الدین ہاشمی	۳/۵۰	۸۵	سچ کا جادو	عبدالحبیب الحضرمی	-/۵۰
۶۴	دیوان عشق اورنگ آبادی	محمد اکبر الدین صدیقی	۲/-	۸۶	سراج سخن	پروفیسر عبدالقادر سروری	۱/-
۶۵	دیوان ہاشمی بیجاپوری	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۲/-	۸۷	سرسید احمد خاں	ظہیر الدین احمد	۱/-
۶۶	رادھا اور رنگ محل	وزیر حسن دہلوی	۱/۵۰	۸۸	سرگزشت ادارہ	خواجہ حمید الدین شاہد	۲/-
۶۷	راہبر و کاروان	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۲/-	۸۹	سرگزشت حاتم	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۲/-
۶۸	رباعیات الہام	ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ	۲/۵۰	۹۰	سرگزشت غالب	" "	۱/-
۶۹	رسائل طیبہ	طیبہ بیگم	۳/۰۰	۹۱	سروجنی نائیڈو	وزیر حسن دہلوی	۲/-
۷۰	رفیق اردو داں	مرزا عظمت اللہ بیگ	۳/۲۵	۹۲	سلک گوہر	جلال الدین اشک	-/۵۰
۷۱	رم جھم	سری کرشن سنہا	۱/۵۰	۹۳	سلسلہ سوانح سلاطین آصفی	سید مراد علی طالع	۲/-
۷۲	رموز فن (چہار رسائل رمز)	ڈاکٹر زور	۱/۰۰		باتصویر (۶) کتابوں کا سیٹ		
۷۳	روح غالب	" "	۳/۰۰	۹۴	سمندری عجائبات	احمد حسین نقوی	۱/۲۵
۷۴	ریاض مختاریہ	دلاور علی دانش	۵/-	۹۵	سوغات ادارہ ⊗	ادارہ	۱/۵۰
۷۵	زہریلے پودے	ڈاکٹر عبدالسلام	-/۷۵	۹۶	شاد و اقبال ⊗	ڈاکٹر زور	۳/-
۷۶	سالنامہ ایوان اردو (انگریزی)	سید دلدار حسین	۲/-	۹۷	شعرائے عثمانیہ	معین قریشی و باقی صدیقی	۲/-
۷۷	سائنس کے کرشمے	میر حسن	۱/-	۹۸	سیر گولکنڈہ ⊗	ڈاکٹر زور	۱/-
۷۸	سالونی اور دوسرے ڈرامے	مرزا اظہر افسر	۱/-	۹۹	طالب و موہنی	" "	۱/۵۰
۷۹	سب رس (ابجد نمبر)	محمد اکبر الدین صدیقی	۲/-	۱۰۰	طبیعیاتی کائنات	پروفیسر محمود علی خاں	-/۷۵

۱۰۱	طلسم تقدیر	ڈاکٹر زور	۱/-
۱۰۲	عرب اور عربستان	جہاں بانو نقوی	-/۷۵
۱۰۳	عروض	ڈاکٹر کلیم اللہ حسینی	۱/۸۵
۱۰۴	علم خانہ داری	محمودہ صدیقی	/۵۰
۱۰۵	عمادالملک	فیض محمد صدیقی	/۵۰
۱۰۶	فن تقریر	ادارہ	۱/۵۰
۱۰۷	فکر مت کرو	قاضی زین العابدین	۲/-
۱۰۸	فیض سخن ⊗	ڈاکٹر زور	-/۷۵
۱۰۹	فہرست کتب خانہ	مولوی غلام رسول	۳/-
	مطبوعات (جلد اول)	محمد اکبرالدین صدیقی	
۱۱۰	" (جلد دوم)	" "	۲/۷۵
۱۱۱	" جلد سوم	" "	۲/۵۰
۱۱۲	قطب شاہی سلاطین اور آندھرا سنسکرتی انگریزی	ڈاکٹر زور	۱/۲۵
۱۱۳	قواعد اردو امتحانات ادارہ	شعبہ اردو امتحانات	-/۲۵
۱۱۴	قطب شاہی سلاطین اور آندھرا سنسکرتی (تلگو)	ڈاکٹر رام راجو	۲/-
۱۱۵	کاغذ کی ناؤ	میر محمد علی خاں میکش	۱/۵۰
۱۱۶	کشاکش ثانی ⊗	شجاع احمد قائد	-/۷۵
۱۱۷	کلمۃ الحقائق (جانم)	محمد اکبرالدین صدیقی	۲/-
۱۱۸	کلیات غواصی	پروفیسر محمد بن عمر	۳/-

۱۱۹	کیف و کم	یوسف ناظم	۱/-
۱۲۰	کیف سخن ⊗	ڈاکٹر زور	۷۵
۱۲۱	گارساں دتاسی	ڈاکٹر زور	
۱۲۲	گریہ و تبسم ⊗	صاحبزادہ میکش	/-
۱۲۳	گاندھی جی	خورشید احمد جامی	۵
۱۲۴	گنج طلسم (ڈرامہ)	ڈاکٹر زور	۵۰
۱۲۵	لیلیٰ	عظیم النساء بیگم	۰
۱۲۶	مال والوں کی تاریخ	مراد علی طالع	۵
۱۲۷	ماہ لقا اور دوسری نظمیں	عزیز احمد	۲۵
۱۲۸	متاع سخن ⊗	ڈاکٹر زور	۷۵
۱۲۹	مجموعہ نظم حالی	ادارہ	۷۵
۱۳۰	محبت کی چھاؤں	مرزا ظفر الحسن	۵۰
۱۳۱	محمد حسین آزاد	جہاں بانو نقوی	۵۰
۱۳۲	محمد قلی کی جیون کہانی	وقار خلیل	۵۰
۱۳۳	مختار الملک سالار جنگ	فیض محمد صدیقی	۰
۱۳۴	مدراس میں اردو ⊗	نصیر الدین ہاشمی	۱/-
۱۳۵	معانی سخن (انتخاب)	ڈاکٹر زور	۵۰
۱۳۶	کلام محمد قلی قطب شاہ		
۱۳۷	معلم باغبان	سید زاہد حسین	/-
۱۳۸	مکاتیب سلاطین قطب شاہیہ بنام شاہان مغلیہ (ایران فارسی)	عباس علی خاں	زیر

۱۳۹	مکتوبات شاد عظیم آبادی	ڈاکٹر زور	۴/-	۱۶۲	دہلی	وزیر حسن دہلوی	۵/۵۰
۱۴۰	من کی دنیا	رشید قریشی	۱/-	۱۶۳	ہمارے پھول	پروفیسر محمد سعید الدین	۱/-
۱۴۱	مرقع سخن (جلد اول) ⊗	ڈاکٹر زور	۵/-	۱۶۴	ہندوستانی تمدن	ڈاکٹر ایشور ٹوپا	۲/۲۵
۱۴۲	" (جلد دوم)	" "	۷/-	۱۶۵	ہوش کے ناخن ⊗	میر حسن اور مخدوم محی الدین	—
۱۴۳	مرقع زور	ادارہ سب رس	۱/-	۱۶۶	طلینیا	فضل الرحمٰن	۱/-
۱۴۴	مسلمان شاہی خاندان	محمد عبدالرحمٰن خاں	۵/-	۱۶۷	یاد امجد	محمد اکبر الدین صدیقی	۲/-
۱۴۵	مشاہیر قندھار دکن	محمد اکبر الدین صدیقی	۱/۵۰	۱۶۸	یاد معانی	" " "	۱/-
۱۴۶	مغربی تصانیف کے اردو تراجم	میر حسن	۱/۵۰	۱۶۹	یادگار جشن سیمیں	حمید الدین شاہد	۱/-
۱۴۷	مقام غالب	مبارز الدین رفعت	۲/-	۱۷۰	یادگار زور	محمد اکبر الدین صدیقی	۶/-
۱۴۸	مقدمۂ تاریخ دکن	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	۱/۷۵	۱۷۱	یادگار صفی اورنگ آبادی	حمید الدین شاہد	۱/۷
۱۴۹	مولانا ابوالکلام آزاد	وقار خلیل	/۵۰	۱۷۲	یادگار محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر زور	/۱۵
۱۵۰	مینوں کی کہانیاں	حبیب ابراہیم	/۷۵	۱۷۳	یادگار نصیر الدین ہاشمی	محمد اکبر الدین صدیقی	۲/-
۱۵۱	میاں داد خاں سیاح	ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	۲/-	۱۷۳	یورپ جنگ سے پہلے	پروفیسر ہارون خاں شیروانی	۲/۵۰
۱۵۲	میر محمد مومن	ڈاکٹر زور	۳/۰	۱۷۴	ارسطو جاہ ⊗	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	—
۱۵۳	نذرِ دکن	سکینہ بیگم	۱/۵۰	۱۷۵	ہندوستانی قومیت کا تمدنی پہلو	ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا	۱/۲۵
۱۵۴	نذر محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر زور	۵/-				
۱۵۵	نذر معانی	وقار خلیل					
۱۵۶	نذر ولی	جہاں بانو نقوی	۳/۵۰				
۱۵۷	نذر پروین	عزیز یار جنگ عزیز	۱/۵۰				
۱۵۸	نمود زندگی	سید علی منظور	۲/-				
۱۵۹	نقد سخن ⊗	ڈاکٹر زور	/۷۵				
۱۶۰	نیل کنول مسکائے	محمود حسین بدخشی	۲/۵۰				
۱۶۱	ورڈسورتھ اور اس کی شاعری	میر حسن	۱/۵۰				

ادارۂ ادبیات اردو کے صدور، نائب صدور، کارکن، مجلسین اور شعبے ایوان اردو ایک نظر

۱۸ر جنوری ۱۹۳۱ء ادارۂ ادبیات اردو قائم ہوا۔
۴ر جنوری ۱۹۴۱ء نواب بہی زین یار جنگ کے ہاتھوں عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ ۲ر جنوری ۱۹۴۳ء حضرت خواجہ حسن نظامی نے عمارت کا نام ایوان اردو تجویز فرمایا۔
۲۰ر جنوری ۱۹۵۵ء ادارے کی سلور جوبلی منائی گئی۔
۵ر اپریل ۱۹۵۵ء مجلس انتظامی نے محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ سے [illegible] ادارے کے لئے زمین عطا کرنے کی خواہش کی
۲ر اکتوبر ۱۹۵۵ء بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور نے اس قطعہ زمین کی ادارے کے نام بطور عطیہ رجسٹری کرادی۔
۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۵ء نواب زادہ ریاض الدین نظامی چیف ٹاؤن پلانر نے نقشہ مکمل کیا۔

۶ر نومبر ۱۹۵۵ء حیدرآباد کے چیف منسٹر ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ نے سنگ بنیاد رکھا۔ حکومت آندھرا پردیش کے علاوہ صدر نظام، سر جیمس ٹرسٹ، سالار جنگ اسٹیٹ، نظام ٹرسٹ، گرانٹ کمیشن، ریاستی ... عوامی عطیہ اور چندوں سے متعلق قواعد کی تکمیل کی صورت میں ... لاکھ روپیوں کے صرفہ سے اس کی تکمیل ہوئی
۱۵ر مارچ ۱۹۶۰ء بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر نے اس ایوان کا افتتاح فرمایا۔ اور
جناب بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش نے افتتاحی جلسے کی صدارت فرمائی

۱- ادارے کے صدور

نواب سر مہدی یار جنگ بہادر
۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۷ء
نواب لیاقت جنگ بہادر
۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء
نواب زین یار جنگ بہادر
۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۱ء
پروفیسر سید علی اکبر
۱۹۶۱ء

۳- نائب صدور

نواب لیاقت جنگ بہادر
۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۷ء
نواب زین یار جنگ بہادر
۱۹۴۰ء ۱۹۵۸ء
پروفیسر سید علی اکبر
۱۹۴۱ء تا ۱۹۶۰ء
پروفیسر عبدالمجید صدیقی
۱۹۵۸ء
جناب سید دلدار حسین صاحب ۱۹۶۱ء
راجہ جانکی پرشاد صاحب
۱۹۶۲ء
محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ
۱۹۶۶ء

۴- مجلس انتظامی

صدر: پروفیسر سید علی اکبر صاحب
نائب صدر: پروفیسر محمد عبدالمجید صدیقی صاحب
" راجہ جانکی پرشاد صاحب
" محترمہ تہنیت النساء بیگم صاحبہ
اراکین: جناب بی ایچ گپتا صاحب
جناب حامد علی عباسی صاحب
جناب سید دلدار حسین صاحب
نواب عنایت جنگ بہادر
جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب
جناب سید شاہ تقی الدین قادری صاحب
جناب من راج سکسینہ
جناب میر سراج الدین طالب خاں صاحب
جناب میر حسن صاحب
ڈاکٹر راشم امیر علی صاحب
جناب عارف الدین حق صاحب
معتمد اعزازی: ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ

۲- ادارے کے معتمدین

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۱۹۳۱ء تا ۱۹۶۲ء
ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ ۱۹۶۲ء

۵- مجلس اشاعت تاریخ و تمدن

صدر: پروفیسر عبدالمجید صدیقی
اراکین: نواب عنایت جنگ بہادر
جناب آغا حیدر حسن ضابط
نواب عباس حسین صاحب
ڈاکٹر چراغ علی حقیر لکچرار

— ... —

معتمد
جناب میر سراج الدین طالب خاں صاحب

۶۔ مجلس تعلیم بالغان و اردو امتحانات	۷۔ مجلس انتظامی "سب رس"	۸۔ مجلس نشر و اشاعت
صدر :۔ پروفیسر سید علی اکبر اراکین :۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی جناب رائے جانکی پرشاد صاحب پروفیسر سید محمد صاحب مولوی غلام رسول صاحب جناب نصیر الدین صاحب نظامی جناب محمد منظور احمد صاحب جناب محمد اکبر الدین صدیقی جناب کنول پرشاد صاحب کنول محترمہ ڈاکٹر خالدہ بیگم صاحبہ معتمد : جناب عارف الدین حسن صاحب	نگران :۔ پروفیسر سید علی اکبر مولوی میر حسن صاحب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جناب رمن راج سکسینہ صاحب ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب جناب محمد منظور احمد صاحب منتظم :۔ وقار خلیل صاحب مہتمم : محمد جمال الدین صاحب معتمد :۔ جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب	صدر :۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی اراکین :۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی پروفیسر ایم اے رحمٰن جناب میر عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب جناب وقار خلیل صاحب جناب منظور احمد صاحب معتمد :۔ محمد محمود حسین صاحب
۹۔ مجلس انتظامی کتب خانہ	۱۰۔ مجلس ادب اطفال	۱۱۔ مجلس انتظامی اردو انسائیکلوپیڈیا
اراکین :۔ نواب عنایت جنگ بہادر پروفیسر عبدالمجید صدیقی جناب خواجہ محمد احمد صاحب جناب مولوی غلام رسول صاحب معتمد :۔ جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب	صدر :۔ شری پی ہنمنت راؤ (ایم پی) ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد عمومی جناب دھرمیندر پرشاد صاحب جناب مرزا سرفراز علی بیگ صاحب جناب مرزا علی صاحب طالع جناب وقار خلیل صاحب جناب محمد منظور احمد صاحب معتمد : ڈاکٹر محمد مصلح الدین صاحب	صدر :۔ پروفیسر سید علی اکبر پروفیسر عبدالمجید صدیقی ڈاکٹر محمد محسن محشر عابدی جناب خواجہ یوسف الدین صاحب رائے جانکی پرشاد صاحب ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب معتمد :۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ
عملہ دفتر ادارۂ ادبیات اردو جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب آفس سکریٹری (اعزازی)	جناب محمد جمال الدین صاحب منتظم ادارہ جناب رصیص الدین صاحب انصاری (لائبریرین) جناب وقار خلیل صاحب منتظم کتب [illegible]	محمد عبداللہ صاحب کار پرداز محمد نذیر الدین صاحب چوکیدار

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد (اے-پی)

تختہ آمد و خرچ من ابتدائے اپریل ١٩٦٦ء تا ٣١/ مارچ ١٩٦٧ء

خرچ	روپے	پیسے	روپے	پیسے
اخراجات مطبوعات				
اخراجات اشاعت و خریدی کتب برائے فروخت بشمول ڈاک خرچ			٣١٧	٣٣
" معاوضہ مصنفین			٦٥٠	٠٠
" اشاعت سب رس				
ا - اخراجات طباعت بشمول قیمت کاغذ	2,215	٩٥		
ب - متفرق و ڈاک خرچ	٩٢	٩٩	٢،٣٠٨	٩٤
اخراجات برائے معمول کا باغ			٢٢	٥٠
" اردو امتحانات			١،٧٠	٢٠
" کتب خانہ				
(١) تنخواہ عملہ کتب خانہ	١،١١٠	٠٠		
(٢) صادر و متفرق اخراجات	٢١	٩٧	١،١٣١	٩٧
علمی و ثقافتی مصروفیات و تقاریب				
(١) علمی و ادبی مصروفیات	٥١	٥٠		
(٢) یوم محمد قلی قطب شاہ	٧٣٨	٨٩		
(٣) " زور	٤٥٥	٧٩	١،٢٤٦	١٨
اخراجات دفتر ادارہ				
(١) تنخواہ عملہ دفتر	٣،٢٦٠	٠٠		
(٢) ٹیلیفون، بجلی اور پانی	١،٠٨٤	١٨		
(٣) صادر، طباعت، ڈاک خرچ	١١٢	٨٧		
(٤) متفرق اخراجات	٢٨٤	٦٦		
(٥) آڈٹ فیس	١٠٠	٠٠	٥،٠٨١	٧١
ادائی بہ محترمہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر زورؔ برائے تنصیب سنگ مزار			٥٠٠	٠٠
" پیشگی برائے اخراجات			٨٥٠	٠٠
سلک اختتامی نقد و بنک				
(ا) نقد	٣،٠٣٨	٩١		
(ب) نقد سلک در اسٹیٹ بنک صدر دفتر	٧،٦١٧	٤١		
(ج) اسپیشل سیونگس بنک اکاونٹ در کنٹرا بنک				
(١) ادارہ کھاتہ ١٩١ = ٠٣				
(٢) سب رس " ٢٠ ٤ = ٢١	٦١١	٢٤		
گلگشن اکاونٹ جی رگھوناتھ مل بنک ضم شدہ بہ کنٹرا بنک لمیٹڈ	١٥٨	٩٠		
فکسڈ ڈپازٹ در اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد (صدر دفتر)	٦،٠٧٦	٠٣	١٧،٥٠٢	٤٩

تصدیق شد [illegible] ڈاکٹر سید [illegible] صدر ادارہ

تصدیق شد [illegible] معتمد [illegible]

صدر ادارہ ٩-٣-١٩٦٤ [illegible]

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد (اے۔پی)

تختہ آمدنی ابتدائے یکم اپریل ۱۹۶۶ء لغایتہ ۳۱ / مارچ ۱۹۶۷ء

آمدنی	روپے	پیسے	روپے	پیسے
سلک اتفاقی				
ا۔ نقد رقم	۱,۵۵۵	۵۵		
ب۔ رقم در کرنٹ اکاونٹ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد (صدر دفتر)	۶,۷۴۴	۴۱		
ج۔ ،، اسپیشل سیونگس بنک اکاونٹ کنٹرا بنک لمیٹڈ حیدرآباد				
۳۔ ۱۸۴۲ ادارہ اکاونٹ (۱)				
۲۱ ۳۰۴۳ سب رس اکاونٹ (۲)	۵۸۸	۲۴		
د۔ کلکشن اکاونٹ جی رگھوناتھ مل بنک ضم شدہ بہ کنٹرا بنک لمیٹڈ	۱۵۸	۹۰		
ہ۔ فکسڈ ڈپازٹ بہ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد (صدر دفتر)	۵,۶۲۴	۳۲	۱۳,۶۶۹	۴۲
آمدنی از مطبوعات ادارہ			۱۰,۶۵۲	۵۰
آمدنی از ماہنامہ سب رس				
ا زر سالانہ	۲۴	۷۱		
ب معاوضہ اشتہارات	۱۳۰	۰۰		
ج فروخت نمونہ و قدیم شمارے	۱۶	۶۸	۳۸۷	۳۹
آمدنی از کار باغ			۱۰۷	۱۵
امداد از حکومت ہائے ہند و آندھرا پردیش				
ا۔ از حکومت آندھرا پردیش				
(۱) ۹,۰۰۰ = ۰۰ برائے امداد باہمی ادارہ بابتہ ۱۹۶۶-۶۷ء				
(۲) ۵,۰۰ = ۰۰ ،، تقاریب یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۶۷ء	۶,۵۰۰	۰۰		
ب۔ از حکومت ہند				
برائے امداد ادارہ بابتہ ۱۹۶۶-۶۷ء	۲,۵۰۰		۹,۰۰۰	۰۰
آمدنی از امتحانات اردو				
فیس امتحانات مع رجسٹریشن، فارمی صداقت نامہ جات، قیمت فارم شرکت و قواعد و ضوابط و پرچہ جات سوالات سال گزشتہ			۱,۶۳۷	۷۰
عطیات: (۱) برائے یوم محمد قلی قطب شاہ	۱۲۷	۵۷		
(۲) ،، یوم اردو	۳۱	۰۰	۱۵۸	۵۷
امداد از محکمہ بلدیہ حیدرآباد برائے دارالمطالعہ ادارہ			۳۰	۰۰
آمدنی از منافع کھاتہ جات بنک				
فکسڈ ڈپازٹ	۴۵۱	۱۲		
(۱) ۷ = ۰۰ سیونگس بنک اکاونٹ ادارہ				
(۲) ۱۶ = ۰۰ ،، ،، سب رس	۲۳	۰۰	۴۷۴	۴۱
آمدنی متفرق				
ا۔ آمدنی از ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ				
(۲) ۳۰ ۰۰ = ۷ بابتہ کرایہ ۴۰۰ بابت بجلی				
۶۵ = ۳۶ ۰ ۱ (۳) ٹیلیفون بلز ب	۳,۷۷۶	۶۵		
ب۔ کرایہ مکان قاضی بلی	۱۴۴	۰۰	۳,۹۲۰	۶۵
وصول از مدات دیگر			۲۰۰	۰۰
میزان	—	—	۴۲,۴۴۷	۰۹

مقام: حیدرآباد (اے۔پی)

تاریخ ۸/۷/۱۹۶۷ء

تنقیح کی اور درست پایا۔

دستخط: ایس۔ جی۔ ڈیکھیرا اینڈ کمپنی چارٹرڈ اکاونٹنٹس

اداره کی اہم مطبوعات

نمبر	نام کتاب	نام مصنف	قیمت
۱	تذکرہ اردو مخطوطات جلد ہم تا پنجم	مرتبہ ڈاکٹر زور	ہر جلد کی قیمت ۷ روپے
۲	فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارہ	محمد اکبر الدین صدیقی	
	جلد اول	مولوی غلام رسول	۳
	جلد دوم	محمد اکبر الدین صدیقی	۲/۷۵ پیسے
	" " جلد سوم	"	۲ - ۵۰ "
۳	حدیقۃ السلاطین (فارسی کامل) ٹائپ کی طباعت	علی اصغر بلگرامی	۱۰ - "
۴	ادبی تحریریں	ڈاکٹر زور	۴ روپے
۵	میر محمد مومن	"	۳ - روپے
۶	کلمۃ الحقائق (برہان الدین جانم)	محمد اکبر الدین صدیقی	۲ "
۷	دیوان ہاشمی (بیجاپوری)	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۶ "
۸	کلیات غواصی	محمد بن عمر مرحوم	۴ "
۹	معانی سخن (انتخاب کلام) محمد قلی قطب شاہ	ڈاکٹر زور	۲ "
۱۰	تاریخ ادب اردو	ادارہ ادبیات اردو	۲ "
۱۱	داستان ادب حیدرآباد	ڈاکٹر زور	۳ "
۱۲	کیف وکم (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)	یوسف ناظم	۲ "
۱۳	تاریخ گولکنڈہ	پروفیسر عبدالمجید صدیقی	۷ "

ایجنسی کی کتابیں

۱	اردو کے اسالیب بیان	ڈاکٹر زور	۱/۵۰
۲	ہندوستانی لسانیات	" "	۳/۰۰
۳	ہندوستانی فونیٹکس (انگریزی)	" "	۴/۰۰
۴	باغ و بہار	مرتبہ ڈاکٹر زور	۲/۰۰
۵	نوری بیگم (ناول)	طیبہ بیگم بلگرامی	۲/۰۰
۶	تجربی طبعیات	پروفیسر نصیر احمد عثمانی	۲/۰۰
۷	طلسم تقدیر	ڈاکٹر زور	۱/۰۰
۸	مقننہ اور قانون سازی	حفیظ صدیقی	۴/۰۰
۹	اسٹوڈنٹس قرآن (انگریزی)	ڈاکٹر ہاشم امیر علی	۵/۰۰
۱۰	اکبر اعظم (تذکرہ)	پروفیسر محمد نصیر الدین	۱/۱۰
۱۱	ذکر و فکر (نغمۂ کلام)	تہنیت النساء بیگم	۲/۰۰
۱۲	صبر و شکر "	" "	۲/۰
۱۳	تسلیم و رضا "	" "	۲/۰۰
۱۴	حضرت مشکل آسان ثانی (تذکرہ)	مراد علی طالع	۱/۰
۱۵	سوسینی کی آپ بیتی	ترجمہ بادشاہ حسین	۱/۵۰
۱۶	ہسٹری آف گولکنڈہ (انگریزی)	پروفیسر مجید صدیقی	۷/۰۰
۱۸	مومن و غالب	عزیز یار جنگ عزیز	۱/۰۰
۱۹	فن انشا و پردازی	ڈاکٹر زور	۱/۰۰

ملنے کا پتہ **ایوان اردو** خیریت آباد (حیدرآباد دکن ۴)

پروفیسر سید علی اکبر ایڈیٹر پرنٹر پبلیشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد میں چھپوا کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد سے شائع کیا

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد (۳۱) شمارہ (۱۰)

اکتوبر ۱۹۶۸ء

ماہنامہ سب رس

زر سالانہ چھ روپے — غیر ممالک سے دس روپے
ششماہی تین روپے — فی پرچہ پچاس پیسے
نمونے کے پرچہ کیلئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے
پرنٹر و پبلیشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا

ترتیب

حصہ نظم

نقد و نظر

اپنی بات

ستمبر میں ڈاکٹر زور کی رحلت واقع ہوئی اس لئے ادارہ ستمبر کے آخری ہفتہ میں یوم زور مناتا ہے لیکن اس سال یوم زور چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر نہ منایا جا سکا۔ سب رس ڈاکٹر زور کی اہم یادگار ہے اور ہم اپنی امکانی کوشش کر رہے ہیں کہ اس کا تحقیقی اور تنقیدی معیار بلند رہے اور یہ بر وقت نکلتا رہے۔ ہمیں اپنے قلمی معاونین سے توقع ہے کہ وہ اپنے افکار سے نوازتے رہیں گے اور اس کی بقا کی خاطر توسیع اشاعت میں سعی فرمائیں گے۔

یہ خبر خوش آئند ہے کہ ہماری مجلس ادارت کے ایک رکن ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو وسکانسن یونیورسٹی کے شعبہ علوم ہند نے ایک سال کیلئے اُردو زبان و ادب کی وزٹنگ پروفیسرشپ پیش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اس سے پہلے بھی وسکانسن میں کام کرچکے ہیں جہاں سے آپ کی ایک تصنیف READINGS IN LITERARY URDU PROSE شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ان طلبا کے لئے ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں۔ اس میں اُردو کی کئی سو سالہ نثر کا انتخاب پیش کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ ثانوی سطح پر نہ صرف اُردو زبان و ادب کی تعلیم دی جاسکے بلکہ اُردو کی پشت پر جو مخصوص تہذیبی تصور ہے اس کے بنیادی عناصر بھی سامنے آجائیں۔ کتاب میں میرامن، مرزا غالب، محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، کرشن چندر وغیرہ مصنفین کی تحریریں شامل ہیں۔ اس میں ذخیرہ الفاظ کو چونکہ سائنٹفک طریقے سے پیش کیا گیا ہے اس لئے مشکل الفاظ کی تعداد بتدریج بڑھائی گئی ہے۔ وضاحتی فرہنگ میں الفاظ کے معنی کے علاوہ لسانیاتی تاریخی اور سماجی حواشی بھی شامل ہیں۔ امریکہ سے نستعلیق میں شایع ہونے والی یہ پہلی کتاب ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اس قسم کی کتاب کی جو عرصہ سے ضرورت محسوس کی جاتی تھی اب پوری ہو جائے گی ہم اس کارنامے پر ڈاکٹر صاحب موصوف کو مبارکباد دیتے ہیں۔

بہ سلامت روی و باز آئی بہ سفر رفتنت مبارکباد

ڈاکٹر صاحب نے دوسری کتاب علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی کی "منشورات" مرتب کر کے شائع کی ہے اس پر آئندہ شمارہ میں تبصرہ پیش ہوگا۔

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی نے پنجشنبہ ۵ ستمبر کو طویل علالت کے بعد رحلت فرمائی۔ مرحوم بمبئی میں بابائے اُردو بنے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی ہر یونیورسٹی سے ان کا تعلق تھا۔ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

محمد اکبر الدین صدیقی

جے کرشن چودھری

ملک محمد جائسی

محمد جائسی ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے اُس خوشگوار دور کے نمایندہ ہیں جب ہندو مسلم مدتوں کے سیاسی اور مذہبی اختلافات کو ہٹا کر ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور آپس میں میل جول بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ وقت ختم ہوچکا تھا جب مسلمان ایک غیر ملکی کیمپ کی صورت میں رہے اور ہندوؤں نے اپنی مدافعت کی غرض سے قطعاً الگ تھلگ رہ کر عدم تعاون کئے رکھا۔ مسلمان یہاں رہنے کیلئے آئے تھے نہ کہ واپس لوٹنے کیلئے۔ ہندو آخر کب تک کھچے کھچے رہتے کچھ یہ بڑھے کچھ وہ بڑھے جنگ کے زخم بھرنے لگے۔ نفرت کم ہوتی گئی، دوئی کے پردے اٹھتے گئے، نزدیک سے نزدیک تر آئے۔ ایک دوسرے کو دیکھا بھالا اور گھل مل گئے۔

ان دونوں کو قریب لانے میں فقیروں اور درویشوں کا خاص حصہ تھا۔ دونوں خدا پرست تھے دونوں جام وحدت بلا امتیاز مذہب و ملت پلا۔ حضرت نظام الدین اولیا۔ حضرت معین الدین چشتی کبیر اور بھگتی تحریک کے بانی راما نند اور اُن کے شاگردوں نے دونوں کو یکساں سرشار کیا۔ اگر آپ اس وقت کے بھگت اور صوفی شاعروں کے حالات پڑھیں تو آپ اپنے آپ کو مذہبی رواداری، مہر و محبت اور پرجوش عقیدت کی ایک نئی دنیا میں سانس لیتے ہوئے پائینگے۔ اس وقت راما نند کہہ اٹھا ہے

جاتی پانتی پوچھے نہ کوئی　　؎　　ہری کو بھجے سو ہری کا ہوئی

ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے اور دل میں راہ پانے کے لئے ہندوؤں نے مسلمانوں کے مذہب، تاریخ اور طرز زندگی کا مطالعہ شروع کیا اور مسلمانوں نے ہندوؤں کے دھرم اور رسم و رواج کو محبت کی نظر سے دیکھنا اور سمجھنا شروع کیا۔ ہندو فارسی پڑھنے لگے اور مسلمان ہندی۔ باہمی محبت و اعتماد کی استواری کے لئے یہ بے حد ضروری تھا۔ جب تک ہم ایک دوسرے کے دلوں کے اُس سرچشمہ تک رسائی حاصل نہیں کرتے جن سے ہمیں قوت فکر و عمل ملتی ہے اور جو ہر کو تاب و توانائی دیتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے اور ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کی قدر نہیں کرسکتے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس وقت کے صوفی اور بھگتی تحریک شاعروں نے وہ نغمے الاپے اور وہ گیت گائے جنہوں نے ہمارے سازِ دل کو چھیڑ دیا اور نہ صرف ایک دوسرے سے قریب کر دیا بلکہ ہمیں اتنے قریب لے آئے کہ ہم ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سن سکتے تھے۔

اسی جذبہ کے تحت اس وقت کے کچھ مسلمان شاعروں نے عوام کی زبان میں ہندوؤں کی محبت کی کہانیوں کو نظم کیا اور ہندوؤں کی تہذیب و تمدن کے ساتھ اپنی یگانگت اور محبت کا ثبوت دیا۔ ان مسلمان شاعروں میں قطبن۔ عثمان۔ نور محمد اور محمد جائسی قابل ذکر ہیں۔ قطبن نے ۹۰۹ھ میں "مرگاوتی" نام کی ایک کتاب لکھی جو چندر نگر کے شاہزادہ اور کنچن نگر کی شاہزادی مرگاوتی کی محبت کی داستان ہے۔ اسی انداز میں عثمان نے سمت ۱۶۷۰ کے لگ بھگ "چتراولی" اور نور محمد نے سمت ۱۷۹۶ میں "اندراوتی" لکھی لیکن جو شہرت محمد جائسی اور ان کی تصنیف پدماوتی کو حاصل ہوئی وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

کبیر کی طرح جائسی نے بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان محبت کا بیج بویا۔ پدماوتی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جائسی کو اس خاک سے جس سے وہ پیدا ہوا کتنا پیار ہے اور اسے اپنے ہم وطنوں سے کتنا انس اور لگاؤ ہے۔ پدماوتی گاؤں کی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ وہاں کے رہنے والوں کے رسم و رواج، عبادات و اخلاق مذہبی طور طریقے اور روحانی نظریئے۔ عوام کے اقوال ان کے خیالات اور جذبات کی لاجواب تصویر ہے غرض یہ کہ پدماوت ہندی میں اپنے ڈھنگ کی واحد کتاب ہے۔ یہ فارسی مثنوی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ شروع میں خدا کی تعریف، پیغمبر اسلام کی توصیف اور بادشاہ وقت کی مدح سرائی کی گئی ہے زبان جائسی کے آس پاس کی اودھی ہے اور چوپائیوں اور دوہوں میں کہانی بیان کی گئی ہے۔

جائسی کب پیدا ہوئے اور کب مرے۔ کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ اپنی ایک مختصر سی کتاب "آخری کلام" میں جو ۹۳۶ ہجری (مطابق ۱۵۲۸ء) بابر کے عہد میں لکھی گئی۔ جائسی نے اپنی پیدائش کا ذکر اس طرح کیا ہے

بھا اوتار مو نو صدی ؛ تیس برس اوپر کوی بدی

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ نوصدی سے غالباً مراد ہے کہ پیدائش نو سو ہجری (۱۴۹۲ء) کے لگ بھگ ہوئی دوسرے مصرع کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ پیدائش سے تیس سال بعد وہ شعر کہنے لگے۔ "پنڈت چندر بلی پانڈے" کے خیال کے مطابق وہ ۹۰۰ہجری میں پیدا ہوئے۔ ان کی موت جنگل میں شکاری کی گولی سے غالباً ۴۹ برس کی عمر میں ہوئی۔ قاضی نصیر الدین حسن جائسی نے جنہیں اودھ کے نواب شجاع الدولہ سے سند ملی تھی اپنی یادداشت میں جائسی کی تاریخ وفات ۴ رجب ۹۴۹ ہجری م ۱۵۴۲ عیسوی دی ہے۔

ملک محمد جائسی ضلع رائے بریلی کے باشندے تھے۔ ڈاکٹر گریرسن کا خیال ہے کہ وہ کسی اور جگہ کے رہنے والے تھے اور جائس میں آکر بس گئے۔ جائسی کی درسی تعلیم بہت کم تھی۔ لیکن چونکہ درویشوں اور سادھوؤں کی صحبت سے خاص رغبت رکھتے تھے اس لئے مذہبی معلومات غیر معمولی طور پر وسیع تھیں۔ ہندوؤں کے مذہبی عقائد، جیوتش، یوگ رسائن، ویدانت میں غیر معمولی دسترس حاصل کی۔ یہ امر ان کی تصنیفات کے مطالعہ سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے نیز

وہ بہت خدا پرست اور درویش سیرت انسان تھے۔ دل خلق خدا کی محبت سے لبریز تھا اور کسی قسم کا غرور نہ تھا۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے گذر اوقات کھیتی باڑی سے ہوتی تھی۔ "پدماوت" انکی معروف ترین تصنیف ہے۔ جس کی تصنیف کا زمانہ مصنف نے اس طرح دیا ہے ؎

سن نو سے ستائیس اہا کتھا آرمبھ بین کوئی کہا

پدماوت کی کتھا کی ابتداء شاعر نے ۹۲۷ھ ہجری میں کی تھی۔ لیکن شاعر نے مثنوی کے ابتدائیہ شروع میں شاہ وقت شیر شاہ کی تعریف کی ہے۔ جس کی حکومت کا آغاز ۹۴۷ھ ہجری (۱۵۴۰ء) میں ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاعر نے کچھ پد تو ۱۵۲۱ء میں کہے اور باقی تصنیف انیس برس بعد شیر شاہ کے وقت جیسا کہ اس پد سے ظاہر ہے ؎

جائیس نگر دھرم ستھانو تہاں آئی کوئی کیس بکھانو

پدماوت کی کہانی کے دو حصے ہیں۔ پورو آردھ (آغاز کا نصف حصہ) اور اتر آردھ (خاتمہ کا آدھا حصہ) پہلا حصہ قیاسی ہے اور دوسرے حصے کا انحصار تاریخ پر ہے۔ پہلے حصے میں رتن سنگھ والئی چتوڑ کا۔ جو اس افسانہ کا ہیرو ہے۔ اپنی بیوی ناگ متی کو چھوڑ کر سنگل جزیرہ کے راجہ گندھرب سین کی لڑکی پدماوتی کی جو حسن و جمال میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی، تلاش میں اُس جزیرہ کا سفر اختیار کرنے طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرتے اور آخر میں پدماوتی کے ساتھ چتوڑ واپس آنے کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں علاؤ الدین خلجی کے حملہ اور پدماوتی کے ستی ہونے کا بیان درج ہے۔ رتن سنگھ سے متعلق یہ واقعات ٹاڈ راجستھان اور آئین اکبری میں درج ہیں گو جائسی نے اس میں کئی روایتوں کو جوڑ دیا ہے۔

اپنے اعجاز کلام کے باعث جائسی ہندی شاعری میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں وہ بیان محبت کے شاعر ہیں۔ محبت کا اعجاز ان کے کلام میں جگہ جگہ موجود ہے۔ محبت کے دونوں پہلوؤں وصال و ہجر کے نہایت حسین مرقعوں نے پدماوتی کو ایک لافانی شہرت دیدی ہے۔ لیکن برہ یعنی ہجر کا بیان تو لاجواب ہے، ناگ متی رتن سنگھ کی شادی شدہ عورت تھی۔ اسے اپنی خوبصورتی پر ناز تھا۔ ایسی خوبصورت بیوی کے ہوتے ہوئے بھی اُس کا خاوند ایک اور عورت (پدماوتی) پر عاشق ہو جائے۔ یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ رتن سنگھ کے پدماوتی کی تلاش میں چلے جانے پر ناگ متی کی جو حالت ہوئی اُس کا بیان جائسی نے "بارہ ماسہ" میں کیا ہے جو پدماوتی کا سب سے زیادہ حسین و جمیل اور جاندار حصہ ہے۔ ایک ایک کے مہینوں اور موسموں کے گذرنے پر برہ کی ماری ناگ متی کے حساس دل پر کیا بیتی اس کا بیان جائسی جیسے عظیم شاعر ہی کر سکتے تھے۔

وصال کی صورت میں عاشق کو محبت کی شدت کا احساس نہیں ہوتا اس لئے شعراء نے ہجر کی تصویر کشی کی ہے۔ ہجر میں عاشق کا دل نہایت حساس ہو جاتا ہے اور برہ کی آگ میں جلتے ہوئے بھی وہ ایک

لذت کا احساس ہوتا ہے اس راہ میں اُسے جو درد و غم کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اس کا سرمایہ حیات ہے کیونکہ یہ غم بھی تو محبوب ہی کا ایک عطیہ ہے، ناگ متی کہتی ہے ؎

جرت بجاگنی کرو بیو چھانہاں   آئی بجھاؤ انگارن مانہاں
لاگے اون جرے جرے جس بھارو   پھری پھری بھونجے تجیو نہ بارو

جس طرح بھاڑ کی تپی ہوئی ریت میں بھن کر اناج کا دانہ پھر پھر کرکے اُس میں گر پڑتا ہے۔ اسی طرح گو حالت ہجر بے حد اذیت پہنچانے والی ہے لیکن دل اُس اذیت سے بچنے کی خواہش کرتے ہوئے بھی اس سے نکلنا نہیں چاہتا۔ وہ بار بار اُسی سوز سے لذت اندوز ہونا چاہتا ہے۔ یہ برہ کی اذیت ہی تو ہے۔ جس سے محبوب کا خیال برقرار رہتا ہے اور دل اُس کی یاد میں بے قرار ہوتے ہوئے بھی لذت پاتا ہے۔ یعنی تکلیف پاتے ہوئے بھی اُس سے چھٹکارا نہیں پانا چاہتا۔ محبت میں سرشار دل کی کیفیت کس خوبی سے بیان کی ہے۔ ہجر میں ناگ متی کے دل کی کیفیت ساری دنیا پر چھا گئی ہے۔ اُسے ساری دنیا آنسوؤں سے بھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

کوہکا کوہک جیسی کویل روئی ؎   رکت آنسو گونگچی بن بوئی
جنہہ جنہہ ٹھاڑی ہوئی بن باسی ؎   تینہ تینہ ہوئی گونگچن کے راسی

وہ کوئل کی طرح کوک کوک کر روئی اور خون کے آنسوؤں سے گویا اُس نے جنگل میں گھنگچیاں بھر دیں جنگل میں پھرتے ہوئے وہ جہاں جہاں کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہیں وہیں گھنگچیوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ ناگ متی کے غم کو دیکھ کر یہ حال ہو جاتا ہے ؎

یہی دکھ ڈھیے پراس نیلاتے   لوہو بوڑھی اٹھے پر بھاتے
راتے بمب بھیے تیہی لرہو   پرور پاک بھاٹ ہیہ گو ہو

اُس کے دکھ میں جل کر پلاس بغیر پتوں کے ہو گیا اور پھر اس کے لہو میں ڈوب کر سرخ ہو گیا اُسی خون سے بمبا پھل بھی سرخ ہو گئے اور پرور ہمدردی میں پک کر پھٹ گیا اور گیہوں کا دانہ ترخ گیا

نہ پاوسی اوہی دیسیرے   نہ ہیونت نہ بسنت !!!
نہ کوکل نہ پپیہرا !   کیہی سنی آوہیں کنت

اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس دیس میں اُس کا شوہر (محبوب) گیا ہے۔ وہاں نہ تو پاگل بنا دینے والے موسم ہیں۔ نہ برسات ہے، نہ پت جھڑ ہے نہ بسنت اور نہ محبت کی یاد دلانے والے پرندے، کوئل یا پپیہا۔ ایسی صورت میں اس کا شوہر واپس آئے تو کیسے آئے۔ جائسی کے ناگ متی کے بیان ہجر میں وہ کیفیت ہے جس میں ہجر کے مارے کو ہجر کی شدت کے باعث ذی روح اور بے جان چیزوں کی (باقی صفحہ ۲۰۲ پر)

ڈاکٹر مغنی تبسم

روحِ تنقید

دکھنی ادب کے محقق اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے ڈاکٹر زورؔ کا نام اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ احترام سے لیا جاتا رہے گا۔ ڈاکٹر زورؔ کے تحقیقی کارناموں میں جہاں ایک نقاد کے ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہیں ایک تخلیقی فنکار کے قلب کی دھڑکن بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی ایک نقاد اور شاعر کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ پھر لسانی تحقیق کی طرف مائل ہوئے ساتھ ہی ساتھ افسانہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی۔ سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد سے ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی توانائیاں بڑی حد تک دکنی زبان و ادب کی تحقیق و تدوین کے لیے وقف کر دی تھیں۔ ڈاکٹر زورؔ کے ابتدائی ادبی کارناموں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ تخلیق و تنقید سے اپنی دلچسپی باقی رکھتے تو اردو کے چند بلند رتبہ ادیبوں اور نقادوں میں ان کا شمار ہوتا۔ پھر بھی صنفِ تنقید میں جو کچھ سرمایہ انھوں نے چھوڑا ہے اسے اردو ادب کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر زورؔ کے علمی اور ادبی کارناموں کی صحیح قدر شناسی کے لئے ضروری ہے کہ ان کی مختلف النوع خدمات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔ بدقسمتی سے اس اہم کام کی طرف مناسب توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ کسی عالم اور ادیب کے ساتھ اس سے برا سلوک اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس کے کارناموں کی حقیقی قدر و قیمت کو سمجھے بغیر اس کی مبالغہ آمیز تحسین و مدح سرائی کی جائے۔ ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت اور کارناموں پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کا بڑا حصہ اسی ذیل میں آتا ہے۔ اس کی ایک مثال پروفیسر انور علی انور کا مضمون ہے جو "ڈاکٹر زورؔ کا تنقیدی شعور" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کی تنقید نگاری اردو ادب کا ایک اعلیٰ ترین معیار پیش کرتی ہے اور اس مخصوص صنف ادب میں بلند ترین رتبہ و مقام کی مستحق ہے۔" اس جملے میں تفاضیل کل "اعلیٰ ترین" اور "بلند ترین" محل نظر ہیں۔ دوسری طرف مولوی عبدالحق، کلیم الدین احمد اور عبادت بریلوی جیسے ناقدین ہیں جو ڈاکٹر زورؔ کے تنقیدی کارناموں کو طالب علمانہ کاوشوں سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ دونوں رویئے جذباتی اور غیر معتدل ہیں۔ اردو میں تنقید نگاری کو ایک علم اور ایک فن کی حیثیت سے آگے بڑھانے میں ڈاکٹر زورؔ نے جو حصہ لیا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا

کوتاہ نظری اور عصبیت کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کی پہلی ادبی تالیف "روحِ تنقید" ہے جو پہلی بار ۱۹۲۹ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اُردو میں مبادیات تنقید اور تاریخ فلسفۂ تنقید پر یہ پہلی باضابطہ اور مستقل تالیف ہے۔ اُردو میں آج تک اس موضوع پر کوئی اور ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی جو ہمیں اس کی بعض کوتاہیوں، خامیوں اور اختصار کے باوجود روحِ تنقید کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے۔ پھر کیا سبب ہے کہ ہمارے بعض مورخین ادب اور ناقدین اس کی اہمیت کا کھلے دل سے اعتراف نہیں کرتے مجھے تو اس کا بس ایک سبب نظر آتا ہے کہ اس کتاب کے تعارف میں عبدالغنی صاحب نے شمالی ہند پر دکن کا تقدم اور برتری جتاتے ہوئے اسے ایک دکنی کا کارنامہ قرار دیا۔ چنانچہ اورنٹیل کالج لاہور کے پروفیسر مولانا محمد شفیع اس پر دبے لفظوں میں اعتراض کیے بغیر نہ رہ سکے۔

روحِ تنقید کی تالیف کے وقت ڈاکٹر زورؔ کے پیشِ نظر ایک خاص تاریخی اور عصری ضرورت تھی جس کی تکمیل پر زبان و ادب کی نشو و نما اور ترقی کا دارو مدار تھا۔ اس ضرورت اور مقصد کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:-

> "یہ صرف تنقید ہی ہے جو قوموں کے محسوسات خوابیدہ کو بیدار کر دیتی ہے یہ صرف تنقید ہی ہے جو غلط معتقدات اور باطل خیالات کو زبان دانوں کی ذہنیت سے محو کرا دیتی ہے اور یہ صرف تنقید ہی ہے جس کے باعث علوم ادبی علوی مذاق اور رفعتِ تخیل کی خوشنما شاہراہوں پر گام زن ہونے لگتی ہے۔ پس اگر اُردو داں حضرات کو بھی اس کے مقاصد و اصول سے واقف کرایا جائے تو امید ہے کہ بہت جلد اردو ادب کے تمام موجودہ نقائص کی تلافی ہو جائے گی۔ اگر ہم اپنی زبان کو دنیا کی مہذب و ترقی یافتہ زبانوں کی فہرست میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہماری خواہش ہے کہ اپنے ادب کو کچھ ہی عرصہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادبیات کے پہلو بہ پہلو دیکھیں ... تو ہمیں چاہیئے کہ بہت جلد تنقید کے صحیح اصولوں اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کی طرف متوجہ ہوں۔"

اس اہم مقصد کے تحت ڈاکٹر زورؔ نے روحِ تنقید کی تالیف کا کام شروع کیا۔ اُردو میں اس کام کا کوئی نمونہ ان کے سامنے نہیں تھا۔ انھیں خود اپنا راستہ بنانا پڑا۔ روحِ تنقید پر ڈاکٹر عبادت بریلوی کا اعتراض یہ ہے کہ اس میں "زیادہ تر مغربی ادیبوں اور شاعروں کے اقوال و خیالات ہو بہو نقل کر لیے ہیں انھوں نے اپنی طرف سے بہت کم کہا ہے"۔ یہ اعتراض ایک طرفہ ہے اور جزوی صداقت رکھتا ہے۔ اگر ہم اس

کتاب کے منشائے تالیف کو پیش نظر رکھیں تو یہ محسوس کریں گے کہ اس کے حصول کے لئے ڈاکٹر زور نے جو طریقہ اختیار کیا وہ کس حد تک درست تھا۔ روح تنقید سے پہلے اردو میں اصول تنقید پر کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ ڈاکٹر زور نے اسے پہلی بار اردو میں روشناس کرایا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کتاب میں تنقید کے اصول اختصار اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دیئے جائیں۔ اس کے لئے انھوں نے بڑی سعی اور کاوش سے ادب اور تنقید کے بارے میں مشرق و مغرب کے مفکروں، نقادوں اور ادیبوں کے خیالات اور آرا کو اکٹھا کیا اور انھیں اس طرح ترتیب دیا کہ مختلف ادوار میں اس موضوع پر جو کچھ سوچا اور لکھا گیا ہے۔ اس کا خاکہ قارئین کے سامنے آ جائے۔ پھر ان بیانات کو سامنے رکھ کر انھوں نے ادب اور تنقید کے بارے میں اپنے اخذ کردہ نتائج بہ صراحت بیان کر دیے۔ اس بات کا خاص التزام رکھا کہ ہر باب میں مغربی ادبیات کے علاوہ ادبیاتِ مشرق بالخصوص اردو ادب سے مثالیں دی جائیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی طرف سے بہت کم کہا ہے۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مسئلہ پر ڈاکٹر زور نے اپنے نقطۂ نظر کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ ادب کی ماہیت و مقصد اور تنقید کے منصب کا تعین کرنے کے سلسلے میں انھوں نے بے شمار عرب، یونانی، یورپی اور ہندوستانی مفکروں اور نقادوں کے نظریات کا مطالعہ کیا اور ان سب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک متوازن نظریہ تشکیل دینے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پچاس برس پہلے انھوں نے ادب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ ادب کے جدید تر تصور سے قریب نظر آتے ہیں۔ بعض جدید نقادوں کی طرح انھوں نے بھی خارجی صداقت اور ادبی صداقت کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادب کے "من گھڑت پن" پر بھی زور دیا ہے۔ ان کے خیال میں شاعر یا ادیب جو کچھ پیش کرتا ہے اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ "وہ کسی موجود حقیقی اور واقعی چیز پر مبنی ہو۔ اس کی اصلیت خود مصنف کے دماغ میں ہوتی ہے لیکن یہ تخیلی مخلوق ایسی ہونی چاہئیے جس کو عام دماغ اپنے تجربات روزمرہ کی مطابقت سے حقیقی تسلیم کر کے اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں" اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ "تخلیقی ادب کی صداقت تاریخی یا سائنس کی صداقت نہیں ہوتی۔ پس تنقید کا مقصد یہ ہے کہ ادبی صداقت کی گہرائیوں تک پہنچ جائے۔ ادبی تخلیق کی ماہیت کے بارے میں ایک جدید تصور یہ ہے کہ وہ ایسا لفظی ڈھانچہ ہوتی ہے جو ایک پیچیدہ اکائی اور سالمیت رکھتا ہے۔ کسی نامیاتی جسد سے وہ ان معنوں میں شباہت رکھتی ہے کہ اس کے کسی جزو کو علیحدہ کر دیا جائے تو وہ ناقص ہو جاتی ہے۔ اس تصور کے تحت موضوع اور ہیئت کی پرانی اور مصنوعی تقسیم ختم ہو جاتی ہے اور ہم موضوع کو ادبی تخلیق کے مجموعی مفہوم کے مترادف قرار دینے کی غلطی سے

متوازن ہوتے ہیں ڈھانچے یا STRUCTURE کا تصور ادب کو زبان کے دوسرے استعمالوں سے ممتاز کرتا ہے۔ ہم کو اس سے کم غرض ہوتی ہے کہ ادبی تخلیق حقیقی واقعات کو کس قدر سچائی کے ساتھ بیان کرتی ہے ہم "کیا کہا گیا" کے مقابل "کس طرح کہا گیا" سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں دیگر فنون لطیفہ کی طرح ادب کا مطالعہ خود ادب کے لیے کیا جا سکتا ہے جو اپنے اندر ایک قدر رکھتا ہے۔ ڈاکٹر زور بھی اس حقیقت سے پوری طرح آشنا تھے چنانچہ تنقید نگاری کے اصول بیان کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ادب کو فطرت کی دیگر اشیاء کے مانند ایک تدریجی ترقی پانے والی شئے کی حیثیت سے دیکھا جائے جس میں ہر تصنیف اپنی نوعیت کے باعث (دوسری تصنیف سے) بالکل جدا ہوتی ہے۔ ادبی تکمیل اور تناسب کی بحث میں وہ ادبی تصنیف کو ایک جاندار سے تشبیہہ دیتے ہیں جس کے مختلف اعضا ایک خاص تناسب سے اپنی جگہ موجود ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر زور ادب کو غیر ادبی معیارات سے جانچنے کے مخالف تھے۔ ان کے الفاظ میں ایک ادبی نقاد ادبی کائنات کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے جس کی وہ دراصل مستحق ہوتی ہے۔ نیز جن اصول و قواعد کے تحت عالم ادب کا ظہور ہوتا ہے اور وہ اثر ڈالتا ہے ایک نقاد ان کو بھی منضبط کرتا ہے اور سوائے ادبی کارناموں کی سند کے کسی دوسرے محکمے کے فیصلوں کو منظور نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر زور ادب کی مقصدیت اور موضوع کی اہمیت کے کچھ زیادہ ہی قائل تھے۔ وہ تنقید کے مختلف دبستانوں کے اہم نکات کو یکجا کر کے تنقید کے چند عالمگیر اصول مدون کرنا چاہتے تھے۔ اس کوشش میں وہ کہیں کہیں ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جن میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ مثلاً موضوع کے انتخاب کے بارے میں وہ وکٹر ہیوگو کے اس بیان کی تائید کرتے ہیں کہ "شاعری کے لیے کوئی مضمون اچھا اور کوئی برا نہیں ہوتا بلکہ اچھے اور برے شاعر ہوتے ہیں" اسی ضمن میں حالی کے اس خیال کی حمایت کرتے ہیں کہ انشاء پردازی کا انحصار جتنا الفاظ پر ہے معنی پر نہیں" معنی اور مطالب صرف الفاظ کے تابع ہیں اور ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مطالب کو بہترین طور پر ادا کر سکیں اور حتی الامکان اس بات کی کوشش ہو کہ معانی، الفاظ اور اصوات الفاظ میں ہم آہنگی رہے اس عبارت کے آگے ہی یہ جملہ ملتا ہے" پس جس کتاب میں مطالب و معانی کی خوبیاں کثرت سے پائی جائیں وہی بہتر کتاب سمجھی جائے گی مثلاً جس ناول میں اخلاقیات کا سبق جابجا دیا گیا ہو یا شریف جذبات کو اکسانے کی کوشش کی گئی ہو وہ بہ نسبت عشقیہ اور غیر فطری قصوں کے زیادہ قابلِ قدر ہے۔

روحِ تنقید کا دوسرا حصہ نظریاتِ تنقید کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس میں مختلف ابواب کے تحت یونانی، رومی، فرانسیسی اور انگریزی کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے اور کتاب کے آخر میں بیسویں صدی کے تنقیدی نظریات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس حصۂ تالیف کے مطالعے سے مغرب میں تنقید کی اجمالی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ اس میں مشرقی تنقید اور اردو تنقید کے ارتقا پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ صرف کتاب کے دیباچے میں اردو تنقید کے ارتقا کا سرسری خاکہ پیش کر دیا گیا ہے۔ اس کمی کی تلافی کسی حد تک عبادت بریلوی اور بعض دوسرے مصنفوں کی کتابوں سے ہو گئی ہے جو اس موضوع پر قلمبند کی گئی ہیں۔

روحِ تنقید کی دوسری جلد عملی تنقید کے نمونوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول میں تنقید کے جو اصول مدون کیے گئے ہیں ان کی روشنی میں مختلف ادبی کارناموں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان مضامین کا نمایاں وصف وہ بے لوث خارجیت ہے جو ہر اچھی تنقید کے لئے ضروری ہے۔ تنقید اور تحقیق کا ناگزیر امتزاج ان مقالوں کی دوسری اہم خوبی ہے۔ ڈاکٹر زور تنقید لکھتے وقت مصنف کی شخصیت سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے اور نہ ہی ادبی تخلیق کی دلکشی انھیں جذبات کے دھارے پر بہالے جاتی ہے۔ وہ زیرِ تنقید تخلیقات کی خوبیوں اور خامیوں کو غیر جذباتی انداز میں الگ الگ بیان کرتے ہیں۔ لیکن یہ محاکمے اور فیصلے اتنے نمایاں ہو جاتے ہیں کہ تنقید کے پاس صرف "عصائے عدل" نظر آنے لگتی ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں جو مشعلِ نور ہوتی ہے وہ مدھم پڑ جاتی ہے۔ عملی تنقید میں ڈاکٹر زور تاریخی تنقید کی داستان سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے تنقید نگاری کے جو پانچ اہم اصول گنائے ہیں ان میں ایک اصول یہ ہے کہ مصنف کی ذات، اس کے ماحول اور اس کی مصنفات کے ماخذوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔ اس اصول پر وہ خود بھی سختی سے کاربند رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا مقالہ "حالی اور نثر اردو" پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس مقالے میں سب سے پہلے انھوں نے حالی کی زندگی اور ان کے عہد کا سرسری جائزہ لیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ حالی کے ادبی ذوق کی نشو و نما کس ماحول میں ہوئی۔ پھر ان کی ابتدائی نثری تصانیف کا اجمالی تعارف پیش کرتے ہوئے حالی کی تحریروں میں مغربی اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ حالی کی نثر پر سرسید کی نثر نگاری کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے دونوں کے اسالیب کی مابہ الامتیاز خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں اردو نثر میں حالی کے درجے کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی ضمن میں ان کے اسلوب کا موازنہ آزاد اور نذیر احمد کے اسالیب سے کیا ہے اور ان کے باہمی فرق کو تشبیہ کے پیرائے میں اس طرح نمایاں کیا ہے۔

آزاد اپنی تحریروں میں اس قدر بے تکلف ہو جاتے ہیں کہ ہر جگہ اپنی ذات کے متعلق کچھ نہ کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حساس شخص خانگی ملاقات میں بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ یہی حال مولوی نذیر احمد کا ہے وہ اس معاملے میں ایک طرح آزاد سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ آزاد عبارتیں پڑھتے وقت یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی شخص گھر میں بیٹھ کر بے تکلف گفتگو کر رہا ہے لیکن نذیر احمد کی تحریروں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کو گویا مصنف بازاروں اور گلی کوچوں میں چکر لگاتے ہوئے عوام سے بات چیت کر رہا ہے۔ حالی نے اپنے اسلوب کے ذریعہ ان دونوں زبردست خامیوں کو دور کر دیا اور سنجیدہ و علمی مضامین کو اس طرح لکھنا شروع کیا کہ پڑھنے والا ان سے مرعوب ہو جائے اور اس کو معلوم ہو کہ یہ ایک علمی بحث ہے۔ اس قسم کے اسلوب کی اس زمانے میں سخت ضرورت تھی کیونکہ یہ ایک ردّ عمل تھا اردو کی ان پرانی طرز کی تحریروں کا جن میں مواد اور کام کی باتیں تو بہت کم ہوتی تھیں لیکن لفظی خوبیوں اور ظاہر صنائعوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا"۔

روحِ تنقید جلد دوم کے دیگر مضامین میں بھی ڈاکٹر زورؔ کی تنقید نگاری کا یہی اسلوب ملتا ہے اور تاریخی دبستان کی اکثر تنقیدوں کی طرح یہ جائزے بھی کسی حد تک میکانکی ہو گئے ہیں۔ اس سے قطع نظر ڈاکٹر زورؔ کے یہ مقالات اس نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتے ہیں کہ اس سے قبل مغربی اصول تنقید کی روشنی میں ادبی تخلیقات کا ایسا تجزیاتی مطالعہ کسی نے نہیں کیا تھا۔ روحِ تنقید کی اشاعت نے اردو میں مغربی تنقید کے نظریات کو فروغ دیا اور اس کے اثر سے تنقید نگاری کے مروجہ طریقوں میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ ان مقالوں کی اشاعت کے بعد تحقیق زبان و ادب سے ڈاکٹر زورؔ کا شغف بڑھ گیا اور تنقید نگاری سے دلچسپی باقی نہیں رہی ورنہ علم لسانیات پر ان کی مہارت اردو تنقید کے لیئے زیادہ سود مند ثابت ہوتی اور لسانیاتی تنقید سے ہمارا تنقیدی ادب بہت پہلے روشناس ہو چکا ہوتا۔ اس کے باوجود خود ڈاکٹر زورؔ نے جتنا کچھ سرمایہ تنقیدی ادب میں چھوڑا ہے وہ اردو تنقید کی تاریخ میں ان کے نام کو ہمیشہ زندہ اور روشن رکھے گا۔

ڈاکٹر زور کے ان مقالوں کے علاوہ جو روحِ تنقید کی جلد دوم میں شامل ہیں کئی تنقیدی اور نیم تنقیدی مضامین متفرق رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو۔ اگر ان مقالوں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے اس طرح نہ صرف ڈاکٹر زورؔ کی یہ تحریریں محفوظ ہو جائیں گی بلکہ بحیثیت نقاد ان کی خدمات کا جائزہ بھی صحیح طور پر لیا جا سکے گا۔

(ادبی اجلاس یوم زورؔ ۱۹۶۷ء میں پڑھا گیا)

حسرت کاسگنجوی

جگر کا سیاسی اور سماجی شعور

جگر کے متعلق یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ وہ عشق و محبت کے شاعر ہیں۔ اُن کی تمام شاعری خالص حسن و عشق کا مرقع ہے۔ وہ شہنشاہ تغزل ضرور ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی شاعری کا رُخ بدلتے ہوئے حالات کے تحت نہیں موڑا تھا۔ انھوں نے حسن کے نغمے الاپے لیکن جب سنجیدگی سے ان باتوں پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں بے حد سطحی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جگر نے کسی سیاسی تحریک سے وابستگی کا اعلان نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کسی جھنڈے کو ہاتھ میں اٹھا کر نعرے نہیں لگائے۔ انھوں نے جلسوں میں سیاست پر لچھے دار باتیں نہیں کیں۔ اور کبھی اس بات کی تمنا نہیں کی کہ کوئی انہیں سیاسی انسان سمجھے۔ لیکن اس بات سے انکار بہت مشکل ہے کہ انھوں نے بدلتے ہوئے حالات پر غور نہیں کیا۔ انہیں اس کا احساس نہیں تھا۔ اُنکی ابتدائی شاعری تو واقعی حسن و عشق سے معمور ہے۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ جوں جوں سنجیدگی آتی گئی۔ انھوں نے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیا۔ اور آلام دہر کا تذکرہ اُن کے اشعار میں ملنے لگا۔ انسانی عظمت کی جب کبھی بھی توہین کی گئی تو وہ بے چین ہو گئے لیکن نعرہ بازی ان کے کلام میں اُس وقت بھی نہیں آئی۔ جگر کے کلام کی سب سے بڑی خوبی ہی ہے کہ بڑے سے بڑے حادثے پر بھی اپنے مخصوص انداز کو چھوڑتے نہیں۔ آزادی جب ملی تو انسان درندہ بن گیا۔ خون کی ہولی کھیلی۔ انسانیت ذلیل و رسوا کی گئی۔ یہ سب کچھ جگر نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس پر جو ان کا تاثر تھا۔ وہ انہوں نے ایک شعر میں بیان کر دیا ؎

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے ۔۔۔ گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

ایک شعر میں پوری داستان بیان ہو گئی ہے۔ وہ جذباتی نہیں ہے۔ سنجیدگی سے سوچتے ہیں شاعرانہ احساس اُن کے ہاں ہمیں ہر جگہ ملتا ہے۔ انسانیت کے احساس کو وہ زندہ رکھنا چاہتے ہیں ؎

وہی انساں جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا ۔۔۔ وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

آدمی کے پاس سب کچھ ہے مگر ۔۔۔ ایک تنہا آدمیت ہی نہیں

ہر چند کائنات دو عالم ہیں اے جگرؔ — انساں ہی ایک چیز ہے انساں مگر کہاں
جب تک انسان پاک طینت ہی نہیں — علم و حکمت، علم و حکمت ہی نہیں
کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگرؔ — آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں
لباسِ حریت کے اڑ رہے ہیں ہر طرف پرزے — بساطِ آدمیت ہے شکن اندر شکن ساقی

اسی سائنسی دور میں جب کہ انسان نے بے حد ترقی کر لی ہے۔ وہ اور بھی زیادہ جاہل ہو گیا ہے۔ اب انسانیت اور کائنات کی بقا کا خیال ذہن میں نہیں لایا جاتا کہ اسے تباہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ ایٹم اور ہائیڈروجن بم دنیا کی تباہی کا پیش خیمہ ہیں۔ زمانے کی ستم ظریفی تو دیکھئے ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا گیا تو اُن کا کیا حشر ہوا۔ اس ہولناک واقعہ کی بے حد تشہیر کی گئی۔ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی وہاں انسان آباد نہیں ہو سکے۔ آج بھی سیاست کا مفہوم یہ ہے کہ طاقتور کمزور کو کھا جائے۔ کوریا۔ ویت نام، فلسطین، وغیرہ ہر جگہ "مہذب" لوگوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر کمزوروں کی آزادی سلب کی ہے اور "انسانیت" کے گیت گائے ہیں۔ انسان خود انسانیت کو فنا کرنے کے منصوبے باندھ رہا ہے۔ زندگی سے نیکی کا تصور ختم کیا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ انسانیت کے نام پر ہو رہا ہے۔ جگرؔ نے ان سب باتوں کا مطالعہ کیا ہے ؎

اے سہاروں کی زندگی والو! — کتنے انسان بے سہارے ہیں

اپنی ایک نظم "ساقی سے خطاب" میں فرماتے ہیں ؎

کہاں سے بڑھ کے پہنچے ہیں کہاں تک علم و فن ساقی — مگر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی نہ من ساقی
سلامت تو، ترا مے خانہ، تیری انجمن ساقی — مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی
کبھی میں بھی تھا شاہد در بغل، توبہ شکن مے کش — مگر تنہا ہے اب خنجر بکف ساغر شکن ساقی
نہ لاؤ سوا اس دل میں جو ہیں تیرے دیکھنے والے — سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی
جو دشمن کیلئے بھی سر سے اپنے کھیل جاتے ہیں — دلِ خوباں میں چبھتا ہے اُنہیں کا بانکپن ساقی
ترے جوشِ رقابت کا تقاضہ کچھ بھی ہو لیکن — مجھے لازم نہیں ہے ترکِ منصب دفعتاً ساقی
ابھی ناقص ہے معیارِ جنوں تنظیم مے خانہ — ابھی نامعتبر ہے تیرے مستوں کا چلن ساقی
وہی انساں جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا — وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی
لباسِ حریت کے اڑ رہے ہیں ہر طرف پرزے — بساطِ آدمیت ہے شکن اندر شکن ساقی
مجھے ڈر ہے کہ اس ناپاک تر دورِ سیاسی میں — بگڑ جائے نہ خود تیرا مذاقِ شعر و فن ساقی

کہیں ملحد نہ بن جائیں میرے افکار سنجیدہ   کہیں مرتد نہ ہو جائے مرا ذوقِ سخن ساقی
کہیں خود حسن رہ جائے نہ قومی ملکیت بن کر   کہیں خود عشق ہو جائے نہ محدود وطن ساقی
یہاں میں رند سرگشتہ کہاں یہ دعوئے تمکیں   سمجھ اس کو بھی میرا ایک اندازِ سخن ساقی
عجب کیا ہے یہ بہکی بہکی باتیں رنگ لے آئیں   بہت باہوش رہتا ہے مرا دیوانہ پن ساقی
یہ جام مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت   سوادِ ساحل گنگا و گلگشت چمن ساقی

یہ نظم پڑھکر جگر کے سیاسی شعور کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان اشعار کی روشنی میں یہ جان لینا ایسا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ ان کے دل میں ملک اور قوم کا درد کس قدر ہے وہ انسانی عظمت کا احترام کتنا کرتے ہیں۔ وہ اپنے ملک کے جب ناگفتہ بہ حالات دیکھتے ہیں تو اُن کے دل میں کس طرح کے احساسات جنم لیتے ہیں۔ حسن و عشق کا شاعر اپنے معاشرے کی خرابیوں پر کس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے نعرہ بازی سے انھوں نے حتی الامکان گریز ہی کیا ہے۔ وہ اپنے مفادات کو ملک اور قوم پر قربان کرکے فخر محسوس کرتے ہیں ؎

چمن تو برقِ حوادث سے ہو گیا محفوظ   مری بلا سے اگر میرا آشیاں نہ رہا
یوں تو ہونے کو گلستاں بھی ہے ویرانہ بھی ہے   دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں کوئی دیوانہ بھی ہے
مرا تو فرض چمن بندیٔ جہاں ہے فقط   میری بلا سے بہار آئے یا خزاں گزرے
بھری بہار میں تاراجیٔ چمن مت پوچھ   خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گزرے
یہ شکل ناخدا جس میں ہیں ابتک جعفرؔ صادق   وہ کشتی غرق ہو جائے تو بیڑہ پار ہو جائے

جب وہ اپنے ملک کی سیاسی بدحالی اور افراتفری سے بے حد متاثر ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ؎

تجھے ہو سیرِ چمن مبارک مگر یہ رازِ چمن بھی سن لے   کلی کلی خوں ہو چکی تھی شگفتِ گل ہائے تر سے پہلے
تا زجس خاکِ وطن پر تھا مجھے آہ جگرؔ   اسی جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے

جگرؔ دوسرے شاعروں کی طرح معاشی بحران میں مبتلا نہیں رہے۔ حالانکہ اُن کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ پھر ان کے قدردان بہت زیادہ تھے اور وہ کسی نہ کسی صورت سے جگرؔ صاحب کو معاشی بحران میں مبتلا نہیں ہونے دیتے تھے۔ لیکن ملک کی سیاسی حالت سے وہ بہت متاثر تھے۔ ایک سچے اور آزاد شہری کی طرح وہ اصلاح بھی چاہتے تھے۔ ایک کامل آزاد ملک و قوم کے ایک نو وارد مسافر سے شاعر نے خطاب کیا ہے۔ یہ ایک گیت ہے۔ اس گیت میں انھوں نے اپنے ملک کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے ان کے یہاں ایک سیاسی لیڈر کا سا انداز نہیں ہے۔ لیکن وہ حالات سے باخبر معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں

ان کا دکھ بھی ہے۔ ؎

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ — اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ
دیس کے اپنے کرتا دھرتا اکثر ہیں وہ لوگ — مل میں جن کے کنکر پتھر فطرت جن کی کاگ

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ

گاندھی جی کا نام زبان پر من کے اندر روگ — کام نہیں بے جھانسہ پٹی بات نہیں بے لاگ
جنتا جاہل ننگی بھوکی اور یہاں کچھ لوگ — اپنے اپنے رنگ محل میں بیٹھے اڑائیں کاگ

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ

بھولی بھالی صورت والے پوٹ میں بس کی پوٹ — گوری چٹی رنگت والے ناگ ہیں کالے ناگ

آگ لگی ہے آگ مسافر، آگ لگی ہے آگ

تیرے وطن میں میل محبت فرض کا عام احساس — میرے وطن میں پھوٹ عداوت اپنے اپنے بھاگ
آزادی کی بھیک سے ملتا آخر کیا انعام — فتنے جاگے بھیروی ناچا موت نے چھیڑا راگ

موت نے چھیڑا راگ

کسی کی رائے ہے "جگر صاحب کے سیاسی افکار کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ ایک انسانیت نواز فنکار (PHIL IN THROPHIST) تھے۔ بنگال کے قحط کی وجوہ نے نہیں بلکہ واقعات نے انہیں متاثر کیا تھا۔ اگر وجوہ سے متاثر ہوتے یا اُن کا شعور انہیں حاصل ہوتا تو اُسی وقت سے اُن کی شاعری کا انداز بدل جاتا۔ لیکن وہ دو ایک غزلوں سے زیادہ اس موضوع پر کچھ نہ لکھ سکے تھے۔ اسکے بعد جن غزلوں کا حوالہ ترقی پسند ناقدین دیتے ہیں۔ وہ در اصل سیاسی رجحانات کی حامل نہیں بلکہ ۱۹۴۷ء کے زمانہ میں مسلمانوں کی ابتری اور تباہی سے بحیثیت مسلمان بے حد متاثر تھے۔ ان کی یہ فنکارانہ عظمت کہ جب یوم جمہوریت پر لال قلعے میں مشاعرہ ہوا۔ اور بڑے بڑے ترقی پسند جغادری شاعر ہندوستان کے سیاسی استحکام کی شان میں رطب اللسان ہوئے تو انھوں نے پنڈت جواہرلال نہرو کے روبرو وہ غزل پڑھی جس کا مصرعہ ہے ع "کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے" در اصل مسلمان کی حالتِ زار اور اُن سے حکومت کے غیر منصفانہ رویّہ کی ایک شکایت تھی۔ شعور ہرگز نہیں تھا۔ اور نہ اس میں پرولتاری اور بورژوائی نظریات کی جھلک تھی۔ اس اقتباس کی روشنی میں ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ جگر ترقی پسند ہرگز ہرگز نہیں۔ جگر صاحب نے خود بھی اس بات کا کبھی اقرار نہیں کیا کہ وہ ترقی پسند ہیں۔ شاعر کبھی کسی سیاسی پارٹی سے منسلک نہیں ہوتا۔ اگر وہ صحیح معنوں میں کسی پلیٹ

رکن ہے تو اس کی شاعری میں آفاقیت کبھی نہیں آسکتی۔ شاعر حالات اور واقعات سے متاثر ہو کر ہی لکھتا ہے۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اُن میں سیاسی شعور نہیں تھا۔ اگر سیاسی شعور کا مطلب یہ ہے کہ وہ محض سیاسی ہی نظمیں لکھتا رہے تو واقعی اُن میں سیاسی شعور نہیں تھا۔ شاعر کی فطرت عام انسان کی فطرت نہیں ہوتی۔ وہ بہت زیادہ حساس ہوتا ہے۔ عام انسان سے کہیں زیادہ اس کے یہاں غور و فکر کا مادہ ملتا ہے۔ جگر بڑے نڈر قسم کے شاعر تھے وہ اپنی عام زندگی میں بھی بڑے بے باک اور اصول پسند تھے ان کا یہ کہنا عجب کہیں بہار نہ آئے، کہیں بہار آئے۔ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ جو برسرِ اقتدار لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ جب دوسرے شعرا نے ہندوستان کے سیاسی استحکام کی شان میں رطب اللسانی کی تھی۔ میں دوسرے شعرا کا ذکر یہاں نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے ایسے ایسے شاعروں کو بھی دیکھا ہے جو ملک کے مشہور و معروف شاعر ہیں اور ان کے پاس مختلف قسم کے خطاب ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ موقع محل دیکھ کر شعر کہے اور جب ضرورت سمجھی تو نعرے لگائے۔ جگر بڑے سادہ لوح انسان تھے۔ وہ سیاسی اینچ پینچ سے واقف نہیں تھے۔ اُنھوں نے جہاں ظلم دیکھا اُس کے خلاف آواز بلند کی۔ ہو سکتا ہے اد[illegible] کی رائے میں شعور کے معنی کچھ اور ہوں۔ "قحطِ بنگال" ملاحظہ ہو —

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں — ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں
افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ — بے گور و کفن خاک بسر دیکھ رہا ہوں
بچوں کا تڑپنا وہ بلکنا وہ سسکنا — ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں
بے مہری و بے دردی و افلاس و غلامی — ہے شامتِ اعمال جدھر دیکھ رہا ہوں
تعمیر کے پردے میں یہ اندازِ حکومت — تخریب بہ عنوانِ دگر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ آثار تو کچھ اور ہیں لیکن — اک خیر بھی در پردۂ شر دیکھ رہا ہوں
بیداریِ احساس ہے ہر سمت نمایاں — بیتابیِ اربابِ نظر دیکھ رہا ہوں
خاموش نگاہوں میں امڈتے ہوئے جذبات — جذبات میں طوفانِ شرر دیکھ رہا ہوں
انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے — میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں
صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن — صیاد کا لٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں
اربابِ وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ — اغیار کو مجبورِ سفر دیکھ رہا ہوں
اک [illegible] سی نظر آئی تھی مجھ کو — اک [illegible] دیکھ رہا ہوں
[illegible] کو ہے پھر نیرِ تاباں — ہونے کو ہے [illegible] کی سحر دیکھ رہا ہوں

بیداری و آزادی و اخلاق و محبت　　اک خلد در آغوش نظر دیکھ رہا ہوں
جو خواب کہ شرمندۂ تعبیر تھا اب تک　　اس خواب کی تعبیر مگر دیکھ رہا ہوں

جگر اس ظلم کے نظام کو عارضی تصور کرتے ہیں اور حالات کے بدل جانے کی امید رکھتے ہیں یعنی ان کے ہاں تخریب نہیں تعمیر ہے۔ وہ نعرہ لگانا پسند نہیں کرتے۔ دراصل وہ کسی خاص اور غیر ملکی نظام کو اپنے اوپر مسلط کر لینے کے حق میں نہیں ہیں۔ اس لئے وہ "انقلابی" بھی نہیں۔ لیکن جہاں تک سیاسی شعور کا تعلق ہے وہ اُن کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے خیالات میں بے انتہا درد ہے، وہ امن، آزادی اور انصاف کی تمنا کرتے ہیں لیکن اس کے لئے وہ ایسے اصول پسند کرتے ہیں۔ جو انسانیت کے منافی نہ ہوں۔ وہ سنجیدگی سے سوچتے ہیں۔ جذباتیت اور جوش سے کام نہیں لیتے اور احساس کی بیداری کیلئے وہ کوشاں رہتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کو بار بار اس بات کا احساس دلاتے ہیں

ع۔ کہیں بہار نہ آئے، کہیں بہار آئے۔

مسلمانوں کے ساتھ جو امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے بھی انھوں نے آواز بلند کی۔ آزادی کا مفہوم ان کے یہاں بہت وسیع ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

کام ادھورا اور آزادی　　نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی　　سایہ ہے لیکن روشن روشن

جن لوگوں نے آزادی کے لئے جانیں دیں یا جو ظلم کے خلاف جہاد کرتے ہوئے مارے گئے اور جو لوگ آج بھی افلاس، غلامی اور ظلم و ستم کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ ان کے لئے کہتے ہیں ؎

یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائیگا لیکن　　کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرف بہاراں ہوتے ہیں

بمبئی میں جب حکومت کی طرف سے ظلم و ستم ڈھائے گئے تو جگر بے چین ہو گئے وہ خوب جانتے تھے کہ حکومت کے خلاف کچھ کہنا حکومت کو اپنا دشمن بنا لینا ہے۔ لیکن انھوں نے بمبئی کے مشاعروں میں جہاں اور شعر پڑھے۔ وہاں یہ شعر بھی پڑھا ؎

حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں　　جگر ہم بمبئی کو کوچۂ قاتل سمجھتے ہیں

وہ ہر جگہ ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے رہیں اور کبھی کبھی ان کی آواز سوز سے بھرا بھی جاتی ہے لیکن مقصد ان کا وہی ہے۔ کہ کسی طرح ظلم و ستم کا ماتم کیا جائے ؎

یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی　　کہ انساں عالمِ انسانیت پر بار ہو جائے
اک ایسی شان پیدا کر کہ باطل تھرتھرا اٹھے　　نظر تلوار بن جائے نفس جھنکار ہو جائے

نہیں جاتی کہاں تک فکرِ انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

بلندی چاہیئے انسان کی فطرت میں پوشیدہ
کوئی ہو بھیس لیکن شانِ سلطانی نہیں جاتی

وہ مایوس نہیں ہیں، حالات کے بدل جانے کی انہیں امید بھی ہے ؎

جو طوفانوں میں پلتے جارہے ہیں
وہی دنیا بدلتے جارہے ہیں

نکھرتا آرہا ہے رنگ گلشن
خس و خاشاک جلتے جارہے ہیں

وہ اِس سائنسی ترقی کے بھی شاکی ہیں جنھوں نے انسان کو ستاروں تک پہنچا دیا۔ لیکن وہ انسانی عظمت نہ پہچان سکا۔ اسپوٹنک اور دوسرے آلات تو تیار کرلئے۔ لیکن وہ دنیا کے رہنے والوں کے غموں کا مداوا نہیں کرسکا۔ اگر کیا بھی ہے۔ تو وہ جان بوجھ کر انسان کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ دراصل انسان کی یہ سب سے بڑی ذلت ہے کہ وہ اپنی خودی سے آگاہ نہیں۔ وہ انسانی عظمت کو نہیں پہچانتا اور سائنسی ترقی کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے ؎

ربط بڑھایا تھا ستاروں کے ساتھ
کم نہ ہوئیں اُن سے بھی کچھ ظلمتیں

انھیں انسان میں عرفان و محبت کی شدید کمی بڑی طرح کھٹکتی ہے ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

وہ عشق کی توہین نہیں دیکھ سکتے۔ جگرؔ کے یہاں عشق کا مفہوم وہ نہیں جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ جگرؔ انسان میں انسانیت دیکھنے کے قائل ہیں۔ یہ عشق انسانیت کی بنیاد ہے ؎

توہینِ عشق، دیکھ نہ ہو جائے جگرؔ نہ ہو
ہو جائے دل کا خون مگر آنکھ تر نہ ہو

وہ اس نظریہ کے قائل ہیں کہ اچھوں سے سب ہی گند کرلیتے ہیں۔ بروں کو اچھوں کی صف میں لانا، اُن کی بُرائی دور کرنا اور انھیں انسانی عظمت کا مفہوم بتانا ایک بڑا کام ہے ؎

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیئے جارہا ہوں میں

جگرؔ کے یہاں ہمیں ادبی خلوص ملتا ہے۔ وہ انسانیت نواز فنکار ہیں۔ انسان کے دل میں جو درد اُٹھتا ہے اسکی ان کے ہاں ترجمانی ہے۔ وہ اِدھر اُدھر کے فلسفے بیان نہیں کرتے، انھیں دراصل لفظوں میں اُلجھانے کا آرٹ نہیں آتا۔ اُن کی جو آواز بھی نکلتی ہے۔ انسانی عظمت اُن کا موضوع ہیں۔ انسان خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے۔ اگر وہ اپنی عظمت کو نہیں منوا سکتا تو اُس کی یہ مادی ترقیاں محض مشینی ہو کر رہ جائینگی۔ یہ بات نہیں کہ جگرؔ کے ہاں جوش و خروش بالکل نہیں۔ لیکن یہ ہنگامی کیفیت اُن کے ہاں زیادہ دیر نہیں رہتی، اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ ایک سچے فنکار تھے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ـــــ

اٹھو اٹھو کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے ۔۔۔ بڑھو بڑھو کہ چار سو پکار ہی پکار ہے
وہ وقت ہے کہ علم حق ہے علم شیطنیت میں گم ۔۔۔ وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے
کہاں کے مطرب و غزل کہاں کے شاہد و چمن ۔۔۔ کہ زندگی تمام تر بساطِ کارزار ہے
غضب کی چھا رہی ہیں ظلمتوں کی بدلیاں ۔۔۔ ستم کی زد میں آندھیوں کی شمع روزگار ہے
زمیں کو روندتے ہوئے صفوں کو چیرتے ہوئے ۔۔۔ بڑھے چلو بڑھے چلو! یہ وقت کی پکار ہے

یہ کوئی فوجی نغمہ نہیں ہے بلکہ اس بات کا شدید احساس ہے کہ زندگی ہی زندگی پر بار ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کے لئے وہ اپنا یہ نظریہ کہ آدمی کا آدمی شکار ہے۔ پیش کرتے ہیں اصلاح نعرہ لگانے سے نہیں ہو سکتی ہے۔ نعرہ تو ایک جذباتی عنصر ہے۔ ہمارے ترقی پسند شعراء نے یہیں ٹھوکر کھائی ہے۔ اور جھنڈا ہاتھ میں لیکر جنگ کا نقشہ پیش کیا ہے۔ ع بڑھتے بھی چلو کٹتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
کسی بھی نظام کی کسی بھی برائی کو دور کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس برائی کی اصل حقیقت پیش کیجائے وہ احساس پیدا کیا جائے جو اس برائی کے پہلو کو سمجھ سکے۔ ذہنی طور پر بیداری اس جنگی بیداری سے کہیں بہتر ہے۔ جہاں انسان بغیر سوچے سمجھے سر اور بازو کٹائے۔ وہ جانیں دے اور وہ لوگ جو انھیں اشتعال دلا رہے ہیں۔ سیاسی طور پر اقتدار حاصل کر لیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہوا ہے . . . . اور آج بھی تاریخ خود کو دہرا رہی ہے۔ بات پھر جذباتیت کی آجاتی ہے۔ سیاسی گرگے انسان کی سادہ لوح فطرت سے واقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ ان کے احساسات پہ دبیز پردے ڈال دیتے ہیں اور سطحی باتوں کو اپنی جادو بیانی سے اس طرح پیش کرتے ہیں۔ کہ عقل ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ صرف جسم اور جذبات رہ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں انسانیت کا صحیح مفہوم انسان کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہ جادوگری فنکاری نہیں انسانیت کی تذلیل ہے۔ جگر کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ جگر نے ان تمام باتوں پر بہلے حد غور کیا ہے۔ پڑھئے جس کا مطلع ہے ـــــ

کدھر ہے تو اے جرأتِ باغیانہ ۔۔۔ بدل دے مقدر پلٹ دے زمانہ

بشر کی پستی جگر کا خاص موضوع ہے قیسی الفاروقی جو کہ جگر سے بہت نزدیک رہے ہیں اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں۔ ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء آج صبح سے طبعیت کچھ اچھی تھی میں نے نظموں کے متعلق ذکر چھیڑا تو فرمایا کہ اعظم گڈھ کے دوران قیام میں میں نے "سوراج" "گاندھی جی" "تلک" "مولانا محمد علی مرحوم" [illegible] پر نظمیں لکھیں۔ مگر اس دور سرمستی کی اکثر نظمیں ضایع ہو گئیں۔ دریافت کرنے پر فرمایا آپ مجھے

یاد نہیں رہیں۔ بہت عرصہ ہوگیا تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد یاسمین نے بتایا ہے .... جبکہ گاندھی جی نے مکمل آزادی کا نعرہ لگایا تھا میں نے ڈرامائی انداز میں ایک نظم لکھی تھی۔ جس میں بہادر رہبر کی طرح ان کی روح مسلمانوں اور ہندوؤں سے مخاطب ہوتی ہے ..... "سوراج" کے عنوان سے جو نظم کہی تھی اس کے شعر یہ ہیں ؎

سوئے سوراج قدم اپنے بڑھاتے جاؤ   جس طرف جاؤ ادھر آگ لگاتے جاؤ
خوں ابھی اور بہاتا ہے زمینوں پہ عمیق   گولیاں اور بھی کچھ سہتی ہیں سینوں پہ عمیق

۵ مارچ ۱۹۳۰ء لکھا ہے

وطن ہی جب نہیں اپنا تو پھر کہاں کا وطن   چمن اُجاڑ رہا ہوں مگر برائے چمن

یہ شعر غالباً اس دور کا ہے۔ جبکہ ۱۹۴۲ء میں کانگریسی ریل کی پٹریاں اور ڈاک خانے وغیرہ برباد کر رہے تھے اور ایک عظیم ہنگامہ برپا کیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ... قیسی الفاروقی صاحب کی ڈائری سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے اور بھی سیاسی نظمیں کہی تھیں۔ جن کو کہیں نقل نہیں کیا گیا اور جگر صاحب کے وہ خیالات ہم تک نہیں پہنچ سکے بعد میں وہ نظمیں خود بھی اُن کے ذہن سے محو ہوگئی تھیں۔ لیکن یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ ع "چمن اُجاڑ رہا ہوں مگر برائے چمن" کہنے والا شاعر اپنے دور کے حالات سے ضرور متاثر ہوا ہوگا۔ اس نے ضرور اچھے شعر کہے ہوں گے۔ ۱۹۴۶ء میں جب وہ بمبئی گئے تھے اس وقت کا بمبئی سیاسی اور ہنگامہ پرور دور سے گذر رہا تھا مزدور تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں دوسری سیاسی جماعتوں نے بھی حکومت کو پریشان کر رکھا تھا ظالم حکومت گولیاں برسانے سے بھی گریز نہیں کر رہی تھی جگر صاحب کے اس وقت کے خیالات ملاحظہ ہوں :-

ہندوستاں میں خیر سے ان کی کمی نہیں   لب پر جو ہیں خلوص کا دفتر لیے ہوئے
دیتے ہیں بات بات پہ انسانیت کا درس   دل میں ہزار دشنہ و نشتر لیے ہوئے
چہرے جنونِ حبِ وطن سے دھواں دھواں   سینے خیانتوں کا سمندر لیے ہوئے
ظاہر میں اک مجسمۂ امن و آشتی   باطن میں لاکھ فتنۂ محشر لیے ہوئے
کہتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام   پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لیے ہوئے
انسان جس میں بستے ہوں اسطرح کے جگرؔ   بھاگ ایسی سرزمیں سے بستر لیے ہوئے

یہ ٹھیک ہے کہ جگرؔ کی شاعری اقبالؔ یا ظفر علی خاں کی سی شاعری نہیں ہے لیکن یہ کہنا شاید زیادتی ہوگی کہ ان کے ہاں سیاسی شعور نہیں ملتا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ جگر کے سیاسی شعور میں زیادہ گہرائی اور گیرائی نہیں ہے۔ مثلاً کوئی واضح نظریات ہیں۔ جن کی انھوں نے تشریح کی ہو یا کی

وجہ یہ ہے کہ وہ شاعری کو سیاسی تبلیغ کا ذریعہ نہیں سمجھتے۔ ایک سچے فنکار کی طرح جہاں تبلیغی عنصر
زیادہ نظر آنے لگتا ہے۔ وہ پھر واپس ہو جاتے ہیں۔ شاعری کا مفہوم ان کے ہاں کچھ مختلف سا ہے وہ
سیاسی گتھیوں کو نہیں سلجھاتے نہ کوئی خاص نظریہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن آلام دہر اور سیاسی انتشار نے
انھیں متاثر کیا۔ ان کے ہاں گہرائی تو نہیں لیکن وہ ہلکی پھلکی باتوں میں بھی بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔
ان کے طنز گہرے ہیں۔ وہ انسانیت نواز فنکار ہیں۔ اس لیے انسانیت کی رسوائی وہ برداشت نہیں کر پاتے
وہ جب بھی کچھ کہتے ہیں تو ان کا مخصوص لہجہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اُن کی ایک نظم "آجکل" ہے۔ یوں تو
یہ ایک نظم سی ہے۔ لیکن اس میں غزل کی بہت سی خصوصیات ملتی ہیں اس غزل نے بہت شہرت پائی مطلع ہے ؎

فکر جمیل خوابِ پریشاں ہے آجکل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آجکل

جگر کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو ان کے سیاسی شعور کی غماز ہیں۔ انھوں نے جو کچھ
محسوس کیا ہے اور جس طرح محسوس کیا بے باکی سے کہہ ڈالا۔ وہ اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ اپنی بات
کو کسی فلسفے میں لپیٹ کر پیش کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں بے حد سادگی ملتی ہے۔ طوالت کے
خوف سے میں اُن کی بہت سی نظمیں اور اشعار حذف کر رہا ہوں۔ لیکن جن لوگوں نے جگر کا پورا
کلام پڑھا ہے وہ بڑی آسانی سے اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ جگر کا سیاسی شعور نکھرا ہوا ہے

جگر کے علاوہ اختر شیرانی، سیماب اکبرآبادی اور مجاز ایسے شاعر گذرے ہیں جن کے
ہاں ہمیں بے حد رومانی فضا ملتی ہے۔ جو ڈوب کر حسن و عشق کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن سیاسی شعور انکے
پاس بھی ملتا ہے۔ جو لوگ جگر پر کام کر رہے ہیں۔ اُن کا فرض ہے کہ وہ جگر کو حسن و عشق کا ہی شاعر نہ
سمجھیں بلکہ ان کے سیاسی شعور کا بھی تجزیہ کریں۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۳ سے آگے) ان مراسلوں میں "جدیدیت" سے متعلق گرما گرم بحثیں ہوئی ہیں۔ تحریکوں کی
خامیوں اور اچھائیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اشتراکیت اور کمیونزم پر حملے کیے جاتے ہیں۔ ترقی پسندی کے
اصلی روپ کو بے نقاب کیا جاتا ہے اور پھر جدید ذہن اور جدید ادب کی خوبیوں سے بھی اور کوتاہیوں سے
آگاہی حاصل کی جاتی ہے "شب خون" نے مراسلہ کو فن سے قریب کر دیا بلکہ "شب خون" میں مراسلہ نگاری کے
بعد ہی مراسلے کے فنی ہونے کا احساس عام ہوا "شب خون" کے مراسلہ نگاروں میں جدید و قدیم بھی مکتب خیال کے ادیب و
شاعر شامل ہیں اس وجہ سے جب بھی "جدیدیت" کی تاریخ لکھی جائے گی ان مراسلوں کو پڑھنا ضروری ہوگا ان مراسلوں
کے مطالعہ کے بغیر جدید ادب کی تاریخ لکھنا بے معنی ہے اور بے وزن بھی۔ کیونکہ ان ہی مراسلوں کے ذریعہ ہم نے
"جدیدیت" کے مفہوم کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش ابھی جاری ہے۔

ضیاء حسنی

مکتوبات کرشن چندر

طویل مدت سے میں ان گنت کہانیوں کے درمیان سے کرشن چندر کو ابھرتا ہوا دیکھ رہا ہوں باشعور، بالغ نظر اور دردمند کرشن چندر کو اُس کرشن کو جو اُردو کا صاحبِ طرز اور عہد آفریں افسانہ نگار ہے اور جو بقول سردار جعفری ایک بے ایمان شاعر ہے جو افسانہ نگار کا روپ دھار کے آتا ہے اور بڑی بڑی محفلوں اور مشاعروں میں ہم سب ترقی پسندوں کو شرمندہ کر کے چلا جاتا ہے'۔ وہ اپنے ایک ایک جملے اور فقرے پہ غزل کے اشعار کی طرح داد لیتا ہے'۔ میں اُسی البیلی اور محبوب شخصیت کی طرف دوڑ کر کھنچتا رہا ہوں لیکن اُسے قریب سے دیکھنے کی خواہش ہمیشہ میرے دل میں مچل مچل کر رہ گئی۔

آج مکتوباتِ کرشن چندر کے مطالعہ کے درمیان مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اُس کے پُر شکوہ قصرِ خلوت میں چوری چوری داخل ہو گیا ہوں۔ اُس کا رُخِ زیبا دکھائی دے رہا ہے جس میں انسانیت، محبت اور دردمندی کی لکیریں صاف اُبھری ہوئی ہیں۔ برسوں سے میں جس کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا تھا وہ پیامِ خلوص و محبت لئے ایک دم میرے سامنے آگیا ہے۔ میں اُسے اس طرح لگاتار دیکھے جا رہا ہوں جیسے کسی سُہانے سپنے کی تعبیر سامنے آگئی ہو۔ اُس کے لب ہل رہے ہیں اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے پھول برس رہے ہوں، ویسی ہی شگفتگی، شیرینی اور دل آویزی گفتگو میں محسوس ہو رہی ہے جیسی اُس کی تحریر میں ملتی تھی لیکن آج مجھے طلسمِ خیال کا کرشن چندر نہیں مل سکا وہ بھی مل جاتا تو میرے دل کی کلی کھل جاتی۔ بقول علی حیدر ملک 'مکروہات دنیا اور زندگی کی تلخیوں کے شانہ بہ شانہ تازگی اور مسرت کا یہ احساس ایک بڑی دولت ہے' لیکن آج وہ احتیاط سے باتیں کرتے ہوئے صرف زندگی کے تلخ پہلوؤں کو اُجاگر کر رہا ہے جیسے محبت کا زندگی سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ وہ اپنی زندگی کے دلکش گوشے پر ایک دبیز پردہ ڈال کر آگے بڑھ گیا ہے۔ نہ جانے کیوں وہ اُسے ڈھکا مُندا رکھنا چاہتا ہے۔ یہ کھلی نا انصافی ہے جسے شائقین دیدار کافی محسوس کریں گے۔

آج وہ صہبا لکھنوی، سہیل عظیم آبادی، مظہر امام اور پرکاش پنڈت سے ہم کلام ہے۔ اُس کی گفتگو موجودہ زندگی، انسانیت، خلوص اور محبت کے محور پر گھوم رہی ہے وہ وقتاً فوقتاً جس کرب و اذیت میں مبتلا ہوتا رہا ہے اُس کا عکس بھی اس گفتگو میں دکھائی دے رہا ہے۔ اُس کی زبان سادہ، سلیس اور تعقید

اور تکلف سے یکسر عاری ہے۔ وہ ہماری باتیں دل نشین انداز میں کہہ رہا ہے اس لیے جی چاہتا ہے کہ وہ اسی طرح بولتا رہے۔

مکتوباتِ کرشن چندر کے مطالعہ کے درمیان کئی اہم مکتوب نگار اُبھر کے سامنے آگئے ہیں، اُن کی مرصع، مقفیٰ اور پرشکوہ عبارات ذہن میں گونج رہی ہیں، دلکش اشعار بھی یاد آرہے ہیں جو نگینوں کی طرح اُن عبارات میں جڑے ہوئے ہیں، ایسے مکتوبات منثور شاعری کے بلند پایہ نمونے تو کہے جاسکتے ہیں لیکن خط کی حیثیت اُنھیں نہیں دی جاسکتی۔ کرشن چندر کے خطوط موجودہ عہد کے عکاس، دردمندی، خلوص اور محبت کے مظہر ہیں۔ یہ خطوط ہیں انھیں مقالہ، انشائیہ اور افسانہ نہیں کہا جاسکتا۔ صہبا لکھنوی مدیر "افکار" کے نام لکھا ہوا یہ خط ملاحظہ فرمائیے۔ ہر سطر سے عہد جدید جھانکتا ہوا دکھائی دے گا اور آپ اُنھیں پڑھتے ہوئے مجروح اور مضروب زندگی کی سسکیاں سنیں گے۔

"اِدھر دونوں ملکوں کے درمیان نفرت اس قدر بڑھ چلی ہے۔ محبت کی اس قدر کمی محسوس ہوتی ہے کہ جی الٹنے لگتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ زہر کب دور ہوگا۔ کتابیں پڑھنے کا ذوق اس قدر کم ہے کہ اپنی بے بضاعتی پر افسوس ہوتا ہے یعنی ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارے سامنے لڑائی ہوتی ہے۔ لوگ مرتے ہیں۔ مار دیے جاتے ہیں۔ غریبی، بے کاری، پریشانی، زبوں حالی میں دن رات اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ کبھی کبھی افسوس ہوتا ہے۔ خدا نے مجھے کتے کا ذہن کیوں نہیں دیا؛ بس پڑے پڑے دم ہلایا کرتے اور آرام سے کھایا کرتے بلکہ اُس وقت تک کہیں نہ کہیں وزیر ہوتے ہی۔

اچھا خوش رہو۔ تم سے چند منٹ باتیں کرکے جی کی بھڑاس نکال لی ورنہ ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ اپنا کام تو اپنا کام کئے جانا ہے بس۔"

اس مکتوب میں کرشن چندر ویسا ہی لگ رہا ہے جیسا کہ وہ ہے اتحاد و اتفاق کا حامی انسانیت کا مبلغ، غریبوں اور محنت کشوں کا ترجمان، اگر اس خط کو اس کی تخلیق کا ماحصل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جن قارئین نے "غدار" "ہم وحشی ہیں" اور "پشاور ایکسپریس" کہانیاں پڑھی ہیں اور جو فرنگی سامراج کے ہاتھوں لٹے ہوئے کشمیری عوام کی خونچکاں داستانیں اور ممبئی کے فٹ پاتھوں کی کہانیاں سُن چکے ہیں۔ انھیں اس مکتوب کے مطالعہ کے بعد کرشن چندر کو سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوگی۔

"غریبی، پریشانی اور زبوں حالی میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور ہم کچھ کر نہیں سکتے۔

اس تاسف میں کتنا درد چھپا ہوا ہے اور اس سے اس کے حساس دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ خط ختم کرتے کرتے طنز نگار کرشن چندر اُبھر کے سامنے آگیا ہے۔

"خدا نے مجھے کتے کا ذہن کیوں نہیں دیا۔ بس بڑے بڑے دم ہلایا کرتے بلکہ اس وقت تک کہیں نہ کہیں وزیر ہوتے ہی"

اس چبھتے ہوئے فقرے کا جواب نہیں "بس بڑے بڑے دم ہلایا کرتے" اور یہ کرشن چندر کبھی نہیں کرسکا جو کچھ دیکھا اُسے من و عن ظاہر کرنے میں کبھی بخل نہیں کیا پھر اس سلسلہ میں کوئی مصلحت اور کوئی اندیشہ اس کے دل میں نہیں آتا تھا۔ اس لے معاشرے کی دکھتی ہوئی رگوں کو چھونے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ یہی سبب ہے کہ وہ آج تک نہ کوئی پرفضا بنگلہ تعمیر کرسکا نہ کوئی بھاری بنک بیلنس بناسکا اور نہ اُس کے یہاں کوئی نئی ماڈل کی کار دکھائی دی۔

اب دوسرا خط ملاحظہ فرمائیے:۔

"تمہارا خط مل گیا۔ اس سے پہلے والے خط کا مفصل جواب دے چکا ہوں۔ اس خط میں تم نے وہی باتیں لکھی ہیں۔ شاید میرا خط تمہیں ابھی تک نہیں ملا۔ مکان بحالت مجبوری تبدیل کرنا پڑا کیوں کہ مالک مکان نے نوٹس دے دیا تھا کل کلاں کو اگر موجودہ مالک مکان بھی نوٹس دے دے تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔ بمبئی میں مالک مکان کی حیثیت ایک زار سے کم نہیں ہے۔ یہاں میرے حالات کیا ہیں۔ بس اب تم کو کیا بتاؤں! خاموشی بہتر ہے۔ تم اس پتہ پر رقوم بھجواسکتے ہو۔ حساب باقاعدہ رکھو۔ کمی بیشی سے مطلب نہیں ہے مگر حساب اپنے پاس باقاعدہ رکھو۔ اگر مجھے رقم زیادہ وصول ہوجائے گی تو اگلی کتاب میں یا دوسرے ایڈیشن میں کٹ جائے گی۔ کم ملے گی تو آئندہ چل کے پوری ہوجائے گی کوئی مضائقہ نہیں مجھے حساب کتاب رکھنا پسند نہیں ہے۔ یہ کام بڑے جھگڑے کا ہے مگر تمہیں ضرور اپنے کاموں کی خاطر کم سے کم موٹا موٹا حساب ضرور رکھنا چاہیئے۔ رہا تمہارے رشتہ داروں کا معاملہ تو پچیس پچاس تو یوں بھی نکل آتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی بڑی رقم درکار ہو تو اس رقم کو ہندوستان بھجوانے کے بجائے دوسرے کے ہاں امانت رکھوا دینا تجھ سے خرچ ہوجائے گی اور بعد میں بدمزگی پیدا ہوسکتی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ روپے پیسے کی خاطر دو دوستوں میں بدمزگی پیدا ہو۔ یہ میں کسی طرح نہیں چاہتا۔ دوسرے یہ کہ حساب کتاب تم رکھو۔ میں نہیں رکھوں گا۔ تیسرے یہ کہ اس سلسلے میں تم مجھے کسی قانونی یا کاروباری جھنجھٹ میں نہ ڈالو گے ایسا نہ ہو کوئی صاحب مجھے یہاں رقم بھیج دیں اور بعد میں مجھ پر دعویٰ کرتے پھریں۔ میں کہاں بھگتوں گا۔ چوتھے یہ کہ میں نہایت فضول خرچ اور بے کار قسم کا آدمی ہوں اس لئے تمہاری تمام توقعات میرے سلسلے میں غلط ہیں۔ لکھنے پڑھنے افسانے لکھنے اور کتابیں لکھنے کے سوا اور کوئی کام مجھے نہیں آتا۔ آج تک کسی دوست کا مجھ سے بھلا نہیں ہوسکا۔ میں نہایت ہی مطلبی خود غرض اور کمینہ آدمی ہوں یہ تم اچھی طرح جان لو۔ اس کے بعد مجھ سے دوستی رکھو نہ رکھو۔ میرا کیا جاتا ہے۔"

کرشن چندر نے اپنے منفرد اور دلکش اسلوب میں اپنے مخلص دوست مہیا لکھنوی سے دل کھول کر باتیں کی ہیں اور اپنی پوزیشن کی وضاحت کی ہے اور اپنے کمزور پہلوؤں کو اجاگر بھی کیا ہے۔ اسے دوستی کافی عزیز ہے اور اس کے تحفظ کا بھی خیال ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ کسی طرح کی بدمعاملگی ہو اور دوستی میں فرق آئے۔ یہ درست بھی ہے۔ بسا اوقات زر مقراض محبت بن جاتا ہے اس لئے وہ نہیں چاہتا کہ ایسے مرحلے گزرا جائے۔ وہ ادیب ہے اور مخلص دوست بھی۔ اس کے دل میں دوستوں کے لئے کافی گنجائش ہے۔

کرشن چندر مشغلۂ نوشت وخواند جاری رکھنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ وہ اکاؤنٹنٹ نہیں بن سکتا۔ آج ہمارے ملک کے کتنے ادیب و شاعر عجیب عجیب کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور وہ کام ان کی فطری صلاحیتوں کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ خیر کرشن چندر تو لکھ پڑھ کے کسی طرح جئے جا رہا ہے لیکن گھٹن اس کے حصے میں بھی آئی ہے۔

"یہاں میرے حالات کیا ہیں؛ بس اب تم کو کیا بتاؤں؛ خاموشی بہتر ہے" اگر آپ کلرک میں کرسیاں بن رہے ہیں، موزے بنیان لیے ہوئے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہیں کسی بک اسٹال پر کتابیں فروخت کرتے ہیں تو یہ نہ سمجھئے کہ وہ کافی مطمئن رہیں۔ محل غور ہے کہ۔ ممتاز اور معروف ادیب کرشن چندر کو بھی زندگی کے الجھے ہوئے مسائل سے نبٹنا پڑتا ہے۔ مسئلہ مکان کا اُس نے بھی مقابلہ کیا ہے۔ وہ بھی ہماری طرح ذہنی اذیتوں میں مبتلا رہتا ہے اور گھٹ گھٹ کے لکھتا رہتا ہے۔

بمبئی میں مالکِ مکان کی حیثیت ایک زار سے کم نہیں ہے۔ چھوٹے موٹے زار اتر پردیش کے بڑے شہروں میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ عروس البلاد بمبئی کے مالکِ مکان یقیناً بڑے زار ہوں گے۔

کرشن چندر اپنے لاکھوں پرستاروں کے درمیان خود کو کبھی کبھی تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرتا ہے۔ مصائب جھیلتا ہے اور اذیتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ ذرا اپنے محبوب اور عظیم افسانہ نگار کی زندگی کی ایک جھلک دیکھئے۔

"بمبئی"

تاریخ درج نہیں ہے۔ یہ خط ۳۰ اپریل ۱۹۶۲ء کو وصول ہوا تھا۔

دہلی سے واپس بمبئی آیا کیوں کہ دلی نے عجیب سرد مہری کا سلوک کیا جیسا کہ اس جفا پیشہ شہر کا ہمیشہ چلن رہا ہے۔ بمبئی آ کے پھر سے قدم جمانے کی کوشش میں لگا رہا سب کچھ نئے سرے سے کرنا پڑا مکان چھن چکا تھا۔ دو ماہ ایک ہوٹل میں پڑا رہا۔ کوئی کام ہاتھ میں نہ تھا احباب یوں کترا کے نکل جاتے تھے جیسے انھوں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو بہر حال شدید تگ و دو کے بعد مکان مل گیا ہے پتہ اوپر درج ہے۔ ایک فلم میں

کام بھی مل گیا ہے۔ یعنی اب مزید جدوجہد کے لئے سہارا ہوگیا ہے اور یہ سب کچھ اپنی ذاتی کاوشوں سے ہوا ہے یار لوگوں نے اڑنگا لگانے میں کوئی کوشش باقی نہیں چھوڑی۔ اب کے انسانی فطرت کے کچھ مطالعے بڑے دلچسپ ہوئے۔ دلچسپ اس لئے کہ ناامیدی کی منزل سے نکل چکا ہوں اب کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی اتنا کچھ کر لینے کے بعد اب تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ گذشتہ چار ماہ جو خاموش رہا تو اس کی وجہ اب تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔ میرا نیا پتہ نوٹ کر لو اور آئندہ خط و کتابت اسی پتہ پر ہوگی (یعنی جب تک یہ مکان اپنے پاس رہیگا) علاوہ ازیں افکار بھی اسی پتہ پر بھیجا کرو۔ گذشتہ تین چار ماہ سے افکار نہیں ملا ہے۔ دو ایک پرچے اگر بچے ہوں تو بھیج دو۔ جوش نمبر کی اشاعت سے تم نے ایک نئی روائت کا آغاز کیا ہے۔ امید ہے اب یہ سلسلہ جاری رہیگا جوش نمبر میں نے جستہ جستہ مختلف مقامات سے دیکھا ہے۔ بہت خوب ہے۔ اتنے مشاہیر اہل قلم کے مضامین اتنی محنت اور سنجیدگی سے لکھے گئے مضامین کی فراہمی تمہاری جگر کاوی کی دلیل ہے"۔

دلی نے میر و غالب کی طرح کرشن چندر کے ساتھ بھی سرد مہری کا سلوک کیا۔ سچ کہا ہے۔ اس جفا پیشہ شہر کا ہمیشہ سے یہی چلن رہا ہے۔ دوستوں کی بے وفائی کے باوجود کرشن چندر نے خلوص و لگن اور اپنی ذاتی کاوشوں سے بمبئی میں پھر قدم جمالئے اور یارانِ جفا پیشہ کی طبیعتوں کا مطالعہ اُس کے لئے دلچسپ ثابت ہوا۔

صہبا صاحب نے سب سے پہلے جوش کی عظیم شخصیت اور اُن کے فن کے اعتراف کے سلسلہ میں نمبر نکالا تھا۔ کرشن چندر نے اُن کی کوششوں کو اس مکتوب میں سراہا ہے۔ اب ایک خط کا اقتباس درج کر رہا ہوں کرشن چندر نے درج ذیل مکتوب میں ایسی بات کہہ دی ہے جسے ادب سے تعلق رکھنے والے اذہان بشدت محسوس کرتے ہیں۔ کوئی زبان اور اس کا ادب تقسیم نہیں کیا جا سکتا، شاعر اور ادیب ہزاروں میل دور رہ کے بھی ذہنی طور پر جدا نہیں رہ سکتے۔

"کیا میں دونوں ملکوں کی حکومتوں سے پوچھ سکتا ہوں کہ اگر آپ نہری پانی کے سمجھوتے پہ آمادہ ہو سکتے ہیں تو اُن نہروں کے بارے میں کیوں کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے جو دونوں ملکوں میں "کشت ہائے ادب" کو سیراب کرتی ہیں"۔

(مکتوب کرشن چندر بنام صہبا لکھنوی)

ملکی مسائل کی زلف ذرا بھی الجھے تو کرشن چندر مضطرب ہو جاتا ہے عجیب سا کرب محسوس کرتا ہے اور جب تک وہ دل کھول کر لکھ نہیں لیتا دل کی بھڑاس نہیں نکلتی ملک میں غذا کی قلت ہے۔ آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ رہنے کا ٹھکانا نہیں۔ تن ڈھکنے کے لئے کپڑے نہیں

کرشن چندر کی دور بیں نگاہیں دیکھ رہی ہیں اور مستقبل کو خوش آئند بنانے کے لیے بے چین ہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے کتنی اچھی بات کہی ہے ملاحظہ فرمایئے۔ —

"ہاں بھئی۔ زیادہ بچے پیدا کرنا آج کل کے زمانے میں واقعی دانشمندی نہیں ہے۔ میں تمھیں لکھنے والا تھا مگر اچھا ہوا تم نے خود ہی محسوس کر لیا۔ میرے بھی تین بچے ہیں جن میں سے ایک تو پاگل خانے میں ہے جس کیلئے ہر ماہ مجھے تین سو روپے کا انتظام کرنا پڑتا ہے اور باقی دو۔ بچوں کی پرداخت میں۔ اگر صحیح ڈھنگ سے ہوتی رہے تو بہت خرچ اٹھتا ہے۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ بچے کم ہوں، مگر جو ہوں اُن کی پرورش، تعلیم اور تربیت مناسب ڈھنگ سے اس طرح کی جائے کہ بڑے ہو کر یہی بچے اپنی خامیوں کا الزام اپنے والدین کی غریبی کو نہ دے سکیں۔

غرض کہ کرشن چندر کے سبھی مکتوبات کافی جاذب نظر اور موثر ہیں۔ عام طور پر اُس نے اپنی باتیں کہی ہیں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے وہ جگ بیتی سنا رہا ہو۔ قاری مطالعہ کے دوران دھیرے سے اُس کے "خلوت کدہ" میں داخل ہو جاتا ہے اور عجیب سی مسرت محسوس کرتا ہے۔

آخر میں پھر کہوں گا کہ کرشن چندر کے تمام مکتوبات کو یکجا کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ حضرت اعجاز صدیقی کا کرشن چندر نمبر نکالنا ایک عظیم ادبی کارنامہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کافی اہم مکتوبات نمبر کی زیب و زینت بنے ہوئے ہیں۔ پھر بھی وہ یا کرشن چندر خود سبھی مکتوبات کو یکجا کر دیں تو اُن کی زندگی کے تمام پہلو قارئین کی نگاہوں کے سامنے آجائیں گے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۶ سے آگے)

تیز نہیں رہتی اور وہ اپنی دلی کیفیت کے باعث ساری دنیا کو ذی روح سمجھتا ہے اور اپنے دردِ غم میں انھیں شریک سمجھتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جذبات ہجر کے بیان میں جائسی کا کوئی ہمسر نہیں۔

طیب انصاری

مراسلہ نگاری

مراسلہ نگاری کل تک تو فن نہیں تھی۔ آج فن بن گئی۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مراسلہ نگاری میں بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں بلکہ یہ ضرور ہے کہ مراسلہ کا جو ڈھانچہ بنتا جا رہا ہے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ تکنیکی ہے اور یہ تکنیک شعوری بھی ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ اکثر سرکاری دفاتر میں جو کارروائیاں ہوتی تھیں وہ بذریعہ مراسلت ہی ہوتی تھیں یعنی یہ اپنے ابتدائی خدوخال میں دفتری ہوا کرتا تھا۔ ادبی نہیں اور آج بھی یہ شکل موجود ہے لیکن جب سے اخبارات کی اجرائی عمل میں آئی اور اخبارات نے عوامی کالموں کے ذریعہ عوامی شکایات کو متعلقہ افراد تک پہنچانے کے لئے چند کالموں کی جگہ نکالی' عوام نے اپنی شکایتیں لکھ بھیجنا شروع کیں' اس طرح کی شکایتیں بھی مراسلہ سے موسوم کی جانے لگیں اور اکثر ایسے مراسلوں کی نوعیت دفتری تو ہوتی ہی ہے۔ سیاسی و نیم سیاسی بھی بن گئی۔ چنانچہ بیسویں صدی کے تمام اخبارات میں آئے دن عوامی کالموں میں ایسے مراسلے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مراسلے اپنے مقصد کے حصول میں کس حد تک موثر ہوتے ہیں' یہ علحدہ بات ہے لیکن یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ یہ اپنی ابتدائی عمر ہی سے افادی ہوتے ہیں' مقصدی بھی! اظہار مقصد بجائے خود فن ہے۔ اسلئے ابتدا ہی سے مراسلہ لکھنے میں احتیاط اور مصلحت کو پیش نظر رکھا جاتا رہا۔ خصوصاً سیاسی مراسلے غیر معمولی احتیاط اور مصلحت پسندی کے متقاضی ہوا کرتے ہیں۔ اخباروں میں جگہ کی قلت بھی اس کے اختصار کی دوسری اہم وجہ ہے۔ کم جگہ اور کم الفاظ میں اظہار خیال یقیناً مشکل کام ہے۔ اسلئے مراسلہ نگاری کو ہمیشہ ہی سے امر مشکل سمجھا جاتا رہا۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اور اس سے پہلے بھی مراسلہ صرف سرکاری حیثیت رکھتا تھا یہ "حکم نامہ" ہوتا تھا جو سرکار کی طرف سے آتا تھا۔ اس لئے اس کی حیثیت عوامی نہ تھی۔ درحقیقت جرائد و رسائل کی اجرائی اور پھر اخبارات کی اشاعت نے اس کو عوامی حیثیت دلائی ہے۔ اب عوام کی طرف سے بھی مراسلے بنام سرکار شائع ہونے لگے ہیں۔ لیکن اکثر مراسلہ نگار گمنام ہوا کرتے ہیں یا پھر وہ اپنا فرضی نام لکھتے رہیں' کیونکہ مراسلہ اکثر اوقات شکایتی ہوتا ہے اور کبھی کبھی مخالفانہ و باغیانہ بھی خصوصاً جنگ آزادی کے زمانے میں آئے دن جو مراسلے شائع ہوتے رہے وہ سیاسی ہوتے تھے اور ان مراسلوں سے بغاوت کا

ہو آتی تھی، اس طرح گویا سرکار کی نظر میں ان پر عتاب تھا تو دوسری طرف عوام نے اس کو بیباکی کے طور پر استعمال کیا۔ درحقیقت یہی وہ دور ہے جب کہ مراسلہ عوام میں مقبول ہوا اور عام بھی ہوا ہے۔ بلدیہ کی خرابی، دفاتر میں رشوت ستانی اور اقربا نوازی کے خلاف آواز، غنڈہ گردی اور بدمعاشی کے خلاف توجہ دہانی، پولیس کی جانبداری کی شکایت اور ایسی ہی بہت سی باتیں مراسلہ کا موضوع رہی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے کبھی مراسلت کی طرف کبھی توجہ نہیں دی گئی۔ اور ہمیشہ اس کو غیر ادبی سمجھا گیا۔ اور کبھی مراسلاتی کالموں کے ذریعہ ادبی بحثیں بھی ہوتی رہی ہیں لیکن ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ دکن سے شائع ہونے والے بیشتر ماہناموں میں ایسے مراسلے شائع ہوتے رہے ہیں جو خالص ادبی ہیں۔ الہلال و البلاغ کے بعد سے بیشتر ہفتہ وار روزنامہ اخباروں نے ادبی اور نیم ادبی مراسلوں کو جگہ دینا شروع کیا۔ چنانچہ دور جدید کے اخبار میں روزنامہ سیاست اور رہنمائے دکن (حیدرآباد) قومی آواز (لکھنو) کے علاوہ دیگر بہت سے روزناموں نے اپنے کالموں کو ادبی بحثوں کے لئے کھول دیا اور بہت جلد ان کے کالم ادبی اکھاڑوں میں بدل گئے۔ ہفتہ وار اخبار میں "ہماری زبان" کا مراسلاتی کالم خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کالموں میں اکثر طویل مراسلے بھی شائع ہوتے ہیں اور یہ اتنے طویل بھی ہوتے ہیں کہ اکثر ان پر مضمون کا گماں ہوتا ہے۔ حالانکہ مضمون کہیں زیادہ مربوط ہوتا ہے اور یہ اپنی مستقل صورت بھی رکھتا ہے۔ جبکہ مراسلہ تشنہ غیر مربوط اور بڑی حد تک پراگندہ ہوتا ہے۔ پراگندہ ان معنوں میں کہ اس میں سنجیدگی کم اور جذبات کی کارفرمائی کہیں زیادہ ہی ہوتی ہے علاوہ ازیں مضمون اپنی طوالت اور گنجائش کی وجہ سے بڑی حد تک مکمل ہوتا ہے۔ مراسلہ میں تفصیلات ممکن نہیں ہیں۔ یہاں اشاروں ہی اشاروں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ یہ مجبوری بھی ہے۔ ہماری زبان میں جو مراسلے شائع ہوئے ہیں ان کی خصوصیت دیگر روزناموں سے یوں بھی مختلف ہے کہ یہ خالصتًا ادبی ہوتے ہیں، زبان اور ادب سے متعلق ہوتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ان کی زبان شستہ اور ان کا بیان شائستہ ہوتا ہے، یہ ادبی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں مراسلہ نگار زبان و بیان کا لحاظ رکھتا ہے بلکہ اکثر مراسلہ نگار ادیب و شاعر ہی ہوتے ہیں اسلئے بھی لازمًا یہ ادبی بن جاتے ہیں۔ یہ اکثر "ہماری زبان" کے صفحہ ڈیڑھ صفحہ پر مشتمل ہوتے ہیں اور بعض بے حد مختصر بھی اور ان کی نوعیت اکثر استفساریہ ہوتی ہے یا اطلاعی!

چند سالوں قبل تک بھی مراسلہ، باوجود ادبی بن جانے کے فنی صورت اختیار نہ کر پایا تھا۔ ادھر چند دنوں سے اکثر ماہناموں نے اپنے چند صفحات کو مراسلوں کی نذر کر دیا ہے اور ان مراسلوں میں پرچہ متعلقہ میں شائع شدہ ادبی مواد پر بحثیں ہوتی ہیں۔ ان مراسلوں کے ذریعے

مواد اور تنقید کا بھی کام لیا جاتا ہے۔ اکثر تبصرے قصیدہ بن جاتے ہیں اور تنقید یں تنقیص کی شکل
ناد کر لیتی ہیں۔ بہت کم ایسے مراسلے ہوتے ہیں جو متوازن ہوتے ہیں اور معیاری بھی۔ آجکل جدیدیت
بحث عام ہے۔ نجی محفلوں میں بھی مباحث میں بھی اور اخباروں اور رسائل کے صفحات پر بھی ہر جگہ جدیدیت
نوع بحث ہے۔ اکثر مدیران جرائد اپنے اداریتی نوٹ میں اور بہت سے ادیب و شاعر مراسلاتی صفحات
پنے خیالات ظاہر کر رہے ہیں۔ جدیدیت کے اس معرکہ میں مراسلہ خاصی اہمیت اختیار کر گیا ہے اور
اوہ زمانہ ہے جبکہ یہ معتوب طریقہ اظہار خیال سے محبوب فن بن گیا ہے اور کبھی بڑے اور چھوٹے
یب و شاعر اپنے نام سے مراسلے شائع کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتے۔

ویسے تو شاعر' کتاب' تحریک' صبا' آئینہ' سب رنگ' اور بہت سے دوسرے ماہنامے
ہیں جو مراسلوں کو خاصی اہمیت دے کر شائع کرتے ہیں اور کافی جگہ بھی دیتے ہیں۔ ان مراسلوں کی
یت خطوں کی تو ہوتی ہے لیکن موضوع اور مواد کے اعتبار سے یہ مراسلہ ہی ہوتے ہیں اور ان کا منشا اپنی
ذکو دوسروں تک پہنچانا ہوتا ہے جبکہ خط صرف نجی اور خانگی ہوتا ہے۔ اس کے مخاطب کئی نہیں صرف
ہوتا ہے جبکہ مراسلہ میں کئی افراد سے مخاطبت ہوتی ہے۔ ان رسائل میں چھپنے والے مراسلے ادبی ہوتے ہیں
زبان و بیان کے لحاظ سے بھی اور مواد کے اعتبار سے بھی ان مراسلوں میں اکثر بحثیں ہوتی ہیں۔
بھی جواب ہوتے ہیں اور کبھی جواب الجواب بھی۔ اس لئے مراسلے طول طویل کی صورت اختیار کر جاتے ہیں
کی وجہ سے بہت جلد مدیران صاحبان کسی مخصوص موضوع پر مراسلہ کے اشاعت کی مسدودی کا اعلان
تے ہیں۔ ادب میں بحث کوئی نئی بات نہیں ہے حالی کے زمانے ہی سے ایسے موضوعات زیر بحث آتے
ہیں۔ خصوصاً نیچرل شاعری کی جب بات نکل پڑی' اودھ پنچ نے اپنے کالموں کے ذریعہ سے ایسے مراسلے
نظر عام پر لایا جو حالی کی مخالفت میں لکھے گئے اور اس معاملہ میں خود اودھ پنچ کے اداریتی کالم نمایاں مقام
تے ہیں۔ گو اداریتی کالم کو ہم مراسلہ نہیں سمجھتے لیکن ان کی اہمیت بڑی حد تک مراسلاتی ہی ہوتی ہے
یہ منجانب ادارہ ہوتے ہیں ان کا بھی مواد وہی ہوتا ہے جو مراسلوں کا ہوتا ہے اور یہ مقصد میں بھی مراسلے
ہی ہیں۔ اس لئے وہ تمام اداریئے جو سیاسی یا غیر سیاسی ہیں مراسلہ ہی کی تعریف میں آتے ہیں اور
یہ ادبی ہیں تو ہم ان کو بھی فن مراسلہ نگاری کی بدلی ہوئی شکل کہیں گے۔ خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد'
علی' قاضی عبدالغفار' جالب دہلوی' ظفر علی خاں اور سالک وغیرہ نے جو اداریئے لکھے ہیں وہ فن مراسلہ نگاری کا
مکالہ ہیں اور ان کی ادبی حیثیت مسلّم ہے۔

آج کل "شب خون" کے مراسلے موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔ ان (باقی مضمون صفحہ نمبر ۲۳ پر)

محسن شمسی

مکتوب لندن

اس وقت جب میں آپ کو یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ لندن کے ہورنس کالج آف آرٹس کے طلبہ نے کالج کی عمارت پر قبضہ کر رکھا ہے اور استاد کالج میں نہیں آجا سکتے۔ بیلگریڈ یوگوسلاویہ میں حکومت نے تمام جلوسوں اور جلسوں پر پابندی لگادی ہے۔ کل طلباء اور پولیس کے درمیان جھڑپیں ہو رہی ہیں پچھلے دنوں فرانس میں ایک انقلاب برپا تھا اور جنرل ڈیگال کی تقریر سے پہلے یہ عام خیال تھا کہ حکومت فرانس طلباء کے اس نئے انقلاب کے طوفان میں تنکے کی طرح بہہ جائے گی۔ گویہ انقلاب دو طوفان ایکا ایکی یورپ اور امریکہ کے مختلف یونیورسٹی کے شہروں میں یکے بعد دیگرے ابل رہے ہیں اور پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے (عموماً داہنے بازو کی حکومتیں اعلان بھی یہ ہی کرتی ہیں) کہ غالباً بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹیاں ان انقلابات کے پیچھے ہیں مگر مزے کی بات یہ ہے کہ ان انقلابات سے مشرقی یورپ کی کمیونسٹ ممالک کی حکومتیں بھی محفوظ نہیں۔ چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور اب یوگوسلاویہ کی حکومتیں بھی طلباء میں پھیلی ہوئی اس بین الاقوامی بے چینی کی شکار ہیں۔ دراصل یہ بے چینی اور حکومت وقت سے یہ بیزاری نہ تو بین الاقوامی کمیونسٹ انقلابی تحریک کی پھیلائی ہوئی ہے اور نہ ہی امریکی سی۔آئی۔اے (C-i-A) کے ڈالر کی طاقت کا نتیجہ ہیں۔ ایسی تحریکیں جو ایکا ایکی پرجوش چشموں کی طرح ابل جانے والی ہوں کسی غیر ملکی اور بین الاقوامی سازش کے سہارے کی محتاج نہیں دراصل یہ بے زاری وہ ہے جس کے متعلق "البرٹ کامو" نے اپنی کتاب "باغی" میں لکھا ہے یہ بے زاری مختلف فلسفوں سے متاثر سیاسی تحریکوں اور ان کے مختلف رہناؤں سے ہے۔ یہ بے زاری صنعتی زندگی کے اس پہلو سے ہے جہاں انسان کی انفرادیت مشین کی ٹھنڈی غیریت میں غرق ہو جاتی ہے اور جہاں فرد اپنی انفرادیت کھو کر صنعتی زندگی کی عظیم الشان مشین کا ایک معمولی پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ ایسا پرزہ جو بدلا جاسکتا ہے اور جس کا کام زیادہ سے زیادہ صنعتی پیداوار میں محض حصہ لینا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ طلباء کی یہ بے چینی... ان ملکوں میں زیادہ ہے جو سب سے زیادہ مشینوں سے لبریز ہیں اور جن کی ملکی صنعتی پیداوار بہت زیادہ ہے۔ امریکہ، جرمنی، فرانس، انگلستان۔ اٹلی۔ سویڈن اور جاپان کے طلباء اپنے ملک کی حکومتوں سے سب سے زیادہ بے زار ہیں۔ گو طلباء کا یہ احتجاج محض صنعتی ملکوں تک ہی محدود نہیں۔ جنوبی امریکہ۔ انڈونیشیا چین اور مشرق وسطیٰ کے طالب علم بھی طلباء کی بے زاری کی اس بین الاقوامی تحریک سے علیحدہ نہیں۔ عرب ممالک میں غالباً مصر ہی ایسا ملک ہے جہاں کا سربراہ مملکت طلباء کی نفرت کا نشانہ نہیں۔

برکلے امریکہ - میڈیسن، ویسکانسن، سوربون، لندن اسکول آف اکنامکس، [illegible] اور اسٹاک ہوم سویڈن میں ایک کے بعد ایک اُبھرنے والے طلباء کے احتجاجوں کے اُبھرنے اور ختم ہونے میں ایک خاص طرح کا تعلق پایا جاتا ہے۔ شروع میں طلباء احتجاج کرتے ہیں جیسے کہ کولمبیا نیویارک اور سوربون فرانس میں ہوا۔ حکومت اس احتجاج کا جواب پولیس اور طاقت کے استعمال سے دیتی ہے۔ کولمبیا نیویارک پولیس کی گولیوں سے تین نیگرو طالب علم مارے گئے۔ لندن میں ویت نام کی جنگ کے خلاف طلباء کے ایک جلوس کو گھوڑسوار پولیس نے اپنے گھوڑوں سے کچل ڈالا۔ فرانس میں پولیس نے نہ صرف طلباء کو بری طرح پیٹا بلکہ آس پاس کھڑے تماشائی بھی پولیس کے ڈنڈوں کا شکار ہوئے۔ تشدد کے اس استعمال سے طلباء کی طاقت اور بھی [illegible] ہے اور غیر طرفدار طلباء اور عام لوگوں کی ہمدردیاں بھی طلباء کے ساتھ ہو جاتی ہیں اور آخر میں حکومت کو طلباء کی مانگوں کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ انگلستان جہاں کے طلباء غالباً پورے یورپ میں سب سے زیادہ غیر جوشیلے اور کمزور دل کے ہیں۔ حکومت کو طلباء کے مطالبوں کے آگے جھکنا پڑا اور اب طلباء کالجوں کے چلانے میں برابر کے حصہ دار ہو رہے ہیں۔ انڈونیشیا اور چیکوسلواکیہ میں طلباء کے احتجاج نے حکومت کا تختہ ہی الٹ دکھ دیا۔ امریکی پولیس بھی اب اپنی روایتی وحشیانہ کارروائی والے تشدد کو چھوڑ کر طلباء سے زیادہ [illegible] اور امریکی یونیورسٹیاں زیادہ جمہوری ہو گئیں ہیں۔ دراصل طلباء کو اپنی طاقت کا احساس ہو رہا ہے اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ تشدد سے کام بنتے ہیں۔ مختلف پارٹیوں کی ملی جلی حکومتیں جہاں کی پارلیمنٹ میں کوئی باقاعدہ مخالف پارٹی نہیں اور جہاں حکومت کرنے والوں اور محکوموں میں ایک نہ پٹنے والی خلیج واقع ہے حکومت کرنے والے غیر محدود اور جواب دہی سے مبرا طاقت کے نشے میں ڈوب گئے ہیں۔ طالب علموں کے اس انقلاب کا ایک مقصد یہ ہے کہ روایتی سیاسی پارٹیوں سے علیحدہ بائیں بازو اور ترقی پسندوں کے گروہوں پر مشتمل ایک نئی مخالف پارٹی وجود میں آئے جو پارلیمنٹ اور جہاں ہونے والے سیاسی [illegible] علیحدہ ہو کر عوام کا صحیح نظریہ پیش کرے۔ طالب علموں کے کا یہ نیا گروہ روائتی داہنے بازو والی اور [illegible] کمیونسٹ پارٹیوں دونوں سے منہ موڑتا ہے۔ ان کے خیال میں یہ سب روایتی سیاسی گٹھ جوڑ [illegible] دوسری سیاسی ترکیبوں اور چالاکیوں سے محض طاقت حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ [illegible] مزدور اور کسان کی بھلائی نعروں کے علاوہ کچھ نہیں اور مزدور اور کسان اور سماج کے [illegible] ان جماعتوں اور ان کے سیاسی رہنماؤں کو طاقت میں لانے کے لئے منظم کی جاتی ہیں لہٰذا طلباء [illegible] انقلاب کسی بھی طرح کی سیاسی یا سماجی تنظیم کے خلاف ہے۔ تنظیم کا مطلب ایک خاص نصب العین [illegible] کرنے کی کوشش ہے اور اس کا مطلب اس نصب العین اور اس کو پا کر [illegible]

ایسا سماج ایک ساکن سماج ہے۔ طلبا موجودہ کمیونسٹ ممالک اور مغربی ممالک دونوں کے سماجوں کو ساکن سماج سمجھتے ہیں۔ جہاں زندگی محض صنعتی پیداوار بڑھانے کے مقصد میں جذب ہو کر رہ گئی ہے اور انسان کی عظمت انفرادیت اور وہ عظیم الشان تحفہ جسے قوت تخلیق (جنسی معنوں میں نہیں) کہا جاتا ہے کھو بیٹھا ہے یونیورسٹیاں اس نظام میں لگ جانے والے پرزوں کی پیداوار میں لگی ہیں۔ طلبا اس ساکن سماج کو قبول نہیں کرتے اور اس کی بجائے ایک متحرک سماج چاہتے ہیں جہاں انقلاب اور تبدیلی ایک مستقل جستجو کی صورت میں جاری رہے ۲۸ سالہ روڈی ڈشکے (RUDi DUTSCKE) جرمن طلبا کی تحریک کا رہنما مستقبل کے سماج کی وضاحت سے صاف انکار کرتا ہے کیونکہ اس کا مطلب ہوگا کہ انقلاب اس سماج کے حاصل کرنے کی تگ و دو تک محدود ہو کر رہ گیا۔ گو یہ کوئی نئی بات نہیں طلبا اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ ارتقا کا عمل جاری ہے اور جاری رہے گا۔ لہذا کسی بھی زمانے کے لوگوں کو یہ اختیار نہیں کہ وہ یہ سمجھیں کہ ارتقا کی آخری منزل آ پہنچی۔ مگر جو لوگ حکومتوں میں ہیں اور جنھوں نے اپنی زندگیاں موجودہ حالت اور سماج کے حاصل کرنے میں لگائی ہیں۔ ان کو یہ سیدھی سچائی ماننے میں بے حد جذباتی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ یہ لوگ ہمدردی کے بالکل ناقابل نہیں۔

طلبا تنظیم کے خلاف ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ طلبا کے اس بین الاقوامی انقلاب کے پیچھے کوئی باقاعدہ فلسفیانہ دلائل نہیں۔ طلبا کے اس بائیں بازو ترقی پسند گروہ پر جرمن فلسفی ہربرٹ مارکوس (HERBERT MARCUSS) کی تحریروں کا سب سے زیادہ اثر ہے مارکوس امریکہ کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں۔ مارکوس کی دلیل ہے کہ سائنس اور صنعت غیر جانبدار نہیں کیونکہ ان کو ان کے استعمال سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سائنس اور تکنیکی نظام ایک ایسا نظام حکومت ہے جو کہ نئی سے نئی تکنیکوں کے بنانے میں مصروف ہے اور اس نظام میں انسان کی ذاتی و جماعتی ضرورتیں صنعتی ضرورتوں سے متعین ہوتی ہیں۔ موجودہ مغربی دنیا کے سماج کی اس تشریح سے عموماً لوگ متفق ہیں مارکوس کے نزدیک اقتصادی آزادی معاشی طاقتوں سے آزادی کا نام ہے۔ جہاں روزی کمانے کی ضرورت سے آزادی حاصل ہو سیاسی آزادی کا مطلب اس سیاست کے چنگل سے آزادی ہے جس پر فرد کا کوئی قبضہ نہ ہو۔ ذہنی آزادی کا مطلب انسانی خیال اور تخیل کی ایسی آزادی جس پر ریڈیو ٹیلی ویژن اور عوام میں پھیلے وسیع پروپیگنڈے کے وسائل کا قبضہ نہ ہو۔ ان آزادیوں کو حاصل کرنے کے لئے روایتی احتجاج کے ذرائع بے کار ہیں کیونکہ ایک تو وہ موجودہ نظام میں آسانی سے برداشت کر لئے جاتے ہیں اور دوسرے عوام اور مزدور اور وہ طبقہ جو کہ اقتصادی طاقتوں کے ہاتھوں لوٹا جاتا ہے، پروپیگنڈے کے اثر سے اس طرح بے نور کر دیئے گئے ہیں کہ وہ اپنی اصل ضرورتوں اور خواہشات سے ناواقف ہیں اور ان کو ان کی صحیح اور اصلی ضروریات سے متعارف کرانے کی ذمہ داری

ایک مخصوص چھوٹی سی جماعت طلبا کے سر ہے۔ اس لئے کہ طلبا ہی ایک ایسی جماعت ہیں جو کہ صنعتی پیداوار کے نظام میں جذب نہیں ہوئے ہیں اور طلبا یہ ذمہ داری اس طرح پوری کر سکتے ہیں کہ حکومتوں کو تشدد پر اکسائیں تاکہ جب وہ تشدد پر اتر آئیں تو عوام اور مزدور انھیں ان کے اصلی رنگ میں بے نقاب دیکھیں اور وہاں سے انقلاب اور مستقل انقلاب شروع ہوتا ہے جس میں طلبا اور مزدور ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور ایک ایسا نظام قائم ہو جہاں ہر ایک کام اور دماغی اور تخلیقی قوتوں کی تکمیل میں وقت صرف کرتا ہے۔ دیکھئے یہ انقلاب کیا صورت اختیار کرتا ہے۔

انگلستان کے اخبارات جنرل ڈیگال سے بغض کی بنا پر شروع میں اس انقلاب سے بہت خوش تھے اور اپنی اس خوشی کا اظہار بغیر کسی شرم کے اخبارات میں شائع ہونے والی تصویروں اور خبروں میں کرتے تھے۔ مگر اب انگلستان کے رہنما سنجیدگی سے سوال کر رہے ہیں کہ اگر فرانس میں یہ ہو سکتا ہے تو کیا انگلستان میں ہونا ناممکن ہے اور ایک نامعلوم خوف روایتی رہنماؤں پر طاری ہے۔

حرمت الاکرام

زخمِ چشم و دل لئے اہلِ نظر جاگا کئے
شمع سا پہنائے غم میں تا سحر جاگا کئے

عشق نے بدلی نہ اپنی فطرتِ شب زندہ دار
تجھ کو پا کر بھی ترے آشفتہ سر جاگا کئے

آگہی کے درد کا کس سے مداوا ہو سکا
طعنہ زن تھا نیند کا جادو مگر جاگا کئے

تھپکیاں دیتے رہے خوابوں کے افسوں روح میں
سونے والے بھی باندازِ دگر جاگا کئے

اک تصور نے بنایا کتنی راتوں کو بہار
اک تمنا لے کتنے بام و در جاگا کئے

آنسوؤں کے ہار پہناتے رہے لمحات کو
شام سے ہم تا سحر، با چشمِ تر جاگا کئے

زندگی کی رات خوابوں میں گنواتے کس طرح
منتظرِ صبح میں اہلِ نظر جاگا کئے

جھلملا کر بجھ گیا بزمِ طلب کا ہر چراغ
ہم جلا کر شمعِ دل کی، رات بھر جاگا کئے

کہکشاں کی راہ سے گزرا نہ کوئی قافلہ
تا بہ حرمت کسی کے دیدہ ور جاگا کئے

ساحل مانکپوری

اشک آنکھوں میں یوں دہکتا ہے
جیسے سونا کہیں پگھلتا ہے

اس کو موتی کہیں کہ اشکِ الم
اُن کی مژگاں پہ جو چمکتا ہے

دل کے آنگن میں آس کا غنچہ
پھول بنتا ہے پھر مہکتا ہے

دل ہے بالک، اک ایسا چنچل سا
ہر کھلونے پہ جو مچلتا ہے

جانے کیوں پھول ہنسنے لگتے ہیں
جب بھی غنچہ کوئی چٹکتا ہے

رات کیسے کٹے گی اے ساحلؔ
شام ہی سے جو جی لرزتا ہے

اقبال نہاس

ہم بھی دریا تھے اگر محوِ روانی ہوتے
غم کے پایاب ہوئے ورنہ کہانی ہوتے

تیری پلکوں پہ اُمڈ آئے تو انمول ہوئے
سبزہ و گُل پہ یہ دو گوہر تو پانی ہوتے

چل دیئے چھوڑ کے تم بھی مجھے تنہا آخر
ساتھ چلتے تو نئی رسم کے بانی ہوتے

ہاں تری جنبشِ ابرو ہے تکلّم تسلیم
اور اگر میری خموشی کے معانی ہوتے

ضبط کے دشت میں محبوس رہے ہیں اقبال
ملکِ احساس کے ورنہ ہمی ثانی ہوتے

سُہیل اختر

تو جذبِ دل کو نہ دے اتنا احتیاط کا رنگ
رُخِ حیات سے اُڑ جائے گا نشاط کا رنگ

بھٹک رہا ہوں میں اس دشتِ یاس میں کہ جہاں
نہ قربتوں کی ہے خوشبو نہ ارتباط کا رنگ

افق پہ صبح بھی پھوٹی شفق بھی لہرائی
نہ چھا سکا دلِ افسردہ پہ نشاط کا رنگ

یہ زندگی کا سفر بھی ہے کس قدر نازک
ہر ایک راہ پہ طاری ہے انحطاط کا رنگ

نہ جانے یہ کیا چال چل گیا اختر
کبھی بھی رُخ پہ نہیں آج انبساط کا رنگ

امجد نجمی

سیکڑوں میں ہوں یا ہزاروں میں　　ایک میں بھی ہوں جاں نثاروں میں
لکھ لیجئے تشبیہات جمیل　　ثبت کرتا ہوں کہساروں میں
کس مجسم بہار کو آنکھیں　　ڈھونڈتی ہیں یہاں نظاروں میں
ظلمتِ شامِ غم سے گھبرا کر　　آہیں ڈھلنے لگیں شراروں میں
حسنِ دلکش کا ان کے کیا کہنا　　ماہ پارے ہیں ماہ پاروں میں
اشک آنکھوں میں آ کے خشک ہوئے　　روشنی اب کہاں ستاروں میں
کشتیاں آ کے ڈوبتی ہیں یہیں　　عافیت کچھ نہیں کناروں میں
ان نگاہوں نے کہہ دیا کیا کیا　　کچھ کنایوں میں کچھ اشاروں میں
اب خزاں کو نہ دیجئے الزام　　پھول مرجھا گئے بہاروں میں
تم نے جس دن سے پھیر لیں آنکھیں　　ہو گئے ہم بھی بے سہاروں میں
ظاہراً ہیں نباہے جاتے ہیں　　وہ خلوص اب کہاں ہے یاروں میں

کیا ہے نجمی ہماری عمرِ رواں
ناؤ بہتی ہے تیز دھاروں میں

محمد نسیم قریشی

یہ لوگ عجب ہیں یونہی لب کھول رہے ہیں
کہنے کو نہیں کچھ بھی مگر بول رہے ہیں
کیا غم کہ بھرے شہر میں ہم آج ہیں بے بس
ہم بھی تو کسی دور میں انمول رہے ہیں
کل بھی تھے خود اپنی ہی صداؤں کے بھنور میں
کشتی کی طرح آج بھی ہم ڈول رہے ہیں
یہ لوگ ترا حسن پرکھنے سے ہیں قاصر
کانٹوں کی ترازو میں تجھے تول رہے ہیں
پھر ہونے لگا مجھ کو کسی درد کا احساس
پھر آپ مری سوچ کے در کھول رہے ہیں

ریاض حسین چودھری

ٹوٹا نہیں ہے آج کوئی آسماں نیا
پوچھو کسی سے گردشِ دوراں کو کیا ہوا
اک پردۂ خیال پہ ابھرا ہے نقشِ پا
گردِ الم کے پردوں میں لپٹا ہے چاند سا
پھولوں کی اوٹ سے وہ مجھے دیکھنا ترا
اک اور تیری یاد کا دل میں دیا جلا
تجھ سے غمِ حیات نہ ہوں گے کبھی جدا
دل کو عزیز ہے ترے دامن کا تھامنا
یوں آمدِ بہار کا اعلان ہو گیا
کہ پھٹ پڑا ہے چاک گریباں سِلا ہوا
اے باغباں فضول خزاں کا نہ کر گلا
شعلہ نشاں بنی ہے ترے باغ کی ہوا
ہم نے ریاضؔ راہ میں سجدے کئے بہت
شاید کسی رقیب کو مل جائے راستا

ناشاد کانپوری

دل کی جانب جو اُن کی نظر ہو گئی
زندگی موجِ مے سر بسر ہو گئی
دیکھتے ہی انھیں آنکھ تر ہو گئی
داستانِ الم مختصر ہو گئی
مایۂ زندگی ہے وہی زندگی
یار کی یاد میں جو بسر ہو گئی
چونک اٹھتے ہیں وہ کیوں مرے نام پر
کیا انھیں دردِ دل کی خبر ہو گئی
جان دیتے تھے جس زندگی کیلئے
اب وہی زندگی دردِ سر ہو گئی
مختصر کس قدر تھی شبِ زندگی
آنکھ جھپکی ذرا بس سحر ہو گئی
جب نہ دیکھا گیا حال ناشادؔ کا
بیکسی رو پڑی نوحہ گر ہو گئی

غلام مرتضیٰ راہیؔ

چراغِ شام اب گُل ہے، بجا ہے
مگر تاریکیٔ شب میں جلا ہے
ابھی سے خواب منزل کے نہ دیکھو
ابھی تو فاصلہ ہی فاصلہ ہے
گھٹا دو چند محلوں کی بلندی
کہ اس نقصان ہی میں فائدہ ہے
زمانہ اس طرح کب تک چلے گا
ابھی تو گرتا پڑتا چل رہا ہے
تخیل کی حدوں سے پار ہو کر
چلو دیکھیں اگر کچھ ہے تو کیا ہے؟
غبارِ کارواں ہے ہم سے آگے
یہیں اس راہ میں کچھ سوچنا ہے
چلی آتی ہیں دنیا بھر کی فکریں
مری تنہائیوں کو کیا ہوا ہے
نہ جانے مجھ پہ کیا گذرے گی راہیؔ
مرا سایہ بھی مجھ سے کانپتا ہے

معصوم شرقی

افسانۂ حیات کی حالت ہے غیر سی
تجویز کردو تم کوئی عنوانِ زندگی
کتنے ادب نوازوں نے خونِ جگر دیئے
سرسبز تب ہوئی ہے کہیں کشتِ شاعری
خوشیوں کا دور آتا ہے رنج و محن کے بعد
جسطرح تیرگی سے ابھرتی ہے روشنی
چھیڑا جو میں نے قصۂ غم بزمِ یار میں
چشمِ عدو بھی اشک سے لبریز ہوگئی
کچھ بوالہوس بھی کہتے ہیں خود کو وفا پرست
بدنام کیوں نہ بزمِ جہاں میں ہو دوستی
تھے صبحِ نو کی راہ میں آنکھیں بچھائے لوگ
اس دورِ نو میں بھی تو جہالت نہیں مٹی
آزردہ حال دیکھ کے وہ مجھ کو ہنس پڑے
اپنی تباہیوں کی مجھے داد مل گئی
ڈھلتے ہوئے شباب کا ماتم نہ کیجئے
بس چار دن کے واسطے آتی ہے چاندنی

معصوم کیوں نہ دادِ غزل کی ملے مجھے
مضمون بھی اچھوتے ہیں ترکیب بھی نئی

نعیم تقوی

نہ مضطرب ہوں میں دنیا میں رنگ و بو کیلئے
یہ اہتمام ہے بس تیری جستجو کیلئے

یہ اور بات کہ کچھ بھی نہ کہہ سکا ورنہ
کئے تھے لاکھ جتن تم سے گفتگو کیلئے

تمام عمر در و بام ہی سجائے ہیں
کس اہتمام سے اس جانِ آرزو کیلئے

حسین کیوں نہ ہو اس کا کلام جانِ غزل
کہے جو شعر کوئی تم سے خوبرو کیلئے

بصد قیود نکھرتا ہے جوہرِ ذاتی
صدف ہے قطرۂ نیساں کی آبرو کیلئے

اسیرِ زلف وفا ہیں اسیرِ جور و جفا
قدم قدم پہ ہیں دار و رسن گلو کیلئے

دہانِ زخم مگر وا ہوں چشم پرنم ہو
نعیم شرط ہے ان سے یہ گفتگو کیلئے

نسیم تقوی

اے موجِ بہاراں تجھے رقصاں نہیں دیکھا
یہ کیسی سحر ہے گلِ خنداں نہیں دیکھا

ہم لوگ پگھلتے ہی رہے موم کی مانند
کب تو نے ہمیں عمر گریزاں نہیں دیکھا

کچھ لوگ چلے پھول بنے راہ کے کانٹے
ایسا تو کہیں جذبۂ انساں نہیں دیکھا

آئی جو خزاں خاک ہوا شہرِ بہاراں
ہم نے تو کبھی ایسا بیاباں نہیں دیکھا

جلتا رہے اپنوں کے لئے دیپ کی صورت
اس دور میں ایسا کوئی انساں نہیں دیکھا

یہ دل کبھی پتھر ہے کبھی درد کا درماں
اس کو کسی پہلو میں بھی یکساں نہیں دیکھا

طالب جے پوری

ترجمہ رُباعیاتِ خیام

دنیا سے امیدِ لطف و احساں بیکار
بے کار ہے فکرِ سر و ساماں بیکار
درماں طلبی درد بڑھا دیتی ہے
دل درد کا خوگر ہو تو درماں بیکار

ہے موت سے اے دوست کہاں جائے اماں
تو بھی کبھی ہوگا اسی پردے میں نہاں
آیا ہو کہیں سے بھی بلا سے مے پی
خوش رہ نہیں معلوم کہ جائے گا کہاں

نعرۂ شباب

دنیا سے گزرنا ہے تو ڈر نہ گزر
پستی سے ابھرنا ہے تو بے خوف ابھر
جینا ہے تو مردوں کی طرح شان سے جی
مرنا ہے تو شیروں کی طرح ٹھاٹ سے مر

حوصلہ مندی

افلاس میں بھی بے سر و ساماں نہ رہا
میں بے سر و سامانی پہ نالاں نہ رہا
ہر تلخیٔ دوراں کو نوازا میں نے
مجھ سے ہی مگر خوش کبھی دوراں نہ رہا

رندی و مستی

پاکیزگیٔ دل کا فسانہ اچھا
باطن کی صفائی کا ترانہ اچھا
مے پی کہ نہیں آنا ہے پھر دنیا میں
خوش رہ کہ تو اچھا تو زمانہ اچھا

کلیہ

انساں کا دنیا سے حذر مشکل ہے
دنیا سے کرے قطع نظر مشکل ہے
آساں ہے شعلوں سے بچانا دامن
شبنم کا شراروں میں گزر مشکل ہے

نقد و نظر

نذرِ ذاکر مرتبہ مجلس نذر ذاکر نئی دِلّی۔ ملنے کا پتہ ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دِلّی نئی دِلّی/ بمبئی صفحات ۶۷۰ کاغذ کتابت، طباعت اور گٹ اپ وغیرہ نہایت اعلیٰ قیمت چالیس روپے (کتاب پر سہواً تیس روپے لکھا ہے)

مجلس نذر ذاکر کے صدر ڈاکٹر تارا چند تحریر فرماتے ہیں، ــــ

"کیا بلحاظ ایک فاضل و صاحب علم شخص کے اور کیا بحیثیت صدر جمہوریہ ہند کے۔ ہمارا سب سے بڑا قومی اعزاز۔ ہمارا فرض ہے کہ ایک یادگاری کتاب ان کی خدمت میں پیش کی جائے جس میں ان کے کارناموں اور انکی مدت العمر کی ملکی خدمات کا اعتراف ہو اور جس میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے بلند پایہ مصنفین کے فاضلانہ مقالات انگریزی اور اُردو بھی شامل ہوں"۔

اس کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری جناب مالک رام صاحب معتمد مجلس کے سپرد کی گئی اور اس طرح یہ شاندار کارنامہ ظہور میں آیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی سوانح حیات اور خدمات کا تذکرہ کرنے والوں میں پہلے خود صدر مجلس ڈاکٹر تارا چند ہیں اور ان کے بعد ذاکر صاحب سے بہت قریب رہے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر محمد مجیب ہیں صدیقی صاحب نے "موجِ گل سے چراغاں ہے گذرگاہ خیال" کے عنوان کے تحت ذاکر صاحب کا تعلق اپنے خاص انداز میں طالب علم سے لے کر وائس چانسلری تک بتایا ہے۔ مجیب صاحب نے جامعہ ملیہ کے قیام میں ذاکر صاحب کی جانفشانی، ایثار اور اعلیٰ علمی اور تنظیمی صلاحیتوں کی داستان سنائی ہے۔ تیسرا مضمون ذاکر صاحب کے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا "ذاکر میاں" کے زیرِ عنوان ہے۔ یہ بہت زیادہ تفصیلی اور موثر خانہ کیفیات کا حامل ہے ان سب مضامین کا مطالعہ قلب میں اہتزاز روح میں بالیدگی اور نظر میں وسعت پیدا کرتا اور کردار سازی میں مدو معاون ہوتا ہے۔ ان مضامین کے لکھنے والے جانے پہچانے اور صف اول کے ادیب ہیں جنھوں نے ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے تمام گوشوں کو منظر عام پر لاکر ان کے مقام کو اور اونچا کر دیا ہے۔

دوسرا حصہ حسبِ ذیل مقالات پر مشتمل ہے :ــ

۱۔ ہندوستانی روح کا بحران ڈاکٹر سید عابد حسین ۲۔ دیوان حسن بیگ شاملو گرامی قاضی عبدالودود

۳- شاہانِ اودھ کا علمی و ادبی ذوق - سید مسعود حسن رضوی
۴- جاحظ کی کتاب الاخبار - امتیاز علی خاں عرشی

۵- تذکرۃ المذاہب - ڈاکٹر عبدالعلیم
۶- اردو میں سیاسی اصطلاحیں - ہارون خاں شروانی

۷- ابن عربی کا نظریہ وحدت الوجود - محمد عبدالسلام خاں
۸- سبعۃ احرف - سعید احمد اکبرآبادی

۹- عورت اور مرد کا مرتبہ اقوامِ عالم میں - محمد زبیر صدیقی
۱۰- گلِ رعنا۔ غالب کا گم شدہ انتخاب - مالک رام

۱۱- شاہ خلیل اللہ کے خطوط - نذیر احمد
۱۲- افلاطون کی ریاست - ضیاء الحسن فاروقی

۱۳- مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دارالترجمہ - عبدالقادر سروری
۱۴- اسلامی عہد کی علمی رواداریاں - سید صباح الدین عبدالرحمٰن

۱۵- اُردو کی ہندی بحر - ڈاکٹر گیان چند
۱۶- منتخب اللطائف - ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی

۱۷- اُردو آوازوں کی نئی درجہ بندی - ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
۱۸- رسالۃ المبرد - ڈاکٹر مختار الدین احمد

ان میں تین رسالے۔ کتاب الاخبار، تذکرۃ المذاہب اور رسالۃ المبرد عربی میں جنھیں مرتب کرکے پیش کیا گیا ہے۔ بقیہ پندرہ مقالوں میں پہلا مقالہ ڈاکٹر سید عابد حسین کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ان کی نذر کے لیے ایسا مضمون زیادہ موزوں ہوگا جو ان کی ذات سے نہیں بلکہ ان مقاصد سے تعلق رکھتا ہو جو موصوف کو جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ مقالے میں انھیں مقاصد کی توضیح ملتی ہے۔ دوسرے مقالے میں قاضی صاحب نے اپنے خاص انداز میں گرامی کی سوانح حیات اور شاعری پر مواد پیش کیا ہے اور آخر میں اشعار کا انتخاب دے کر اشعار کے محاسن اور اسقام بتائے ہیں۔ "شاہان اودھ کا علمی و ادبی ذوق" میں شاہان اودھ کی علمی استعداد، ان کے علمی و ادبی کارنامے، عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی، ان کے علمی اور تعلیمی ادارے، ان سے دربار سے وابستہ اور ان کی سرکار میں ملازم "ادبا اور شعرا" کا تعارف کرایا گیا ہے اور تمام واقعات کو تذکرہ اور کتب تواریخ سے لے کر ان کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ باوجود اس کے کہ متعدد تذکروں کے فقرے اس میں شامل ہیں لیکن دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اس کو برہان الملک کے دور کے آغاز سے واجد علی شاہ کے دور کے اختتام یعنی (۱۷۲۲ء/۱۱۳۴ھ - ۱۸۵۶ء/۱۲۷۲ھ) تک کی علمی اور ادبی تاریخ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی نے اردو میں سیاسی اصطلاحوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اصطلاح سازی کا آغاز سرسید سے کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں اصطلاح سازی کے ساتھ ساتھ بعد کے دور میں جو اصطلاحیں بنائی گئیں ان کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ ابن عربی کے نظریہ پر فاضل مصنف نے بہت سیر حاصل بحث کی ہے۔ گلِ رعنا کی پیش کشی غالبیات کے امام جناب مالک رام کے قلم کی مرہونِ منت ہے اس سے بعض غزلوں کے دور کے تعین میں مدد ملی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ غالب نے اپنے اشعار پر جو اصلاح کی ہے۔ اس کے بھی مطالعہ کا موقع فراہم ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے ابراہیم عادل شاہ ثانی بانی نورس اور مصنف نورس کے دربار کے خطاط

تلنگانہ کے تحریر کردہ قلمی نسخۂ سب رس کے اوراق کی تصویریں دی ہیں اور ان کا حال بھی لکھا ہے۔ اس سے مالکوں اور بعد کے کچھ اور خطاطوں کے نام بھی سامنے آتے ہیں۔ خود ابراہیم عادلشاہ ثانی کا تحریرہ کلام مجید کے آخری دو صفحوں کا عکس بھی چھاپا ہے۔ اس سے ابراہیم کے ماہر خطاط ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ ماہر فن مولا تھا اور جگت گرو کا لقب اس کو زیب دیتا تھا۔ اُردو کی ہندی بحر کے تعلق سے ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں کہ "نثر اور نظم کا فنی فرق ہی یہ ہے کہ نظم (خواہ کتنی ہی آزاد کیوں نہ ہو) وزن کے کسی مقررہ آئین کی پابند ہوتی ہے" اس کی صداقت میں شک ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کو کسی وقت میں یا مختلف اوزان میں بٹھایا جائے لیکن آئین کا پابند سمجھنے میں تامل ہوگا۔ مقالہ کافی محنت سے لکھا گیا ہے اور مطالعہ غور و فکر کا داعی ہے۔ ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے منتخب اللطایف کا تعارف کرایا ہے۔ یہ رحم علی خان ایمان کی تالیف ہے یہ سکندرہ راؤ ضلع علی گڈھ کے باشندے تھے اور بقول مصنف تاریخ فرخ آباد ۱۲۲۶ھ میں انتقال کیا۔ اس تذکرہ سے استفادہ کرنے والوں میں قدرت اللہ شوق اور حسین قلی خاں (مصنف نشترِ عشق) کے نام ملتے ہیں۔ ایمان نے بعض شعراء کے حالات کی جو تفصیل دی ہے وہ اور تذکروں میں مفقود ہیں۔ اس لئے اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں آخری مقالہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا ہے جو اُردو آوازوں کی نئی درجہ بندی پر سپرد قلم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف سب رس کی مجلس ادارت کے ایک رکن ہیں۔ وسکان سن یونیورسٹی میں ویزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ایک سال کیلئے جارہے ہیں۔ لسانیات اور صوتیات پر دو کُ مقالے لکھ چکے ہیں۔ ایک کتاب بھی امریکہ سے شائع کر چکے ہیں۔ پیش نظر مضمون بہت زیادہ ٹکنکی اور فنی ہے اور انھیں تصویروں سے سمجھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ دوران مقالہ بعض ماہرین فن کے اعتراضات کے جواب بھی ہیں۔ بہ اعتبار محاسن ظاہری و باطنی کتاب نہایت اہم اور قابل قدر ہے اور جس معیار پر اس کو تیار کیا گیا ہے اس لحاظ سے چالیس روپے قیمت زیادہ نہیں۔ (حصہ انگریزی کی تفصیلات اگلے شمارے میں پیش ہوں گی)

گلِ نوا

واحد پریمی۔ مکتبہ صبح ادب نول والی مسجد بدھوارہ بھوپال مجلد معہ خوبصورت گرد پوش صفحات ۱۴۴
قیمت دو روپے

بیسویں صدی کے نصف اول کے اختتام اور نصف آخر کے آغاز کے بعد کی اردو شاعری میں ہمیں کافی فرق نظر آتا ہے۔ نصف اول کی شاعری میں روایتی شاعری یعنی گل و بلبل اور جام و مینا کے ساتھ حصول آزادی کی جدوجہد غلامی زنجیروں سے چھٹکارا پانے کے تصورات، انگریزوں سے بہ حیثیت حاکم تنفر اور وطن سے محبت اور خلوص کا جذبہ جاری و ساری دکھائی دیتا ہے اور دوسرے نصف کے آغاز سے آزادی کے خوابوں کی دھندلی تعبیریں، قائدین کی جواب حاکم بن چکے تھے، بے بسی اور ایک طرح کی جانبداری، سرمایہ دارانہ نظام کا عروج، غریب کا غریب تر اور امیر کا امیر تر ہونا

عوام کی تنگ نظری، عصبیت، خون خرابے، ہولناک گرانی، زبانوں سے دشمنی، ادب اور ادیبوں کی ناقدری [illegible] جگہ لیتے گئے۔ بعض شعراء نے برملا کہا اور بعض نے رمز و ایما کا طریق اختیار کیا۔ ان کی یہ رمزیت اور ایمائیت دور کے گزرنے کے بعد بھی برقرار ہے اس لئے کہ حالات نے انھیں اپنے تصورات میں تبدیلی کی اجازت نہ دی۔ اس دور کی غزل نغمہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں درد و کرب کا حصہ زیادہ شامل نظر آتا ہے۔ ہمارے شعراء غزل روایتی انداز سے شروع کرتے ہیں لیکن بہت جلد اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر حقیقتوں کے اظہار پر اتر آتے ہیں اور کبھی ابتدا ہی اظہار حقیقت سے ہوتی ہے۔

گل نو کے شاعر واحد پریمی صاحب کی شاعری آزادی کے حصول کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ ابتداً وہ روایتی ڈگر پر چلے لیکن قایم نہ رہ سکے۔ رنگین اور طرب آمیز شاعری کے ساتھ ساتھ ماحول کے اثرات کو بھی جگہ دی۔ جناب شفا گوالیاری مرحوم کی صحبتوں میں انھوں نے اپنے مذاق کو نکھارا، زبان کو سنوارا، الفاظ کے دروبست کا سلیقہ پیدا کیا اور بہت جلد شاعروں میں اپنے لئے ایک مختص مقام پیدا کر لیا۔ وہ اردو کے سبھی رسائل میں غزلیں بھیجتے ہیں لیکن مشاعرے کے شاعر نہیں حالانکہ بھوپال میں مشاعروں کا ایک تانتا بندھا رہتا ہے۔ وہ زندگی کی دلچسپیوں اور رنگینیوں کو بھی اپنی غزل میں جگہ دیتے ہیں اور تلخیوں کو بھی لیکن تلخیوں سے گھبرانا ان کا شعار نہیں وہ حوادث کو پامال کرتے ہوئے گذر جانے کے قایل ہیں۔ یہ جواں ہمتی اور بلند حوصلگی زندگی کے معیار کو اونچا کرتی ہے۔ کچھ روایتی اور کچھ درایتی اشعار نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اس سے ان کی شاعری کا اندازہ کرنے میں مدد مل سکے گی۔

نہ پوچھئے کہ شبِ ہجر ہم پر کیا گذری — تمام رات جلے شمع انجمن کی طرح
ہم بارہا یہ سوچ کے شکوہ نہ کر سکے — ساقی کے التفات کا کچھ تو بھرم رہے
رگ گل جس کو کہتے ہیں خردمند — وہ دیوانے کا تار پیرہن ہے
آ کے قدموں میں بہاریں بچھ گئیں — جس طرف بھی چل پڑے اہل جنوں

دلوں میں زخم ہونٹوں پر تبسم — اسی کا نام تو زندہ دلی ہے
اندھیروں میں اجالے ڈھونڈتا ہوں — یہ حسنِ ظن ہے یا دیوانہ پن ہے
ایک دن آپ وہ اس آگ میں جل جائیں گے — جن کے سینوں میں سلگتے ہیں عداوت کے الاؤ
صبح نو آنے کو کب کی آ گئی — ہے ابھی لیکن رہی شب کا فسوں
باغبانو! آہ کن آنکھوں سے میں — گلستاں جلتا ہوا دیکھا کروں
پھول افسردہ غنچے پژمردہ — کیا یہاں رنگ ہیں بہاروں کے
گل فروشوں کو امیں گلستاں کب تک کہیں — دوستو ہم غاصبوں کو پاسباں کب تک کہیں
شہر ہو بیاباں ہو دار ہو کہ زنداں ہو — نغمے زندگی ہی کے گائے جا رہے ہم نے

اینٹ کا جواب | مظفر حنفی - میواتی پورہ ، بھوپال گیٹ ، سیہور ، بھوپال -

مظفر حنفی شاد رامپوری کے صحیح جانشین کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں جو تلخی اور جذبات کی شدت طنز کا تیکھا پن اور سماج کے گھناونے مناظر پہ ضرب ان کی شاعری میں نظر آتی ہے یہی کیفیت ان کی نثر میں بھی پائی جاتی ہے انھوں نے اپنی ادبی زندگی افسانہ نگاری سے شروع کی اور ذوق شعر نے شاعر بنا دیا ۔ "اینٹ کا جواب" ان کے اکیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مگر یہ افسانے عشق و محبت کے نہیں جو محض ذہنی عیش کوشی ہی کا کام دیتے ہیں۔ سب ہی افسانے معاشرت کی اصلاح کا خیال پیش نظر رکھکر لکھے گئے ہیں اور چونکہ مصنف کی نظر گہری اور مشاہدہ عمیق ہے اس لیے وہ جزئیات کو بھی چھوڑنا .. گوارا نہیں کرتے ہمارے سماج کی حالت کچھ دل خوش کن تو نہیں ہے اس لئے ایسے افسانے جن میں افسانہ نگار مقصدیت لیئے ہوئے ہوتا ہے ذہنی طور پر رنج و افسوس کا باعث بنتے ہیں۔ اصلاح سماج کا نظریہ رکھنے والے مصنف سے دلآویز اور دلچسپ باتوں کی توقع رکھنا عبث ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان میں خشکی اور یبوست راہ پا گئی ہے۔ افسانہ نگار اپنے خیالات کو اس انداز سے ضبط تحریر میں لاتا ہے کہ بے دلی اور ناگواری محسوس نہیں ہونے پاتی۔ وہ قاری کو اپنی تحریر کے زیر اثر رکھتے ہیں۔ کہیں ہلکے سے طنز سے متبسم کرتے اور کہیں جذبہ میں لاتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگاری کے فن پر انھوں نے بڑا ریاض کیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ فطرتاً ہی افسانہ نگار واقع ہوئے ہیں اور وہ جن حالات سے گذر رہے ہیں انھوں نے ان میں یہ تلخی پیدا کی ہے۔ بعض مقامات پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ عام حالات سے ہٹ کر کچھ غیر فطری انداز میں کہہ رہے ہیں لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ انھیں ایسا ہی سابقہ پڑا ہو اور وہ صداقت کو من و عن پیش کر رہے ہوں۔

فراق گورکھپوری نے مظفر صاحب کا تعارف کراتے ہوئے بجا تحریر فرمایا ہے کہ "ان کے افسانوں میں زندگی کے کئی پہلوؤں کی عکاسی ہے۔ ان میں نیاپن ہے ان کا انداز دلکش ہے۔ مکالمے فطری ہیں اور پلاٹ میں جدت ہے"۔ فراق صاحب کی اس رائے کے بعد مزید کچھ کہنا تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔ امید کہ ہمارے سماج کے ارکان اس پتھر، اینٹ کا جواب سے حظ حاصل کریں گے

عکس ریز | مظفر حنفی - ناشر - کتاب پبلشرز چوک لکھنؤ - صفحات ۱۴۶ - کتابت ، طباعت اوسط - مجلد مع گرد پوش - قیمت تین روپے -

یہ ایک طویل نظم ہے جس میں سو بند سے زاید ہیں۔ آپ چاہیں تو اس کو مسلسل نظم بھی کہہ سکتے ہیں اور ہر بند ایک علیحدہ موضوع کے سبب نظم سے علیحدہ بھی رکھا جا سکتا ہے اس عمل سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ نظم ایسے طنزیہ خاکوں پر مشتمل ہے جو ہمارے سماج کا جوہر بنے ہوئے ہیں مشاہدے کی گہرائی بہت بڑھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سماج کے ایسے تمام افراد کے خاکے جن سے ہمیں رات دن سابقہ رہتا ہے پیش کر دیئے گئے ہیں مثلاً افسر، وکیل، ٹھیکے دار، پیشکار، میر منشی، مالک مکان، جی ملا بھائی، جوان بیوی بوڑھا شوہر، دوست احباب، یورپ زدہ، کوتوال شہر، لکچرر غرض کہ کوئی فرد چھوٹا نہیں۔

مکالماتی انداز لطف کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے اور افراد سے ہم زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں اور ان سے کردار پہ واضح روشنی پڑتی ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو ؎

یہ ہمارے شہر کے انجینیر

ریت سے تعمیر کرتے ہیں محل ۔۔۔ ”زرِ تخمینہ“ میں نیت کا خلل
باندھ بنتا ہے تو بن جاتے ہیں یہ ۔۔۔ بلڈنگوں کے ساتھ تن جاتے ہیں یہ
باڑھ میں دیہات جب ڈوبے گئی ۔۔۔ بن گئے حضرت کے منصوبے کئی
دیکھنا اک دن پھریں گے دربدر ۔۔۔ یہ ہمارے شہر کے انجینیر

ہر بند کے نو مصرعوں میں پہلا مصرع تعارفی طور پر ہے اور باقی آٹھ مصرعے کردار کا اظہار۔ ہمارے ادب میں ”عکس ریز“ اپنی جدت کی بنا پر کافی مقبولیت حاصل کرے گی۔ (محمد اکبر الدین صدیقی)

ماہنامہ الشجاع (سالنامہ ۶۸ء) کراچی

مرتب سلمان الارشد۔ صفحات (۳۳۲) تصویریں (۷۰) قیمت سالنامہ ۲/۵۰ زرِ سالانہ ۵/- ملنے کا پتہ: ٹائمز پریس۔ صدر، کراچی ۵ (پاکستان)

ماہنامہ الشجاع کراچی گزشتہ پندرہ سال سے پابندی اور اپنے بھرپور معیار کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ علمی و ادبی اور معدود رسالوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ الشجاع تحقیقی تنقیدی مضامین، افسانوں، نظموں اور غزلوں کے علاوہ دیگر فیچرس پر مشتمل ہے۔ اور ہر آئینہ اس قابل ہے کہ اچھا اور ستھرا ذوق رکھنے والے اس سالنامہ کو خریدیں۔ ادب اور فلسفہ، توبۃ النصوح، دیو مالا اور علامت، اردو غزل، نظیر کے نقاد اور رمانی و دو اہم ٹھوس اور بھرپور مقالے ہیں جن کے لکھنے والوں میں علی الترتیب ڈاکٹر احسن فاروقی، جمیل جالبی، ابن فرید، سلیم احمد، ڈاکٹر ابو محمد سحر اور ڈاکٹر اسلم فرخی شامل ہیں۔ اس خصوصی اشاعت میں (۲۵) افسانے شامل ہیں اور ہر افسانہ اپنے تاثر کے لحاظ سے خوبصورت ہے۔ اقبال متین، انور عنایت اللہ، عفت موہانی، انور عباس، حمیدہ معین رضوی، رفعت فواز، اکرام جاوید، ابراہیم شفیق اور عوض سعید جیسے مشاق اور مقبول افسانہ نگاروں کی شمولیت اچھی کہانیوں کی ضامن ہے۔ حصۂ نظم اور غزل یوں لگتا ہے ذرا روایتی سا ہو گیا ہے اور اس قدر بھرپور اور توانا نہیں جس کی سالنامے کے مرتب سے توقع کی جا سکتی تھی۔ اکیس نظمیں چھپی ہیں جن میں بلراج کومل، شاذ تمکنت، حمید الماس، سلیمان اریب، محمود سعیدی، عزیز تمنائی، مصحف اقبال اور محمود خاور نے متاثر کیا ہے۔ دو درجن سے زیادہ غزلوں میں اچھے شاعروں کا نمائندہ کلام شامل نہیں ہے، سوائے دو ایک شعراء کے۔ پھر بھی احمد ہمدانی، خورشید احمد جامی، قمر اقبال، کمار پاشی، ناصر زیدی، شمس الرحمن، نظر [illegible] راہی کی غزلیں لب و لہجہ اور اندازِ فکر کے سبب پسند آئیں۔ ریڈیائی ڈرامہ ”خزاں“ اور احمد جمال پاشا کا فکاہیہ دلچسپ ہے۔ سالنامہ میں دیگر زبانوں کی نصف درجن سے زیادہ نمائندہ کہانیوں کے ترجمے بھی شامل کیے گئے ہیں، ان میں سے چند تراجم بہت خوب ہیں۔ مجموعی طور پر الشجاع کا سالنامہ بہت اچھا اور یادگار تحفہ ہے۔

(وقار خلیل)

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء جلد ۳۱ شمارہ ۱۱

نومبر سنہ ۱۹۶۸ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

پروفیسر سید علی اکبر

مجلس مشاورت

میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، میر معراج سکینہ، ڈاکٹر غلام عمر خاں

محمد منظور احمد

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم — محمد جمال الدین

منتظم — وقار خلیل

زر سالانہ چھ روپے غیر ممالک دس روپے

ششماہی تین روپے فی پرچہ پچاس پیسے

نمونے کے پرچہ کیلئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

گزشتہ مہینے میں ۲۰ ستمبر کو ایوان اُردو میں پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کے انتقال پر جناب سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ ادبیات اُردو کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر مغنی تبسم اور راقم الحروف نے مرحوم کے کارناموں پر روشنی ڈالی اس کے بعد تعزیتی قرارداد پیش ہو کر منظور ہوئی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے تحریک کی کہ سب رس کا ایک خاص شمارہ پروفیسر مرحوم کی یاد میں شائع کیا جائے اس کو جناب صدر نے منظور کیا اور آئندہ کوئی شمارہ ان کی یاد میں نکالنے کی اجازت عنایت فرمائی۔

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی بجائے خود ایک ادارہ اور انجمن رہے ہیں ان کے دوست احباب شاگردوں اور وابستگان سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مضامین ختم نومبر تک ارسال فرمائیں تاکہ ان کے شایانِ شان سب رس کا یادگار شمارہ شائع کیا جا سکے۔

ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات اُردو دانی، اردو زبان دانی، اردو عالم۔ ۲۹ ڈسمبر تا ۳۱ ڈسمبر بلدہ اور اضلاع کے مراکز پر ایک ساتھ منعقد ہوں گے فیس داخل کرنے کی آخری تاریخ ۲۰ ڈسمبر مقرر کی گئی ہے۔ اضلاع میں مراکز کے قیام کے تعلق سے جناب عارف الدین حسن صاحب معتمد امتحانات ادارہ ۱۷-۶-۶ اسپیشل سی آئی بی۔ آغاپورہ حیدرآباد ۱ سے مراسلت کر کے معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ادارہ ان امتحانات کو ۱۹۴۰ء سے فروغ اردو کے سلسلے میں منعقد کرتا آ رہا ہے اور اب تک ہزاروں اصحاب شرکت کر کے اپنے تعلیمی معیار میں اضافہ کر چکے ہیں۔ ادارہ ان امتحانات کی نگرانی کیلئے اضلاع کے تمام مراکز پر اپنے نمائندے روانہ کرتا ہے جو سوالات کے پرچوں کے ساتھ جاتے اور جوابی بیاضوں کے ساتھ واپس ہوتے ہیں۔ اس خصوصیت سے سرکاری اور جامعاتی امتحانات کے مراکز بھی عاری ہیں۔ جامعہ اردو علی گڈھ نے اُردو عالم کے امتحان کو مستند قرار دیا ہے اس امتحان کو کامیاب کر کے ادیب کامل میں شریک ہو سکتے ہیں جس کو بی، او، ایل (عثمانیہ) میں شرکت کیلئے قبول کیا گیا ہے چنانچہ اس طریقے سے کئی امیدواروں نے اپنی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی ہے۔

اس رسالے میں ڈاکٹر عابدی، ڈاکٹر احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر مغنی تبسم، پروفیسر شیخ زید اور جناب سید یوسف کمال بخاری ڈائرکٹر آرکائیوز بھوپال کے مضامین تنقیدی اور تحقیقی ہیں۔ خصوصاً جناب بخاری صاحب نے توزک جہانگیری کے نسخہ نیشنل میوزیم کو جہانگیر کا قلمی ثابت کرنے میں جو عرق ریزی کی ہے وہ قابل داد ہے اور یقیناً بہ نظر استحسان دیکھی جائیگی۔ یہ مضمون انگریزی میں اسلامک کلچر میں شائع ہوا ہے اردو میں ابھی تک منظر عام پر نہ آیا تھا۔ ہم بخاری صاحب کے ممنون ہیں کہ یہ مضمون آپ نے سب رس کو عنایت فرمایا۔

محمد اکبر الدین صدیقی

ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی

فاتح گیلانی

میر رضی متخلص بفاتح کو "میرزا اور شاہ" بھی کہا گیا ہے۔ مگر ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بہر حال آپ صفوی خاندان کے چشم و چراغ اور شیخ علی حزیں کے اقربا میں سے تھے۔ گیلان کے شہر رشت میں پیدا ہوئے۔ جس پر آپ کو کافی فخر تھا۔ نیز رشت سے ایک جذباتی لگاؤ تھا ؎

ہست فاتح بلبل گلزار رشت　　طالب آل اگر از آل است

گرد شہرت گر خدا خیز است گیلان در جہاں　　لیک فاتح ہر ہزا بینی ز شہر رشت ماست

انھوں نے کوہ حیدر کا بھی ذکر کیا ہے جو غالباً رشت میں ہے ؎

کوہ حیدر صد فلک از طور سینا برتر است　　برتر از شان کلیم اللہ شان حیدر است

بعد میں آپ اصفہان جا کر رہنے لگے جہاں کے دریا کی توصیف کی ہے ؎

ای خوشا زایندہ رود اصفہان　　کاسمان طاقی ز طاق این پل است

دیوان فاتح کا ایک قلمی نسخہ سالار جنگ میوزیم میں ہے (نمبر ۱۰۷ ادب نظم فارسی) جس کی کتابت محمد حسن بن حاجی خاں نے ۱۱۶۴ھ میں ذی الحجہ کے مہینہ میں حیدر آباد میں کی تھی۔ اس نسخہ میں شاہ فاتح کے حالات کچھ تفصیل سے قلمبند کئے گئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علوم دینی وغیرہ کی تحصیل کے بعد فاتح زیارت عتبات عالیات کے لیے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے وہ وطن سے نجف گئے۔ جہاں تین دن رات ضریح مبارک کے سامنے کھڑے رہے اور برابر روتے جاتے تھے۔ تیسری شب میں جب دنیا سوئی ہوئی تھی روضہ سے دست مبارک بلند ہوا اور حضرت نے فاتح کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کیلئے آواز دی جب بیعت سے فراغت ہوئی تو دوسری آواز آئی کہ تربیت ظاہری کیلئے مشہد مقدس کے شاہ عرفان کو حکم دیدیا گیا ہے۔ اسی وقت سے فاتح کی درویشی کا سلسلہ شروع ہوا اور وہ تارک الدنیا ہو کر فقیرانہ لباس میں سفر کرتے ہوئے مشہد پہنچے۔

ادھر شاہ عرفان نے دو درویشوں کو ان کے استقبال کیلئے بھیجا جو فاتح کو ان کے پاس لیگئے

۱۔ متوفی بسال ۱۱۸۰ ہجری / ۶۷-۱۷۶۶ عیسوی

فاتح نے ابتدائے جوانی میں کبھی یہ مصرع کہا تھا «سلکی کو تا مرا دریتم عرفان جادہ» جب شاہ عرفان کی نظر فاتح پر پڑی تو انسے پوچھا کہ کیا انھوں نے یہ مصرع کہا تھا۔

اسکے بعد روضۂ امام رضا میں فاتح نے شاہ عرفان کے ساتھ دو چلے کھینچے جسکی برکت سے نیز شاہ عرفان کی توجہ سے انکی کیفیت بہت بدل گئی۔ ہندوستان خاصکر دکن اور حیدرآباد میں انسے بے شمار خوارق عادات ظاہر ہوئے۔ نیز جس سرزمین پر فاتح پہنچے تھے ان سے بوے وحدت لوگوں کے دماغ تک پہنچتی اور ان کو بے خود و مدہوش بنا دیتی تھی۔

چونکہ شاہِ مردان کی طرف سے انکو فاتح کہکر پکارا گیا تھا اسلئے یہی انکا تخلص اور لقب ہو گیا۔

بہرحال جب ایران پر افغانیوں کا تسلط ہوا تو فاتح ۱۱۲۴ - ۱۱۳۱ ہجری/۱۷۱۳ - ۱۷۱۹ عیسوی کے درمیان ہندوستان آئے۔ مؤلف تذکرۃ الشعراء نے آپ کو عہد فرخ سیر ۱۷۱۳ - ۱۷۱۹ عیسوی کا شاعر بتلایا ہے۔

حسب ذیل شعر میں آپ نے اپنے ہندوستان آنے کا سبب بھی بتلایا ہے:-...

زامیر خود نپرسی ز غریب خود نگوئی !!! کہ زعشق من بر آمد سوے ہند از ولایت

بہرحال یہاں آنے پر آپ نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ نیز ہندوستان کی باربار تعریف کی ہے:-

فاتح چو روشنش شدہ چشم از سواد ہند این سرمہ را دگر بصفاہان نمی دہد

حسب ذیل شعر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یہاں آکر لوگوں کی ہدایت اور ان کے معیار کو بلند کرنا چاہتے تھے

بیا فاتح ز ایران چشم اہل ہند روشن کن کہ قدر سرمہ دارد گرد راہ اصفہان اینجا

پھر بھی ظاہر ہے کہ مسافرت کے عالم میں انہیں وطن یاد آتا رہا ہوگا اور وہ ایران کو فراموش نہیں کرسکتے تھے۔ نیز یہاں انہیں تلخیوں کا سامنا کرنا پڑا اور تہی دستی کی زندگی دیکھنی پڑی جس کے نتیجے میں وہ یہاں سے برداشتہ خاطر ہو کر شکایت کرنے لگے:-

گریم بہ تیرہ بختی خود گر بہ ملک ہند اشکم کدام قطرہ کہ صد رود نیل نیست

فاتح ز تہی دستی خود داد کہ در ہند ہردم گہر اشک درین بادہ بیارد

ز فاتح اے صبا در گلشن ایران پیامی بر کہ روز روشن خود در دیار ہند شب کردم

سر و برگ غزل خوانی چو بلبل نیست در ہندم درین گلشن برنگ غنچہ فاتح دل گرفت از من

بہند از قول من فیضی نباشد بی نصیبان را ز آب خضر در ظلمات لب ترکرد نتوان کردن

حسب ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اس سفر میں انہیں وطن جیسی عزت نصیب نہ ہو سکی اور وہ ایران واپس جانا چاہتے تھے:-

در وطن عزت دیگر بود آزادان را جلوۂ گلبنگ بیکبہار نماید خود را
در وطن خاطر آزادہ دلان آزاد است در چمن غنچہ دل افگار نماید خود را

بایران می روم فاتح ز ہند از درد بیدردی چو بیماران دہم تغییرآب بہر شگون جا را

پھر بھی اس ملک کو بالکل فراموش کرنے کے لئے وہ تیار نہ تھے ؎

بایران گر شود بخت سیاہت آرزو فاتح خدا نا کردہ یاد ہند گاہے میتوان کردن

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں پہلے وہ دہلی میں رہے اور اس کے بعد دکن گئے۔ جہاں وہ حیدرآباد میں رہے ؎

حیدرآباد است فاتح چون دل فاتح خراب چشم آن دارم کہ از فضل و کرم آباد باد

اس کے بعد وہ ارکاٹ چلے گئے ؎

الکن بجود و زنار بگردن فاتح می برد عشق بتاں جانب ارکاٹ مرا

مؤلف ریاض الشعراء نے لکھا ہے کہ فاتح نے ایک سال تک شاہجہاں آباد میں انتہائی گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی۔ اگر سفینۂ ہندی میں بتایا ہے کہ وہ ہندوستان میں صرف ایک سال رہے۔ اگر ریاض الشعراء کا کہنا مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ دہلی میں ایک سال اور اس کے بعد دکن وغیرہ میں بھی کچھ رہے ہوں گے مگر اگر سفینۂ ہندی کی بات مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک ہی سال میں دہلی، حیدرآباد اور ارکاٹ وغیرہ رہے۔

مؤلف ریاض الشعراء نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک سال کے بعد شاہجہاں آباد سے زیارت بیت اللہ کے قصد سے روانہ ہوئے مگر سورنج اور اجین کے درمیان ڈاکوؤں اور لٹیروں کے ہاتھوں مع تمام قافلہ کے قتل کر دیئے گئے۔ سفینۂ ہندی میں بھی اسی سے ملتی جلتی عبارت ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک سال کے قیام کے بعد جب وہ زیارت بیت اللہ کیلئے روانہ ہوئے تو سورنج کے پاس لٹیروں نے انہیں قتل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ سفر کے وقت فاتح نے ایک غزل کہی تھی جس کے مقطع میں اس شہادت کی طرف اشارہ ہے ؎

میاور گلشن ایران ز فاتح این پیامی بر کہ وقف دشمن خود در دیار ہند شب کردم

مگر حسب ذیل شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکن سے دہلی کیلئے دوبارہ روانہ ہوئے ؎

چو گل ز ملک دکن چند فاتح از سیرش کہ باز شوق ہوائے دیار دہلی کرد

غالباً اسی واپسی میں راستہ میں قتل کر دیئے گئے تھے۔ مؤلف تذکرۂ بے نظیر نے بھی اس کی تائید کی ہے اور یہی صحت سے زیادہ قریب ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دہلی واپس ہو کر انکا زیارت بیت اللہ کا ارادہ رہا ہو۔ شیخ علی حزیں نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس تحریر سے ... سال قبل گجرات میں فاتح چوروں کے ہاتھوں قتل کئے گئے تھے۔ فاتح نے قاسم ابن ...

باباشجاع الدین کی مدح کی ہے۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ حضرات انہیں ایران میں ملے تھے یا ہندوستان میں سے

بحضور آمده فاتح زبانهٔ قاسم　　　خوش است شورش مستان اگرچه بے ادبی است

کرد فاتح صید حسن خلق احسن خان مرا　　　زان گل رو بلبل طبعم سخن گستر د بود

زہے عید ہمایون توای بابا شجاع الدین　　　تبارک باد و میمون توئے با باشجاع الدین

اپنے معاصرین میں سے ہندوستان کے کسی نام علی کی موت پر اظہار افسوس کیا ہے۔ نیز حسب ذیل شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے مربی رہے تھے سے

قابل تربیت امروز سے نیست بہ ہند　　　رفت نام علی از دست تو فاتح افسوس

مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کون صاحب ہیں۔

فاتح کا تذکرہ نویسوں نے بڑے احترام سے ذکر کیا ہے۔ مولف تذکرہ بے نظیر نے انہیں "درویش صاحب حال" تجرد مشرب، حق آگاہ"[1] کہکر یاد کیا ہے اور صاحب ریاض الشعراء ان کے متعلق لکھتے ہیں" از اعاظم سلسلۂ علویہ صوفیہ و از اکابران طبقہ جلیلہ بود"[2] ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ رسمی مذاہب کی تنگنائیوں سے بلند اور معرفت کے اعلیٰ مدارج پر فائز تھے سے

زرشد فتحی بکارم ہیچ از دیر و حرم فاتح　　　دگر چشم نوازش حلقہ سانم نیست زین درہا

بدریائے می وحدت بسان قطرہ افتادم　　　عجب سرشار و دریانوش ایں میخانہ ام امشب

مقصود دیر و کعبہ بود امتیاز دین　　　اسلام و کفر ہر دو پی دین بہم زنند

نیز ہندوستان آکر ان کی وسیع المشربی میں اضافہ ہوگیا تھا اور وہ یہاں کی بت پرستی سے کافی متاثر تھے۔ نیز انھوں نے برہمن اور بت پرستوں کا بار بار ذکر کیا ہے سے

فاتح از عشق بتی بت نہ پرستم چہ کنم　　　بت پرستم بخدا دوی دلم سوی بتی است

برہمن گشتم و بت سجدہ کردم در رہ عشقت　　　ندارد ہر کہ تاب عاشقی از کار بر خیزد

مگر نصیحت اور عرفان میں وہ طریقت کے ساتھ شریعت کے سختی سے پابند نظر آتے ہیں۔ وہ نماز و روزہ جیسی چیزوں کو ترک کرنے کے قائل نہ تھے۔ نیز اخلاقی قدروں پر اصرار کرتے تھے اور انکے انحطاط کے شاکی تھے۔

زنہار مخور روزۂ ماہ رمضان را　　　کیں لقمہ حرام است نگہدار دہان را

خواندہ گر آیۂ ان تخرق الارض ای پسر　　　کبہا در راہ رفتن ہان نسازی راہبر

---

[1] ص ۱۰۲　[2] فہرست ف

بجای بانگ نماز و تلاوت قرآن نوای بربط و چنگ است یا علی مددی

فاتح کو حضرت علیؓ سے غیر معمولی عقیدت تھی ؎

ز فیض ساقی کوثر نیم محروم چوں فاتح گرفتم دامن ساقی کوثر شاہ دُلدُل را

یا علی سرور ارباب یقین عشق اللہ ای غبار قدمت روح فزای فقرا

میرسد سلسلۂ فقر فقیران از تو گو بیت گر نبود کفر خدائی فقرا

یا علیؑ کیست کہ در دہر ثنا خواں تو نیست ہست منسوخ ہر آن آیہ کہ در شان تو نیست

ان کے علاوہ وہ تمام ائمہ اہل بیت کے دل سے معتقد تھے ؎

فاتح برون نمی رود از خاندان دینا یعنی سگ محمدؐ و آل محمدؐ است

حسب ذیل غزل میں سب کی زیارت گاہوں کا فرداً فرداً ذکر کیا گیا ہے ؎

میرسان بر سر خاک نجف از ایں محزون گذرت گر فتد ائے باد صبا عشق اللہ

عمرہا شد کہ ز درگاہ تو گشتم محروم در رہ ہند بصد جور و جفا عشق اللہ

وز نجف چون بسر خاک حسینؑ راہ بری تحفہ ز ما ببرائے باد صبا عشق اللہ

کاظمین قبلۂ اہل کرم و اہل دل اند جان ما در رہ شان باد فدا عشق اللہ

چوں ازی سامرہ اے باد صبا بہر خدا برسان بر سر شہ سرور ما عشق اللہ

زان طرف بر در سلطان خراسان چون رسی برسان از من غمگین برضا عشق اللہ

ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک رند مشرب انسان تھے ؎

چوں شمع گشت عمر مرا صرف دوستاں یکساں ببزم فقر و شہنشاہ سوختم

مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ تند خو بھی واقع ہوئے تھے ؎

فاتح تند خوی تو از دو جہاں امیدہ است رام نمی شود بکس ہر کہ گرفتہ خوئے تو

مولف ریاض الشعراء نے ان کے دیوان کے متعلق لکھا ہے "دیوان آن عارف زمان قریب سہ چہار ہزار بیت رسد. و تمام ابیاتش است بر حقایق و معارف بسیار و حل مسائل و نکات لطیفہ بی شمار"[1] اور صاحب نگارستان سخن نے ان کے اشعار کے متعلق کہا ہے "از سیارگان سمار فکرش عالم خواطر مستغنی است"[2]۔ شیخ علی حزیں نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ کسی نے فاتح کے کچھ اشعار انھیں سنائے۔ نیز ان اشعار کے متعلق اپنی رائے ظاہر کیا ہے خالی از حالتی و کیفیتے

---

[1] فہرست ف [2] ص ۷۱

[illegible] فاتح کے نسخہ سالار جنگ میوزیم کے علاوہ جس میں تقریباً ۱۰۰۰ شعر ہیں ایک بیاض میں (۱۲۲۹، اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد) ان کے کلام کا بہت بڑا انتخاب مل گیا ہے جس میں تقریباً ۱۷۲۷ شعر ہیں۔ البتہ اس انتخاب میں صرف غزلیں ہیں، جبکہ نسخہ دیوان میں غزلوں (۱۷۲۵ شعر) کے علاوہ رباعیاں (۱۳ عدد) مخمس (۵۵ شعر) اور ایک ہفت بند بھی ہے۔ نیز نسخۂ دیوان میں نثر میں فاتح کے حالات زندگی دیئے ہوئے ہیں۔ بہرحال ان دونوں نسخوں کی مدد سے فاتح کی شاعری کا پوری طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نیز ان کی زندگی کے بہت سے جزئیات معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتخاب اور یہ نسخۂ دیوان اس مطلع سے شروع ہوتے ہیں ؎

الٰہی بلبل گلزار شکرت کن زبانم را
بہار از حمد خود دہ گلبن باغ زبانم را۔

فاتح کو اپنی شاعری اور معرفت پر فخر تھا: —

فاتح کلید گنج حقیقت زبان تست | خواہد شدن در آئینہ از جوشش آب آب
فاتح ہمہ خلق برت سجدہ نمایند | گر مرد خدا بودن تو خلق بدانند

بزرگوں میں شمس تبریزی سے انکو بڑی عقیدت تھی جن پر ایک پوری غزل کہی گئی ہے ؎

دیدم من بدیوان خیال شمس تبریزی | دہم چون شرح چون وصف کمال شمس تبریزی

حسب ذیل غزل میں بنگال کا ذکر ملتا ہے اور شاید حافظ[2] کی غزل "بہ بنگالہ می رود" سے متاثر ہو کر کہا گیا ہے ؎

طوطی کلک سخن سنجش چہ شکر ہا کہ ریخت | فاتح ما دوش گویا عازم بنگالہ شد

فاتح کے کلام میں کافی تصنع اور آورد ہے، جسکی وجہ سے ان کے اشعار مشکل ہو گئے ہیں۔ یہاں انکے کچھ اس قسم کے اشعار بطور نمونہ کے پیش کئے جا رہے ہیں ؎

نباشد ناخدائی جز خدا بحر ہویت را | بود طوفان کثرت موجۂ دریائے وحدت را
چلیپا موج ہر سوی زند چون مسطر دریا | ندیدم غیر وصف زلف او در دفتر دریا
بیضۂ چرخ دہد مرغ سرای فقرا | مرغ فکرت نکند پر بہوای فقرا

۱؎ ص ۱۰۱۴، کلیات حزیں
۲؎ متوفی بسال ۶۴۵ ہجری / ۴۸ – ۱۲۴۷ عیسوی
۳؎ متوفی بسال ۷۹۱ ہجری / ۱۳۷۹ عیسوی

از جبینِ حباب زند عند لیبِ سر	افتادہ تا بعکس تو ای الیدن حباب

فاتح نے عجیب و غریب ردیفوں میں غزلیں لکھی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

فاتح تو مست از عشق و من یلّی یلّا یلّا	رفتہ زدست از عشق من یلّی یلّلہ یلّلہ [1]

یا کہتے ہیں ؎

ای شاہ خوبان یلّلہ وی ماہ تابان یلّلی	ای راحت جان یلّلہ وی جان جانان یلّلی

ایک غزل میں تمام الفبا کا ذکر کیا گیا ہے :۔

تا بخون من نگارین کرد دال و سین و تے	ریخت خونم را بہ تیغ عین و میم و زے و ہے

مگر اسی کے ساتھ ساتھ انکے دیوان میں بہت سے سلیس، سادہ، روان اور شگفتہ اشعار بھی ملتے ہیں جن میں سے بعض یہاں نقل کئے جا رہے ہیں ؎

رہ عشقست باید زد قدم در لامکان اینجا	کہ باشد زیر ہر نقش قدم صد آسمان اینجا
تو در عشق حقیقی عاقبت خواہی کمر بستن	نہ بندی دل بزنجیر سر زلف بتان اینجا
عاشق رد نی ترا با دین و با ایمان چہ کار	کی مرا باشد سر سودای این بازار ہا
کعبہ و بتخانہ ایم و مسجد و میخانہ ایم	کافریم و مومن و گبر و ملا نیستیم ما
نیست فاتح غیر ما موجود در عالم کسی	ہر چہ می گویند خلق آنیم ما آنیم ما
بصحرای قیامت موی سر آشفتہ چون آیم	بخوانم صد غزل در وصف ہر تاری ز کاکلہا
ہمچو شیخ کعبہ پیر خانقاہش شد مرید	مست گردد گر ملک بیند قدح نوشی مرا
دم وحشی غزالان الفت ماست	قیامت تازہ زاد وحشت ماست
ہنگام جلوہ خون شہیدان نگار اوست	ریزد صبا چو رنگ خزان نو بہار اوست
بکجا روم چہ سازم بکہ گویم این حکایت	کہ دلم ز غصہ خون شد ز جہان جہان شکایت
از کا و کاوِ غمزہ نہ خد سینہ ات خبر	آئینہ کو شوخی مژگان ندیدہ است
گر یہ خواہم ہمہ از خون دل آید بکنار	از دل و دیدہ بہ من ساغر و مینا بخشید
راسوا ست ہر کہ شیفتۂ گلرخان شود	در پردہ بوی گل نتواند نہان شود

---

[1] یہ غزل بیاض میں اسی طرح سے دی ہوئی ہے مگر نسخۂ سالار جنگ میں بجائے "یلّی یلّلہ یلّلہ" کے "یلّی یلّی یلّلہ" ہے۔

وقت آن آمد کہ کوہ و دشت پیمائی کنم | تا ترا دیوانہ و مجنون و صحرائی کنم
دل کشوری کہ نیست جز آئینہ مشربان | مرجان تسم خورند بدامان پاک من
ہماں پروانہ شمع حضورم من کہ میگشتم | ترا بر گرد سر با بال و پر در بزم تنہائی

ایک رباعی بھی بطور نمونہ کے پیش کی جاتی ہے جسکو شیخ علی حزیں نے بھی اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے ؎

از روز ازل رضا بتقدیر شدیم | صد جا سگ نفس را گلو گیر شدیم
بر خوان کسی چشم طمع نکشودیم | خوردیم دل بس گرسنگی سیر شدیم

فاتح کے مخمس پیغمبر کی نعمت اور حضرت علیؓ کی مدح میں ہیں۔ نیز ان کا ہفت بند ملا کاشی کے ہفت بند کے جواب میں ہے ؎

(ماخذ)

۱۔ فاتح گیلانی: — انتخاب دیوان فاتح، بیاض نمبر ۱۱۲۹، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد۔
۲۔ فاتح: — دیوان فاتح، نسخہ خطی شمارہ ۱۰۷۴ (ادب نظم فارسی) سالارجنگ میوزیم حیدرآباد۔
۳۔ علی قلی خان والہ داغستانی: — ریاض الشعرا، نسخہ خطی شمارہ ۴۵/۳۷.۰ نیشنل میوزیم، نئی دہلی۔
۴۔ سید عبدالوہاب افتخار: — تذکرہ بے نظیر، سٹیٹ ہاؤس، الہ آباد ۱۹۴۰ء
۵۔ مولوی مظفر حسین صبا: — روز روشن، مطبع شاہجہانی، بھوپال۔
۶۔ نواب نورالحسن خاں: — نگارستان سخن، مطبع شاہجہانی بھوپال۔
۷۔ بھگوان داس ہندی: — سفینۂ ہندی، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی۔ پٹنہ۔ ۱۹۵۸ء
۸۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق: — تاریخ ادبیات ایران، چاپخانہ پیروز۔
۹۔ محمد عبدالغنی خاں: — تذکرۃ الشعرا۔ مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ علیگڈھ۔
۱۰۔ شیخ محمد علی حزیں: — کلیات حزیں، مطبع نولکشور۔ ۱۲۹۳ھ

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

غالب انانیت کے آئینہ میں

غالب کی نثر اور نظم میں انانیت کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ غالب نے عمداً مختلف انداز سے اپنی عظمت کو نثر و نظم میں پیش کیا ہے۔ اردو میں دو ادیب اس حیثیت سے ممتاز ہیں ایک مولانا آزاد جنھوں نے غبار خاطر میں انانیتی ادب پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہی رجحان خطوط غالب میں بھی ملتا ہے۔ لیکن خطوط کے علاوہ خود شاعری میں غالب نے یہ کیفیت نہایت وضاحت اور تفصیل سے پیش کی ہے اور اپنی شخصیت و اہمیت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے مولانا ابوالکلام آزاد کی انانیت میں کوئی تضاد نہیں مگر غالب کی انانیت تضاد سے بریز ہے۔ اس میں غالب بیسوں کی خاطر اپنے آپ کو بہت گرا کر پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ جو خطوط انھوں نے نواب رام پور کو لکھے ہیں اور جو اب عرشی صاحب کی کوشش سے منظر عام پر شائع ہو کر آچکے ہیں ان میں شاعر اپنی خودداری اور انانیت کو نقش و نگار طاق نسیاں بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو نہایت گرا کر پیش کرتا ہے اور کہیں کہیں شبہ گداگروں کے طرز کا ہونے لگتا ہے۔ اس کے برعکس مولانا آزاد کے یہاں اس طرز کا تضاد موجود نہیں۔

انانیت ویسے تھوڑی بہت ہر ذی کمال کا خاصہ ہے خصوصاً شعراء کا تو یہ مخصوص میدان ہے چنانچہ مشہور عرب ناقد ابن رشیق لکھتا ہے کہ عجب بات ہے کہ اگر کوئی اپنی تعریف خود کرے تو لوگ اسکو بے وقوف بنالیں لیکن شعراء اپنے اشعار میں خوب اپنے گیت گاتے ہیں اور کوئی اُن پر اعتراض نہیں کرتا' وہ کہتا ہے کہ معاشرہ نے یہ رعایت ان کو دے رکھی ہے۔

غالب کی انانیت کا اصل مرکز ان کی سخن وری ہے۔ آخر میں نثر میں بھی ان کو اپنی عظمت کا احساس ہو گیا تھا اسی بناء پر غالب نے اپنی زبان پر قدرت بیان کا سلسلہ کئی خطوط میں کیا ہے اشعار میں بھی بار بار اپنی انفرادیت کا اظہار کیا ہے۔ ان کی انانیت مختلف انداز سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اگرچہ اصل دعویٰ ان کا شاعری میں ہے اور مختلف انداز سے وہ اپنی عظمت کو جتانا چاہتے ہیں مگر پھر بھی ان کی انانیت صرف ایک میدان میں عظمت پر بس نہیں کرتی بلکہ وہ شجاعت و جنگجوئی پر فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صرف شاعری میرے لئے باعث عزت نہیں بلکہ عظمت کیلئے دوسری چیزیں بھی ہیں ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری　　کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

"موشگافیت" کا مبالغہ بھی ان کی انانیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ بعض خطوط میں بھی انھوں نے اپنے خاندانی حالات بیان کئے ہیں جس میں فوجی خدمات کا ذکر ہے۔

انانیت زندگی میں

موجودہ تصور یہ ہے کہ زندگی کا عکس ادب ہوتا ہے کسی نہ کسی شکل میں غالب کی زندگی میں انانیت کا وجود بھرپور انداز سے ملتا ہے اس سلسلہ میں دو واقعے انکی زندگی کے قابل ذکر ہیں۔

ایک بار دلی کالج میں فارسی پروفیسر کی جگہ خالی تھی غالب وہاں بحیثیت امیدوار گئے اپنی فنس پر بیٹھ کر پہونچے انٹرویو کیلئے اور انتظار کرنے لگے کہ صاحب آکر میرا استقبال کریں کیونکہ اس سے قبل وہ برابر انکا استقبال کرتے تھے اور لینے آیا کرتے تھے۔ غالب بہت دیر بیٹھے رہے۔ پھر چپراسی کو بھیجکر کہلوایا کہ آخر وہ کیوں نہیں آئے۔ تب "صاحب" غالب سے آکر ملے اور بتایا کہ آج آپ اپنی غرض سے آئے ہیں۔ اس لئے یہاں میں آپ کا استقبال نہیں کروں گا۔ ہاں جب آپ شہر میں ملیں گے تو میں ضرور آپ کو وہی عزت دوں گا جو کہ پہلے سے آپ کے لئے تھی۔ غالب نے کہا کہ صاحب میں تو عزت کیلئے نوکری کرنے آیا تھا اب جبکہ نوکری سے آبرو اور کم ہوتی ہے تو کیا فایدہ؟ چنانچہ وہ ملازمت چھوڑ کر اپنے گھر آ رہے۔ یہ یقیناً شاعر کی انانیت کا واضح ثبوت ہے۔

دوسرا واقعہ ان کی "جوا بازی" کا ہے۔ غالب چند پیسے تفنناً رکھکر تاش کھیلا کرتے تھے۔ ایک کوتوال جس کو غالب سے دشمنی تھی۔ اس نے اس جرم میں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ دائر کر دیا اور ان کو جج نے دو ماہ کی سزا دیدی۔ اس پر جو خطوط انھوں نے لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ نے ان کی انانیت پر ضرب کاری لگائی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ حالی نے غالب کی انسانیت کے گیت جو بھی گائے ہوں۔ مگر یہ حق ہے کہ غالب بحیثیت ادیب کے اعلیٰ درجہ و مرتبہ پر فائز ہیں مگر بحیثیت انسان کے وہ ہرگز مذکورہ بالا مرتبہ تک نہیں پہونچ سکتے ہیں۔ جوا۔ شراب اور بادشاہوں کی خوشامد و تملق یہ چند اخلاقی عیوب بھی ان سے وابستہ ہیں۔ جوا اور خوشامد تو یقیناً انانیت کے خلاف عناصر ہیں اور یہ غالب کی زندگی میں پوری طرح موجود ہیں۔ وہ درباری شاعر بھی تھے۔ ان کی زندگی میں انانیتی تضاد ہے۔ بالکل یہی چیز ان کے ادب و شاعری میں بھی ملتی ہے اس انانیتی تضاد کی توضیح میں بعد میں کروں گا۔

انانیت شاعری میں

غالب اپنے کو سارے شعرا سے ممتاز و منفرد اسلوب کا حامل سمجھتے ہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کی شاعری پر کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا اور اس میں عیب کا کوئی پہلو موجود نہیں۔

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخن گرم   تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

غالب اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ صنف غزل میری وسعت کیلئے ناکافی ہے ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل   کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

ایک خاص انداز سے وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میرے اشعار میں دل سوزی ہے اس بنا پر اثر ہیں بلا اثر کے شاعری کیلئے

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ   پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

وہ اپنے خامہ کی آتش فشانی کا ذکر یوں بھی کرتے ہیں ؎

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی   یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

" اب اس میں دم کیا ہے" بظاہر تنقیص کا شبہ دلاتی ہے مگر ایسا نہیں ہے مراد ہے کہ اب وقت آخر ہے۔ ان تمام اشعار میں غالبؔ کی انانیت پوری طرح اُجاگر ہے۔ غالبؔ کا فخر و انانیت غیر معمولی انداز سے ان کے کلام میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے   جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

اپنے اشعار کے مضامین پر بھی فخر کرتے ہیں ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں   غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ان کی انانیت کبھی اس پہ فخر کرتی ہے کہ لوگ آسانی سے میرے کلام کو سمجھنے سے قاصر ہیں ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے   خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

معاملہ یہیں تک ہوتا تو ٹھیک تھا۔ بار بار وہ ذرا ٹھہر کر یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ میں ولی ہوں۔ یا کم از کم ان کے جذبۂ انانیت میں ولی ہونے کی کیفیت سے سکون محسوس ہوتا تھا چنانچہ کہتے ہیں ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ   تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

آگے چل کر ایک عجیب انداز سے دعوے بزرگی کر ہی دیا۔ کہتے ہیں ؎

دیکھیو غالبؔ سے گر الجھا کوئی   ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

ایسے لوگوں کو عرفِ عام میں مجذوب کہا جاتا ہے جو شریعت کا ظاہرًا احترام نہیں کرتے مگر تقربِ الی اللہ ان کو حاصل ہوتا ہے۔ البتہ ایسے لوگ ذرا حواس میں توازن نہیں رکھتے۔ غالبؔ سے ان کی یہ کیفیت عدم پیروئی شریعت ظاہر مراد لیا ہے۔

غالبؔ اپنے آپ کو نہایت اہم سمجھتے تھے چنانچہ یہ اشعار ملاحظہ ہوں جن سے ان کو دراصل تسکین ملتی تھی اور ان کا ناؔ ان اشعار سے کیفیت سکون پاتا تھا ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے   ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک   اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

انانیت نثر میں

اگرچہ نثر میں ان کی تصانیف بھی ہیں جن میں خاصہ مسالہ انانیت کا موجود ہے مگر میں ان کے نثری شاہکار یعنی خطوط تک اس بحث کو محدود رکھوں گا۔

غالب کے سلسلہ میں یہ بات یقینی ہے کہ ان کو خطوط میں جہاں موقع ملا ہے اپنی شخصیت کو خوب اچھالا ہے۔ کبھی اس نے عبدالصمد استاد کو گڑھ لیا کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ان کا کوئی استاد نہ تھا مگر کبھی اس پر فخر کیا کہ میں مبداء فیاض سے مستفیض ہوں۔ اس سے ان کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں کہ مجھے نواب لکھا کرو۔ بہت سے انگریز بھی مجھے نواب لکھتے ہیں۔ اس طرح گویا ان کی انانیت کو ایک تسکین ملتی ہے۔ یہ شوق بھی عجیب ہے کہ کھانے کو تو ہے نہیں اور شوق نواب لکھنے کا۔ جب کہ خطوط ہی میں وہ اپنی معاشی زندگی کی تکالیف کا بیان تفصیل سے کرتے ہیں۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ میرا نام اتنا مشہور ہے کہ تم صرف میرا نام اور شہر دلی لکھ دیا کرو خط مجھے مل جائیگا۔

ایک خط میں فرماتے ہیں کہ میں نے خطوط نگاری کی ایک نئی راہ نکالی ہے اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں، —

"مرزا صاحب میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے
ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

انانیتی تضاد اور اس کا حل

میں اپنا یہ خیال پیش کرتا ہوں کہ غالب جہاں جھکتے ہیں خوشامد کرتے ہیں اپنی حقارت کا بیان کرتے ہیں سب مدح کی ایک قسم ہے اور جس پر شبہ ذم کا ہوتا ہے۔ ورنہ سب تعبیر ریا ہیں ان کی انانیت کی۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اگر وہ قانع اور غیور ہوتے تو نواب رام پور کو اس انداز کے تملق آمیز خطوط نہ لکھتے۔ مگر یہ قابل غور مسئلہ ہے کہ جب اس زمانے میں ۱۰۰ ماہوار مفت میں گھر بیٹھے نواب صاحب غالب کو روانہ کر دیتے تھے تو اگر وہ اس انداز کے خطوط لکھیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے بلکہ شکر و شرافت کا تقاضہ ہے۔ مومن نے کبھی کی شان میں قصیدہ نہ کہا مگر جب انکو ایک راجہ نے تحفی پیش کی تو بطور شکریہ کے ایک قصیدہ کہہ ہی دیا۔

وہ تمام اشعار جن میں غالب کی انانیت پر حرف آتا ہے دراصل اس میں بھی وہ اپنی منقبت نکال لیتے ہیں وہ نظم جو بہادر شاہ کو تنخواہ ماہ بہ ماہ کرنے کیلئے لکھی تھی۔ اس کے دو اشعار ملاحظہ ہوں جو اس مسئلہ کو حل کر دیتے ہیں —

شاد ہوں اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

آج مجھ سا نہیں زمانہ میں — شاعر نغز گوئے خوش گفتار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار

یہ غالب کے انانیتی تضاد کے حل کی ایک شکل ہے مگر میرا ایک خیال اور ہے اور اس کی صحت پر مجھے پورا یقین ہے ممکن ہے کہ میرے اس نظریہ پر کسی کو استعجاب ہو، مگر فکر کو آزاد فضا ملنی چاہیئے۔ دستور زباں بندی صحیح نہیں ۔ انانیت کے بارے میں مندرجۂ ذیل خصوصیات میرے نزدیک غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں ۔

۱ - انانیت ہمیشہ اعلیٰ فنکاروں، شاعروں اور ادیبوں میں پائی جاتی ہے ۔ کم قیمت فن کار کو یہ جرارت نہیں کہ عظمت کے دعوے کرے ۔

۲ - مغربی مصنفین کا خیال ہے کہ انانیت احساس کمتری کا عکس ہے مگر میرا اپنا تصور یہ ہے کہ انانیت ہمیشہ انھیں اشخاص میں ملتی ہے جن کے حوصلے بلند ہوں۔ جن کے عزائم میں سمندروں کی وسعت اور طوفانوں کی ہاہمی ہو اور جو کچھ کرنے کی صلاحیت لیکر آئے ہوں۔ انانیت پسند ادیب اعلیٰ تخلیق پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ غالب اور ابوالکلام آزاد نے ہمارے ادب میں اعلیٰ تخلیقات پیش کی ہیں۔ اسی طرح عربی میں متنبی نے انانیت سے کام لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر اعلیٰ فنکار انانیت کا کچھ نہ کچھ شکار ہوتا ہے۔ یہ احساس کمتری نہیں بلکہ بلندی کی دلیل ہے اس سے فنکار اپنے فن کی عظمت کو نمایاں کر سکتا ہے۔ اسی میں زندگی کی بلندیاں پوشیدہ ہیں۔

۳ - فخر انسانی فطرت کا ایک لاینفک جز ہے اگر کوئی صاحب امتیاز ہوتا ہے تو وہ اپنے مخصوص امتیاز و صلاحیت پر فخر کرتا ہے۔ اردو تغزل میں محبوب کے ناز و غمزہ کا ذکر بار بار آتا ہے۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ محبوب کو اپنے حسن پر فخر ہے احساس ہے، واقعہ یہ ہے کہ فخر محسوس کرنا انسانی فطرت ہے۔ خصوصاً اپنی صلاحیتوں کا احساس بذریعہ بشریت ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی زبان کی فصاحت کا ذکر ایک بار اس انداز سے فرمایا کہ "انا افصح العرب بید انی من قریش" میں عربوں میں سب سے فصیح ہوں البتہ میرا تعلق قبیلۂ قریش سے ہے۔ عرب ناقد ابن رشیق اپنی شہرہ آفاق کتاب "العمدہ" میں لکھتا ہے کہ سارے انسانی طبقات میں صرف شعراء کو انسانی معاشرے نے یہ اجازت دی ہے کہ وہ اپنی تعریف آپ کریں۔ اگر شعراء کے علاوہ کوئی خود اپنی تعریف کرے تو لوگ اس کو مضحکہ بنا لیں میں ابن رشیق کے اس نظریہ پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ حق ہر اعلیٰ فنکار کو حاصل ہونا چاہیئے بلکہ حاصل ہے ۔ فخر برا نہیں اگر فنکار نے کوئی اعلیٰ چیز پیش کی ہو؛ ورنہ بلا قابل قدر ادبی تخلیق کے انانیت جہالت ہے ہم اردو شاعری میں اصناف کی تقسیم معنوی انداز پر نہیں کی گئی ہے۔ عربی میں اعتذار، شکوی، فخر اور حکمت، اضیاف (مہمان نوازی) اور حماسہ (شجاعت) وغیرہ۔ بطور اصناف سخن کے موجود ہیں۔ چنانچہ مشہور کتاب "الحماسہ" کے ابواب کی تقسیم اسکے مشہور شاعر و مرتب ابو تمام نے مذکورہ اصناف میں کی ہے۔ فخر اگر کسی غلط کام کیلئے استعمال نہ ہو تو اچھی چیز ہے اس سے دوسروں کو آگے بڑھنے اور کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اور آرزو کی دولت عطا ہوتی ہے ۔

۵ - اردو مشاعروں میں داد دینے کا طریقہ کیا ہے ؛ کیا اعلیٰ سے اعلیٰ شاعر اس پر راضی ہو جائیگا کہ وہ غزل کہ

لٹائے اور آپ اس کی تعریف میں چند الفاظ بھی نہ کہیں؛ کیا اُن کی یہ توقع احساس کمتری ہے؛ ہرگز نہیں۔ یہ انسانی جبلت ہے۔ فکر و فن کی عظمت کا تقاضہ ہے اور خود اپنے آپ کو اپنے احساس سے ہلکا کرنے اور شاعر کے ضمیر کو مطمئن کرنے کا ذریعہ ہے جس سے اسکی انانیت کو تسکین ملتی ہے۔ لاکھ منکسر المزاج شاعر ہو ایکبار آپ اسکے جائز حق کو مشاعرہ میں غصب کر لیں دوبارہ وہ آنے کی جرأت نہ کرے گا! اسلیئے کہ یہ ایک فطری حق ہے اور انسانی تقاضہ۔ انانیت کس میں نہیں؟

۶۔ شاعرانہ تعلیاں درحقیقت انانیت کا پرتو ہیں۔ شاعروں کے علاوہ ادیبوں و نثاروں میں بھی یہ کیفیت موجود ہے۔ سرسید کے فارسی اشعار جو علیگڑھ تحریک مرتبہ نسیم قریشی میں شائع ہوئے ہیں۔ وہ سرسید کی فنکارانہ عظمت پیش کرتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا اشک می آرد ز درمانے کہ من دارم
فلک یک مطلع خورشید دارد بہ ہمہ شوکت
ہزاراں مطلعہا دارد گریبانے کہ من دارم

خود حالی کی بعض نظمیں نہایت تعلّی آمیز ہیں۔ اگرچہ وہ نہایت منکسر المزاج انسان تھے۔ مولانا آزاد کے علاوہ میرامن نے اپنی صلاحیت و زبان پر باغ و بہار کے مقدمہ میں فخر کیا ہے اسی طرح رجب علی بیگ سرور نے کیا ہے پھر اس بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب تفاخر سے لبریز ہیں۔

۷۔ مفاخرت اور انانیت کی نفسیاتی تحلیل احساس کمتری ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر ادب کیلئے باعث صد فخر و فیض ہے کہ اس کے ذریعہ سے فکر و نظر کی اشاعت ہوتی ہے تنقیدی پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور ادبی و شعری تخلیق میں زبردست و فنکارانہ اضافہ ہوتا ہے۔ انانیت سے مجبور ہو کر جب شاعر فخر کرتا ہے تو اس کے معاصر اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ یعنی فنی اعتراض اس طرح ایک سلسلہ فکر و نظر کا روشن ہو جاتا ہے اس کی مثال خود غالب کی انانیت میں قاطع برہان وغیرہ سے دی جاسکتی ہے جو سارا مناقشہ غالب کی انانیت کی تمنا و تماشا سے عبارت تھا۔

انیس و دبیر کی چشمک نے جو زبردست شاعرانہ تخلیق کو جنم دیا ہے وہ سب اسی انانیت کا پرتو نہیں تو اور کیا ہے۔ شعراء اپنی انانیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ فخر کرتے ہیں اور کاوش و کاہش سے فکر کے لئے آفاق خون جگر کی لالہ کاری سے پیش کرتے ہیں۔

عربی شاعری کا ایک پورا دور اسی انانیتی کیفیت و چشمک کا غماز ہے۔ اخطل، جریر اور فرزدق نے ایک دوسرے کے خلاف اشعار کا انبار لگا دیا۔ چونکہ فرزدق نہایت اونچے خاندان سے تھا اسلیئے وہ اپنے آباء پر فخر کرتا ہے۔ اس نے ان فخریہ اشعار میں اتنے الفاظ استعمال کر ڈالے کہ نحویوں اور اہل لغت نے کہا کہ اگر فرزدق کی شاعری نہ ہوتی تو "ایک تہائی عربی" ختم ہو جاتی۔

غالب کی انانیت ان کے عزائم، حوصلے اور بلندی فکر کی ترجمان ہے ان کی انانیت کے بحر بیکراں کیلئے

سفینہ دڈکا رہے۔

غالب کی شاعری بھی اس انانیت سے پُر ہے اور ان کے خطوط بھی اس کیفیت سے لبریز ہیں۔ انانیت کے تصور میں غالب کا ایک مصرع پیش کیا جاسکتا ہے کہ :—

" بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی "

میرا تصور یہ ہے کہ جس قدر انسان کے عزائم بلند ہوں گے اسی قدر اس کی انانیت واضح ہوگی۔ اسی اندازسے اس کے اندر خمار تشنہ کامی ہوگا۔ انسانی معاشرہ میں دو طرز کے لوگ ہیں ایک اپنی حالت پر قانع اور دامنی بہ رضا رہنے والے اور دوسرے اعلیٰ مقاصد کے طلبگار' بلندیوں پر جان دینے والے اور زندگی میں عظمت حاصل کرنے کے شائق۔ چنانچہ مشہور عرب شاعر متنبی کہتا ہے :۔

" لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو معمولی زندگی پر خوش ہوتے ہیں۔ ان کی سواری ان کے دونوں پیر ہیں اور ان کی جلد ان کا کپڑا ہے۔ لیکن میرے پہلو میں ایسا دل ہے جس کی تمناؤں کیلئے کسی افق کا تعین ممکن نہیں "۔

بس غالب اسی طبقہ سے تھے جو اپنی حالت پر قانع نہ تھا اور بقول متنبی جب عزائم بلند ہوں تو قلت وسائل کا آدمی شکار ہو جاتا ہے اور اسی صورت میں " خمار تشنہ کامی " پیدا ہوتا ہے جس میں انانیت ابھرتی بکھرتی اور پروان چڑھتی ہے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۴ سے آگے)

۱۔ نوائے ازل مرتبہ:۔ ریحانی لکھنوی —— } ملنے کے پتے : ۔ زندگی کا نور پوسٹ بکس ۱۴۵

۲۔ رنگ زار مرتبہ:۔ ریورنڈ ہنین ریحانی } عابد روڈ۔ حیدرآباد اے پی

نوائے ازل مسیحی اردو شعراء کے مختصر اور منتخب کلام پر مشتمل چالیس صفحات کا ایک کتابچہ ہے جس میں (۳۴) بقید حیات مسیحی شعراء کی مختصر نظمیں شامل ہیں۔ تمام نظموں میں مسیحیت کی تبلیغ کے پہلو اور مسیحی نقطہ نظر شامل ہے۔

رنگ زار مسیحی مشاعرے کا باتصویر گلدستہ ہے۔ یہ کل ہند مشاعرہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ اردو کے مشہور اور قادر الکلام مسیحی شاعر ریورنڈ ہنین ریحانی لکھنوی ثم حیدرآبادی اس مشاعرہ کے معتمد اور اس گلدستے کے مرتب ہیں۔ گلدستہ میں سترہ مسیحی شعراء کی تصویریں اور کلام شامل ہے۔

وقار خلیل

ڈاکٹر مغنی تبسم

سب رس

سب رس وجہی کا نثری کارنامہ اور اردو نثر کی پہلی ادبی تخلیق ہے۔ اولیت کا یہ سہرا ہی وجہی کے لئے باعث افتخار نہیں ہے وہ اردو کا بہت بڑا ادیب اور صاحب طرز انشاپرداز تھا۔ زبان کی قدامت وجہی شناسی اور اس کے مرتبے کے تعین میں مزاحم ہوتی ہے۔ قدیم اردو سے موانست پیدا کی جائے تو ہم ایک ایسے شاہکار سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں جس کا جواب ساری اردو نثر میں نہیں ملتا۔

وجہی کے اسلوب نثر کا جائزہ لینے سے پہلے "سب رس" کے صنفی نوعیت کا تعین ضروری ہے۔ ادب کے مورخوں نے اس کا شمار داستانوں میں کیا ہے اور سبھی نقادوں نے داستان مان کر ہی اس پر اظہار خیال کیا ہے یہ ایک مغالطہ ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہو کہ وجہی نے سب رس میں ضمناً ایک داستان بھی بیان کی ہے۔ حسن و دل کے قصے کو جو سب رس میں بیان کیا گیا ہے۔ کہاں تک داستان کہنا بجا ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے ...... غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ قصہ خود ایک پیرایۂ بیان ہے۔ سب رس کو داستان ٹھیرانے والے اگر سبب تالیف کتاب ہی تامل سے پڑھتے تو اس مغالطہ کا شکار نہ ہوتے۔ وجہی لکھتا ہے کہ "سلطان عبداللہ قطب شاہ ایک دن صباح کے وقت بیٹھے تخت، یکایک غیب تے کچھ رمز پا کر دل میں اپنے کچھ لیا کر وجہی نادر من کوں، دریا دل گوہر سخن کوں ... بلائے۔ پان دیئے بہوت مان دیئے ہور فرمائے کہ انسان کے وجود میں کچھ عشق کا بیان کرنا اپنا ناؤں عیاں کرنا۔ کچھ نشان دھرنا۔ وجہی بھو گنی گن بھریا، تسلیم کر کے سر پر ہاتھ دھریا، بہوت بڑا کام اندیشیا، بہوت بڑی فکر کریا۔ بلند ہمتی کے بادل لے دانش کے میدان میں گفتاراں برسایا، قدرت کے اسراراں برسایا....."

اس کے آگے اپنی تصنیف کی تعریف میں یوں رقم طراز ہوتا ہے کہ:۔

"اگر کسی میں سخن شناسی ہور اسرار دانی ہے تو یو کتاب گنج العرش بحر المعانی ہے۔ جیتا کوئی طبیعت کے کواڑ کھولے گا۔ اس کتاب میں نیں سو بات کیا بولے گا۔ جو کچھ آسمان ہور زمین میں ہے سو اس کتاب میں ہے جو کچھ دنیا ہور دین میں ہے سو اس کتاب میں ہرگز کوئی فصیح اس فصاحت سوں بات نیں کیا اس دھات بات کوں سلاست نیں دیا..... جیتے جو ساراں جیتے فہم داراں جیتے گن کاراں ہوئے..... آج لگن کوئی اس جہاں میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر

تیں پرویا..... غرض بہوت نادر نادر باتاں پرویا ہوں۔ دریا ہو کر موتیاں رولیا ہوں۔ موتیاں کی معجان کا میں دریا ہوں۔ تمام موتیاں سوں بھریا ہوں۔"

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عشق و معرفت کے مضامین بیان کرنا وجہی کا اصل مقصد تھا اور وہ اسے ایک ادبی کارنامہ بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ سب رس کو نظم و نثر کی ملی جلی تالیف قرار دیتا ہے۔ سب رس میں داستانی حصہ صرف زیب داستان کے لئے ہے۔

سب رس کی صنفی حیثیت کا پوری طرح تعین کرنا اور اسے کوئی نام دینا مشکل ہے۔ کیفیت تخلیق میں یہ انشائیے سے یوں مماثلت رکھتا ہے کہ اس میں مصنف اپنے خیالات کو جو اس کے مطالعے اور زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں کا نچوڑ ہیں اور جن میں فلسفیانہ گہرائی اور گیرائی بھی ہے۔ کسی منصوبے کے بغیر بے تکلف پیرایہ میں بیان کرتا چلا گیا ہے۔ سب رس کے بعض اجزا اپنی جگہ مستقل انشائیے ہیں۔ سب رس کی تکنک کے چند پہلو "گلستاں" اور اس زمرے کی بعض دوسری تصانیف کے ان حصوں سے مماثلت رکھتے ہیں جن میں مصنف پہلے حکمت اور دانش کی کوئی بات کہتا ہے اور اس ضمن میں تمثیلاً حکایات اور اشعار لاتا ہے۔ سب رس میں مختلف حکایتوں کے بجائے ایک ہی قصے کے اجزا وقفے وقفے سے پیش کئے گئے ہیں۔ وجہی ان اجزا کو بات کا رخ بدلنے یا بات کو آگے بڑھانے کے لئے سہارے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ سب رس کے پیرایہ اظہار کا خاص وصف آزاد تلازمۂ خیال ہے وہ کسی مضمون کو پہلے ہی سے سوچ کر ترتیب کے ساتھ بیان نہیں کرتا بلکہ اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ یوں خیال سے خیال نکلتا اور بات سے بات پیدا ہوتی ہے۔ جہاں کوئی مضمون پورا ہوا۔ یا سوچ کی راہ بند ہوئی وہ قصے کی طرف رجوع ہوتا ہے اور قصہ بیان کرتے ہوئے کسی لفظ یا فقرے سے اس کے منقطع خیالات کی رو جاگ پڑتی ہے اور پھر وہ انشاپردازی کے جوہر دکھانے لگتا ہے۔ وجہی کا کمال یہ ہے کہ اس نے داستانی حصہ کو اپنی انشاپردازی سے داخلی طور پر اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ سب رس کے منصوبے میں قصہ اپنا خارجی اور آزاد وجود نہیں رکھتا۔ قصے میں ایک تمثیلی رنگ ضرور ہے لیکن وہ خود مکتفی تمثیلی داستان نہیں ہے۔ سارا قصہ ایک مسلسل شعری استعارہ ہے۔ وجہی نے اس پردے میں ان معاملات اور کیفیات کو بیان کیا ہے۔ جو محبوب اور عاشق کے درمیان اولین تعارف کے بعد ساعت وصال تک گزرتی ہیں۔ افراد قصہ کلی استعارے ہیں جو تشخص اور تجسم سے وہ مکمل تمثیلی رمز نہیں ہیں۔ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ قصے میں غمزہ غمزہ ہی ہے اور غمزہ ہی کا کام انجام دیتا ہے دوسرے تمام کرداروں کا بھی یہی حال ہے۔ سب رس کا قصہ اپنی ماہیت میں مسلسل غزل ہے جس کا ہر جزو ایک شعر کی نثری توسیع ہے۔

سب رس کی صنفی حیثیت کے اس تجزیئے کے بعد وہ سارے اعتراضات رد ہو جاتے ہیں جو اس مفروضے پر قائم ہیں کہ سب رس ایک نثری داستان ہے۔ سب رس کو داستان کے معیار پر جانچنا اور اس کے غیر داستانی حصوں کو غیر ضروری پند و موعظت قرار دینا دراصل نقادوں کی اسی غلط فہمی اور کم فہمی کا نتیجہ ہے۔

جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں، سب رس کے دو تخلیقی محرکات اور مقاصد ہیں۔ ایک عشق و معرفت کے رموز بیان کرنا دوسرے انشاپردازی کا کمال دکھانا۔ یہ محرکات و مقاصد وجہی کی شخصیت کی آئینہ داری بھی کرتے ہیں۔ سب رس میں وجہی ایک عارف حق شناس، مفکر، شاعر اور ادیب کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وجہی کا اسلوب اس کی شخصیت کے انہیں پہلوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔

سب رس کا مطالعہ کریں تو جو چیز ہم کو فوری متوجہ کرتی اور چونکاتی ہے وہ اس کا لہجہ ہے جس میں انفرادیت اور قطعیت کے ساتھ خاص طرح کی اپنائیت بھی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک باکمال عظیم اور دلکش شخصیت کے حضور میں پہنچ گئے ہیں۔ یہ شخصیت ہمارے دل میں احترام اور محبت کے جذبات ابھارتی ہے۔ کبھی وہ دلنشیں پیرائے میں حیات و کائنات کے رموز کھولتا اور کھولتا ہے کبھی کوئی لطیفہ اور قصہ چھیڑ دیتا ہے اس کے احوال و افکار اور نفسی کیفیات کے ساتھ اس کا لہجہ بھی تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ کبھی شدت جذبات میں اس کا انداز خطیبانہ ہو جاتا ہے اور کبھی خود کلامی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

لہجے کی ان خصوصیات کے ساتھ وجہی کی نثر کا عام رنگ شاعرانہ ہے، شعریت کا در آمد نثر کے لئے تو عیب ہو سکتی ہے لیکن وجہی کی انشائے لطیف میں شعریت کا امتزاج اور شاعرانہ زبان کا استعمال ایک ناگزیر عمل بن گیا ہے۔ یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ وجہی نے تصوف و معرفت پر کوئی علمی کتاب تصنیف نہیں کی بلکہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں سے بنے ہوئے افکار اور شاعرانہ وجدان کو لفظوں کا پیراہن دے کر ایک ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

اب ہم وجہی کے اسلوب اور اظہار کی چند نمایاں خصوصیات کی نشاندہی کریں گے۔ وجہی کے اظہار کا ایک خاص وصف تمثیل نگاری ہے وہ اپنے خیالات کی وضاحت کے لیئے اپنے دعووں کو ثابت کرنے کے لیئے اور کبھی بات میں زور پیدا کرنے کے لئے تمثیل سے کام لیتا ہے اس کی تمثیلیں تشبیہیں ہوتی ہیں یا کہاوتیں۔

ایک جگہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ خدا کا دیدار مشکل ہے محال نہیں ہے۔ یہ کام عاشق کی دلیری پر موقوف ہے۔ وہ اس خیال کو تمثیل کے پیرائے میں یوں پیش کرتا ہے۔

"یو کیا خالہ کا گھر ہے۔ کانٹیاں کو لانگ جاتا تو باغ میں پھول پاتا۔ جکوئی دریا میں جاوے

خوش ہوتے آوے۔"

وجہی کے نزدیک عاشق کا مرتبہ عابد سے بہت اونچا ہے۔ عشق اور بندگی کے فرق پر تمثیل ملاحظہ ہو۔

"عاشقی مصاحبت ہور یاری۔ عبادت بندگی ہور خدمت گاری۔ محبوباں ہیں سو صاحب کی گود میں سوتے۔ چاکراں ہیں سو ہات جوڑ کھڑے ہوتے۔ نفر جیتا بڑا ہوا بی محبوب کا ناز کچھ اور ہے۔ یو لاڈ کچھ اور۔ سر پچھاڑ دیتے ہیں تو بی کیا کچھ کس دیتے ہیں؟ کینک محبوب ایسے ہیں۔ مطلوب ایسے ہیں جو وسے کبھی نہیں لیتے بدلا اور در بریاں آسمان دین کا اثر۔"

سب رس میں ابتدا سے آخر تک یہ تمثیلی پیرایہ نمایاں ہے۔ اظہار کے دوسرے پیرائے اس کے تابع ہیں۔ اسی پیرایہ میں وہ تشبیہات کا نگار خانہ سجاتا ہے۔ وجہی کی چند تشبیہات ملاحظہ ہوں۔

عشق میں بدنامی جوں کھانے میں نمک جوں دیوے میں جھمک جوں محبوب میں ٹھمک"

ایک جگہ شراب کو عشق کا لازمہ قرار دیتا ہے۔ اس تمثیل میں تشبیہ کی کرشمہ سازی بھی شامل ہے۔

"جاں عاشق ہور معشوق اچھے وہاں شراب نا اچھی تو برا عیب۔ جوں نمک نیں سو کھانا بے نمک کھانے تے آدمی نے کیا سودا پایا۔ جوں جوت نیں سو گھر۔ جوں مٹھائی نیں سو شکر۔ جوں معنا نیں سو بات۔ جوں ...... سخاوت نیں سو ہات۔ جوں پانی نیں سو لہو۔ جوں سبزہ نیں سو ہوا۔ جوں حسن نیں سو نار کا جل نیں سو سنگار۔"

اسی ضمن میں وصف نگاری بھی آتی ہے وجہی نے محبوب کے سراپا کے ایک جزو اور عشق کی ایک ایک حالت اور کیفیت کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ عاشق کے آنسوؤں کی توصیف ملاحظہ ہو۔

"چنداں کس کیں لذت بھرے درداں سوں انکھیاں میں تے پڑیا ہے بند ایک ایک اگر تو عاشق ہے تو بند بند کا لذت دیکھ۔ اس غم میں کیوں خوشی آئی۔ اس کڑوائی میں کون رکھے مٹھائی۔ کانٹیاں تے پھل کی باس کون لیا ہے۔"

آگ میں پانی ہے وہ پانی کون پیا ہے وہ بھنورا کاں ہے جو بو باس لیوے وہ پروانہ کاں ہے جو یو پانی پیوے ہور اس پانی کی خبر دیوے یو قطرا ہے بہوت لذت بھریا ہر قطرے میں سو سو دریا۔

تمثیل نگاری اور وصف نگاری کے لئے وجہی نے جو زبان استعمال کی ہے وہ مجاز کنایوں اور استعاروں کی زبان ہے۔ کم عبارتیں ایسی ہوں گی جن میں وجہی نے محض روزمرے پر قناعت کی ہو۔ وجہی کی زبان کے اس پہلو کی وضاحت ان چند فقروں سے ہو سکتی ہے۔

محنت کا جھاڑ راحت کے پھل بار لیا وے۔ امید کے چمن میں تے گود بھر بھر کر پھول چننا نظروں پہ فلک کی کسوٹ "بنیا۔

وجہی کبھی اپنے بیانات کی تائید میں اور کبھی کلام میں زور اور اثر پیدا کرنے کے لئے عربی، فارسی اور دکنی کی کہاوتیں، اقوال اور آیات قرآنی احادیث اور فارسی اور دکنی اشعار جا بجا لے آتا ہے۔ اس کی عبارتوں میں کہاوتوں کا استعمال برجستہ اور معنی خیز ہوتا ہے خود وجہی کی اپنی عبارتیں بلیغ ہوتی ہیں وہ اپنے خیالات فکر کو ایسی تعمیم دیتا ہے کہ اس کے جملے ضرب الامثال اور اقوال زرین کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ وجہی کے چند ایسے اقوال ملاحظہ ہوں۔

جس سوں لگیا کام اس کا چ اچھنا نام عاشق کی عبادت حسن دیکھنا، راگ سننا۔ شراب پینا ہے۔
عاشقی مصاحبت اور یاری عبادت بندگی ہور خدمت گاری۔
جان تازا۔ ایمان تازا تو سب جہان تازا، مشقت ٹالی نہیں جاتی۔ ہمت خالی نہیں جاتی۔
ان اقوال کے حسن تعمیر میں قافیوں کا خاص حصہ ہے۔

سب رس کی نثر مقفی مسجع اور مرصع نثر ہے لیکن وجہی کے اسلوب کی یہ خوبی ہے کہ کہیں بھی آورد تکلف اور تصنع کا گمان نہیں گزرتا۔ قافیوں سجع اور ترصیع کو وجہی نے اپنے لہجے اور طرز اظہار میں اس طرح سمویا ہے کہ عبارت کی بے ساختگی اور برجستگی کمال فن کی داد طلب کرتی ہے۔ وصف نگاری میں بالعموم اسم یا صفات بطور قافیہ لائے گئے ہیں۔ جیسے:۔

کرامت کتے سو عقل تمام جکچھ دنیا میں ہوا سب عقل کا کام، عقل تے ہوا سب حلال ہور حرام۔
عقل تے پکڑلیا فرق خاص ہور عام عقل تے رکھے ہر ایک نام نہیں تو کاں تھا صبح ہور شام، شیشہ ہور جام پستہ بادام صیاد دام، صاحب غلام۔

قوافی کے استعمال کی دوسری صورت وہ ہے جہاں ردیف فعل ہوتی ہے اور فعل کی تکرار سے وہ کسی بات پر زور دینا چاہتا ہے مثلاً:۔

اگر منگتا ہے غم کوں مارے تو شراب پی۔ اگر منگتا ہے جفا تیرے انگے ہارے تو شراب پی۔
———— اگر منگتا ہے سخاوت پر آنے تو شراب پی۔ اگر منگتا ہے رن میں گھوڑا بھانے تو شراب پی۔ اگر منگتا ہے معشوق سوں حظ پانے تو شراب پی۔ حسن کا نظارہ کرے تو شراب پی۔ اگر منگتا ہے دل میں محبت بھرے تو شراب پی۔ اگر کچھ اونچا چڑنے منگتا ہے تو شراب پی۔ اگر خدا کو انپڑنے منگتا ہے تو شراب پی۔

قوافی کے ساتھ وجہی نے صنعت تکریر کا استعمال بھی بڑے فن کارانہ انداز میں کیا ہے۔ صنعت تکریر میں ردیف کے برعکس الفاظ کی تکرار جملوں اور فقروں کے آغاز میں ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے بیان میں تاکید اور زور پیدا ہوتا ہے۔ سب رس میں اس صنعت کے استعمال کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

عشق ہم باطن ہم ظاہر، عشق سب جاگا حاضر ناظر، عشق 'نڈر' عشق پادشاہ' عشق کون کس کا ڈر۔ عشق ہم مست ہم ہوشیار۔ ہم بے خبر' ہم باخبر' عشق سلطان چتر اس کا رسوائی تخت استغنائی۔ عشق کا حکم بے پروائی عشق لاوبالی سب ٹھار بھر یا ہے۔ عشق کہیں نیں خالی۔

وجہی کی زبان اور اس کے اظہار کا ایک خاص قول متناقص یا استبعاد کے استعمال میں جھلکتا ہے۔ استبعادی زبان کے استعمال سے وجہی کے اسلوب میں دلکشی اور جاذبیت پیدا ہوگئی ہے استبعاد سے وہ معنی آفرینی اور رمز نگاری کا بھی کام لیتا ہے۔

وجہی کے استبعادی اظہار کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

جتنے عاقلاں نے عقل دوڑائے۔ آخر عشق کی بے آرامی میں آکر آرام پائے قال حال ہوتا ہے۔ فراق وصال ہوتا ہے۔

ایک جگہ ذات وصفات کی بحث میں لکھتا ہے :۔

واں کیا دیکھے گا چرا اور چوں۔ وہاں سب خالی ہور لبالب' واں کچھ نیں اور سب ہے واں کچھ نیں ہور سب واں تے آتا۔ جاں کچھ نیں واں کیوں کوئی جاتا۔ اس کچھ نیں میں ہے سب کچھ۔

وجہی نے اپنے اسلوب کو صنائع بدائع کے استعمال سے نکھار سنوار کر دلکش اور جاذب توجہ بنا دیا ہے۔ وجہی کی نثر کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو شاید ہی کوئی عبارت صنعتوں سے خالی ملے گی اور شاید ہی کوئی صنعت ایسی چھوٹے گی جس سے وجہی نے کام نہ لیا ہو۔ اس کے باوجود کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوگا کہ کوئی جملہ یا عبارت محض صنعت کی خاطر لکھی گئی ہو۔

پروفیسر شیخ فرید

ٹھاکر لعل برہان پوری اور اس کی تصنیف "دستور العمل"

برہان پور - دارالسرور - صدیوں علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کے ادباء اور شعراء نے علم و ادب کے بیش بہا جواہر پارے اپنی ذہنی تخلیقات کی شکل میں زمانے کو عطا کیے اور زمانہ کی ناقدری دیکھیے کہ اس کے بے رحم ہاتھوں نے کچھ حصہ برباد کردیا۔ کچھ فرزندانِ "تثلیث" کے ہاتھوں یورپ پہنچ گیا۔ کچھ کو ابنائے زمانہ کی کنجوس فطرت نے چھپا رکھا ہے۔ اس لیے بہت سا حصہ ہماری رسائی سے دور ہے اور راقم کی محدود علمیت اور خود اپنی نے اُن ادب پاروں تک اُن کی رسائی کو دشوار تر بنا دیا ہے۔

سطورِ ذیل میں ٹھاکر لال (برہان پوری) کی تصنیف "دستور العمل" کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ جو مغلیہ انتظامِ سلطنت سے متعلق فارسی دستاویزات میں سے ایک اہم دستاویز ہے۔

سلاطین مغلیہ کے مرکزی اور علاقائی نظم و نسق کے تفصیلی جائزہ کیلئے تاریخ کے ایک طالب علم کے لئے صدہا کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ان میں مغل دور کی فارسی کتابیں، خطوط کے مجموعے، فرامین، یورپین سیاحوں کے سفرنامے اور یادداشتیں اور دیگر فارسی مسودات خاص طور پر نہایت اہم ہیں۔ ان میں اس عہد کے واقعات ملتے ہیں کہیں نظم و نسق کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔ کہیں ان اصولوں کی عملی شکلیں ہیں۔ اس کے علاوہ اہم شخصیتوں کے متعلق تفصیلات بھی فراہم ہو جاتی ہیں۔

مسلم اور غیر مسلم مورخوں، انشاء پردازوں، وقائع نگاروں اور ادیبوں کی نگارشات اور تخلیقات سے اس عہد کے سیاسی اور سماجی، عسکری اور اقتصادی حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اُن حالات اور واقعات سے نظم و نسق کے اصولوں اور ان اصولوں کی عملی شکلوں کا استنباط بھی کیا جا سکتا ہے۔

انتظام سلطنت سے متعلق "ٹھاکر لال" کی تصنیف اہم مسودہ ہے۔ اس کا مکمل نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس کتاب میں صوبوں، سرکاروں اور جاگیروں کا حال تاریخی واقعات کے ساتھ درج ہے۔ یہ کتاب صوبائی نظم و نسق کے متعلق مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ اس کے سرورق پر مرقوم ہے۔

" دستور العمل شاہنشاہی مرتبہ منشی ٹھاکر لال"

لیکن اس مخطوطے کے خاتمہ میں سنہ ۱۹۲۱ء تک تمام شاہان مغلیہ کے نام تاریخ وار درج ہیں۔ جو بعد کے اضافے معلوم ہوتے ہیں۔ راقم کے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ برٹش میوزیم کے نسخے سے مختلف ہے۔ یہ نسخہ اصول سے بحث کرتا ہے اور بعد کی تصنیف معلوم ہوتا ہے۔

ٹھاکر لعل ولد چتر بھوج داس۔ قوم کایستھ - ماتھر۔ مصنف دستور العمل — کے حالات زندگی کے بارے میں ہماری معلومات محدود اور مختصر ہیں اور ان کا انحصار صرف "دستور العمل" پر ہے۔ ٹھاکر موصوف اور اس کی تصنیف کے ذکر سے عصری تذکرے اور تاریخیں خالی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب - دستور العمل کے دیباچے سے مصنف اور اس کی تصنیف پر روشنی پڑتی ہے -

"دستور العمل — علم سیاق کہ سر دفتر آن خرد ارجمند و مستوفیان عقل بلند جوہر شناسائی را بعرصۂ روزگار و نقد کمال را بمیزان ظہور سنجیدہ، بچندین صیغہ و قواعد مرتب، دادہ اند چنان چہ اکثر۔ دستور العمل بملاحظۂ حساب دان تبادو انکسار ٹھاکر لعل ولد چتر بھوج داس - قوم کایستھ - ماتھر۔ سکنۂ دار السرور برہان پور - آمدہ - از ان جا کارخانہ جات سلاطین عظمٰی و سرکارات کبریٰ درج سن و حساب ہائے دقیق از روئے ہائے کہ در ہندوی معتبر و معروف است، ارقام پذیر فتہ۔ نو آموزان این وقت بہ دریافت و فہم آں چوں حسود در کنج حیرانی بمانند و بالفعل رشتۂ سلطنت بہ ہم و این سرکارات عمدہ نامنتظم۔ بنا بر علیہ از مدت بخاطر این . . ہیچ مدانے می رسد کہ بحسب ضرورت انچہ روزگار حال را مفید شود، نسخہ، ترتیب دادہ تا سریع الفہم، طالبان این فن و موجب مواد بقدر حصول معاش، ددین دیرکہن باشد ددین ولا عزیز از جان سعادت اقتباس لالہ گوکل داس برائے تربیت پیش احقر الناس می آمدند و مافی الضمیر مطابق ملاحق صورت پذیرفت - ہر چند کہ خود کسب انشا ر نمود و در زنگا پوئے پاسئے اوقات فرمودہ، اما بیمن فتوحات قبلہ گاہی بیکنٹھ باشی و بزرگان عالی قیاس کہ فی الجملہ سرمایۂ ابد درین مسلم شدہ۔ بہ ترتیب و تالیف این چند ورق پرداخت و بتاریخ نہم رجب المرجب ۱۱۸۱ھ یکہزار و یکصد و ہشتاد ہجری علم اختتام آن برافراخت۔ توقع از کامل ہنران انسب کہ بہ نظر تصدیق و بہ نگاہ تنقیح و تحقیق نوازش فرمودہ، صورت قصور دستور بہ اصلاح منظور خواہند فرمود ....."

دیباچہ کے مذکورہ بالا اقتباس سے امور ذیل کی صراحت ہوتی ہے :—

نام مصنف — ٹھاکر لعل ولد چتر بھوج داس -

نام تصنیف — دستور العمل -

سبب تصنیف — "نو آموزان وقت" کے لئے یہ کتاب علم سیاق میں لکھی گئی ہے -

— برہان پور میں سلاطین وقت کے کارخانے تھے[1] اور ان میں حساب کتاب عربی اور ہندی

---

[1] برہان پور شاہجہاں، جہاں آرا، اورنگ زیب کے کپڑے کے کارخانے تھے۔ ملاحظہ کیجئے — (باقی صفحہ نمبر ۲۸ پر)

[illegible] جاتا تھا۔

[illegible] مصنف کے ذہن میں یہ بات تھی کہ زمانے کے مطابق ایک مفید کتاب ترتیب دے۔ جو اس فن کے حاصل کرنے والوں کے لیئے سریع الفہم ہو اور حصولِ معاش کا موجب بن سکے لہذا چند صیغے اور قواعد ترتیب دے کر زیرِ نظر کتاب لکھی

سنِ تصنیف ـــــ تصنیف کی ابتدا کی تاریخ کی کہیں صراحت نہیں ہے۔ کتاب کی تکمیل کی تاریخ ۸ رجب ۱۲۱۰ھ ہے

"دستور العمل" کے ترقیمہ کی دلچسپ عبارت بھی ملاحظہ کیجئے گا " تمام شد کتاب دستور العمل بتاریخ چہاردہم جمادی الاول ۱۲۱۶ ہجری بدستخط نہال سنگھ ولد ٹیکا رام ابن دیو رام قوم کالیتھ اونائی۔ سکنہ موہان باشندہ لکھنؤ ... از باعثِ آمدن روزگار بجانب دکھن دار السرور برہان پور ... بوقت جنگ ... از ہر سہ بہادران مہاراجہ پونہ والا نواب عمدۃ الملک نظام علی خان و دولت راؤ سندھیا و جسونت راؤ ہلکر ... نگارش یافت"

ترقیمہ کی مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے کہ کاتب نہال سنگھ ولد ٹیکا رام ہے۔ مہاراجہ پونا۔ نظام علی خان، دولت راؤ سندھیا اور جسونت راؤ ہلکر کے درمیان جنگ کے زمانہ میں برہان پور[1] آیا اور کسی نسخہ سے ۱۴ جمادی الاول ۱۲۱۶ھ کو نقل کیا

ترتیب مضامین: ـــــ دستور العمل دو ابواب پر مشتمل ہے

بابِ اوّل کی ابتدا میں مروجہ سنین ـــ الہٰی، ہجری، فصلی، جلوسی وغیرہ کا ذکر ہے۔ ان سنین کے مہینوں اور دنوں کے نام بھی مرقوم ہیں۔ ایک گوشوارہ میں عربی اسمائے ایام کو سیاقی تحریر میں بھی درج کیا گیا ہے۔

ذیل کے مختلف گوشواروں کے نمونے دیئے ہوئے ہیں: ـــ

۱۔ نقد و جنس کا حساب

۲۔ باورچی خانہ کا حساب ـــ حاصل اعمال و تفصیل ـــ

۳۔ عمارات ـــ فیل خانہ، اصطبل، گاؤ خانہ ـــ

۴۔ شاہ گنج اور راویر[1] پرگنہ کے حاصل اعمال اور آمدنی کا گوشوارہ ـــ

۵۔ داخلہ خزانہ ہائے عامرہ[2]

۶۔ زمین ـــ اقسام و پیداوار ـــ

جہاں اسم نویسی کی تفصیل ہے وہاں ملازمان سرکار اہل قلم اور خدمت گاروں کی فہرست دی ہوئی ہے۔ ملازمین کی تنخواہ کے

---

[1] برہان پور کے مضافات۔ [2] خزانہ عامرہ اور راویر پرگنہ کی محصلات کی تفصیل ہے۔ داروغہ ـــ میر محمد اور مشرف خوشحال رائے کے نام دیئے ہیں۔

(۲۲۵ سے آگے)

(۱) رقعات عالمگیری۔ مقدمہ ص ۲۲۷ (۱۱) آداب عالمگیری خط ع ۲۲۸ (۱۱۱) خطوط عالمگیری ص [illegible]

گوشوارہ میں قاعدے اور اصول بھی مذکور ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ کیجیے :—

اسناد عال و خدمات :—

(الف) پرگنہ فیض آباد کی جاگیر —— خوش وقت رائے کے نام

(ب) خانہ گنج کی داروغگی —— میر محمد علی کے نام

(ج) سرکاری فیض آباد پرگنہ —— محمد مصطفےٰ کے نام

تصدیق وکالت کے نمونے :—

(الف) صوبہ برار کی متصدی گری کی وکالت (ب) سررشتۂ بیوتات کی وکالت

(ج) پیادہ ملازم کی وکالت (د) شمس آباد کے جاگیرداروں کو مطلع کرنے کی وکالت

(ر) محمد بیگ اور دیگر ملازمین کو محمد قلی عامل جہانگیر پور دہ — کی خدمت میں مستعد رہنے کی اطلاع۔

(ی) مرزا احمد خاں کو پروانۂ راہداری۔

دیوار اور زمین کی پیمائش کے نمونے اور طریقے مندرج ہیں طول و عرض اور ارتفاع کی پیمائش اور اس کے لحاظ سے مسالہ اور مزدوری کی شرح کی تفصیل ہے۔ اس ضمن میں : — (۱) طرح اوزان (۲) طرح تمسک و ضامنی (۳) قرض (۴) زیور گرو رکھنے کی رسید (۵) ضمانت نامہ (۶) قرض نامہ وغیرہ کے نمونے دیئے ہوئے ہیں۔

مکان کی فروخت کے سلسلہ میں مکان کے محل وقوع اور گرد حویلی کے بارے میں بھی تمسک کے نمونے ہیں۔ مچلکا اور ضامنی مال اور حاضر ضامن کے نمونے بھی دیئے ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا نمونوں کے بعد ترقیمہ کی عبارت ہے۔ جو کاتب، سن کتابت اور کاتب کے برہان پور آنے کی وجہ کو بیان کرتی ہے۔

باب دویم :— دوسرے باب میں زراعت، حوض، کنواں، دیوار وغیرہ کی مساحت کا بیان ہے۔ اس میں مینار، محیط، کنواں، حوض، خندق وغیرہ کے ناپنے کے مختلف ضابطے اور قاعدے بیان کئے گئے ہیں۔ پیمائش کے مختلف طریقوں کی شکلوں کے ذریعہ وضاحت کی گئی ہے۔ اور آخر میں حسابِ جمل کے قواعد مرقوم ہیں۔

مختلف شعبوں کی ذیل میں اہم مناصب کا ذکر ہے :—

دیوان، بخشی، متوفی، خانساماں، دیوانِ بیوتات، پیش دست بخشی، پیش دست خانساماں، پیش دست دیوانِ بیوتات، دیوان، وکیل مطلق، دیوانِ خالصہ، تحویلدار، عرض مکرر۔

اس کے بعد مختلف شعبوں میں کام کی تقسیم کی تفصیل ہے۔ مختلف فنکاروں کے نام اور کام کا تذکرہ ہے۔

اس تذکرہ کے بعد مرقوم ہے :—

وزیراعظم دولت خواہی و جان سپاری منظور داشتہ مطلب' را بہ عرض رساند و ہر کس از اطراف و جوانب' معاملات [illegible] ت رب را موافق حکم' داخل واقع نماید' حقیقت صوبہ داران ممالک محروسہ' در خلوت خانہ بہ عرض رساند و بموجب حکم تجویز عزل و نصب کند۔

فرامین جہان مطاع ..... جن و عطایات حسب ضرورت صوبہ داران از جناب قدسی ارسال گرداند جزو کل اہلِ خدمات مہمات کارگاہ سلطنت را بنظر تدقیق درآوردہ' ہر کسے را بحال داشتن یا تغیر کردن..... معمول ار دو ہر معاملہ بہ عرض رسانیدہ' دستخط نمودہ بمتصدیان محلہ و..... بسپارد۔

پروانہ تنخواہ و جاگیر اہل مناصب در ہر صوبہ بہ مہر خاص خود مرحمت کند۔ صدر الصدور و دیوان خالصہ و خانساماں در معنی پیشکاران وزیراعظم اند۔

انتظام سلطنت ابد قرین ہمیں است؟

مذکورہ بالا اقتباس کے بعد امیر الامرا آصف الدولہ کی عرضی ہے اور خاتمہ کتاب۔

اقتباس بالا سے وزیراعظم کے فرائض اور اس کے رفقائے کار پر روشنی پڑتی ہے۔

بابر اور ہمایون کے عہد میں صرف ایک وزیر ہوا کرتا تھا۔ اکبر نے سلاطین دہلی کے تاریخی حالات اور بیرم خاں کے واقعات سے تجربات کی روشنی میں وزیر اعلیٰ کا منصب ختم کر دیا۔ اور اس کی جگہ کئی دیوان مقرر کر دیئے۔ ہر دیوان کی نگرانی میں ایک محکمہ ہوتا تھا۔ دیوان اعلیٰ یا وزیر کے علاوہ' محکمۂ دیوان حسب ذیل افراد پر مشتمل ہوتا تھا: —

دیوان خالصہ —— خالصہ اراضی کے لئے — دیوان تن —— تنخواہوں کے لئے

مشرف —— محاسب خاص — مستوفی —— حساب کی تنقیح کرنے والا

داروغہ —— — تحویل دار ——

میر بخشی' بخشی اوّل' دویم و سویم کے عہدے قائم کئے گئے اور ان کے فرائض مقرر کئے گئے۔ ان تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ علامہ ابوالفضل نے "غسل خانہ یا خلوت خانہ" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ وہ بالعموم "دولت خانہ" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ بعد کی تاریخی کتب میں دیوان کے لئے "خلوت خانہ" بھی استعمال ہوا ہے۔ عبدالحمید لاہوری اور محمد صالح نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ غسل خانہ' خلوت خانہ کیسے بن گیا' دیوان خانہ اور زنان خانہ کے درمیان ایک کمرہ تھا جس میں اکبر غسل کیا کرتا تھا۔ یہاں وہ چند قابل اعتماد اشخاص سے ملاقات کر لیا کرتا تھا۔ بعد میں دیوان بخشی بھی وہاں حاضر ہونے لگا۔ دربار کے امیروں کو بھی وہاں آنے کی اجازت حاصل ہوگئی اور سلطنت کے کام وہاں انجام پانے لگے۔

مختصر یہ کہ سلاطین مغلیہ کے مرکزی اور صوبائی نظم و نسق کے جائزہ کے لئے "دستور العمل" بھی ایک قابل ذکر ماخذ ہے۔

سید یوسف کمال بخاری

نیشنل میوزیم نئی دہلی میں
توزک جہانگیری کا قلمی نسخہ

نیشنل میوزیم میں خطی مخطوطات کے ذخیرہ میں ایک نسخہ توزک جہانگیری (سوانح جہانگیر) موجود ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ متذکرہ بالا نسخہ جہانگیر کے اپنے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے چنانچہ مغلیہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے ناظرین و محققین کو...... قدرتی طور پر یہ معلوم کرنے کی خواہش ہوئی کہ آیا یہ نسخہ اصلی ہے یا نہیں۔ متعدد محققین نے اس نسخہ کو دیکھا ہے اور موافق و مخالف نظریوں کا اظہار کیا ہے اس دلچسپ اور متنازعہ فیہ مسئلہ نے مجھے اس نسخہ کے بالاستیعاب اور تفصیلی مطالعہ پر آمادہ کیا۔

یہ نسخہ ۱۹۵۶ء میں نیشنل میوزیم کی آرٹ پرچیز کمیٹی (فنی اشیاء کی مجلس خریداری) نے لکھنؤ کے ایک سوداگر سے خریدا۔

نسخہ کی ظاہری حالت اچھی نہیں ہے۔ ۲۷۳ اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ اوراق بوسیدہ اور کرم خوردہ ہیں تاہم متن آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ زیادہ ناقص نہیں ہے۔ اوراق کا طول و عرض (۱۰) اعشاریہ (۸) انچ اور (۶) اعشاریہ (۸) انچ بالترتیب (۲۷) اعشاریہ ۵ سنٹی میٹر اور (۱۶) اعشاریہ (۵) سنٹی میٹر ہے۔ نسخہ مجلد ہے جلد اغلباً چرمی ہے جو عمدہ کپڑے سے پوشیدہ ہے جس پر گلہائے رنگا رنگ نکھار دکھا رہے ہیں۔ خان بالغ کاغذ پر یہ نسخہ ضبط تحریر میں لایا گیا ہے لیکن ناقص الآخر ہے اور ۷ سن جلوسی (جہانگیری) پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ساتواں سن جلوسی بھی نامکمل ہے۔ جس میں دو یا تین صفحات غائب ہیں حاشیہ مسلسل و متواتر نمونہ ہائے گل، تصاویر وحوش و طیور سے آراستہ و مزین ہے۔

نسخہ کا آغاز حسب معمول سرلوح کی نیچے والی تختی میں "اللہ اکبر" کے الفاظ سے ہوتا ہے اس کے بعد مندرجہ ذیل سطور تحریر ہیں: —

"از عنایات بیغایات الٰہی بساعت نجومی از روز پنجشنبہ بیستم جمادی الثانی ہزار و
چہار دہ ہجری گذشتہ"......... الخ

اور خاتمہ پر قوسین میں تحریر کردہ الفاظ پر ہوتا ہے: —

"راجہ نرسنگ دیو بہ منصب چہار ہزاری ذات و دو ہزار و دویست سوار
مقرر گشت"

میں قارئین کرام سے اجازت چاہوں گا کہ اس نسخہ کی جانچ پڑتال فنی حیثیت سے کروں۔ یہ مد نظر رکھتے ہوئے کہ

یہ نسخہ جعلی ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں جو شبہات و اعتراضات دماغ میں دوران تحقیقات پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ ذیل پیش کرتا ہوں۔

۱۔ نسخہ پر طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ تحریر از آغاز تا انجام یکساں نہیں ہے۔ متعدد قلموں کی تحریر کردہ مختلف خط ہیں۔ اس حقیقت سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ یہ نسخہ بادشاہ کا دستی تحریر کردہ نسخہ نہیں ہے اور اس دعویٰ کی نفی و ابطال ہو جاتا ہے کہ یہ اصلی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شہنشاہ نے بطور املا متعدد واقعہ نویسوں سے مختلف اوقات پر لکھوایا ہو۔ بدیں وجہ ضبط شدہ واقعات مختلف خطوں میں نظر آتے ہیں۔

۲۔ (الف) یہ بھی امکان ہو سکتا ہے کہ کسی شخص نے جہانگیر کے خط کی بعینہٖ نقل کرنے کی کوشش کی ہو تاکہ وہ توزک کا ایک جعلی نسخہ تیار کر سکے اور پھر یہ دعویٰ کرے کہ یہ اصلی نسخہ بادشاہ کے ہاتھ کا تحریر کردہ نسخہ ہے تاکہ یہ نسخہ بے بہا ہو جائے اور مابعد کے زمانہ میں امرا و عمائدین میں سے کسی کے ہاتھ فروخت کر کے مالا مال ہو جائے۔

(ب) ہو سکتا ہے کہ یہی مندرجہ بالا سعی کسی نے موجودہ دور میں کی ہو تاکہ نیشنل میوزیم کی مانند کسی ادارہ کو فروخت کر کے قسمت بنائیں۔

۳۔ شاہی کتب خانہ کی کوئی مہر اس نسخہ پر حسب معمول ثبت کیوں نہیں ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ جو کتابیں شاہی کتب خانہ میں ہوتی تھیں ان سب پر مہریں مع شاہی دستخطوں کے اشارات و حواشی کے ثبت ہوتی تھیں۔

۴۔ تین اوراق شمارہ نمبر ۱۲۲، ۱۵۱، ۲۲۴ کا کاغذ اور طرز تحریر مختلف کیوں ہے۔ تمام نسخہ میں نظر سے یہ بات گذری کہ تحریر بے نقطہ بجز مندرجہ بالا تین اوراق کے۔

۵۔ توزک جہانگیری کا کوئی نسخہ جہانگیر کے ہاتھ کا تحریر کردہ موجود ہونا محال ہے کیونکہ جہانگیر خود اپنے ہاتھ سے کبھی کوئی نسخہ احاطہ تحریر میں نہیں لایا بلکہ املا کیا ہے یقیناً موجودہ نسخہ کا جہانگیر کے ہاتھ کا لکھا ہونا ناممکن ہے۔

۶۔ سر سید احمد خاں کے علیگڈھ ایڈیشن کے توزک کے صفحہ ۳۵۲ پر شہنشاہ جہانگیر نے لکھا ہے:۔

"از عمر ضعیفی کہ دو سال پیش ازیں عارض شدہ بود و ہنوز ہست دل و دماغ ہمراہی نمود کہ مسودات سوانح و وقائع توام پرداخت درینولا کہ معتمد خاں از خدمت دکن آمدہ سعادت آستان بوس دریافت۔ چوں از بندہ ہائے مزاج داں و شاگردان سخن فہم بود و سابق نیز سر رشتہ ایں خدمت ضبط وقائع بہ عہدہ او بود حکم فرمودم کہ از تاریخ کہ نوشتہ ام آمدہ مشارٌ الیہ بخط خود نویسد و ذیل مسودات من داخل سازد و آنچہ بعد ازیں سوانح شود بطریق روزنامچہ مسودہ نمودہ بہ تصحیح من رسانیدہ بہ بیاض می سپردہ باشد۔"

فقرہ "نوشتہ ام" سے مذکورہ بالا عبارت کے اس مفہوم کی تائید نہیں ہوتی کہ بادشاہ نے یہ سوانح خود لکھی ہے بلکہ

اس نے کسی دوسرے سے لکھوائی ہے۔ شہنشاہ کا مقصد کہ نوشتہ اہم ہے کہ زیادہ مناسب ہے بعض میں سے لکھا اور کسی دوسرے نے تحریر کیا۔

۷۔ کیا سبب ہے کہ اس نسخہ کی عبارت مصدقہ مطبوعہ تزک سے مطابقت نہیں رکھتی

ہماری جانچ دراصل مندرجہ ذیل نکات پر منحصر ہونا چاہیئے :-

سب سے مقدم اور اولین پہلو اس امر کی ہونا ضروری ہے کہ نسخہ زیر بحث واقعی شہنشاہ جہانگیر کا اپنا قلمی نسخہ ہے اور اگر شہنشاہ جہانگیر کے مصدقہ دستخطی نمونے نسخہ زیر بحث کی لکھاوٹ سے مطابقت رکھتے ہیں تو یہی سب سے بڑا ثبوت اس نسخہ کے اصلی ہونے کی بابت پیش کیا جا سکتا ہے ۔

دوسرے حواشی پر زیبائشی بیل بوٹے، پرندوں اور جانوروں کی تصاویر ہیں ان کی جانچ بھی ضروری ہے اگر یہ آرٹ اُستاد منصور کا ہے جو جہانگیر کے دربار کا مشہور مصور ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ نسخہ پر یہ زیبائشی فن منصور نے شہنشاہ جہانگیر کے لئے پیش کیا ہوگا ۔

اگرچہ اس زیبائشی فن کا منصور سے متعلق ہونا اس امر کا واضح اور بدیہی ثبوت نہیں ہو سکتا کہ یہ نسخہ جہانگیر کا قلمی ہے لیکن کم از کم یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ یہ نسخہ کبھی بھی جہانگیر کے مقبوضات میں رہا ہوگا ۔

تیسری چیز اس بات کی تنقیح ہے کہ نسخہ میں استعمال کیا ہوا کاغذ جہانگیر کے زمانہ کا ہے یا نہیں؟

حالانکہ تنقیحات نمبر دو اور تین مسئلہ متنازعہ فیہ کے فیصلہ کے لئے کوئی بالراست ثبوت نہیں ہو سکتے پھر بھی یہ دو باتیں اس نسخہ کی جانچ کے لئے محققین کے ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

اگر نسخہ زیر بحث واقعی جہانگیر کا قلمی ہے تو یہ بات بھی لازم ہو جاتی ہے کہ ہم خود نسخہ زیر بحث کی اپنی تاریخ کے بارے میں صحیح معلومات کریں کہ یہ جہانگیر کے پاس سے ہوتا ہوا کس طرح اور کن حالات میں نیشنل میوزیم تک پہونچا ۔

سب سے پہلے جہانگیر کے لکھنے کے طریقہ کی جانچ کرنی چاہیئے اور معلوم کرنا چاہیئے کہ اس کے طرز تحریر میں کونسی نمایاں باتیں ہیں۔ اس مقصد کے لئے میں نے جہانگیر کی لکھائی کے نمونے مختلف مسودات اور دستاویزات سے فراہم کئے جو مختلف عجائب گھروں اور اداروں سے مل سکے۔ ان مختلف نمونوں کو جب میں نے یکجا کیا اور ان کا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ سب ایک دوسرے سے سو فیصدی مطابقت نہیں رکھتے۔ حالانکہ یہ سب تحاریر جہانگیر کی اپنی ہیں جس کی تصدیق ہو چکی ہے اور آخر میں دی ہوئی ان تحریروں کی تصاویر سے صاف ظاہر ہوگا۔

یہ تحریریں سب کی سب بے قاعدہ اور بے ترتیب نستعلیق میں مختلف نوعیت کی ساتھ ہیں۔ اور ان کو مندرجہ ذیل عنوان میں رکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ تحریر نقطہ دار ۲۔ تحریر بے نقطہ ۳۔ تحریر مشترک (نقطہ دار و بے نقطہ)

کوئی [illegible] سے نہیں کہہ سکتا کہ ایک خاص شخص کی لکھائی ہمیشہ ایک جیسی ہو اور ایک دوسری تحریر سے مماثلت رکھتی ہو۔ اسی طرح کوئی بھی یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتا۔ اس کی لکھائی تا عمر ایک سی رہی اور اس میں کوئی بھی فرق نہیں پیدا ہوا۔ حالات ایک ہی انسان کے قلم کے دائروں میں افتراق پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کئی حالات سامنے آتے ہیں مثلاً بچپن، نوجوانی، جوانی اور ادھیڑ عمر انسان کی مختلف مزاجی کیفیت۔ خوشی کا عالم، حزن و ملال کی کیفیت، مسرت، خوف، نشہ کی حالت، سکون اور دماغی ہیجان وغیرہم بہر نوع ان اختلافات کے باوجود جو مختلف حالات ایک ہی انسان کے خط میں تبدیلیوں کا باعث ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بات لازم و ملزوم ہے کہ کوئی نہ کوئی انفرادیت یا خصوصیت ایسی ضرور ملجاتی ہے جو قاری کے ذہن و نظر میں یہ واضح کر دیتی ہے کہ یہ خط اس کے لئے اجنبیت نہیں رکھتا بشرطیکہ اس کو ایسے خط سے واقفیت یا لگاؤ رہا ہو۔ اور یہی تجربہ ہمیں اس وقت ہوجاتا ہے جب ہم اپنے کسی عزیز دوست یا جانی پہچانی شخصیت کا خط پڑھ رہے ہوں۔ .... جو بغیر ہم سرنامہ پر لکھا ہوا پتہ پڑھتے ہیں ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ خط ہمیں کس کی جانب سے موصول ہوا ہے۔ یہ دراصل منطق نہیں ہے بلکہ بصارت ہے۔ جو ایک خاص شخصیت کی لکھائی کی تصدیق کرتی ہے۔

اگر دو انسانوں کی لکھائی میں کچھ یکسانیت ہو تو بھی ہر لکھائی کی خصوصیت اور انفرادیت خود ہی کسوٹی بن کر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور ہم پرکھ لیتے ہیں کہ کونسی تحریر کس شخص کی ہے اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ یہ بصارت ہے جو یہ قوت تمیزی رکھتی ہے۔ اس میں دلائل کو کوئی مقام حاصل نہیں ہے اسی طرح عام حالات میں ہم شناساؤں کو ان کی آوازوں سے پہچان لیتے ہیں کسی بھی شناسا کی صورت دیکھے بغیر اسکی آواز سے اسکو پہچان لینا مشکل نہیں ہے یہاں بھی قوت سامعہ، دماغی قوتوں سے اوپر ہے اسلئے ہم اس نتیجہ پر باسانی پہونچ جاتے ہیں کہ جہانگیر کی مختلف تحریروں کے نمونے جو میں نے فراہم کئے ہیں خود شہنشاہ جہانگیر کے ہاتھ کے ہی لکھے ہوئے ہیں۔ اس صداقت کو ذہن میں محفوظ کئے ہوئے میں نے قریبی زاویہ سے ان تحریروں کے نمونوں کو دیکھا اور یہ سمجھ لیا کہ ان میں طرز نگارش اور اسلوب تحریر میں قدر مشترک موجود ہے۔

ان تمام نمونوں کے غور و فکر سے معائنہ کے بعد یہ ضروری ہے کہ اس نسخہ زیر بحث کی لکھائی سے مقابلہ اور موازنہ کیا جائے۔ طرز تحریر میں اختلاف ہونیکے باوجود اگرچہ کسی بھی نمونہ تحریر کی کسی بھی صفحہ سے مماثلت ہوجاتی ہے تو یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے کہ نسخہ مذکور جہانگیر نے اپنے قلم سے تحریر کیا ہے۔

موازنہ کے وقت یہ محسوس ہوا کہ تمام تحریر اس نسخے کی ابتداء سے انتہا تک بے نقطہ ہے سوائے صفحات ۱۵۰-۱۵۱ اور ۲۳۴ کے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا نسخہ دونوں تحریروں میں لکھا گیا ہے یعنی نقطہ دار اور بے نقطہ اسلئے لکھائی کا یہ اختلاف کسی بھی موجب انکار نہیں ہوسکتا کہ نسخہ مذکور اصلی نہیں ہے۔

انتہائی دقیق اور گہری نظر سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ قلم کی حرکات، دائرے، زاویے، آڑھے ترچھے خط (VERTICAL SHAFTS HORIZENTAL LINE) حروف کی عمودی اور افقی کشش کے [illegible]

کسی دوسری نمونۂ تحریر سے مطابقت اور مماثلت رکھتے ہیں۔ اور قارئین خود بھی نسخۂ مذکورہ کے مختلف [illegible] کا جائزہ کرکے دیکھ سکتے ہیں۔

واقعتاً مجھ کو یہ کہدینا مشکل ہے کہ نسخۂ مذکور کی لکھائی جہانگیر کے دیگر دستخطی نمونوں سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس لئے انصاف کی بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کیلئے ماہرین دستاویزات کی رائے طلب کی جائے۔ میں کم از کم تین ایسے ماہرین کی رائے لے رہا ہوں۔ سائنسی اور ٹیکنیکی بنیادوں پر بغیر تاریخی پس منظر کے اپنی رائے دیں گے اور اس میں بلاشبہ کوئی ذاتی غرض یا تعصب کا شائبہ بھی نہ ہوگا۔ یہ ماہرین جہانگیر کے مصدقہ دستخطی نمونوں سے نسخہ زیر بحث کا مقابلہ کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرینگے۔

مورخوں اور محققوں کا ایک گروہ اس امر کا حامی ہے کہ جہانگیر نے اپنی سوانح حیات خود نہیں لکھی ہے بلکہ دوسروں سے لکھوائی ہے اور اسی لئے ان کے خیال میں جہانگیر کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی۔ توزک کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے اگر ہمارا نقطۂ نظر صحیح اور قابل قبول ہے تو جونہی ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ نسخہ مذکورہ کی لکھائی جہانگیر کے اپنے قلم کی ہے تو پھر ہمیں مندرجہ بالا آراء پر نظرثانی کرنا ہوگی یہاں میں دو محققین کی رائے کو قارئین کے لئے پیش کرتا ہوں:—

چارلس ریو اپنی رائے اس طرح پیش کرتا ہے:—

"توزک جہانگیری کے اسوقت دو تصحیح شدہ نسخے موجود ہیں یا یوں کہیے کہ دو مخصوص کارنامے ایک ہی نام سے پائے جاتے ہیں۔

ان نسخوں میں سے ایک جو تاریخ وار مرتب کیا گیا ہے۔ مہر تصدیق ثبت ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس پر شک کیا جائے کہ وہ جو شہنشاہ (جہانگیر) کا اسم تاجپوشی سے اس کے عہد حکومت کے سترہ سال تک تحریر کیا گیا ہے اور بعد ازاں شہنشاہ کی نگرانی میں اسے معتمد خاں - انیسویں سال جلوس کی ابتدا تک لکھتا رہا جیسا کہ خود نسخہ مذکور میں تحریر ہے (مطبوعہ نسخہ مقدمہ[1])

سر سید احمد خاں نے تحریر کیا ہے:—

واضح باد کہ شہنشاہ جہانگیر احوال زماں روائے خود تا اوسط سال ہفدہم خود تحریر نمودہ بعد ازاں معتمد خاں را کہ از امرائے معتمد جہانگیر بود حکم فرمود کہ خاں مذکور از آئندہ مسودات تحریر نمودہ باصلاح جہانگیر در آوردہ شامل کتاب می نمودہ باشد چنانچہ معتمد خاں تا اوائل سال نوزدہم جلوس مسودات را نوشتہ باصلاح در آوردہ بعد ازاں مرزا محمد ہادی مولف دیباچہ تا آخر ایام حیات تکمیل نمود[2]

---

[1] مسودات فارسی مخطوطہ برٹش میوزیم جلد اول صفحہ ۲۵۳ نمبر اضافی ۲۶ ۱ اور ۲۱۶
[2] توزک جہانگیری مولفہ سر سید احمد خاں علیگڑھ مطبوعہ ۱۸۶۴ء مندرجہ حاشیہ صفحہ ۱
توزک جہانگیری کی مسلسل کوششوں کے باوجود تصویر کے باکس حاصل ہو سکے جسکا راقم کو افسوس ہے۔

[illegible] مسودہ خود جہانگیر کے قلم سے لکھے جانے کی صداقت کے بارے میں سرسید احمد خاں اور چارلس ریو کے بیانات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے اس کے علاوہ خود تزک جہانگیری سے بھی اس امر کی شہادت مل جاتی ہے۔ متعلقہ عبارت اس مقالے کے شروع میں نقل کی جا چکی ہے جس میں جہانگیر نے فارسی میں تحریر کیا ہے "کہ نوشتہ ام" اس لئے اس فقرے کا ہرگز یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ "کہ نویسانده ام" اس لئے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ جہانگیر نے اپنی سوانح خود اپنے قلم سے تحریر کی ہے اور یہ قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کہ جہانگیر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تزک کا وجود ممکن ہی نہیں ہے۔

میں نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ اس نسخہ کے بارے میں معلومات فراہم کروں کہ یہ جہانگیر سے ہوتا ہوا کس طرح نیشنل میوزیم پہونچا لہذا میں نے اس تاجر سے رابطہ پیدا کیا جس نے نسخہ زیر بحث میوزیم کو فروخت کیا تاکہ معلومات فراہم کر سکوں کہ اس نے اس نسخہ کو کہاں سے حاصل کیا اور اس سے پہلے یہ کس کے پاس تھا اور کس فرد یا خاندان کو یہ نسخہ کس سے دستیاب ہوا لیکن تاجر موصوف نے اس سلسلہ میں باوجود میری پر زور استدعا کے کوئی بھی معلومات فراہم نہیں کی اور ماخذ بتانے سے انکار کر دیا جس سے میں قطعی مایوس ہو گیا۔

میں نے نسخہ زیر بحث کا تزک جہانگیری کے اس مطبوعہ نسخے سے موازنہ و میلان کیا جسے سرسید احمد خاں نے ۱۸۶۴ء علیگڑھ سے شایع کیا تھا۔ بائیس ۲۲ صفحات تک اس مسودے کی عبارت مطبوعہ نسخے سے ملتی رہی علاوہ اس کے کہ چند۔۔۔ الفاظ کہیں کہیں تبدیل ہو گئے ہیں، لیکن اس تبدیلی سے عبارت کے مفہوم میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہ ہو سکی بس یہ اختلاف نظر انداز کئے جانیکے قابل ہیں اور انکی موجودگی سے عبارت کی ہم آہنگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ان اختلافات کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:---

نسخہ محفوظ نیشنل میوزیم	تزک جہانگیری مؤلفہ سرسید احمد خاں	صفحہ	سطر
بخاطر	برخاطر	۲ الف	۴
تا روضہ	تا بدرگاہ روضہ	" "	۹
ہفت در روزہ	ہفت روزہ	" "	۱۳
آگرہ بسری برد	آگرہ استقامت داشت	۲ ب	۸
معشیاری کامر کہ شنیدم	ہشیاری شنیدم	۳ الف	۱۲
متصل	متصدی	۱۷ الف	۱
قدیم کلاں	قدیم بزرگ	" "	۷
سبحان عالم	روندھائے عالم	" "	۱۰
کبوتری ۱ (حاشیہ اگلے صفحہ پر)	سیوتی	۶ "	۹

...ہائے قدیم پر عبارت	... بعد ہائے قدیم عبارت	[illegible]	[illegible]
سنہ ع ۱۰۱	دکوئی سنہ اس نسخہ میں نہیں دیا گیا	۱۱۱	[illegible]
بالمرادو بالعدی	ازبلہ بالعدی	[illegible]	[illegible]
مفصل مجموعہ	سرسید کے مؤلفہ نسخہ میں تین اشعار درج ہیں جبکہ نسخہ زیر بحث میں ان اشعار کو حذف کر دیا گیا	۱۲۱	[illegible]
سنہ	توشہ	۲۲	[illegible]

میرے مشاہدات درج ذیل ہیں:—

(۱) سلسلہ تحریر سے حواشی پر دئے ہوئے زیبائشی نقش و نگار کٹ گئے ہیں اگر نسخہ زیر بحث شہنشاہ کا قلمی نہ ہوتا بلکہ اس نے کسی سے لکھوایا ہوتا جیسا کہ عالموں نے ایک گروہ کا قیاس ہے تو پھر یہ کسی خوشنویس کے ہاتھوں سے خوشخط لکھا ہوتا کیونکہ وہ جانتا کہ نسخہ مذکورہ شہنشاہ کی ڈائری ہے اور اس لئے وہ اسے خوبصورت اور صاف لکھنے کی کوشش کرتا۔ کاٹ چھانٹ قطع و برید حواشی پر سے عبارت کا گذر جانا اور ترمیم وغیرہ جیسی چیزیں اس نسخہ میں ہرگز نہ پائی جاتیں کیونکہ ان خامیوں نے صفحات کے حواشی پر دیئے ہوئے نقش و نگار کو بھدا اور بدصورت بنا دیا ہے اور یہی واقعاتی چیز ہمیں اس نتیجہ پر پہونچا دیتی ہے کہ نسخہ زیر بحث خود شہنشاہ جہانگیر کے قلم سے لکھا ہوا ہے اور اس نے صفحات کی خوبصورتی کا لحاظ کئے بغیر ہی لکیروں کو قطع کر کے اپنی تحریر آگے تک جاری رکھی ہے کیونکہ اس پر خوبصورتی و صفائی کو قائم رکھنے کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔

(۲) بغیر اعراب یا نقاط لگائے یہ نسخہ مخلوط لکھا گیا ہے اور تحریر کی یہ خصوصیت جہانگیر کی دوسری تحریر میں بھی شامل ہے۔

(۳) صفحہ ۱۶۵ ب پر حاشیہ پر ایک تحریر ہے جو اصل متن میں ایک اضافہ ہے۔ شہنشاہ نے پہلی بار متن لکھنے کے بعد جب نظرثانی ہوگی تو اصل تحریر میں کچھ اضافہ کیا ہوگا۔ یہ اضافہ کردہ تحریر اصل متن کا ہی ایک حصہ ولا ینفک ہے کیونکہ سرسید احمد خاں کے مطبوعہ ایڈیشن میں موجود ہے

(۴) حاشیہ پر آرائش کا کام متن لکھے جانے کے بعد کیا گیا ہے جیسا کہ صفحہ ۱۷۷ ب کے مشاہدہ سے واضح ہوتا ہے نیچے سے دوسری سطر حاشیہ کو قطع کر گئی ہے، اور حاشیہ پر کیا ہوا مطلا کام عمودی سطر پر مسلسل نہیں کیا گیا چونکہ درمیان میں حروف حائل ہو گئے۔

(۵) صفحہ ۱۷۰ (ا) پر صفحہ کے بیچوں بیچ ایک سطر پر خط نسخ پھیلا ہوا ہے اور دائیں جانب کے حاشیہ پر اصل متن ہے

— پہلے لفظ "کیتو کی کر سیوتی" لکھا گیا تھا۔ بعدہٗ "کیتو کی" کیا گیا جیسا کہ نسخہ زیر بحث میں "سیوتی" کا "س" کاٹنے سے ظاہر ہوتا ہے شاید شہنشاہ نے نظرثانی کرتے وقت یہ اصلاح کی ہے مگر میرا خیال ہے کہ نسخہ زیر بحث میں صحیح لکھا ہوا ہے اور سرسید احمد خاں کے مؤلفہ نسخہ میں لفظ "چند" سہواً لکھنے سے رہ گیا ہے۔

چند الفاظ [illegible] دیا گیا ہے ہو کہ اصل متن کی تحریر کے وقت چھوٹ گئے ہونگے یا شہنشاہ نے بعد میں اس تحریر کو بڑھایا ہوگا [illegible] یہ الفاظ [illegible] کے ایڈیشن میں موجود نہیں ہیں۔

(۶) اورنگ زیب کی ایک مہر چسپاں ہے جو صاف پڑھی نہیں جاتی الفاظ یہ ہیں "عالمگیر محی الدین بادشاہ غازی ابوالمظفر"

جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ میوزیم کے نسخہ کی تحریر کا مقابلہ کرنے کیلئے جہانگیر کی دوسری دستی تحریروں کو حاصل کرنے کی سعی کی اور بالآخر مجھے یہ تحریریں۔ مختلف قلمی نسخوں پر حواشی کی شکل میں دستیاب ہوئیں۔ جو کہ ملک کے مختلف کتب خانوں اور عجائب خانوں میں محفوظ اور موجود ہیں۔ ان نمونہ ہائے تحریر کی ایک فہرست درج ذیل ہے۔ . . . .

قارئین کی سہولت کے پیش نظر تمام فوٹو جو میں نے حاصل کئے ہیں وہ اور ایک فوٹو میوزیم کے نسخہ میں سے اس صفحہ کا جس میں الفاظ "نورالدین ابن اکبر بادشاہ" تحریر ہیں فی الحال یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں میوزیم کے نسخہ سے کوئی ایسا صفحہ پیش کروں جسکا متن جمع کئے ہوئے دوسرے مقامات کے نمونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بالکل یکساں ہو لہذا مقابلہ و موازنہ کیلئے ہمیں میوزیم کے نسخہ اور دوسری تحریروں کے چند مشترک الفاظ تک ہی جائزہ کو محدود کرنا پڑیگا چنانچہ میں نے میوزیم کے نسخہ سے چند نمونے انتخاب کئے ہیں جن میں جہانگیر اور اکبر کے نام آئے ہیں کسی شخص کی تحریر نہیں اسکے دستخط کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے

میں تمام دلچسپی رکھنے والے محققین اور مورخین کو دعوت دیتا ہوں کہ ..... اس نسخہ کا جائزہ لیں اور اپنے نتیجہ سے آگاہ کریں کہ واقعی یہ نسخہ اصل ہے یا جعلی۔

جہانگیر کی مستند دستخطی تحریروں کی فہرست

مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں ۲ تحریریں موجود ہیں ؎

(۱) ذخیرہ حبیب گنج فہرست نمبر ۲۹/۳۰ عربی کتاب موسوم بہ شرح موقف مطول کے آخری صفحہ پر خود قلمی تحریر ہے (عکس نمبر ۱)

اللہ اکبر مطول در علم فصاحت بخط سیدا (لمحققین) و سند مدققین میر سید شریف جرجانی .... (بعد ملاحظہ) داخل کتابخانہ این نیازمند۔ درگاہ الٰہی شد سر جلوس مطابق ۱۰۲۲ حررہ محمد نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی۔

(۲) دوسری تحریر ایک حرکی دیوان کے صفحہ پر ہے (اب یہ ورق کتاب سے علحدہ کر دیا گیا ہے) اور مندرجہ بالا کتب خانہ میں ہے۔

متن

اللہ اکبر منیم آذر سنہ داخل کتابخانہ این نیازمند درگاہ الٰہی شد نورالدین جہانگیر ۱۰۲۴ ابن اکبر بادشاہ

دونوں تحریروں پر شاہی مہر ثبت نہیں ہے۔ لیکن اسی صفحہ پر شاہجہاں کی مہر ثبت ہے جس سے اول الذکر تحریر کے مستند ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

خدا بخش اورینٹیل لائبریری بانکی پور پٹنہ

۳۔ فہرست (CATALOGUE) نمبر ۴۴۱ کتاب موسوم بہ دیوان مرزا کامران کے سر ورق پر جہانگیر کی دستخطی تحریر موجود ہے

—— (متن) ——

اللہ اکبر۔ دیوان مرزا کامران کہ عم پدر بزرگوار منست بخط محمود اسحق شہابی حررہ نورالدین محمد جہانگیر شاہ

اکبر سنہ ۲ جلوس موافق سنہ ۱۰۱۵ھ

اس تحریر پر جہانگیر کی کوئی مہر ثبت نہیں ہے اسی صفحہ پر شاہ جہاں کی بھی دستخطی تحریر موجود ہے اور اس کی مہر بھی مذکورہ بالا تحریر کی دائیں جانب ثبت ہے۔

(۴) فہرست نمبر ۱۳۱ کتاب موسوم بہ دیوان حافظ کے اندر ایک صفحہ پر جہانگیر کی تحریر موجود ہے۔

—— (متن) ——

وقتے کہ از الہ آباس لقصد یل ——— حضرت والد بزرگوار خوسب ——— آگرہ بودم در اثنائے راہ ——
رسید کہ تفال بدیوان حافظ ——— باید نمو این غزل برآمد ——— ہم سعادت خدمت ——— ورضاجوئی و حاضر بو۔
در واقعہ ناگزیر دست د ..... ——— ہم دولت موروثی ——— آوری گشت کہ بقیہ مضمون ——— غزل بود
در جمیدی الثانی (سنہ) ——— کشودہ شد راقمہ نورالدین ابن اکبر بادشاہ غازی (عکس چہار)

اس دستخطی تحریر پر جہانگیر کی کوئی مہر چسپاں نہیں ہے۔

(۵) متذکرہ بالا کتاب کے ایک دوسرے ورق پر جہانگیر کی ایک اور دستخطی تحریر ہے۔

—— (متن) ——

والسلام ——— اجمیر بسر را تا رفتہ بودم در پیکار ——— بید الماس تراشیدہ از سر من انتاد ———
چون این را چوب بدانستہ تفال ——— دیوان خواجہ نمودم این غزل ——— برآمد و روز دیگر تعویذ بیدا ———
حررہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی فی ماہ محرم سنہ ۱۰۲۲ھ (عکس پنجم)

۸۔ اس صفحہ پر دوسری تحریر بھی ہے۔

اس تحریر پر بھی جہانگیر کی مہر ثبت نہیں ہے۔

رضا کتب خانہ رامپور

۶۔ فہرست شمارہ ۵۵ کتاب موسومہ بہ رسالہ خواجہ عبداللہ انصاری کے صفحہ اول پر جہانگیر کی ایک تحریر ہے:۔

—— (متن) ——

رسالہ خواجہ عبداللہ انصاری خط کاسلطان علی از پیشکش خان خاناں بتاریخ ۲۴ جمادی الاول سنہ ۱۰۲۲ سنہ جلوس

حدہ [illegible] اکبر بادشاہ غازی

(عکس شش)

سالار جنگ میوزیم حیدرآباد دکن

(۷) اندراج عمومی ۹۰۴/۹۹ نسخۃ القرآن صفحہ اول پر جہانگیر کی تحریر ہے۔

(متن)

اللہ اکبر بنام بارخدائے عز وجل این نیازمند درگاہ صمدیت بقدوۃ العارفین وسراج المتقین حسن خواجہ بتاریخ اول شہریور ماہ الہی سنہ ۱ جلوس مطابق ہجری رمضان المبارک ۱۰۱۴ برسم ارمغان فرستاد حدہ نورالدین جہانگیر شاہ ابن اکبر بادشاہ غازی

(عکس ہفتم الف)

۸۔ اسی صفحہ پر دوسری تحریر بھی ہے۔

(متن)

ایں کلام ملک علام کہ بخط زبدۃ الکتاب خواجہ یاقوت غلام مستعصم عباسیت۔

بتاریخ دوازدہم امرداد سنہ ۹ جلوس مطابق بست وہفتم جمادی الثانی ۱۰۲۳ ہجری داخل کتابخانہ ایں نیازمند درگاہ الہی شد حدہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ غازی (عکس ہفتم ب)

۹۔ فہرست نمبر ۲۱۲ دیوان حافظ صفحہ اول پر تحریر ہے: —

(متن)

اللہ اکبر کہ آذر سنہ ۱ داخل کتابخانہ ایں نیازمند درگاہ الہی شد در دارالخلافہ آگرہ۔ حدہ نورالدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ، درخانہ پدرم از عموی من محمد حکیم مرزا رسید۔

ذیل میں زیر بحث نسخہ توزک جہانگیری کے چار صفحات کے فوٹو جن میں جہانگیر کے دستخط یا اس کا نام وقوع پذیر ہوا ہے مقابلہ کیلئے پیش ناظرین ہے۔

(۱) نمبر ۱ پر بالائی قطعہ کے اندر الفاظ "اللہ اکبر" ملاحظہ ہوں اور اس کا مقابلہ جہانگیر کے دوسرے خطی نمونوں میں واقع لفظ "اکبر" سے کیجئے۔

اس تحریر پر بھی جہانگیر کی مہر ثبت نہیں ہے۔

جہاں وہ لکھتا ہے "نورالدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ"

(۲) عکس نمبر ۸ کی بالائی سطر میں مرقوم الفاظ "جلال الدین اکبر بادشاہ نورالدین" ملاحظہ کیجئے۔

(۳) اسی فوٹو میں دوبارہ اوپر سے تیسری سطر میں الفاظ "نورالدین جہانگیر بادشاہ" ملاحظہ کیجئے۔

(۴) عکس نمبر ۹ صفحہ ۲ (الف) میں نیچے سے پانچویں سطر میں مرقوم الفاظ "اکبر بادشاہ" ملاحظہ کیجئے۔

تصاویر پر شہنشاہ جہانگیر کی خودنوشت تحریریں
(حاشیہ از سائمن ڈگبی)

میں جناب بخاری صاحب کے خیال کی پرزور تائید کرتا ہوں کہ نسخۂ تزک جہانگیری شہنشاہ کے ہاتھ کا تحریر کردہ ہے میں کچھ مدت سے جہانگیری دور کی عمدہ تصاویر پر مرقوم متعدد تحریریں جمع کر رہا ہوں۔ جو مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر قطعی امکان یا یقین کے ساتھ شہنشاہ کی ذات سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔ میری یہ فہرست ابھی مکمل نہیں ہے لیکن میں یہاں ان دستخطی . . . . . تحریروں کا ذکر کروں گا جو پہلے بھی کسی نہ کسی اشاعت میں شائع ہو چکی ہیں ان سے جہانگیر کے دستخطی تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو جاتا ہے۔ یہ ساری تحریریں بھدّے نستعلیق طرز میں ہیں ان تمام خصوصیات کے ساتھ جن کا جناب بخاری صاحب نے ذکر کیا ہے اور وہ خصوصیات بعینہ نسخۂ زیر بحث کی تحریر سے مماثلت رکھتی ہیں۔ اور یہی خصوصیات وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم لندن کے نسخہ اکبرنامہ پر جہانگیر کی تحریر کردہ عبارتوں میں موجود ہیں۔

"ایک مزید خصوصیت ان تحریروں کی یہ ہے کہ یہ عام طور سے تصاویر کے اندرونی حصے میں پائی جاتی ہیں جہاں جگہ بہت محدود ہے۔

نمایاں دستخطی تحریر سے قطع نظر، ان تحریروں میں سے کچھ کا انداز عبارت ایسا ہے کہ ایسے الفاظ صرف جہانگیر ہی کے قلم سے نکل سکتے تھے۔ مثال کے طور پر ایران کے شاہ عباس اول کی تصویر جس میں اسے جہانگیر کے برابر باادب بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے اور جہاں شاہ کے سر پر "شبیہ برادرم شاہ عباس" لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح جہانگیر کی محل جودھا بائی کے بھائی راجہ سورج سنگھ پر لکھی ہوئی عبارت "طفلای خرم" (خرم کے چچا) مغل دربار کے سخت آداب مجلس کی تحت صرف خرم (یعنی شاہجہاں) کے باپ ہی کی تحریر ہو سکتی ہے۔ ان ہی دستخطی تحریروں میں جن سے جہانگیر کے مذاق کا بھی پتہ چلتا ہے وہ عبارات ہیں جو ان معروف جانوروں کی تصاویر پر تحریر ہیں جو اس کے عہد حکومت میں دربار میں پیش کئے گئے تھے اسی ضمن میں وکٹوریا اینڈ البرٹ میوزیم میں زیبرا کی تصویر ہے جس کے داہنی جانب یہ عبارت تحریر ہے :—

استر جو میر جعفر کے ہمراہ حبشہ سے آیا تھا اور جس کی تصویر نادر زمانہ استاد منصور نے کھینچی تھی سنہ ۱۰۳۰ ہجری مطابق دور ہندوستان کے نیشنل میوزیم میں عام گمان ہاتھی کی تصویر ان دستخطی تحریروں کی بین شناخت اس معروف جہانگیری میوزیم میں مل سکتی ہے جس کا بیشتر حصہ برلن میں ہے جسے کیونسل (KUCHNAL) اور گوئٹز (GOELZ) نے ہندوستانی کتابی تصاویر (INDIAN BOOK PAINTING) کے نام سے شائع کیا تھا ایک حصہ طہران[۱] میں ہے اور بعض اوراق پریشان دیگر

[redacted] — ہندوستان کے سلاطین اور شہنشاہوں کی تصاویر پلیٹ ۳۵ الف

[redacted] (انجمن پلیٹ ۲۰ — [۱] آثار آف انڈیا سالانہ نمبر ۱۹۲۲ء ص ۷۵ [redacted]

خاکہ کیں پالی [redacted] کی اشاعت ۱۹۲۲

علامات بھی ہیں۔ یہ البم جس کے حاشیے اس قدر مزین ہیں بظاہر ایک شاہی ملکیت ہو سکتی ہے اور غالباً دہلی سے بیگم علی
قیمت کے ساتھ [illegible] کے قبضہ میں آیا۔ اس کی اکثر تصاویر پر ویسی ہی جہدی نستعلیق تحریریں ہیں جن کا ذکر [illegible]
ان تصاویر میں کچھ کے راجہ' ناؤ بھارو کی شبیہ ہے جس کے چاروں طرف داہنی جانب [illegible] ہو کر
حسب ذیل عبارت تحریر ہے۔

تصویر ناؤ بھارو زمیندار ولایت کچھ جسے گوردھن نے کھینچی تھی اور جو سنہ ۱۳ مطابق [illegible] شہر [illegible]
میں معتبر زمینداروں میں سے ہے جو اس سرزمین کے کسی بھی حاکم سے ملاقات کرنے آیا تھا۔

گیونسل اور گیثیر نے غالباً اس معروف فقرہ سے ناواقفیت کی بناء پر حرۃ کو حضرت[۱۳] پڑھ لیا۔ باوجودیکہ یہ فقرہ [illegible]
اور پیش کے ساتھ صاف لکھا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں حضرات یہ سمجھنے سے قاصر رہ گئے۔ جہانگیری البم کی یہ تمام تحریریں خود جہانگیر
کی ہیں۔ طہران کے مسودہ کے ایک صفحہ پر یہ دستخطی[۱۴] تحریر ہے ۱۰۱ عمل فرخ بیگ بقلم جہانگیر اکبر بادشاہ (کذا)

اس مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تحریریں البم میں صفحات کی حاشیہ بندی سے پیشتر کی ہیں اور انہیں حسب ضرورت کہیں کہیں تراش دیا
گیا ہے مجھے تو یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے نپرسنک میوزیم پراگ[۱۵] میں رکھے ہوئے اس البم کے اس دلچسپ صفحہ پر جس کے ایک
حصہ میں بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کی شبیہ کے اوپر اس سلطان کے علم موسیقی کو حسب ذیل مبالغہ آمیز فقرہ میں سراہا گیا ہے دراصل
جہانگیر ہی کے تاثرات قلمبند ہیں جن کو صفحہ کی حاشیہ بندی کے وقت کاٹ کر نکال دیا گیا بعد کو خطاط محمد حسین زریں قلم نے دوبارہ خود تحریر کیا

اللہ اکبر شبیہ ابراہیم عادل شاہ دکنی طرف دار بیجاپور جو کہ دکن کے علم موسیقی میں خود کو اہل فن کا سردار تصور کرتا ہے عمل فرخ بیگ
سنہ ۵ جلوس مبارک موافق [illegible] بندہ کمترین محمد حسین زریں قلم جہانگیر شاہی نے تحریر کیا۔

جہانگیر کی ایک اور رومانوی دستخطی تحریر ہے جو تلف ہو گئی یہ ایک تصویر کے اوپر تھی جسے شاید خود شہنشاہ نے انگریزی سفیر
سر طامس رو کو پیش کیا تھا اس تحریر کا ایک عکس طامس رو کی اصل تصنیف "سفارت" میں زیارت کے اندر شائع ہوئی تھی
انگریزی فن کار نے اس قدر کامیابی سے [۱۲۰۶] در شہر ماندو تحریر منوہر داس پچاس سالگی۔

---

[۱۳] KECHNAL (بجنسہ) پلیٹ ۳۶ روگرس اور بیورج کے ترجمہ "تزک جہانگیری" میں اس امیر کا نام راے بہاری ہے حصہ دوئم ۱۰

[۱۴] GODARD (بجنسہ اشتہد) ۰ ۷ ص ۱۳ ۲ پر جس کا بیان ص ۱۸ ۲۱ پر یوں ہے۔

[۱۵] بجنسہ مغل اسکول کی ہندوستانی تصاویر' آرنیہ بکس' لندن ۱۹۶۰ ص ۱۰ پلیٹوں کی فہرست میں غلطی سے اس کا نمبر (ص ۷) ہے اس کا [illegible] ترجمہ جو [illegible] ہوا ہے مغل فنون کی تاریخ کے کسی بھی معیار سے گرا ہوا ہے' شبیہ ابراہیم عادل خان دکنی حاکم بیجاپور جس نے اپنے علم موسیقی کے ذریعہ ملک دکن کو شہرت بخشی اور اپنی رعایا کو ہدایت بخشی اور جس نے [illegible] (سنہ ۱۶۱۱ء ۱۶۱۰ء) میں فرخ بیگ کو اپنے بہار بیگ سے [illegible] کا اصل کس اعزاز کی شکل میں دیا تحریر محمد حسین زریں قلم بندہ جہانگیر ۱۶ سر ولیم فاسٹر سر طامس رو کی سفارت ہندوستان [illegible]
۱۹۲۶ ص ۱۲۰ اور ص ۱-۶ تک کے سامنے کی تصاویر ص ۱ع بلگرامی کا نسخہ سنہ (۱۰۲۶ ہجری) کے درمیان اعداد صاف نہیں ہیں۔

سہیل اختر

سر پٹکتے ہی رہے خواب ہواؤں کی طرح
غم مگر چھا گیا دل پہ گھٹاؤں کی طرح

دشتِ غم میں جو کبھی تجھ کو پکارا میں نے
خامشی گونج اٹھی تیری صداؤں کی طرح

کیا خبر تھی کہ ترے قرب کے روشن لمحے
دل پہ جھپٹیں گے شبِ غم میں بلاؤں کی طرح

اس نئے دور میں ماضی کی روایات کہن
جسمِ انساں پہ ہیں بوسیدہ قباؤں کی طرح

حسرتیں شہرِ نگاراں میں لئے کاسۂ دل
ایک اک چہرے کو تکتی ہیں گداؤں کی طرح

ہم کسے زخم دکھائیں کہ یہاں لوگ سہیل
دیدہ و دل پہ مسلط ہیں خداؤں کی طرح

حباب ہاشمی

حدِ جنوں سے بھی آگے گئے ہیں دیوانے
ملے گی منزلِ مقصود کب خدا جانے

کئے ہیں تو نے منور دلوں کے کاشانے
ترے وجود سے آباد ہیں صنم خانے

جو تم نہ تھے تو بہاریں خزاں سے بدتر تھیں
تم آگئے تو چمن بن گئے، یہ ویرانے

ہر ایک دوست مجھے اجنبی نظر آیا
فریب مجھ کو کچھ ایسے دیئے ہیں دنیا نے

تمام عمر رہی یونہی چاک دامانی
چلے ہیں اہلِ خرد آج مجھ کو سمجھانے

شبِ فراق ہجومِ غم و الم کے طفیل
تمہاری یاد چلی آئی دل کو بہلانے

حبابؔ اشکِ ندامت ہیں اُن کی آنکھوں میں
قبول کیجئے خلوص و وفا کے نذرانے

رونق دکنی سیمابی

گرہ میں زہر بھی رکھتے ہیں یہ شیر و شکر والے
ہیں ان میں کون اہلِ خیر اور ہیں کون شر والے

خرد بینی مآلِ خود شناسی سے عبارت ہے
ہیں بے بہرہ مگر اس بات سے علم و ہنر والے

دُرِ خوش آب سے پانی اُتر جائے تو پتھر ہے
مگر پھر بھی انہیں سے کھیلتے ہیں سیم و زر والے

خودی اور بیخودی دو زاویے ہیں خود شناسی کے
نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے وہ دِل والے یہ سَر والے

تن آسانی عمل کی راہ میں کانٹے بچھاتی ہے
فلک کو تک رہے ہیں بے بسی سے بال و پر والے

نظر کی بے سر و سامانیاں دیکھی نہ جائینگی
نگاہیں چار آخر کیوں کریں ہم سے نظر والے

سرِ منزل سے منزل درحقیقت دور ہے لیکن
بڑے ثابت قدم ہوتے ہیں یارانِ سفر والے

بس اک جینے کی خواہش ہے جئے جاتے ہیں مر مر کے
حیاتِ خضر رکھتے ہیں حیاتِ مختصر والے

دیارِ غیر میں رونق یہ فکرِ عافیت کیسی!
بھلا ہم بے گھروں کا درد کیا سمجھیں یہ گھر والے

ریورنڈ متین ریحانی

نظر کچھ اور آئے زندگی کا رنگ عالم میں
اگر انسان ہو جائے شریکِ انسان کے غم میں

یہ کیا جبرِ مشیت ہے اٹھا کر پی نہیں سکتے
اگرچہ فاصلہ کچھ بھی نہیں ہے جام اور ہم میں

پہنچکر محفلِ ناہید میں اک روز دم لینگے
ترانے گائے جائینگے ہمارے خیر مقدم میں

تمہارے مے کشوں کے دامنِ تر سے لپٹ جائے
کہاں ہے تاب اتنی شعلۂ نارِ جہنم میں

بنا دینگے گلستاں در گلستاں ہر ستارے کو
نہاں روحِ بہاراں ہے ہماری سعیِ پیہم میں

ہماری حسرتیں یوں تو بہت نکلیں مگر اب بھی
دِلِ پُر غم میں کچھ ہیں اور کچھ ہیں چشمِ پُر نم میں

ابھی تو اس نے تسخیرِ فضا کی ابتدا کی ہے
نہ جانے اور کتنا حوصلہ ہے ابنِ آدم میں

کبھی پھولوں کی محبت میں ہنسے تھے ہم بھی ریحانی
سزا اس کی ابھی تک پا رہے ہیں باغِ عالم میں

ڈاکٹر سید اختر احمد

اگر تحت ہدایت فطرت انساں رواں ہوتی
زمیں نہ پھر یا رشک نگار آسماں ہوتی

ارادے سے ترے جاری ہے ابتک عالم امکاں
مشیت میں نہ ہوتی گر تو یہ دنیا کہاں ہوتی

ترے جلووں کی حیرت سے دھڑکتا دل جو رک جاتا
وہ مرگ ناگہاں، میری حیات جاوداں ہوتی

مرے سوز دروں سے اس کے شعلے سرد پڑ جاتے
جو بجلی بھی مجسم ہو کے فرش آشیاں ہوتی

تمنا دل کی آخر بن گئی خود فاصلہ ورنہ
نہ وہ کھنچتے، نہ میں بڑھتا نہ دوری درمیاں ہوتی

وفا کا راز کھل جاتا، محبت جگمگا اٹھتی!!
یہ پروانہ جو گونگا ہے اگر اس کو زباں ہوتی

حقائق سے گریزاں گر نہ رہتا آدمی، اختر
قبائے آدمیت اس طرح کیوں دھجیاں ہوتی

عزمی

حیدرآباد دکن

حیدرآباد مروت کی بہاروں کا چمن
خار بھی جس کے ہیں کلیوں کی طرح غنچہ دہن
حسن افکار کا حساس دماغوں کا وطن
مرکز دیدہ وراں ارض دکن ارض دکن
سانولی شام جنوں جسکی سحر بھاگ متی
ماہ و خورشید محبت سے ہر اک دل روشن
کہساروں کی ہواؤں میں وہ راگوں کی بہار
بھیرویں رام کلی میگھ بسنت اور یمن
ارض تقدیس و وفا شہر نگار ہستی
کوئے آتش نفساں میکدۂ شعر و سخن
تربیت گاہ ادب وہ کہ نہیں جسکی مثال
جسکا ہر خورد و کلاں کم سخن و شیریں سخن
کفر و ایمان کی تہذیب کا وہ سنگم ہے
جسکے دامن میں نہیں کوئی کسی کا دشمن
عافیت گاہ ہمیشہ سے رہا ان کیلئے!
علم و فن جب بھی ہوئے ہیں کہیں آوارہ وطن
یہ وہ بستی ہے جہاں رہتے ہیں انسان فقط
نہ رقابت نہ شکایت نہ حسد اور نہ جلن
تلخی گردش ایام کا شکوہ نہ گلہ
یہ وہ میخانہ ہے جسمیں [illegible] ندگن
کوئی فردوس زمیں پر ہے اگر اے عزمی
ایک میرا ہی وطن ہے جسے کہتے ہیں دکن

باقر منظور

کیا جاذبِ دل چہرۂ ایوانِ غزل ہے
محبوبِ نظر حسنِ گلستانِ غزل ہے
بجلی ہے محبت کی رواں اس کی رگوں میں
پروردہ بہت شمعِ شبستانِ غزل ہے
ہوتی ہے جہاں نشو و نما فکر سخن کی
گہوارۂ فطرت وہ دبستانِ غزل ہے
محفوظ ہے دامن میں فصاحت کا خزانہ
یہ حسنِ بلاغت بھی تو فیضانِ غزل ہے
پاکیزگیٔ فکر بھی تخئیل حسین بھی
ہر جذبۂ الفت تہہ دامانِ غزل ہے
اک نغمۂ دلکش ہے محبت کی فضا میں
تہذیب تکلم پہ بھی احسان غزل ہے
وہ حسن کی دیوی جسے کہتے ہیں محبت
وہ حسنِ غزل شانِ غزل جانِ غزل ہے
منظورِ نظر صنفِ سخن ہے یہی باقرؔ
فطرت مری شرمندۂ احسانِ غزل ہے

رؤف خیر

اس ادا پر تو مٹا جاتا ہے طالب کوئی
سننے والا ہے کوئی اور مخاطب کوئی

آج تک بھی ہے جو تسکین آنا سے قاصر
زندگی ہے کہ بھٹکتا ہوا راہب کوئی

ہنس رہا ہے مری پلکوں پہ جو یہ قطرۂ کرب
افقِ درد سے ٹوٹا نہ ہو ثاقب کوئی

یوں تجھے دیکھ رہا ہوں میں تھکی نظروں سے
جیسے شرمندہ ہو حالات سے تائب کوئی

مرنے والوں پہ تو بہتان تراشو لیکن
جینے والوں کو دو الزام مناسب کوئی

زندگی تونے پلٹ کر نہیں دیکھا ورنہ
دور تک دیکھ رہا تھا تری جانب کوئی

غم جدا، فکر جدا، زیست کی اقدار جدا
خیر شاعر ہے مگر خیر نہ غالب کوئی

زیب غوری

شام غم جلوہ فشانی بھی تو ہو
کچھ جگر کا خون پانی بھی تو ہو

غم میں رفتہ رفتہ مستی آئیگی
کچھ دنوں یہ مے پرانی بھی تو ہو

کیا توجہ کا تری احسان اٹھائیں
اعتبارِ زندگانی بھی تو ہو

پست ہے طوفان غم کا حوصلہ
سر سے اونچا میرے پانی بھی تو ہو

کیجیے گا سُن کے کیا رُوداد غم
کیا کہوں، کوئی کہانی بھی تو ہو

اُن پہ کھلتا جا رہا ہے رازِ دل
بے زبانی بے زبانی بھی تو ہو

دشمن صبر و قرارِ دل سہی
تم ہماری زندگانی بھی تو ہو

تنگ ہوں خود اپنے ہاتوں کسقدر
مجھ پہ میری مہربانی بھی تو ہو

کیا تقابل طبعِ جولاں سے مری
کوئی دریا میں روانی بھی تو ہو

کیا اٹھائے کوئی لطفِ اختصار
زیب عمر جاودانی بھی تو ہو

کلونت سنگھ جانی

چھلکی ہوئی تیری آنکھوں کا یہ جام جدھر ہو جاتا ہے
رندوں کی حقیقت کیا ہوگی میخانہ اُدھر ہو جاتا ہے

جب حد سے گذر جاتی ہے خلش اور ٹیس کی حد کو چھوتی ہے
دل شمع کا شعلہ ہو کہ نہ ہو پروانے کا پر ہو جاتا ہے

جب حسن کی آن پہ بن جائے تب عشق تلی پہ جاں لیکن
فرہاد کا دل ہو جاتا ہے منصور کا سر ہو جاتا ہے

تقلید میں رندوں کی پہنچا زاہد بھی تمہاری محفل میں
معلوم نہ تھا یوں جلدی میں صحبت کا اثر ہو جاتا ہے

مانا کہ صبح کے دامن میں ہر چیز ہے لیکن اے جانی
ظلمت کی سیاہی سے خالی دامانِ سحر ہو جاتا ہے

عطا کلیانوی

رباعیات

(۱)

اک عشق میں ٹپکا ہوا آنسو میں ہوں
خود آپ سے بھاگا ہوا آہو میں ہوں
اک چاہ میں ہاروت کو کرتا ہوں اسیر
زہرہ کا جگایا ہوا جادو میں ہوں

(۲)

میں اپنی خودی کو قید کر دیتا ہوں
ہر جلوہ گری کو قید کر دیتا ہوں
جب اپنا جنوں اتارتا ہوں سر سے
شیشے میں پری کو قید کر دیتا ہوں

(۳)

یوں سامنے "عالم مثال" آجائے
جیسے دل میں کوئی خیال آجائے
اک ساز کو مضراب میں چھیڑ تو دوں
ڈرتا ہوں کہیں تم کو نہ حال آجائے

(۴)

جلوہ کوئی دیکھا ہے نظر سے پہلے
خورشید کو پایا ہے سحر سے پہلے
ہر چند کہ مجھ کو نہ ملی راہ گذر
منزل پہ میں پہنچا ہوں سفر سے پہلے

(۵)

اوہام کو الہام نہیں کہہ سکتے
ہر قول کو پیغام نہیں کہہ سکتے
میخانے میں ہے خون سے لبریز سبو
ہم بادۂ گلفام نہیں کہہ سکتے

(۶)

کب دل کو نگاہوں کا پیام آیا ہے
کس وقت تمہارا دورِ جام آیا ہے
جلوے تو ہیں سامنے مگر ہوش نہیں
اللہ مرے! عجب مقام آیا ہے

(۷)

ہیں عشق میں انوار خود آگاہی کے
ہیں فقر میں اسرار شہنشاہی کے
افلاک کی منزل سے جو ہیں دور بہت
اسباب ہیں پرواز میں کوتاہی کے

نقد و نظر

اُردو زبان کا مذہبی ورثہ

قیوم صادق احمد پوری ۔ ملنے کا پتہ ۔ علوی بکڈپو محمد علی روڈ بمبئی ۳ ۔ اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد ۔ صفحات ۱۰۳ قیمت تین روپے ۔

قیوم صادق صاحب نے اس سے پہلے اپنی ایک مرتبہ کتاب " اردو ادب میں تنقید کی اہمیت " پیش کی ہے ۔ اس طرح ادبی دنیا ان سے ناواقف نہیں ۔ پیش نظر کتاب " اردو زبان کا مذہبی ورثہ " ان کے ایک ایسے مطالعہ کا نتیجہ ہے جبکہ ان کو اس امر کا خیال ہوا کہ آخر اردو میں کن کن مذاہب کی تعلیمات ملتی ہیں ۔ ان کا بیان ہے کہ ۔ اگر اردو زبان صرف مسلمانوں کی ہوتی تو غیر مسلم خصوصًا ہندو اپنی مذہبی کتابیں اس کثرت سے اس میں کیوں شائع کرتے ؛ ہندو ، عیسائی ، سکھ ، جین اور بہائی مذہب اور ہندوؤں کے متعدد اصلاحی فرقے مثلاً آریہ سماج ، برہمو سماج ، دیو سماج ، کبیر پنتھ ، رادھا سوامی مت ۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی وغیرہ ان سب کا اپنے مذہب و اخلاق کی نہ صرف مستند اور چوٹی کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنا بلکہ سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابوں کو تالیف کر کے اردو کے ذریعہ عوام تک پہنچانا اس حقیقت کا ناقابل انکار ثبوت ہے کہ یہ مشترک زبان ہندوستان کے بڑے حصے کی عام زبان کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس طرح موجودہ ہرزہ سراؤں اور یاوہ گویوں کو جو اردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں مسکت جواب دیا ہے ۔ کتاب کا آغاز اردو کی ابتدا سے کیا ہے اور اس کے بعد کے عنوانات میں مذہبی لہریں ، صوفیانہ شاعری ، مذہبی لٹریچر ، قرآن مجید کے اُردو تراجم ، غزل میں مذہبی خیالات ، نعت اور مرثیہ شامل ہیں ۔ آخری دو عنوانات نثری اسلوب اور غیر مسلموں کا حصہ قدرے موضوع سے ہٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن متن میں جن کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ان کا تعلق مذہبی ادب سے رہا ہے ۔ یہ جایزہ کسی صورت میں بھی مکمل نہیں کہلایا جا سکتا موضوع اس قدر وسیع ہے کہ دفتر کے دفتر سیاہ کئے جا سکتے ہیں لیکن فاضل مصنف نے صرف اشارے کئے ہیں اور ان کا مقصد بھی قاری کو موضوع کی طرف متوجہ کرنے سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا ۔ تاہم اس مختصر سی کتاب میں بہت سی کارآمد باتیں بھی آگئی ہیں ۔ اسلئے صادق صاحب کا یہ کام سراہے جانے کے لائق ہے ۔

اقبال قلندر نہیں تھا

صائب عاصمی ۔ ناشر تخلیق کار پوسٹ بکس ۴۰ لاہور سائز ۱/۱۶ کراؤن صفحات ۲۲۰ قیمت ندارد

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں کئی علائم و اشارات استعمال کئے ہیں ۔ انھیں میں ایک قلندر بھی ہے ۔ اقبال کے قلندر اور مرد مومن میں دراصل کوئی فرق نہیں ۔ قلندر کو صائب عاصمی نے لغوی معنی میں استعمال کر کے یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ اقبال قلندر نہ تھے اور خواہ مخواہ لفظ قلندر استعمال کر کے شاعر نے ایسی مقدس شخصیت کی توہین کی ۔ بات

جب غلام[illegible] کی ہو تو یہ اعتراض منفی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اقبال نے جو درس دیا ہے اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو [illegible] قلندر کی ایک خاص تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے ابھرے گی بشرطیکہ ہم قبل از قبل کوئی مفروضہ نہ رکھتے ہوں۔

اسرارِ کائنات و اشرف المخلوقات

ڈاکٹر اختر احمد۔ ناشر پاپلی اسٹڈی سرکل ۴۳۴–۳–۲۲ پرانی حویلی حیدرآباد۔ صفحات ۱۶۶ قیمت تین روپے سات پیسے

ڈاکٹر صاحب جہاں جسمانی امراض کے معالج ہیں وہیں وہ ذہنی انتشار کے علاج کے بھی ماہر ہیں۔ اسرارِ کائنات اور اشرف المخلوقات کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں موجودہ دور کے حالات میں جس میں عوام کی پریشان حالی کے اظہار کے بعد حکومتی، صنعتی، جوہری، تعلیمی اور مذہبی انقلابات سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرا باب نظامِ کائنات سے متعلق ہے جس میں نیچر، مادہ، کائنات میں اشیاء کا ربط باہم، وقت اور فاصلہ اور حقیقت کائنات اور انسانی تصورات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ مسائل پیچیدہ ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کے دلچسپ اندازِ بیان نے ان کو سلیس اور آسان بنا دیا ہے۔ تیسرے باب کا عنوان "کرۂ ارض" ہے۔ اس کے اہم موضوع سماجی ناانصافیاں۔ اسبابِ حیات اور انسان اور ہماری دنیا ایک مہمان خانہ اور کارخانہ ہیں۔ ان میں فاضل مصنف نے بعض پتہ کی باتیں بتائی ہیں مثال کے طور پر ان دو چار جملوں کو پڑھیے۔

"اب مذہب کے بجائے سیاسی نظریات نے جگہ لے لی ہے۔ سیاسی گروہ بندیاں کم و بیش اتنی ہی تخریبی ہیں جیسے مذہبی گروہ بندیاں تھیں۔ اب بھی کمزور عوام کا پہلے ہی کی طرح استحصال کیا جا رہا ہے ...... پہلے کے حکمران اقتدار کے بھوکے تھے اور اب طاقتور گروہ دولت کا بھوکا ہو گیا ہے۔ پہلے عوام کی زبان پر پہرے بٹھائے جاتے تھے اب ان کی معیشت پر پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں...... بیشتر سیاسی رہنما عوام کے ساتھ برائیوں کے خلاف آواز اٹھانے نہیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں"۔

اس طرح ڈاکٹر صاحب نے موجودہ دور کے سماجی نقائص اور حکومتی مصائب پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ چوتھا باب "اشرف المخلوقات" ہے جس میں جسم، دماغ، ذہن انسانی، نیکی و بدی، ضمیر روحانیت۔ بنی نوع انسان میں ذہن کی اہمیت اور حیاتِ انسانی میں دین کی اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ آخری باب کا عنوان "نظامِ حکومت" ہے جس میں جمہوریت کی تعریف اور اس کے اغراض و مقاصد اور طریق کار کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

"کتاب" باوجود اس کے کہ مختصر ہے لیکن اپنی جامعیت کے لحاظ سے مختلف نوعیتوں کے مضامین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور چونکہ اندازِ بیان دل نشین ہے۔ قاری کہیں گرانی محسوس نہیں کرتا۔ ڈاکٹر صاحب نے جن موضوعات کو اپنایا ہے وہ آج ہر ایک عامی کے دل کی آواز ہیں اسلئے یقین ہے کہ کتاب کو قبولیت عام حاصل ہو گی۔

محمد اکبر الدین صدیقی

(باقی صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ ہو۔)

بیاد گار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ جلد ۳۱ شمارہ ۱۲

دسمبر ۱۹۶۸ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

پروفیسر سید علی اکبر

مجلس مشاورت

حمید ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ مسز راج سکینہ۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں

محمد منظور احمد

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم: **محمد جمال الدین**

منتظم: **وقار خلیل**

چندہ سالانہ	چھ روپے	غیر ممالک سے	دس روپے
چندہ ششماہی	تین روپے	فی پرچہ	پچاس پیسے

نمونہ کے پرچہ کیلئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

اس شمارہ میں پروفیسر سید علی اکبر نگران سب رس و صدر ادارہ ادبیات اردو کے ایک مضمون کا جو اصل میں انگریزی میں لکھا گیا ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے اس مضمون میں اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں مرحوم کی تخت نشینی (۱۹۱۱ء) سے ۱۹۴۸ء تک حیدرآباد میں جو تعلیمی ترقی ہوئی اس کا بہ تفصیل اظہار کیا گیا ہے یہ مضمون ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے کہ فاضل مضمون نگار عرصہ دراز تک ریاست حیدرآباد کے عہد نظامت تعلیمات پر فائز رہ چکے ہیں اور اس کے بعد سے آج تک بھی حیدرآباد کی تمام علمی اور تعلیمی سرگرمیوں میں صاحب موصوف کی خدمات حاصل کی جاتی رہی ہیں آپ نے نظام کالج اور حیدرآباد میں یونیورسٹی کے تحت قائم شدہ پہلے ایوننگ کالج کی پرنسپلی کی خدمت انجام دینے کے بعد ایک امدادی کالج انوار العلوم کالج کی پرنسپلی قبول کی اور ڈیڑھ سو طلباء کے کالج کو ایک ہزار طلباء کا کالج بنا دیا۔

ایک مضمون ہمارا شمارہ میں اردو کی زبوں حالت کے تعلق سے شریک ہے اسمیں اعداد و شمار دے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ پہلے یہاں اردو زبان رائج تھی اب مدارس کی تعداد آزادی کے بعد گھٹ گئی اور اس کے برعکس مرہٹواڑہ میں ان اضلاع کے سوا جو ریاست حیدرآباد میں شامل تھے وہاں مدارس اور ان میں شرکت کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے ایسے کئی طلبہ ہیں جو اردو مادری زبان رکھتے ہوئے مرہٹی ذریعہ تعلیم سے تعلیم پانے پر مجبور ہیں اور یہ دستور کے بالکل مغایر ہے حکومت مہاراشٹر کو دستور کو پیش نظر رکھتے ہوئے اردو مادری زبان رکھنے والے طلبا کو اردو ذریعہ تعلیم کی سہولتیں دینے کا بندوبست کرنا چاہیئے تاکہ دستور کا منشا بھی پورا ہو اور طلبا اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر سکیں۔

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ رائے جانکی پرشاد صاحب نے ۱۵ نومبر کی رات میں انتقال کیا رائے صاحب حیدرآبادی تہذیب و تمدن کے نمائندے تھے عرصہ دراز سے ادارہ ادبیات اردو کے نائب صدر کے عہدہ پر فائز تھے ادارہ کے ٹرسٹ کے قیام کے بعد وہ ٹرسٹی بھی منتخب ہوئے انجمن ترقی اردو حیدرآباد سے بھی وابستہ رہے اور اردو مجلس کے صدر تھے صاحب موصوف نے اپنی ملازمت کا آغاز دار الترجمہ سے کیا جہاں انھیں مولوی عبد الحق (بابائے اردو) وحید الدین سلیم علی حیدر طباطبائی اور دوسرے علما کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا محکمہ اطلاعات کی نائب نظامت سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہونے کے بعد وہ اردو کی خدمت کے ساتھ ساتھ انڈین کانفرنس آف سوشیل ورکس کا کام بھی انجام دیتے رہے وہ ہمیشہ شیروانی اور ٹوپی میں رہتے اور اپنی اس وضعداری کو آخر تک نباہتے رہے وہ ہندو مسلم اتحاد کے نقیب تھے اور حیدرآباد کی روایت کو قائم رکھنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا خدا ان کی روح کو شانتی عطا کرے اور ان کے پسماندگان کو توفیق صبر۔

پروفیسر سید علی اکبر

عہدِ عثمانی میں تعلیم کی ترقی [1]

اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر نے ریاست حیدرآباد پر ۳۷ سال تک حکومت کی اس طویل
[دو]ر میں انتظامی امور کے مختلف شعبوں میں بہت دور رس اصلاحیں کی گئیں انیسویں صدی کے وسط تک ریاست
[کا] نظام جاگیردارانہ تھا۔ سالار جنگ اول کے دورِ صدر المہامی میں ریاستی نظم و نسق کے ڈھانچہ میں ایک حد تک تبدیلیاں
[کی گئیں] لیکن ریاست کو عصری بنانے کا کام آصف سابع کے لئے مقدر کیا گیا تھا آپ نے یہ محسوس کیا کہ توسیع و اشاعت
[تعلی]م کے بغیر اس کام میں کامیابی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے تعلیم کے فروغ پر اپنی پوری توجہ کو مرکوز کر دیا۔

[ریا]ست میں تعلیم کا تاریخی پس منظر ۱۹۱۱ء سے پہلے ریاست حیدرآباد میں تعلیم کی کیا حالت تھی اس کا جاننا اس
[لئے ض]روری ہے کہ اس کی روشنی ہی میں ہم آصف سابع کے دورِ حکومت (۱۹۱۱ء۔ ۱۹۴۸ء) میں جو تعلیمی ترقی ہوئی اس کا
[اندا]زہ صحیح طور پر کر سکیں گے۔ ۱۸۶۸ء میں محکمہ تعلیمات کا قیام عمل میں آیا اور اشاعت تعلیم کو حکومت کے اہم فرائض
[میں ت]سلیم کیا گیا۔ ہر صوبہ کے لئے ایک مہتمم تعلیمات اور اس کے ماتحت ہر ضلع کیلئے ایک ناظر کا تقرر کیا گیا۔ ابتدائی اور
[ثانو]ی تعلیم کی توسیع کے لئے اورنگ آباد، ورنگل اور گلبرگہ میں نیز حیدرآباد اضلاع کے مستقروں پر فوقانی مدارس قائم کئے گئے۔
[ہر ع]لاقہ میں ایک وسطانیہ اور آبادی زیادہ رکھنے والے قصبوں میں تحتانیہ مدارس کھولے گئے شہر حیدرآباد میں انگریزی کے
فوقانی مدارس پہلے ہی سے موجود تھے مثلاً چادرگھاٹ ہائی اسکول، مدرسہ عالیہ اور امدادی مدارس میں سینٹ جارجس
[گرامر] اسکول، محبوب کالج اور آل سینٹس انسٹی ٹیوٹ ہے ۱۸۸۷ء تک کوئی ایسا فوقانیہ مدرسہ نہ تھا جہاں لڑکیاں ثانوی تعلیم
[پاتی]ں اس سال زنانہ مڈل اسکول نامپلی قائم کیا گیا جس کو ۱۹۰۸ء میں فوقانیہ کا درجہ دیا گیا اور اس سال محبوبیہ
اسکول کا بھی افتتاح ہوا۔ ۱۹۱۱ء سے پہلے جو تعلیمی ادارے قائم تھے۔ ان میں نارمل اسکول حیدرآباد شامل تھا جس میں
[تح]تانیہ کے اساتذہ کو تدریس کی تربیت دی جاتی تھی اس کے علاوہ ایک مدرسہ انجینیرز ایک مدرسہ طبیہ ایک
[مدرسہ] قانون اور تین صنعتی مدارس قائم تھے ریاست صرف دو کالجوں پر فخر کر سکتی تھی ایک نظام کالج جو مدراس یونیورسٹی
[سے ملحق] تھا اور دوسرا دار العلوم جو ۱۸۵۳ء میں قائم ہوا اور جو پنجاب یونیورسٹی کے علوم مشرقیہ کے امتحانات کے لئے امیدواروں

---

[1] علی اکبر صاحب سابق ناظم تعلیمات کے اس مضمون کا ترجمہ جو کچھ عرصہ قبل گاندھی میڈیکل کالج کے مجلہ میڈیکو میں شائع ہوا۔

کو تیار کیا جاتا تھا بعد میں یہ ادارہ اپنے امتحانات خود منعقد کرنے لگا سنہ ۱۹۱۱ء میں نظام کالج میں تعداد طلبہ (۱۵۳) اور دارالعلوم میں (۱۳۵) تھی سنہ ۱۸۷۷ء میں انگریزی میں اعلیٰ تعلیم کی توسیع کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا تھا چادر گھاٹ ہائی اسکول کو کالج کا درجہ دے کر اس کا نام حیدرآباد کالج رکھا اور اس کے پرنسپل مسز سروجنی نائیڈو کے والد ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیائے مقرر کئے گئے تھے سنہ ۱۸۸۷ء میں مدرسہ عالیہ کے قیام کے بعد حیدرآباد کالج کو اس فوقانیہ مدرسہ میں ضم کر دیا گیا اور کالج کو نظام کالج کا نام دیا گیا سنہ ۱۹۱۰ء میں جملہ ۱۰۳۶ مدارس اور ۴۸۴۶۶ طلبا تھے ان اعداد سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ریاست تعلیمی اعتبار سے کس قدر پیچھے تھی۔ اس سال تعلیم کا موازنہ بھی ۱۴ لاکھ سے زائد نہ تھا۔

۱۹۱۱ تا ۱۹۲۱ میں تعلیمی ترقی نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے دور ہی میں یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ تعلیم کو مزید اہمیت اور ترقی دینے کی سخت ضرورت ہے اس سلسلے میں جو اہم قدم اٹھایا گیا وہ یہی تھا کہ سنہ ۱۹۱۱ء میں مسٹر لے ٹی میہیو آئی، ای، ایس کا دو سال کے لئے بحیثیت مشیر تعلیم تقرر کیا گیا انھوں نے سنہ ۱۹۱۲ء میں اپنی رپورٹ پیش کی اور سنہ ۱۹۱۵ء تک ان کی متعدد سفارشات روبہ عمل لائی گئیں ان سفارشات میں مدارس کے لئے ایک صدر مہتمم لڑکیوں کے مدارس کے لئے ایک مہتمم اور ہر ضلع کے لئے ایک مہتمم تعلیمات کا تقرر تحتانی اور وسطانی جماعتوں کے لئے نصاب کی نظر ثانی، نارمل اسکول حیدرآباد کی تنظیم جدید عہدہ داروں کے لئے امتحان زباندانی کا لزوم اور ضابطہ تعلیمات کی ترتیب شامل تھی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں تحتانی تعلیم کی توسیع کیلئے ایک اسکیم منظور کی گئی جس کے نتیجہ کے طور پر سنہ ۱۹۱۱ء اور سنہ ۱۹۲۱ء کی درمیانی مدت میں تحتانی مدارس کی تعداد (۳۰۸۰) اور طلبا کی تعداد ایک لاکھ بیالیس ہزار تک پہنچ گئی سنہ ۱۹۲۲ء میں تحتانی تعلیم پانے والوں کی تعداد میں مزید اضافہ اس وجہ سے ہوا کہ حضرت حضور نظام کے ایک فرمان کے ذریعہ تحتانی تعلیم کو مفت قرار دیا گیا

نواب میر عثمان علی خاں بہادر مرحوم کی تخت نشینی کے وقت نسوانی تعلیم کا معیار نہایت پست تھا سنہ ۱۹۱۱ء میں صرف نو ۹ مدارس تھے لیکن سنہ ۱۹۲۱ء میں ان کی تعداد ۸۰ تک پہنچ گئی۔ نسوانی تعلیم کی توسیع کے سلسلے میں بڑی رکاوٹ تربیت یافتہ استانیوں کی کمی تھی۔ اس دشواری کو حل کرنے کیلئے سنہ ۱۹۱۹ء اور سنہ ۱۹۲۰ء کے درمیان چار ٹریننگ اسکول حیدرآباد، ورنگل، اورنگ آباد اور گلبرگہ میں کھولے گئے جن میں ترتیب وار تحتانیہ مدارس میں اردو، تلنگی، مرہٹی اور کنڑی زبانوں میں تعلیم دینے والی استانیوں کو تربیت دی جاتی تھی ایسا ہی انتظام مدارس تحتانیہ ذکور میں پڑھانے والے اساتذہ کیلئے بھی متذکرہ مقامات پر کیا گیا۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں پانچ صدر مہتمان کی جائیدادیں قائم کی گئیں ایک مستقر حیدرآباد اور چار صوبوں کیلئے ایک ایک۔ پہلے مدارس فوقانیہ دو قسم کے تھے ایک انگریزی ذریعہ تعلیم کے ہائی اسکول جو مدراس یونیورسٹی کے امتحان یا کیمبرج کے لوکل امتحانات کے لئے طلباء کو تیار کرتے دوسرے فوقانیہ مدارس جو منشی (فارسی) اور مولوی (عربی) کے امتحانات کیلئے طلبا کو تیار کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کے امتحان کا قیام انگریزی فوقانی مدارس کو مقبول بنانے

کا سبب تھا جو عرصہ دراز سے مدراس یونیورسٹی کے میٹرکولیشن کے امتحان کی وجہ سے بُری طرح متاثر ہو رہے تھے اور طلبا
انٹرمیڈیٹ کے فوقانی مدارس زیادہ کامیاب ثابت نہ ہو سکے تھے اس لئے ۱۹۱۵ء تک فوقانیہ مدارس کے سوائے باقی سب کو وسطانی مدارس کا درجہ دیا گیا
۱۹۱۱ء تا ۱۹۲۱ء کے درمیان اسّی ثانوی مدارس کھولے گئے اور ثانوی مدارس کے طلباء

طلباء کی تعداد میں ۵۰ فیصد کا اضافہ ہوا۔ جامعہ عثمانیہ ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ کے قیام سے سابق ریاست حیدرآباد کی تعلیمی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا یہ جامعہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی جامعہ تھی مسٹر اکبر حیدری معتمد تعلیمات تھے نے جو بعد میں رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کہلائے حضور نظام کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی جس میں اجنبی ذریعہ تعلیم کے نظام تعلیم کے نقائص کو بتلایا گیا مثلاً طلباء کے ذہن پر غیر ضروری بار بجائے نفس مضمون کے اجنبی زبان پر قدرت حاصل کرنے کی کوشش میں طلبہ کے عزیز وقت کی تضیع ان کی ذہنی صلاحیتوں کی پامالی طلبا نیں کی ، اپنے ہم وطنوں کو ان کی مادری زبان میں مفید معلومات بہم پہونچانے کی عدم صلاحیت اور اس کی وجہ سے عوام اور تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک ناقابل عبور خلیج کی تخلیق بنا برآں موصوف نے حیدرآباد میں ایک ایسی جامعہ کے قیام کی تجویز پیش کی جس کا نام جامعہ عثمانیہ ..... ہو۔ اور جس کا ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ جو ریاست کی سرکاری زبان ہونے کے علاوہ عوام میں سب سے زیادہ سمجھی اور بولی جانے والی زبان تھی ساتھ ہی انگریزی کو لازمی ثانوی زبان کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی سفارش کی گئی حضور نظام نے اپنے فرمان کے ذریعہ اس تحریک کو منظور کرتے ہوئے اس توقع کا اظہار کیا کہ توسیع علم کے ساتھ ساتھ طلباء کی اخلاقی تربیت بھی ہوگی اور سائنسی علوم میں تحقیقاتی کام بھی کیا جائیگا جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لئے جو پہلا قدم اٹھایا گیا وہ اسی غرض کے لئے دارالترجمہ کا قیام تھا کہ مختلف مضامین کی تعلیم کیلئے درسی کتب مہیا کی جاسکیں اور ان کا اردو میں ترجمہ ہوسکے جامعہ عثمانیہ کی طرف سے میٹرکولیشن کا پہلا امتحان ۱۹۱۸ء میں منعقد ہوا اور ۱۹۱۹ء میں کلیہ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا ۱۹۲۱ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۲۳ء میں بی اے کا پہلا امتحان ہوا ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۹ء کے درمیان کلیہ قانون کھولا گیا۔ اور انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کا سٹی ہائی اسکول، زنانہ ہائی اسکول نامپلی اور مدارس فوقانیہ اورنگ آباد اور ورنگل میں اضافہ کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں انگلش ہائی اسکول گلبرگہ اور مدرسہ فوقانیہ گلبرگہ کا انضمام عمل میں آیا اور اس نئے ادارے میں انٹرمیڈیٹ کلاسس کھول دی گئیں۔ اس کے ایک سال بعد نامپلی زنانہ انٹرمیڈیٹ کالج کو درجہ اول کا کالج قرار دیا گیا اور اس کا نام کلیہ جامعہ عثمانیہ برائے اناث رکھا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں جامعہ عثمانیہ کے تحت پہلا پیشہ ورانہ کالج قائم ہوا۔ طبی مدرسہ کہ جو اسسٹنٹ سرجن اور سب اسسٹنٹ سرجن کی جائیدادوں کے لئے امیدواروں کو تیار کرتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے حوالہ کیا گیا اور اسکو کالج کا درجہ دے کر عثمانیہ طبی کالج کے نام سے موسوم کیا گیا ۱۹۲۸ء میں جامعہ عثمانیہ میں شعبہ جات انجینیرنگ اور شعبۂ تعلیم کا افتتاح عمل میں آیا اس کے چند سال بعد زرعی کالج برائے تعلیم علاج حیوانات بھی کھولے گئے ۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے کوئی پندرہ سال بعد تک بھی جامعہ توپ کے سانچہ میں کرایہ کی عمارتوں میں کام کرتی رہی ۱۹۳۴ء میں اڈک میٹ میں ۱۵۰۰ ایکڑ کے ایک رقبہ کو جامعہ عثمانیہ کی عمارات کے لئے منتخب اور حاصل کیا گیا اسی سال حضور نظام نے آرٹس کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد بنفس نفیس رکھا یہ عمارت ڈیڑھ کروڑ روپے کے صرفہ سے بنائی گئی اس میں ہندو مسلم دونوں طرز تعمیر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اس عمارت کے تکمیل پانے تک عارضی عمارت میں آرٹس کالج انجینرنگ کالج، دفاتر جامعہ اور دارالترجمہ کام کرتے رہے۔

۴ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو اعلیٰ حضرت مرحوم نے آرٹس کالج کی عمارت کا افتتاح فرمایا اس موقع پر یونیورسٹی کونسل اور انجمن اتحاد طلباء کی جانب سے جو سپاس نامے پیش کئے گئے تھے۔ ان کا جواب دیتے ہوئے حضور نظام نے جو تقریر فرمائی اس سے ان کے جامعہ سے گہرے تعلق خاطر کا اظہار ہوتا ہے انھوں نے ارشاد فرمایا کہ "جامعہ عثمانیہ ان کے دور حکومت کا ایک شاندار کارنامہ ہے انھوں نے اس توقع کا اظہار کیا کہ جامعہ عثمانیہ نہ صرف حیدرآبادی ثقافت کی بہترین روایتوں کا خزینہ بنے گی بلکہ حیدرآبادی تہذیب و شائستگی کا بہترین نمونہ بھی اس کے علاوہ وسیع النظری باہمی ارتباط اور طلباء کے اتحاد کی وہ ایک انمول مثال قائم کرے گی۔ عمارت کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ اس عمارت میں ہندو مسلم طرز تعمیر کو اس طرح سمو دیا گیا ہے جس طرح کہ ریاست میں یہ دونوں فرقے ایک عرصہ دراز سے شیر و شکر رہے ہیں انھوں نے اساتذہ جامعہ کو ہدایت فرمائی کہ ان کا سب سے اہم فریضہ یہ ہوگا کہ وہ طلباء کے مختلف فرقوں کو آپس میں مل جل کر اتحاد و یگانگت سے رہنا اور تعلیم حاصل کرنا سکھلائیں۔

۱۹۳۴ء میں اقامت خانہ الف اور ب تعمیر ہوئے سائنس کالج کی عمارت چند سال بعد تعمیر کی گئی انجینرنگ کالج کی موجودہ عمارت ابتداً عثمانیہ ٹکنیکل کالج کے لئے بنائی گئی تھی لیکن ۱۹۴۲ء میں حکومت نے اسے انجینرنگ کالج کو دینے کا تصفیہ کیا۔

۱۹۴۷ء میں جامعہ کے انتظامی امور میں ایک اہم تبدیلی کی گئی پروفیسر عبدالرحمٰن خاں صاحب ۱۹۲۴ء سے کلیہ جامعہ عثمانیہ کے پرنسپل تھے ان کے وظیفہ پر علحدہ ہونے کے بعد پرنسپل کے عہدہ کو پرو وائس چانسلر کے عہدہ سے بدل دیا گیا اور اس خدمت پر ڈاکٹر لے ایچ میکرسی کا تقرر عمل میں آیا ان کے بعد ۱۹۴۸ء تک پروفیسر قاضی محمد حسین پرو وائس چانسلر رہے پھر اس جگہ کو وائس چانسلری میں تبدیل کر دیا گیا اس سے قبل وزیر تعلیم بلحاظ عہدہ وائس چانسلر ہوتے تھے۔ نواب اعظم جنگ بہادر پہلے ہمہ وقتی وائس چانسلر تھے ان کے بعد اس خدمت پر ڈاکٹر ولی محمد کا تقرر عمل میں آیا۔ جامعہ کی ابتداء ایک کالج اور ۱۲۹ طلباء سے ہوئی تھی۔ ۱۹۴۸ء تک کالجوں کی تعداد ۱۴ ہو چکی تھی اور طلباء کی تعداد (۱۰۰۰۰) دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔

نظام کالج جامعہ عثمانیہ کے قیام سے نظام کالج کی حیثیت غیر متاثر رہی اور اسکو پہلے کی طرح الحاق کر دی گئی

کی روایات کے ساتھ ان طلباء کی خاطر جو انگریزی ذریعہ تعلیم کو ترجیح دیتے تھے قائم رکھا گیا جہاں جامعہ عثمانیہ کی جونیر انٹرمیڈیٹ کلاس میں داخلہ کے لئے عثمانیہ میٹرک یا ایچ۔ ایس۔ ایل سی میں محض کامیاب ہونا کافی تھا وہیں نظام کالج کی جونیر انٹرمیڈیٹ کلاس میں داخلہ کے لئے ایچ۔ ایس۔ ایل سی میں درجہ دوم میں کامیابی ضروری تھی اس کے قطع نظر نہایت کارکرد قسم کے اسٹاف کی وجہ سے نظام کالج کو اپنا تعلیمی معیار کافی بلند رکھنے میں مدد ملی سنہ ۱۹۲۰ء میں سائنس کی تعلیم کے لئے ایک کافی وسیع عمارت تعمیر کی گئی تھی اس سال طبیعات و کیمیا میں بی۔ ایس سی کی جماعتیں کھول دی گئیں ۱۹۲۵ء میں نباتیات و حیوانیات کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا ۱۹۲۳ء میں بی اے آنرز کی جماعتیں کھولی گئیں اور کوئی پندرہ سال بعد ایم۔ اے کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ۱۹۳۹ء سے طالبات کو بھی اس کالج میں داخلہ دیا جانے لگا۔

مدراس یونیورسٹی کے امتحانات میں نظام کالج کے نتائج عموماً اچھے رہتے تھے۔ تعلیمی اعتبار سے امتیاز حاصل کرنے کے علاوہ اسپورٹس اور کھیلوں کے میدان میں بھی نظام کالج نے اپنی روایتی شہرت قائم رکھی۔

۱۹۴۷ء میں نظام کالج کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے قطع کر کے اس کا الحاق بہ حیثیت اسوسی ایٹیڈ کالج جامعہ عثمانیہ سے کر دیا گیا اور الحاق کے بعد بھی انگریزی ذریعہ تعلیم کو برقرار رکھا گیا کالج میں طلباء کی تعداد ۱۹۱۱ء میں (۱۱۲) تھی ۱۹۲۱ء میں (۳۰۰) ہو گئی اور ۱۹۴۷ء میں (۷۰۰) تھی۔

ثانوی تعلیم کی تنظیم جدید و ترقی

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے ساتھ ہی ثانوی تعلیم کی تنظیم جدید بھی ضروری ہو گئی تھی فوقانی مدارس دو قسم کے تھے عثمانیہ اور انگریزی مدارس فوقانیہ عثمانیہ میں ذریعہ تعلیم اردو تھا اور انگریزی تعلیم بحیثیت لازمی زبان دوم دی جاتی تھی ابتداء میں عثمانیہ میٹرک کا نصاب دو سالہ تھا لیکن ۱۹۲۵ء میں ایچ۔ ایس۔ ایل سی نصاب سے مماثلت کی خاطر اس کو سہ سالہ کر دیا گیا ۱۹۱۷ء سے ۱۹۳۹ء تک (۲۳) نئے فوقانی مدارس کھولے گئے ان میں سے ایک جاگیردار کالج بھی تھا۔ ۱۹۲۳ء میں اس اقامتی فوقانیہ مدرسہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ یہ جاگیرداروں کے بچوں کیلئے مختص تھا۔ اور اس کے اخراجات کے لئے جاگیروں سے ان کی آمدنی کے تناسب سے ایک مقررہ محصول وصول کیا جاتا تھا محبوبیہ گرلز اسکول کی طرح جاگیردار کالج میں بھی کیمبرج یونیورسٹی کے لوکل امتحانات کے لئے طلباء کو تیار کیا جاتا تھا۔

تحتانوی تعلیم کی توسیع کا پنجسالہ منصوبہ

جامعاتی اور ثانوی تعلیم کی جو توسیع ۱۹۱۸ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان ہوئی وہ تحتانوی تعلیم کے لئے نقصان رساں ثابت ہوا۔ اس لئے کہ اس طرف توجہ کم ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس مدت میں جو تحتانیہ مدارس کھولے گئے ان کی تعداد صرف (۲۹۱) تھی ۳۶-۱۹۳۷ء کی محکمہ تعلیمات کی رپورٹ پر حکومت نے جس رائے کا اظہار کیا اس میں اس امر کا اعتراف کیا گیا کہ اونچے درجوں پر اخراجات کافی ہو رہے ہیں اور یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ تعلیمی عمارت ایسی ہونی چاہئے کہ جس کا نچلا حصہ چوڑا اور

اوپر کا حصہ تکمیل ہو چنانچہ ۱۹۳۹ء میں حکومت تحتانوی تعلیم کی توسیع کے لئے ایک پنجسالہ پروگرام منظور کیا اس پروگرام کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ جملہ لوکل فنڈ مدارس کو سرکاری بنا دیا گیا اور لوکل فنڈ سے جو رقم ان پر خرچ کی جاتی تھی اسے عمارتوں کی تعمیر اور فرنیچر کی خریدی کے لئے مختص کر دیا گیا اس پروگرام پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۴ء کی مدت میں تحتانوی مدارس کی تعداد (۴۸۴۲) سے بڑھ کر (۵۳۴۸) ہو گئی۔

مابعد جنگ ترقی کا منصوبہ

۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک مابعد جنگ ترقی کے منصوبہ کے تحت تحتانوی تعلیم کی توسیع کے کام میں اور بھی زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی اس مدت میں (۶۰۰) سے زیادہ تحتانوی مدارس کھولے گئے ۱۹۴۷ء میں چھ شہری علاقوں میں بشمول حیدر آباد اور چار دیہی علاقوں میں تحتانوی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا صرف اسی ایک سال کی مدت میں طلبار کی تعداد میں (۳۵۵۰۰) کا اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ (۳۰۰) دیہاتوں میں اسکول کمیٹیوں کا قیام عمل میں آیا ان کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ والدین کو تلقین کریں کہ اپنے بچوں کو پابندی سے مدرسہ بھیجیں اور تحتانوی نصاب کی تکمیل سے پہلے تک ان کو مدرسہ میں شریک رکھیں تحتانوی تعلیم کی توسیع کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ ثانوی تعلیم کی مانگ بڑھ گئی اس مطالبہ کی تکمیل کے لئے ثانوی تعلیم کی سہولتوں میں اضافہ کیا گیا چنانچہ ۱۹۴۳ء میں جبکہ (۲۵۳) ثانوی مدارس قائم تھے ۱۹۴۷ء میں یہ تعداد بڑھ کر (۲۹۰) ہو گئی اور اسی مدت میں ثانوی مدارس کے طلبار کی تعداد میں (۱۴۵۰۰) کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۶ء میں وسطانیہ جماعتوں میں بھی تعلیم مفت قرار دی گئی۔

شروع ہی سے حکومت کی یہ پالیسی رہی تھی کہ طبقہ تحتانیہ میں ذریعہ تعلیم بچے کی مادری زبان ہو۔ ۱۹۴۶ء میں حکومت نے احکام نافذ کئے کہ امدادی اور مسلمہ سرکار ثانوی مدارس جماعت میٹرک تک اردو کے علاوہ کسی بھی ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا سکتے ہیں بشرطیکہ اردو زبان زائد کی حیثیت سے طلبہ کو پڑھائی جائے اور ایسی طالبات کو بھی جو جامعہ عثمانیہ میں شرکت کی خواہاں ہوں عوام کے ایک بڑے حصہ کو اس اصلاح سے پوری تشفی نہیں ہوئی اور اس کا مطالبہ تھا کہ سرکاری مدارس ثانویہ میں بھی ملکی زبانیں ذریعہ تعلیم قرار دی جائیں ان کا مطالبہ واجبی تھا لیکن اس امر کا بھی اعتراف ضروری ہے کہ حکومت نے جو اقدام کیا اس کی سابقہ پالیسی کے مقابلہ میں کہیں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں عثمانیہ کالج آف ایجوکیشن کے علاوہ جملہ (۱۲) ٹریننگ اسکول قائم تھے۔

صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم

۱۹۳۵ء تک عثمانیہ ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے علاوہ جس کا قیام ۱۹۲۲ء میں عمل میں آیا تھا اور جسے بعد میں کالج کا درجہ دے دیا گیا تھا پوری ریاست میں تقریباً نصف درجن صنعتی مدارس تھے۔ اور وہ بھی مابعد تحتانوی ریاست میں صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم میں اصلاح و ترقی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ۱۹۳۵ء میں حکومت نے اس کے لئے ایک علحدہ محکمہ قائم کیا اور مسٹر لمعا یبٹ کو جو سابق میں انگلستان کے چیف انسپکٹر آف ٹکنیکل اسکولس تھے، دعوت دی کہ وہ ریاست میں ٹکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم

کی توسیع و ترقی کے لئے رپورٹ اور ماہرانہ مشورہ اور سفارشات پیش کریں مسٹر ایبٹ کی سفارشات کے بموجب ما بعد تحتانوی ما بعد وسطانوی اور ما بعد فوقانوی ٹکنیکل تعلیم کے لئے گنجائش فراہم کی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں (۲۲) ٹکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیمی ادارے تھے یعنی عثمانیہ ٹکنیکل کالج، سنٹرل اسکول آف کامرس، سنٹرل اسکول آف آرٹس اینڈ کرافٹس، اسکول آف فائن آرٹس لڑکوں کے لئے دو ٹکنیکل فوقانی مدارس لڑکیوں کے لئے پیشہ ورانہ تعلیم کے دو فوقانی مدارس (۱۲) ما بعد تحتانوی صنعتی مدارس برائے ذکور اور (۴) ما بعد تحتانوی مدارس برائے اناث اس کے علاوہ پربھنی میں ایک زرعی اسکول کے قیام کے لئے قدم اٹھایا گیا۔

۱۹۴۲ء میں ٹکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کے محکمہ کا محکمہ تعلیمات میں انضمام عمل میں آیا۔

تعلیم بالغان ۱۹۲۶ء میں تعلیم بالغان کا آغاز حیدرآباد میں تین مدارس برائے تعلیم بالغان کے قیام سے ہوا تعلیم بالغان کی ترقی کی رفتار نسبتاً سست تھی ۱۹۴۵ء تک جملہ تعلیم بالغان کے مدارس کی تعداد (۱۱۵) تھی اور ان میں طلباء کی تعداد (۳۰۰۰) تھی اس کے دوسرے سال حکومت نے ایک اسسٹنٹ انسپکٹر برائے تعلیم بالغان کا تقرر کیا اور توسیع و ترقی تعلیم بالغان کے لئے (۵۰۰۰۰) روپے کے متوالی اخراجات اور (۷۵۰۰۰) ہزار روپے کے غیر متوالی اخراجات کی منظوری صادر فرمائی اسکیم کے تحت ایک سال کے اندر مدارس بالغان کی تعداد میں (۲۲۶) کا اضافہ ہوا۔

عہد عثمانی میں تعلیم کے میدان میں جو دوسری نمایاں ترقیاں ہوئیں بوائے اسکاؤٹ اور گرل گائیڈ تنظیمیں تھیں جو علی الترتیب ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۵ء سے شروع کی گئیں ۱۹۳۰ء میں کلیہ تعلیم جسمانی کا قیام عمل میں آیا غریب اور مستحق طلباء کے لئے رعایتی وظائف کی ایک نئی اسکیم شروع کی گئی ۱۹۳۴ء میں کور دکر و گونگے بچوں کی تعلیم کے لئے اسکول قائم کیا گیا ۱۹۴۱ء میں بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن یعنی مجلس تعلیم ثانوی کا قیام عمل میں آیا۔ انگریزی سائنس اور دستکاری کے لئے علاحدہ انسپکٹر مقرر کئے گئے اور ہریجن بچوں کی تعلیم کی نگرانی کے لئے ایک خصوصی انسپکٹر کا بھی تقرر کیا گیا۔

نواب میر عثمان علی خاں بہادر مرحوم کے عہد میں غیر معمولی تعلیمی ترقی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۱۱ء میں جب آپ تخت نشین ہوئے (۱۰۳۶) مدارس تھے اور طلباء کی تعداد (۴۸۴۶۶) تھی اس کے مقابلہ میں ۱۹۴۷ء میں مدارس کی تعداد (۲۷۰۰) اور طلباء کی تعداد زائد از (۵) لاکھ ہو گئی ۱۹۱۱ء میں تعلیمات پر مصارف (۱۴) لاکھ تھے اور ۱۹۴۷ء میں تین کروڑ تجاوز

ریاست میں تعلیمی ترقی کی رفتار اور زیادہ ہوتی اگر ریاست میں جاگیریں نہ ہوتیں جن کا رقبہ ریاست کے رقبہ کا تقریباً ایک تہائی تھا۔ جاگیری رقبہ اور ریاستی رقبہ میں تعلیمی حالت کا اندازہ اس فرق سے بہت زیادہ نمایاں ہوتا ہے کہ جاگیری رقبہ میں ہر پچاس مربع میل کے لئے ایک اسکول تھا اور ریاستی رقبہ میں ہر ۱۰ مربع میل کے لئے ایک اسکول۔

خود اعلیٰ حضرت آصف سابع فارسی اور عربی کے عالم تھے اور اردو فارسی کے مشہور شاعر اسی وجہ سے انھوں نے

ضرورت مند شاعروں اور ادیبوں کی ریاست کے اندر ہوں یا باہر سرپرستی فرمائی اور نہایت فراخ دلانہ طور پر انکو نوازا وہ ہر تعلیمی اسکیم میں دلچسپی لیتے اور اس کو روبعمل لانے کیلئے فراخدلی سے عطیات عطا کرتے تھے اس کے علاوہ انہوں نے ریاست سے باہر کے مشہور اور بڑے تعلیمی اداروں کی گرانقدر مالی امداد کی ان کی فیاضی سے مستفید ہونے والے اداروں میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، شانتی نکیتن، بنارس ہندو یونیورسٹی، عثمانیہ کالج کرنول، لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج، لیڈی ارون کالج دھلی اور انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور ہیں جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا تو انھوں نے ان کی یادگار کے طور پر مادر دکن وظیفہ فنڈ قائم فرمایا جس سے طالبات آج تک استفادہ کر رہی ہیں۔

فرمان روائے ریاست کی حیثیت سے علحدہ ہونے کے بعد بھی اعلیٰ حضرت تعلیم کی سرپرستی فرماتے رہے ۱۹۵۱ء میں انھوں نے پانچ کروڑ روپیوں کا ایک خیراتی ٹرسٹ قائم کیا جس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تعلیمی اداروں کی امداد کی جائے اور مستحق طلباء کو جو اندرون ملک یا بیرون ملک تعلیم پانا چاہیں وظائف دیئے جائیں سینکڑوں مدرسے اور کالج اور ہزاروں طلباء حضور نظام کے خیراتی فنڈ سے آج بھی مستفید ہو رہے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی طرح جو بجا طور پر اعلیٰ حضرت مرحوم کے دور حکومت کا شاندار کارنامہ سمجھا جاتا ہے حضور نظام کا نام ان کے خیراتی ٹرسٹ کی وجہ سے بھی باقی رہے گا ۲۴ رفروری ۱۹۶۷ء کو جس روز اعلیٰ حضرت نے انتقال فرمایا اور اس کے دوسرے دن جب کہ ان کا جنازہ اٹھا ماتم گساری اور سوگواری کے جو مناظر فراوانی سے دیکھنے میں آئے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ حیدر آباد کے باشندوں نے بلا تفریق مذہب و ملت ان کی جدائی کو اپنا شخصی نقصان تصور کیا۔

خدا اعلیٰ حضرت مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی روح کو سکون عطا کرے۔

ڈاکٹر سخی احمد ہاشمی

مولانا حالی کا ایک کمیاب[1] شخصی مرثیہ

۱۸۵۷ء کے رستخیز بے جا کے بعد سرسید کو اپنی قوم کی حالت درست کرنے کی بڑی فکر تھی اور اس کے لئے وہ تعلیم کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ مغرب نے علوم و فنون میں بڑی ترقی کی تھی۔ سرسید چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ایک ایسی درس گاہ کا قیام عمل میں آئے، جو مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرے اور وہاں قوم کے ہونہار طالب علم جدید علوم و فنون کو سیکھیں۔ سرسید جو کوشش کر رہے تھے اس کے متعلق مولانا حالی اس طرح لکھتے ہیں:-

"فروری ۱۸۷۳ء میں جو جلسہ صدر کمیٹی کا بنارس میں ہوا تھا اس میں سید محمود نے یہ بھی تحریک کی تھی کہ بہت جلد مقام مجوزہ میں ایک مدرسہ ماتحت مدرسۃ العلوم مجوزہ کے قائم کیا جائے چنانچہ ۱۲ر اگست ۱۸۷۳ء کو علی گڈھ میں جو سب کمیٹی کا جلسہ ہوا اور جس میں علی گڈھ اور بلند شہر کے اکثر رئیس اور معزز مسلمان شریک تھے۔ وہاں مولوی سمیع اللہ خاں سکریٹری سب کمیٹی اور سید محمود نے اپنی اسپیچوں میں مدرسہ ماتحت قائم کرنے کی دوبارہ تحریک کی پھر ۲۱ر دسمبر ۱۸۷۳ء کو دوسرا جلسہ علی گڈھ ہی میں ہوا اور مولوی سمیع اللہ خاں نے تقریر کرتے وقت کہا کہ مدرسۃ العلوم کی مخالفت روز بروز بڑھتی جاتی ہے اس کے رفع کرنے کی کوئی تدبیر اس سے بہتر نہیں کہ ایک ماتحت مدرسہ بطور نمونہ کے علی گڈھ میں قائم کیا جائے جس کے طریقہ تعلیم سے لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ جو تعلیم صدر کمیٹی بنارس نے تجویز کی ہے وہ کسی طرح اصول اسلام کے برخلاف نہیں ہے اس تجویز کو سب نے پسند کیا بعض علمائے اہل اسلام نے جو اس جلسہ میں شریک تھے طریقہ تعلیم کو جو سکریٹری نے اس وقت بیان کیا بلا محظور شرعی تسلیم کیا۔"[2]

جب مدرسہ قائم کرنا طے ہو گیا تو اس کے افتتاح کی تیاریاں شروع ہوئیں مولانا حالی اس کے متعلق اس طرح رقم طراز ہیں:

"۲۴ر فروری ۱۸۷۵ء جو کہ ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا مدرسہ کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی تاریخ مذکورہ پر سرسید بنارس سے علی گڈھ آ گئے اور ایک جلسہ میں جس کے صدر انجمن مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر علی گڈھ تھے رسم افتتاح عمل میں آئی اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے جماعت بندی ہو کر تعلیم شروع ہو گئی۔"[3]

۱۔ اس مرثیہ کا ذکر حالی کا ذہنی ارتقاء، از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، حالی بحیثیت شاعر از ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی دیوان حالی اور کلیات حالی اور حالی کے متعلق دوسری کتابوں میں نہیں ہے۔ ۲۔ حیات جاوید از حالی مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ ۱۹۲۳ء طبع سوم صفحہ ۱۲۸ ۳۔ ایضاً صفحہ ۱۲۸

مدرسہ تو قائم ہوگیا مگر اس کی عمارتوں کی تعمیر اور دیگر اخراجات کے لئے رقم کی ضرورت تھی اس لئے سرسید نے چندہ وصول کرنے کی مختلف تدبیریں اختیار کیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ سرسالار جنگ اول میر تراب علی خاں مختار الملک کی ایک تصویر بنوائی جس میں ان کو مدرسہ کی طرف متوجہ ہونے اور اس کی مالی اعانت کی ترغیب دی تھی۔ مولانا حالیؔ اس تصویر کی تیاری کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔

"انھوں نے مصور سے ایک تصویر بنوائی جس میں مسلمانوں کی حالت اور ان کے تنزل کی کیفیت محض تصویر کے ذریعہ سے ظاہر کی گئی تھی اس کی صورت یہ تھی کہ سرسید سمندر کے کنارے ایک درخت سے کمر لگائے حیران اور فکرمند کھڑے ہیں۔ اور اس سے کسی قدر فاصلے پر مختار الملک معہ دو مصاحبوں کے استادہ ہیں۔ سمندر میں طوفان آرہا ہے۔ جہاز میں بہت سے مسافر سوار ہیں اس کا مستول ٹوٹ گیا ہے اور وہ ڈوبا چاہتا ہے کچھ آدمی پانی میں گر پڑے ہیں اور ڈبکیاں لے رہے ہیں ایک کشتی جس میں کچھ آدمی سوار ہیں۔ ان ڈوبتوں کو بچانے کو جہاز کی طرف جا رہی ہے اس کے جھنڈی کے پھریرے پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہیں" ون لک ربیز "سرسید اس حیرت اور تشویش کی حالت میں کہہ رہے ہیں" ناٹ سفیشینٹ (یعنی یہ روپیہ کافی نہیں ہے) ایک فرشتہ آسمان سے اترا ہے جو ہوا میں معلق ہے اور ایک ہاتھ سے سرسید کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے نواب مختار الملک کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور سرسید سے کہتا ہے" لک ایٹ دس نوبل مین "یعنی اس شریف آدمی کو دیکھو۔

اس تصویر میں سمندر سے زمانہ مراد ہے اور جہاز سے مسلمانوں کی قوم کشتی جو جہاز والوں کی دستگیری کو جارہی ہے اس سے مدرستہ العلوم مراد ہے اس کے پھریرے پر جو" ایک لاکھ روپیہ "کا لفظ لکھا ہے اس سے وہ لاکھ روپیہ مراد ہے جو اس وقت مدرسہ کے لئے جمع ہوا تھا۔ سرسید گویا مسلمانوں کی سقیم حالت دیکھ کر اپنے دل میں یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے ابھارنے کے لئے ایک لاکھ روپیہ کافی نہیں ہے اس وقت خدا کی طرف سے ان کے دل میں یہ القا ہوتا ہے کہ نواب مختار الملک سے مدد مانگنی چاہئے فرشتہ کا ان کی طرف اشارہ کرنا اسی مضمون پر دلالت کرتا ہے۔

یہ تصویر نواب مختار الملک سید تراب علی خاں مرحوم کی خدمت میں بھیجی گئی اور وہ اس کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے سنا ہے وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اس تدبیر کے سوا کوئی دوسری تدبیر روپیہ مانگنے کی میرے دل پر موثر نہیں ہوسکتی تھی[1]

اس تصویر کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور مختار الملک سالار جنگ میر تراب علی خاں نے مدرستہ العلوم کی اپنی جیب خاص سے اور ریاست سے مالی اعانت کی اور یہ امداد حیدرآباد (دکن) سے ہمیشہ بڑھتی اور جاری رہی ہے۔

سرسالار جنگ اول کی حیدرآباد (دکن) میں حیثیت کے متعلق نظامی بدایونی، قاموس المشاہیر جلد اول میں اطرح

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹۔

لکھتے ہیں۔

نواب میر تراب علی خاں نام ہے۔ مختار الملک خطاب ۲۴ رجادی الثانی ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۹ء کو پیدا ہوئے سلسلۂ نسب اویس قرنی سے ملتا ہے ۱۸۴۷ء سے آپ کی سرکاری زندگی کا آغاز تعلقدار (دکن) کی حیثیت سے ہوا۔ ۱۸۵۳ء میں مغفور ناصر الدولہ بہادر بادشاہ دکن نے خلعت وزارت سے سرفراز فرمایا اس زمانے میں ریاست کی حالت نہایت خراب تھی آپ نے ایسا انتظام کیا کہ تمام خرابیوں کی اصلاح ہوگئی۔ ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء کے زمانے میں آپ نے نہایت دانشمندی کا برتاؤ کیا ریاست میں غدر کے زہریلے جراثیم کا اثر نہ ہونے دیا اور برٹش حکام کو ہر طرح مدد دی اس بیدار مغز وزیر پر کئی مرتبہ قاتلانہ حملے بھی کئے گئے لیکن یہ سب بے کار گئے آپ کے عہد میں میر محبوب علیخاں بہادر کم سنی کی حالت میں تخت نشین ہوئے اور ریاست کا انتظام ایک ریجنسی کے سپرد ہوا۔ آپ کے زمانے میں پرنس آف ویلز (شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم) ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں ہندوستان میں تشریف لائے۔ آپ نے نظام دکن کی طرف سے بمبئی جاکر شہزادہ موصوف سے ملاقات کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۸۷۶ء میں آپنے یورپ کی سیر کی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی نے ڈی سی۔ ایل۔ کی ڈگری عطا کی لندن میں ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کے سلام کا شرف حاصل کیا۔ علی گڑھ کالج کے آپ خاص معاونین میں تھے۔ کالج کا ڈائننگ ہال سالار منزل آپ کی فیاضی کی یادگار ہے[۱]

سر سالار جنگ، ریاست حیدر آباد کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ انکو کالج کی امداد کے لئے متوجہ کرنا اور امداد حاصل کر لینا بہت بڑی بات تھی۔ چنانچہ انھوں نے قومی کالج کی امداد کر کے قوم کی تعلیمی حالت کو درست کرنے میں بڑی مدد دی ان کی مالی اعانت مدرسہ کو کالج تک پہنچانے میں بڑی معین ومددگار ثابت ہوئی۔

ایسے ہمدرد قوم اور کالج کے مربّی کے دنیا سے اٹھ جانے پر علی گڑھ کالج کو بڑا صدمہ پہنچا اور کالج کے ارکان اور ہمدردوں کو بہت دکھ ہوا۔ مولانا حالی جو کالج کے خاص ہمدردوں، مخلصوں اور سرسید کے ساتھیوں میں تھے اس سانحہ سے بہت متاثر ہوئے اور اسی کیفیت میں فارسی میں ستائس اشعار کے ترجیع بند میں ایک مرثیہ لکھا یہ مرثیہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مع پروگریس میں شائع ہوا[۲]۔ گزٹ کی عبارت یہ ہے۔

مدرستہ العلوم مسلمانان علیگڈھ کے نامور لائق ممبر مولوی الطاف حسین حالی نے نواب سر سالار جنگ بہادر کی وفات کے متعلق چند اشعار بطور مرثیہ تحریر فرمائے جن کو ہم ذیل میں چھاپتے ہیں[۳]۔

۱؎ قاموس المشاہیر جلد اول مرتبہ نظامی بدایونی۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ ۱۹۲۴ء صفحہ ۲۷۸ ۲؎ علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ مع پروگریس۔ ۲۰ر فروری ۱۸۸۳ء صفحہ ۱۹۸، ۱۹۹ ۳؎ ایضاً

مولانا حالی نے پہلے مختار الملک کی مقبولیت کا ذکر کیا ہے کہ وہ ایسے شخص تھے کہ ہر شخص کی زبان پر ان کی تعریف تھی کہ اسکے میں ان کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ مولانا نے ناگہانی خبر کا بڑا اچھا اثر ڈالا ہے چنانچہ کہتے ہیں:-

داشت ہر کس بزبان مدحت مختار الملک　　کامد از در خبر رحلت مختار الملک

مختار الملک تو رخصت ہو گئے مگر ان کی روانگی کے بعد ان کے متعلقین پر مصیبت آ گئی۔

تا چہ افتاد پس ابنهفت مختار الملک　　بر سر ترکیب وجمیعت مختار الملک

پھر مولانا حالی موت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو مختار الملک کے بے جان جسم کو اگر خاک کے سپرد کر دے تو اس کے نام کو نہیں بھلا سکتی گویا اس کی خوبیاں زندہ اس کی نیکیاں باقی۔

اے اجل گر تن بے جان تہ خاکش سپری　　نتوانی کہ نکو نامیش از یاد بری

فوج اس کے ماتم میں بے حال ہو گئی اور ملک اس کی موت سے بالکل پژمردہ ہو گیا۔

لشکر از ماتم او چاک گریباں شدہ است　　کشور از مردن او یکسرہ پژماں شدہ است

مختار الملک کیا رخصت ہوئے کہ حیدر آباد ویران ہو گیا کیونکہ انھیں کے دم سے حیدر آباد میں رونق تھی اور ہر آنکھ اس حادثہ سے رونے والی ہو گئی۔

اے بسا چشم کزیں حادثہ گریاں شدہ است　　حیدر آباد تو گفتی ہمہ ویراں شدہ است

اس شعر کو پھر دہراتے ہیں کہ اے موت اگر تو بے جان جسم کو خاک کے سپرد کر دے لیکن اس کے نیک نام کو نہیں بھلا سکتی اس طرح رنج و غم کی کیفیت کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

اے اجل گر تن بے جان تہ خاکش سپری　　نتوانی کہ نکو نامیش از یاد بری

اس کے بعد مرحوم کی اصلاحات اور حیدر آباد کے مالی نظام کو مستحکم کرنے کا اشارہ بڑی خوبی سے کرتے ہیں

منتی ہست از و بر سر کار نظام　　کہ بشکر ش نتوان کرد بصد سال قیام

عدلیہ، مالیہ اور فوج کے نظام کو درست کرنے میں جو مرحوم کی خدمات ہیں ان کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔

ہم از و یافتہ، عدلیہ و مالیہ قوام　　ہم از و لشکر و ضبطیہ پذیرفت نظام

پھر موت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تو نے مرحوم کے بے جان جسم کو خاک کے سپرد کر دیا مگر اس کے نیک نام کو فراموش نہیں کر سکتی۔

اے اجل گر تن بے جان تہ خاکش سپری　　نتوانی کہ نکو نامیش از یاد بری

مسلمان قوم اور حیدر آباد کو جو دھکا پہنچا ہے اس کا مداوا نہیں ہو سکتا یہ ایسی مصیبت ہے کہ جس نے ملک کے ستون ہلا کر رکھ دیئے اس مفہوم کو بڑی خوبی سے ادا کرتے ہیں۔

آہ کیں دردنہ در دلیست کہ درماں دارد　　　ملک ازیں واقعہ صد لرزہ درارکاں دارد

قوم حیران ہے کہ اس مصیبت کے لانے میں آسمان کی کیا مصلحت ہے۔

قوم ازیں واقعہ انگشت بدنداں دارد　　　تا فلک درپس ایں پردہ چہ پنہاں دارد

پھر موت والے شعر کو دہراتے ہیں۔

اے اجل گر تن بے جان تہ خاکش سپری　　　نتوانی کہ نکو نامیش از یاد بری

اسلام کو اس سے بڑا سہارا تھا۔ اس کی موت سے اسلام کی آنکھ خون کے آنسو رو رہی ہے اور قوم کی حالت پہلے ہی کون سی اچھی تھی اب تو اور زبوں ہوگئی ہے چنانچہ کہتے ہیں:-

چشم اسلام ازیں قصہ بخوں تر گردید　　　ملت از حالت پیشینہ زبوں تر گردید

دین ویسے ہی کس مپرسی کی حالت میں تھا اب تو دین کا جھنڈا اور بھی جھک گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی میت اور قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی۔

علم دیں کہ نگوں بود نگوں تر گردید　　　قیمت خواجہ پس از مرگ فزوں تر گردید

اے موت تو نے بڑی خوبیوں والے کو مٹی میں چھپا دیا مگر اس کی خوبیوں کو نہیں چھپا سکتی

اے اجل گر تن بے جان تہ خاکش سپری　　　نتوانی کہ نکونامیش از یاد بری

دوست اور دشمن سبھی اس کی مدد اور اعانت کے طلبگار رہتے تھے اور وہ ملک کی بھلائی کی تدبیریں سوچا تھا اسی تدبیر نے ملک کو مضبوط بنائے ہوئے تھی اور اس کی ساکھ کو قائم کئے ہوئے تھی۔

دوست تا دشمن او زد طمع یاری داشت　　　کشور از نیروی تدبیرش استواری داشت

دولت اس کی وفادار اور قوم اس کے احسان سے گراں بار تھی۔

دولت عہد از وچشم وفاداری داشت　　　گردن قوم ز احسانش گراں باری داشت

اے موت تو نے ایسی خوبیوں والے شخص کو مٹی میں ملا دیا مگر تو اس کے نیک نام پر پردہ نہ ڈال سکے گی۔

اے اجل گر تن بے جان تہ خاکش سپری　　　نتوانی کہ نکونامیش از یاد بری

افسوس وہ عقل و کفایت جس کی مثال ملنا مشکل ہے اور افسوس! وہ سخاوت اور بخشش جو اس کے ساتھ رخصت ہوگئی۔

آہ از آں عقل و کفایت کہ نہ بینیش مثال　　　آہ از آں بذل و سماحت کہ نہ یابیش ہمال

ہندوستان سے ایسی خوبیوں کا آدمی سو سال تک پیدا ہونے کی امید نہیں خصوصاً مسلمان قوم سے جس میں قحط الرجال پہلے ہی اچھے آدمیوں کی کمی) ہو۔

سپس از ہند چنیں مرد نہ خیزد صد سال　　　خاصہ از قوم کہ افتاد در آں قحط رجال

اے موت تونے اس خاکی جسم پر تو پردہ ڈال دیا مگر اسکی نیک نامی پر پردہ نہیں ڈال سکتی۔

اے اجل گرتن بے جان تہ خاکش سپری　　　　نتوانی کہ نکو نامیش از یاد بری

علی گڈھ کالج پر مرحوم کے فیض کی بارش تھی اسی تعلق سے مولانا نے مرحوم کا مرثیہ لکھا تھا لہذا مرثیہ میں اس قومی کالج کا ذکر ناگزیر تھا۔ اسلئے علی گڈھ کی درسگاہ اور اس کے بانیوں (سرسید، مولوی سمیع اللہ خاں وغیرہ) کا تذکرہ صرف ایک لفظ عزیزاں میں بڑی خوبی سے کیا ہے لکھتے ہیں :-

علی گڈھ میں عزیزوں نے ایک درسگاہ کی بنیاد ڈالی اس کے پھل طوبیٰ سے بھی زیادہ پھلے

در علی گڑھ کہ نہادند عزیزاں بنیاد　　　　درسگاہے کہ ز طوبی ثمرش باد زیاد

جب تک یہ دنیا آباد ہے یہ دلکش خطہ (علیگڈھ) اور خلق اس کی جوانمردی کی یاد دلائے گی۔

تا بہ گیتی بود این بقعہ دلکش آباد　　　　خلق را یاد جوانمردی او خواہد داد

اے موت تونے اس کو قبر میں پہنچا دیا مگر تو اس کے نیک نام کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔

اے اجل گرتن بے جاں تہ خاکش سپری　　　　نتوانی کہ نکو نامیش از یاد بری

کون ہے جس نے ہندوستان میں اس کا غم نہ کیا ہو اور کون ہے جس نے قوم میں سے اس کی موت پر غصے سے اپنے گریباں چاک نہ کیا ہو۔

کیست در ہند کزیں غم لب حسرت نگزید　　　　کیست از قوم کزیں غصہ گریباں ندرید

حد یہ ہے کہ جب اس نالۂ جانکاہ کی آواز حالی کے کانوں تک پہنچی تو اس گوشہ نشین کے جگر سے بھی آہ نکلی۔

تا بجائے کہ چوں ایں نالۂ جانکاہ شنید　　　　حالی گوشہ نشیں ہم زجگر آہ کشید

اے موت تونے بے شک اس شخص کو خاک میں ملا دیا مگر اسکی نیک نامی پر خاک نہ ڈال سکی۔

اے اجل گرتن بے جاں تہ خاکش سپری　　　　نتوانی کہ نکو نامیش از یاد بری

یہ سادی مگر پُر اثر آہ جو قوم کے ہمدرد حالی کے جگر سے قوم کے محسن اور قومی کالج کے ہمدرد کے غم میں نکلی وہ آج بھی لوگوں کو تڑپانے والی اور رُلانے والی ہے یہ مختار الملک کا مرثیہ نہیں بلکہ اسکے ساتھ ہی قوم کا مرثیہ بھی ہے جبکہ وہ ایک فرد تھا مختار الملک کی انتظامی صلاحیت اور اہلیت کو اس مرثیہ نے اجاگر کرکے انکی نیک نامی کو چار چاند لگا دیئے ہیں اور انکی شہرت اور نیک نامی کو لافانی بنا دیا ہے۔ حالی کے اس مرثیہ سے پہلے ممکن تھا کہ قوم اور ملک اسکے نیک نام کو بھلا دیتی مگر اس مرثیہ کے بعد اسکی نیک نامی لازوال ہو گئی ہے۔ سچ ہے

نتوانی کہ نکو نامیش از یاد بری

یس غلام رسول کرنولی

اُردو ادب میں شخصیت

کسی شاعر کی شخصیت اور عظمت کا اندازہ اسکے کلام سے لگانے کی روایت بڑی پرانی ہے اس میں شاعر کے خیالات جذبات اور احساسات کو دخل ہوتا ہے شاعر کے خیالات میں اگر تصوف کی جھلک ہے تو اسے صوفی شاعر کا لقب مل جاتا ہے اگر شاعری میں غیر ملکی حکومت کے خلاف باغیانہ جنگ جویانہ خیالات ہیں تو ایسے شاعر کو قومی شاعر کا خطاب ملتا ہے۔

روسی ادب کے چند ہتھیار عاریتاً لیکر کوئی شاعر مزدوروں اور غریبوں کے ساتھ ہمدردی اور دوستی کا اظہار کرتا ہے تو لوگ اُسے ترقی پسند ادیب کہہ بیٹھتے ہیں۔ اس طرح شاعروں کی شخصیت کو ابھارنے کے لئے مختلف زاویے اپنائے جاتے ہیں۔

عام نقطۂ نظر اور شخصیت

جب ہم کسی شاعر اور قائد کو بھاری بھر کم اچھے ڈیل ڈول والے خوش پوش بات چیت میں طرار، چرب زبان، چست و چالاک دیکھتے ہیں تو فوراً کہہ اٹھتے ہیں کہ ان کی شخصیت اونچی ہے وہ بڑی شخصیت کے مالک ہیں سرکار جب نوکری کے لئے نوجوانوں کو چنتی ہے تو اسے نوجوانوں کو پہلی نظر میں چن لیتی ہے جو موٹے تازے اونچے لمبے بھاری بھر کم ہوں ہماری جنتا کی نظر کی خامی یہ ہے کہ باہری ٹرک بھڑک ہمارے لئے جاذب نظر بن جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے جس شاعر نے عمر بھر شراب اور کباب سے اپنا رشتہ محبت قائم رکھا ہو وہ شاعر صوفی شاعر کہلاتا ہے۔ قومی شاعر وہ جس نے اپنی زندگی میں عملی طور پر قوم کے مفاد کے لئے کچھ نہیں کیا ہو خود غرض اور نفس پرست رہا ہو مذہبی شاعر وہ جس نے مذہب کو اپنی زندگی سے دور رکھا ہو غریبوں کا ہمدرد شاعر وہ جس نے غریبوں کے لئے اپنے آرام کدہ کو نہ چھوڑا ہو۔ اپنی لذیذ او مقوی غذاؤں سے ایک دن کے لئے بھی چھٹی نہ لی ہو اگر نظر غائر سے کام لیا جائے تو ایسے لوگوں کی زندگیاں دو حصوں میں بٹی نظر آتی ہیں ایک بیرونی اور ایک اندرونی۔

یہ دونوں زندگیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک کا تعلق دوسری سے نہیں ہوتا بداخلاق اخلاق کی تعلیم دے نفس پرست بے نفسی کی ترغیب دے۔ ڈرپوک اپنے کو مرد میداں ثابت کرے تو یہ اپنے کو اور دوسروں کو دھوکہ دینے کے مترادف ہوگا۔

شخصیت کا صحیح مفہوم

شخصیت کے صحیح مالک کی زندگی دو حصوں میں بٹی نہیں ہوتی نہ اس کی اور ملک زندگی میں تضاد نہیں ہوتا اس کے باہر اور بھیتر میں ایک ہی شخص کام کرتا ہے۔

اس کی زندگی آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہوتی ہے اس کی زندگی میں خلوص ہوتا ہے جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اس کی زندگی کو تکلف سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا وہ زندگی کے انمول خزانے کی قربانی دیکر اس اکائی کی حفاظت کرتا ہے وہ بڑا آدمی بن کر رہنا نہیں چاہتا۔ وہ زندگی کی اکائی کو لے کر بڑھتا چلا جاتا ہے وہ کسی کو اپنے کو بڑا کہنے کے لئے مجبور نہیں کرتا اس کی زندگی مقناطیس بنکر دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ وہ خارجی زندگی کو داخلی زندگی کا ذمہ دار بناتا ہے اسکی شخصیت سے لوگوں پر خوف و ہراس نہیں چھاتا بلکہ لوگ اس کی زندگی کو اپنی زندگی کے لئے نمونہ سمجھتے ہیں۔

حق دار کون

اُردو ادب میں ایک گروہ ایسا بھی ہوا ہے جس کی زندگی باہرا ور بھیتر کی تنقید سے پرے تھی جیسے انسان ایک ہے اسکی زندگی کا روپ بھی ایک ہی تھا اس گروہ نے وہی کیا جو کہا ان کی زندگیوں میں دوہرا اور تضاد نہیں تھا یہ گروہ ان بزرگان دین کا ہے جو اردو ادب میں صوفی شعرا کے نام سے مشہور ہیں ان کے کلام کو پڑھ کر دل و دماغ پر جو اثر پڑتا ہے وہ زندگی کو بنانے والا ہوتا ہے ان کے دعوے بے معنی اور خیالات عملی زندگی سے خالی نہیں ہوتے ایک شخص کی زندگی کو صحیح شخصیت کا مالک بنانے کے لئے جن خصوصیات کی ضرورت ہے وہ سب ان میں پائی جاتی ہیں۔

بے نفسی، کسر نفسی، فقر و فاقہ، محبت الٰہی، غریب دوستی، محبت خلق، دولت سے نفرت، شکوہ شکایت سے پرہیز یہ ان بزرگان کرام کی زندگی کے نقوش رہے ہیں۔ یہ ان کی زندگیوں کے اجزاء غیر منفک تھے دنیا کی بڑی سے بڑی سیاسی سماجی، ہستیاں اپنی اندرونی زندگیوں میں کھوکھلی نظر آتی ہیں نزدیک سے ان کی زندگی کا مختصر مطالعہ تنفر پیدا کرتا ہے ان کے بارے میں مختلف شبہوں کو جنم دیتا ہے مگر ان بزرگان دین کی زندگی کا مطالعہ اور کلام کا مطالعہ دونوں ایک ہوتے ہیں ان کا قول اور فعل زندگیوں کو سنوارتا ہے یہ شاعر وہ نہیں جنکی قرآن حکیم مذمت کرتا ہے یہ تلامیذ الرحمٰن ہیں۔

شاعروں کے کلام میں ہر مضمون کے بارے میں کچھ نہ کچھ خیال آرائی ہوتی ہے مگر اس تصویر میں شاعر کی اکائی گرفت میں نہیں آتی یہاں وحدت خیال نہیں کثرت خیال ہوتی ہے مگر بزرگوں کے کلام میں وحدت خیال ہی ایک جامع چیز ہے ان بزرگوں نے زندگی کو ایک وحدت کی صورت میں دیکھا اور اس وحدت کو بنائے رکھنے کے لئے جو لوازمات کی ضرورت ہے انہیں کو اپنی شاعری میں جتایا باقی کو ہٹایا۔

بڑے شاعروں کی برسی ، سلور جوبلی کے موقعوں پر لوگ ناچ گانے شراب کباب کے مزے اڑاتے ہیں مگر ان صوفی ادبا کے پاس جو لوگ آتے ہیں اُن پر ان کی صحیح شخصیت کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ دنیاوی مکروہات سے ملوث آدمی بھی چند گھنٹوں کے لئے ان سے پرہیز کرنے لگتا ہے۔

جن شاعروں کی زندگیاں شخصیت کے گراں بہا جوہر سے خالی ہیں۔ ان کے اشعار بازار، ناچ گھر اور شراب خانوں میں گائے جاتے ہیں اور گانے والے اور سننے والے دونوں ایک ہی معیار کے ہوتے ہیں بخلاف اسکے صوفی

شعرائے شعرا ایسے لوگوں کی زبان پر ہوتے ہیں جو خود اونچے پائے کے ہوتے ہیں اور سننے والے بھی معیاری لوگ ہوتے
کسی شاعر کے کلام سے لطف اندوز ہوتے ہیں مگر شاعر کی نجی زندگی کی کہانی سنکر نعوذ باللہ پڑھتے ہیں

یہ شخصیت کے حامل ان صوفی شعراء کی شان ہی نرالی ہے ان کے شعر زماں و مکاں کی قید سے پرے ہوتے ہیں یہ پرانے ہوکر اپنے اثر اور معیار کو کھو نہیں دیتے یہ پرانے ہوکر بھی نئے ہوتے ہیں حقیقت پرانی ہوکر بھی نئی ہوتی ہے ان بزرگان کرام کے چند مسلمہ اصول ہیں۔ ان کا ادب ان چند مسلمہ اصول کے گرد اگر دگھومتا رہتا ہے پریشان خیالی اور ہرزہ سرائی کو اس میں دخل نہیں ہاں بیان کی ندرت ضرور ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اردو ادب میں شخصیت جیسے معزز اور موقر لفظ کا استعمال کردار کے غازیوں کے لئے ہی ہوسکتا ہے گفتار کے غازیوں کے لئے نہیں اس لفظ کے حقدار وہی ہوسکتے ہیں جن کی زندگی ٹوٹی زندگی (SPLIT PERSONALITY) نہیں بلکہ مسلم زندگی ہے۔

میں یہاں صرف چند اشعار مثالاً پیش کرونگا جن سے ان بزرگان کرام کی صحیح شخصیت کا اندازہ ہوگا۔

نہیں ہے غیر حق موجود جگ میں   تجلی اس کی سارا انجمن ہے (حضرت شاہ ابوالحسن قربی؟)
غیر نہیں جگ میں ادچ ہے ظاہر   لا لباں کو سلام میرا ہے۔
اَدسی نیوں ہو دل کو کرنا صاف   تن کے اوپر سنگار نا کرنا
دیکھنے میں کا دیکھنا دیکھ   دیکھتا دکھتا دونو ایک
دیکھتے دیکھتے ہوتا ایک   صورت دو آئینہ ایک

جب تجلی نور کی لاوے ظہور   عبد کا تب ماومن ہوتا ہے دور
من جوارنی کہا تو وہ بولے   جب تلک تو ہے لن ترانی ہے

لے روپ ترا رتی رتی ہے   پربت پربت پیتی پیتی ہے
پربت میں ادک نہ کم پیتی میں   یک سار اس اور رتی میں
اولا بوج لید حق کو بوج   معتبر من سے لیو خیالے بوج

ایم ، بلاک

فرزانہ حمید

جگر کی شاعری

جگر ادب لطیف کی تحریک کے اہم ستون ہیں" ادب لطیف" کی تحریک یلدرم سے سنہ۱۹۰۰ء سے شروع ہوئی اور ۱۹۲۶ء تک جاری رہی" ادب لطیف" کا اہم موضوع "رومانیت" ہے چنانچہ رومانی ادیبوں اور شاعروں کے ہاں فن کی اہمیت سماجی اہمیت سے زیادہ ہوتی تھی جس وقت حسرت شاعری کو ارفع بنا رہے تھے شیرانی اور جوش رومانیت کو نظم کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اکبر طنز کے تیر چلا رہے تھے اور حالی جدید شاعری کی بنیاد ڈال رہے تھے داغ وغیرہ رومانیت کو ہوا دیئے ہوئے تھے رومانی شاعری ہر دور میں رہی ہے۔ باوجود اقبال کی فلسفیانہ شاعری اور اکبر کے طنز و مزاح کے یہ تحریک مسلسل جاری رہی داغ یا جگر کی رومانی شاعری میں اور اختر شیرانی کی سلمیٰ کی تلاش میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے جذبہ وہی رومانی ہے مگر سانچے بدلے ہوئے ہیں۔

جگر ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے ان کے والد شاعر تھے۔ جگر داغ کے شاگرد تھے اور داغ کے رنگ سے بے حد متاثر تھے اسی لئے انہوں نے اپنے پہلے مجموعہ کلام کا نام بھی "داغ جگر" رکھا جگر کے لہجے میں اور داغ کے لہجے میں انیسویں اور بیسویں صدی کا فرق ہے۔ جگر کی تعلیم بہت واجبی سی تھی نشیب و فراز ان کی زندگی کے اہم جزو رہے ہیں ان کی بیشتر عمر شاہدان بازاری میں گذری اسلئے ان کے محبوب بھی وہی ہیں جگر اصغر کے مقابلے میں بلانوش تھے۔ اصغر روحانی شراب کے متوالے تھے جگر پینے والے تھے "شکست توبہ" ان کی ایسی غزل ہے جس میں وہ بار بار رجوع شراب ہوتے ہیں مگر آخری زمانے میں بیگم اصغر سے عقد کرنے کے بعد ترک شراب پر پوری طرح مائل ہوتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ جگر نے شراب کو نہیں خراب کیا بلکہ شراب نے جگر کو خراب کیا۔ جگر شراب نوش ہونے کے باوجود مہذب رہے دوست پرور رہے جگر کی شخصیت بڑی دلآویز تھی ان کے اندر شاعرانہ بانکپن تھا ان کے بعد اختر شیرانی ہیں جنھوں نے زندگی کو شاعرانہ انداز میں بسر کیا۔ جگر نے باوجود شاعرانہ زندگی بسر کرنے کے اس ثقافت اور تہذیب سے اپنا رشتہ نہیں توڑا جو انسانی قدروں کی پاسبان ہوتی ہے۔

انکی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ جگر کے پاس مادہ رشک نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ شاگردوں کا بہت بڑا حلقہ رہتا تھا۔ پیشہ ورانہ ذہنیت سے وہ بہت دور تھے۔ موجودہ نسل پر ان کا اثر بہت بُری طرح پڑا ہے جگر نہ صرف اپنی شاعری کی وجہ سے ممتاز ہیں بلکہ ان کا مخصوص ترنم بھی تھا جس نے ان کی شخصیت کو معقول بنایا اور ایسا بہت کم

ہوتا ہے کہ کوئی شاعر مشاعروں کی وجہ سے عروج کمال کو پہنچا ہو۔ لیکن جگر کی مقبولیت و شہرت میں مشاعروں کا بہت بڑا ہاتھ ہے مشاعروں ہی کے ذریعہ انھوں نے پوری نسل کو اپنے ارد گرد رکھا۔

جگر کا دوسرا مجموعہ کلام "شعلہ طور" ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا اور آخری کلام چند سال پہلے "آتش گل" کے نام سے شائع ہوا۔ جس پر انھیں انعام بھی ملا۔ جگر مشاعرے کی دنیا پر حاوی رہے اور جدید نسل کو تقسیم ملک سے پہلے بری طرح متاثر کرتے رہے بُرا اسلئے ہوا کہ جتنے بھی نوجوان شعراء تھے جو معاشرتی اور سماجی شاعری سے اجتناب کرتے تھے وہ تمام تر جگر کے پیرو ہو گئے اور جو جگر کے رتبہ کو نہ پہنچ سکے وہ صرف نقال بنکر رہ گئے اسی دوران نظم گوئی کے میدان میں جو سب سے زیادہ متاثر کرنے والا شاعر . . . جوش ہے اس نے بہتوں کا ستیاناس کیا کیونکہ جوش کے انداز کو بھی نہیں پہنچا جا سکتا جوش اپنی سماجی شاعری کے لحاظ سے اقبال پسند لوگوں پر حاوی ہے اور جگر غزل گو شاعروں کے محبوب شاعر بن گئے

جگر کی شاعری کا آغاز "داغ جگر" سے ہوتا ہے جس میں بیشتر داغ ہی کا انداز ہے جگر کی شاعرانہ عظمت کا پہلی بار احساس شعلہ طور کی اشاعت کے بعد ہوا۔ جگر کا اپنا انداز اور اپنی انفرادیت شدید طور پر اس سے قبل نمودار نہیں ہوئی تھی مگر پہلی بار جب ان کا مخصوص ترنم اجاگر ہوتا ہے تو انکی مخصوص انفرادیت کا احساس جاگ اٹھتا ہے

جگر کے ہاں سماجی یا معاشرتی موضوع موضوع شاعری نہیں ہیں بلکہ انکے موضوع زیادہ تر شراب حسن اور مستانہ انداز ہے اسی انداز کو پوری غزلوں میں جاری و ساری رکھا۔ جگر کو زبان پر پوری قدرت ہے انھوں نے کبھی معتقدین کا سہارا نہیں لیا متروکات کو استعمال نہیں کیا قدما کی تراکیب کو بھی جگہ نہیں دی۔ غالب سے استفادہ کرتے ہوئے فانی کی طرح یاسیت کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنا لیا جگر کی حد تک ہماری عشقیہ شاعری غزل کے قالب میں ڈھلکر ایک خاص قدرت کی مالک بن گئی۔ معاشرتی اور سماجی انداز کی ترقی فیض اور مخدوم کے ہاں ملتی ہے مگر عشقیہ شاعری کا خاص لب و لہجہ جگر کے ہاں اپنی پوری توانائی کے ساتھ متعین ہو جاتا ہے فانی، حسرت، اور یگانہ کی زبان قدیم ہے مگر جدید عشقیہ شاعری میں جگر کی زبان نئی ہے اور یہی اُن کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں حسن خود لینے لگا انگڑائیاں

فراق صاحب نے غزل کی توسیع کی ہے وہ بھی پیوند کاری کا شکار ہیں ایک طرف تو فراق فارسی کی ایسی تراکیب جس کو کوئی جدید شاعر استعمال نہیں کرتا استعمال کرتے ہیں اور دوسری طرف ہندی کی مخصوص تراکیب جو صرف فراق ہی کے ساتھ مخصوص ہو چکی ہیں استعمال کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے فراق کی شاعری باوجود قدرت رکھتے ہوئے بھی روایت کی شکار ہے اور جگر کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنے عشق کو بیسویں صدی کا لہجہ دیتا ہے اور فانی مکمل ہوتے ہوئے بھی غالب کا شکار ہے۔

جگر جن کی تربیت روایت سندی کے ماحول میں ہوئی ہے مگر وہ اس صدی کے انسان لگتے ہیں اسی لئے جگر

کی مقبولیت مسلم ہے۔

نگاہوں کا مرکز بنا جا رہا ہوں — محبت کے ہاتھوں لٹا جا رہا ہوں

جگر واحد شاعر ہیں جن کے اشعار سمجھنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی اس کے برعکس فانی کے یاس دقت محسوس ہوتی ہے حسرت کے کلام کی تراکیب قدما کے مطالعہ پر مجبور کرتی ہیں یگانہ کے پاس بھی وہ آسان فہمی نہیں ہے مگر جگر کی شاعری میں باوجود روایت شعر کا تتبع ہوتے ہوئے بھی کوئی دقت پسندی نہیں ہے۔

دل سے دل کو جو راہ ہوتی ہے — آہ ہوتی ہے واہ ہوتی ہے

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا — دل کچھ اس صورت سے تڑپا، ان کو پیار آ ہی گیا

جگر کی شاعری کا ایک نیا موڑ تیسرے مجموعہ سے ظاہر ہوتا ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے قحط بنگال کا اثر جو سارے ملک میں ہوا اس کو جگر نے پوری طرح سے محسوس کیا اور پہلی بار جگر عشقیہ راہوں کو چھوڑ کر سیاسی اور سماجی اور زندگی کی حقیقی راہوں کو اپناتے ہیں مثلاً ان کی غزل "آجکل" اور ۱۹۴۷ کی آزادی کی غزل جس کا شعر ہے ؂

یہ مرحلہ بھی تری حیرتوں میں دیکھ لیا — بہار میرے لئے اور میں تہی دامن

پہلی بار جگر اپنے مخصوص تغزل کے انداز میں معاشرتی اور سیاسی موضوعات کو شاعری میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ حلقہ بہت محدود ہے مگر یہ غزلیں بہت ہی بھرپور ہیں اور اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ غزل میں عشقیہ ہی نہیں دیگر موضوعات کو بھی ڈھالا جا سکتا ہے۔

مجموعی طور سے اگر جگر کا موجودہ غزل گو شعرا میں مقام متعین کرنا چاہیں تو جگر کو تحسین و ستائش ان کی زندگی ہی میں حاصل ہو گئی وہ میر شاعرہ تھے کسی اور نے مشاعروں کو اس طرح سے متاثر نہیں کیا جس طرح سے جگر نے کیا ہے۔ شاعر کے شاعر کی عظمت جب تحریر میں آجاتی ہے تو ہمیشہ کیلئے باقی رہ جاتی ہے جگر نہ صرف اسطرح سے بلکہ اپنے کلام سے اور اپنے مخصوص ترنم سے چھا کر رہ گئے فانی و حسرت کو یہ مرتبہ حاصل نہ ہو سکا مگر ان شاعروں میں سے یگانہ جو سرمایہ محدود رکھتے ہیں۔ مگر مقبولیت میں سب سے عظیم ہوتے ہیں۔ جوش، و جگر نے پہلی جنگ سے لیکر۔ حال تک نئی نسل کو بنایا بھی ہے اور بگاڑا بھی ہے پچھلی شاعری میں یہی حال ناسخ اور ذوق کا تھا ان کا سرمایہ سخن بھی کچھ زیادہ نہیں ہے مگر وہ پہلوان سخن تھے اسلئے ان کا مرتبہ بہت اونچا ہو جاتا ہے غرض جگر کی شاعری میں عشقیہ شاعری کی وہ لہر جو جگر سے شروع ہوئی تھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود نظر آتی ہے گو کچھ موڑ بدل چکے ہیں مگر غزل میں اب کچھ موضوعات آرہے ہیں وہ غزل کی توسیع کا سبب بن رہے ہیں مثلاً فیض وغیرہ جن کے ہاں ہمیں اجتماعی شعور ملتا ہے۔

غلام مرتضیٰ راہی

مظفر حنفی کا مجموعۂ کلام
"پانی کی زبان"

جدیدیت اپنے وقت کے عالم گیر رجحان کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تجریدیت، کا تعلق تنہائی سے ہوتا ہے اب سوال یہ کہ جدیدیت اور تجریدیت لازم و ملزوم کیونکر؟ تو ضروری ہے کہ ہم اپنے دور کے مزاج اور مزاج کا ردعمل جو ہماری فکر و نظر پر ہوتا ہے دیکھیں، اگر مزاج وقت، واقعی اتنا تلخ و تند ہے کہ ہمارے تمام تر خارجی امکانات مجروح ہو چکے ہیں تو ہمارا اعلان کہ آج کی جدیدیت بغیر تجریدیت کے نامکمل ہے صحیح ہوگا۔

آج جب ہم بین الاقوامی پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں تو چہار طرف افراتفری کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، سیاسی، مذہبی، سماجی، معاشی و دیگر تمام ڈھانچے مسمار ہو چکے ہیں مذہب پر اعتماد نہ رہ جانے سے کسی بھی اصلاح کی امید بھی ختم ہو چکی ہے زمانہ حال کی ہر تباہ کن ایجاد کا متوقع استعمال بھی ہمیں مستقبل سے مایوس کر چکا ہے۔ ماضی کے تلخ تجربوں نے ہمارے باہمی اعتماد و تعاون کو بھی چکنا چور کر دیا ہے۔ زمانہ ماضی کے ہولناک واقعات کے بعد ہم نے عالمی مجلس بہ ہوش و آگہی کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن ہمارے قول و عمل کے تضاد کو کیا کیجئے کہ ہم تخریب کاری کا سامان بدستور مہیا کئے جا رہے ہیں گویا غیر شعوری طور پر ہم منزل بہ منزل مکمل تباہی کی طرف بڑھتے آئے ہیں۔ اب تو اس موڑ پر ہیں کہ ہمارا مکمل طور پر نیست و نابود ہو جانا کچھ دور نہیں رہا۔ صورت حال جب یہ ہو تو گرد و پیش کے تکلیف دہ مناظر سے آنکھیں پھیر لینا ایک فطری عمل ہے لہٰذا آج کی جدیدیت میں تجریدیت کا عنصر ایک سچائی ہے جس سے انکار کرنا کفرانِ صداقت ہے۔

مظفر حنفی جدید شاعری کرتے ہیں ان کا مجموعہ کلام "پانی کی زبان" جو ۲۷ غزلوں اور ۲۰ نظموں پر مشتمل ہے حال ہی میں شب خون کتاب گھر الہ آباد سے شائع ہوا ہے۔

مظفر حنفی کے جدید کلام کا طرہ امتیاز طنز ہے ان کا یہ اقدام مستحسن ہے کہ انھوں نے جدید شاعری کرتے وقت اپنے فطری لب و لہجہ (طنز) کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس اعتبار سے جب کبھی جدیدیت کا جائزہ لیا جائے گا تو مظفر حنفی ایک منفرد خانے میں نظر آئیں گے۔ دراصل ایک دوسرے کی شعوری طور پر تقلید کرنے سے نئی شاعری کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ زمانہ ماضی میں بھی تغزلی شاعری کی گئی ہے، میر، غالب، فانی، و دیگر شعرا کے یہاں تجریدی و تغزلی رحجانات جا بجا ملتے ہیں۔ مگر یہ کیا بات ہے کہ ہم غالب کے شعر سن کر فوراً غالب کو پہچان لیتے ہیں، میر کی غزل سن کر برجستہ میر کا نام زبان پر آ جاتا ہے، فانی کی یاسیت ایک بالکل مختلف تاثر رکھتی ہے تو معلوم ہوا کہ تجریدیت کے کینوس میں بھی ہر شاعر اپنا نقش انفرادیت بنا سکتا ہے مگر آج ایسا نہیں ہے تمام شعرا

کے دفتر کے دفتر الٹ جائیے وہی ایک سا تاثر ذہن پر طاری رہتا ہے لہجہ و مفاہیم سے قطع نظر غزلوں کی بحور میں بھی کثرت سے مماثلت ملتی ہے یہ صرف اسی لئے کہ ہم میں سے کچھ کی شاعری کا تعلق لاشعور سے ہے اور بیشتر کا شعور سے۔ مظفر حنفی اپنی ایک مختلف سمت کی نشاندہی کرنے میں انھوں نے اپنے نظریہ کو جدیدیت، تجریدیت کے مجملہ اصول و ضوابط کا پابند نہیں بنایا ان کے کلام میں بیک وقت روایت اور جدیدیت کی رعائت ملتی ہے ؎

زخموں کی چھلنی سے ان کو چھان رہا ہوں		کرنیں اپنے ساتھ اندھیرے بھی لائی ہیں

تحریر کر رہا ہوں انھیں نوک خار سے		سینے جو زخم کھائے ہیں پھولوں کے درمیاں

پتھر تو پوجا جائے گا		جب تک شیش محل باقی ہے

اب سوچنے بیٹھا ہوں کہ مصرف مرا کیا ہے		مجبور محبت ہوں کہ پابند وفا ہوں

طویل رات، زمین سخت، آسمان چپ چاپ		مگر ہے قافلۂ زندگی رواں چپ چاپ

اک التفاتِ خاص تھا اس بے رخی کیا تھ		سب کو بلا رہا تھا مجھے دیکھتا گیا

مظفر حنفی نے جہاں طنز برائے طنز والا اصول برتا ہے وہاں ان کا لہجہ کافی سست پڑ گیا ہے ایسے مضامین نہ تو قاری کو متاثر کرتے ہیں اور نہ ہی طنز کے جدید آرٹ کو سمجھنے میں تعاون کرتے ہیں ؎

پنڈت جی سے آدھو بوتل		تھوڑا گنگا جل باقی ہے

اپنا گنجا چاند سنبھال		میرے سر پر دھول نہ جھاڑ

گر پڑے گا پچھاڑ کھا کر دن		سب کی گردن مروڑتے جاؤ

آسماں چھت ہے تو بستر فٹ پاتھ		کون کہہ سکتا ہے بے گھر ہم کو

مظفر حنفی نے قافیہ ردیف کی تلاش و خراشں پر بطور خاص توجہ دی ہے ان کی بیشتر غزلوں میں ایسے قوافی نظم ہوئے ہیں جو پہلے بار سماعت جان کر نظر انداز کئے جاتے رہے ایسے سنگ صفت قوافی کی رعائت سے بھی انھوں نے اپنے رنگ کے اچھے شعر نکالے ہیں مظفر حنفی نے غیر مردف غزلیں بہت کم کہی ہیں نئی غزلیں عموماً ردیف کی پابندی سے آزاد ہوتی ہیں جو اچھی بات نہیں ہے ندرت خیال اور جدت بیان مظفر حنفی کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں وہ معمولی سے معمولی تجربہ کو ایک انوکھے ڈھنگ سے کہنے کے عادی ہیں اس شعوری التزام کے نتیجہ سے بعض جگہوں پر ان کا پیرایۂ بیان غیر سنجیدہ ہو گیا ہے۔ ؎

خون پینے کو بلکتا ہے تو سنیئے		تیز چاقو کر کراتے ہیں ہوا میں

اس طرح کے بیشتر جوڑ سے ملے بازار میں		یہ ستمگر بہ کا حامل وہ شکست ناروا

سرکس کے ایکٹر کی طرح جھولی عمر بھر		امید اور یاس کے جھولوں کے درمیاں

مگر جہاں ایسے اشعار کی تعداد نہیں کے برابر ہے وہاں مظفر حنفی کے کلام میں ندرت و جدت کے عمدہ نمونے

جا بجا ملتے ہیں ع

خوش بو کی چوری کا دوش لگا ہے ان پر　　سب گل بوٹے اپنے دامن جھٹک رہے ہیں
آزادی بشر بھی اصولوں کے درمیاں　　تنکے سی اڑ رہی ہے بگولوں کے درمیاں
ہر چیز کو ہزار طرح دیکھتا ہوں میں　　آئینہ خیال میرا پاش پاش ہے
کس موڑ پہ یادوں سے ملاقات کریں ہم　　ہر بار گذرتی ہیں نئی راہ بدل کر

طنز گو شاعر، اپنے گرد و پیش کی غیر صحت مندی کو کڑی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے محسوسات و مشاہدات کو اس طرح قلمبند کرتا ہے کہ پڑھنے والا اپنے اندر ایک چبھن سی محسوس کرے مظفر حنفی کے طنز یہ کلام کی خارجیت میں داخلیت کا حسن بھی موجود ہے وہ اپنے مشاہدہ کو بعینہ بیان نہیں کر دیتے بلکہ مشاہدہ سے جو تاثر قبول کرتے ہیں اس کا اظہار کرتے ہیں مگر اس عمل میں وہ پیچیدہ ترین علامتوں نیز قوت ترسیل سے عاری مفاہیم سے گریز کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ کہکر کہ ع

پیچیدہ عہد نو کی علامت کے نام پر　　یاروں نے شاعری کو تماشا بنا لیا

گویا جدیدیت کے ایک ناگزیر پہلو پر طنز کیا ہے میرے خیال میں طنز گوئی کی اثر اندازی کے لئے ضروری ہے کہ بعید از فہم علامتوں اور استعاروں سے بچا جائے۔

مظفر حنفی اور روایت پرستوں میں تقریباً وہی اَن بَن ہے جو روایت پرستوں اور شیخ و زاہد کے درمیان رہی ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں نیز نظموں میں تقریباً یکساں طور پر روایت پرستوں کے خلاف رجحان ملتا ہے لیکن یہاں پر قابل غور بات ہے کہ روایت پرستی سے سخت اختلاف کے باوجود مظفر حنفی از خود سال خوردہ مفاہیم، الفاظ اور علامات سے مکمل طور پر دامن نہیں بچا سکے۔ ان کی نظر جہاں شاعری کے نئے زاویوں پر رہے وہیں ان کے کلام میں خالص روایتی قسم کے اشعار بھی موجود ہیں ع

اک التفات خاص تھا اس بے رخی کیساتھ　　سب کو بلا رہا تھا مجھے دیکھتا گیا
پھر تو یہ قتل کا الزام انھیں پر آتا　　کاش ہاتھوں میں وہ مہندی نہ رچائے ہوتے
اس کے دل کا چور تو دیکھو سب سے ہنس ہنس کر ملتا ہے　　ہم کو بیچ بیچ کر دیکھے گا شرما شرما کر جائے گا۔

آزاد اور معریٰ نظموں کا دور ختم ہو چکا۔ اب بلینک ورس اور فری ورس کا وقت ہے نظم کے اخراف کردہ ان شکلوں (FORMS) میں حد درجہ پیچیدگی اور الہام گویا زمانہ حال کی سیاسی، مذہبی، معاشی، سماجی بدحالیوں کا ردعمل ہے ان بدحالیوں سے آج کا شاعر بری طرح متاثر ہوا ہے اسکے ذہن میں امید عمل کا کوئی خاکہ نہیں ہے یہ تمام ناآسودگیاں اسے تمام ذات کے کرب کو سہنے کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں اب چونکہ ذات کا کرب شاعر کے ذہن پر محسوسات کا ایک سمندر بنکر ابھرتا ہے اسلئے ان محسوسات مشاہدات کو بہ یک وقت بیان کرنے کے لئے شاعر کو گونا گوں علامات کا سہارا لینا پڑتا ہے ان علامتوں کی تلاش و تراش شاعر خود ہی بقدر ضرورت کرتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ۔

قاری یا ذو تبلیغ فہم ہو یا نئی علامتوں کا ایک ملک گیر تعین کر کے ان کی وضاحت کی جائے بہر حال نئی نظموں میں ترسیل کا المیہ سر دست مرض لاعلاج ہے۔ مظفر حنفی نے پابند و معمولی نظمیں بھی کہی ہیں۔ مگر بلینک ورس کو زیادہ برتا ہے ان کے یہاں ترسیل کا المیہ برائے نام ہے یہ ایک بڑی خوبی ہے جو ان کی نظموں کو حاصل ہے انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو حسن و خوبی سے نظم کیا ہے میری نظر میں ان کی نظمیں ان کی غزلوں سے مقابلتاً بہتر ہیں ان کی نظمیں قاری کے ذہن کو ایک دیرپا تاثر بخشتی ہیں نظموں میں ان کی قوت مشاہدہ بہت عمیق و گہری ہے۔ نظموں میں بھی ان کے یہاں طنز کی چاشنی موجود ہے مگر یہاں ان کا طنز خود ان کی ذات میں گھل مل کر ابھرتا ہے۔ ان کی نظموں کی نشتریت میں بے پناہ اثر ہے۔ نئے خدا کا قہر اور ایک فسادزدہ رات طنزیہ انداز کی بہترین نظمیں ہیں۔ فلسفے کے شہر میں، گوتم کا خط، جستجو کا شوروہ، ایک اور مرحلہ، حروف کا اٹیم، خوف در خوف مرے اشعار کے معنی ایسی نظمیں ہیں کہ جن میں مظفر حنفی نے خود ساختہ علامتوں سے خارجیت نیز داخلیت دونوں پہلوؤں کو بہ حسن و خوبی واضح کیا ہے۔ ان نظموں کی تمام علامتیں اپنا ایک مختلف حیرتی آئینہ پیش کرتی ہیں اور قاری خود اپنے محسوسات کی تصاویر دیکھ کر محو حیرت ہو جاتا ہے۔

مظفر حنفی کی ایک نظم پرانی تنقید کا باب، روایت اور روایت پرستوں کی مکمل تباہی کی منتظر ہے جب کہ دوسری نظم میری نظموں کا مصرف ان کے اس نظریہ کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ روایت کے پامال و فرسودہ خاکوں میں نیا رنگ بھرنا چاہتے ہیں۔

بہر حال پانی کی زبان' پڑھ کر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مظفر حنفی ایک انفرادی حیثیت سے جدیدیت کے زمرے میں شامل ہوئے ہیں۔ ان کا کلام نہ صرف یہ ہے کہ جدیدیت کے مختلف زاویوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ خالص روایتی ذہنوں کو کریدتا بھی ہے ان کی شاعری میں روایت اور جدیدیت کا عمدہ امتزاج ہے جو ہر دو نظریہ شاعری کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔

میر رونق علی
صدر انجمن اشاعت تعلیم ضلع بیڑ

مہاراشٹرا اور اردو مدارس

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے پیش نظر، تھوڑے سے ردو بدل کے بعد مہاراشٹر کے تینوں علاقوں کی آبادی کا تناسب اس طرح حاصل ہوتا ہے۔ مرہٹواڑہ (۴) ودربھا (۶) مغربی مہاراشٹر (۱۵)

۱۹۶۸ء میں مہاراشٹرا کے تینوں علاقوں سے یس یس سی میں (۱) ناگ پور ڈویژن سے اکسٹھ ہزار پانسو ترپاسی طلبہ اور پیچ یس یس سی سے نو ہزار چار سو اکتیس جملہ اکہتر ہزار چودہ طلبہ اور (۲) پور ڈویژن سے ایک لاکھ چھتر ہزار دو سو انچاس طلبہ اور (۳) اورنگ آباد ڈویژن بورڈ سے (۲۴۱۲۹) اور (۱۲۲۲) یعنی (۲۵،۳۵۱) طلبہ شریک امتحان ہوئے۔

ان طلبہ کی شرکت پر نظر کرتے معلوم ہوتا ہے کہ آبادی کے تناسب سے مرہٹواڑہ میں تقریباً (۴۸) ہزار طلبہ کو شریک امتحان ہونا چاہیئے تھا لیکن صرف (۲۵) ہزار طلبہ شریک امتحان ہوئے اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرہٹواڑہ، ودربھا سے تعلیم میں بہت پیچھے ہے البتہ ودربھا، مغربی مہاراشٹر سے تعلیم میں کوئی پیچھے نہیں ہے آبادی کے لحاظ سے ستر ہزار طلبہ کو شریک ہونا چاہیئے تھا لیکن اکہتر ہزار طلبہ شریک ہوئے ہیں اس لئے ودربھا فوقانی تعلیم میں مغربی مہاراشٹر کے تقریباً مساوی ہے مگر مرہٹواڑہ ان دونوں علاقوں سے تعلیم میں پیچھے ہے۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مدنظر حالیہ آبادی (علاقہ مرہٹواڑہ) کا اندازہ لگایا گیا ہے جو بالکل صحیح تو نہیں ہے لیکن صحت کے قریب قریب ہے اور اکثر قریبی اعداد دئے گئے ہیں۔

نام ضلع	کل آبادی	مسلم آبادی	فی صد مسلمان
اورنگ آباد	۱۷،۵۰،۰۰۰	۱،۵۰،۰۰۰	۱۴ فی صد
نانديڑ	۱۲،۰۰،۰۰۰	۱،۳۰،۰۰۰	۱۱ فی صد
عثمان آباد	۱۶،۵۰،۰۰۰	۱،۶۵،۰۰۰	۱۰ فی صد
پربھنی	۱۴،۵۰،۰۰۰	۱،۴۵،۰۰۰	۱۰ فی صد
بیڑ	۱۱،۵۰،۰۰۰	۱،۱۰،۰۰۰	۹ فی صد
میزان	۷۲،۰۰،۰۰۰	۸،۰۰،۰۰۰	اوسط فی صد (۱۱)

سرکاری اعداد و شمار کے لحاظ سے مسلمان مرہٹواڑہ میں (۱۱) فی صد ہیں اور عام خیال ہے کہ (۱۵) فی صد ہیں لیکن نتیجہ سرکاری اعداد و شمار کے لحاظ سے ہی اخذ کیا جا رہا ہے۔

۱۹۶۷ء میں پونہ ڈویژن سے زبان اول اردو کے (۳۵۱۷) طلبہ نے امتحان دیا اور اورنگ آباد ڈویژن سے (۵۰۸) طلبہ شریک امتحان رہے مسلم آبادی کے ۱/۳ تناسب کے لحاظ سے (۱۲۰۰) مسلم طلبہ کو امتحان دینا چاہیئے تھا اردو زبان اول کے لحاظ سے ہم پونہ ڈویژن سے بہت پیچھے ہیں حالانکہ ریاست حیدر آباد کے زمانہ میں تو یہاں اردو ہی اردو تھی اس کمی کی وجہ یہ ہے کہ پونہ ڈویژن میں اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس زیادہ اور مرہٹواڑہ میں کم ہیں اگر یہاں بھی اردو کے مدارس کھولے جائیں تو یہ کمی پوری ہو سکتی ہے۔

اضلاع مرہٹواڑہ میں مدارس کی تعداد ۱۹۶۸ء

نام ضلع	تعداد مدارس	شریک امتحان مسلم طلبہ	اردو میڈیم کے	کامیاب	مرہٹی میڈیم کے	کامیاب	جملہ کامیاب مسلم طلبہ
اورنگ آباد	۱۲۰	۴۲۰	۲۶۰	۸۴	۱۶۰	۳۶	۱۲۰
بیڑ	۸۰	۱۸۰	۸۰	۴۴	۱۰۰	۳۶	۸۰
ناندیڑ	۱۱۵	۲۵۰	۱۳۲	۵۰	۱۲۰	۳۶	۸۶
عثمان آباد	۱۳۰	۲۶۰	۶۰	۱۷	۲۰۰	۵۳	۷۰
پربھنی	۸۵	۱۵۰	۶۸	۱۹	۸۰	۳۱	۵۰
میزان	۵۳۰	۱۲۶۰	۶۰۰	۲۱۴	۶۶۰	۱۹۲	۴۰۶

۱۹۶۸ء کے امتحان ایس ایس سی میں تقریباً (۲۰) ہزار طلبہ شریک ہوئے اس میں مسلم طلبہ (۱۲۶۰) تھے اور اس میں نصف سے زائد طلبہ مرہٹی ذریعہ تعلیم کے تھے ان پانسو تیس مدارس میں اردو ذریعہ تعلیم کے صرف چار امدادی مدرسے ہیں اور گورنمنٹ کے (۲۶) مدرسے ایسے ہیں جن میں مرہٹی کے ساتھ اردو کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اس طرح کل مرہٹواڑہ میں (۳۰) مدرسے ایسے ہیں جہاں اردو ذریعہ تعلیم ہے بقیہ مدارس میں مرہٹی ذریعہ تعلیم ہے انگریزی اور ہندی ذریعہ تعلیم کے مدارس تو بہت ہی کم ہیں جو نظر انداز کئے جانے کے قابل ہیں۔

اردو ذریعہ تعلیم کے چار امدادی مدارس سے تقریباً (۲۰۰) طلبہ اور ۲۶ سرکاری مدارس سے تقریباً (۴۰۰) طلباء شریک امتحان ہوئے پانسو سے زائد مرہٹی کے مدارس سے صرف (۶۶۰) مسلم طلبہ شریک امتحان ہوئے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کم ہونے سے اردو مادری زبان والے طلبہ کا بہت نقصان ہو رہا ہے اس کے علاوہ مرہٹی

ذریعہ تعلیم کے مدارس آئے دن کھل رہے ہیں چنانچہ اس سال اورنگ آباد ڈویژن میں نئے (۴۸) مدارس فوقانیہ کے طلبہ سال گزشتہ سے زیادہ شریک ہوئے اردو مادری زبان رکھنے والے طلبہ جو تعلیم میں پیچھے ہیں اگر اردو ذریعہ تعلیم کے زیادہ سے زیادہ مدارس قائم کئے جائیں تو وہ تعلیم سے مستفیض ہو سکیں گے اسطرح پونہ ڈویژن میں اردو بولنے والے مرہٹی والوں سے بہت پیچھے ہیں چنانچہ ۱۹۶۶ء میں پونہ ڈویژن میں اردو زبان اول کے امتحان دینے والے (۳۵۱۷) تھے اول زبان مرہٹی کے امتحان دینے والے مرہٹی ذریعہ تعلیم کے۔ (۴،۴۰۱۱) تھے تناسب کے لحاظ سے (۸،۶۰۰) طلبہ کو اردو میڈیم میں شریک ہونا چاہیئے تھا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہاں بھی اردو میڈیم کے مدرسے بہت کم ہیں چنانچہ سال حال (۱۷۴) جدید ہائی اسکول کے امیدوار شریک امتحان ہوئے جن میں اردو میڈیم کے تین مدرسے تھے تناسب کے لحاظ سے (۱۳) ہونا چاہیئے تھا

شرکائے امتحان ایس ایس سی بورڈ مرہٹواڑہ ۱۹۶۸ء

نام ضلع	شرکائے امتحان	مسلم طلبہ	اردو میڈیم کے مسلم طلبہ	مسلم طلبہ مرہٹی میڈیم	مسلم طلبا شریک امتحان فی دس ہزار
اورنگ آباد	۴۶۷۵	۴۳۰	۲۶۰	۱۶۰	۱۷ فی دس ہزار مسلم آبادی
بیسٹر	۲۹۷۳	۱۸۰	۸۰	۱۰۰	۱۶ ؍ ؍ ؍ ؍
ناندیڑ	۳۷۱۹	۲۵۰	۱۳۰	۱۲۰	۱۹ ؍ ؍ ؍ ؍
عثمان آباد	۶۲۰۸	۲۶۰	۶۰	۲۰۰	۱۵ ؍ ؍ ؍ ؍
پربھنی	۲۵۱۱	۱۵۰	۷۰	۸۰	۱۰ ؍ ؍ ؍ ؍
میزان	۲۰۰۸۶	۱۲۶۰	۶۰۰	۶۶۰	۰۰۰۰۰۰

عام طور پر اردو میڈیم کے طلبہ کا نتیجہ کامیابی (۳۵) فیصد اور مرہٹی میڈیم سے امتحان دینے والے مسلم طلبہ کا نتیجہ، کامیابی (۲۹) فی صد رہا۔

تعلیمی اعتبار سے ضلع عثمان آباد بہت ترقی کر رہا ہے لیکن اردو میڈیم کے لحاظ سے نہایت پست ہے یعنی ۱۹۶۸ء میں ۶۲۰۸ طلبہ شریک امتحان رہے اس میں بلحاظ دس فیصد مسلم طلبہ (۶۲۰) کو شریک امتحان ہونا چاہیئے تھا مگر ۲۶۰ مسلم طلبہ نے امتحان دیا جس میں اردو میڈیم کے (۶۰) اور مرہٹی میڈیم کے (۲۰۰) طلبہ شریک تھے اس سال نتائج کے لحاظ سے ضلع بیڑ اول رہا یعنی اس ضلع کا نتیجہ (۳۹٫۵۴) فیصد ہے۔

عثمان آباد کے بعد ناندیڑ ضلع بھی رو بہ ترقی ہے۔ (۳۷۱۹) شرکائے امتحان میں (۲۵۰) مسلم طلبہ شریک امتحان رہے اور (۸۶) کامیاب ہوئے جن میں (۵۰) طلبہ اردو میڈیم کے تھے اس لحاظ سے ضلع ناندیڑ کا نتیجہ بہ لحاظ زبان اردو

اردو میڈیم اول رہا۔

ضلع پربھنی میں (۲۵۱۱) شرکائے امتحان کے منجملہ (۵۰) مسلم طلبہ کامیاب ہوئے جس میں اردو میڈیم کے صرف (۱۹) طلبہ تھے۔ یہ ضلع تعلیمی ترقی میں ہر لحاظ سے پست ہے۔ اس ضلع میں اردو میڈیم کا کوئی امدادی مدرسہ نہیں ہے اور نہ عثمان آبادی۔

مجموعی طور پر مرہٹی بولنے والوں میں دس ہزار میں (۳۰۰) طلبہ امتحان ایس ایس سی میں شریک ہوتے ہیں اور مسلم طلبہ فی دس ہزار میں (۱۲) طلبہ شرکت کرتے ہیں وجہ ظاہر ہے کہ اردو میڈیم کے مدارس بہت ہی کم ہیں۔ اب بھی خواہان اردو اور محبان زبان کی ادنیٰ کوشش سے مرہٹواڑہ کے تعلقات اور قصبات میں (۱۰۰) اردو ہائی اسکول قائم ہو سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے عزت مآب وزیر تعلیم حکومت مہاراشٹرا اور عزت مآب نائب وزیر تعلیمات حکومت مہاراشٹر دونوں علم دوست دور اندیش مدبر اور بہی خواہ زبان اردو ہیں عزت مآب پنڈت سندر راؤ جی سالونکے نائب وزیر تعلیم کو تو زبان اردو سے فطری لگاؤ اور گہرا شغف ہے کیوں نہ ہو جب کہ آپ عثمانیہ یونیورسٹی کے لاگریجویٹ اور درخشندہ تارے ہیں ان ہر دو وزراء صاحبان کے الطاف کریمانہ سے اردو زبان کو آج مہاراشٹر میں وہ مقام حاصل ہے جو اس کو کسی ریاست میں بھی حاصل نہیں ہے اب محبان اردو کا فرض ہے کہ اس درخشاں عہد سے فائدہ اٹھائیں اور اردو زبان کی ترقی کے لئے سعی و کوشش کریں تاکہ اردو ذریعہ تعلیم رکھنے والے طلبہ تعلیم پاکر اپنے وطن کی ہمہ جہتی ترقی میں برابر کے حصہ دار بنیں اردو طلبہ ناساعد حالات کے باوجود تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کے دل میں ترقی کرنے کا بے حد شوق ہے مگر مادری زبان اردو کے مدارس نہ ہونے سے انکی بہت پست ہمتی ہو رہی ہے۔

مہاراشٹر کے تینوں علاقوں مرہٹواڑہ، ودربھا اور مغربی مہاراشٹر میں مرہٹواڑہ مغربی مہاراشٹر سے پیچھے ہے ہی مگر ودربھا سے بھی پیچھے ہے۔ ودربھا میں مرہٹواڑہ سے اردو مدارس نسبتاً کافی زیادہ ہیں مثال کے طور پر مرہٹواڑہ کے چھوٹے ضلع بیڑ کا تقابلہ ودربھا کے چھوٹے ضلع بلڈانہ سے کیا جائے تو بین فرق معلوم ہوتا ہے ضلع بیڑ میں اردو میڈیم کا ایک ہی ہائی اسکول ہے اور ضلع بلڈانہ میں اردو میڈیم کے سات ہائی اسکول ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرہٹواڑہ ودربھا سے تعلیمی میدان میں بہت ہی پیچھے ہے۔

مرہٹواڑہ میں اردو میڈیم کے پرائمری اسکول بھی بہت ہی کم ہیں اور ودربھا میں اردو میڈیم کے پرائمری اسکول بہت کافی ہیں حالانکہ ودربھا کی مسلم آبادی مرہٹواڑہ سے کم ہے مسلم آبادی کا تناسب مرہٹواڑہ میں (۶) اور ودربھا میں (۵) اور مغربی مہاراشٹر میں (۱۷) ہے۔

آخر میں مکرر عرض ہے کہ یہ مضمون ایسے کوردہ مقام سے قلم بند کیا جا رہا ہے جہاں مواد فراہم نہیں ہو سکتا پھر بھی حتی الامکان ... بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مندرجہ بالا مواد صحت کے بہت ہی قریب ہو اب محبان اردو اور محققین کا فرض ہے کہ اس ... تحقیق فرما کر صحیح نتیجہ پر پہنچیں۔

حسرت سہروردی

آنسو ہیں کہ رخسار پہ ڈھلتے ہوئے موتی
اے کاش محبت میں یہ برسات بھی ہوتی

اب بھی ہے وہی طور وہی دار و رسن ہیں
اب بھی ہیں یہ آنکھیں ترے جلووں کو ترستی

زیبِ دو عالم ہے مگر تیرے جہاں میں
دیکھی نہیں جاتی ترے انسان کی پستی

قائم ہے مجھی سے مئے و میخانہ کی رونق
مشہور ہے رندوں میں مری بادہ پرستی

جینا کوئی جینا ہے نہ مرنا کوئی مرنا
مہنگی ہے یہاں موت نہ ہے زندگی سستی

سب دل پہ ہے موقوف تبسم ہو کہ آہیں
دل اپنی جگہ پر ہے تو ویرانہ بھی بستی

اٹھو کہ نئے دور کا آغاز کریں ہم
آؤ کہ بنائیں اسی ویرانے کو بستی

کل بھی یہی بستی تھی مگر پاپ نہیں تھا
اب بھی وہی بستی ہے مگر پاپ کی بستی

گاہے غمِ دل گاہے غمِ رنجشِ دوراں
مجموعۂ افراد ہے حسرت مری ہستی

ناشاد کانپوری

محبت وہ کرے وہ دل لگائے
جو اپنی جان ہی پر کھیل جائے

جو چاہے پار کرنا بحرِ الفت
وہ اپنے خون سے پہلے نہائے

تجھے شکوہ ہے یہ، تو ہنس نہ پایا
مگر وہ جو کبھی رونے نہ پائے؟

یہی کہتی ہے بزمِ یار میں شمع
جسے جینا ہو پہلے سر کٹائے

بجھا ڈالے زمانے کی ہوا نے
دیئے امید نے لاکھوں جلائے

کئے جا ذکر اس کا، یاد اس کی
پلٹ کر سانس پھر آئے نہ آئے

نزاکت کا بھلا ہو ان کی ناشاد
تصور میں بھی وہ گاہے نہ آئے

کرار نوری

اب بھی آزاد فضاؤں کا نہ امکاں نکلا
بابِ گلشن جسے سمجھے درِ زنداں نکلا

ٹھیک منجدھار سے رقصاں و غزلخواں نکلا
کتنے طوفانوں سے ہو کر مرا طوفاں نکلا

اتنا نزدیک مرے تو بھی کبھی آ نہ سکا
جتنا نزدیک مرے یہ غمِ دوراں نکلا

اُنکی محفل سے میں لے آیا تمنا اُن کی
لوگ سمجھے تھے کہ میں بے سر و ساماں نکلا

رُک کے اک رشک نے کیا کیا نہ جلایا ہمکو
دل کا سورج بھی چراغِ تہِ داماں نکلا

کتنی گلرنگ بہاروں کے سُنے تھے قصے
ہم نے جب جام اُٹھایا تو بیاباں نکلا

اڑ گئے ہوش جو محفل میں سُنا قصہ صبح
نشہ بھی سینۂ مینا سے پریشاں نکلا

جب بھی معلوم کیا اپنی تباہی کا سبب
اپنے ہاتھوں میں خود اپنا ہی گریباں نکلا

خود نمائی بھی عجب ظلم ہے نوری مجھ پر
ہائے وہ وقت کہ میں خود سے گریزاں نکلا

نثار عباسی

اگر محفل میں تیری ساقیا گردش میں جام آتا
تو اُٹھ کر تیری محفل سے کوئی کیوں تشنہ کام آتا

نہ کام آئی ہمارے سنگدل! سنگیں دلی تیری
کوئی پتھر ہی مل جاتا جو دیوانوں کے کام آتا

اگر تجھ کو خیالِ خاطرِ رنداں ذرا ہوتا
تو تجھ پہ تنگ ظرفی کا نہ ساقی اتہام آتا

غمِ دوراں بھی اس کا احترامِ ضبطِ غم کرتا
وہ دل ملتا جسے غم ہائے جاناں کا سلام آتا

مجھے خود دور تک پہونچانے جاتی آبلہ پائی
مری صحرا نوردی میں کوئی ایسا مقام آتا

قدم خود منزلِ مقصود لیتی عزمِ محکم کو
اگر اک دن سوئے منزل نثار خستہ گام آتا

اقبال طاہر

کیجئے نہ شرمندہ اور لطفِ پیہم سے
زخم اتفاقاً ہی بھر سکے ہیں مرہم سے

چھوٹ جائے گا ہم سے صبر و ضبط کا دامن
ایسے بدگماں ہو کر منہ نہ موڑیئے ہم سے

موسمِ گل نالہ کر رہا ہے گلشن میں
غسلِ صحت خوشبو وہ بھی اشکِ شبنم سے

آپ جو سزا دے دیں جرم بے گناہی کی
اب تو غیر ممکن ہے ترکِ آرزو ہم سے

ہائے کیا کہوں طاہر انتظار کا عالم
بیٹھ ہی نہ جائے دل آج شدتِ غم سے

اطہر عزیز

چیخی خاموشی سے نہ گھبرا رات گذر ہی جائے گی
یاس کے آگے ہاتھ نہ پھیلا رات گذر ہی جائیگی

تھک جائیگا درد کا چندا چلتے چلتے آخرِ شب
زخم جلا کر نہ اُجالا رات گذر ہی جائے گی

خواب وہ بھٹکے سائے ہیں آج یہاں تو کل ہیں وہاں
سایوں کا کیوں کرنا ہے پیچھا رات گذر ہی جائے گی

باتیں ہیں یہ رازکی اِن کو پردے ہی میں رہنے دے
دیواروں سے مت کر چرچا رات گذر ہی جائے گی

موندھ لو آنکھیں لُٹ جائیگا ورنہ تمہارا سارا سنگار
یہ کہکر تاروں کو نہ بہکا رات گذر ہی جائے گی

چھٹنے لگیں اب غم کی گھٹائیں دیکھ امیدیں مسکائیں
چھیڑ کوئی پیارا سا نغمہ رات گذر ہی جائے گی

شعلے سنائے تو اطہر اپنے پرانے ساتھی ہیں
اپنوں سے پھر جھگڑا کیسا رات گذر ہی جائے گی

فرحت قمر

شاعر سے کچھ سوال

نظام میکدہ برہم، عجیب عالم ہے
نہ کوئی ساقی نہ پیر مغاں نہ جام و سبو
یہاں تو پیاس کے شعلوں کا رقص ہوتا ہے
بہار آئی چمن میں تو لے کے کیا آئی؟
ہر ایک برق کا رُخ آشیاں کی جانب ہے
ہے صحنِ گل میں ابھی تک نظام فرسودہ
ہر ایک پھول کے لب پر ہے نوکِ خار ابھی

کوئی بتائے کہ پھر بھی یہ بے حسی کیوں ہے؟

ابھی تو شعر کے پردے میں ہے صدائے رباب
تری نواؤں میں اب بھی رچی ہوئی ہے شراب
ترے خیال میں اب بھی بسے ہیں باطل خواب
نہ فکرِ فردا، نہ امروز کی پریشانی
کہ تیرے ذہن پہ حاوی ہیں رنگ و بو کے سراب

شراب سے کہیں شعلوں کی پیاس بجھتی ہے!
رباب و چنگ سے زنجیر کس نے توڑی ہے

نظام میکدہ برہم، عجیب عالم ہے
ہر ایک برق کا رُخ آشیاں کی جانب ہے
نظر اٹھا کہ افق ظلمتوں کی زد پہ ہے!
سبھی کے دیدۂ تر میں سوال رقصاں ہیں
سبھی کے ہونٹوں پہ جلتے سوال لرزاں ہیں!
لرز رہے ہیں ستارے حدودِ مژگاں پر
گرے جو ٹوٹ کے اُن کا حساب کیا ہوگا؟
بہار خوب، یہ ہنگامۂ بہار ہے، سچ
بہت سوال ہیں اُن کا جواب کیا ہوگا؟
یہ چھوڑ قافیہ پیمائی راہ پیما بن
کہیں جو بن گئی منزل سراب کیا ہوگا؟

تقی شاعر

تشکیک

میں ترا ہی عبد ذلیل ہوں، تری ذات بندہ نواز ہے
مجھے تجھ سے نسبتِ خاص ہے، میں نشیب ہوں تو فراز ہے
تری ذات عرش سریر ہے، تو مجھے بھی فرشِ حصیر دے
تجھے مہر و ماہ کا واسطہ، مجھے ایک نانِ شعیر دے
مرے دل میں آگ لگا رہے ہیں چمن کے پھول کھلے ہوئے
کہ برس رہی ہے گھٹا مگر، مرے ہونٹ کیوں ہیں سلے ہوئے
جو چلی ہوا تو سنور گیا، میں وہ ایک نقش بر آب ہوں
جو انھیں ہواؤں پہ پھوٹ کر کبھی رو دیا وہ حباب ہوں
مجھے ایک لقمہ نصیب ہو کہ گزر رہا ہوں میں جان سے
یہ وہ بات تھی جو نکل رہی تھی کسی گدا کی زبان سے
کوئی تیر ٹوٹ کے رہ گیا، کوئی آبلہ تھا جو بہہ گیا
وہیں اک جواں تھا کھڑا ہوا کہ جو مسکرا کے یہ کہہ گیا
تو ابھی سے ہی کے فریب میں تری عقل جن میں اسیر ہے
میں خدا کے نام پہ بھیک دوں تو خدا بھی گویا فقیر ہے

عباس اثر

سحر ماحول

مری سحر کا مآل دیکھو اداس ہے کارزارِ ہستی
افق کی پاک اور حسیں جبیں پر عیاں ہے خطِ غبارِ ہستی
اڑی ہوئی ہے چمن کی رنگت وہ تمتماہٹ کہیں نہیں ہے
عجیب سکتہ سا ہے چمن میں صبا کی آہٹ کہیں نہیں ہے
نہال اپنے اداس چہروں کو زرد پتوں میں ڈھانپتے ہیں
یہ کیا قیامت ہے آشیانے میں آج تنکے بھی کانپتے ہیں
لباسِ گل تار تار ہو کر جنوں کی عظمت بھی کھو رہا ہے
کہ جیسے کانٹوں کی باڑھ پہ کوئی دل کے ٹکڑے پرو رہا ہے
چمن میں غنچے قدم قدم پر نسیم پر چوٹ کر رہے ہیں :
لڑی جو ٹوٹی ہے کہکشاں کی چمن میں موتی بکھر رہے ہیں
بہار کے رخ کی مردنی سے ہر ایک کا جی دہل رہا ہے
کوئی نہ کوئی تو حادثہ پھر پروں کو تولے مچل رہا ہے
اثر ہمارا یہ بختِ خفتہ کبھی تو کروٹ بدل کے جاگے
مگر یہ ہے شرط جاگنے کی سنبھل کے جاگے سنبھل کے جاگے

نقد و نظر

ماہنامہ "شاعر"

مکتبہ قصر الادب بمبئی ۸ - بی سی - افسانہ و ڈرامہ نمبر
ادارت اعجاز صدیقی، مہندر ناتھ

اردو والے کبھی تو وقفہ وقفہ سے اور کبھی پے در پے کوئی نہ کوئی کام ایسا کر جاتے ہیں کہ اس زبان کی بقا اور اس کے مستقبل کی طرف سے جو یاس دلوں پر چھائی ہوئی ہوتی ہے وہ اچانک زائل ہو جاتی ہے اور پست سے پست ہمت بھی جاگ اٹھتا ہے اب کی بار اعجاز صدیقی صاحب نے ایسا ہی ایک کارنامہ انجام دیا ہے انہوں نے "شاعر" بمبئی کا دوسرا اور تیسرا شمارہ "افسانہ و ڈرامہ نمبر" بنا کر شائع کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ افسانوی ادب کو دنیا میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور شاعری کو چھوڑ کر افسانوی ادب نے ذہنوں کو اتنا متاثر کیا ہے کہ اس کا حلقۂ اثر بڑھتا ہی جا رہا ہے مشرق میں افسانوی ادب کی عمر اگرچہ کم ہے اور صرف چند ہی افسانہ نویس بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں تاہم پچھلے پچاس سال میں اس نے بھی قابل لحاظ ترقی کی ہے۔" اتنا کہہ چکنے کے بعد اگر وہ بھی شاعر کے افسانہ اور ڈرامہ نمبر میں چوٹی کے صرف چند گنے چنے افسانہ نگاروں کی دوسرے یا تیسرے درجہ کی تخلیقات چھاپ دیتے جن کو سب ہی خوشی خوشی چھاپ لیا کرتے ہیں تب بھی بات بن جاتی اور شاعر کا شمار بھی صف اول کے رسائل ہی میں ہوتا۔ لیکن ہم سب کی طرح شاید یہ احساس اعجاز صاحب کو بھی شدت کے ساتھ ستا رہا تھا کہ" اردو ادب میں عام طور پر گھٹیا قسم کے افسانے زیادہ لکھے جا رہے ہیں ذوقی افسانہ نگاری تو وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے لیکن اس وبا کے خلاف مناعت ابھی قارئین میں پیدا نہیں ہوئی ہے چنانچہ ایک ماہر نباض اور معالج کی طرح انہوں نے جہاں بیماری کو شناخت کر لیا وہاں ایک صاحب اجتہاد کی طرح ڈٹ کر ایسا بھی ایک آزما لگے کہ اگر اس جسم میں بیماری کے خلاف لڑنے کی ذرا بھی قوت باقی ہے تو وہ آپ ہی آپ بیدار بھی ہو جائے صدیقی صاحب نے اردو کے چند پرانے اور باقی ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے ساتھ ہی ملک کی دیگر آٹھ بڑی زبانوں اور دو غیر ملکی زبانوں کے شاہکار افسانے بھی ساتھ کے ساتھ شاعر کے اس نمبر میں شامل کر دئے تاکہ سب کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ بہ آسانی دکھایا جا سکے کہ" اردو میں افسانہ نگاری کتنی پیچھے یا کتنی آگے ہے" جب تک ہم گریبان میں منہ نہ ڈالیں ہمیں اندازہ کیسے ہوگا کہ ہم کیا ہیں اور منہ نکال کر جب تک ہم ارد گرد نہ دیکھیں یہ فیصلہ کیسے ہوگا کہ ہم کنوئیں کے مینڈک ہیں یا افلاک کی وسعتوں کے پنچھی؟

میں صدیقی صاحب سے بالکل متفق ہوں کہ شاعر کی یہ تازہ ترین پیش کش منفرد اور اہم ہے اور مجھے اس سے بھی سو فیصدی اتفاق ہے کہ انہوں نے اردو والوں کو ایک دلنواز تحفہ دیا ہے اردو میں ایسے مجموعے کم شائع ہوتے ہیں کہ ہم ان سے لطف اندوز بھی ہو سکیں اور بہ یک وقت تنقید اور موازنہ کا فرض بھی انجام دے سکیں شاعر کے افسانہ اور ڈرامہ نمبر کی خوبی یہی ہے کہ افسانوی

ادب کا جائزہ لینے کے لئے یہ ایک کسوٹی کا کام بھی دیتا ہے اور اچھے افسانوں کا ایک ایسا انتخاب بھی ہے قریب قریب ہر قسم کے ذوق مطالعہ کی تسکین بھی انہیں مل جاتی ہے راجندر سنگھ بیدی کرشن چندر عصمت چغتائی قرۃ العین اور خواجہ احمد عباس تو بیشک شریک نہیں ہیں اگرچہ وہ بھی ہوتے تو اچھے تھے لیکن رام لال جوگیندر پال آمنہ ابوالحسن اکرام جاوید عفت موہانی اسی طرح سلمیٰ صدیقی پرکاش پنڈت اظہر افسر ضرور موجود ہیں اور انہیں سے ہمارے مستقبل کی امیدیں زیادہ وابستہ کی جانی چاہئیں اوپر سے کلیم راہ آرا رحیم آزد وغیرہ اور چند دوسرے بھی شاعری کی اس خصوصی مالا میں - خوبصورت خوبصورت موتیوں کی طرح پروئے گئے ہیں اور قیمت رکھی گئی ہے صرف ۳ روپے اس قیمت میں دیدہ زیب سرورق مواد و موضوعات اور ۷ × ۱۹ انچ سائز کے ساتھ آپ خود ہی انصاف کیجئے کہ اور کیا چاہئے !

حکیم یوسف حسین خاں

منشورات

دفتی جلد، ۲۷۵ صفحات، قیمت ۶ روپیے، ناشر انجمن ترقی اردو، دلی

یہ کتاب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی تصنیف ہے آپ اردو زبان کے صف اول کے کہنہ مشق اہل قلم ہیں جو ساٹھ پینسٹھ سال تک اردو کی خدمت کرتے رہے کیفی نے اردو ادب کی مختلف اصناف مثلاً ناول، افسانے، مضامین خطبات اور شاعری میں بہت کچھ لکھا ہے ان کے علاوہ زبان اور انشا سے متعلق بعض مسائل میں موصوف کو غیر معمولی درک حاصل تھا وہ صرف ادیب ہی نہ تھے بلکہ علم زبان کے ماہر بھی تھے۔

اردو میں منشورات اور کیفیہ ان کی تصانیف معرکے کی سمجھی جاتی ہیں مقدم الذکر زیادہ تر علمی و ادبی خطبات اور کچھ مضامین پر مشتمل ہے اور موخر الذکر میں زبان کی مختصر تاریخ قواعد اور انشا کے ضروری امور کا ذکر ہے

زیر نظر کتاب منشورات میں ادیب شہیر مالک رام کا پیش لفظ ہے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ مرتب کا مقدمہ ہے اس کے بعد حواشی ہیں جن میں مصنف کی بعض علمی غلط فہمیوں کی اصلاح کی گئی ہے سب سے آخر میں اصل کتاب کے موضوعات اور مضامین کا اشاریہ ہے موجودہ کتاب اس کی پانچویں اشاعت ہے جس میں پچھلے ایڈیشنوں کے مقابلے میں پیش لفظ، مقدمہ حواشی اور اشاریہ کا اضافہ کیا گیا ہے جن کے باعث کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

مقدمے میں جو (۲۴) صفحوں کو محیط ہے نارنگ صاحب نے کتاب کے بعض موضوعات پر ادبی اور لسانیاتی پہلوؤں سے مکمل کر بحث کی ہیں - مصنف کی بعض علمی کمزوریوں کو بھی واضح کیا ہے - جہاں قابل قدر باتوں کا ذکر کیا اور انہیں سراہا ہے وہاں بعض نقائص کی مذمت بھی کی ہے جس سے مرتب کی اعلا حوصلگی اور بے لاگ تنقید کا ثبوت ملتا ہے دراصل یہی چھان پھٹک کا معیار ہے کتاب کی ترتیب و تدوین حکمیاتی طریقے پر ہوئی ہے جو قابل تحسین ہے۔

انجمن ترقی اردو، دلی قابل مبارک باد ہے کہ اس نے ایک گراں مایہ کتاب کو جو بالکل مسخ ہوگئی تھی اور کمیاب تھی صحت و تحقیق کے ساتھ شائع کرکے اس کو نیا جنم دیا اور نیز اردو والوں کو اس سے مزید استفادہ کا موقع عطا کیا (غلام رسول)

مقالات یوم شبلی مرتبہ حافظ نذر احمد پرنسپل شبلی کالج۔ ناشر مسلم اکیڈمی ۱۸ محمد نگر لاہور۔ سائز ۲/۱ کراون گٹ اپ خوبصورت دورنگی ٹائیٹل صفحات ۱۰۰ قیمت ۲۵/=

لاہور میں شبلی کالج کے زیر اہتمام اس سال پہلی بار ڈاکٹر سید محمد عبداللہ سابق پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور کی صدارت میں یوم شبلی منایا گیا اس میں جو مقالات پڑھے گئے انھیں حافظ نذر احمد پرنسپل نے مرتب کرکے شائع کیا ہے پہلا مقالہ خطبہ صدارت ہے جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے شبلی کو جامع الحیثیات شخصیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ مورخ، مفکر مذہبی سوانح نگار، شاعر ادیب، نقاد، ماہر تعلیم، سیاس، صاحب اسلوب، صاحب طرز انشا پرداز اور ایک خوش مذاق انسان تھے اس امر کا بھی اظہار کیا ہے کہ علیگڑھ میں سولہ سال سر سید کا ساتھ دینے کے باوجود سرسید کے بالکلیہ ہم خیال نہ ہوسکے اور ان کے انتقال کے ساتھ ہی وہاں سے علحدہ ہوگئے ڈاکٹر صاحب کا یہ خطبہ مختصر لیکن بہت جامع ہے

ایک سوال یہ بھی اٹھایا گیا ہے کہ کتابیں مصنف یا ورثا یا اداروں کی اجازت کے بغیر دیگر ناشرین چھاپ لیتے ہیں اس سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی کوئی تلافی نہیں ہوسکتی یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ حکومت اس کیلئے سخت قانون بنائے اور اس پر پابند ہو۔

خطبہ کے بعد چھ مقالے ہیں اور دو صحافیوں نے یوم شبلی کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے آخر میں منظوم خراج عقیدت ہے چھ مقالوں میں پہلا دارالمصنفین پر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے لکھا ہے دوسرا ندوۃ العلماء پر پروفیسر افتخار احمد چشتی نے تیسرا شبلی۔ ایک ماہر تعلیم سید غلام شبیر بخاری نے اور چوتھا شبلی کی ذوق آفرینی سید مرتضیٰ حسین فاضل نے لکھا ہے پانچواں مقالہ پروفیسر شیخ محمد عثمان نے لکھا ہے جس کا عنوان ہے "مولانا شبلی" کے اثرات ہماری قومی زندگی پر،" اسمیں فاضل مقالہ نگار نے شبلی کو ماڈرن ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں ان کا مقابلہ سرسید سے کیا ہے اور کہا ہے کہ شبلی بلاشبہ سرسید سے کم ماڈرن تھے لیکن سرسید کے مقابلے میں وہ جدید سے کم مرعوب تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ مرعوبیت شبلی سے کوسوں دور تھی اس کا بڑا ثبوت سیرۃ النبیؐ جلد اول کی اشاعت کے لئے جو پاپڑ بیلنے پڑے اس سے ہوتا ہے۔

آخری مقالہ پروفیسر ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی کا ہے ایک ماہ (جولائی ۱۹۱۴ء مولانا شبلی کے ساتھ) سب رس کے قارئین فاضل مقالہ نگار اور ان کے شبلی پر لکھے گئے مقالوں سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ کتنی دیدہ ریزی کے بعد ایک ماہ کے تفصیلی واقعات ڈاکٹر صاحب موصوف نے جمع کردیئے ہیں۔ مقالے بھی مختصر ہیں اور کتاب بھی مختصر لیکن شبلی کو سمجھنے میں بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔ شبلی کا یوم منانے اور مقالے شائع کرنے پر ہم کارکنان کالج کو مبارکباد دیتے ہیں۔

محمد اکبر الدین صدیقی

عکس و شخص

عنوان چشتی۔ ناشر ادارہ عارف ماڈل پورہ دہلی ۶ ۲ سائز ۱/۸ کراؤن صفحات ۲۴۸ مجلد گرد پوش قیمت ۵ روپے۔

نام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اشخاص کے خاکے ہوں گے لیکن یہ خاکے کم اور شخصیتوں اور ان کے کام پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے اس میں حسب ذیل دس اصحاب اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے پروفیسر محمد مجیب ۲۔ غلام ربانی تاباں ۳۔ کوثر چاند پوری ۴۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ۵۔ ابراحسنی گنوری ۶ شفا گوالیاری ۷ ریکش اکبر آبادی ۸۔ تسکین قریشی۔ ۹۔ انور صابری ۱۰۔ زلیش کمار شاد۔

سب ہی حضرات کی تحریری تصویریں نہایت دلآویز اور حسین انداز میں کھینچی ہیں پروفیسر مجیب کی افسانہ نگاری اور ڈرامہ نگاری کا تجزیہ کرکے انھیں ایک اچھا ڈرامہ نگار اور ادیب ثابت کیا ہے۔ مجیب صاحب کی انگریزی کتابوں کی فہرست بھی دیدی جاتی تو بہتر ہوتا۔

دوسرا مضمون تاباں صاحب پر ہے اور تیسرا کوثر چاندپوری پر یہ بتایا گیا ہے کہ کوثر صاحب اسّی کتابوں کے مصنف ہیں لیکن مضمون میں صرف جہاں غالب پر تبصرہ کیا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار کو صرف جہاں غالب ہی کی کل تفصیلات دینی اور اس پر تنقید کرنا منظور تھا غالب سے متعلق جو بھی لکھا گیا ہے بہت سلجھے ہوئے انداز میں اور تفصیلی ہے۔ کنور سحر صاحب کی بذلہ سنجی اور شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ بقیہ دوسری تمام حضرات کی تحریری تصویریں بھی ہیں اور ان کی شاعری اور شخصیت پر دلکش انداز میں مضامین۔ جناب چشتی صاحب نے ایسے حضرات پر قلم اٹھایا ہے جن کی شہرت عرصہ دراز سے چلی آرہی ہے لیکن ان پر مفصل اور سیر حاصل مضامین نہیں لکھے گئے۔ اگر ان حضرات کی تاریخ ہائے ولادت بھی دیدی جاتیں تو بہتر ہوتا اور اس سے سیر حاصل مضمون پر کوئی مذموم اثر نہ پڑتا عکس و شخص ہماری تاریخ ادب کا ایک جزء ہے اس لئے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

(محمد اکبر الدین صدیقی)

شعلہ خاموش

ناشر: عبدالسمیع بوہیرے معہ امید چلی کیٹنز بمبئی ۸ مصنف کالی داس رضا گپتا پوسٹ بکس ۴۴۰۵ نیروبی۔ کینیا (مشرقی آفریقہ) سائز ڈیمی کاغذ کتابت اور طباعت اعلیٰ معیار کی مجلد اوپر اور پشتہ پر سنہری نام صفحات ۳۱۸

رضا صاحب پنجابی ہیں اور انھوں نے عرصہ دراز پہلے وطن چھوڑ کر مشرقی آفریقہ کو وطن ثانی بنالیا ہے وہ پنجاب میں رہنے کے زمانے میں اپنا کلام جناب لبھورام جوش ملسیانی کو دکھاتے رہے اور ترک وطن کے بعد ڈاک کے ذریعہ اصلاح لیتے رہے جناب جوش ملسیانی کی صحبت اور ان کی اصلاح نے زبان کو شستہ، پاکیزہ اور دلاویز بنا دیا الفاظ کی بندش کا سلیقہ جابجا نظر آتا ہے اور سہل ممتنع اشعار کی بھی کمی نہیں نظموں میں وطن سے محبت کے جذبات بھی نظر آتے ہیں اور غزلوں میں تغزل کی پوری شان جلوہ گر ہے جس شخص نے وطن سے دور نئے ماحول اور اجنبی زبان بولنے والوں میں ربع صدی گذاردی

ہیں۔ اس کی قدرت زبان کا یہ عالم اُردو کی تیا کا خاص نظر آتا ہے نظموں میں ایسی کئی ہیں جو جذبات کی شدت اور خلوص محبت کی نمائندہ ہیں کتاب میں گیت بھی ہیں اور قطعات بھی رباعیات بھی ہیں اور نعت و منقبت بھی غزلوں کا حصہ فراق و وصال کے عنوان کے تحت صفحہ ا سے شروع ہو کر صفحہ ۲۰۵ تک چلا گیا ہے یہ حصہ بے حد دلآویز ہے الفاظ کی بندش حسین انداز میں ملتی ہے نمونتاً کچھ شعر پیش ہیں

دوزخ، بہشت، موت حیات الا شرع بند — میکش نظام دہر سے گھبرا کے پی گیا
مال دنیا، دولت دل، نقد جاں — اک اشارے پر تری ہم ہار دیں
زمانہ حسن، نزاکت، بلا، جفا، شوخی — سمٹ کے آگئے سب آپ کی اداؤں میں
زبان کا پاس قسم کا لحاظ، قول کی شرم — یہ جوہر آپ نہ پائیں گے بے وفاؤں میں
سیرت کو دیکھا حسن کو دل کو مزاج کو — کس کس طرف نہ اہل نظر کی نظر گئی

رضا صاحب وطن سے بہت دور ہیں اور وطن کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی ہے وہ غزلوں میں بھی وطن کا ذکر کرتے ہیں اور بعض مقامات پر طنز بھی کر جاتے ہیں۔ دو شعر دیکھئے۔

یوں مضطرب ہیں رہ کے ہم اپنے وطن سے دور — جیسے تڑپ رہے ہوں عنادل چمن سے دور
چاہتے ہیں ہم، وطن پر ہوں نثار — خوئے خودکامی کو لیکن کیا کریں

مضامین میں جدت اور ندرت ہے اور انھیں کبھی وہ آن بان سے ادا کرتے ہیں دیکھئے

دل میں اب کوئی نہیں تا ممکن — نہ سہی آپ، خدا تو ہوگا
شمع مدفن بنے کھڑے کیوں ہو — اب تو ہو بھی چکا جو ہونا تھا
جائیں گی کیا ہماری وہ نازک مزاجیاں — شبنم میں ڈوب جائیں تو ابھریں گہر سے ہم

ذرا اس شعر کو پڑھیئے اور ایک خاص واقعہ کو ذہن میں لائیے۔

ہم پلہ پھر کبھی ہو نہ سکے اہل فقر کے — تولے گئے ہزار دفعہ سیم و زر سے ہم

ورق گردانی میں جو چند اشعار پسند آگئے ہدیہ نظر ہیں۔

جب چلے اٹھ کر تو یہ احساس سا ہونے لگا — ہو نہ ہو کچھ کھو چلے ہیں آپ کی محفل سے ہم
کوئی آسان ہے سنانا حال دل — غم کی باتوں کا کرے اظہار کون
شراب عیش نہیں تو شراب غم ہی سہی — یہ چیز میکدہ دہر میں حرام نہیں
مجھ سے قیمت نہ مانگ اے ساقی — [illegible] تنگ دستی کی انتہا ہوں میں
کاش منزل ہی مجھ تک آجائے — [illegible] وہ نومید شکستہ پا ہوں میں

محمد اکبر الدین صدیقی